ادبِ اُردو کا ماہوار با تصویر رسالہ

مرتبہ

ed 1969.

پیارے لال شاکر (میرٹھی)

جلد دوم

اگست لغایت دسمبر ۱۹۱۳ء

جس میں

پچاس سے زائد نامور اہل قلم کے تقریباً چھہتر مضامین نظم و نثر

ڈھائی سو صفحات مین درج ہین

مقام اشاعت دفتر "العصر" لکھنؤ

فہرست مضامین

نثر

1952

صفحہ

نظم

العصر کے قواعد

یہ باتصویر ماہوار رسالہ جو اُردو علم ادب کی ترقی کا اعلیٰ نمونہ ہو ہر ماہ کے آخر مین لکھنؤ سے شائع ہوتا ہے۔ ملک کے نامور اہل قلم مسلّم الثبوت اساتذہ اور بہترین انشا پردازاسے دقیع دلچسپ اور مفید بناتے ہین سرگرم ہین مضامین کی نوعیت ایسی ہے جو ہر طبقہ کے لیئے دلچسپ ہو۔ کوشش کیگئی ہے کہ اس کے مضامین نثر ہون خواہ نظم تعلیم یافتہ مستورات کے لئے بھی اُسیقدر دلچسپ مفید اور خوشگوار ثابت ہون جسقدر تعلیم یافتہ اصحاب اور بالغ نظر حضرات کے لیئے۔

اسکی ضخامت ۸۴-۶۵ صفحات ہوتی ہے اور ہر ماہ التزاماً ایک رنگین اور متعدد عکسی تصاویر دی جاتی ہین جنمین مشہور مصوّرون کی صناعی کے نمونے مشاہیر حضرات کے فوٹو تاریخی عمارات کے نقشے، اور دیگر دلچسپ واقعات کے مرقعے ہوتے ہین بعض تصاویر کے متعلق مشہور شاعرونکی نظمین بھی شامل کی جاتی ہین جو تصویر کی دلکشی کو دوبالا کر دیتی ہین۔ قدر دانون کی ترقی کے ساتھ ساتھ اس کے حجم اور تصاویر کی تعداد مین اضافہ ہوتا رہے گا۔

تصاویر کے علاوہ اسکی لکھائی چھپائی مین بھی اعلیٰ درجے کا اہتمام کیا جاتا ہے اور قیمتی کاغذ پر نہایت صفائی کے ساتھ تصاویر چھاپ کر اسمین اضافہ کیجاتی ہین جو اسکی مقررہ ضخامت سے علیحدہ ہوتی ہین۔ بہرنوع قدردانان علم ادب کے لیے ایسا پرچہ مہیا کیا گیا ہے جو کمی قیمت کے ساتھ انگریزی میگزینون سے مشابہ ہے۔

اسکی سالانہ قیمت للعہ مع محصول ہے۔ اس قیمت مین ان خصوصیات کے ساتھ کوئی پرچہ نہین ملسکتا بلکہ اس ارزانی کے ساتھ اسقدر تصاویر بھی کہین دستیاب نہین ہوسکتین۔ نظر برین معزز ناظرین رسالہ سے استدعا ہے کہ اگر یہ خدمات قابل قبول ہون تو علاوہ ذاتی قدردانی کے اسکی توسیع اشاعت مین بھی حتی الامکان امداد فرمائین۔

خریداری کے لیئے پیشگی قیمت آنا ضروری ہے۔ نمونہ مفت نہین بھیجا جائے گا بلکہ ۸؍ وصول ہونے یا ویلیو ایبل کی اجازت آنے پر ارسال ہوگا۔ نام اور پتہ صاف اور خوشخط لکھا جائے تاکہ پرچہ پہونچنے مین دقت نہ ہو۔

اس رسالہ مین مذہبی مباحث اور موجودہ پالیٹکس پر کوئی مضمون نہ چھاپا جائے گا۔ ناتمام مضامین بھی نہین لئے جائینگے جس مضمون کے ساتھ تصویر کی ضرورت ہو اس کا مضمون نگار حضرات خود بندوبست فرمائین۔

طلبا اور کم استطاعت اصحاب کے لئے "العصر" کا ایک سستا ایڈیشن بھی شائع ہوتا ہے۔ اسمین صرف ایک تصویر ہوتی ہے اور کاغذ ایوری فنش کے بجائے دیسی استعمال کیا جاتا ہے۔ اسکی سالانہ قیمت ۓ مع محصول ہے نمونہ کے لئے ۸؍ آنا چاہیئے۔

جملہ خط و کتابت پتہ ذیل پر ہونی چاہیئے

پیارے لال شاکر میرٹھی مالک و ایڈیٹر رسالہ العصر لکھنؤ

سید محمد مرتضی "بیان" و "یزدانی" (میرٹھی) مرحوم

زمین کی حرکتِ محوری کے بعض اہم نتائج

سائنس نے مدت ہائے دراز تک "قدرت" کے حضور مین جبین نیاز رگڑنے کے بعد آخر یہ حق حاصل کر لیا کہ اب اس کے نام لیوا "قدرت" کے عالیشان مظاہر کے قدیم اور سربستہ راز ایک محو حیرت عالم کے سامنے وثوق کے ساتھ بیان کر سکتے ہین۔ سائنس کی دوربینی واقعات ماضی کے علل و اسباب کی گتھی سلجھانے مین جس حد تک کامیاب ہو چکی ہے ہم امید کرتے ہین کہ ہمارے ناظرین اس کا کسی قدر اندازہ موجودہ مضمون کے مطالعے سے فرما سکین گے ؎

خدا دے دوربینی اور اس چشم تصور کو
کہ لاکھون کام اس سے دور کے بے دوربین نکلے

زمین کی محوری حرکت کے متعلق ہم اپنے گذشتہ دو مضامین مین شرح و بسط کے ساتھ بحث کر چکے ہین۔ پہلے مضمون مین ہم نے یہ دکھانے کی کوشش کی تھی کہ زمین کی حرکت اور دیگر تمام اجرام فلکی کی حرکت صرف ایک عالمگیر قانون کے تابع ہے اور دوسرے مضمون مین ہم نے زمین کی محوری حرکت کے سُست ہونے کو تین مختلف دلائل سے ثابت کیا تھا۔ موجودہ مضمون اس سلسلہ کا آخری اور سب سے ضروری حصہ ہے پہلے دو مضمون ایک حد تک اس کا دیباچہ تھے۔

اگر ہم زمین کی محوری حرکت کے جملہ نتائج محض ایک فہرست کی شکل مین یہان درج کر دین تو شاید بعض سطحی نگاہ والے اس طرز عمل سے بہت محظوظ ہون گے لیکن علمی نقطۂ خیال سے یہ کوئی احسن طریقہ نہ ہوگا۔ سائنس سے واقفیت پیدا کرنا صرف معلومات مین اضافہ کرنے کا نام نہین ہے بلکہ اصلی اور حقیقی مقصد سائنس کی تعلیم کا دلون مین ایک علمی صلاحیت پیدا کرنا ہے۔ سائنس کا اولین خاصہ یہ ہے کہ اس مین کوئی بات تحکم سے نہین قبول کرائی جاتی بلکہ ہر بیان کے لیے ایسی معقول و قابل پذیرائی دلائل پیش کی جاتی ہین جن کے حسن و قبح پر بحث کرنا ہر سمجھدار کا فرض ہونا چاہیے۔ علمی تحقیقات کا کوئی شعبہ کسی خاص جماعت کے لیے مختص نہین ہے بلکہ جو کوئی اپنے آپ کو انہی حالات مین رکھ سکے جن مین دوسرے سائنس دانون نے اپنے تئین رکھا ہے اس پر وہی حقائق منکشف ہو سکتے ہین جو دوسرون پر منکشف ہو چکے ہین۔ اگر ایک خاص تجربہ یا مشاہدہ

ایک آدمی کرسکتا ہے تو ادنیٰ سے ادنیٰ آدمی بھی اس کے کرنے پر قادر ہوسکتا ہے۔ سائنس میں استثنائی حالتیں شاذ کا حکم رکھتی ہیں۔

مختلف دلائل اور مشاہدات کی بنا پر یہ بات یقینی طور پر مانی جاتی ہے کہ مرکز سے زمین کی سطح کا فاصلہ مختلف مقامات پر مختلف ہے۔ ہمارا اشارہ یہاں سمندر اور پہاڑوں کے نشیب و فراز کی طرف نہیں بلکہ اس تدریجی اختلاف کی طرف ہے جسکی بدولت زمین کا نصف قطر خط استوا سے شروع ہوکر قطبین کی طرف کم ہوتا جاتا ہے[۵۱]۔ دوسرے الفاظ میں اس اختلاف کو یوں بیان کرسکتے ہیں کہ زمین کی شکل ایک کرہ (Sphere) کی سی نہیں ہے جسکی سطح کا فاصلہ مرکز سے ہر جگہ برابر ہوتا ہے بلکہ اسکی شکل "شبہ کرہ" یعنی سفیرائڈ (Spheroid) کی سی ہے جو کرہ کو کسی قطر کے سروں پر نیچے کی طرف دبا دینے سے پیدا ہوتی ہے۔ زمین قطبین پر چپٹی ہے اور خط استوا پر سے اُبھری ہوئی ہے قطبین کا فاصلہ مرکز سے بہ نسبت خط استوا کے تقریباً ۱۴ میل کم ہے۔ استوائی قطر ۷۹۲۶ میل لمبا ہے اور قطبی قطر اس سے ۲۷ میل کم یعنی ۷۸۹۹ میل ہے۔ اگر آپ ایک دائرہ کو ایک قطر کے گرد گھمائیں تو آپ کو
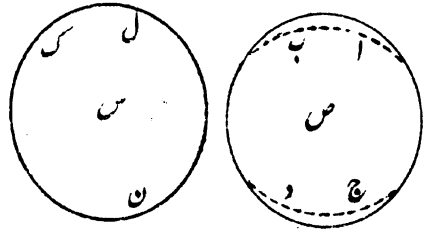
آنکھ کی کمزوری کی وجہ سے ایک کرہ دکھائی دیگی۔ اگر دائرہ کو اب اور ج د کیطرح ذرا سیدھا کردیں اور پھر گھمائیں تو شبہ کرہ کی سی شکل دکھائی دے گی۔ یہ ثابت کرنا کہ فی الاصل قطبی اور استوائی قطر میں ۲۷ میل کا فرق ہے ہمارے مبحث سے خارج ہے لیکن ہم یہاں چند اُمور کی طرف ناظرین کی توجہ مبذول

---

۵۱ ہم کسی دوسری جگہ ذکر کر آئے ہیں کہ زمین کے محور کے شمالی اور جنوبی سروں کو قطبین کہتے ہیں اور ان کے عین وسط میں زمین کے گرد ایک محیط خط کا نام خط استوا ہے۔

کرانا چاہتے ہیں جن سے اس امر کا پتہ چلتا ہے کہ قطبی قطر استوائی قطر سے کم لمبا ہے یا یہ کہ زمین سنگترے کیطرح وسط میں اُبھری ہوئی ہے اور شمالی جنوبی سروں پر چپٹی ہے۔ قانون تجاذب مادی کے مطابق زمین کی کشش کسی مقام پر اُسی تناسب سے کم ہوتی ہے جس تناسب سے اس مقام کے مرکزی بعد کا فاصلہ بڑھتا ہے۔ لہذا اگر اس کشش کا اندازہ سطح زمین کے اوپر جگہ بہ جگہ خط استوا سے لیکر قطبین تک کیا جائے تو زمین کی شکل کے متعلق مفید مطلب معلومات بہم پہنچ سکتے ہیں۔ اس کشش کا اندازہ ہم تین طریقوں سے کرسکتے ہیں

(۱) زمین کی کشش ایک گرنے والے جسم میں تقریباً ۳۲ فٹ یا ۹۸۱ سنٹی میٹر[۵۲] فی ثانیہ فی ثانیہ کا اسراع[۵۳] پیدا کرتی ہے۔ اس اسراع کا معیار کئی طریقوں سے ہوسکتا ہے۔ متعدد مقامات پر تجربات کا نتیجہ یہ ہے کہ اسراع کی مقدار سب جگہ یکساں نہیں ہے بلکہ خط استوا پر ۹۷۸ اور قطبین کے قریب ۹۸۳ سنٹی میٹر فی ثانیہ فی ثانیہ ہے۔

(۲) اسراع کا اندازہ پنڈولم (Pendulum)[۵۴] کے ذریعے سے بھی ہوسکتا ہے۔ اگر ایک پنڈولم کی لمبائی میں کوئی تبدیلی نہ کی جائے تو اسکے اِدھر سے اُدھر تک ایک دفعہ حرکت کرنے کا وقت اسی تناسب سے گھٹتا بڑھتا ہے جس تناسب سے زمین کی کشش کے اسراع کا وقت بڑھتا گھٹتا ہے۔ اگر کسی مقام پر ایک خاص لمبائی کے پنڈولم کا نوبتی وقت (Period of Vibration یا Periodic Time)

---

۵۲ فرانس اور یورپ میں لمبائی کا پیمانہ میٹر (Metre) ہے۔ ایک میٹر میں سو سنٹی میٹر (Centimetre) ہوتے ہیں۔ ایک انچ ۲½ سنٹی میٹر یا زیادہ صحیح طور پر ۲٫۵۴ سنٹی میٹر کے برابر ہوتا ہے۔ ۵۳ اسراع کے متعلق "حرکت کا پہلا قانون" دیکھئے جو العصر بابت ماہ جون ۱۹۱۳ء میں شائع ہوا ہے۔ ۵۴ اگر ایک بھاری جسم کو ایک تار دھاگے کے کنارے پر باندھ کر کسی مضبوط جگہ لٹکا دیں تو رسی اور بھاری جسم کے مجموعہ کو پنڈولم کہتے ہیں پنڈولم کی لمبائی بھاری جسم کے مرکز ثقل سے لیکر اس نقطہ تک ہوتی ہے جہاں رسی باندھی جاتی ہے۔

فرض کیجیے کہ دو ثانیہ ہی تو کسی دوسرے مقام پر جہان زمینی کشش کا اسراع کم ہی وہان نوبتی وقت دو ثانیہ سے زائد ہوگا جس کا اندازہ دو نو مقامات پر سوا ہزار نوبتی حرکتون کا وقت معلوم کرنیسے نہایت درستی کے ساتھ ہو سکتا ہی[1] سطح زمین کے اوپر استوا سے قطبین کے قریب تک پنڈولم کے ساتھ زمین کی پیمائش اب کی جا چکی ہی اور تمام تحقیقات کا نتیجہ یہ ہی کہ تدریجی طور پر ع کی مقدار استوا سے قطبین تک بڑھتی چلی جاتی ہی۔ اب جیسا کہ ہم شق اول مین ذکر کر چکے ہین اس کا سبب مرکز سے سطح زمین کے بعد کا اختلاف ہی عملی طور پر پنڈولم پر مرکز کے قرب و بعد کا اثر بڑی گھڑیون کی حالت مین خوب عیان ہوتا ہی۔ اگر ایک گھڑی استوا پر ٹھیک وقت دیتی ہی تو قطبین کی طرف لیجانیسے وہ تیز ہو جائیگی یعنی اس گھڑی کے مطابق ایک ثانیہ دو دفعہ ٹک ٹک کی میعاد کم ہو جائیگی اور اس لیے ایک دن رات مین اس گھڑی کے مطابق ٦٠×٦٠×٢٤ ثانیہ سے زیادہ دفعہ ٹک ٹک ہوگی۔ اسطرح جو گھڑی استوا شمال یا جنوب مین صحیح وقت دیتی ہی وہ استوا کی طرف لیجانیسے سست ہو جاتی ہی

(۳) مختلف اجسام مین مادہ کی مقدار ایک چیز ہی اور ان کا وزن دوسری چیز۔ مادہ کی مقدار مین سطح زمین سے مرکز کے قریب یا بعید ہونیکا کوئی اثر نہین پڑتا لیکن بوجھ پر اثر پڑتا ہی۔ بوجھ فی الاصل اس طاقت کا نام ہے جس طاقت سے زمین اس جسم کو اپنی طرف کھینچتی ہی۔ ہم دیکھ چکے ہین کہ زمین کی کشش پر فاصلہ کا اثر ہوتا ہی اس لیے اگر ہم ایک بھاری بوجھ کو ایک سپرنگ بیلنس (Spring Balance) کے کہٹے سے لٹکا کر استوا سے قطبین کی طرف لیجائین تو چونکہ زمین کی کشش بڑھتی جائیگی اس لیے اس جسم کا وزن بھی بڑھتا جائیگا۔ بوجھ کا صحیح مفہوم سمجھنے کے لیے آپ فرض کیجیے کہ وہ جسم چاند کی سطح پر واقع ہی۔ چونکہ چاند زمین سے بہت چھوٹا ہی اس لیے اس کی کشش بھی زمین سے بہت کم ہی۔ نتیجہ یہ ہی کہ چاند کی سطح پر چیزون کا بوجھ زمین کی نسبت کئی درجہ کم ہی حالانکہ مقدار مادہ دونون جگہ ایک ہی۔ زمین اور چاند کے درمیان فضا مین ایک ایسا مقام ہی جہان چاند کی کشش زمین کی کشش کے برابر ہی۔ اس مقام پر زمین کے بھاری سے بھاری جسم کا بوجھ کچھ نہین ہوگا۔ اگر ایک بچہ وہان پہنچ سکے تو وہ بھی اسے بآسانی اٹھا سکے گا۔ برعکس اس کے آفتاب کی سطح پر چیزون کا بوجھ اس کی کشش کی افزونی کی بدولت اس قدر زیادہ ہی کہ وہان ہماری طاقت کے انسانون سے بوجھ کے مارے اپنے اعضا بھی نہین ہلائے جا سکین گے۔

اس استدلال سے یہ امر بوضاحت ثابت ہوتا ہی کہ زمین کا استوائی محیط قطبی محیط کی بہ نسبت بڑا ہی یعنی زمین کی شکل سنگترے کی طرح ایک ابلیٹ سفرائیڈ[2] کی سی ہی۔ زمین کی اس مخصوص شکل اور محوری حرکت کے درمیان کسی قسم کا واسطہ دریافت کرنے کے لیے دو آسان تجربے بہت مدد دینگے۔ اگر آپ ربڑ کے ایک باریک مجوف کرہ مثلاً ایک فٹ بال مین کوئی سیال مادہ مثلاً پانی بھر کر اسکے منہ کو لمبی رسی سے باندھ کر ہاتھ سے گھمائین تو وہ کرہ لیمون کی طرح لمبوترا سا ہو جائیگا جسے اصطلاح مین پرولیٹ سفرائیڈ[3] کہتے ہین۔ بالفاظ دیگر اگر ایک نرم کرہ کا گردشی مرکز اس کے باہر واقع ہو تو وہ کرہ ایک ایسا شبہ کرہ بن جاتا ہی جس کی لمبائی لیمون کی طرح اس کی چوڑائی سے زیادہ ہوتی ہی۔ برعکس اسکے اگر گردشی مرکز اس جسم کے مرکز ثقل سے علیحدہ نہ ہو تو وہ جسم گردش کرتے ہوئے سنگترہ کی طرح طول مین چپٹا ہو جاتا ہی۔ تیل کے چند قطرے پانی مین ڈال کر انھین گردش دیجیے۔ آپ دیکھین گے کہ وہ جس محور کے گرد گھوم رہے ہونگے اس کی سمت مین سکڑ جائین گے اور اس کے

---

[1] پنڈولم کی حرکت کے کل قوانین الجبری طریقۂ تحریر کے مطابق اسطرح ظاہر کیے جا سکتے ہین۔ اگر نوبتی وقت ت ثانیہ ہو لمبائی ل انچ ہو اور زمینی کشش کا اسراع ع انچ فی ثانیہ ہو تو نتیجہ ت - $\sqrt{\frac{ل}{ع}}$ کو ٢π ہوگا۔ اس مساوات مین π ایک یونانی لفظ پائی دائرہ کے محیط اور قطر کے تناسب کے لیے اشارہ ہی۔ π کی مقدار بالکل صحیح طور پر معلوم کر لینا ناممکنات مین سے ہی لیکن تخمیناً ٢٢/٧ یا زیادہ صحیح طور پر ٣٫١٤١٦ کے برابر ہے۔

[2] ایک ایسا شبہ کرہ جو لمبائی مین چوڑائی سے کم ہو۔

[3] ایک ایسا شبہ کرہ جس کی لمبائی چوڑائی سے زیادہ ہو۔

مقابل کی سمت مین زیادہ لمبے ہوجائین گے۔ تجربۃً ہم ایک سیدھے سادے
آلہ کے ساتھ محوری حرکت اور قطبی کھنچاؤ کے تعلق کا مطالعہ اسطرح کرسکتے ہین
کہ ایک رسی ر کے ذریعے سے ایک چھوٹا سا پہیہ ب ایک بڑے پہیہ پ
کے دستی د کو پکڑ کر ہلانے سے نہایت تیزی کے ساتھ گھمایا جاسکتا ہے۔

ایک عمودی محور ل ن ج کے گرد تار دن کا بنا ہوا ایک کرہ ل
م ح ہے۔ اب اگر بڑے پہیہ کے ہلانے سے اس نرم کرہ کو گردش دیجائے
تو کرہ کی شکل چپٹی یعنی شکل گ ن ک کیطرح ہوجاتی ہے۔ جتنا تیز اس کرہ کو
گھمایا جائیگا اُتنا ہی زیادہ یہ کرہ چپٹا ہوتا جائیگا۔ لیکن یاد رہے کہ ہر ایک
جسم ایک خاص مقدار سے زیادہ تیز حرکت کے ساتھ نہین گھمایا جاسکتا
اگر ایسا کیا جاے تو وہ ٹوٹ جاتا ہے۔ اگر کمہار اپنے مٹی کے چاک کو زیادہ تیزی
سے گھمائے تو چاک ریزہ ریزہ ہوجاتا ہے۔ ان تجارب کی بنا پر یعنی زمین کے
چپٹا ہونے اور نیز زمین کی حرکت محوری سے ہم ایک نئے نتیجے پر پہنچتے ہین کہ
قدیم زمانے مین زمین نرم تھی یعنی زمانہ حال کیطرح ٹھوس اور سخت نہین تھی
لیکن پیشتر اسکے کہ ہم گذشتہ زمانے مین زمین کے نرم ہونے کو دلائل سے
ثابت کرین یہ دیکھنا چاہیئے کہ موجودہ زمانے مین زمین کی محوری حرکت کا
اثر سطح زمین کے اوپر کیا ہو رہا ہے۔

مذکورہ بالا تجربہ مین آپ نے دیکھا ہے کہ کرہ ل م ح کی شکل محوری گردش
کی وجہ سے گ ن ک کی سی ہوگئی ہے۔ اب فرض کیجیے کہ یہ کرہ چھوٹے
پیمانہ پر زمین کے بالکل مشابہ ہے یعنی اسکی سطح پر کسی طرح سے پانی کی ایک
گہری تہ ہے۔ حرکت کا نتیجہ یہ ہوگا کہ پانی قطبین سے دوڑ کر استوا کے قریب
زیادہ مقدار مین جمع ہوجائیگا۔ پہلے تمام کرہ کے گرد پانی کی یکسان گہری تہ تھی
مگر اب قطبین کے اوپر کم پانی رہ گیا ہے اور
پانی کا زیادہ حصہ شمال اور جنوب کی
سمت سے حرکت کی بدولت استوائی
محیط پر جمع ہوگیا ہے۔ پانی کی حرکت زیادہ
تیز ہوتی ہے لیکن اگر اس کرہ کے اوپر
خاک مٹی بھی رکھی ہو تو وہ آہستہ آہستہ
قطبین سے استوا کی طرف منتقل
ہوجائیگی گویا کہ محوری حرکت کا ایک
نتیجہ یہ ہے کہ پانی اور مٹی قطبین سے استوا کی طرف منتقل ہوگئے ہین۔ بعینہ
یہی حال ہماری زمین کا ہے۔ اگر اس وقت کسی وجہ سے زمین کی محوری
حرکت یک لخت بند ہوجائے تو ایک تحریک منعکسہ فوراً شروع ہوجائے گی۔
جس طرح پانی اور مٹی کے انبار قطبین سے استوا کی طرف منتقل ہوے
تھے اسی طرح استوا سے قطبین کی طرف منتقل ہوجائین۔ کرہ زمین کے
شمالی اور جنوبی حصو مین پانی کا ایک عظیم الشان سیلاب آمے۔ جنوبی
امریکہ، سائبیریا، اور یورپ، پانی کے نیچے غرق ہوجائین، اور استوائی حصون
مین سمندر کا بہت سا حصہ خشک زمین بن جائے۔ وسط امریکہ اور لنکا
سمندر کی سطح سے، میل اونچی سطح مرتفع کی طرح اوپر نکل آئین اور خلیج
بنگال کا بہت سا حصہ بالکل خشک ہوجائے۔ لیکن اس انتہائی مثال
کو چھوڑ کر ہم یہان محوری حرکت کی ذرا سی کمی بیشی کے نتائج پر غور کرتے
ہین۔ ہم نے اپنے ایک مضمون مین یہ ثابت کیا ہے کہ زمین کی حرکت فی الواقع
سُست ہو رہی ہے گویا پہلے زمانون مین دن رات چوبیس گھنٹہ لمبا
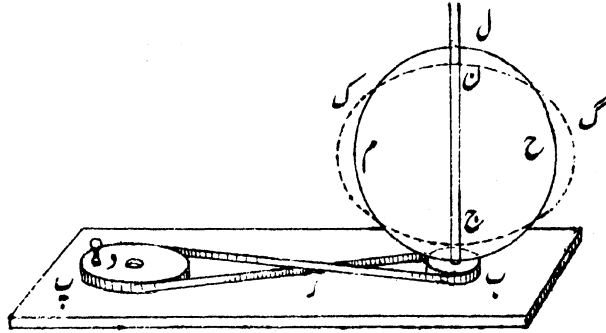
ہونے کے بجائے ۲۴ گھنٹہ بلکہ اس سے بھی کم لمبے ہونگے اور آیندہ زمانون مین ۲۵ گھنٹہ بلکہ اس سے بھی زیادہ لمبے ہونگے۔

آپ نے کبھی اس بات پر بھی غور کیا کہ مختلف پہاڑون مین کیا فرق ہو؟ زمین کی سطح پر کی جھرّیون کا نام پہاڑ ہو لیکن ان جھرّیون کا آغاز کیسے ہوا۔ دو وجوہ بیان کی جاتی ہین۔ پہلی وجہ کا بیان زمین کی اندرونی حرارت کے ذکر مین آجائیگا، لیکن اگر محوری حرکت کے سُست ہونے کو مدنظر رکھا جائے تو دوسری وجہ سمجھ مین آسکتی ہو۔ عالمانِ ارضیات کا قیاس ہو کہ بندھیاچل پہاڑ کوہ ہمالیہ کے سلسلے سے زیادہ پُرانا ہو۔ اس پر تعجب نہ کرنا چاہیے کیونکہ ان پہاڑون کی ساخت دو جُداگانہ طریقون سے ہوئی ہو۔ جن مین سے ایک کا عمل دوسرے سے بہت پیچھے شروع ہوا ہو۔ اندازہ لگایا گیا ہو کہ آج سے تیس کروڑ برس پہلے زمین کی ایک گردش ۲۴ کے بجائے ۲۳ گھنٹہ مین ختم ہوتی تھی۔ آپ اوپر کے تجربونمین دیکھ چکے ہین کہ گردش کی تیزی کے ساتھ قطبی اور استوائی قطر کا فرق بڑھتا جاتا ہو جس کا مطلب زمین کی حالت مین یہ ہو کہ استوا کے گرد پانی کی تہ قطبین کی نسبت گہری ہوتی جاتی ہو جب زمین کی گردش ۲۳ گھنٹہ مین ہوتی تھی تو پانی کی سطح استوا کے گرد اتنی اونچی تھی کہ بندھیاچل کا بہت سا حصہ پانی کے نیچے غرق تھا۔ آج سے تیس کروڑ برس پہلے کوئی بندھیاچل نہین تھا، اس لیے بندھیاچل کی عمر زیادہ سے زیادہ تیس کروڑ برس ہو، اور ہمالیہ وغیرہ کی اس سے بھی کم ہو۔ زمین کی محوری حرکت مین نہ صرف ایک گھنٹہ کی کمی سے بلکہ ایک منٹ اور اس سے بھی کم مقدار کی کمی سے ایسے حیرت انگیز نتائج مرتب ہوتے ہین کہ عقل دنگ رہ جاتی ہو۔ آج سے تقریبًا سو صدی پہلے زمین کی ایک گردش ۲۳ گھنٹہ ۵۹ منٹ مین ختم ہوتی تھی۔ اُس وقت کلکتہ سطح سمندر کے نیچے تھا اور اس سے پہلے جبکہ ایک گردش ۲۳ گھنٹہ ۵۰ منٹ مین ختم ہوتی تھی الہ آباد ساحل سمندر پر واقع تھا۔

دُنیا مین ہم دو قسم کی تبدیلیان دیکھتے ہین۔ ایک تو نوبتی جو ایک عرصہ تک ایک سمت مین بڑھ کر پھر اُتنے ہی عرصہ تک گھٹتی ہین اور جب پہلے کی سی حالت دوبارہ ہوتی ہو تو پھر ایک نیا دور شروع ہوتا ہو۔ موسمون کی تبدیلی ایک نوبتی تبدیلی ہے۔ اسی طرح زمین کے محور کی سمت بدلتی رہتی ہو لیکن یہ تبدیلی ہمیشہ ایک ہی سمت مین نہین ہوتی بلکہ ۲۶ ہزار برس کے بعد زمین کے محور کی سمت پھر وہی ہوجاتی ہو اور ایک نیا دور شروع ہوتا ہو۔ دوسری قسم کی تبدیلیان وہ ہین جو ہمیشہ بغیر کسی قسم کے انقطاع کے قدیم سے لیکر آج تک ایک ہی سمت مین بڑھتی یا گھٹتی چلی آئی ہین اور جو آئندہ بھی اسی نہج پر جاری رہین گی۔ ایسی تبدیلیون کے نتائج نہایت ہی اعلیٰ درجے کے مہتم بالشان ہوتے ہین۔ ان کی دو مثالین ہمارے مضمون کی جان ہین جنمین سے ایک محوری حرکت کا سُست ہونا ہو۔ جہانتک آپ کا خیال زمانہ ماضی مین پیچھے کی طرف جا سکتا ہو، اسے دوڑایئے اور چشم تصور سے دیکھئے کہ نہ صرف زمین کی ایک گردش آج سے ۳۰ کروڑ برس پہلے ۲۳ گھنٹہ مین ختم ہوتی تھی بلکہ اس سے بہت پہلے ایک زمانہ ہوگا جب کہ زمین نہایت تیزی کے ساتھ چھ پانچ چار گھنٹون مین ایک گردش ختم کرتی ہوگی، لیکن زمین اتنی تیزی کے ساتھ گھوم رہی ہو تو ہمین ایک دوسرے امر کی طرف متوجہ ہونا لازم ہو۔ زمین بے انتہا تیزی کے ساتھ نہین گھوم سکتی تھی اس لیے کہ اگر ایک مخصوص حد سے تجاوز کرتی تو یہ ریزہ ریزہ ہوجاتی یا کم از کم دو برابر حصون مین منقسم ہوجاتی۔ لہٰذا ہم اپنے چشم تصور کی حدنگاہ وہ قدیم زمانہ[1] مقرر کرتے ہین جب کہ

---

[1] زمانہ ماضی کا ذکر کرتے ہوے ہم اس مضمون مین کروڑون برس کا ذکر اس طرح کرتے رہے ہین جس طرح روزمرہ کی زندگی مین دنون اور مہینون کا شمار ہوتا ہو۔ لیکن غور طلب بات یہ ہو کہ انسان جس کی عمر ساٹھ برس سے زائد نہین ہوتی اتنے لمبے عرصے کا اندازہ آسانی سے نہین لگا سکتا بلکہ شروع مین سرے سے ان کا انکار کردیتا ہو۔ میزانِ ہستی مین ادنیٰ ترین جانور جن کی حیات مستعار گھنٹون اور دنون سے تجاوز نہین ہوتی ان کے لیے انسانی زندگی اسی تناسب سے بڑی ہو جس تناسب سے ارضیات کے طبقات انسان کے لیے بڑے ہین جس وقت یہ کہا جاتا ہو کہ زمین کا بعد سورج سے ۹ کروڑ میل ہو تو انسانی عقل اس فاصلے کے[2]

زمین اپنی انتہائی تیزی کے ساتھ گھوم رہی ہوگی۔ اسوقت سطح زمین کی حالت کیا تھی؟ چاند کہان تھا؟ ان سوالات کا جواب ہم تھوڑی کے بعد دین گے۔ سردست ہم زمین کی اندرونی حرارت کے مسئلہ کو حل کرنے کی کوشش کرین گے۔

ہم ذکر کر رہے تھے کہ ان تبدیلیون مین سے جن مین واقعات ہمیشہ ایک ہی طرح پر ہوتے چلے جاتے ہین دو ہمارے مضمون کی جان ہین۔ محوری حرکت کے سست ہونے کا ذکر ہم ابھی کر چکے ہین۔ دوسری تبدیلی گرم اجسام کے ٹھنڈا ہونے سے متعلق ہی یعنی زمین کی ذاتی حرارت کا تدریجی لیکن غیر متناہی نقصان۔ آپ لوہے کا ایک گرم گولہ ہوا مین رکھین۔ تھوڑی دیر کے بعد اس کا درجۂ حرارت اردگرد کی ہوا کے برابر ہوجاتا ہی تو گویا اسکی گرمی گرد و پیش کی چیزون مین منتقل ہوگئی ہی۔ حرارت کے اس طریقۂ انتقال کو اصطلاح مین شعاع کہتے ہین جس سے مراد یہ ہی کہ گرمی کی شعاعین گرم بدن سے نکلتے رہنے کی وجہ سے گرم بدن کی گرمی ضائع ہوجاتی ہی۔ اگر آپ لوہے کے گرم گولے کے گرد فلالین کا ٹکڑا یا کوئی اور چیز لپیٹ دین جیسا عام طور پر چاء کی کیتلی پر لپیٹ دیا جاتا ہی تو اس کا درجہ حرارت آہستہ آہستہ کم ہوگا۔ لیکن قابل غور صرف یہ بات ہی کہ نقصان آہستہ ہو یا جلدی آخر شعاع کا اثر ظاہر ہو کے رہتا ہی۔ بے شمار مشاہدات کی بناء پر یہ امر مسلمہ ہی کہ زمین بھی آہستہ آہستہ شعاع کے عمل سے ٹھنڈی ہورہی ہی۔ میرا مطلب اس گرمی کی طرف نہین ہی جو ہمین سورج ہر لحظہ پہنچاتا رہتا ہی بلکہ ہم یہان زمین کی ذاتی گرمی کا ذکر کر رہے ہین۔ یہ سچ ہی کہ اگر آج سورج کی گرمی ہم سے چھین لیجائے تو سطح زمین کا درجہ حرارت وہی ہوگا جو فضائے بسیط کا ہی یعنی پانی کے درجۂ انجماد سے تقریباً تین سو درجہ نیچے۔ لیکن سطح زمین کے نیچے زمین کا درجہ حرارت جون جون دور چلے جائین بڑھتا چلا جاتا ہی۔ بعض مقامات پر سوا سو فٹ کی گہرائی کے لیے ایک درجۂ فارن ہیٹ کی زیادتی ہوتی ہی لیکن بعض مقامات ایسے بھی ہین جہان ایک درجۂ فارن ہیٹ کی زیادتی صرف ۳۰ یا ۴۰ فٹ کی گہرائی تک ہوجاتی ہی۔ زمین کی اندرونی حرارت کے متعلق سب سے زیادہ دلچسپ بات یہ ہی کہ فی الحال جن جن مقامات پر جو مشاہدات زمینی حرارت کے متعلق کیئے گئے ہین وہان زیادہ سے زیادہ گہرائی تک حرارت کی زیادتی کا پتہ چلتا ہی۔ سطح کے نزدیک سورج کی گرمی زمین کی ذاتی گرمی کے اثر کو ایک حد تک چھپا دیتی ہی کیونکہ دن کے وقت گرمی کی ایک لہر سطح سے نیچے کی طرف جاتی ہی اور رات کو اس گرمی کا بہت سا حصہ شعاع کے عمل سے زائل ہوجاتا ہی۔ اسی طرح روزانہ لہر کے علاوہ گرمی کی ایک سالانہ لہر زمین کے اندر سرایت کرتی ہی کیونکہ موسم گرما مین دن رات سے بڑے ہوتے ہین اور سردیون مین اس کے برعکس گرمی کی روزانہ لہر کا اثر ۳ یا ۴ فٹ سے زیادہ گہرائی تک نہین ہوتا اسی طرح سالانہ لہر کا اثر تقریباً ۵۰ فٹ تک ہوتا ہی چنانچہ مقیاس الحرارت

(حاشیہ بقیہ صفحۂ گذشتہ) اندازہ سے عاجز رہ جاتی ہی لیکن اس سے بھی زیادہ جسوقت ہم دریافت کرتے ہین کہ نظام شمسی سے قریب ترین ستارہ کا فاصلہ اتنا زیادہ ہی کہ نور کی لہرین باوجود اتنی تیز رفتاری کے (نور کی رفتار ثانیہ تقریباً ایک لاکھ پچاس ہزار میل ہی) اس ستارے سے ہمارے پاس تین چار سال مین پہنچتی ہی تو یہ فاصلہ جس کے ظاہر کرنے سے ہماری گنتی بالکل قاصر ہی براہ راست کسی طرح ذہن نشین نہین ہوسکتا۔ لیکن اگر آپ ایک ایسے انسان کا تصور کرین جس کا قد معمولی انسانون کے قد سے اتنا ہی بڑا ہو جتنا ہمارا قد ان چھوٹے چھوٹے کیڑون سے بڑا ہوتا ہے جن کے باعث مختلف بیماریان شروع ہوتی ہین اور جو ہمین بمشکل خوردبین کی مدد سے دکھائی دیسکتے ہین تو اس انسان کے لیے یہ فاصلہ چندان تعجب کا موجب نہ ہوگا۔ نظام شمسی کے مختلف افراد کا دورہ اس کے لیے گھنٹون اور دنون کی سیر و سیاحت سے زیادہ وقعت نہ رکھے گا۔ ہمارا مطلب اس مثال کے بیان سے صرف یہ ہی کہ جب قدیم زمانے کے بہت ہی پہلے کے طبقات کا ذکر کیا جائے تو اُسے اپنی عمر سے مقابلہ کرکے ناممکن خیال نہین کرنا چاہیئے۔ ایک اور بات جس کی طرف ناظرین کی توجہ دلانا یہان ضروری معلوم ہوتا وہ یہ ہی کہ جب اتنی طویل مدت کا ذکر ہوتا ہی جسکی اکائی کروڑون برس ہو تو اس مین اندازہ ہمیشہ تخمینہ کے طور پر لگایا جاتا ہی۔

کے ذریعے سے دیکھا جاتا ہو کہ ۳-۴ فٹ تک زمین کے درجۂ حرارت مین روزانہ تبدیلی ہوتی ہو اور ۵۰-۶۰ فٹ تک سالانہ تبدیلی ہوتی ہو لیکن ۶۰ فٹ کے فاصلے سے پرے زمین کا درجۂ حرارت بالکل یکسان ہوتا ہو۔ ہم ان اُمور کا یہان اس لیے ذکر کرتے ہین کہ اِن کے مقابلے سے زمین کے اندر سے باہر آنے والی گرمی کی لہرون کے متعلق کچھ رائے زنی کی جاسکے۔ سورج کی سخت سے سخت گرمی کو روکنے کے لیئے زمین کی ایک چھوٹی سی تہ کافی ہو۔ اسیطرح زمین کی اندرونی حرارت نہایت قلیل مقدار مین سطح پر پہنچتی ہو اور شعاع کے عمل سے فضائے بسیط مین ضائع ہو جاتی ہو۔ لارڈ کیلون نے زمین کے موجودہ نقصان حرارت کے معیار سے زمین کی عمر کا اندازہ لگایا ہو۔ اس کا طریِ عمل گہرائی کے ساتھ درجۂ حرارت کی زیادتی کو معلوم کرنے پر مبنی تھا۔ اگر ایک پتھر کی سل جسکی موٹائی اور رقبہ ہمین معلوم ہو کھولتے ہوئے پانی کے برتن کے منھ پر رکھ دیجاے تو بیرونی ہوا کا درجۂ حرارت جاننے کے بعد ہم حرارت کی کل مقدار جو فی ثانیہ اِس سل مین سے باہر کی طرف گذرتی ہو معلوم کرلین گے۔ اِسی طرح سطح زمین سے حرارت کے مجموعی سالانہ نقصان کا اندازہ اندر اور باہر کے درجۂ حرارت کی تدریجی تبدیلی معلوم کرنے کے بعد لگایا گیا ہو اور اس اندازہ کی بناء پر اور دیگر معلومات کی مدد سے لارڈ کیلون نے یہ بات ثابت کی ہو کہ زمین کی عمر ۲۰ کروڑ سال سے زائد نہین ہو۔ زمین کی عمر سے مُراد اُس زمانہ کا بعد ہو جبکہ زمین کی سطح پر ایک ٹھوس تہ بننی شروع ہوگئی تھی۔ عالمان ارضیات کا اندازہ زمین کی عمر کے متعلق لارڈ کیلون کے اندازہ سے بہت بڑا ہو لیکن اِس موضوع پر مفصل بحث کرنا ہمارے مضمون سے خارج ہے۔

یہ اعتراض کیا جاسکتا ہو کہ انسان نے زمین کے اندر کی حالت کا وسیع مطالعہ نہین کیا۔ زیادہ سے زیادہ تین میل کی گہرائی تک ہماری رسائی ہوئی ہو اور یہ گہرائی ۴۰۰۰ میل کے مقابلے مین صفر کا حکم رکھتی ہو۔ لیکن اِس اعتراض کا جواب قدرت خود دیتی ہو۔ زمین کے اندر سے آتش فشان مادّہ کا اخراج خود اس بات کی تصدیق کرتا ہو کہ زمین کی اندرونی حرارت کا درجہ اسقدر بڑھا ہوا ہو کہ وہان سطح زمین پر کی سخت ٹھوس چیزین بھی مائع اور سیال حالت مین ہین۔ سطح زمین کے تزلزل کا باعث زمین کی اندرونی حرارت ہو اور جون جون اندر کی گرمی کم ہوتی جاتی ہو زمین کی آتش فشانی بھی کم ہوتی جاتی ہو[1]۔ ۲۷۔ اگست ۱۸۸۳ء کو کراکٹو مین ایک غضب کی آتش فشانی ہوئی تھی جس سے ۳۶ ہزار نفوس سمندر مین بہ گئے تھے اور کئی دن تک سمندر مین اور کرۂ ہوائی مین تلاطم رہا تھا۔ چھوٹے چھوٹے زلزلے آئے دن آتے رہتے ہین۔ اِن سب باتون سے ہم صرف ایک ہی نتیجہ نکال سکتے ہین یعنی یہ کہ زمین کے اندر شدّت کی گرمی ہے۔

اب آپ عمل شعاع کے غیر متناہی نتائج پر غور کرین۔ یہ ہو نہین سکتا کہ زمین کے ٹھنڈا ہونے کے متعلق وہ قوانین صحیح نہون جو باقی تمام ٹھنڈا ہونیوالے اجسام پر صادق آتے ہین۔ ہم مانتے ہین کہ فی زمانناً زمین کی اندرونی حرارت کا درجہ نہایت آہستہ آہستہ کم ہو رہا ہو یعنی اتنا آہستہ کہ ہم ایک دو صدیون مین اس کا صحیح اندازہ بھی نہین لگا سکتے لیکن اِس یقینی امر سے انکار بھی نہین ہوسکتا کہ سطح زمین سے متواتر زمین کی اندرونی حرارت ضائع ہو رہی ہو۔ اگر آپ یہ امر مدّ نظر رکھین کہ سخت سے سخت گرم آگ کی بھٹی کی حرارت ایک دو فٹ موٹی دیوار روک لیتی ہو تو آپ کو زمین کی اندرونی حرارت اور اس کے نہایت آہستہ تدریجی نقصان کا اندازہ اس بات سے

---

[1] خیال کیا جاتا ہو کہ کسی زمانے مین چاند کی سطح پر حد درجے کی شدید آتش فشانی ہوتی تھی اور اس قیاس کے ثبوت مین سطح چاند پر آتش فشان پہاڑون کے بڑے بڑے منھ (کریٹر Crater) پیش کیئے جاتے ہین لیکن چاند کی حرارت بوجہ زمین سے چھوٹا ہونے کے بہت جلدی ضائع ہوگئی ہو اور اب آتش فشانی بھی بند ہو۔ زمین کی اندرونی حرارت کے کم ہونے کا ایک اور نتیجہ یہ ہو کہ زمین کا اندرونی حجم کم ہوتا ہو (ایک عام قانون ہو اجسام ٹھنڈا ہونے سے سکڑتے ہین) اور بیرونی سطح مین جھریان پڑ جاتی ہین کیونکہ وہ حجم پہلے سے کم پڑ کر ڈھیلی رہجاتی ہو۔ بہت سے پہاڑون کی جھری دار بناوٹ اِسی قیاس کی مصدق ہو۔

ہوجائیگا کہ زمین کی اندرونی حرارت کے روکنے کے لیے اس طبقہ مین ایک بہت موٹی ٹھوس تہ مٹی اور چٹانون کی ہو- بہرکیف حرارت ضائع ہورہی ہو خواہ ہم اسکا صحیح اندازہ نہ لگاسکین لیکن یہ یقینی ہو کہ آج حرارت کی مقدار کل سے کم ہو اور کل پرسون سے کم تھی- فرض کیجئے کہ فی سال حرارت کا نقصان صرف اسقدر ہوتا ہو کہ زمین کا اندرونی درجۂ حرارت ایک سال مین ایک سنٹی گریڈ کا دس ہزاروان حصہ کم ہوجاتا ہو- اگرچہ ایسا خفیف فرق ہمارے نازک سے نازک آلات کا مُنھ موڑ دیگا لیکن جب نقصان ہزارون لاکھون برس اسی نہج پر ہوتا رہتا ہو تو اسکا اثر محسوس ہونے لگتا ہو- آج سے دس ہزار برس قبل زمین کا درجۂ حرارت ایک درجہ سنٹی گریڈ زیادہ ہوگا اور ایک کروڑ برس پہلے اسی حساب سے آج سے ہزار درجہ سنٹی گریڈ زیادہ ہوگا- اگر خیال کو وسعت دیجائے تو قدیم زمانہ مین زمین کا درجۂ حرارت اسقدر زیادہ تھا کہ اس کی سطح پر کی چیزین بھی سب پگھلی ہوئی حالت مین تھین اُسوقت سمندر کا نام ونشان بھی نہ تھا کیونکہ تمام پانی بخارات کی شکل مین تھا- پھر ہم اُن طبقات کا خیال کرسکتے ہین جب کہ زمین کے جسم کی تمام اشیا مائع اور سیال ہونے کے بجائے درجۂ حرارت کی زیادتی کی وجہ سے بخارات اور گیس کی حالت مین تھین- لیکن یہان ہمارے خیال کی وسعت کو روکنے والی ایک دوسری دلیل موجود ہو- ہم اوپر دیکھ چکے ہین کہ جون جون ہم وقت کے سمندر مین پیچھے ہٹتے جاتے ہین زمین کی محوری حرکت تیز ہوتی جاتی ہو اور ہم یہ بھی دیکھ چکے ہین کہ اگر اس کی رفتار ایک خاص مقدار سے متجاوز ہوجائے تو زمین کی کشش اپنے اجزا کو ایک دوسرے کے ساتھ پیوستگی کی حالت مین نہین رکھ سکتی- لہذا ان دونون استدلالات کی تطبیق سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہین کہ جب زمین کی محوری حرکت اتنی تیز تھی کہ دن رات صرف ۳ یا ۴ گھنٹہ کے تھے تو زمین ایک سیال کرہ تھی جس کی سطح پر اُبلتے ہوئے اور پگھلے ہوئے معدنیات اور چٹانین تھین- ہمین اس سوال کا حل مل گیا کہ زمین کا قطبی قطر استوائی قطر سے کیون چھوٹا ہو- اگر زمین کسی قدیم زمانہ مین سیال نہ ہوتی بلکہ ہمیشہ سے آج کیطرح ٹھوس ہوتی تو اسکی شکل کروی ہوتی- نظام شمسی مین زمین کی شکل کے ساتھ سب سے زیادہ مشابہت مشتری (Jupiter) کو ہو جو زمین سے تیرہ سو گنا بڑا ہو لیکن تعجب کی بات ہو کہ اسکی محوری گردش صرف دس گھنٹہ مین پوری ہوتی ہو- اگر بڑی دوربین مین دیکھا جائے تو مشتری صاف طور پر ایک شبہ کرہ کے مشابہ معلوم ہوتا ہو کیونکہ اسکے قطبی اور استوائی قطرون مین بہت نمایان فرق ہو- مشتری کی سطح ابھی ٹھوس نہین بلکہ سیال ہو اور یہ ایک مزید تصدیق اس امر کی ہو کہ زمین بھی کسی زمانے مین مشتری کی موجودہ حالت مین تھی- چونکہ مشتری بہت بڑا ہو اس لیے اسکی اندرونی حرارت ابھی ضائع نہین ہوئی- گویا ہم زمین کی گذشتہ تاریخ مشتری کی سطح کے مطالعہ سے معلوم کرسکتے ہین-

اس سے پہلے مضمون مین زمین کی حرکت کے سُست ہونے کے اسباب بیان کرتے ہوئے ہم نے مدوجزر پر تفصیلی بحث کی تھی- ہم نے بتایا تھا کہ نظام ارض وقمر مین مدوجزر کی کیا اہمیت ہو- مدوجزر کے وسیع علمی مطالعہ سے ایک حیرت انگیز نتیجہ یہ نکلتا ہو کہ زمین کے دن، رات اور مہینے بڑھ رہے ہین- ہم اس موضوع پر مفصل بحث نہین کرسکتے لیکن جن حضرات کو مزید معلومات بہم پہنچانے کی خواہش ہو اُن کے لیے سر رابرٹ بال کی چھوٹی سی کتاب ٹائم اینڈ ٹائیڈ (TIME & TIDE) بہتر معاون ہوگی- یہ کتاب اس قابل ہو کہ اس کا ترجمہ اُردو زبان مین کیا جائے لیکن اگر ترجمہ نہ ہوسکے تو کم از کم اس کے اوپر ایک بسیط تبصرہ لکھنے کی اشد ضرورت ہو- ہم نے مذکورہ بالا مضمون مین صرف دن رات بڑھنے کے متعلق بحث کی تھی اور مہینے کے بڑھنے کی بحث کو پس انداز کردیا تھا- ہم اس مضمون مین بھی اس سے زیادہ اور کچھ لکھنا نہین چاہتے کہ اس طویل بحث کے لیے ایک جداگانہ مفصل مضمون درکار ہو اور اس لیے اب ہم زمین کی محوری حرکت کے رفتہ رفتہ کم ہونے کے نتائج پر غور کرتے ہین-

اگر دن رات کے ساتھ مہینہ بھی بڑھ رہا ہو تو اس سے چاند کے بُعد کے
متعلق یہ حیرت انگیز نتیجہ نکلتا ہو کہ چاند رفتہ رفتہ زمین سے دور ہٹ رہا
ہو یعنی اگر موجودہ زمانہ مین چاند کا فاصلہ ۲ لاکھ ۴۰ ہزار میل ہو تو کسی گزشتہ
زمانہ مین دو لاکھ ہوگا۔ وعلیٰ ہذا القیاس۔ وہی مدوجزر کی طاقت جو زمین
کی محوری حرکت سست کر رہی ہو، چاند کی حرکت بھی سست کر رہی ہو
چاند زمین کے گرد گھومتا ہو۔ اگر زمین اسے اپنی طرف نہ کھینچتی تو حرکت کے
پہلے قانون کے مطابق یہ ایک خط مستقیم مین حرکت کرتا چلا جاتا لیکن ہر لحظہ
زمین کی کشش اسے اپنے مرکز کی طرف کھینچ رہی ہو اور اس لیے چاند ایک
بین بین راستے پر چل رہا ہو[1]۔ اگر یہ اس راستے سے ہٹ کر زمین کے نزدیک
آجائے تو اسکی دوری حرکت کی استقامت کے لیے لازمی ہو کہ اسکی رفتار
تیز ہو جائے کیونکہ جتنا تیز یہ چلے گا اتنی ہی کم زمین کی کشش اس پر غالب
آئیگی۔ جون جون چاند زمین سے دور ہوتا جاتا ہو مہینے کی لمبائی دو وجوہ
سے بڑھتی ہو۔ ایک تو راستے کی زیادتی اور دوسرے رفتار کی سستی۔
مختصر نتیجہ یہ ہو کہ ہر بعد کے لیے چاند ایک خاص رفتار کے ساتھ زمین کے
گرد گھومتا ہو۔ جب چاند زمین سے صرف اسی ہزار میل کے فاصلے پر ہوگا
تو اُسوقت سمندر کا مدوجزر نہایت شدت سے ہوتا ہوگا۔ چڑھاو کے وقت
سمندر کی سطح ۱۰۰ فٹ اونچی ہوتی ہوگی حالانکہ زمانۂ موجودہ مین اسکی
بلندی ۲۰-۳۰ فٹ سے زیادہ ہے۔ جزائر انگلستان سمندر سے صرف
۵۰ فٹ بلند ہین۔ اس حالت مین یہ تمام خطۂ زمین پانی مین غرق رہتا
ہوگا۔ اور پھر یہ خیال کیجیے کہ اس زمانے مین دن رات بھی چھوٹے تھے اس لیے
پانی کا اُتار چڑھاؤ اور بھی جلدی جلدی ہوتا ہوگا۔ ان تمام مقدمات کا
موازنہ کرنے سے یہ نتیجہ نکلتا ہو کہ اُسوقت مدوجزر کا اثر زمین کی محوری حرکت
کے سست کرنے مین اب سے بہت زیادہ ہوگا۔

اب اگر اس دور بینی کو اور بھی زیادہ وسعت دین تو اُس زمانہ مین جبکہ
دن رات صرف ۳-۴ گھنٹہ کا ہوگا چاند زمین کے بہت ہی قریب ہوگا اور
مہینہ تقریباً دن کے برابر ہوگا۔ جون جون ہم زمانۂ قدیم مین اور دور چلے
جاتے ہین تو مہینہ چھوٹا ہوتا جاتا ہو حتی کہ وہ صرف تین گھنٹہ کا رہ جاتا ہو یعنی
چاند زمین کے گرد اتنی حرکت کرتا ہو کہ گردش ۳ گھنٹہ مین پوری ہو جاتی ہو۔
صحیح طور پر اندازہ لگایا جا سکتا ہو کہ ایسی حالت مین چاند کی رفتار کیا ہوگی
آخر مین ہم اس حیرت انگیز نتیجہ پر پہنچتے ہین کہ چاند بالکل زمین کے ساتھ لگا ہوا تھا
اور دونون ایک ہی رفتار کے ساتھ حرکت کر رہے تھے یعنی چاند فی الاصل زمین
کا ایک حصہ تھا اور جب کہ زمین کی محوری حرکت اتنی تیز تھی کہ دن رات
تین گھنٹہ کے ہوتے تھے تو زمین کا ایک حصہ کسی حادثہ کی وجہ سے زمین سے
علیحدہ ہو گیا اور ہمارا چاند کہلایا۔

شروع مین جب چاند زمین سے علیحدہ ہوا تو چاند اور زمین دونون سیال
اور آگ سے زیادہ گرم تھے۔ چاند کی علیحدگی کے بعد فی الفور مدوجزر کا وہ لمبا
سلسلہ شروع ہوا جس سے رفتہ رفتہ چاند زمین سے دور اور دن رات
لمبے ہوتے گئے۔ جب چاند زمین سے بالکل قریب تھا اور زمین کی تمام سطح
سیال ادون کی تلاطم گاہ بنی ہوئی تھی اُسوقت مدوجزر نہایت شد ومد سے
ہوتے ہونگے اور ان کا اثر بھی اسی تناسب سے زیادہ ہوتا ہوگا۔ مدوجزر کا
اثر چاند پر یہ ہوا کہ چاند کی محوری گردش کا نوبتی وقت یعنی چاند کا دن چاند
کی دوری گردش کے نوبتی وقت کے برابر ہو گیا ہو اور اب ہم صرف چاند
کا ایک رُخ دیکھتے ہین لیکن چاند متواتر اپنی کشش سے زمین کی محوری حرکت
سست کر رہا ہو۔ اور اگر ہم گذشتہ سے آئندہ کروڑون برس گذرنے کے بعد
کا منظر اپنی آنکھون کے سامنے لاسکین تو ہم زمین کا دن اور مہینہ برابر یکسان
مدت کا پائینگے۔ جب یہ دن آئیگا ہمارا دن ۱۴۰۰ گھنٹہ یعنی اسوقت کے
۵۸ دن کے برابر لمبا ہوگا اور مہینہ بھی اسی تناسب سے لمبا ہوگا۔ اُسوقت
چاند کی طرح زمین بھی چاند کی طرف ہمیشہ ایک ہی رُخ کرے گی اور دونون

---

[1] اگر چاند کی خط مستقیمی حرکت بند ہو جائے تو یہ فوراً زمین کی طرف گرنا شروع ہو جائے اور
اپنے موجودہ فاصلہ سے ۴-۵ دن مین زمین سے ٹکرائے۔

اِسطرح حرکت کرینگے جسطرح دو جسم ایک لکڑی کے دونون سرون پر باندھ کر گھمائے جاتے ہین۔ لیکن یہ بھی آخری منزل نہ ہوگی۔

ہم ذکر کر چکے ہین کہ سورج کی کشش سے بھی مد و جزر پیدا ہوتے ہین لیکن ان کی مقدار چاند کے مد و جزر سے نصف کے قریب کم ہوتی ہی۔ لیکن یہ شمسی مدّ و جزر خواہ کتنے ہی کم ہون اِن کا اثر ہمیشہ ایک ہی سمت مین عمل کرتا ہی پس نتیجہ یہ ہوگا کہ دن بڑھتے بڑھتے سال کے برابر ہوتا جائیگا یعنی دِن مہینے سے لمبا ہو جائیگا۔ بالفاظ دیگر چاند ایک دن رات مین ایک سے زیادہ دفعہ طلوع کیا کریگا اور ایک ہی دن رات مین ہلال سے بدر بنکر پھر ہلال کی شکل مین نمودار ہوگا۔ یہ آخری حالت نہایت خطرناک ہوگی۔ چاند رفتہ رفتہ جس طرح زمین سے دور ہٹتا گیا تھا اسی طرح زمین کیطرف چکر کاٹتا ہوا آئے گا (دیکھو شکل[١]) اور بالآخر نہایت زور کے ساتھ زمین کے اوپر گر پڑیگا اور اگر اس سے پہلے کسی اور طریقہ سے زمین کا خاتمہ نہ ہو چکا ہو تو شاید دُنیا کی موت اسی طریقے سے ہو۔ گویا زمین کا بچہ جس سے اَب زمین متمتع ہو رہی ہی انجام کار زمین کی تباہی کا باعث ہوگا۔
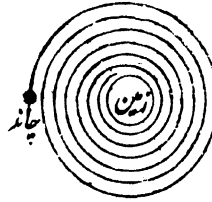
جو مختصر سا خاکہ ہم نے زمین کی گذشتہ اور آئندہ تاریخ کا ناظرین کے سامنے پیش کیا ہی وہ اِس قدر نادر اور عجیب ہی کہ طبیعت اس کے ماننے سے گریزان ہوتی ہی لیکن نظام شمسی ہی مین یہ آخری نظارہ مریخ (Mars) کی حالت مین ہمارے پیشِ نظر ہی۔ مریخ کے پانچ چاند دریافت ہو چکے مین لیکن اس کا ایک چاند اس قدر عجیب و غریب حرکتین کرتا ہی کہ اگر مذکورہ بالا نتائج ہمارے پیشِ نظر نہ ہون تو شاید ہم اُنکی تشریح نہ کر سکتے۔ مریخ کی محوری گردش تقریباً ۲۴ گھنٹہ مین ختم ہوتی ہے لیکن یہ چاند ایک دن رات مین مریخ کے گرد تین گردشین ختم کرتا ہی گویا مریخ کا مہینہ صرف ۸ گھنٹہ کا ہی۔ چاند کا فاصلہ آہستہ آہستہ مریخ کی سطح سے کم ہو رہا ہی اور اب صرف ۴ ہزار میل باقی رہ گیا ہی۔ مریخ کا یہ چاند ہمارے چاند کے مقابلہ مین بالکل چھوٹا سا جسم ہی۔ اسکا قطر ۲۰-۳۰ میل ہی اور اس کا وزن صرف ۴۰ بلین ٹن ہی لیکن جب یہ مریخ کی سطح سے ٹکرائے گا تو اس کی رفتار ۸ ہزار میل فی گھنٹہ ہوگی۔ اور جو عظیم الشان نتائج اس تصادم کا نتیجہ ہونگے وہ تشریح کے محتاج نہین ہین۔ فی الحال اس حادثہ کے وقت کی تعین نہین کی گئی۔

جو نظریہ ہم نے نظام ارض و قمر کی مثال لیکر یہان بیان کیا ہے وہ تمام کائنات کے متعلق صحیح ہی۔ اس کا مختصر اصطلاحی نام ارتقاے مد و جزری (Tidal Evolution) ہے۔

زمین کی محوری حرکت کے بعض اہم نتائج ایسے ہین جن کا ذکر ہم اس مضمون مین نہین کر سکتے۔ مثلاً خط استوائی کے گرد مادہ کی زائد مقدار ہتنزاز محور الارض (Precession & Notation of the Earth's axis) کی ذمہ دار ہے۔ چاند اور سورج کی کشش زمین کی اس بے قاعدہ مقدار مادہ کو کھینچ کر زمین کے محور کی سمت بدلتی ہی۔

زمین کی محوری حرکت کے بعض اہم نتائج جن پر ہم نے اس مضمون مین بحث کی ہی مختصر الفاظ مین یہ ہین:۔ محوری حرکت کا یہ نتیجہ ہی کہ فی الحال دن اور مہینہ دونون بڑھ رہے ہین۔ چاند زمین سے دور ہٹ رہا ہی اور زمین کا استوائی قطر قطبی قطر سے ۲۶ میل زیادہ لمبا ہی۔ جب یہ محوری حرکت ایک منٹ فی دن بھی سُست ہو جائے گی تو شمالی اور جنوبی حصہ زمین مین بہت سی خشک زمین پانی کے نیچے آجائیگی اور منطقہ حارّہ مین خشکی کا حصّہ بڑھ جائے گا۔

ہم زمین کی اندرونی حرارت کے مطالعہ سے یہ نتیجہ نکالتے ہین کہ کسی زمانے مین زمین سیال مادہ کا ایک کرہ تھی اور اس زمانے مین چاند زمین کے ساتھ لگا ہوا تھا۔

فیروزالدین مُراد

[١] شکل ۱ مین دکھایا گیا ہی کہ کس طرح چاند زمین سے دور ہٹ کر پھر نزدیک آتا جائے گا۔ ایسی حرکت کو حرکت مغزلی یعنی اسپارل موشن Spiral Motion کہتے ہین۔

فلسفۂ تربیت

مصنفۂ اسپنسر پر ریویو

کسی ایسے موضوع پر، جو عملی و نظری دونوں حیثیات رکھتا ہو، (مثلاً اخلاق یا سیاست) بحث کرنے کی دو صورتیں ہوسکتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ اُس مسئلہ کی تھیوری، اُس مسئلہ کی ماہیت، اُس مسئلہ کا فلسفہ بیان کردیا جائے۔ دوسرے یہ کہ اُسکو برتنے کے عملی اصول، اُسکو عمل میں لانے کے وسائل وطریقے بتائے جائیں۔ فلسفی عموماً پہلی شق اختیار کرتے ہیں اور مبلغ و واعظ دوسری۔ مثلاً اخلاق کے متعلق جب ایک فلسفی یک ارسطو، قلم اُٹھاتا ہی تو اسکے پیش نظر صرف اس قسم کے مسائل ہوتے ہیں کہ اخلاق کی تعریف کیا ہی؟ افعال کے حسن و قبح کا کیا معیار ہی؟ انسان مجبور ہی یا مختار؟ انسان کے اوپر ذمہ داری نیت کی بنا پر ہوتی ہی یا نتائج افعال پر؟ بخلاف اسکے ایک واعظ، ایک سعدی، جب اسی موضوع پر کچھ کہنا چاہتا ہی، تو اُسکو صرف ان عملی سوالات سے بحث ہوتی ہی کہ فلاں فلاں افعال نیک ہیں فلاں بد، افعال نیک کے اختیار کی یہ تدابیر ہیں اور افعال ذمیمہ کے ترک کے یہ طریقے وغیرہ۔ اسی قسم کے جامع الحیثیتین مسائل میں سے ایک مسئلہ تربیت کا بھی ہی۔ اور اس مسئلہ پر بھی دو جداگانہ حیثیات سے نظر کیجا سکتی ہے:۔

اولاً یہ کہ تعلیم کی فلسفیانہ تھیوری کیا ہی؟ تعلیم کا مطمح نظر (آئیڈیل) کیا ہی؟ تعلیم کو انسان کی حیات انفرادی و اجتماعی سے کیا تعلق ہی۔ وغیرہ

ثانیاً یہ کہ حصول تعلیم کے عملی وسائل کیا ہیں؟ معلم کو کیا کیا طریقہ استعمال کرنا چاہیے؟ متعلم کے لیے کن کن شرائط کی پابندی ضروری ہی؟ وغیرہ

چنانچہ اسوقت تک فن تعلیم پر جتنی کتابیں لکھی جا چکی ہیں، اور ظاہر ہی کہ انکی تعداد سیکڑوں ہزاروں تک پہنچ چکی ہے، وہ اپنی حیثیت تحریر کے لحاظ سے تقریباً سب یک طرفہ ہیں، مثلاً فلاطون، لاک، وغیرہ حکما فلاسفہ نے صرف اول الذکر نقطۂ خیال سے بحث کی ہی، اور اسکے مقابلہ میں یونیورسٹیوں کے پروفیسر، کالجوں کے معلمین و اساتذہ جو کچھ تحریر کرتے ہیں اسکا تعلق تمام تر آخر الذکر نقطۂ نظر سے ہوتا ہی۔ لیکن کوئی ایسی قابل لحاظ تصنیف جس میں یہ دونوں خصوصیات جمع ہوں غالباً اب تک عالم وجود میں نہیں آئی۔ تاہم ایک کتاب ایک بڑی حد تک ان ہر دو حیثیات کی جامع ہی وہ اسپنسر کی "ایجوکیشن"[1] ہی، جس میں اس مسئلہ کی نظری و عملی دونوں پہلوؤں پر مساوی درجہ کی قوت، قابلیت و جامعیت سے بحث کی گئی ہی، اور جس کے اندر ایک فلسفی اور ایک معلم کے لیے تقریباً یکساں دلچسپی کا سامان موجود ہی۔

"فلسفۂ تعلیم" یوں تو ایک خاصی ضخامت کی کتاب ہی، جسکے ذیل میں تربیت سے متعلق تقریباً تمام اصولی اور بہت سے فرعی مسائل آگئے ہیں لیکن ہم اُن میں سے یہاں خاص خاص اہم عنوانات کو انتخاب کرکے، انکی تلخیص معہ اپنے جابجا کے تبصرہ کے درج کرتے ہیں، ان مہمات مباحث کو، منطقی ترتیب کے ساتھ، سوالات ذیل کی صورت میں رکھا جاسکتا ہے:۔

(۱) تربیت کیا ہے؟

(۲) کسی تربیت کی خوبی کا معیار کیا ہے؟

(۳) اُس معیار پر کون سا نصاب پورا اُترتا ہی؟

---

[1] ایجوکیشن کا اُردو ترجمہ کئی سال ہوے انجمن ترقی اُردو کے زیر اہتمام خواجہ غلام الحسنین بی۔ اے "فلسفۂ تعلیم" کے عنوان سے کرچکے ہیں۔ لائق مترجم کی محنت و کاوش کے پورے اعتراف کے ساتھ میں یہ کہنے کی اجازت چاہتا ہوں، کہ ناظرین ترجمہ مذکور کے مطالعہ کے بعد بھی اگر مضمون بالا کو پڑھیں گے، تو بھی غالباً انکا وقت ضائع نہ ہوگا۔ بلکہ ممکن ہے کہ کچھ نئے اور اس سے مختلف نکات معلوم ہوں (فلسفۂ تعلیم" ایم لے او کالج ڈیوٹی شاپ علیگڈھ سے مل سکتی ہے)

(۴) ایک مکمل تربیت انسانی کے لیے عملی ہدایات :-

(الف) عملی ہدایات، تربیتِ ذہنی سے متعلق -

(ب) عملی ہدایات، تربیتِ اخلاقی سے متعلق -

(ج) عملی ہدایات، تربیتِ جسمانی سے متعلق -

پہلا مسئلہ یہ ظاہر ہو کہ انسان کا بچہ جس وقت پیدا ہوتا ہو، کتنا ضعیف و بے بس ہوتا ہو - لیکن یہ بھی ظاہر ہو کہ اُسکے اندر مختلف اقسام کی بیشمار قوتوں کا ایک مخزن ہوتا ہو، جن کے صرف کا موقع یقیناً آئیگا - چلنا، پھرنا، بولنا، کھانا، پینا، لوگوں سے میل جول رکھنا، کوئی نہ کوئی پیشہ یا شغل اختیار کرنا، زندگی و بقاے صحت کی فکر رکھنا، غرض اس طرح کے صدہا مراحل اُسے آگے چل کر لازمی طور پر طے کرنا ہونگے - اور ان سب کے لیے استعداد و قوت اُس میں اُسی وقت سے موجود ہو - پس وہ ضابطہ جس سے ان تمام قوائے فطری کو نشو و نما کا پورا موقع ملے، وہی تربیت ہو - کسی بچہ کو اگر بالغ ہو کر زندہ رہنا، اور زندہ رہکر لطفِ حیات اُٹھانا ہو تو بجز اس کے چارہ نہیں ہو کہ وہ ابتداءً ان تمہیدی مراتب کو قائم کرلے :- زندگی کیونکر قائم رکھنی چاہیے؟ کارزارِ ہستی، تنازع للبقا میں اپنے تئیں تحریکاتِ مخالف سے کیونکر بچانا چاہیے؟ کسبِ معاش کے کیا وسائل اختیار کرنا چاہیے؟ سوسائٹی کے مختلف تعلقات کو کیونکر نباہنا چاہیے؟ دماغ کو کس طرف استعمال کرنا چاہیے؟ ہاتھ پیر سے کتنا کام لینا چاہیے؟ اور جو شے اس قسم کے تمام سوالات کا جواب دیتی ہو اسی کا نام تربیت ہو - اس بنا پر اگر تربیت کی منطقی تعریف کرنا چاہیں تو یوں کہہ سکتے ہیں کہ وہ اُن ہدایات و اعمال کے مجموعہ کا نام ہو، جن سے انسان ایک کامل و مکمل زندگی بسر کر سکتا ہو - یا، دوسرے الفاظ میں، وہ اُس دستور العمل کا نام ہو، جس سے انسان کے تمام قوائے مخفیہ ایک صحیح و کامل نشو و نما پاتے ہیں -

فنِ تعلیم کے اکثر مصنفین اس نکتہ کو نظر انداز کر جاتے ہیں، اور تربیت کے نہایت محدود معنی لینے لگتے ہیں، لیکن اسپنسر کی دقیقہ رس نگاہ اس نکتہ تک پہنچگئی - اسنے تربیت کی ماہیت جو بیان کی ہو اُسے ہم اُسی کے الفاظ میں درج کرتے ہیں :-

ہمارے واسطے سب سے زیادہ ضروری سوال یہ ہو کہ زندگی کیونکر بسر کرنی چاہیے؟ یہاں "زندگی بسر کرنے" سے صرف جسمانی ضروریات کا پورا کرنا مقصود نہیں ہے بلکہ یہ لفظ اپنے وسیع ترین معنی میں استعمال کیا گیا ہے - ایک عام سوال، جو معاشرتی مسئلہ پر حاوی ہے، یہ ہے، کہ ہر ایک حالت اور ہر ایک معاملہ میں اپنی روش و طرزِ عمل کو کیونکر درست رکھا جائے - مثلاً جسم کے ساتھ کس طرح سلوک کرنا چاہیے؟ نفس کے ساتھ کس طرح سلوک کرنا چاہیے؟ اپنے معاملات کا کس طرح انتظام کرنا چاہیے؟ بال بچوں کی پرورش کس طرح کرنی چاہیے؟ معاشرتی حیثیت سے کس طرح برتاؤ کرنا چاہیے؟ حصولِ مسرت کے ذرائع، جو فطرت نے مہیا کیے ہیں اُن سے کس طرح نفع اُٹھانا چاہیے؟ یعنی اپنی تمام قوتوں کو خود اپنے تئیں، اور نیز دوسروں کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچانے میں کیونکر استعمال کرنا چاہیے؟ قصہ کوتاہ، کامل طور پر کیونکر زندگی بسر کرنا چاہیے؟ چونکہ ہم کو ایک مکمل معاشرت کے سیکھنے کی سب سے زیادہ ضرورت ہے، اس لیے جو بات تربیت سے حاصل ہونا چاہیے، وہ یہی ہے اور تربیت کو جو فرض ادا کرنا پڑتا ہے، وہ یہی ہے کہ ہم کو کامل طور پر زندگی بسر کرنے کے لیے تیار کر دے

دوسرا مسئلہ تربیت کا مفہوم متعین ہو جانے کے بعد ہی دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہو، کہ بہترین نصاب تربیت میں کن شرائط کا وجود لازمی ہو؟ اس سوال کا مجمل جواب تو پہلے مسئلہ کے ضمن میں آچکا، یعنی وہی نصاب بہترین ہو جس سے منشاے تربیت بوجہ اکمل پورا ہو یا بقول اسپنسر

کسی نصاب تربیت کی نسبت راے قائم کرنے کا یہی ایک معقول طریقہ ہے کہ اِس امر کی تحقیق کیجائے کہ وہ فرائض تربیت کو کس حد تک پورا کرتا ہے -

گویا کسی نصاب تربیت کی خوبی کا معیار صرف یہ امر ہو کہ وہ ایک کامل زندگی کی طرف کس حد تک رہنمائی کر سکتا ہو؟ لیکن خود کامل زندگی کیا ہو؟ اسکے جاننے کے لیے ہمیں کل افعال انسانی کی تحلیل کرنی چاہیے - اس تحلیل کے

وقت اتنا تو بادی النظر میں بھی ہر شخص کو علم ہوجاتا ہے کہ کل افعال انسانی کو دو بڑے عنوانات کی تحت میں رکھا جا سکتا ہے۔ (الف) ایک تو وہ جو لازمۂ حیات و شرط زندگانی ہیں اور (ب) دوسرے وہ جو زندگی کی مشین پر صرف رنگ و روغن کا کام دیتے ہیں۔ اب ان میں سے اول الذکر یعنی افعال ضروری، کے پھر دو اقسام ہیں (ا) یعنی ایک وہ جو انسان کی حقیقی و فطری ضروریات میں داخل ہیں، اور (ب) دوسر وہ جنھیں انسان کی ادعائی ضروریات کہنا چاہیے، یعنی وہ تمدن معاشر کی وجہ سے انسان کی ضروریات میں ایسا داخل ہوگئے، کہ گویا وہ اسکی سرشت میں ہیں۔ لیکن افعال (ا) یعنی جو افعال حیات انسانی کے لیے لازمی و لابدی ہیں، ابھی انکی دو اور قسمیں ہو سکتی ہیں، اولاً وہ افعال جن سے براہ راست حفاظت نفس وابستہ ہے۔ ثانیاً وہ افعال جو بالواسطہ حفاظت نفس میں معین ہوتے ہیں۔ تو گویا سارے افعال انسانی، ذیل کے پانچ طبقات میں رکھے جاسکتے ہیں :-

- ضروریات
  - حقیقی ضروریات
    - (۱) وہ افعال جن سے حفاظت نفس براہ راست وابستہ ہے، مثلاً آگ، پانی میں کودنے سے باز رہنا، صدمہ سے اپنے تئیں بچانا، وغیرہ
    - (۲) وہ افعال جو حفاظت نفس میں بالواسطہ معین ہوتے ہیں، مثلاً معاش کیلیے کوئی پیشہ اختیار کرنا، کھانا پکانا وغیرہ
  - ادعائی ضروریات
    - (۳) وہ افعال جن سے افزائش نسل نیز اپنی اولاد کی پرورش و پرداخت مقصود ہے
    - (۴) وہ افعال جن کا مقصد ملکی معاشرتی تعلقات کو قائم رکھنا، دوسروں کی مدد کرنا، اور دوسروں کی مدد سے خود فائدہ اٹھانا ہے
- تکلفات
  - تفریحات
    - (۵) وہ افعال جن کے مخاطب فقط مذاق و جذبات ہیں، اور جن سے مقصد محض تفریح و تفنن ہوتا ہے

چنانچہ اسپنسر حیات انسانی کی ان افعال پنجگانہ میں تحلیل کر کے کہتا ہے، کہ جس شے سے ان پانچوں طرح کے افعال میں انتہائی مدد ملے، وہی بہترین نصاب تربیت ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ہمارے موجودہ علوم میں سے کون اس معیار پر پورا اترتا ہے۔

تیسرا مسئلہ | اس ضمن میں یہ امر قابل لحاظ ہے کہ مذکورۂ بالا تقسیم افعال ایک خاص ارتقائی ترتیب کے ساتھ کی گئی ہے، یعنی اس سلسلہ کی ہر کڑی اپنے بعد والی کڑی سے زمانہ اور اہمیت دونوں کے لحاظ سے مقدم ہے۔ مثلاً انسان کے لیے سب سے زیادہ اہم، قسم اوّل کے افعال ہیں، کہ اگر انسان تدابیر حفظ نفس سے واقف نہ ہو تو ایک منٹ بھی زندہ رہنا ممکن نہیں، اور اسی لیے انسان کو سب سے پہلے ان ہی تدابیر کا علم ہوتا ہے، اسکے بعد اُن افعال کا درجہ ہے، جن سے حصول رزق میں آسانی ہوتی ہے ظاہر ہے کہ تاوقتیکہ انسان کسب معاش کے وسائل نہ رکھتا ہو، نہ خود تا دیر زندہ رہ سکتا ہے، اور نہ کسی قسم کے اجتماعی فرائض ادا کر سکتا ہے۔ پھر حصول معاش سے مطمئن ہو کر انسان پرورش اولاد پر متوجہ ہوتا ہے۔ اور چوں کہ قدامت زمانہ نیز اہمیت کے لحاظ سے خاندان، حکومت و سلطنت پر مقدم ہوتا ہے، اسلیے اس قسم کے افعال کو تیسرے نمبر پر جگہ دیگئی۔ فرائض متعلق بہ ملک و سیاست کو چوتھے نمبر پر اس لیے جگہ دی گئی کہ انسان کے لیے مذکورۂ بالا افعال ثلاثہ سے فارغ ہونے کے پیشتر انکی جانب توجہ کرنا ممکن العمل نہیں آخری درجہ تفریحی مشاغل کا ہے، اور انکو آخر میں جگہ دینا محتاج دلیل نہیں اسلیے کہ اتنی بات ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ تکلفات و تفریحات کا نمبر ہمیشہ ضروریات کے بعد ہوتا ہے۔ اب ان فرائض خمسہ کو علٰحدہ علٰحدہ کر کے، ذیل میں یہ بتایا جاتا ہے کہ ان میں سے ہر ایک کے لیے کون نصاب موزوں ہے۔

(۱) فرائض نمبر (۱) کے لیے ایک بڑی حد تک خوش قسمتی سے کسی انسانی معلم، کسی خارجی تربیت کی ضرورت نہیں۔ جو چیزیں لازمۂ حیات ہیں، اُن میں سے اکثر ایسی ہیں، جن کی تعلیم، بجائے انسانی مدارس و مکاتب کے ہمیں خود فطرت کی درسگاہ میں مل جاتی ہے۔ اسپنسر کہتا ہے :-

تعلیم کا جو حصہ سب سے زیادہ ضروری ہے، یعنی براہ راست حفاظت نفس خوش قسمتی سے اُسکے لیے پہلے ہی سامان کر دیا گیا ہے۔ چونکہ یہ تعلیم اسقدر اہم اور مہتم بالشان ہے کہ اسے ہمارے بھروسہ پر نہیں چھوڑا جا سکتا تھا کہ ہم آئے دن ٹھوکریں کھایا کریں، اسلیے اسے فطرت نے اپنے ہی ہاتھ میں رکھا ہے۔ شیر خوار بچہ ابھی انا کی گود ہی میں ہوتا ہے، اور چلنے پھرنے کی طاقت نہیں رکھتا، کہ اجنبی شخص کی صورت دیکھ کر مُنھ چھپانے اور رونے لگتا ہے۔ اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ بچہ کی فطرت ہی میں اُس عقل حیوانی کا ظہور ابتدائی طور پر پایا جاتا ہے جس کے ذریعہ سے ہم ہر نا معلوم شے سے، جسکے خطرناک ہونے کا احتمال ہوتا ہے، بھاگ کر بچتے ہیں ..... اسکے علاوہ، بچہ اس قسم کے علم کے حاصل کرنے میں از خود، ہر گھڑی مصروف رہتا ہے۔ "اپنے جسم کو کس طرح سنبھالنا چاہیے"؟ "اپنے اعضا کو کس طرح قابو میں رکھنا چاہیے، تاکہ صدمہ سے محفوظ رہیں"؟ "کون سی چیزیں سخت ہیں، جنکی ٹکر سے چوٹ لگتی ہے"؟ "کون سی چیزیں بھاری ہیں جو ہاتھ پاؤں پر گرنے سے تکلیف دیتی ہیں"؟ یہ سب باتیں اور اس قسم کی اور معلومات جو موت یا حادثہ سے بچنے کے لیے ضروری ہیں، بچہ ہر وقت حاصل کرتا رہتا ہے۔

لیکن اگرچہ فطرت ایک بڑی حد تک اس معاملہ میں خود ہی ہماری اتالیق ہے، تاہم اس باب میں بھی ہم انسانی تربیت سے بالکل بے نیاز نہیں رہ سکتے بلکہ بہت سی اُن چیزوں سے بچنے کے لیے جو رفتہ رفتہ ہمیں موت و ہلاکت کی طرف لے جاتی ہیں، ہمارے لیے خارجی تعلیم و تربیت ناگزیر ہے۔

کسی اوزار کے صدمہ یا ضرر سے بچنے کے علاوہ، دوسرے اسباب سے جو نقصان پہنچتا ہے، اس سے بھی جسم کو محفوظ رکھنا لازم ہے، مثلاً بیماری و موت، جو قوانین فزیالوجی کی خلاف ورزی کا نتیجہ ہے۔ معاشرت کامل کے لیے صرف اُن ہی افعال کو دفع کرنا ضروری نہیں، جن سے یکایک زندگی کا خاتمہ ہو جاتا ہے، بلکہ اُن بے عقلی کی حرکتوں اور نادانی کی عادتوں سے بھی بچنا لازمی ہے، جو آہستہ آہستہ انسان کا کام تمام کرتی ہیں .....

یہ سچ ہے کہ اس خصوص میں بھی فطرت نے ہماری ہدایت کا سامان کسی قدر پہلے ہی سے مہیا کر دیا ہے، ... چنانچہ اشتہا کا معلوم ہونا، سخت گرمی یا سردی کا محسوس ہونا، ایسی قوی تحریک ہمارے دل میں پیدا کرتا ہے کہ اُسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، اور اگر لوگ اس قسم کی تحریکات کا حکم، عادۃً اُسی وقت بجا لائیں، جب کہ انکا عمل زیادہ قوی ہو، تو صحت و زندگی کے متعلق بہت کم خرابیاں پیدا ہوں۔ مثلاً جس وقت جسم یا دماغ کام کرتے کرتے تھک جائے، اگر ہمیشہ اسی وقت کام چھوڑ دیا جائے، یا اگر کبھی بغیر بھوک کے کھانا نہ کھائیں، اور بغیر پیاس کے پانی نہ پئیں، تو ایسی صورت شاذ و نادر ہی پیش آئے گی کہ ہمارا نظام جسم، کام کرنے سے عاری ہو جائے۔ مگر زندگی کے قوانین سے لوگ اس قدر جاہل ہیں کہ وہ یہ بھی نہیں جانتے کہ یہ احساسات (Sensations) اُنکے قدرتی رہنما ہیں، اور اگر ایک مدت دراز تک اُنکے احکام کی نافرمانی کر کے اُنھیں واماندہ اور بیکار نہیں بنا دیا ہے، تو قابل اعتبار رہنما ہیں۔ پس اگرچہ فطرت نے آفرینش عالم کی غرض و غایت کو پیش نظر رکھ کر صحت کی حفاظت کے لیے ہمیں عمدہ رہنما دیدیے ہیں، تاہم ہماری لاعلمی و ناواقفیت، انھیں بہت کچھ نکما و بیکار بنا دیتی ہے۔

اِس بنا پر، حفاظت نفس کی غرض سے ہمارے لیے اس علم کا حاصل کرنا سب سے زیادہ ضروری ہے، جس سے قوانین صحت اور اصول بقاے حیات معلوم ہوتے ہیں، پس بہ قول اسپنسر

علم فزیالوجی کا اس قدر حصہ جو اسکے عام اصول اور روزانہ زندگی سے اُن اصول کے تعلقات کو سمجھنے کے لیے درکار ہے، کسی معقول نصاب تربیت کا نہایت ضروری جُز ہے۔

(۲) دوسرے نمبر پر وہ افعال ہیں، جو بالواسطہ حفظ نفس کا کام

دیتے ہیں، یعنی وسائل کسب معاش۔ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہی کہ بجز ملازمت پیشہ افراد کی محدود جماعت کے، عموماً لوگ جس کام میں مشغول رہتے ہیں، وہ تجارتی کاروبار یا لین دین ہی، اور ظاہر ہی کہ اسکی قابلیت کا انحصار سائنس پر ہے۔

بعض ادنیٰ ترین جماعات کو چھوڑ کر، غور تو کرو کہ تمام آدمی کس کام میں مصروف ہیں؟ وہ تجارتی مال کے پیدا کرنے، تیار کرنے اور تقسیم کرنے میں مصروف رہتے ہیں۔ اور پھر تجارتی مال کے پیدا کرنے، تیار کرنے، اور تقسیم کرنے کی لیاقت کس شئے پر منحصر ہے؟ یہ صرف اُن طریقوں کے استعمال پر منحصر ہے، جو مختلف قسم کے تجارتی مال کے لیے مناسب ہیں، یعنی یہ امر صرف اُس مال کے طبعی، کیمیائی، یا حیاتی خواص سے واقفیت پر منحصر ہے، یا یوں کہو کہ سائنس پر منحصر ہے۔

چنانچہ یہ ایک واقعہ بدیہی ہی، کہ صنعت و حرفت یا لین دین کے کاموں میں ریاضی کی، فن تعمیر پیمایش، و نجاری میں علم ہندسہ کی، فن جہازرانی کے لیے، جسکے اوپر تمام بیرونی تجارت کا انحصار ہی، علم ہیئت کی، فن زراعت کاشتکاری و باغبانی کے لیے علم نباتات و کیمسٹری کی، فن آہنگری و انجنیری کے لیے علم جر ثقیل (Mechanics) کی؛ رنگریزی اور قلعی، صابون، چینی و شیشہ وغیرہ کی مصنوعات کے لیے کیمسٹری کی؛ مویشیوں اور دیگر جانوروں کے کاروبار کے لیے بیالوجی کی؛ اور تقریباً ہر قسم کی مشینری تیار کرنے کے لیے، حرارت، الکٹریسٹی و مقناطیس کے قوانین یعنی علم طبعیات کی تعلیم ازبس ضروری ہی۔ اور اسپنسر کے اس دعوے پر، کہ ذرائع معاش کی افزونی کے لیے سائنس دانی لازمی ہی، تاریخ و تجربہ کی قوی شہادات موجود ہیں، چنانچہ زمانہ قدیم میں جس وقت یونان و روم کے باشندے اپنے تمول و مرفہ الحالی کے لیے ممتاز تھے، یہ وہی زمانہ تھا، جبکہ یہاں سائنٹفک تعلیم بھی عروج پر تھی۔ اور آج بھی جن ممالک کی دولت ہماری آنکھوں کو خیرہ کر رہی ہی، جن ممالک کی سرزمین زر و جواہر اُگل رہی ہی، جن ممالک کی مصنوعات سے ہمارے بازار اور منڈیاں لبریز ہیں، وہی مقامات ہیں جہاں سائنس کا آفتاب سوقت نصف النہار پر ہی۔

(۳) اسکے بعد فرائض والدین کا نمبر آتا ہی، اور ہم دیکھتے ہیں کہ اس خصوصیت میں بھی، یعنی جہاں تک تربیت اولاد کا تعلق ہی، ہم بعض اصناف سائنس کے سخت محتاج ہیں۔ جب یہ تسلیم ہی کہ (بقول اسپنسر)

بچوں کے نفس جسم کا نشو و نما، خاص قوانین کے تابع ہے،
جب تک اُن قوانین کی ایک خاص حد تک پابندی نکیجائے، بچوں کی موت یقینی ہے۔
جب تک اُن قوانین کی پوری پابندی نکیجائے، سخت جسمانی و ذہنی امراض پیدا ہوجانا لازمی ہیں،
جب اُن قوانین کی پوری پابندی کیجاتی ہے، تب ہی جاکر بچوں کو پورا کمال حاصل ہوسکتا ہے۔

تو ان مقدمات کی صحت تسلیم کرلینے کے بعد یہ خواہ مخواہ ماننا پڑتا ہی کہ جو لوگ ایک دن ماں باپ بننے والے ہیں، اُنکے لیے فن تربیت اولاد کا جاننا، یعنی اُن اصول سے واقفیت حاصل کرنا جن کے اوپر اُنکی اولاد کی موت و زندگی، صحت و بیماری کا دارمدار ہی، ناگزیر ہی۔ یہ اصول جہاں تک جسمانی صحت کا تعلق ہی، فزیالوجی کے، اور جہاں تک دماغی صحت کا تعلق ہی، سائیکالوجی کے، بعض قوانین ہیں۔ اسی بنا پر اسپنسر اس نتیجہ اور بالکل صحیح نتیجہ پر پہنچتا ہی کہ

انسانی زندگی کے تیسرے بڑے حصّہ کے باقاعدہ انتظام کے لیے فزیالوجی کے اصول اولیہ، اور سائیکالوجی کے ابتدائی حقائق کی کسی قدر واقفیت لازمی ہی

(۴) چوتھا نمبر فرائض معاشری کا ہی، یعنی وہ تعلقات جو ہمیں بطور سوسائٹی کا ایک جزو ہونے کے، دوسرے افراد کے ساتھ رکھنا پڑتے ہیں، مگر ظاہر ہی کہ ان تعلقات کا، بحسن اسلوب قائم رکھنا موقوف ہی، فطرت انسانی کی، انفرادی و اجتماعی دونوں حیثیات کے سمجھنے پر، اور فطرت انسانی ہی کی رازشناسی کا دوسرا نام سائیکالوجی اور سوشیالوجی

کی تعلیم ہو۔ اس نکتہ کو اسپنسر ایک منطقی تسلسل کے ساتھ یوں بیان کرتا ہو

قوم، نام ہے مجموعۂ افراد کا۔ قوم میں جو کچھ ہوتا ہو افراد کے مشترک افعال سے ہوتا ہو، اسلیے قومی امور کا عقدہ صرف افراد کے افعال کے مطالعہ سے حل ہوتا ہو۔ لیکن افراد کے افعال منحصر ہیں انکی فطرت کے قوانین پر، اور تا وقتیکہ اُن قوانین کو سمجھ نہ لیا جائے، اُنکے افعال سمجھ میں نہیں آسکتے؛ پھر یہ قوانین یا تو جسم سے متعلق ہوسکتے ہیں، یا نفس سے۔ پس اسکا نتیجہ یہ نکلا کہ بیالوجی اور سائیکالوجی کا مطالعہ فرائض معاشرتی کو کما حقہٗ سمجھنے اور برتنے کے لیے لازمی ہے۔

یا، بالفاظ دیگر،

تمام معاشرتی واقعات، زندگی ہی کے واقعات، زندگی ہی کے پیچیدہ مظاہر ہوتے ہیں۔ پس ضرور ہو کہ یہ واقعات، عام قوانین زندگی کے تابع ہوں، اور صرف اسی وقت سمجھ میں آسکتے ہیں، جب قوانین حیات سمجھ میں آجائیں

(۵) آخر میں ہم اُن اشغال زندگی کو لیتے ہیں، جن کی غرض محض تفنن و تفریح ہوتی ہو، اور جو بجاے حفظ نفس کے حظ نفس کا کام دیتے ہیں۔ یہ افعال غیر ضروری، صرف اس معنی میں ہیں، کہ انسان کی حیات ان کے ساتھ وابستہ نہیں، ورنہ عملاً ایسا کون شخص ہو، جو دن رات کام میں مشغول رہتا ہو، اور اپنے وقت کا کوئی حصہ مشاغل تفریح میں صرف نہیں کرتا؟ اسی لیے افعال انسانی کے دوسرے شعبوں کی طرح، اس شعبہ کی تربیت بھی ناقابل لحاظ نہیں۔ اب دیکھنا یہ ہو کہ اس استعداد کی نشو و نما کس علم سے ہوتی ہو؟ اسپنسر جواب دیتا ہو کہ سائنس سے۔ یہ جواب بظاہر حیرت انگیز معلوم ہوتا ہو لیکن تامل و تعمق کی نظر سے دیکھو تو اسکی واقعیت ظاہر ہوجائیگی۔ یہ اشغال تفریحی، جن کے لیے ایک خاص لفظ فنون لطیفہ کا ہو، چار بڑے عنوانات کے تحت میں رکھے جاسکتے ہیں۔ بت تراشی (Sculpture) مصوری، موسیقی، اور شاعری۔ ان میں سے ہر ایک پر الگ الگ نظر ڈالنے سے معلوم ہوگا، کہ ان سب کی نشو و نما کے لیے سائنس دانی لازمی ہے۔

پہلے بت تراشی کو لیجیے۔ کیا کوئی شخص ایک باکمال بت تراش ہوسکتا ہو تا وقتیکہ اُسے انسانی ڈھانچ کے رگوں، پٹھوں، اور ہڈیوں کی مقامات اُنکی تقسیم، اُنکے باہمی تعلقات، اور اُنکی حرکات سے واقفیت نہ ہو؟ اور پھر صرف فزیالوجی کا علم کافی نہیں بلکہ جر ثقیل (Mechanics) کے ابتدائی اصول بھی جاننا ضروری ہیں۔ اسے اسپنسر ایک مثال سے یوں سمجھاتا ہے:۔

تصویر کے استحکام کے لیے ضروری ہو کہ مرکز ثقل (Centre of Gravity) سے جو عمود (Perpendicular) ڈالا جائے جسے خط السمت (Line of Direction) کہتے ہیں، عماد (Support) کے قاعدہ (Base) کے اندر واقع ہو، اور اسی لیے ایسا ہوتا ہو کہ جب کوئی شخص اس حالت میں کھڑا ہوتا ہو، جسے قیام الراحت (Standing at Ease) کہتے ہیں، جس میں ایک ٹانگ بالکل سیدھی تنی رہتی ہو، اور دوسری ذرا ڈھیلی اور خمیدہ رہتی ہو، تو خط السمت سیدھی تنی ہوئی ٹانگ کے پاؤں کے اندر ہوتا ہے، مگر جو بت تراش مسئلہ توازن (Principle of Equilibrium) سے ناواقف ہوتے ہیں، وہ حالت قیام کی اس وضع کو عموماً اس طرح ظاہر کرتے ہیں کہ خط السمت دونوں پاؤوں کے نیچے واقع ہوتا ہو۔

اسی طرح اعلی مصوری کے لیے علم مناظر (Optics) اور روشنی کے قوانین سے واقفیت لازمی ہو۔ اسپنسر کہتا ہو:۔

اہل چین کی تصویریں کیوں بے ڈول اور بھدی ہوتی ہیں؟ محض اس لیے کہ مصور، صورتوں کے قوانین کا بالکل لحاظ نہیں رکھتے، تصویر اُتارتے وقت مختلف اشیا کے فاصلوں اور اُنکی جسامت کے چھوٹے بڑے ہونے کا کافی خیال نہیں کرتے، اور تصویر کے روشن اور تاریک حصہ کو باقاعدہ رنگ و روغن لگانے کے اصول سے بے بہرہ ہوتے ہیں۔ بچہ کی بنائی ہوئی تصویروں میں

بجز اسکے کیا عیب ہوتا ہی کہ ان میں اصلیت نہیں ہوتی، اور تصویر میں اصلیت کا نہ ہونا اسی قاعدہ سے ناواقفیت کا نتیجہ ہی، جسکے مطابق اشیا کی صورتیں مختلف حالتوں میں مختلف ہوتی رہتی ہیں -

یہی حال موسیقی کا ہی - اگر یہ سچ ہی کہ موسیقی نام ہی جذبات کی تصویر کا، تو یہ ماننا بداہتہً لازم آتا ہی، کہ راگ میں تاثیر اُسی وقت پیدا ہو سکتی ہی، جب وہ جذبات موجودہ کے عین مطابق ہو، اور اس لیے اسپنسر کے نزدیک ماہر موسیقی کو سائیکالوجی کے ابتدائی اصول جاننا لابدی ہیں - لیکن ہمارے نزدیک، ماہر موسیقی کے لیے محض سائیکالوجی کے معلومات ناکافی ہیں، تاوقتیکہ وہ علم الصوت (Aconstics) سے بھی واقف نہ ہو - اسلیے کہ راگ سنتے وقت، جو شئے، دل میں اثر اور طبیعت میں گداز پیدا کرتی ہی، وہ صرف راگ کا مفہوم و مضمون نہیں ہوتا، بلکہ اس میں گوَیَّے کی آواز کے اُتار چڑھاؤ، اور سُروں کے اونچے یا مدّھم ہونے کو بھی بہت بڑا دخل ہوتا ہی - اور اس لیے گانے والے کو آواز کے قوانین سے بھی واقف ہونا ضروری ہی -

اب رہی شاعری، تو اگرچہ عام خیال کے بموجب سائنس اور شاعری دو متناقض چیزیں ہیں، لیکن اسپنسر جیسے دقیق النظر کی تسکین اس عامیانہ خیال سے کیوں کر ہو سکتی تھی؟ وہ، مِل کا ہم آہنگ ہو کر کہتا ہی کہ شاعری صرف اصلی جذبات کی تصویر کا نام ہی، جو الفاظ کے ذریعہ سے کھینچی گئی ہی، اور اگر یہ صحیح ہی تو شاعری کے ڈانڈے سائیکالوجی سے ملجاتے ہیں - یہی وجہ ہی کہ اسوقت تک دنیا میں جتنے بڑے سے بڑے حقیقی شاعر ہوے ہیں (مثلاً شکسپیر، گیٹے، حافظ، غالب) غالباً وہی سب سے بڑے سائیکالوجسٹ بھی ہوے ہیں، گو یہ بالکل ممکن ہی، کہ وہ اپنے مفہوم کا اظہار، سائیکالوجی کے خاص اصطلاحی الفاظ میں نہ کر سکتے ہوں - اسپنسر اس سے بڑھ کر اسکا بھی مدعی ہی کہ سائیکالوجی سے قطع نظر کر کے دیگر اصناف سائنس بھی شاعری کے منافی نہیں، بلکہ ایک بڑی حد تک اسکے معاون ہیں، اپنے دعوے اور دلیل کو وہ ذیل کے دلچسپ طریقہ سے پیش کرتا ہی :-

یہ خیال جو عام طور پر مشہور ہی کہ سائنس و شاعری باہم مخالف ہیں، ایک دھوکا ہی - یہ بات حقیقت میں سچ ہی کہ ادراک (Cognition) اور جذبہ (Emotion) جو معرفت طبعی (Consciousness) کی مختلف حالتیں ہیں، ایک دوسری کو خارج کرنا چاہتی ہیں، اور یہ بھی سچ ہی حد اعتدال سے بڑھ کر قواے مُفکرہ کا عمل، جذبات کو مردہ کر دیتا ہی، علیٰ ہذا القیاس جذبات کا عمل اگر حدِ اعتدال سے زائد ہو تو قواے مُفکرہ کو مردہ کر دیتا ہی - اور اس معنی میں تو تمام ذہنی قوتیں ایک دوسرے کے منافی ہیں - لیکن یہ دعویٰ کہ سائنس کی تحصیل، قوت متخیلہ کے خواہ مخواہ برخلاف واقع ہوئی ہی، ہرگز صحیح نہیں، بلکہ بخلاف اسکے سائنس، شاعری کی اس اقلیم کو جو سائنس سے ناواقف لوگوں کے لیے بالکل چٹیل میدان ہی، ہمارے سامنے بے پردہ آشکارا کر دیتا ہی - جو لوگ سائنس کی تحقیقات میں مصروف رہتے ہیں، وہ ہمیشہ اس بات کو ثابت کر دیتے ہیں، کہ وہ دوسروں کی بہ نسبت اپنے مضامین کی شاعری کا لطف کم نہیں، بلکہ زیادہ خوبی و صفائی کے ساتھ اُٹھاتے ہیں - جو شخص "جیالوجی" مصنفہ Hugh Miller پر غور کریگا، یا Lewis's "SEA SIDE" کا مطالعہ کریگا، اُسکو ضرور معلوم ہو جائیگا کہ شاعری کے جوش کو سائنس سرد نہیں کرتا، بلکہ اور زیادہ بھڑکاتا ہی، اور جو شخص Gœthe کی سوانح عمری پر غور کریگا اُسپر یہ حقیقت ضرور منکشف ہو جائیگی، کہ شاعر، اور ماہر سائنس ایک ہی وقت میں یکساں قابلیت سے کام کر سکتا ہی، کیا یہ عقیدہ بیہودہ نہیں، کہ جو شخص جس قدر زیادہ قدرت کا مطالعہ کریگا، اسیقدر کم اُسکی توقیر کریگا؟ کیا تم سمجھتے ہو کہ پانی کا قطرہ، جو عام لوگوں کی نظر میں صرف پانی کا قطرہ ہی، اُسکی وقعت ایک عالِم طبعیات کی نظر میں کچھ کم ہو جائیگی، جو اس بات کو جانتا ہی، کہ اُس قطرہ کے عناصر ایک قوت کے ذریعہ سے وابستہ ہیں، اور اگر وہ قوت یکایک زائل ہو جائے، تو اس سے بجلی کی چمک پیدا

ہوگی؟ کیا تم سمجھتے ہو، کہ ایک گول چٹان کا پتھر، جسپر متوازی خطوط کے نشانات کھدے ہوے ہیں، جاہل آدمی کے دل میں اُسی قدر شاعرانہ خیالات پیدا کرتا ہے جتنے کہ عالمِ طبقات الارض کے دل میں، جو اس بات کو جانتا ہے کہ دس لاکھ سال پیشتر ایک برف کا ٹیلا اس چٹان پر بہتا ہوا گزرتا تھا؟ اصل یہ ہے کہ جو لوگ سائنس کے مشاغل میں کبھی مصروف نہیں رہے، وہ شاعری کے بہت بڑے حصہ سے جو اُنکے گردو پیش ہے، اندھے، اور محروم ہیں۔ جس شخص نے اپنی نوعمری میں پودوں اور کیڑوں کو تلاش کر کے نہ جمع کیا ہو، وہ اُس دلچسپی کی آدھی قدر بھی نہیں جانتا، جو گلی کوچوں، اور خاردار جھاڑی کی قطاروں سے حاصل ہو سکتی ہے۔ جس شخص نے معدنی اشیاے متحجرہ کی تلاش نہ کی ہو اسکو اُن شاعرانہ جذبات کا تصور ہی نہیں ہو سکتا، جو اُن مقامات پر جانے سے پیدا ہوتے ہیں، جہاں یہ خزانے زیرِ زمین پائے جاتے ہیں..... بس اگر صحیح طور پر خیال کیا جائے تو سائنس (ضد شاعری ہونا تو کجا) بجاے خود ایک شاعری ہے"

پس مشاغلِ زندگی کی جو تحلیل ابتدا میں کی گئی تھی، تحقیق سے معلوم ہوا کہ اُن میں سے ہر جزو کی نشو و نما کے لیے بہترین شئے سائنس کی تحصیل ہے۔ اسپنسر ایک فخر آمیز اطمینان کے ساتھ اپنی تحقیقات کا ان الفاظ میں لُبِّ لُباب درج کرتا ہے :-

جو سوال ہمنے آغاز مضمون میں کیا تھا، یعنی "کون علم سب سے زیادہ قیمتی ہے؟" اور جو پہلے نہایت پریشان کُن معلوم ہوتا تھا، اب وہ نسبتہً آسان ہو گیا۔ اسکا صرف ایک جواب ہے، کہ "سائنس"۔ تمام بیانات پر عدالت کا حکم ناطق یہی ہے۔ براہ راست حفاظت نفس یعنی زندگی و صحت قائم رکھنے کے لیے سب سے زیادہ قیمتی علم سائنس ہے۔ بالواسطہ حفاظت نفس کے لیے بھی جسکو ہم حصول معاش کہتے ہیں، سب سے زیادہ قیمتی علم سائنس ہے۔ فرائض والدین کے باقاعدہ ادا کرنے کے لیے مناسب ہدایت صرف سائنس سے حاصل ہو سکتی ہے۔ گذشتہ و موجودہ قومی زندگی جسکے بغیر کوئی شہری، صحیح طور پر اپنے کردار کا انتظام نہیں کر سکتا، اسکا دروازہ کھولنے کے لیے جس کنجی کی ضرورت ہے وہ سائنس ہی ہے۔ علیٰ ہذا القیاس جملہ اقسام فنون کی تکمیل اور اُس سے لطف اُٹھانے کے لیے بھی سائنس ہی ہمکو تیار کرتا ہے۔

یہ ساری گفتگو اس لحاظ سے تھی، کہ زندگی کے مختلف شعبوں میں کس علم کے معلومات و ہدایات سب سے زیادہ کارآمد ہوتے ہیں، لیکن ابھی یہ دیکھنا باقی ہے کہ تربیت ذہنی کے اُن اجزا کے لیے جنکا تعلق زندگی کے ہر شعبہ کے ساتھ ہے (مثلاً قوت حافظہ) کون سا علم ضروری ہے؟ اسکے جواب میں عموماً لوگ، زبانوں کی تعلیم کو پیش کرتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ اس سے ذہن کی ایک خاص تربیت (Discipline) ہوتی ہے، جس سے ہر شعبۂ زندگی میں مدد ملتی ہے۔ مگر اسپنسر عام خیال کے برخلاف، اس اعزاز کا مستحق بھی سائنس کو قرار دیتا ہے۔ بقول اُسکے،

قوت حافظہ کا فائدہ، مطالعہ الفاظ کے ساتھ مخصوص سمجھا جاتا ہے، لیکن سچ یہ ہے کہ حافظہ کی مشق کے لیے، سائنس اس سے وسیع تر میدان مہیا کرتا ہے، نظام شمسی کا پورا حال ذہن میں محفوظ رکھنا، کہکشاں کی بناوٹ کے متعلق تمام دریافت شدہ امور کا ازبر کر لینا، مرکب مادّی چیزوں کی تعداد کو، جنھیں بجز مخصوص پروفیسروں کے کوئی نہیں شمار کر سکتا، یاد رکھنا، معمولی کام نہیں۔ اور سالمات (Atoms) کی ترکیب، اور اُنکے مرکبات کے تعلقات کا یاد رکھنا، تاوقتیکہ انسان تمام عمر، کیمسٹری کے مطالعہ میں نہ صرف کرے، تقریباً ناممکن ہے..... اسی طرح نباتات کی انواع تقریباً تین لاکھ بیس ہزار تک پہنچ چکی ہیں۔ اور حیوانات کی مختلف نوعی صورتوں کا اندازہ، علماے حیات کے تخمینہ میں بیس لاکھ تک ہو چکا ہے۔

اسی طرح قوت فیصلہ و امتیاز کی ترقی، اور علت سے معلول، اور معلول سے علت کے دریافت کی قابلیت کا نشو و نما، جس قدر سائنس کے ذریعہ سے ہوتا ہے، زبان کی تعلیم میں اسکا عشر عشیر بھی ممکن نہیں۔ اسکے علاوہ، جو چیزیں اخلاق کی روح رواں ہیں، مثلاً آزادیِ را

صبر و استقلال، راست بازی، ان سب چیزوں کی تکمیل بھی سادہ منفک واقعات کے دوران تحقیقات میں بخوبی ہوتی ہی، بخلاف اسکے تحصیلِ زبان سے اجتہادِ فکری مفقود ہو جاتا ہی۔ معلمِ لسان، بلا وجوہ دہبا بتلائے، ایک تحکمانہ لہجہ میں صرف یہ کہتا ہی، کہ "فلاں لفظ کے یہی معنی ہیں" "فلاں محاورہ یوں ہی ہی" اور اس سے طالب علم میں بجائے آزادیٔ اجتہاد، وشوق جستجو کے، غلامی، تقلید اور قناعت پسندی پیدا ہو جاتی ہی۔

الغرض اسپنسر کے نقطۂ خیال سے، اگر دنیا میں کوئی شئے ایسی ہی، جو نسان کی جسمانی، ذہنی، اور اخلاقی قویٰ کو ہر طرح پر نشو و نما دیتی ہی، اور جو تربیت کا حقیقی مفہوم پورا کرتی ہی، تو وہ صرف سائنس ہی۔ اسکا یہ منشا نہیں کہ ہر شخص اعلیٰ سائنس داں ہو جائے، ایسا ہونا نہ ممکن العمل ہی اور نہ ضروری و مناسب۔ بلکہ ہر شخص کو صرف سائنس کے ابتدائی اصول جاننا ضروری ہیں

(باقی آیندہ)

"متعلم"

کلامِ شاد

از مہاراجہ بہادر سر راجہ کشن پرشاد صاحب بالقابہم

جُز ذاتِ تو اے دوست دگر ہیچ کسے نیست	اے بے ہمہٗ و با ہمہ و اللہ بسے نیست
مرغِ ملکوتم بسرِ عرش مقام است	ایں کالبدِ چار عناصر قفسے نیست
در عالمِ تنہائی و شبہاے جُدائی	کس مونس و غمخوار مرا جُز نفسے نیست
بزمیکہ تمایش کنی آں محفلِ عشق است	جائیکہ کسے را خبر از حال کسے نیست
ایں دیدہ و دل طالبِ وصلِ تو مُدام اند	جز حاصلِ سودائے محبت ہوسے نیست
غرقابِ جہاں گشت تلاطم جو بپا شد	از سر چو گذشت آب دگر خار و خسے نیست
از غیر چرا حاجتِ خود را طلبد کس	تا دامنِ وصلِ تو اگر دست رسے نیست
یارب بتو فریاد از آنست کہ باشد	در ہر دو جہاں غیرِ تو فریاد رسے نیست

جُز ذاتِ خدا شاؔد ز کس کار ندارم
دانم کہ مرا مونس و غمخوار کسے نیست

برخوردار

الفاظ کیا ہین؟ حروف کا مجموعہ۔ حروف کیا ہین؟ بات چیت گفت و شنید اور تلفظ کا صحیح ذریعہ۔ بات چیت اور گفت و شنید یا تلفظ کیا ہی؟ چند آوازین یا چند صدائین جو جاندار اور غیر جاندار مخلوق کے منھ یا جسم اور تصادم سے نکلتی یا سرزد ہوتی ہین۔ جو آواز نکلتی اور جو صدا ہمارے کانون تک پہنچتی ہی وہ کوئی نہ کوئی ہوائی شکل یا ہوائی مجسمہ رکھتی ہے۔ اگرچہ بظاہر بولنے یا تلفظ کے بعد اُسکی کوئی شکل یا مجسمہ نہین ہوتا مثلاً جسوقت بناو، دکھاو، سُناو، کہتے یا تلفظ کرتے ہین تو اُسوقت ان الفاظ یا ان صداؤن کا کوئی وجود یا کوئی شکل نہین ہوتی گو مخاطب ان کا مطلب اور مفہوم سمجھ لیتا ہی لیکن اگر متکلم اور مخاطب دونون سے یہ کہا جائے کہ ان صداؤن ان آوازون ان الفاظ کی صورت یا شکل کیسی اور کیا ہی تو دونون مین سے کوئی بھی نہین بتا اور دکھا سکے گا۔

خود متکلم بھی اس کا ثبوت سوائے اسکے اور کچھ نہین دے سکے گا کہ اسکے منھ سے یہ چند الفاظ نکلے تھے اور اُن کے یہ معانی[لہ] تھے۔ یا اُن کا یہ مطلب اور یہ مفہوم تھا۔

جسطرح مادی مواد مین ایک طاقت اور ایک اثر ہوتا ہی اسی طرح الفاظ اور فقرات یا جملون مین بھی ایک طاقت اور ایک اثر ہوتا ہی۔ تعریف خوشامد مذمت اور گالی بھی الفاظ اور فقرات کا مجموعہ ہین۔ دونون مین ایک اثر اور ایک جذب ہی۔ تعریف اور خوشامد سے انسان خوش ہو جاتا ہی اور دشنام سے اُسکی طبیعت اور دل و دماغ پر ایک تکلیف دہ زد پڑتی ہی۔

ہر لفظ اور لفظ ہی نہین بلکہ ہر حرف اور ہر جملہ اور ہر فقرہ مین ایک طاقت اور ایک اثر ہی اور اُسکی وضع اور ترتیب ایک حقیقت یا ایک کیفیت رکھتی ہی اور ہر لفظ یا ہر فقرہ اور ہر جملہ کی حقیقت اور کیفیت دوسرے الفاظ، دوسرے فقرات، دوسرے جملون سے جُداگانہ اور ممتاز ہوتی ہی۔

اگر مختلف الفاظ کی ساخت ترکیب اور ترتیب پر غور کیا جائے تو پتہ لگ جائے گا کہ واضعین نے اُن کی ساخت اور ترتیب یا ترکیب مین کوئی نہ کوئی ایسی خوبی یا عمدگی رکھی ہی جو کسی نہ کسی رنگ مین قابل اعتراف ہی۔ الفاظ کیا ہین؟ ایک ایسا اعلان، ایک ایسی منادی، جو اپنی ذات مین سوائے صداقت اور حقیقت کے کچھ رکھتی ہی نہین گو کہ کہنے والے اور سننے والے کے دل و دماغ مین اور ہو۔ لیکن الفاظ یا اُن الفاظ مین جو بولے اور سنائے جاتے ہین کوئی غلطی نہین ہوتی۔

جو شخص منہ سے لفظ مین، تو، وہ، ایسا، جیسا، نکالتا ہی اُنکی وہ کیفیت جو اُنکی ذات مین مستتر ہی کبھی زائل نہین کر سکتا۔ اُسکا دل کوئی اور منصوبہ کر سکتا ہی لیکن اِن الفاظ کی معنوی کیفیت نہین تبدیل کر سکتا مثلاً مین کے اطلاق سے کبھی تو کا مفہوم نہین لیا جا سکتا یا تو کے اطلاق سے کبھی وہ

لہ یہ بحث بھی دلچسپی سے خالی نہین کہ الفاظ اور معانی یا مفہوم مین کیا نسبت ہی جب ہم کوئی آواز یا کوئی لفظ یا کوئی فقرہ منھ سے نکالتے ہین تو اُس کا کوئی نہ کوئی مفہوم یا مطلب ہوتا ہی جب ہم یہ کہتے ہین کہ ایسا کرنا چاہیئے، ایسا ہونا چاہیئے، ایسا ہو سکتا ہی تو یہ فقرات ایک مفہوم اور ایک مطلب رکھتے ہین۔ سننے والا فوراً ہی سمجھ جاتا ہی کہ گوئندہ یہ کہتا اور یہ چاہتا ہی۔ اِن الفاظ مین یہ مطلب بھر گیا ہی یا یہ الفاظ اس مفہوم کے قابل ہین گویا الفاظ قالب ورجسم ہین اور مفہوم یا معانی جان اور روح۔ یا الفاظ اور فقرات ذات ہین اور معانی یا مفہوم صفت اور کیفیت یا حقیقت جسطرح بعض انسان باوجود انسان ہونے کے کوئی خوبی نہین رکھتے اسی طرح بعض الفاظ اور فقرات باوجود الفاظ اور فقرات ہونے کے کوئی مفہوم یا اثر نہین رکھتے جنھین مہمل یا بے معنی کہا جاتا ہی یہ بحث ہم کسی دوسرے مضمون مین کرین گے کہ الفاظ کا مفہوم یا معانی کس طرح مختص ہوئے ہین اور کس طرح لفظ تو، تھا، وا اور سے وہی معانی مراد لیئے جاتے ہین یا لئے جا سکتے ہین جو بہ عرف عام لوگ لیتے ہین۔ ۱۲۔

مراد نہین لے سکتے جیسے زید زید ہے ایسے ہی مین مین ہے۔

الفاظ مین کیفیتین رکھتے ہین :-

(الف) کیفیتِ معنوی۔

(ب) کیفیت مرادی۔

(ج) کیفیت مفہومیہ۔

معانی اور مفہوم مین فرق ہی۔ لفظ آرزو کے معنی خواہش اور طلب کے ہین لیکن آرزو کا مفہوم کچھ اور ہی معانی عام ہین اور مفہوم خاص ہی اکثر اوقات اِن دونون مین کوئی فرق نہین کیا جاتا۔ کیفیت مرادی اِن دونون سے الگ ہی۔ لفظ آرزو ایک معنی رکھتا ہی۔ لیکن ایک ہی مفہوم نہین رکھتا جب ہم یہ کہتے ہین کہ ہماری مراد یہ ہی تو اُس کا مطلب یا مفہوم ایک خاص مفہوم ہوتا ہی جو عام معانی سے کسی حد تک مغائرت رکھتا ہی۔ الفاظ سے بلحاظ معانی ہر دو مفہومات کے کام لینا ایک دلچسپ استدلال ہی بعض الفاظ بجاے خود فقرات ہین اور ایسے فقرات ہین جن سے بہت کچھ استدلال کیا جا سکتا ہی۔

بعض الفاظ ایسے ہین کہ اُن پر علمی اور عملی رنگ مین بہت کچھ کہہ سکتے ہین اور ہر لفظ کی بابت جُداگانہ لکھا جا سکتا ہی کیونکہ ہر لفظ[1] کے معنے اور مفہوم دوسرے الفاظ سے جُدا ہوتے ہین۔ الفاظ کی دو قسمین ہین :-

(الف) الفاظ علمی۔

(ب) الفاظ کاروباری۔

دونون قسمون کے الفاظ کے معانی اور مفاہیم انسانی زندگی کے واسطے عملی رنگ مین بہت کچھ مواد رکھتے ہین۔ اگرچہ ان دونون قسم کے الفاظ مین نسبتًا فرق ہے۔ لیکن عملی رنگ مین دونون قسم کے الفاظ مین ایک طاقت اور ایک اثر ہی۔ بہت سے الفاظ مثالًا پیش کیے جا سکتے ہین۔ مثلًا برخوردار تین اجزا سے مرکب ہے۔

بر

خور

دار

تینون اجزا جُداگانہ معانی رکھتے ہین۔

بر کے معنے۔ ثمرہ، میوہ، سینہ آغوش بغل کنار کے ہین اور اگر بردن بمعنی لیجانا سے استدلال کیا جائے تو کہا جائےگا کہ یہ صیغہ امر بمعنی لے جا کے بھی ہے۔ خور کے معنے کہاتے یا کھاؤ کے ہین اور دار کے معنے رکھ یا رکھنے کے ہین۔ تینون کا مجموعہ برخوردار ہوتا ہے۔

فارسی اور اُردو زبان مین چھوٹون کو برخوردار یا برخورداری نورچشمی لکھا جاتا ہی یا لکھا جاتا تھا! اگرچہ صاحب غیاث اللغات نے برخورداری نورچشمی لکھنا خلاف محاورہ فارسی قرار دیا ہی لیکن برخوردار کے لکھنے کا اکثر رواج ہی۔ برخوردار نام بھی ہوتا ہے۔

بادی النظر مین یہ لفظ محض ایک ایسا لفظ ہی جو خط وکتابت مین یا گفتگو مین اطلاق پاتا ہی۔ بزرگ یا بڑے چھوٹون کو محض ایک رسم کے طور پر برخوردار لکھنے کے عادی ہین جس غرض اور جس مدعا سے یہ لفظ ترکیب یا ترتیب دیا گیا ہی بہت کم لوگ اِس مدعا اور اِس غرض سے اسکا استعمال کرتے ہین وہ اعزا اور وہ لوگ بھی جنھین برخوردار سے مخاطب کیا جاتا ہی بہت کم اسکی عملی صورت اور عملی مفہوم پر غور کرنے کے عادی ہین سیدھکر یا سُن کر محض ایک رسمی خطاب سمجھ کر خاموش رہتے ہین۔ اگر عملی رنگ مین دونون جانب اسکی اصلیت اور حقیقت پر غور کیا جاتا تو لوگ سمجھنے لگتے کہ یہ کیسا جامع لفظ یا فقرہ ہی اور اسکے اندر کیا کچھ بھرا گیا ہی۔ چونکہ اسکی اصلی کیفیت سے بہت کم لوگ

---

[1] اگرچہ یہ کہا جاتا ہی کہ زبانون مین الفاظ مرادف بھی ہوتے ہین لیکن میرا یہ مذہب ہے کہ ایسا ترادف ٹھیک معنون مین ترادف نہین ہوتا بلکہ مجازی طور پر ترادف کا اطلاق کیا جاتا ہی۔ ایک ہی زبان کے اندر جن الفاظ کو مرادف کہا جاتا ہی اُنمین کلی ترادف نہین ہوتا بلکہ کچھ نہ کچھ فرق ہوتا ہی۔ ۱۲

واقفیت رکھتے ہین اسواسطے اسکا اطلاق یا استعمال بہت دفعہ بیمحل بھی کیا جاتا ہی۔

برخوردار اپنی تہ مین یا اپنے اندر ایک روحانی تمدنی اور اکونمیکل فلاسفی رکھتا ہی جسمین انسانی تمدن، انسانی روحانیت، انسانی دوراندیشی اور انسانی پیش بینی کے اصول پر توجہ دلائی گئی ہے۔

جب برخوردار کا اطلاق کیا جاتا ہی تو اُسکا مفہوم کیا ہوتا ہی؟

(۱) جو کچھ دُنیا مین انسان کماتا، پیدا کرتا، بناتا، اور حاصل کرتا ہی اُسکے تین حصے کرنا چاہیئے۔

(الف) بر یعنی اپنی کمائی لپنے اندوختہ اپنے مال اپنی دولت سے خدا کی راہ مین بھی کچھ دینا چاہیئے۔ رفاہ عام اور قومی کامون کے واسطے بھی کوئی حصہ خاص کرنا چاہیئے۔ جو شخص ایسا کرتا ہی گویا وہ اپنی آئندہ زندگی یا آئندہ دُنیا کے واسطے جسے دوسری زندگی کہنا چاہیئے ایک ذخیرہ جمع کرتا ہی۔

(ب) خور چونکہ انسانی زندگی انسانی آسائش سوائے کھانے پینے اور صرف کے عمدگی سے نہین گزر سکتی اِسی واسطے اِن ماحتاج کے واسطے بھی اپنی کمائی اپنے اندوختہ کا کچھ نہ کچھ حصہ خاص کرنا چاہیئے جو شخص ایسا نہین کرتا وہ اپنی زندگی اپنے اوقات اور اپنی آسائش کو ایک تہلکہ مین ڈالتا ہی نہ صرف خود ہی کو بلکہ اپنے وابستگان کو بھی۔

(ج) دار تمدنی مراحل مین ضروری ہی کہ انسان اپنی کمائی اور اپنے اندوختہ مین سے آئندہ زندگی اور ذریات یا وابستگان کے واسطے بھی کچھ بچائے تاکہ ضرورت اور بے روزگاری کے وقت اُسکو دوسرے اپنے جنس کے پاس اپنی حاجت لیجانیکا موقع نہ ملے اور اُسکا بوجھ دوسری جماعت پر نہ پڑے۔

جو شخص راہ خدا مین کچھ نہین دیتا وہ اپنی قوم اور انسانی نسل کی واجبی امداد سے گریز کرتا ہی جو شخص قومی ضروریات اور قومی کامون مین کوئی حصہ نہین لیتا وہ اپنی زندگی کا جہاز خشکی پر لیجانیکا عزم رکھتا ہی اور توقع یہ رکھتا ہی کہ وہ ساحل انجام پر سلامتی سے جا پہنچے۔

جو شخص کنجوسی اور بُخل سے واجبی مصارف سے نہین بچاتا ہی اور اپنے اور اپنے کنبہ اور بال بچہ کے واسطے خرچ نہین کرتا وہ سب کی زندگی وبال مین ڈالتا ہے۔

جو شخص کچھ بچاتا نہین وہ اپنے تئین اور نیز اپنے بال بچہ اور دیگر وابستگان کو ایسے پانی مین غوطہ لگانے کی ہدایت کرتا ہی جو ایک مہلک گرداب ہی۔

بر، خور، دار، کی تاویل بھی اکثر غلط کی جاتی ہی۔ بر کا یہ مفہوم نہین کہ اندھا دھند یا ایسے طور پر صدقہ وخیرات کی جائے کہ لینے والے لوگ پہلے سے بھی بدتر حال ہو جائین اور یہ سمجھ لین کہ جب اور لوگ بیٹھے بٹھائے یونہی اُنکی پرورش اور امداد کر رہے ہین تو خود اُنھین محنت ومشقت اور تردد کی کیا ضرورت ہے۔

بر کا مفہوم دوسرے الفاظ مین یہ ہی کہ روپیہ یا دولت و مال اُن اُمور اور اُن مقاصد مین خرچ کیا جائے جس سے رفاہ عام کی مشکلات حل ہون اور اُن لوگون کو امداد ملے جو واقعی امداد کے قابل ہین۔ اُن قومی مراحل کی منزلین بسہولت طے ہو سکین جن پر قومون اور نسلون کی بہت کچھ ترقی اور خوش حالی کا مدار ہی نہ یہ کہ ایسے طور پر صدقہ وخیرات دیجائے کہ لوگ اور بھی کم محنتی اور گدائی کے دلدادہ ہو جائین۔

خور کا صحیح مفہوم یہ ہی کہ اپنی زندگی کے ضروری سامان اور ضروری آسائشین صادق تہذیب وشائستگی کے ماتحت بہم پہنچائی جائین۔ اپنے کنبہ اور اپنے بال بچہ اور ذریات کے واسطے تربیت اور تعلیمی سامان یا مواد ایک خوش اسلوبی سے وقت پر بہم پہنچایا جائے اور اُن کی پرورش دوستانہ اور مربیانہ اُصول پر کیجائے۔ خدانخواستہ اِس طریق سے نہین کہ اُنکی اصلی تربیت اور پرورش کے وسائل کو کھو دیا جائے۔ خور کا یہ مفہوم نہین ہی کہ خود ہی کھائے پیئے دوسرون کی خبر نہ لے بلکہ یہ کہ ہر مستحق کی پرورش کرے۔ جو اپنا حق ہے خود لے جو بال بچہ

اور کنبہ کا حق ہو اُسے دے، جو قوم اور ملک کا ہو اُنھین دے، جو گورنمنٹ کا حق ہو اُسکے حوالہ کرے۔

دآر کا یہ مفہوم نہین ہو کہ دولت کما کر زمین مین دبا چھوڑے یا اُس سے کوئی کام نہ لے بلکہ یہ کہ اُس سے مفید کام لے۔ اولاد کی تعلیم اور تربیت مین لگانا بھی دار کی تعریف یا حد مین آسکتا ہو۔ دوستونکی مدد کرنا بھی دآر کا مفہوم رکھتا ہو۔ آئندہ زندگی یا آئندہ زمانے کے واسطے بچانا اور محفوظ رکھنا دآر کی حد مین داخل ہو۔

اِن تینون اجزا کی تفصیل اور تشریح ایک طول طویل بحث چاہتی ہو جو ایک حد تک دلچسپی سے خالی نہ ہوگی۔ موجودہ بحث سے یہ ثابت ہو کہ اِس چھوٹی سی ترکیب مین کیا کچھ خزانہ بھرا ہو۔ وہ جملہ یا وہ لفظ جو ہر ایک شخص لاپروائی کے ساتھ لکھنے کا عادی ہو لکھنے ہی کا نہین بلکہ کہنے کا بھی اپنی تہ مین یا اپنے اندر کیا کچھ رکھتا ہو۔ صرف یہی نہین صدہا اور ہزارون الفاظ اور فقرات یا جملے ایسے ہین جو اسی قسم کی خوبیان اور عمدگیان اپنے اندر رونہ مین رکھتے ہین۔ لوگ غور نہین کرتے۔ رسمی رنگ مین استعمال اور اطلاق کرنے کے عادی ہین۔

حقیقت الاُمور پر غور کرنا تہذیب اور ترقی کا پہلا زینہ ہو۔ اُستاد طالبعلمون کو رسمی معانی سے آشنا کرنے کے عادی اور مشاق ہین۔ اگر حقیقت اور کیفیت سے قرار واقعی شاگرد آگاہ کیئے جائین تو تعلیم بہت کچھ مفید ہوسکتی ہو۔ تعلیم پانے کے بعد بھی بہت کچھ وقفہ ایسے حقائق اور کوائف پر غور کرنے کا ملتا ہو لیکن اکثر لوگ ایسا موقع رائگان دینے سے دریغ نہین کرتے۔ تعلیم صرف پڑھنے اور پڑھانے کا نام نہین بلکہ غور کرنے اور سوچنے کا نام ہو۔ جو لوگ غور نہین کرتے یا سوچتے نہین وہ صرف عوارض کے مشاق یا شیدائی ہین۔ حقائق سے اُنھین کوئی محبت اور کوئی لگاؤ نہین

حقیقت شناسی ہی اصلی تعلیم اور حقیقی تربیت ہو۔ انسان سوچنے اور غور کرنے کیواسطے ہی بنایا گیا ہو۔ اُسکی خلقت کی علت ہی یہی ہو اور اسی وجہ سے اُسے اور و نپر فضیلت اور شرف کی ممتاز ڈگری ملی ہو۔

سلطان احمد

دکن

دکن مین جو نہین لب پہ ہے اُنکے ہاے دکن
وطن کہین ہو مگر ہین سبھی فدائے دکن

مین سَو پچاس برس اُس طرف نہین کہتا
مگر بہشت کی ہمسر ہے اب فضائے دکن

یقین جانیئے دُنیا کا کوئی خطّہ ہو
ملے کسی کو۔ نہ لیگا کبھی بجائے دکن

بڑے بڑے جو مدبر ہین صاف کہتے ہین
یہی زمانہ معراج ہے برائے دکن

ملا ہے شاہ رعایا نواز، دریا دل
شراب عیش کی جو کھول کر پلائے دکن

ملا دکن کو جو غازہ جمال یوسف* کا
فلک نے نذر دیا عیش رو نمائے دکن

کوئی غریب ستایا گیا قلمرو مین
نظیر ایک بھی ایسی تو آج لائے دکن

زہے جمال تو گویند قتیل عشوہ و نازش
ہزار جان گرامی فدائے پائے دکن

ہے جانفزائی کا دعویٰ اگر تو سچ ہوگا
کہ خستہ جانون کو اکسیر ہے ہوائے دکن

ہمائے اوج ہو بسمل اُسی کے قبضہ مین
خلوص سے جو ہوا آکے جبہ سائے دکن

امین الحسن بسمل

* اعلیٰحضرت کا نام ہے

ایشور چندر ودیا ساگر

کلکتہ کے مغرب مین تقریباً ۵۲ میل کے فاصلے پر بیر سنگھا ایک مقام ہے گذشتہ صدی کے شروع مین موضع بنالی پور سے بیر جی پابند ودیا دھیہ نام کا ایک غریب برہمن خاندان اِس جگہ آکر آباد ہوا - اس کنبہ کا سربراہ رام جے تارک بھوشن نامی ایک شخص تھا جسکی بیوی دُرگا دیوی وہان کے ایک نامی گرامی پنڈت اماپتی تارک لنکر کی بیٹی تھی - رام جے چونکہ ایک نہبی خیال کا آدمی اور سیر وسیاحت کا شایق تھا اس لیئے وہ بسا اوقات سالہا سال تک گھر سے غائب رہتا تھا اور اس اثنا مین اپنی بیوی کو اُس کے باپ کے پاس چھوڑ جایا کرتا تھا - لیکن اماپتی تارک لنکر چونکہ خود نہایت مفلوک الحال تھا اس لیے دُرگا دیوی اور اس کے بچون کا بوجھ اسکے واسطے اور بھی تکلیف دہ ثابت ہوتا تھا - نتیجہ یہ ہوا کہ غریب عورت کو اپنا اور اپنے بچون کا پیٹ پالنے کے لیے چرخہ کاتنا پڑا - لیکن اس سے اسے اسقدر رقم آمدنی ہوتی تھی کہ وہ امدادی روپیہ جو اسے وقتاً فوقتاً اپنے باپ کی طرف سے ملتا تھا ملا کر بھی اپنے کنبہ کو بمشکل فاقہ کشی سے بچا سکتی تھی ان لڑکو نمین سب سے بڑے کا نام ٹھاکر داس تھا جو اپنی عمر کے پندرھوین سال مین اپنی مان، اپنے چھوٹے بھائی، اور اپنی چار بہنون کے گزارے کیلئے روزی تلاش کرنے کلکتہ پہنچا - ہر چند مان اور باپ دونون کی طرف سے وہ ایسے خاندانون سے تعلق رکھتا تھا جو سنسکرت مین فضیلت رکھنے کے لیے مشہور تھے تاہم وہ خود اس زبان مین بہت کم مہارت رکھتا تھا اور چونکہ اُسے اپنے سنسکرت کے مایہ علم مین اصلاح یا اضافہ کرنے کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی اس لیے ناچار اس نے انگریزی کی تھوڑی بہت واقفیت حاصل کرنے کی کوشش شروع کی کیونکہ اس زمانہ مین اس زبان کی تھوڑی بہت شُد بُد رکھنے والون کو یورپین تاجرانہ کوٹھیون مین ملازمت مل جایا کرتی تھی - یہ واقفیت اس نے ایک تاجر کے کلرک سے حاصل کی - اس کوشش مین اکثر اوقات اسے شام کی روٹی کے بغیر ہی گزارہ کرنا پڑتا تھا - کچھ مدت کے لیے ایک فیاض منش شخص نے اپنے خرچ سے اسکی رہائش اور خوراک کا انتظام کر دیا لیکن اِس شخص کی آمدنی چونکہ خود اس کے اپنے اخراجات کی بمشکل کفیل ہو سکتی تھی اس لیے ٹھاکر داس کو بیچ بیچ مین فاقہ کرنا پڑتا تھا جس سے تنگ آکر آخر اس نے فیصلہ کر لیا کہ اپنی پیتل کی تھالی فروخت کر کے تھوڑی سی نقدی حاصل کر لون - لیکن جب وہ تھالی بیچنے چلا تو اُسے کوئی خریدار نہ ملا مایوس ہو کر واپس لوٹ آیا - رفتہ رفتہ مفلسی یہان تک قادر ہوئی کہ ایک دن اُسے بالکل کھانا نہ ملا اور بھوک کے اضطراب کو دور کرنے کے لیے وہ بازار مین ادھر اُدھر پھرنے لگا - اسطرح چلنے پھرنے سے بھوک اور بھی تیز ہوئی اور وہ تھک کر ایک عورت کی دوکان کے آگے جو خشکہ بیچتی تھی بیٹھ گیا - اسے اِس حالت مین بیٹھا دیکھکر اس عورت نے سبب دریافت کیا - اس نے جواب دیا مجھے پیاس بہت لگ رہی ہے ذرا سا پانی پیا چاہتا ہون - عورت نے خیال کیا برہمن دیوتا ہے خالی پیٹ پانی پلانا ٹھیک نہ ہوگا اس لیئے اس نے اسے تھوڑے سے چاول دیے جنھین وہ جلدی جلدی کھا گیا - اس کی یہ حالت دیکھکر اسنے پوچھا کیا تمنے آج کھانا نہین کھایا ہے جس کا جواب بلا شبہہ اس نے نفی مین دیا - عورت رحمدل تھی - اسکی حالت دیکھکر دل پسیجا - تھوڑا دہی اور چاول کیلے کے پتہ پر ڈالکر اس کے آگے رکھ دیے اور کہہ دیا آئندہ کبھی اس طرح بھوکے ہو تو میرے یہان چلے آیا کرو - اس واقعہ کے تھوڑی مدت بعد اُسے آٹھ روپیہ ماہوار کی ملازمت ملگئی -

غریب درگا دیوی کے لیے یہی ایک بڑی بھاری رقم تھی - انہی ایام مین ٹھاکر کی شادی ایک فاضل پنڈت کی بیٹی بھگوتی دیوی سے ہوگئی اور ان کا پہلوٹھا بچہ ایشور چندر پیدا ہوا -

ایشور چند ر ابھی ماں کے پیٹ ہی میں تھے کہ اِن کے دادا رام جے کو خواب میں نظر آیا کہ میرے خاندان میں ایک بیٹا پیدا ہوگا جو تمام خاندان کا نام روشن کرے گا اور اپنے ہموطنوں کو بیشمار فوائد پہنچائیگا۔ اسی قسم کی پیشین گوئی بھونند بھٹاچاریہ نامی ایک جوتشی نے بھی کی تھی۔ بالآخر ستمبر ۱۸۲۰ء میں بھگوتی دیوی کے گھر وہ مضبوط، صحت ور اور خوبصورت بچہ پیدا ہوا جسکی صورت دیکھکر ہی معلوم ہوتا تھا کہ وہ ساری توقعات پوری کر دکھائیگا۔

بچہ چونکہ ورشبھ راس میں پیدا ہوا تھا اس لیے بڑھا رام جے اسے مذاقاً "بچھڑا" کہا کرتا تھا اور فی الحقیقت اسے اپنی زندگی کے اندر مختلف غلطیوں اور تعصبات کا مقابلہ کرنے میں ایک سانڈ کی طرح جد و جہد کرنا پڑی۔ بچہ اپنے دادا کی طرح جسمانی طور پر مضبوط تھا چنانچہ ایک موقعہ پر جب عالم شباب میں وہ کسی سیاحت کو طے کر رہا تھا اسکا ایک ریچھ سے مقابلہ ہو گیا جس نے ہر چند اسے بہت زخمی کر دیا تاہم اس نے اسے لوہے کا ڈنڈا مار کر جان سے مار دیا۔

جب ایشور چندر کی عمر پانچ برس کی ہوئی تو انھیں بیر سنگھ کی ایک پاٹ شالا میں تعلیم حاصل کرنے بھیجدیا گیا جہاں اُنھوں نے کالی کنت چٹو پادھیا نامی معلم سے بنگالی زبان کی ابتدائی تعلیم حاصل کی اگرچہ لڑکا انکی تعلیم سے پرانہ دلچسپی رکھتا تھا نتیجہ یہ ہوا کہ زندگی بھر شاگرد کی اِس سے خوب ہی محبت رہی۔

نوجوان ایشور چندر بڑا ہی شوخ طالب علم تھا۔ وہ اپنے ہمسایہ کے باغیچوں سے پھل چُرا لاتا، انکی فصلیں خراب کرتا اور کپڑے جو دھو کر خشک کرنے کے لیے دھوپ میں رکھے ہوتے انھیں خراب کر دیتا۔ یہی وجہ تھی کہ ہمسایہ کے لوگ اکثر اس کے شاکی و نالاں پائے جاتے تھے لیکن باوجود اسکے اُستاد نے کبھی اس سے زیادہ مار پیٹ کا سلوک نہیں کیا۔

ایشور چندر کی عمر ۹ برس کی تھی کہ ان کے والد ٹھاکر داس انھیں مزید تعلیم دلانے کلکتہ لے گئے۔ ان دنوں سڑکوں کی حالت نہایت خراب تھی جسکی وجہ سے ۶۰ میل کا فاصلہ تین یوم میں پورا ہوا اور یہیں سے انکی پیادہ روی کی وہ طاقتیں ترقی پذیر ہونا شروع ہوئیں جو بعد میں انکے اندر نمایاں طور پر موجود پائی جاتی تھیں۔ بسا اوقات اُنھوں نے بیر سنگھا اور کلکتہ کا درمیانی فاصلہ صرف ایک دن میں طے کیا اور ایک موقع پر اُنھوں نے ۲۵ گھنٹہ میں ۱۰۰ میل کا فاصلہ طے کیا تھا۔ چلنے میں بڑے بڑے مضبوط جوان ان کا مقابلہ نہ کر سکتے تھے اور بارہا دیکھا جاتا تھا کہ وہ اپنے ہمسفروں کو آرام دلانے کی خاطر ان کا بوجھ بھی اپنے ہی سر پر رکھ لیتے تھے۔ اپنی عمر کے آخری حصہ میں بھی جب کہ امراض اور بڑھاپے کی وجہ سے انکی جسمانی حالت بہت کمزور ہو چکی تھی ایک روز جبکہ وہ کرماٹار میں جہاں وہ علیحدگی کی زندگی بسر کرتے تھے اپنے دوستوں اور رشتہ داروں سمیت سیر کرنے پھر رہے تھے، ان کے پوتوں میں سے ایک نے جو جوان عمر تھا کہا "دیکھوں آپ مجھ سے بھی زیادہ تیز چلنے والے ہیں۔ کسی روز ہمارا اور آپ کا مقابلہ ضرور ہوگا" عمر رسیدہ ایشور چندر نے جواب دیا کہ "کسی روز کیا ابھی کر کے دیکھ لو" اتنا کہکر اُنھوں نے دھوتی کو خوب کس لیا اور تھوڑے ہی عرصے میں اس نوجوان اور اس کے بعض ہمراہیوں کو چند فرلانگ پیچھے چھوڑ کر آگے نکل گئے شیخی باز نوجوان نے ان تک پہنچنے کی جان توڑ کر کوشش کی مگر رہ گیا۔ بوڑھا بابا دور سے اسکی کوششوں کو دیکھتا اور مسکرا کر چپ رہ جاتا تھا۔

جب ایشور چندر کو کلکتہ پہنچایا گیا تو ان کے والد ٹھاکر داس کو صرف ۸ روپے ماہانہ ملتے تھے لیکن اس پر بھی اُنھوں نے اس بات کا مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ انھیں بہترین ممکن تعلیم دلائی جائے۔ ایک شریف النفس کایستھ نے باپ بیٹے پر رحم کھا کر انھیں نہ صرف اپنے ہاں رہنے کے لیے جگہ دی بلکہ کھانے کپڑے کا بھی بندوبست کر دیا۔ اس کنبہ کے سبھی آدمی بالخصوص ایک بیوہ عورت (رئیمنی) ایشور چندر سے بے حد محبت کرتی تھی اور انسے اپنے بیٹے سے بھی بڑھ کر سلوک کیا کرتی تھی۔ ایشور چند ر نے جہاں اپنی خودنوشت سوانح عمری میں اس کا ذکر کیا ہے وہاں لکھا ہے کہ "میں نے رئیمنی سے بڑھکر مہربان محبت کرنے والی اور فراخدل عورت نہیں دیکھی

اِس پاکباز عورت کی تصویر مدت العمر میرے دل پر نقش رہے گی۔ وہ ایک دیوی تھی جسکی مین اپنی مان سے بھی بڑھکر تعظیم کرتا ہون' اور بڑھاپے مین بھی جب کبھی اسکی یاد آتی ہو تو بے اختیار آنکھون سے آنسو نکل پڑتے ہین" ایشور چند ر جب تک زندہ رہے ہمیشہ عورت کی عزت و تکریم کرتے رہے۔ اِس احساس کی بنا عام خیال کے بموجب اس نیک سلوک کے باعث ان کے دل مین قائم ہوئی تھی جو رہمنی نے ان سے اُور اس خشکہ بیچنے والی عورت نے ان کے والد سے کیا تھا۔

کالکتہ پہنچنے کے بعد ابتدائی تین ماہ کا عرصہ ایشور چند ر نے ایک دیہی نیکو پاٹ شالا مین بسر کیا جہان اُنھون نے تھوڑی بہت بنگالی تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد انھین سنسکرت کالج مین داخل کرادیا گیا جس جگہ عمر رسیدہ پنڈت پرانے طریق پر طلبہ کو پڑھایا کرتے تھے معلم اور متعلم دونون فرش پر بوریہ بچھا کر بیٹھا کرتے تھے۔ حاضری مین باقاعدگی یا پابندی اوقات کا فریقین کو خیال نہ ہوتا تھا اور معلمون مین سے بعض دن کا ابتدائی حصہ سو کر گذارا کرتے تھے۔ تعلیم کے آٹھ کورس مقرر تھے جن کی سرسری تفصیل حسب ذیل تھی :-

(۱) گرامر یعنی ویاکرن۔

(۲) علم ادب یعنی ساہتیہ۔

(۳) علم کلام۔

(۴) قانون یا سمرتی۔

(۵) فلسفہ۔

(۶) ویدانت۔

(۷) علم نجوم۔

(۸) آیور وید۔

ظاہر ہو کہ اِن سب کو ختم کرنے کے لیے ایک مدت درکار ہوتی تھی لیکن اِس زمانہ کے معلم بڑے قابل اور فاضل لوگ ہوتے تھے اور تعلیم نہایت اطمینان بخش طریقہ پر دی جاتی تھی۔ ایشور چند ر کو جنوری ۱۸۲۹ء مین اس جگہ داخل کرایا گیا تھا اور ۱۸۴۱ء تک اس جگہ زیر تعلیم رہے۔ بالآخر جب انھون نے تعلیم ختم کی تو ان کی عمر ۲۱ برس کی تھی۔ اس جگہ اُنھون نے جو ۱۲ سال بسر کئے اس کے دوران مین اُنھون نے علوم کی ۹ شاخون مین سے چھ مین کامیابی حاصل کی۔ ان کی تعلیم کا زمانہ نہایت ہی شاندار تھا' یعنی ایسا جو صرف نادر قابلیت اور خوبی کے لوگون کو نصیب ہوسکتا ہو۔ وہ بڑی کامیابی کے ساتھ کالج کی ایک جماعت سے دوسری مین ترقی کرتے رہے۔ سوائے ایک کے وہ تمام امتحانات مین نمبر اول پر رہے اور ہمیشہ انعام اور وظائف حاصل کرتے رہے۔ زمانہ طالب علمی کے تیسرے سال مین ساہتیہ کے پروفیسر نے انھین اپنی جماعت مین داخل کرنے سے انکار کردیا کیونکہ انکی عمر اسوقت صرف ۱۱ سال کی تھی لیکن آخرکار اسے بھی انکی قابلیتون کا قائل ہوکر داخل کرنا پڑا۔ ۱۳ سال کی عمر مین سنسکرت کے ایسے عمدہ شلوک لکھ سکتے تھے کہ سب لوگ انکی تعریف کرتے تھے۔ زمانہ طالب علمی ہی مین ان کا رسوخ اسقدر بڑھ چکا تھا کہ ایک پنڈت کو انکی سفارش پر فلسفہ کا پروفیسر مقرر کیا گیا۔ تعلیم ختم کرنے سے پہلے وہ خود بھی گرامر کے قائم مقام پروفیسر مقرر ہو گئے اور ایک مرتبہ جب نیائے شاستر کے ایک دقیق مسئلہ پر انکی پنڈت رام موہن ترک سدہانت سے جو اپنے عصر کا بڑا نامور فیلسوف ہو گذرا ہو' بحث ہو گئی تو اُنھون نے اسے از روئے استدلال مغلوب کردیا جب اِس واقعہ کی خبر بڈھے ٹھاکر داس کو ملی تو وہ فوراً کالج مین پہنچا اور پنڈت جی کے پاؤن کی خاک اپنے بیٹے کے سر پر رکھی تاکہ وہ انکسار کا سبق سیکھ سکے۔ ایک اور عمر رسیدہ پروفیسر کو انکی دوراندیشی اور عاقبت بینی کے خیال پر یہان تک اعتماد تھا کہ جب اس نے بڑھاپے مین ایک جوان لڑکی سے دوبارہ شادی کرنے کا ارادہ کیا تو اس مسئلہ پر ان سے رائے لینی ضروری خیال کی بجا لیکہ اِن دنون اِن کی عمر صرف ۲۰ سال کی تھی۔ ایشور چند ر نے اپنے معلم کے دلائل کو بڑے صبر و تحمل سے سنا اور وہ صرف اِسی نتیجہ پر پہنچ سکے کہ بڈھے پنڈت کا اپنی پوتی کی عمر کی لڑکی سے

شادی کرنا حد درجے کی خود غرضی اور ناعاقبت اندیشی پر دلالت کرتا ہے، اس لیئے اسے صاف لفظون مین بتادیا کہ آپ اگر یہ کام کرین گے تو سخت غلطی کے مرتکب ہونگے۔ لیکن اسوقت ان کے کہنے کی پروا نہ کی گئی اور نہ صرف بڈھے نے اِس لڑکی سے شادی کر لی بلکہ وہ ایشور چندر کو اپنی بیوی دکھانے کے لیئے ساتھ بھی لے گیا۔ وہ اپنے معلم کے ہمراہ بہت کچھ تامل کے بعد گئے اور لڑکی کو دو روپیہ منھ دکھائی کے دیئے۔ وہ غور سے اس کا منھ دیکھے بغیر واپس ہونے ہی کو تھے کہ بڈھے نے ان کا بازو پکڑ کر اسکا چہرہ پورے طور پر دیکھنے پر مجبور کیا۔ ایشور چندر نے اس حسین لڑکی کے چہرہ کی طرف دیکھا اور فوراً وہان سے لوٹ آئے۔ جب اُنھون نے اس بات پر غور کیا کہ قدرتی طور پر اس غریب کو عنقریب مختلف دشواریان اور مصیبتین پیش آنے والی ہین تو بے اختیار انکی آنکھون سے آنسو نکل پڑے۔ ان کے خیالات بالکل سچ ثابت ہوئے اور لڑکی چھوٹی عمر ہی مین بیوہ ہو گئی۔

جب ایشور چندر نے سنسکرت کالج کا آخری امتحان پاس کر لیا تو انھین "ودیا ساگر" (بحر العلوم) کا خطاب دیا گیا۔ اسکے علاوہ کالج کے سارے پروفیسرون نے جداجدا طور پر انھین سندات دین کیونکہ انمین سے ہر ایک کو اس قسم کے ہونہار شاگرد کا معلم ہونے پر فخر تھا۔ ان دنون انکی عمر صرف ۲۱ سال کی تھی۔ اِس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ چھوٹی عمر ہی مین وہ کسقدر ذہین اور محنتی تھے۔

لیکن خالی ذہانت رکھنے سے کسی شخص کو قابلِ ذکر قابلیت حاصل نہین ہو سکتی۔ معلوم ہوتا ہے کہ ودیا ساگر کو ہمیشہ اس مقولہ کی صداقت کا اعتراف تھا کہ "ذہانت کے ساتھ غیر معمولی محنت سے بھی کام لیا جائے تو انسان اس رفعت پر پہنچ سکتا ہے جو دُنیا مین اس کا نام روشن کرے"۔ اگر کسی شخص کو ودیا ساگر کے برابر ذہانت حاصل ہوتی لیکن وہ غیر معمولی محنت اور جد و جہد کا معتقد نہ ہوتا تو شاید اُن حالات مین کام کرتے ہوئے جو ایشور چندر کو پیش آئے وہ کبھی ان کے برابر ناموری حاصل نہ کر سکتا۔ جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے ودیا ساگر ایک بہت غریب خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے والد کی آمدنی صرف اتنی تھی کہ جس سے وہ بمشکل اپنا اور اپنے کنبہ کے لوگون کا گذارا چلا سکتا تھا۔ اِن حالات مین جیسا بُرا بھلا کھانا کپڑا نصیب ہوتا اِسی کو غنیمت سمجھا جاتا تھا۔ کیونکہ اتنی توفیق حاصل نہ تھی کہ کوئی اچھا سا مکان کرایہ لیا جائے یا کوئی نوکر کام کرنے کے لیئے رکھین۔ اِن وجوہ سے ودیا ساگر کو بچپن مین خراب کھانا، بُرے کپڑے، مضر صحت مکان، اور ادنیٰ نواحات مین زندگی بسر کرنا پڑتی تھی۔ انھین اپنے والد اور بھائیون کے سبھی کام مثلاً سودا خریدنا، کھانا پکانا، جھاڑو دینا، کپڑے دھونا، صفائی کرنا، خود ہی کرنا پڑتے تھے۔ اِن بواعث سے انھین صبح اور رات کے پہلے حصّہ مین مطالعہ کرنے کا بہت کم وقت ملتا تھا۔ لیکن اِن مشکلات پر بھی جب کبھی انھین وقت ملتا وہ مطالعہ مین منہمک رہتے تھے۔ بسا اوقات دیکھا جاتا تھا کہ سبزی پک رہی ہے اور یہ کتاب لیئے پاس بیٹھے پڑھ رہے ہین یا مدرسہ کو جا رہے ہین تو راستہ مین کتاب دیکھتے جاتے ہین۔ ان کے لیے ایک ایک لمحہ قیمتی تھا اور وہ وقت کی بے حد قدر کرتے تھے۔ لیکن اِس پر بھی چونکہ انھین بہت کم اور ناکافی وقت مل سکتا تھا اسلیئے وہ بہت رات تک مطالعہ کرتے تھے۔ سُنا گیا ہے کہ وہ رات کے دس بجے سوتے تھے، اور ان کے اصرار پر ان کا والد ۲ بجے اُنھین جگا دیا کرتا تھا۔ اسوقت سے لیکر صبح تک وہ برابر مطالعہ مین مصروف رہتے تھے۔

ان کے سونے کی جگہ ایک ۳ × ۲ فٹ کے برآمدہ مین تھی جہان وہ اتنی ہی لمبی چوڑی چٹائی پر لیٹے رہتے تھے۔ لیکن جب ان کا تیسرا بھائی انکے پاس آکر رہنے لگا تو ایک ہمسایہ نے ازراہ عنایت ان کے رہنے کے لیے ایک چھوٹا سا کمرہ دیدیا جس کا فرش بہت سیلا تھا جہان مچھر کھٹمل اور جھینگر بکثرت تھے۔ لیکن جو شخص دن رات مین اسقدر محنت کرتا ہو اسے مچھرون، پسوؤن یا جھینگرون کی کیا پروا ہو سکتی ہے۔ چھوٹی عمر مین وہ پستہ قد تھے اور انکا سر غیر معمولی طور پر بڑا تھا۔ اس لیے ان کے ہم جماعت

طلبہ انھین "جیسو رے کائی" یا "کسو رے جائی" کہا کرتے تھے جس سے مراد جیسو ر کی اس مچھلی سے ہے جس کا سر بہت بڑا ہوتا ہے۔ ان کا والد باوجود محبت کرنے کے اکثر ان سے سختی کا سلوک کرتا تھا۔ کالج کی تعلیم کے ابتدائی ایام مین وہ ہر روز رات کے وقت ان کا سبق سُنتا اور ذرا سی غلطی بھی ہو جاتی تو اُنھین مارتا پیٹتا تھا۔ ان ایام مین وہ اس بات پر بھی مُصر رہتا تھا کہ رات کو فلان وقت سے پہلے نہ سوتا اور اس سے پہلے کبھی ان کی آنکھ لگ جاتی تو انھین بڑی سختی سے بیدار کیا جاتا تھا۔ کبھی کبھی نیک دل رمینی ان کی شفارش کر دیا کرتی تھی لیکن ایک موقع پر تو ان کے والد نے انسے اسقدر سختی کا سلوک کیا کہ باوجود ایک مطیع اور فرمانبردار لڑکا ہونے کے انھین بھاگ کر رام دھن گنگولی (ایک معمر ہمسایہ) کے مکان مین پناہ لینا پڑی۔ اتفاقات زمانہ سے آخر ایک وقت ایسا بھی آیا جب یہ سنسکرت کالج کے پرنسپل بنے اور رام دھن گنگولی ان کے ماتحت چھوٹی حیثیت مین کام کیا کرتا تھا۔ انھین واپس اپنے والد کے مکان پر پہنچا یا گیا لیکن باپ کی طرف سے ان کے ساتھ جو بدسلوکی ہوتی رہی تھی اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ عمداً اس کے احکام کی خلاف ورزی کرنے لگے۔ طبیعت کے ایسے پکے تھے کہ جب ایک بات کا مصمم ارادہ کر لیا تو مار پیٹ کے باوجود اپنے ارادہ سے باز نہ آئے۔ لیکن آخر کار ان کے والد کو اپنی غلطی محسوس ہو گئی اور اس نے ان سے محبت و نرمی کا سلوک کرنا شروع کر دیا۔ اس واقعہ سے والدین ایک بہت اچھا سبق حاصل کر سکتے ہین۔ نہ صرف والدین بلکہ استادون اور تمام با اختیار لوگون کا فرض ہے کہ وہ بجائے سختی کے نرمی سے کام لیا کرین۔ انسانی طبیعت کو مطیع کرنیکا اس سے بہتر کوئی طریقہ نہین کہ نرمی اور محبت کا سلوک کیا جائے۔ حد درجہ کے شریف، مطیع اور نیک بچے بھی غیر معمولی سختی اور عدم توجہی سے نافرمانبردار اور گستاخ بن جاتے ہین۔ جب دیکھا جائے کہ وہ اس غلط راستے پر چلنے لگے ہین تو لازم ہے کہ وہ شخص جو ان پر اختیار رکھتا ہو فوراً اپنی روش بدلکر ان سے مہربانی اور ہمدردی کا سلوک کرنے لگے۔

جب وہ کالج مین تعلیم پا رہے تھے اور ان کی عمر ۱۴ برس کی تھی انکی شادی دین مے دیوی سے ہوئی جو شتر گھن بھٹاچارجی نامی ایک مرفہ الحال اور عزت دار برہمن کی خوبصورت بیٹی تھی۔ اپنی بیوی سے انھین شروع ہی سے بے حد محبت رہی اور اسی کے بطن سے ان کا بیٹا نارائن چندر اور چند لڑکیان پیدا ہوئین۔ اسکا انتقال ان کے دو سال قبل ہو گیا تھا۔

۱۸۳۹ء مین جب اُنھون نے سنسکرت کالج کی طرف سے "ودیا ساگر" کا خطاب حاصل کیا تو اس کے ساتھ ہی ان کی زندگی کے پہلے اہم حصہ کا خاتمہ ہو گیا یعنی اُس حصہ کا جس مین اُنھون نے اپنی مشرقی تعلیم مکمل کی تھی۔ لیکن یہ تعلیم انکی اس کامل تعلیم کا محض ایک جز و تھی جسکی بدولت وہ اپنی زندگی مین کار ہائے نمایان سرانجام دے سکے۔ انھین اپنی تعلیم مکمل کرنے کے لیے انگریزی سیکھنا ضروری تھا جو سنسکرت کالج مین اُنھون نے بدرجۂ اقل سیکھی تھی۔ کالج سے نکلنے کے بعد ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس سے انکے دل مین اس بات کی تیز خواہش پیدا ہوئی کہ انگریزی زبان سیکھین اور وہ واقعہ یہ تھا کہ ۱۸۴۱ء مین انھین فورٹ ولیم کالج کا ہیڈ پنڈت مقرر کیا گیا جہان وہ انگریز سویلینون کو ملک کی ورنیکولر زبانین سکھایا کرتے تھے۔ اس حیثیت مین ہر روز ان کا واسطہ انگریز طلبہ سے پڑتا تھا، اور چونکہ اسی سلسلے مین انکا اکثر دیگر نامی گرامی انگریزون سے میل جول ہوتا تھا اس لیئے قدرتی طور پر ان کے دل مین اس بات کی کوشش پیدا ہوئی کہ انگریزی کی خاصی تعلیم حاصل کرین۔ پس اُنھون نے بڑی محنت، استقلال اور ہمت کے ساتھ اس زبان کو سیکھنا شروع کیا اور تھوڑے ہی عرصے مین اس پر بخوبی قادر ہو گئے۔ اس زبان مین بہت جلد اُنھون نے یہان تک قابلیت حاصل کر لی کہ انکے انگریزی مضامین کی عام

طور پر تعریف کی جاتی تھی مشہور و معروف ڈاکٹر درگا چرن بنیرجی (جو بابو سریندر ناتھ بنیرجی کے والد بزرگوار تھے) اور راج نرائن باسو ہر دو صاحب نے انھین انگریزی سیکھنے مین بہت کچھ مدد دی اور انھی ایام مین انکی ملاقات مشہور و معروف زمیندار راجہ راد ہاکنت دیب بہادر مشہور بنگالی مصنف اکشئے کمار دت اور بعض دیگر مشاہیر بنگال سے ہوئی۔ وہ خود بعض عمر رسیدہ عالمون کو سنسکرت پڑہایا کرتے تھے اور ان کا طریق تعلیم ایسا عجیب اور جدید تھا کہ جو مضمون سنسکرت کالج کے دیگر پروفیسر برسون مین پڑہاتے اُسکو یہ تھوڑے عرصہ مین پڑہا سکتے تھے۔ اپنے ایک شاگرد کی خاطر جس نے بعد مین ایک لائق اُستاد ثابت ہو کر ان کا نام بخوبی روشن کیا اُنھون نے سنسکرت کی مشہور ویاکرن (گرامر) مگدہ بودھ کو رات بھر کے اندر اندر خلاصہ کرکے بنگالی زبان مین لکھ لیا تھا۔

جن دنون وہ ہیڈ پنڈت کا عہدہ رکھتے تھے ہندوستان کے لارڈ ہارڈنگ گورنر جنرل تھے۔ وہ فورٹ ولیم کالج کا معائنہ کرنے گئے اور بہت دیر تک ان سے گفتگو کرتے رہے جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۸۴۴ء سے ۱۸۴۶ء تک بنگال کے مختلف حصون مین ۱۰۱ ورنیکولر اسکول جاری ہو گئے۔ ان اسکولون سے ان طلبہ کو بہت فائدہ حاصل ہوا جو سنسکرت کالج سے تعلیم پاکر نکلتے تھے کیونکہ ان اسکولون کے لیے معلم مقرر کرنے کا کام ودیاساگر کے سپرد تھا۔ اس مین شک نہین کہ انکی اس کارروائی سے سنسکرت کالج کے پروفیسر بہت ناراض ہوئے تاہم حقیقت یہ ہی کہ اُنھون نے جن اُستادون کو نامزد کیا ان سب کی حالت مین کبھی اپنے ضمیر کا خون نہین کیا۔ راستی کے اسقدر پابند تھے کہ ایک موقعہ پر کسی بات پر سنسکرت کالج کے پرنسپل سے تکرار ہو گئی جس کی وجہ یہ تھی کہ وہ ان سے کوئی ایسی بات کرانا چاہتے تھے جسے یہ اپنے ضمیر کے خلاف پاتے تھے۔ آخرکار یہ اپنے عہدہ سے استعفا دینے پر آمادہ ہو گئے گو بعد مین یہان تک نوبت نہ پہنچنے پائی تاہم ان کے اس طریق عمل سے ان کے افسرون کی نظر مین انکی وقعت اور بھی زیادہ ہو گئی۔

اپنے موجودہ عہدہ پر وہ ۵۰ ماہوار تنخواہ پاتے تھے جو کسی طرح بھی زیادہ متصور نہین ہو سکتی لیکن جب ایک موقعہ پر سنسکرت کالج مین انھین گرامر کے پروفیسر کی جگہ دی جانے لگی جس سے انھین للعہ زیادہ ملنے کی اُمید تھی تو اُنھون نے اپنے نفع کی پروا نہ کرتے ہوے یہ عہدہ مشہور و معروف تارا ناتھ ترک واچسپتی کو دلادیا کیونکہ وہ انھین اپنے سے زیادہ قابل شخص سمجھتے تھے۔ یہی وہ موقع تھا جبکہ اُنھون نے ۵۴ گھنٹہ مین ۔ میل کا فاصلہ طے کیا اور وہ بھی محض اس غرض سے کہ تارا ناتھ سے کہکر اس عہدہ کے لیے عرضی دلائین جب اس فاضل پروفیسر اور اسکے باپ نے ودیاساگر کی زبانی یہ پیغام سُنا تو ان کی حیرت کی کچھ انتہا نہ رہی اور وہ یک زبان ہو کر کہنے لگے۔ "ودیاساگر تم انسان نہین فرشتہ ہو!" اس واقعہ سے اس بات کا پورے طور پر ثبوت ملتا ہی کہ لارڈ ہارڈنگ کے قائم کردہ اسکولون کی آسامیان پُر کرنے مین اُنھون نے کس قدر دیانت داری سے کام لیا ہوگا۔

۱۸۴۶ء مین فورٹ ولیم کالج سے ان کا تعلق قطع ہو گیا اور وہ سنسکرت کالج کے اسسٹنٹ سکرٹری بنے۔ فورٹ ولیم کالج مین اُنھون نے پانچ سال تک جو کام کیا تھا اس سے دیگر فوائد کے علاوہ اُنھین ایک خاص فائدہ یہ حاصل ہوا کہ اُنھون نے انگریزی کی تعلیم حاصل کر لی۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہی کہ کالج مذکور سے ان کا تعلق ان کی خوش نصیبی کی دلیل تھا کیونکہ اسی کی بدولت انکے خیالات کو وسعت اور آرا کو اہمیت حاصل ہوئی اور اسی کے وسیلے سے اُنھون نے بہ حیثیت ایک مصلح وہوا خواہ بنی نوع انسان بڑے بڑے معرکہ کے کام سر انجام دیئے۔ یہ خیال غیر درست نہ ہوگا کہ حامی تعلیم کی حیثیت مین ان کے کام کی ابتدا فورٹ ولیم کالج ہی مین ہو گئی تھی۔ کیونکہ وہان پر کالج کا کام کرنے کے علاوہ پرائیویٹ طور پر بھی ذ تدریس کا کام کرتے تھے۔ اس سے ہرچند کہ انھین کوئی خاص مالی

فائدہ نہین ہوا تاہم ان کے دل مین اس بات کا رجحان ضرور پیدا ہوگیا کہ سنسکرت تعلیم کو سادہ اور جدید اُصولون پر قائم کیا جائے اور یہی وہ بات تھی جو بعد مین ان کے لیے موجب شہرت ثابت ہوئی۔ ۱۸۴۶ء مین جب وہ سنسکرت کالج کے نائب سکرٹری بنے تو اس بارے مین انھین کام کا کافی موقعہ مل گیا اور بہت جلد اُنھون نے اپنے ضبط انتظام اور باقاعدگی سے شہرت حاصل کرلی۔ لیکن جب کالج کے سکرٹری یا منتظم خاص نے انکی بعض اصلاحی کارروائیون پر اعتراض کیا تو انھین مجبوراً اپنے عہدہ سے دست بردار ہوکر پرائیویٹ زندگی اختیار کرنا پڑی۔ ان کے ذاتی اعزاز اور خودداری کا ثبوت ایک اور واقعہ سے بھی ملتا ہے جو انہی ایام مین ہوا تھا۔ سنسکرت کالج کے نائب سکرٹری کی حیثیت مین انھین ایک روز ہندو کالج کے مسٹر کر کے ہان جانے کا اتفاق ہوا جس نے ان سے اچھا سلوک نہ کیا۔ جب یہ اس سے ملنے گئے تو اس نے انھین نہ تو کرسی دی اور نہ اچھی طرح پیش آیا بلکہ ٹانگین پھیلا کر آرام چوکی پر لیٹا رہا۔ ودیاساگر کو اس سے رنج تو بہت ہوا لیکن اُنھون نے اسوقت اس معاملہ کو رفت گزشت کردیا اور مسٹر کر سے جو کام تھا اسے سرانجام دیکر واپس چلے آئے۔ لیکن اُنھون نے اپنے دلمین اس بات کا عہد کرلیا تھا کہ مین مسٹر کر کو اس بارے مین ضرور سبق سکھاؤن گا چنانچہ بہت جلد ایک موقع اس قسم کا درپیش ہوا کہ مسٹر کر ان سے ملنے کے لیے آئے۔ ودیاساگر نے کمرہ سے تمام کرسیان اُٹھوا دین اور خود اسی حالت مین بیٹھکر جس مین اُنھون نے مسٹر کر کو بیٹھا دیکھا تھا نوکر سے کہا کہ صاحب کو اندر آنے دو۔ اس حالت مین مجبوراً صاحب کو کھڑا رہنا پڑا اور ودیاساگر کے ہاتھون اپنی اس طرح توہین ہوتے دیکھکر وہ سخت ناراض ہوئے یہان تک کہ آخر اس کی بڑی سختی سے شکایت لکھ بھیجی۔ تعلیمی کونسل کے سکرٹری نے ودیاساگر سے کیفیت طلب کی جسکے جواب مین اُنھون نے لکھا کہ مین اس سبق پر عمل کر رہا ہون جو خود مسٹر کر نے مجھے سکھایا تھا۔ اس بیان کو اطمینان بخش سمجھا گیا اور مسٹر کر کو جواباً لکھدیا گیا کہ آپ ودیاساگر سے اپنے طور پر اس معاملہ کو طے کرلین۔ چنانچہ بعد مین ایسا ہی ہوا۔

سنسکرت کالج سے ودیاساگر کا تعلق صرف تھوڑے ہی دن قطع رہا کیونکہ دسمبر ۱۸۵۰ء مین انھین علم ادب کی پروفیسری کا عہدہ پیش کیا گیا جسے اُنھون نے اس شرط پر منظور کرلیا کہ مجھے پرنسپل یا اس انسٹی ٹیوشن کے افسر اعلیٰ کے برابر انتظامی اختیارات دیے جائین۔ ان کا تقرر اس وقت عمل مین آیا تھا جبکہ سنسکرت کالج مین طلبہ کی تعداد کے بتدریج کم ہوتے جانے سے تعلیمی کونسل کو اس بات کا اندیشہ پیدا ہوگیا تھا کہ کہین انسٹی ٹیوشن کو بند ہی نہ کرنا پڑے۔ پس سب سے اول اُنھون نے ودیاساگر کو جو کام تفویض کیا وہ یہ تھا کہ کالج کی ترقی کے متعلق اپنی رپورٹ پیش کرین اور اس کام کو اُنھون نے ایسے حسن طریقت سے سرانجام دیا کہ کونسل نہ صرف انکی اعلیٰ قابلیت اور دانشمندی کی قائل ہوگئی بلکہ جو طریق عمل اُنھون نے اپنی رپورٹ مین قائم کیا تھا اس پر عمل پیرا ہونے کے لیے بھی رضامند ہوگئی۔ پس اس نے انکی اصلاحات مجوزہ کو سر بسر منظور کرلیا اور انھین باقاعدہ طور پر کالج کا پرنسپل مقرر کردیا۔ اس طرح پر اختیارات حاصل ہوجانے پر اُنھون نے بہت سی اُن اصلاحات کو عمل مین لانا شروع کیا جنھین وہ اس وقت جب چند سال پیشتر نائب سکرٹری کی حیثیت سے عمل مین نہ لا سکے تھے۔ حاضری کی باقاعدگی اور دیگر اُمور مین پروفیسرون اور طلبہ دونون کو یکسان طور پر تنبیہ کی گئی۔ سزائے جسمانی کا طریقہ موقوف کردیا۔ تعلیم انگریزی کو جبری بنادیا گیا اور اس بات کی عام اجازت دیدی گئی کہ کالج مین چھوٹی ذاتون کے لڑکے بھی پڑھ سکتے ہین۔ علاوہ برین سنسکرت تعلیم کو ایسے طریق پر مرتب کیا گیا کہ اسمین بہت کچھ سادگی پیدا ہوگئی اور وہ زمانہ موجودہ کے معیار تعلیمی کے مطابق اور ضروریات کو پورا کرنے کے قابل ہوگئی۔

اِن کا منشائے دلی یہ تھا کہ کالج کو ایک ایسے دار العلوم کی حیثیت دیجائے جہان نہ صرف سنسکرت کی اعلیٰ و ارفع تعلیم حاصل ہوسکے بلکہ اس کے ذریعہ سے ورنیکولر لٹریچر کی اصلاح ہو اور یہان سے جو استاد تعلیم پاکر نکلین وہ تعلیم عامّہ کی اشاعت مین مدد دے سکین۔ یہ بیان کرنا غیر ضروری ہوگا کہ مناسب وقت گذرنے پر ان کا یہ منشا تمام و کمال پورا ہوگیا لیکن اسمین کلام نہین کہ اِس کے حصول مین انھین بڑے صبر اور محنت و استقلال سے کام لینا پڑا۔ قریب قریب جتنے معلم ان کے ماتحت کام کرنے والے تھے وہ سب کسی وقت مین انکے اُستاد رہ چکے تھے اور اِن سب کو ضبط کے دائرۂ انتظام مین لانا واقعی ایک مشکل کام تھا۔ لیکن انھون نے اپنے ذہن رسا کی مدد سے ایسی ایسی ترکیبین سوچین کہ بُڈھے طوطون کو بھی پڑھا ہی لیا۔

قبل ازین بیان کیا جاچکا ہے کہ ودیا ساگر بڑے خوش مزاج تھے۔ اِس خوبی کے علاوہ قدرت نے انکی طبیعت مین مذاق سلیم کا مادہ بھی کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ سزاے جسمانی سے انھین جو نفرت ابتدا ہی سے تھی اسکی وجہ غالباً یہ تھی کہ بچپن مین وہ خود اس کا شکار رہ چکے تھے اور اسی کی وجہ سے چند مرتبہ انھین اپنے والد کے احکام کی بھی خلاف ورزی کرنا پڑی تھی۔ شروع سے آخر تک ان کے دل مین یہی خیال پختہ رہا کہ کسی تعلیمی انسٹی ٹیوشن کی کامیابی کا دار و مدار اس بات پر ہوتا ہے کہ اُستادون اور طالبعلمون کا باہمی برتاو حُسن سلوک پر مبنی ہو۔ ہر کام مین طلبا اپنے استادون کی امداد پر کمربستہ ہون اور اُستاد بجائے خود ان سے مہربانی اور نرمی سے پیش آئین۔ جن دنون وہ کالج کی عمارت مین رہتے تھے متعدد طلبہ کالج کا وقت ختم ہونے کے بعد ان کے پاس پرائیویٹ طور پر ملنے جاتے اور وہ ہمیشہ ان کی تواضع کسی نقل سے یا دلچسپ گفتگو کے ذریعے سے کرتے تھے۔ ایسے موقعون پر وہ ہمیشہ انھین صیغہ واحد حاضر مین مخاطب کرتے جس سے طلبہ کی انسے پوری بے تکلفی تھی۔ لیکن بوقت ضرورت وہ انہی طلبہ سے سختی کے ساتھ بھی پیش آسکتے تھے گو ایسی صورتون مین انکی سختی صرف عارضی اور اسی قدر ہوتی تھی جتنی کہ ان کے خیال مین ان کے لیے مفید ہو جسوقت وہ نقص جو اس بد مزگی کا موجب بنا ہو دور ہوجاتا ان کا نرم دل فوراً پگھل جاتا تھا اور وہ پھر اسی نرمی سے سلوک کرنے لگ جاتے تھے۔

ایک موقعہ پر اُنھون نے تمام جماعت کو عمداً احکام کی خلاف ورزی کرنے پر خارج کردیا لیکن جب اگلے روز وہی طالب علم ان کے مکان پر جاکر معافی کے طلب گار ہوے تو اُنھون نے اِن سب کو تہ دل سے معافی دیدی۔ اسوقت دوپہر کا وقت تھا اور جس وقت طلبا سیڑھیون سے اُتر رہے تھے انمین سے ایک نے یونہی مذاقیہ طور پر دوسرے سے کہا کہ "اگر ودیا ساگر کا دل ویسا ہی رحیم ہوتا جیسا کہ مشہور ہے تو وہ یقیناً ہمین کچھ کھانے کے لئے کہتے"۔ یہ الفاظ ہرچند کہ دبی زبان سے کہے گئے تھے تاہم وہ ودیا ساگر کے کان مین پڑگئے۔ اُنھون نے تمام طلبہ کو واپس بلاکر کچھ کھانے کو دیا جس پر طلبہ مین سے ایک کہنے لگا۔ "بھلا یہ کیونکر ممکن ہے کہ ایسے نیک نفس کے دل مین غصّہ رہ سکے؟"

جسوقت سنسکرت کالج کے تعلیمی سسٹم مین ترمیم کی گئی تو بنگالی زبان مین بہت سی درسی کتابون کا لکھنا بھی لازم ٹھہرا۔ بالآخر یہ کام بھی ودیا ساگر کے ذمہ پڑا اور اُنھون نے ۱۸۵۱ء اور ۱۸۵۸ء کے درمیان متعدد کتابین شائع کین۔ اِن کی علمی مصروفیتون کی ابتدا ۱۸۴۷ء سے ہوچکی تھی جبکہ اُنھون نے درسی کتابون کے علاوہ "سکنتلا" اور "سیتر بن باس" (سیتا کی جلاوطنی) ایسی بعض معرکۃ الآرا کتابین لکھین۔ مسٹر رومیش چندر دت آنجہانی انکی علمی قابلیت کا ذکر بدین الفاظ کرتے ہین:-

> ادبی قابلیت کے معاملہ مین اِس وقت تک بنگال بھر مین کوئی شخص انکے پایہ کا نہ سمجھا جاتا تھا حتی کہ بعد مین لوگ بابو بنکم چندر چٹرجی کی قابلانہ محنت کی داد دینے لگے۔

فی الحقیقت اُنھون نے اور ایک بنگالی مصنف بابو اکشے کمار دت نے

ملکر زمانہ حال کی شاندار بنگالی نثر کی بنا قائم کی تھی۔ تصنیف و تالیف کا سلسلہ اُنھون نے زندگی کے آخری ایام تک جاری رکھا اور بیان کیا جاتا ہے کہ اُنھون نے صرف پانچ گھنٹہ مین شیکسپیر کا مشہور و معروف ڈراما Comedy of Errors "بھرنتی ولاس" کے نام سے لکھا تھا۔

سنسکرت کالج کے پرنسپل کی حیثیت مین ودیا ساگر نے جو خدمات سرانجام دین انکی حکام بالادست نے یہان تک قدر کی کہ ۱۸۵۴ء مین انکی تنخواہ دوگنی کردی گئی اور اُنھین چار اضلاع کا خاص انسپکٹر مدارس اِس غرض سے مقرر کیا گیا کہ وہ اِس نئی تعلیمی پالیسی کو رواج دین جسکی ابتدا ۱۸۵۴ء کی مشہور تعلیمی مراسلت کے ذریعے سے ہو چکی تھی۔ اِس پالیسی کا مطلب یہ تھا کہ ورنیکولر تعلیم کا آسان زینہ بنانا چاہیے۔ اِس عہدہ کے لیے اِن سے بہتر شخص کا انتخاب ناممکن تھا کیونکہ جس تندہی، محنت اور قابلیت سے اُنھون نے کام کیا اِس سے بہت کم لوگ کام لے سکتے ہین۔ اُنھون نے چارون اضلاع مین لڑکون اور لڑکیون کے لیے متعدد ماڈل اسکول جاری کرانے اور بنگال کے اول نارمل اسکول کی خود ہی بنا قائم کرکے اسکی نگرانی کی۔ ۱۸۵۶ء تک سب کام اچھی طرح چلتا رہا حتی کہ آخرکار اس سال بنگال مین ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن کا عہدہ قائم ہوا اور اس پر ایک نوجوان سویلین کا تقرر عمل مین آیا۔ اِس نوجوان نے جس کا نام مسٹر گارڈن ینگ تھا ودیا ساگر کے کام کی قدر نہ کی اور ۱۸۵۸ء کے قریب انھین بالواسطہ طور پر سرکاری ملازمت سے دست بردار ہونے پر مجبور کیا۔ ودیا ساگر سے اِس شخص کا جو سلوک تھا اس کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ اس نے ایک زنانہ اسکول کے متعلق رقوم اخراجات کی ادائیگی منع کر دی۔ یہ اسکول سر ایف ہالیڈے لفٹنٹ گورنر بنگال کی زبانی منظوری سے کھولا گیا تھا البتہ اس کے متعلق مسٹر ینگ کی ضابطہ منظوری نہ لی گئی تھی۔ لفٹنٹ گورنر موصوف ودیا ساگر پر بہت مہربان تھے اور انھین بہت عزت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ جب انھین اِس معاملے کی خبر پہنچی تو اُنھون نے ودیا ساگر کو اس عہدہ سے جسکی تنخواہ انھین ۵۰۰ روپیہ ماہوار ملتی تھی مستعفی ہونے سے منع کیا لیکن ودیا ساگر نے سمجھ لیا تھا کہ میرا اب اِس عہدہ پر رہنا میری خودداری مین فرق لاتا ہے۔ پس اُنھون نے استعفا داخل کر ہی دیا۔ اِس ستعفا کو منظور کرتے ہوئے نواب لفٹنٹ گورنر نے انھین اطلاع دی کہ "ہندوستان مین اشاعت تعلیم کے بارے مین آپ نے جو کوشش بڑی سرگرمی سے مدت دراز تک کی ہے اِس کا گورنمنٹ تہ دل سے اعتراف کرتی ہے"۔

اِس زمانہ مین ودیا ساگر کی عمر ۳۸ برس کی تھی۔ بہ اعتبار ایک معلم و ادیب کے اُنھون نے خاصی شہرت حاصل کر لی تھی۔ اِس زمانہ کی تمام تعلیمی انجمنون سے ان کا تعلق تھا اور وہ کلکتہ یونیورسٹی کے ممبر بھی تھے۔ اِن کے ریٹائر ہونے کا افسوس اِن کے ہندوستانی و یورپین احباب کو یکسان طور پر ہوا اور اندیشہ تھا کہ آئندہ انکی ذات سے پبلک کو استفادہ حاصل کرنے کا موقع نہ مل سکے گا لیکن خوش قسمتی سے یہ خیال غلط ثابت ہوا کیونکہ بقول مسٹر دت اُنھون نے ملازمت کی نسبت ملازمت سے علیحدگی کے ایام مین اپنے آپ کو زیادہ مفید ثابت کر دکھایا۔ انھین اپنی کتابون سے معقول نفع حاصل ہو رہا تھا اور تعلیمی کام سے انکی دلچسپی بدستور سابق تھی حتی کہ آخرکار ان کی بے غرضانہ کوششون کا نتیجہ کلکتہ کے میٹروپولیٹن انسٹی ٹیوشن کی صورت مین نمودار ہوا جو اپنی قسم کے انسٹی ٹیوشنون کے لیے ایک قابل فخر یادگار نمونہ تھا۔ انکی مدد سے مسٹر بیتھیون نے کلکتہ مین جو زنانہ اسکول قائم کیا تھا اس کے ساتھ آنریری سکرٹری کی حیثیت مین انکا تعلق مدتون قائم رہا اور وہ چار سو روپیہ ماہوار کے خرچ سے اپنے وطن مین تین اسکول بھی برابر چلاتے رہے۔ اسکے علاوہ اُنھون نے مختلف حصون مین متعدد اسکول قائم کیے اور ان کے چلانے مین مدد دیتے رہے۔

(۲)

اسمین کچھ شک نہین کہ ودیا ساگر نے تعلیمی حلقہ مین بہت کچھ کوشش کی لیکن جس مخصوص کام کے لیے اسوقت تک انکا نام روشن ہی اور جو بات زمانہ آئندہ مین بھی ان کی شہرت برقرار رکھنے والی ہی وہ مجلسی اصلاح کے میدان مین انکی دلیرانہ کوشش اور غریبون اور محتاجون کی فیاضانہ امداد ہی مجلسی اصلاح کے بارے مین سب سے پہلی کوشش جو انکی طرف سے عمل مین آئی وہ یہ تھی کہ وہ سنسکرت کالج کے پروفیسرون کے خلاف رائے ادنیٰ ذات کے لڑکون کو بھی کالج مین داخل کرنے پر زور دیتے تھے اور اسبارے مین اُنھون نے یہان تک مصمم ارادہ کر رکھا تھا کہ اگر گورنمنٹ انکی اُس کارروائی مین مانع آتی تو وہ اپنے عہدہ سے دست بردار ہونے تک کیلئے آمادہ تھے۔ دوسری کوشش جو ان کی طرف سے عمل مین آئی یہ تھی کہ زنانہ اسکول کے متعلق مسٹر بیتھیون نے اِن سے مدد چاہی اور وہ اس کے لیے پورے طور پر آمادہ ہو گئے بجالیکہ اس کارروائی سے کلکتہ کے راسخ الاعتقاد ہنود مین بہت اضطراب پھیل گیا تھا۔ لیکن سب سے معرکہ کی فتح جو اُنھون نے اہل بنگالہ کے غیض و غضب کے شدید طوفان مین حاصل کی غریب ہندو بیوگان کے حقوق کی حمایت کے متعلق تھی۔ اِس موقعہ پر بنگالیون مین جسقدر ہلچل اور اضطراب پیدا ہوا اسکی مثالین بہت کم دیکھنے مین آتی ہین۔ مسٹر دت فرماتے ہین:-

بنگال کے ہر شہر اور ہر گاؤن مین اسی بات کا چرچا تھا۔ مشہور بنگالی شاعر ایشور چند رگپت اور بنگالی گویتون کے سردار و شرتھی نے نوجوان مصلح کی نسبت طرح طرح کے طنزیہ اشعار لکھے۔ گاؤن کے لوگ جب کبھی الاؤ پر جمع ہو کر بیٹھتے تو اس معاملے پر گفتگو کرتے تھے۔ شانتی پور کے جلاہون نے ساریون کے کنارون پر ازدواج بیوگان کے گیت بُنکر نمودار کیے۔ غرض بنگال کے ہر گھر مین کیا مرد اور کیا عورتین اسی انقلاب عظیم کے متعلق چرچا کرتے تھے۔

اس پر اکتفا نہ کر کے بعض گنوار لوگون نے اِن سے ذاتی طور پر بھی گستاخانہ سلوک کیا۔ بعض نے مارپیٹ کی دھمکی دی اور بعض انکی جان کے لیوا بنے۔ لیکن اس سے ان کے ارادہ یا ہمت مین ذرا فرق نہین آنے پایا۔ ایک روز اُنھون نے سُنا کہ فلان دولت مند آدمی نے اپنے نوکرون کو میری زدوکوب کے لیے متعین کیا ہی اور وہ اس بات کا مشورہ کر رہے ہین کہ کوئی مناسب موقع ملے تو بدسلوکی کی جائے۔ یہ خبر پاتے ہی وہ بڑی دلیری سے اس امیر کے مکان پر جا پہنچے۔ نوکرون مین سے ایک نے ان کے آنے کی وجہ پوچھی تو کہنے لگے "مین نے ایسا ایسا سنا تھا۔ سوچا کہ تم لوگون کو میری تلاش کی خواہ مخواہ تکلیف اُٹھانا پڑے گی۔ اَب مین تمھارے سامنے کھڑا ہون، جو کچھ جی مین آئے مجھ سے سلوک کرو۔" اتنا سنکر سب شرمندہ ہو گئے اور اُنھون نے فوراً معذرت طلب کی۔

ایک اور موقع پر جب وہ ریل مین سفر کر رہے تھے ایک پُرانے خیال کا پنڈت بھی انہی کے کمپارٹمنٹ مین سوار تھا۔ اسے معلوم نہ تھا کہ مین جس سے گفتگو کر رہا ہون وہی ودیا ساگر ہے۔ بے سمجھے سوچے انکی نسبت طرح طرح کی بدکلامیان کرتا رہا۔ ایشور چندر بھی چپ چاپ سنا کیے اور اس بات کو ظاہر نہ ہونے دیا کہ مین ہی وہ شخص ہون۔ منزل مقصود پر پہنچکر جب دونون گاڑی سے اُترے تو کسی ذریعے سے پنڈت کو معلوم ہو گیا کہ یہی ایشور چندر ہی جسکی توہین خود اسی کے مُنھ پر کرتا رہا ہون۔ بہت نادم ہوا یہان تک کہ غش کھا کر گر پڑا لیکن اُنھون نے اپنے ہاتھ سے اسے ہوش مین لانے کی کوشش کی اور بعد مین ہر طرح کا اطمینان دلایا۔

عقد بیوگان کی تحریک کے ایام مین ودیا ساگر کو طرح طرح کی مشکلات پیش آئین۔ لیکن غصّہ کے اس طوفان مین وہ چٹان کیطرح استقلال کے ساتھ کھڑے رہے۔ وہ اپنے دشمنون کے رکیک حملون کا جواب طریق مذکور پر دیتے تھے اور دیانت دارانہ نکتہ چینی کا" فاضلانہ بحث اور قومی استدلال کے ذریعے سے"۔ ان کی کوششون کا سمجھدار لوگون کے دلون پر جو اثر پڑتا تھا اسکا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہی کہ اِس زمانے کے بڑے بڑے آدمی

مثلاً پرسن کمار ٹیگور، رام گوپال گھوش، پرتاب چندر سنگھ، دوارکا ناتھ متر، نرنیدر ناتھ سین وغیرہ سبھی ان کے حامی تھے۔ انھین ایام مین جب عقد بیوگان کی حمایت مین ایک ناٹک کا کھیل کیا گیا تو ان بڑے بڑے آدمیونین سے بعض نے اس مین پارٹ لیے اور کیشب چندر سین نے اسٹیج منیجر کے فرائض ادا کیے۔ اِس تمام تحریک کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۸۵۶ء مین گورنمنٹ نے عقد بیوگان کو قانوناً جائز ٹھیرایا اور ودیا ساگر نے اپنی زیست مین کم از کم ساٹھ ایسی شادیان کرائین۔ کسی شخص کے لیے اسقدر کامیابی واقعی بہت اہم ہی لیکن اس جد وجہد مین ان کا روپیہ بھی بہت صرف ہوا۔ چونکہ ان اخراجات کے لیے انکی آمدنی پورے طور پر مکتفی نہ ہوسکتی تھی اس لیے اُنھون نے کم و بیش ۵۰ ہزار روپیہ قرض لیے اور مدت العمر خود ہی اسے اُتارنے کی کوشش مین لگے رہے۔ انکے بعض دوستون نے ادائیگی قرضہ کے لیے چندہ جمع کرنے کی تحریک کی لیکن اُنھون نے بڑی سختی سے انھین ایسا کرنے سے باز رکھا۔ اُنھون نے عقد بیوگان کو اپنی زندگی کا مدعائے عظیم بنا لیا تھا اور اس مدعا کو حاصل کرنے مین انھین اپنی جان تک کی پروا نہ تھی چنانچہ اپنے بیٹے نارائن چندر کی شادی کے موقعہ پر اُنھون نے اپنے بھائی سے کہا تھا کہ ہندو بیوگان کے متعلق اپنی کوششون کو مین اپنی زندگی کا سب سے زیادہ نیکی اور پارسائی کا کام سمجھتا ہون۔

معلوم ہوتا ہی کہ بیوگان کو مدد دینے کا مصمم ارادہ ودیا ساگر کے دل مین چھوٹی عمر ہی مین ہو چکا تھا۔ چنانچہ انکی عمر ابھی ۱۴ سال ہی کی تھی کہ اُنھون نے دیکھا کہ ایک لڑکی جو بچپن مین ان کے ساتھ کھیلا کرتی تھی شادی کے بعد بہت جلد بیوہ ہوگئی اور ایک اور بیوہ کے گھر ناجائز بچہ پیدا ہوا جسے اِس عورت کی شرمناک کارروائی پر پردہ پوشی کرنے کے لیے گلا گھونٹ کر مار دیا گیا۔ وہ آخر دم تک اپنے اُصول پر قائم رہے گو ان کے بہت سے دوستون نے ایک بار حامی بھر کر بعد مین انکا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ ایک مرتبہ جبکہ کسی بیوہ کی شادی ہونیوالی تھی اور ودیا ساگر اسمین شریک ہونے جا رہے تھے تو اُنھون نے مشہور و معروف مصلح راجہ رام موہن رائے کے بیٹے رام پرشاد رائے کو ہمراہ چلنے کیلیئے کہا لیکن جب وہ متامل ہوا تو اُنھون نے بانی برہمو سماج کی تصویر کی طرف جو دیوار سے لٹک رہی تھی اشارہ کرکے کہا کہ "بہتر ہی آپ اسے وہان نہ لٹکائین بلکہ اُتار کر ردی مین پھینکدین"۔

ودیا ساگر نے تمدنی اصلاح کے متعلق جو بیشمار کوششین کین ان مین ایک وہ بھی تھی جو اُنھون نے کلین براہمنون مین کثرت ازدواج کی خرابی کو روکنے کے بارے مین کی۔ اس معاملے پر انکی توجہ انکی ایک رشتہ دار عورت نے مبذول کرائی تھی جسکی شادی ایک کلین براہمن سے ہو چکی تھی اور جو اپنے شوہر کے تغافل سے تنگ آچکی تھی۔ اُنھون نے حسب معمول اس کام کو پوری کوشش سے شروع کیا اور ایک سے زیادہ عرضی ہزارہا لوگون کی دستخطی گورنمنٹ کی خدمت مین پیش کی۔ اِس تحریک سے اِس معاملے کے انسداد کے لیے کوئی قانون تو پاس نہ ہوا البتہ عام رائے مین بہت کچھ اصلاح ہوگئی اور اس وقت سے یہ خرابی دن بدن کم ہوتی گئی۔

یہان پر ودیا ساگر کے اصلاحی کامون کا سلسلہ ختم ہوتا ہی اور اب ان کے اس کام کا ذکر کیا جاتا ہی جو اُنھون نے بہ حیثیت ہوا خواہ بنی نوع انسان کیا اور اس مین یہان تک کامیابی حاصل کی کہ کل بنگالی قوم آجتک ان کا نام عزت و تکریم کے ساتھ لیتی ہی۔ معلوم ہوتا ہی کہ چھوٹی عمر ہی سے انھین رفاہ عامہ کا خیال پیدا ہو چکا تھا چنانچہ جن دنون وہ سنسکرت کالج مین ۱۵-۱۶ سال کی عمر مین وظیفہ یاب تھے تو بوقت ضرورت اپنے بیمار ہم جماعتون کی تیمارداری کرتے۔ کسی شکستہ حال فقیر کو دیکھ پاتے حسب استطاعت اسکی مدد سے دریغ نہ کرتے۔ اور اگر خود پاس نہ ہوتا تو دوسرے سے مانگ کر دینے کو بھی موجب عار نہ سمجھتے تھے۔ جن دنون کالج مین تعطیلین ہوتین وہ دیہات مین جا کر بیمارون اور

محتاجون کی خبرگیری اور امداد کیا کرتے تھے۔ جب انھین فورٹ ولیم کالج مین جگہ ملگئی توان کے وسائل امداد بھی کسیقدر وسیع ہوگئے۔ اس زمانے مین انھین ۵۰۰ ماہانہ تنخواہ ملتی تھی اور اس مین سے حتی الامکان کافی روپیہ بچاکر وہ اس سے غریب غربا کی مدد کرتے تھے۔ محتاجون کی خبرگیری کرنے مین انھین خاص طور پر آنند (مسرت) حاصل ہوتا تھا اور متعدی امراض کے مریضون کے پاس جانے سے بھی نہ ڈرتے تھے۔ کوئی اجنبی خواہ غریب ہی کیون نہ ہو یہ اسکی مدد پر آمادہ ہو جاتے تھے۔ ایک موقعہ پر ایک شخص کو جو کسی کھاتے پیتے گھرانے مین نوکر تھا ہیضہ ہوگیا۔ آقا نے مارے ڈر کے اسے گھر سے نکال دیا۔ وہ غریب بازار مین پڑا دم توڑ رہا تھا کہ ودیا ساگر کی نظر اسپر پڑ گئی۔ یہ فوراً اسے اُٹھوا کر اپنے ہان لے گئے اور جب تک صحت یاب نہ ہوا اسکی تیمارداری کرتے رہے۔ جن تین اسکولون کا ذکر قبل ازین ہو چکا ہے ان کے علاوہ اُنھون نے اپنے گاؤن مین ایک خیراتی شفاخانہ بھی کھلوایا جس کا ماہوار خرچ سو روپیہ تھا۔ جن دنون وہ خاص انسپکٹر مدارس کی حیثیت مین دورہ کیا کرتے تھے تو انکی یہ حالت تھی کہ راستے مین کسی شخص کو بیمار و نحیف پڑا پاتے تو اسے اُٹھوا کر پالکی مین لٹاتے اور خود ساتھ ساتھ چلتے جاتے حتیٰ کہ کسی سرائے تک پہنچ جاتے اور وہان ہر طرح اس کے آسائش و علاج کا انتظام کرکے آگے بڑھتے جب کہین جاتے تو کچھ متفرق سکّے پاس رکھ لیتے اور راستے مین کوئی حاجتمند نظر آتا تو اسکی امداد سے بالکل دریغ نہ کرتے تھے۔ کوئی شخص جو ان کے پاس جاکر اپنی مصیبت کی کہانی بیان کرتا ضرور ان سے مدد حاصل کرتا تھا اور کوئی نہین کہہ سکتا کہ اُنھون نے در پردہ کتنی بیوگان اور یتیمون کی کھانے کپڑے اور اور ضروری سامان کے ذریعے سے مدد کی۔ وہ متعدد غریب لڑکون کو اپنے ہان رکھکر ان کی تعلیم کا انتظام کرتے تھے۔ اسطرح ایک موقعہ پر تو ایک سو لڑکے ان کے ہان کھانا کھاتے اور تعلیم حاصل کرتے تھے۔ گداگر اور اجنبی ان تک بڑی آسانی سے رسائی حاصل کر سکتے تھے اور اسی وجہ سے اُنھون نے کبھی کوئی دربان نہین رکھا کہ مبادا کوئی حاجتمند ان سے ملے بغیر واپس چلا جائے۔ چند آدمی قرض کی بلا مین اسطرح پھنسے ہوئے تھے کہ ان کا رہا ہونا دشوار اور ناممکن نظر آتا تھا اور وہ تباہی کے قریب پہنچ چکے تھے۔ اُنھون نے اپنے پاس سے انکی مدد کرکے قرض سے انھین خلاصی دلائی۔ ایک بوڑھا برہمن ۲۴۰۰ روپیہ کا مقروض تھا اور قرض خواہ اس غریب کی جو تھوڑی بہت پونجی تھی اسکی تاک مین لگا ہوا تھا۔ انھین جب اس معاملہ کی خبر ملی تو اپنے طور پر معاملہ کو اوپر ہی اوپر طے کردیا اور برہمن کو مطلق خبر نہ ہو سکی کہ مجھ پر یہ مہربانی کس نے کی ہے۔ لیکن یہ سب کوششین ۱۸۶۶ء کے قحط کے موقعہ پر ان کی عظیم الشان امدادی کوششون کے مقابلہ مین ہیچ تھین۔ ان کے گاؤن مین قحط سے سخت مصیبت نازل تھی۔ جب یہ وہان پہنچے تو دیکھا کہ ان کی والدہ نے غربا کی امداد پہلے سے شروع کر رکھی ہے۔ وہ اپنے ہاتھ سے کھانا پکاکر ایک سو غریبون کو روزمرہ کھلایا کرتی تھین لیکن ودیا ساگر کی نظر مین یہ مدد ناکافی تھی۔ اُنھون نے اپنے خرچ سے وہان اور آس پاس کے گاؤن مین لنگر جاری کرکے ایسا انتظام کیا کہ ایک ہزار غربا کو روزانہ مفت کھانا ملتا رہا۔

وہ ادنیٰ سے ادنیٰ ذات کی عورتون کو اپنے ہاتھ سے کھانا دیکر اپنے رشتہ دارون کے لیئے ایک مثال قائم کرکے دکھاتے تھے۔ صرف کھانا کھلانے کو انکی امداد کے لیے غیر مکتفی سمجھ کر اُنھون نے حاملہ اور زچہ عورتون کے لیے جداگانہ مکانات کھلوا دیئے۔ ان کی ان تمام کوششون کا اعتراف بارہا گورنمنٹ کی طرف سے ہوا لیکن اس اعتراف کا سب سے بڑا ذریعہ "ودیا ساگر" "ودیا ساگر" کے وہ بلند نعرے تھے جو ہر روز سیکڑون ہزارون بھوکون اور محتاجون کے منہ سے خود بخود نکلتے تھے۔ اس کے تین سال بعد بردوان مین ایک مہلک قسم کا بخار پھوٹ نکلا جہان اُنھون نے اپنی رفاہ عامہ کی کوششون سے پورے طور پر کام لیا۔ ان کا موتمین

ان کے ہزارون روپیہ خرچ ہوگئے مگر انھین اسکا کبھی خیال نہین آیا
کیونکہ اس کام سے انھین جسقدر خوشی ہوتی وہ اور کسی طرح نہ ہوتی تھی
اور گاون کی آمدنی ان غیر معمولی اخراجات کے لیے کبھی مکتفی نہ ہوئی تاہم
وہ خوش تھے کہ مین اس کو بہترین مصرف مین لا رہا ہون۔ اسبارے
مین انکے دلی خیالات اور محسوسات کا اظہار انکی وصیت سے ہوتا ہے
جس مین اُنھون نے نہایت دور کے رشتہ دارون اور متوفی دوستون
کے کنبہ والون تک کو فراموش نہین کیا۔

ان حالات مین یہ بات ذرا بھی تعجب خیز نہین کہ رام کرشن پرمھنس
ایسے شخص کو جو بنگال مین زمانۂ حال کا سب سے بڑا مذہبی آدمی ہو گذرا ہی
اور جس کے پیرو ہزارون کی تعداد مین موجود ہین یہ خواہش پیدا ہوئی
کہ ودیا ساگر کے مکان پر جاکر ان سے ملاقات کرے جب اس نے اس
معاملہ کا ذکر اپنے بعض مقلدون سے کیا تو وہ اس پر نہایت متعجب ہوئے
لیکن اسنے انھین بتایا کہ اگر اسپر ایشور کی مہربانی نہ ہوتی تو ودیا ساگر اتنا
بڑا آدمی نہ بن سکتا۔ اس کے بعد ایک موقع پر سوامی جی خود ودیا ساگر سے
ملنے گئے اور کہنے لگے کہ "مین ندی، نالے، اور دریا عبور کرکے اب ساگر
(سمندر) دیکھنے آیا ہون"۔ ودیا ساگر نے اُسی لہجہ مین جواب دیا "مجھے
آپ کے تشریف لانے کی بہت خوشی ہے لیکن میری دانست مین
آپکو ساگر مین کھاری پانی اور کوڑیون کے سوا اور کچھ نہ ملے گا"۔ سوامی جی
نے استعارہ کی لطافت کو قائم رکھتے ہوے کہا "مین جس سمندر کے
پاس آیا ہون وہ دودھ شہد وغیرہ رتنون (جواہر) سے بھرا ہوا ہی اور
مجھے پوری توقع ہی کہ مین اس کے اندر سے انمول موتی حاصل کرسکونگا"
اس پرلطف گفتگو کے بعد دونون مین بہت دیر تک بات چیت ہوتی
رہی اور آخر دونون خوشی خوشی ایک دوسرے سے جدا ہوئے۔

لیکن باوجود مذہبی خیال اور مذہبی خصلت کا انسان ہونے کے
معلوم ہوتا ہی کہ ودیا ساگر کسی خاص مذہبی فرقہ سے تعلق نہ رکھتے تھے۔
ایک موقعہ پر اُنھون نے کہا تھا کہ:-

اس قسم کے فرقے دراصل باہمی تفرقہ پیدا کرتے ہین۔ اگر ایک شخص اس
بات کا قائل ہو کہ میرے پاپ گنگا اشنان سے دور ہو جائین گے اور دوسرا
اس بات کا کہ شوجی کی بھگتی ہی کے ذریعے سے انسان کو مکش حاصل ہو سکتا
ہی تو دونون کو ان کے عقائد مبارک رہین۔ میرے لیے دشویشور (شوجی)
اور ان پورنا (گنگا) میرے والدین ہین اور مین تہ دل سے انھی کی پرستش
کرتا ہون۔ مین کسی حالت مین فرقہ بندی کا حامی نہین ہو سکتا کیونکہ
اگر کوئی فریق غلطی پر ہوا تو مین دوسرون کے گناہون کا جوابدہ ٹھیرایا
جاؤن گا اور ریاتما مجھے جھوٹ کے لیے سزا دین گے۔

غرض یہ کہ اُنھون نے اپنا مذہبی عقیدہ کبھی کسی پر ظاہر ہی نہین
کیا گو اس مین شک نہین کہ اپنے ماتا پتا (والدین) کی وہ "ان پورنا"
اور "وشویشور" ہی کیطرح پرستش کرتے رہے۔ وہ ہر روز صبح اُٹھکر انھین
یا انکی تصاویر کو پرنام کیا کرتے تھے اور کسی اہم کام کو شروع کرنے سے
پیشتر ان کی آشیش (برکت) ضرور حاصل کر لیتے تھے۔ والدین کی تعظیم
ان کے دل مین یہان تک گھر کر چکی تھی کہ ازدواج بیوگان کے معاملے
کو چھیڑنے سے پہلے بھی اُنھون نے ان سے اجازت حاصل کرنا ضروری
سمجھا اور اگر ان کے ایک مرتبہ والد کی سختی سے تنگ آکر سرکش
ہو جانے کے معاملے کو مستثنےٰ قرار دیدیا جاے تو انکی ساری عمر مین ایک
بات بھی ایسی نظر نہین آتی جو انکی پابندی فرض تعظیم والدین پر حرف
لانیوالی ہو۔ ان کو سب سے بڑی محبت اپنی ماں سے تھی اور اسی سے یہ
فیاض منشی ورثہ مین ملی تھی۔ ایک موقع پر صرف اپنی مان کی خوشی پوری
کرنے کے لیے وہ کلکتہ سے پیدل چلکر اپنے گاؤن مین پہنچے تھے۔ راستے
مین اُنھون نے کہین آرام بھی نہ کیا اور دو بڑے دریاؤن کو جو خوب
چڑھاؤ پر تھے عبور کرکے عین وقت پر اسکے پاس جا پہنچے۔ اُنھون نے
عزم کر لیا تھا کہ اگر مجھے گاؤن جانے کے لیے فورٹ ولیم کالج سے چھٹی

نہ لی تو نوکری چھوڑ دوں گا۔ باپ سے انھیں جو باتیں ورثہ میں ملیں وہ کام کی باقاعدگی اور سلیقہ اور پوری محنت تھیں۔ چونکہ ان کے والدین پاک صاف اور محبت سے معمور دل رکھتے تھے اس لیے خدا نے انھیں جو بیٹا دیا وہ ہر پہلو سے کامل نمونہ کا درجہ رکھتا تھا جن دنوں انکی شہرت بنگال میں چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی اِن دنوں بھی اُنھوں نے اپنے والدین کی خاطر ادنی سے ادنی خدمت کا کام سر انجام دینے میں انکار نہیں کیا۔ جب وہ کرم آٹار میں سادہ زندگی بسر کرنے والے سنتھالیوں کے ساتھ جنگل میں رہا کرتے تھے تو ان کے ساتھ گھل مل گئے تھے کہ وہ انھیں اپنی ہی برادری کا آدمی سمجھتے تھے۔ ہر روز صبح کے وقت اِن لوگوں کی جھونپڑیوں میں جاتے اور انھیں کسی چیز کی ضرورت ہو تو بہم پہنچاتے تھے۔ بھوکوں کو روٹی ننگوں کو کپڑا اور بیماروں کو دوا دینا ان کا فرض تھا اور بسا اوقات انھیں پھل اور مٹھائی بھی دیا کرتے تھے۔ انکے لیے اُنھوں نے ایک اسکول کھلوا دیا اور ان کی پھلیاں خود خرید کر ان کی آمدنی میں اضافہ کرنے کا طریقہ نکالا۔ انکے جنگلی ناچ سے وہ بہت خوش ہوا کرتے تھے۔ یہ لوگ جنگل کی سبزی ترکاری بطور تحفہ انکے روبرو پیش کرتے جسے وہ بڑی خوشی سے قبول کر لیتے تھے۔ ان میں سے بعض انھیں از راہ محبت باپ اور بھائی اور بعض چچا کہا کرتے تھے اور وہ ان صاف باطن لوگوں کے مہربانانہ سلوک سے بہت ہی خوش ہوتے تھے۔ ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ ایک سنتھال کسی عورت کو ہمراہ لیے ان کے پاس آیا اور ان سے اس کے لیے کپڑا مانگا۔ اُنھوں نے جواب دیا میرے پاس اس وقت اس کے دینے لائق کوئی کپڑا نہیں ہے۔ لیکن سنتھال انکی طرف سے انکار کا لفظ سننے کا عادی نہ تھا۔ اس نے ودیاساگر سے الماری کی چابی لیکر خود ہی بکس کھول لیا اور اس بے تکلفی سے گویا وہ خود ہی اس گھر کا مالک ہے ایک قیمتی کپڑا نکالکر اس عورت کے

حوالہ کر دیا۔ ودیاساگر اس شخص کی اس بے تکلفی سے بہت ہی خوش ہوے۔ سامان عیش سے انھیں فطری نفرت تھی۔ ایک بار اُنھوں نے ایک گھوڑا گاڑی رکھ لی تھی مگر پھر جلدی ہی اسے بیچ ڈالا۔ لباس انکا بے حد سیدھا سادہ ہوتا تھا۔ یعنی ایک معمولی دھوتی، چادر اور پاؤں میں سلیپر۔ وضع کی پابندی اسقدر تھی کہ لفٹنٹ گورنروں سے بھی اسی لباس میں ملاقات کی۔ اِس قسم کے سادہ کپڑے پہننے کی وجہ سے بعض اوقات عورتیں ان کو حقارت کی نظر سے دیکھنے لگتی تھیں۔ جن دنوں وہ انسپکٹر مدارس تھے تو ایک موقع پر کسی دیہاتی اسکول کا معائنہ کرنے گئے۔ اسکول کی عمارت کے قریب بہت گنوار ان کی صورت دیکھنے جمع ہو گئے۔ عورتیں بھی بہت تھیں اور وہ قدرتی طور پر اس بات کی متوقع تھیں کہ کوئی بڑا آدمی شاندار کپڑوں والا دیکھنے میں آئے گا لیکن جب وہ دھوتی چادر پہنے ایک عام آدمی کی طرح پیدل چلتے نظر آے تو انکی حیرت بہت بڑھ گئی۔ ایک بڑھیا جو گھنٹوں دھوپ میں کھڑی انکا انتظار کر رہی تھی اسے تو کسی طرح اِس بات کا یقین ہی نہ آتا تھا کہ یہ شخص ودیاساگر ہو سکتا ہے۔ انکی طرف بہت دیر تک گھورتی رہنے کے بعد وہ آخر کار کہنے لگی "کیا میں اِس اُڑیہ قلی کو دیکھنے اتنی دیر تک دھوپ میں جلا کی، نہ گاڑی نہ چپکن، نہ چغہ، نہ پگڑی، نہ گھوڑی، رام رام! ایسا آدمی! اور لوگ کہتے تھے وہ اتنا بڑا آدمی ہے واہ واہ کیسا پاگل پن ہے!"

لیکن گو وہ خود اسقدر سادہ لباس پہنتے تھے، اور خانگی معاملات میں نہایت کفایت شعاری برتتے تھے تاہم اپنے شاندار کتب خانے کی کتابوں کو خوب بنا سنوار کر رکھتے تھے۔ یہاں تک کہ ولایت سے انکی جلدیں بندھوانے میں بہت سا روپیہ صرف کیا کرتے تھے۔ آخری ایام میں وہ کسی شخص کو اپنی کتاب عاریتاً نہ دیتے تھے۔ انکی وجہ یہ تھی کہ وہ اپنی کتابوں سے بے حد محبت کرتے تھے اور لیجانیوالوں پر انھیں ایک طرح کی بے اعتباری تھی جو کسی طرح بے وجہ نہیں

کہی جا سکتی۔ ایک بار ایک دوست ان سے ایک نہایت قیمتی مسودہ مطالعہ کی غرض سے مانگ کر لے گیا لیکن بجائے پڑھنے کے اس نے اسے بیچ ڈالا۔ اس طرح پر اسنے اِس مسودہ سے نفع تو حاصل کیا مگر وہ نفع ذہنی نہین بلکہ مالی تھا۔ کچھ مدت بعد ودیا ساگر نے اِس سے کتاب واپس مانگی تو بڑی ڈھٹائی سے کہنے لگا "مدت ہوئی کہ کتاب آپ کو واپس کر چکا ہون۔"

سطور بالا مین جو کچھ لکھا جا چکا ہی اِس سے اِس بات کا بآسانی اندازہ ہو سکتا ہی کہ ودیا ساگر ایک ایسا شخص تھا جس پر ہر قوم یا ہر ملک کو فخر حاصل ہو سکتا ہی۔ انکی زندگی کی ہر بات مین کوئی نہ کوئی سبق ضرور پایا جاتا ہی۔ انمین وہ تمام صفات موجود تھین جو کسی شخص کو بڑا بناتی ہین اور انمین سب سے زیادہ قابل ذکر خوبیان صداقت، مہربانی، سادگی، استقلال، آزادگی، فیاضی، اور جوش تھین۔ والدین کی وہ جسقدر تعظیم کرتے تھے اِسے دیکھتے ہوئے پورانک زمانہ کا سمان نظرون مین پھر جاتا ہی۔ زمانۂ طالب علمی مین انھون نے جو سختیان اور تکالیف جھیلین ان سے ہر نوجوان نہایت قیمتی سبق حاصل کر سکتا ہی۔ ان کا زمانہ اُستادی ہمارے روبرو زمانہ قدیم کے رشیون کی مثال پیش کرتا ہی جو جنگلون کے اندر رہ کر اپنے مقدس آشرمون مین بڑے پیار و محبت سے اپنے چیلون کو تعلیم دیا کرتے تھے۔ بہ اعتبار ایک سوشل ریفارمر کے اُنھون نے جو کام کیئے وہ انکی فیاضانہ فطرت کو بخوبی واضح کرتے ہین۔

ایشور چندر ودیا ساگر نے ۷۰ سال سے زائد عمر حاصل کر کے ۲۹۔ جولائی سنہ ۱۸۹۱ء کو انتقال کیا۔ جس وقت ان کی ارتھی شمشان کو لے جانے لگے تو ہزارہا مرد و زن، پیر و جوان، ہر مذہب و ہر ملت کے لوگ اس کے ہمراہ تھے اور وہ سب کے سب اس بات پر متفق تھے کہ اگر زمانہ حال مین کسی شخص نے سادہ زندگی بسر کرتے ہوے اعلیٰ مقاصد کو پیش نظر رکھنے کی عملی مثال قائم کی ہو تو وہ ودیا ساگر تھا جسے ہزارہا غریب لوگ "دیا ساگر" کہکر خوش ہوتے تھے۔

تیرتھ رام

غزل

از افضل الدولہ مظفر الملک سید افضل علیخان شوکت جنگ بہادر متخلص بہ افضل خلف اصغر جناب آسیر مرحوم

نظارہ ہوگا شام تک اُس ماہتاب کا | دیکھا ہے اُٹھ کے صبح کو مُنھ آفتاب کا
محشر مین پھر مزا ہے سوال وجواب کا | ہو جائے گُم جو بند ہمارے حساب کا
ثابت ہے کی ہے مردم آبی نے ترک مے | اُلٹا پڑا ہوا ہے کٹورا حباب کا
اے موج بحر! بہر خدا جلد لے خبر | دم بند کر دیا ہے ہوا نے حباب کا
مانا نہین کسی سے تعلق تھین، اگر | کہتا ہے برخلاف زمانہ شباب کا
امواج کو سمجھ کے گلے سے لگائیے | نازک ہے دل، پھٹے نہ کلیجا حباب کا
ساقی انگاہ زاہد بدمست اگر پڑی | تھوکے گا منھ سے خون یہ شیشہ شراب کا
پھنس جائین شیخ دختر رز سے تو ہو مزا | پایان قدم مین بڑھ کے ابھی یون جناب کا
کرتے ہین سجدے آکے ملک جس پہ فخر سے | افضل یہ مرتبہ ہے درِ بوتراب کا

سیّد محمد مرتضٰی بیآن ویزدانی میرٹھی

زمانہ کسی وقت اور کسی دَور میں کاملین فن سے خالی نہیں رہتا۔ جس طرح اقطابؒ ابدال کی نسبت بیان کیا جاتا ہو کہ یہ روحانی رہنما ہر زمانے میں موجود رہتے اور اپنے فیوض وبرکات سے ایک عالم کو سیراب کیا کرتے ہیں اُسی طرح جسمانی دنیا بھی مقتدر اشخاص کے وجود پُرجود کے فیضان وبخشش سے کبھی محروم نہیں رہتی۔ یہ ضرور ہو کہ بعض اصحاب خلقی طور پر نام ونمود کی خواہش نہیں رکھتے اور اس وجہ سے اُنھیں عام طور پر رُوشناس ہونے کا موقع نہیں ملتا اور اکثر انقلابِ عالم کی عبرت انگیز کیفیات سے اس درجہ متأثر ہوتے ہیں کہ اُنھیں ذاتی طور پر اپنے آپ کو پبلک کے سامنے لانے میں پس وپیش ہوتا ہو، اور اس طرح اُنکے کارنامے پردۂ خفا میں مستور رہ جاتے ہیں۔ انھیں لوگوں میں اُن اشخاص کا بھی شمار ہوسکتا ہو جو اپنی قابلیت وعلمیت کے لحاظ سے ہر طرح قابل عزت ہوتے ہیں لیکن ناقدری اور نامرتبہ شناسی چونکہ عوام کی آنکھ پہ پردہ بنکر پڑجاتی ہو اس لیے وہ اُنکی صحیح پوزیشن کو معلوم نہیں کرسکتے۔

"گرے" نے جو انگلستان کے طبقۂ شعراء کا ایک ممتاز رکن ہونے کی حیثیت سے معرفی سے مستغنی ہو اپنے مشہور ومعروف مرثیہ میں اسی مسئلہ پر کس قدر غائر نظر ڈالی ہو اور کتنی فلسفیانہ دقت پسندی کا ثبوت دیا ہو۔ وہ کہتا ہو کہ "کتنے آبدار موتی سمندروں کی تہ میں اس طرح رہ جاتے ہیں کہ انسانی آنکھ تک اُن کی ضو بھی نہیں پہنچتی اور کتنے ہی خوشرنگ پھول ایسے جنگلوں میں کھلتے ہیں جنکی گوناگوں دلچسپیوں کا آدمیوں کو علم بھی نہیں ہوتا"۔ گویا وہ یہ ثابت کرنا چاہتا ہو کہ جس طرح بہت سے قیمتی موتیوں اور دلفریب پھولوں کی رسائی انسان تک نہیں ہوتی اور وہ سمندروں اور جنگلوں میں پوشیدہ رہجاتے ہیں اسی طرح کتنے قابل دماغ ایسے ہونگے جن کے کارنامے بجاے خود سرمایۂ ناز اور کارآمد ہونے کے باوصف گمنامی کی حالت میں رہ جاتے ہیں اور اہل دنیا کو اُن سے مستفید ہونے اور تمتع حاصل کرنے کا موقع بھی نہیں ملتا۔ غور سے دیکھیے۔ "گرے" نے گویا اُن بےنشان لیکن ذی احترام لوگوں کی اصلی صورت کھینچ کر دکھادی ہو جنکی خدمات فاضلہ اور صفات عالیہ اُنھیں مشاہیر عالم میں نمایاں وقعت دلانے کے لیے کافی تھیں لیکن استحقاق کے باوجود وہ شہرت نہ پاسکے، اور اُنکی ذہنی ودماغی کاوشوں کے نتائج دنیا پر آشکارا نہ ہوسکے۔ سچ پوچھیے تو یہ اُنکی نہیں بلکہ ہماری بدنصیبی ہو کہ ہم اُنکے خرمن فضل وکمال کی خوشہ چینی سے بھی محروم رہے۔

ہر ملک، ہر قوم۔ ہر فرقے، اور ہر طبقے میں اس قسم کے گمنام لیکن اقبالمند لوگ گذر چکے ہیں اور اب بھی اگر کھوج کرو تو تمھیں بہت سے مل سکتے ہیں۔ ہندوستان اس وقت علوم وفنون کی کساد بازاری میں مشہور آفاق ہو اور اسلیے یہاں تحصیل کمال کی تشویق وتحریص کے اسباب بھی مفقود ہیں لیکن اگر کوشش سے تلاش کیا جائے تو یہاں اب بھی آپ کو ایک معقول تعداد ایسے بزرگ سیرت اصحاب کی مل سکتی ہو جو اپنے اوصاف کے لحاظ سے آنکھوں پہ بٹھائے جانے کے قابل تھے یا ہیں لیکن کسی نہ کسی وجہ سے ہم اُنھیں جانتے تک نہیں گویا جس عالم گمنامی میں وہ پیدا ہوے اُسی بیخبری میں وہ پیوند خاک ہوگئے یا ہوجائیں گے۔

اُردو شاعری کی تاریخ پر ایک سرسری نظر ڈالیے تو شعراء قطار در قطار نظر آئینگے۔ ناموں کی گنتی کرنا ہو تو اکثر تذکرے موجود ہیں۔ ان میں جہاں بہت سے مستحق اعزاز وتکریم نظر آئینگے وہاں بھرتی کے بھی ہوں گے۔ میر وسودا انشا ومصحفی، ناسخ وآتش، اور غالبؔ ذوق بلاشبہہ ہمارے علم ادب کے قابل فخر محسنین میں ہیں اور انکے احسانات سے اُردو شاعری کبھی سبکدوش نہیں ہوسکتی لیکن اِن محسنوں اور سرپرستوں کی تعداد یہین پر نہیں ختم ہوجاتی بلکہ بہت سے ایسے بھی تھے جنھوں نے مصداق

نیکی کُن وبدریا انداز

اُردو اور ادب اُردو کے لیے کیا کچھ نہیں کیا لیکن کسی سے داد طلب نہیں ہوئے اور پبلک اُنکے کارناموں سے ناواقف رہگئی۔

حضرت بیان و یزدانی اُردو شعراء کے اسی طبقہ میں شمار ہو سکتے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ عوام ان سے ایک حد تک شناسائی کا فخر رکھتے ہیں تاہم اُن کی اجتہادی قابلیت اور بےنظیر علمیت کے لحاظ سے اُنکا دائرۂ شہرت بالکل محدود رہا اور عام طور پر کسی کو اُنکے کلام کی عظمت، اُنکے ذاتی اوصاف، اور خاندانی حالات سے آگاہی نہیں۔ طبقۂ خواص میں گو اُنکے کلام کو بہت بڑی حد تک رسائی حاصل ہو لیکن وہ بھی اُنکی شناسائی مرتبہ نہیں رکھتے۔

حضرت بیان اس زمانہ کے سربرآوردہ شعراء میں سے تھے جنکی علمیت اور نکتہ شناسی انصافاً اُنھیں بہت سے پیشرو مشاہیر سے ممتاز ثابت کرتی ہے۔ ایسے ذی علم لوگوں کا تذکرہ خالی از افادہ نہیں ہو سکتا۔ لہذا ہم کسی قدر تفصیل سے اُن کے حالات قلمبند کرتے ہیں اور اسکے بعد اُن کے کلام پر اپنی ناچیز رائے کا اظہار کریں گے۔ ان سطور کے مطالعہ سے ناظرین قیاس کر سکتے ہیں کہ بیان کا درجہ شاعری میں کیا ہے اور اُنھوں نے اپنے دل و دماغ سے کام لیکر اپنی فطرتی طباعی اور سخن سنجی کا کیسا کچھ ثبوت دیا ہے۔

سید محمد مرتضیٰ نام تھا۔ بیان و یزدانی تخلص کرتے تھے۔ انکے والد سید گوہر علی کے آٹھ لڑکے تھے جنمیں سے ایک حضرت بیان سے بڑے تھے اور باقی چھوٹے۔ ذاتی فضائل و اوصاف سے قطع نظر حضرت بیان نسباً بھی بڑے آدمی تھے انکا خاندان ساداتِ رضوی سے تھا اور مذہب شیعہ اثنا عشری تھا۔ اِن کے نانا سید عمردراز علی جھانسی اور کالپی میں ڈپٹی کلکٹر تھے اور انکے زمانۂ حیات تک بیان اور اُنکی والدہ زیادہ تر اُنھیں کے پاس رہتے تھے۔

سید بیان میرٹھ کے رہنے والے تھے لیکن اُنکے آبا و اجداد جارچہ ضلع بلند شہر میں سکونت رکھتے تھے۔ سید بیان کا ننھال میرٹھ کے قریب کسی موضع میں تھا اور انھیں تعلقات نے بالآخر میرٹھ کو اُنکا گھر بنا دیا۔

سید عمردراز علی بیان کے نانا نہایت اعزاز و امتیاز کے آدمی تھے جھانسی وغیرہ میں اب تک اُنکے مدّاح اور جاننے والے موجود ہیں۔ ایک مدت تک جھانسی میں ڈپٹی کلکٹری کی اور وہیں ۱۸۵۶ء میں بیان پیدا ہوئے۔ چار سال کی عمر میں شفیق نانا کا سایہ اُٹھ گیا۔ لیکن دوراندیش باپ نے انکی تعلیم و تربیت کا انتظام اپنے ہاتھ میں لیکر اُسے کما حقہ انجام تک پہنچانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔

سید گوہر علی خود ایک قابل بزرگ تھے اور جیسا کہ پہلے زمانہ میں شریف خاندانوں کا عام دستور تھا وہ پڑھے لکھے تھے اور علوم مشرقی میں اچھی دستگاہ رکھتے تھے۔ سید بیان کی ابتدائی تعلیم اُنھوں نے خود کی اور جب تعلقات ملازمت کی وجہ سے وہ اس کام سے معذور ہوئے تو مرزا باقر علی بیگ نے جو "میرٹھ میں فرقۂ شیعہ کے مایۂ ناز تھے" سید بیان کی تعلیم کی تکمیل کرائی۔

مولوی محمد حسین صاحب آزاد نے سید انشا کی تعلیم کا ذکر کرکے اُنکے ذاتی جوہر کو اِن الفاظ میں نمایاں کیا ہے :-

باپ کے لیے مثال دے سکتے ہیں کہ عزیز بیٹے کو اس خوبصورتی سے تعلیم کیا مگر بیٹا جو جوہردار طبیعت اپنے ساتھ لایا تھا اُسکی کوئی مثال نہیں ہے۔

یہی کیفیت سید بیان کی ہے۔ اُن میں خداداد قابلیت کا مادّہ موجود تھا، جو باپ اور اُستاد کی بزرگانہ اور مشفقانہ توجہات کے ساتھ سونے میں سُہاگے کا کام کر گیا۔ اُنھیں کتب بینی کا شغف بیحد تھا اور اسکے ذریعہ سے اُنھوں نے تجربے، مشاہدے، اور معلومات کے وہ تمام درجے بسہولت طے کر لیے جنپر عبور کرنا معمولی آدمی کے حیطۂ امکان سے باہر ہوتا ہے۔ اُنکی بلند نظری اور وسعتِ خیال کا ثبوت اُنکے کلام سے بھی ملتا ہے جسکے دیکھنے والے کو بہت جلد معلوم ہو جاتا ہے کہ شاعر کا دماغ گوناگوں جذبات و کمالات کا ایک بیش قیمت مخزن ہے۔

ذہنی قابلیت کے علاوہ سید بیان کو حسنِ سیرت و حسنِ صورت مساوی طور پر مبدءِ فیاض سے عطا ہوئے تھے۔ وہ نہایت خوش رنگ و وجیہ تھے خلیق

انکسار، اور ہمدردی کی صفات بھی اُن میں بدرجۂ اتم موجود تھیں۔ طبیعت شناس بھی بلا کے تھے۔ ہر شخص سے اُسکے مذاق کے موافق گفتگو کرتے تھے۔

وہ بہت خوبصورت تھے اور رنگ گورا چٹا تھا۔ اسکے متعلق ایک دلچسپ واقعہ قابلِ ذکر ہی۔ غدر کے زمانہ میں جبکہ امن و امان کا جنازہ ملک سے اُٹھ چکا تھا سید بیاؔن کو بعالمِ طفلی کہیں ایک مقام سے دوسرے مقام تک جانا پڑا اتفاق سے راستہ میں باغیوں کی ایک جماعت سے مڈبھیڑ ہوگئی۔ اُن نامردوں نے انھیں انگریز کا بچہ سمجھکر گرفتار کرلیا اور ڈیڑھ سو روپیہ لیکر چھوڑا۔

شروع جوانی میں اُنھیں ایک مرض لاحق ہوگیا تھا جسے دماغی عارضہ کہہ سکتے ہیں لیکن اُسکی ماہیت و نوعیت کے متعلق حکمی رائے قائم کرنا مشکل معلوم ہوتا ہی۔ مؤلف "خمخانۂ جاوید" کا خیال ہی کہ اس عارضہ کو بظاہر وہم سے منسوب کیا جاسکتا ہی" اس باب میں جو حالات سید بیاؔن کے برادرِ عزیز سید حسین صاحب میرٹھی سے دستیاب ہوے ہیں وہ بے کم و کاست درج کرتے ہیں۔ سید صاحب موصوف شہرت و قابلیت میں اپنے برادرِ معظم کے شریک و سہیم ہیں اور صوبجاتِ متحدہ میں بعہدۂ تحصیلداری ممتاز ہیں۔ علمی رسالوں میں آپ کے مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں جن سے آپ کی سخن یاب طبیعت کا بھی اندازہ ہوسکتا ہے۔ آپ رقمطراز ہیں بہ

"حالتِ مرض یہ تھی کہ قریب دو سیر وزن کی کپڑے کی گٹھری بنا کر دماغ پر رکھتے تھے اور کہتے تھے کہ دماغ بغیر اسکے اُڑا جاتا ہے۔ تاریک کمرے میں شب و روز رہتے تھے۔ اُسکے دروازوں پر نیلی پردے پڑے رہتے کہ روشنی مطلق نہ آسکے۔ ہانڈی کے پکنے اور چھالیہ کاٹنے کی آواز بھی اُنھیں ناقابلِ برداشت تکلیف دیتی تھی۔ نہایت خفیف شور سے بھی وہ سخت پریشان ہوجاتے تھے۔ اگر کسی ضرورت سے باہر نکلتے تو چھتری لگاکر۔ کہتے تھے کہ تاروں کی روشنی سے اذیت پہنچتی ہی اور تارے دماغ میں چبھتے ہیں۔ اس مرض میں وہ تمام عمر مبتلا رہے۔ البتہ چند سال کے بعد مرض میں وہ شدت نہ رہی تھی جو آغاز میں تھی۔ شور سے اب مطلق پریشان نہ ہوتے تھے۔ مکانِ تاریک کی نشست ترک کردی تھی۔ کپڑے کی گٹھری سر سے کندھوں پر اُتر آئی تھی۔"

ان باتوں پر غور کرنے کے بعد سوائے اسکے کیا نتیجہ اخذ ہوسکتا ہی کہ انکا دماغ نہایت نازک واقع ہوا تھا لیکن اس کے باوجود بھی انکی دماغی کاوشیں بدستور جاری تھیں۔

سید بیاؔن کئی اعتبار سے واقعی شاعر تھے۔ شاعری اور جنون کا ایک درجہ رکھا گیا ہی۔ جس طرح عالمِ جنون میں انسان کو اور باتوں کا کوئی احساس نہیں ہوتا اسی طرح حقیقی شاعر کی توجہ بھی فروعات کی طرف نہیں جاتی۔ وہ اپنی دُھن میں مست رہتا ہی اور عالمِ خیال کی محویت اُسپر طاری رہتی ہی۔ اُسے قیدِ علائق سے محفوظ رہنے کی ضرورت ہوتی ہی۔ تعلقاتِ نکاح چونکہ آدمی پر غیر معمولی ذمہ داری کا بار ڈالدیتے ہیں اور طرح طرح کے آلام اور تردوات میں پھنسا دیتے ہیں اس لیے انگلستان کے اکثر شعراء نے شادی نکرنا ہی اپنے لیے اچھا سمجھا تھا۔ ہماری ذاتی رائے میں مناکحت ہر انسان کے لیے ایک اخلاقی اور معاشرتی فرض ہی اور مذہب نے اسکی ضرورت و اہمیت جس طریقہ پر تسلیم کرائی ہی اُس سے بھی کسیکو انکار کی جرأت نہیں ہوسکتی باایں‌ہمہ یہ ایک ناقابلِ برداشت بوجھ ہوتا ہی جسکے اُٹھانے کی اگر کسی میں طاقت نہو تو وہ معذور سمجھا جاسکتا ہی۔ سید بیاؔن ذاتی طور پر دنیاوی علائق سے مستغنی واقع ہوے تھے۔ وہ طبعاً آزادی پسند تھے۔ لباس، خورش، کسی چیز میں وہ تصنع و آرایش یا تکلف کے پابند نہ تھے۔ بے غل و غش زندگی بسر کرنا اور چمن سخن کی اپنے خونِ جگر سے آبیاری کرنا اُنکا نصب العین تھا۔ اسی لیے اُنھوں نے کوئی شادی نہیں کی اور باوجود اصرار کے "سنتِ پیغمبری" سے اپنے "گلو" کو بچائے رکھا۔

آزادمنشی کے ساتھ ظرافت میں بھی وہ یکتا تھے۔ مزاج میں استقلال بدرجۂ اتم موجود تھا۔ آخری دفعہ جب بیمار پڑے تو آثارِ موت ظاہر تھے۔ لیکن مستقل مزاجی کا عالم وہی تھا۔ بسترِ مرگ پر بھی خلقی ظرافت نے ساتھ نہ چھوڑا اور عزم و استقلال کے وہی دم خم تھے۔ مرنے سے پہلے ایک کارڈ اپنے عزیز بھائی کو لکھا تھا جسے اس مصرعہ پر ختم کیا تھا ع

برلے مردن من غم مخور بقای تو باد

آخر وہ وقت بھی آگیا جس سے کسی ذی روح ہستی کو چارہ نہیں بسنہ ۱۹۰۰ء کے موسم سرما میں سید بیان مرض الموت میں مبتلا ہوے اور تقریباً دو مہینہ کی علالت کے بعد میرٹھ میں انتقال کیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ؎

رہے گر کوئی تا قیامت سلامت
پھر اک روز مرنا ہے حضرت سلامت

سید بیان کی شاعری پر نظر

حضرت بیان کی شاعری کا پایہ بہت ارفع و اعلیٰ ہے اور وہ اپنے فضائل محاسن کمال کے وسیلہ سے اُس درجہ تک پہنچ گئے تھے جو معمولی شاعروں کے منتہائے نظر سے بھی اُدھر ہے۔ علمیت۔ دماغی قابلیت۔ طبع کی جولانی، فکر کی بلندی خیالات کی نیرنگی، یہی باتیں ہوتی ہیں جو شاعر کے کلام کو مستند اور قابل قدر بنا دیتی ہیں اور انھیں اوصاف کی بدولت بیان نے بھی اپنی لافانی عظمت کا سامان مہیا کرلیا ہے۔

بیان کے کلام پر غائر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ وہ ہر بیشہ کے شیر اور ہر میدان کے مرد تھے۔ پرگوئی کے ساتھ مضامین آفرینی کا پہلو عموماً نظرانداز ہوجاتا ہے لیکن بیان نے سب کچھ کہا ہے اور جو کچھ کہا ہے بہت زیادہ کہا ہے نہ ہو ہے کہ ان کا کلیات اب تک شائع نہیں ہوا ورنہ ہر شخص بجائے خود اندازہ کرسکتا کہ خیالات و جذبات پر انھیں کہاں تک قدرت حاصل تھی اور انکی سخن سنجی او لغزگوئی کن کن دلچسپیوں اور رنگینیوں کا دلفریب مجموعہ بنی ہوئی تھی ہمیں میر سید حسین صاحب کی مہربانی سے بیان کے مختلف اصناف سخن پر غلط انداز نظر ڈالنے کا موقع ملا ہے اور اُسکے دیکھنے کے بعد ہمیں یہ کہنے میں تامل نہیں کہ موجودہ شاعران اُردو میں تو کوئی ایسا نہیں جو انکی نظیر کے طور پر پیش کیا جاسکے بلکہ شعرائے اسلف میں بھی اکثر سے بیان اگر نمبر نہیں لیگئے تو کم بھی نہیں رہے۔

بیان کے ایک پختہ کار سخن گو ہونے کی اس سے زیادہ قوی دلیل اور کیا ہوسکتی ہے کہ وہ جس رنگ میں چاہتے تھے بے تکلف کہتے تھے۔ زبان پر انھیں خاصہ قابو تھا۔ وزن دار اور موزوں الفاظ گویا انکے سامنے ہر وقت ہاتھ باندھے کھڑے ہوتے تھے۔ خیالات کی گوناگوں کیفیات کبھی میر کے رنگ میں نظر آئینگی کبھی غالب کے۔ کہیں ذوق کی متانت اپنی ہو بہو تصویر میں جلوہ گر ہوگی کہیں جرأت و داغ کی شوخی بیاں کا لطف حاصل ہوگا۔ اس نیرنگی کے باوجود انکی خاص طبیعت کا رجحان مطالعہ کرنیوالے کے قلب پر خود بخود ظاہر ہوجاتا ہے اور یہ خصوصیت انکے ہر صنف کلام میں موجود ہے۔

بیان کی اُردو غزلیں بہت دھوم دھام کی ہیں اور انکی پرگوئی کی مثال مشاہیر میں وزیر لکھنوی کے سوا کسی اور میں مشکل مل سکتی ہے لیکن انھوں نے موخرالذکر کی پیروی رعایات لفظی کے اعتبار سے کہیں نہیں کی۔ اور اگر کسی جگہ کی بھی ہے تو خوبی سے نہ اس طرح کہ سامع کا خیال معانی و مطالب سے ہٹ کر الفاظ کی طرف چلا جائے۔

کئی کئی زمینوں میں سہ غزلہ اور چہار غزلہ تک کہا ہے لیکن کہیں اور کسی پہلو سے بھرتی نہیں۔ شعر کے بعد شعر پڑھیے اور آمد کا لطف اُٹھائیے۔ انکے کلام کا بعض حصہ ایسا ہے کہ اگر کوئی شخص سرسری نظر سے بھی دیکھے تو غالب کے اشعار کا دھوکا ہوتا ہے۔ وہی ترکیبیں، وہی الفاظ کی نشست، وہی خیالات کی پیچیدگی، وہی مضمون کی دقت۔

اصل یہ ہے کہ اس قسم کی ہمہ گیر طبیعت ہر کس و ناکس کے حصہ میں نہیں آتی جن سخن وران کامل کو قدرتی طور پر فضل و کمال کا یہ درجہ ملتا ہے وہ ماں کے پیٹ سے صاحب فن پیدا ہوتے ہیں اور لاریب کہ بیان بھی ایک فطری شاعر تھے اور انکے جوہر کمال کو انکے ذاتی علم و قابلیت نے اور جلا دی تھی۔ بچپن ہی سے انھیں شعر گوئی کا شوق دامن گیر تھا اور اپنے والد کی ناراضی کے باوجود وہ فکر سخن میں منہمک رہتے تھے۔ ہمارے یہاں بالعموم مشاہیر کے حالات زندگی شرح و بسط سے منضبط کرنے کا طریقہ مروج نہیں ورنہ بیان کی شاعری کے مختلف مدارج پر غور کرنا خالی از دلچسپی نہ تھا۔ تاہم دو تین اشعار انکی

ابتدائی مشق کے جو بہم پہنچے ہیں اُنکے مطالعہ سے معلوم ہوسکتا ہو کہ آغاز ہی
سے اُنکی طبیعت کس قدر معنی یاب واقع ہوئی تھی۔ تقریبًا پندرہ برس کی عمر
کے یہ تین اشعار اُنکی یادگار ہیں ؎

گھبرا کے جہاں سے یہ ستم کش ترے گھر جائے — اور در ہو ترا بند تو بتلا کہ کدھر جائے
ہٹ ہٹ کے اندھیرا انکی آنکھوں کے آگے — واں تک تو نظر آؤ جہانتک کہ نظر جائے
رشک آئے ہو غمخوار مرا حال نہ کہنا — میں جانسکوں تاکہ ادھر میری خبر جائے

سخن فہم حضرات دیکھیں گے کہ دوسرا شعر کس قدر بلیغ ہو اور تیسرے شعر میں
غالب کے رنگ کی جھلک موجود ہو۔ یہ صفت ہر شخص میں نہیں ہوسکتی اور پھر
اس عمر میں اس پایہ کے شعر کہنا کوئی معمولی بات نہیں ۔

بیان فنِ شعر میں کسی کے شاگرد نہ تھے۔ صاحبِ "خمخانۂ جاوید" نے
اُنھیں سید احمد حسن فرقانی کا شاگرد رشید لکھا ہو اور اسی تلمذ کے ساتھ وہ
اکثر علمی حلقوں میں مشہور بھی ہیں لیکن فی الحقیقت اُنھوں نے زانوے شاگردی
کسی کے آگے تہ نہیں کیا۔ میر سید حسین صاحب برادر حضرت بیان سے
اس باب میں استصواب کیا گیا تھا اسکے جواب میں آپ لکھتے ہیں کہ

برادر مرحوم حقیقت میں کسی کے شاگرد نہ تھے۔ میر احمد حسین فرقانی اُن کے
ماموں تھے۔ برادر مرحوم اُنکی تعظیم کرتے تھے اور اسلیے اُنکو اپنا اُستاد بھی لکھدیتے
تھے۔ ورنہ حقیقت میں اُنھوں نے انکو ایک شعر بھی بنظر اصلاح نہیں دکھلایا
بلکہ بحیثیت شاعرانہ اُن میں اکثر مباحثہ بھی ہوجاتا تھا۔

در حقیقت جو صاحبِ کمال "الشعراء تلامیذ الرحمٰن" کے مصداق اپنی طبیعت
میں خود جوہر فن رکھتے ہیں وہ دوسروں کے مشورہ سے عموماً مستغنی ہوتے
ہیں۔ ہاں یہ ضرور ہو کہ اُستاد کی نظرِ تربیت سونے کو اکسیر کردیتی ہو اور
شاگرد کے ذاتی اوصاف کو اور چمکا دیتی ہو۔ بیان اس سے محروم تھے
لیکن اُنھوں نے اپنی زوردار طبیعت کی بدولت اپنے لیے خود ایک ایسی
شاہ راہ پیدا کرلی جہاں ذوقِ سلیم کے سوا اور کسی رہنما کی ضرورت
نہیں ہوتی۔

بیان کا کلام اُنکے کمال کی دلیل ہو۔ اُنھوں نے جس طرح چاہا اپنی طبیعت
کا رنگ دکھایا اور اسمیں شک نہیں کہ اُنکا ہر رنگ چوکھا ہی رہا۔ غالب کے کلام
کی ایک بہ الامتیاز خصوصیت اُنکے خیالات کا اچھوتا پن ہو۔ معمولی سے معمولی
بات کو وہ جدت کے ساتھ کہتے ہیں کہ سنکر جی خوش ہوجاتا ہو۔ بیان بھی اس
امر خاص میں غالب کے پے بہ پے ہیں۔ مبتذل مضامین کو وہ ایسی شگفتگی سے
باندھتے ہیں کہ سنکر لطف آجاتا ہو۔ بعض جگہ محض ایک آدھ لفظ سے وہ شعر میں
جان ڈالدیتے ہیں۔ ذیل میں دوچار شعر اسی نمونہ کے ملاحظہ ہوں ؎

اُٹھے زمیں سے لالۂ خونیں کفن کی طرح — محشر ہے ایک کھیت شہیدانِ یار کا
لپٹی گلے سے تیغ تو سودا فنا ہوا — یہ جونک خون چوس گئی جسمِ زار کا
لائے گھسیٹ کر ترے در سے شہید کو — دامن لہولہان ہے روزِ شمار کا
دامنِ دشتِ قیامت ہے اک اُدھڑی سی گلی — گُل کھلائے غضب لے چاکِ گریباں تونے

خیالات کی جدت ان اشعار میں ملاحظہ ہو ؎

ترے چلنے سے سینۂ زمیں کے — اُٹھا اک درد محشر کے بہانے
ہمیں نے پنجۂ دستِ جنوں سے — کیے ہیں کوہ کی چوٹی میں شانے
کون آتا ہے قیامت کسے شرم آتی ہو — کہ مرا خون چھپایا تہِ داماں تونے

رفتارِ معشوق سے محشر برپا ہونا، دستِ جنوں سے کوہسار کے ٹکڑے اُڑانا، یا
معشوق کا عرصۂ قیامت میں شرمسار آنا، اردو شاعری کے متداول مضامین
ہیں مگر بیان نے ہر مضمون کو جدت کے ساتھ نظم کیا ہو۔ رفتارِ یار سے زمین
کے سینہ میں محشر کے بہانے درد اُٹھنا بالکل نیا خیال ہو۔ تیسرے شعر کے معنی
بھی نہایت لطیف ہیں کہ خود قیامت نے معشوق کے محجوب ہونے کے خیال
سے عاشق کے خون کو اپنے دامن میں چھپایا ہے۔

ذیل کے اشعار کس درجہ بلیغ واقع ہوے ہیں۔ ان کی داد اہلِ نظر
خوب دیں گے ؎

نہ کھولی آنکھ وقتِ نزع بیمارِ محبت نے — کسیکا پردہ رکھنا تھا کوئی آنکھوں میں پنہاں تھا
کس رشکِ مہر و ماہ کا آوارہ گرد ہوں — ہو آسمان لقب مرے مشتِ غبار کا

رکھا ہے پاؤں واں ترے مشتاقِ دید نے　　ہے شمعِ طور نام جہاں خار خار کا

بے ٹھکانوں کو ڈھونڈھتا ہوں میں　　کہ پتے ہیں ترے ٹھکانے کے

میرے نالوں سے کانپتی ہے برق　　منھ میں تنکے ہیں آشیانے کے

ہر ایک شئی میں پنہاں تیرا مقام نکلا　　توڑا جو بُت کدہ کو بیت الحرام نکلا

موخر الذکر طرح میں بہ تبدیل قافیہ ایک غزل لکھی ہی۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔ صفائی زبان اور سلاست بیان خصوصیت سے قابل غور ہے ؎

ڈھنگ بے ڈھنگ ہیں زمانے کے　　رنگ بیرنگ ہیں زمانے کے

موے مشکیں نے باندھ لیں مشکیں　　یہی سرہنگ ہیں زمانے کے

اک نیا رنگ روز لاتے ہیں　　آپ ہمرنگ ہیں زمانے کے

واہ رے نقش! واہ رے نقاش!　　آئینے دنگ ہیں زمانے کے

گردشِ آسماں فلاخن ہے　　آدمی سنگ ہیں زمانے کے

تیسرے شعر کا مضمون کس قدر لطیف ہی اور آخری شعر میں گردش آسمان کو فلاخن سے اور انسان کو پتھر سے کتنی قریب الفہم اور معنی خیز تشبیہ دیگئی ہے۔

اِن اشعار پر بادی النظر میں غالب کا دھوکا ہوتا ہی ؎

سرِ شوریدہ پائے دشت پیما شامِ ہجراں تھا　　کبھی گھر تھا بیاباں میں کبھی گھر میں بیاباں تھا

گئے تھے روندنے دلکو لیے بیٹھے ہیں تلوؤں کو　　فرو رگ رگ میں نشتر تھے نہاں نس نس میں پیکاں تھا

اُنکا منجملۂ اربابِ وفا ہو جانا　　میرے نزدیک ہی بندے کا خدا ہو جانا

غمِ اُلفت گلوگیر نفس ہے پھیرِ دو خنجر　　نہیں آسان ہو مشکل۔ ہمیں آسان مشکل ہی

مشکل ہی، قاتل ہی، اس زمین میں سید بیاںؔ نے چو غزلہ کہا ہی اور چاروں غزلیں بہت دھوم دھام سے لکھی گئی ہیں۔ ان میں سے ایک غزل جسکا ایک شعر یہ ہی بہت مشہور ہی اور اربابِ نشاط کی زبان پر چڑھی ہوئی ہی ؎

چلی آتی ہیں نذریں دھوم سے دربارِ قاتل ہی　　کسیکا سر ہتھیلی پر کسی کے ہاتھ میں دل ہے

چاروں غزلیں مصنف کے اصلی رنگ طبیعت کا دل فریب نمونہ ہیں اور اسمیں شک نہیں کہ انکا ہر شعر دوسرے شعر سے بڑھا ہوا ہی۔ جو لوگ غزلوں میں شکوہ الفاظ و دبدبۂ مضمون کی تصویر دیکھنا چاہیں وہ ان اشعار کو ملاحظہ فرمائیں ؎

شہادت منزلِ مقصود ہی ملاح قاتل ہی　　یمِ امواجِ بیتابی دمِ شمشیر ساحل ہی

تگ و تازِ سمندِ جسم تا ایوانِ قاتل ہی　　اُتر لے لے سرِ شوریدہ اب نزدیک منزل ہی

مزا پھرتا ہی ہونٹوں پر تلاشِ خونِ بسمل ہی　　زباں بگڑی ہوئی ہی کیا چٹوری تیغِ قاتل ہی

وہ مجنوں ہوں وہ میرا شاہدِ لیلیٰ شمائل ہی　　زمیں جسکا بیاباں چرخ ناقہ عرش محمل ہی

وہ محفل محفلِ شادی ہی ہر سُو رقصِ بسمل ہی　　شہیدِ ناز ہی دُولھا۔ دُلھن شمشیرِ قاتل ہی

یہ شعر کس موثر انداز میں کہا گیا ہے ؎

قیامت کی نگاہِ یاس نے کیوں نیمچہ مارا　　کہ قاتل نیم بسمل ہی دمِ شمشیر بسمل ہے

"شاہدِ لیلیٰ شمائل" کی تعریف اُوپر ایک مطلع میں گذر چکی ہی۔ اسی محمل کے قافیہ کو ایک مقطع میں پھر اُسی شان سے نظم کرتے ہیں ؎

مرا دل لے بیاںؔ مجنوں ہی اُس لیلیٰ شمائل کا

غبارِ عالم ایجاد جس کی گردِ محمل ہی

ذیل کے شعر میں تکرار کتنی پُر لطف ہی اور مضمون بھی نہایت شگفتہ ہی ؎

وہ ہیں چشمِ تصوّر میں تکی ہی چشمِ شوق اُسپے　　تماشا ہی کہ تِل قاتل میں ہی اور تِل میں قاتل ہی

وہ کہتے ہیں مرا پیکاں میں کہتا ہوں مرا ارماں　　وہ کہتے ہیں مرِا مسکن میں کہتا ہوں مرا دل ہی

"نگاہ یاس" والا شعر نہایت پُر اثر ہی۔ زار و نالی کے مضامین انکے کلام میں کم نظر آتے ہیں باایں‌ہمہ جو کچھ کہا ہی خوب کہا ہی۔ یہ شعر کتنا حسرت آمیز ہی ؎

خدا ٹھنڈا رکھے اے شمع تجھکو　　کھڑی روتی ہی بیکس کے سرہانے

اسی طرح ارمان کی "جواں مرگی" کا ماتم بہت پُر درد ہے ؎

عمر بھر قید رہا ہائے جوانمرگ مُوا　　کچھ بھی دنیا میں نہ دیکھا مرے ارماں تو نے

اس غزل کا مطلع قابل دید ہی اور دنیاے فانی کی کیفیات کا آئینہ ہی کہتے ہیں ؎

کیا ہوا اُن کو اُتارے تھے جو مہماں تو نے　　کچھ بتایا نہ لبِ گورِ غریباں تو نے

ناظرین سخن فہم نے غور کیا ہو گا کہ بیاںؔ کس قسم کے شعر گو تھے اور انکا اصلی رُجحان کس طرف تھا۔ جدت پسندی کے باوجود اُنکے کلام کا حصہ ایسا بھی ہی جو سلاست اور سادہ گوئی کا بہترین نمونہ کہا جا سکتا ہی۔ مثلاً ؎

لہو ٹپکا کسی کی آرزو سے　　ہماری آرزو ٹپکی لہو سے

یہ ٹوٹے گی ہوائے گُل سے واعظ　　مری توبہ کو کیا نسبت وضو سے

ترا کشتہ اُٹھایا اُس ادا سے　　چلے محشر کو مٹی میں دبانے

نگاہیں قہر میں ڈوبی ہوئی ہیں　　لگے تم زہر میں چھُریاں بجھانے

مرے مجموعۂ خاطر یہ تو نے　　کیا جو تیرے گیسو سے صبا نے

یہ ہے شامِ فرقت یہ ہے شامِ فرقت　　نہو گی نہو گی سحر دیکھ لینا

وہ پوشیدہ رکھتے ہیں اپنا تعلق　　اِدھر دیکھ لینا اُدھر دیکھ لینا

اب مجھے کھو کے نہ روؤ کہ اگر روئیگی شمع　　جان پڑ جائیگی کیا خاک میں پروانے کی

جلوہ سے ڈال دیا چشمِ تماشا پہ نقاب　　یہ نئی وضع ہے ظالم ترے شرمانے کی

مجھے بھی نقدِ آمرزش کی محشر میں ضرورت ہے　　شہنشاہا! کمی کیا ہے تری سرکارِ رحمت میں

جہاں پُر شور ہے لے دل پڑا رہ کُنجِ عزلت میں　　کہیں مارا نجائے جنگ ہفتاد و دو ملت میں

مضامین کی دھوم دھام اور الفاظ و ترکیب کی بلند پائگی کے اعتبار سے جس شخص کی غزلیں بسا اوقات قصیدوں کا دھوکا دیتی ہوں اُسکے قصیدہ کا کیا کہنا۔ ہمیں افسوس ہے کہ سید بیاںؔ کا کوئی اُردو قصیدہ ہمیں دستیاب نہیں ہوا۔ اُنکے قصائد جہاں تک قیاس کیا جا سکتا ہے عموماً فارسی میں ہیں۔ سید بیاںؔ اُردو کی طرح فارسی کے ایک نغزگو اور جیّد شاعر تھے۔ اور اس میں یزدانیؔ تخلص کرتے تھے۔ فارسی قصائد کے مطالعہ سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہ اس معرکہ میں بھی اچھے اچھوں سے نمبر لیگئے ہیں۔ اُصولاً انکے قصیدے خاقانی کے اور ادائے مطالب کے لحاظ سے انوری کے قصیدوں کے ہم پلّہ ہیں۔ منقبت حضرت علی کرم اللہ وجہہ میں ایک قصیدہ کہا ہے جسکی تمہید قابلِ دید ہے۔ فرماتے ہیں ؎

لے خوشا کوکبۂ گُل کہ بگلزار رسید　　ژالہ شبگیر زد و لالہ بہ دیوار رسید

جعدِ سنبل پُر پیچ چو شانہ آراست　　کس صبا شانہ کش طرۂ طرار رسید

در بہاراں گُل اگر فرو بہائے دارد　　خار را سرو قدے داں کہ ز فرخار رسید

باد در صحنِ چمن طبلۂ عطار کشود　　پنبہ ساں غنچہ ازاں طبلۂ عطار رسید

سرو خضریست کہ پیرایۂ خضرا در بر　　لب جو صورتِ عباسؑ علمدار رسید

رنگ چوں آلِ محمدؐ بہ ریاحیں دادند　　حُلّۂ سبز چو سادات با شجار رسید

از سمک تا بہ سمانیست وجودِ خلشے　　گُل ز گلزار و زجو ماہیِ بے خار رسید

سرو کی تشبیہ حضرت عباس علمدار سے کس قدر لطیف و بامعنی ہے۔ اسی طرح آخری شعر میں خلش نہ ہونے کا ثبوت "ماہیِ بیخار" سے کتنا اچھا بہم پہنچایا ہے۔

میرٹھ میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس ہوا تھا۔ اُس میں سید بیاںؔ بھی شریک تھے۔ اسکے لیے ایک قصیدہ بڑے معرکہ کا کہا ہے تشبیب کتنی بلند ہے ؎

ساقی بیاور مے زدن کا وانِ باراں آمدہ　　ورکوہساراں قطرہ زن ابرِ بہاراں آمدہ

اُردی بہشت آمد کنوں گلشن بہشت آمد کنوں　　از خشت خشت آمد کنوں تا گُل در ایواں آمدہ

از گل نشاط انگیختن وز باد عنبر بیختن　　از ابر لُولُو ریختن وز چاک داماں آمدہ

مرغ انطرب دستاں زند گلخندہ چوں بستاں زند　　چقماق در بستاں زند برقے کہ رخشاں آمدہ

قصائد میں حصۂ غالب مدح ممدوح کا ہوتا ہے لیکن چونکہ تعریف میں مبالغہ سے زیادہ کام لیا جاتا ہے اس لیے سامعین کے دل پر اُسکا اثر چنداں نہیں ہوتا۔ سید بیاںؔ نے اسی قصیدہ میں مسٹر محمود مرحوم اور آنریبل نواب عماد الملک مولوی سید حسین بلگرامی کی تعریف نہایت معنی خیز طور پر کی ہے اور چونکہ اُسمیں واقعیت کو بھی دخل دیا گیا ہے اس لیے مضمون مزیدار ہو گیا ہے۔ مسٹر محمود کی تعریف میں کہتے ہیں ؎

ترکانِ تازی را اگر پیرِ حجازی را اگر　　محمودِ غازی را اگر با فرِّ سلطاں آمدہ

دانش ورش راج کند دارائے ہندش باج　　عزت کلاہش کج کند فرّش فراواں آمدہ

مولوی سید حسین بلگرامی کی مدح میں یہ شعر دادطلب ہیں ؎

آں سیدِ جیّد حسین آں مصطفیٰ را نورِ عین　　صدرِ شرف را زیب و زین در بزم اعیاں آمدہ

گویند نامی گوہر است او بلگرامی گوہر است　　لا بل گرامی گوہر است کز عدن عدناں آمدہ

منشی عبد الکریم سی آئی ای کی تعریف اِن الفاظ میں کرتے ہیں ؎

بخلوت در۔ ندیمِ بارگاہِ عزّ بے چونی　　بجلوت در۔ مشیرِ قیصرِ ہندوستاں بینم

دو دستِ امتناں گستردہ انگشتِ عطا برؔ   با قلیم دو آب اندرو ہیجا باین نام منیم

سید بیانؔ کے قصائد و غزلیات کا ذکر اُسوقت تک مکمل نہیں ہو سکتا تاوقتیکہ اُنکے نعتیہ کلام پر بھی سرسری نظر نہ ڈالیجائے۔ اس صنف خاص میں متاخرین شعرائے اُردو میں حضرت محسنؔ کاکوروی نے قابل رشک امتیاز حاصل کیا ہے۔ حضرت غلام امام شہیدؔ بھی مداحِ رسولؐ امی کی حیثیت سے نہایت ناموری پاچکے ہیں۔ ان بزرگوں کے کلام کی مابہ الامتیاز خصوصیت اُنکی وہ تاثیر کلام ہے جو صرف سچے عاشقان نبیؐ کے دلوں میں پیدا ہو کر زبان اور قلم سے نکل سکتی ہیں۔ مضامین آفرینی کے اعتبار سے نواب رضوان مرادآبادی بھی ذکر کے قابل ہیں۔ لیکن فی الحقیقت اور بہت کم شاعروں نے اس طرف توجہ کی ہے۔ ہر شاعر کے دیوان میں چند نعتیہ غزلیں موجود ہونگی لیکن وہ صرف تیمناً و تبرکاً داخل کیجاتی ہیں۔ امیرؔ مینائی لکھنوی نے البتہ پورا دیوان نعتیہ قصائد و غزلیات کا مرتب کیا ہے اور اُردو میں اس قسم کے مستند کلام کی جو کمی تھی وہ اس سے بہت کچھ پوری ہو گئی ہے۔ سید بیانؔ کا نعتیہ کلام محسنؔ و شہیدؔ کے برابر نہیں رکھا جا سکتا لیکن اُنھوں نے بھی آں حضرت کی شان میں اپنی طرز میں اچھا کہا ہے اور بعض بعض چیزیں تو واقعی اس قدر موثر ہیں کہ گویا دل سے نکلی ہیں۔ اُنکی ایک نعتیہ غزل بہت مشہور ہے جسکا مطلع ہے ؎

خواب میں زلف کو مکھڑے سے ہٹالے آجا   بے نقاب آج تو او گیسوؤں والے آجا

اس غزل کا یہ شعر بیحد کیفیت انگیز ہے ؎

ہوں سیہ کار مرے عیب کھُلے جاتے ہیں   کملی والے مجھے کملی میں چھپالے آجا

اسی کے چند اور اشعار قابل داد ہیں ؎

بیکسی پر مری خوں روتے ہیں چھالے آجا   راہ میں چھوڑ گئے قافلہ والے آجا
پہنچا محبوب تو مشاطۂ رحمت نے کہا ق   خلوتِ راز میں لے ناز کے پالے آجا
رنگ وحدت ہے یہاں غنچۂ خلوت ہے یہاں   اے گُل گلشنِ لولاکَ لمَا۔ لے آجا
صورتِ لالہ ہے پُر داغ بیاںؔ کا سینہ   پڑ رہے ہیں ترے بیمار کے لالے آجا

ایک نعتیہ غزل اور قابل تذکرہ ہے جو ایک متداول زمین میں لکھی گئی ہے۔ اس میں بھی چیدہ چیدہ اشعار دیکھنے کے لائق ہیں ؎

ضیائے دیدۂ حق بیں ہے رُخسارہ محمدؐ کا   کہ ہے اللہ کا دیدار نظارہ محمدؐ کا
قمر سمجھیں کہ ہم قرآن رُخسارہ محمدؐ کا   یہ سیپارہ محمدؐ کا وہ صد پارہ محمدؐ کا
وہ محبوب الٰہی ہے کیا ہے اُسنے مہ پارہ   کریگا سامنا کیا کوئی مہ پارہ محمدؐ کا
اذاں ہے شور اُس سلطانِ دیں کے کوسِ شاہی کا   سدا بجتا ہے پانچوں وقت نقارہ محمدؐ کا
وہ شافی میرے دردونکا وہ کافی میرے دردونکا   میں دُکھیارا محمدؐ کا میں دُکھیارا محمدؐ کا

نعتیہ کلام کے آخر پر منقبت حضرت علی کے یہ چند اشعار درج کیے جاتے ہیں تاکہ ناظرین کو سید بیانؔ کی پُر گوئی اور قادر الکلامی کے ساتھ اُنکی وسیع النظری کا بھی اندازہ ہو سکے۔ لکھتے ہیں ؎

خانۂ حق میں علی سا گلعذار آنیکو ہے   باغِ ابراہیم میں فصلِ بہار آنیکو ہے
جھومتا ہے بادِ فرور دیں سے کعبہ کا غلاف   گلفشانِ شاخسارِ ذوالفقار آنیکو ہے
قلعہ کنؔ خیبر شکنؔ عنتر فگنؔ اژدر شگافؔ   دیو در، عفریت کش ضیغم شکار آنیکو ہے
بعض بندے جسکو نادانی سے کہتے ہیں خُدا   وہ مقدس بندۂ پروردگار آنیکو ہے
لافتیٰ اِلّا علی کا غلغلہ اُٹھنے کو ہے   آیۂ لاسیف اِلّا ذوالفقار آنیکو ہے

چوتھے شعر میں نصیریوں کی طرف اشارہ ہے جو حضرت علی کو (معاذ اللہ) خدا کہتے ہیں۔

مرثیہ بھی آجکل جداگانہ فن کی صورت اختیار کیے ہوئے ہے۔ اور اس فن میں انیسؔ و دبیرؔ یا اُنکے جانشینوں نے جو نام پیدا کیا ہے اُسکے آگے کسی کا دعویٰ قابل قبول نہیں ہو سکتا۔ غالبؔ نے بھی اس میدان میں تلوار میان میں کر لی تھی حالانکہ جذبات نگاری کا فطری ملکہ جو اُنھیں تھا اُسکی نظیر کسی اور شاعر کے کلام میں ملنا غیر ممکن ہے۔ بیانؔ نے میر انیسؔ کی طرز پر تین چار مرثیے کہے ہیں اور بجائے خود وہ بہت کچھ قدر کے شایاں ہیں۔ ایک مسدس کی فخریہ تمہید یوں لکھی ہے ؎

خورشیدِ آسمانِ شرف ہے سخن مرا   دریائے فیض و کانِ شرف ہے سخن مرا

چترِ خدائیگانِ شرف ہے سخن مرا   شاہنشہِ جہانِ شرف ہے سخن مرا
اس زور شور سے کوئی لشکر بڑھا نہیں
اس اوج موج سے کوئی دریا چڑھا نہیں

بسمل کیا عدو کو ستم ہے زباں مری   گویا زبانِ تیغِ دو دم ہے زباں مری
تیغ علی کی طرح علم ہے زباں مری   سیفِ خدا خدا کی قسم ہے زباں مری
نقرے پکارتے ہیں کہ معجز نگار ہوں
مدحت طرازِ بادشہِ ذوالفقار ہوں

انکے مراثی کو بلا استیعاب دیکھتے ہوئے یہ کہنا مشکل ہے کہ سید بیاںؔ کا مرثیہ گوئی میں کیا درجہ ہے۔ تاہم اوپر کے دو بند انکے انداز کے ذہن نشین کرنیکے لیے کافی ہیں۔ انیسؔ و دبیرؔ دنیا میں دوبارہ نہیں آسکتے۔ لیکن انکے خاندان والوں نے اپنے گرامی منزلت بزرگوں کا نام اچھی طرح روشن کیا ہے گویا ابھی تک مرثیہ گوئی اُن لوگوں کا موروثی ترکہ ہے۔ یقینی بات ہے کہ اُردو زبان کی ترقی کے ساتھ ساتھ انکی ملکیت کے دعویدار بھی پیدا ہوتے جائینگے اور ایکدن اپنا حصہ لیکر رہیں گے۔ سید بیاںؔ اور اسی قسم کے دوسرے شعراء کی یہ کوششیں اُسی دعوے کا ابتدائی ثبوت ہیں اور اسی قبیل سے شعرا غالباً ایکدن اپنی مساعی جمیلہ سے دنیا پر ثابت کر دینگے کہ کوئی علم اور کوئی فن کسی خاص شخص یا کسی خاص طبقہ کی ملکیت نہیں ہوتا بلکہ صاحبِ ہمت کے آگے پہاڑ بھی سرنگوں ہوتا ہے۔

سید بیاںؔ کے مراثی گو انیسؔ و دبیرؔ کی ٹکر کے نہیں ہیں لیکن اُن کے تصنیف کردہ "سلام" بہرصورت اس قابل ہیں کہ لکھنؤ کے مشاہیر کے بالمقابل لائے جائیں۔ مونسؔ کا ایک مشہور سلام ہے جس کے چند اشعار حسب ذیل ہیں ؎

عذابِ نارِ سقر سے معاف ہم بھی ہیں   کہ عبدِ ہاشم و عبدِ مناف ہم بھی ہیں
نکل کے تیغِ علیؑ نے کہا کہ بسم اللہ   بڑھیں حضور کہ بے غلاف ہم بھی ہیں
کبھی تو یاد کرا سے کعبۂ خلیل اللہ   کہ مستحقِ ثواب طواف ہم بھی ہیں
نجف ہو یا کہ ہو جنات عدن ہو یا کہ بہشت   علی جہاں وہیں بے اختلاف ہم بھی ہیں
صراط بال سے باریک ہو تو ہو مونسؔ
کچھ اسمیں فرق نہیں موشگاف ہم بھی ہیں

اسی ردیف و قافیہ میں سید بیاںؔ کے اشعار دیکھیے ؎

سخن کے معرکہ میں گرمِ لاف ہم بھی ہیں   برنگِ تیغِ علی بے غلاف ہم بھی ہیں
زبانِ چیں سے کہا آستین مولا نے   کہ سیفِ دستِ خدا کے غلاف ہم بھی ہیں
زمیں پکاری کہ خاکِ درِ حسینؑ ہو نہیں   کہا فلک نے شریکِ طواف ہم بھی ہیں
کہا حسینؑ کے اعضا نے قطع ہو ہو کر   مقطعات بلا اختلاف ہم بھی ہیں
بیاںؔ بہشت میں مونسؔ سے چلکے کہتے ہیں
کچھ اسمیں فرق نہیں موشگاف ہم بھی ہیں

مقطع میں سید بیاںؔ نے شاعرانہ شوخی سے کام لیا ہے۔ مونسؔ اپنے موشگافی کے دعوے میں بال برابر فرق تسلیم کرتے ہیں اور بیاںؔ اپنے موشگاف ہونے میں اتنا فرق بھی جائز نہیں رکھتے۔ عبدمناف کا قافیہ بیاںؔ نے بھی یوں نظم کیا ہے ؎

کہا یہ حُر نے شہِ دیں سے ہو کے پیوستہ   کہ سروِ گلشنِ عبدِ مناف ہم بھی ہیں

اس سلام میں سید بیاںؔ نے قافیہ پیمائی کی شان نہایت عمدگی سے دکھلائی ہے بہت سے ناموس اور دقیق الفاظ کو غایت خوبی سے نباہا ہے۔ ملاحظہ ہوں ؎

یہ آفتاب کا ہے قول خیطِ ابیض سے   برائے مسندِ شہ نور باف ہم بھی ہیں
غبارِ شاہ کا ہے قول روشنائی میں   عیونِ شمس و قمر کے شیاف ہم بھی ہیں
پکارے گر کے صنم جب علی نے کی تقطیع   کہ بیتِ ربِ عُلا کے زحاف ہم بھی ہیں

اس شعر کا مضمون کتنا بیساختہ ہے ؎

رسول کہتے ہیں مولا کے خاکسار وں سے   فلک کرے تو کرے انحراف۔ ہم بھی ہیں

ایک اور سلام کا مطلع کس قدر پُردرد ہے ؎

صدا مجرائی آئی تھی لبِ شمشیرِ قاتل سے   رگیں پیاسے گلے کی خشک ہیں کٹتی ہیں مشکل سے

اسکا ایک اور شعر مضمون و طرزِ بیان کے لحاظ سے خوب ہے لیکن پیاسے باطفا

یاسے ادل کانوں کو اجنبی سا معلوم ہوتا ہے ؎

لب دریا پیاسے رہ گئے حضرت یہی غم ہے   کہ اک موج اب تک سر کو ٹکراتی ہے ساحل سے

دو ایک معرا نظمیں "محرم نامہ" وغیرہ کے نام سے لکھی ہیں - ایک جگہ فرماتے ہیں ؎

آگیا ساقی غم کا مہینا   توڑ دے ساغر پھوڑ دے مینا
آنا آنا دوڑ کے آنا   خندۂ جام کو آنکھ دکھانا
بارہ مہینے عیش پہ لپکے   ہفتہ عشرہ اشک بھی ٹپکے
شیشۂ سبز تراق سے ٹوٹے   ساغرِ سرخ پڑاق سے ٹوٹے
ساغرِ گل نہ مینا بھردے   خونِ جگر سے مینا بھردے

شاعری خوب ہے لیکن جذبات صحیح نہیں - طرز بیان ایسا ہونا چاہیے تھا کہ سامعین کے دلوں کو گداز کرے - ان اشعار کو سنکر قلوب پر رنج و غم کے اثرات طاری نہیں ہو سکتے بلکہ خیال کو تلازمے اور استعارے اپنی طرف پھیر لیتے ہیں - مولنا حالی کا وہ اصولی اعتراض جو آپ نے مثنوی گلزار نسیم کے اُس حصہ پر کیا ہے جہاں بکاؤلی پھول چوری جانے پر گریہ و فریاد کرتی ہوئی یہ کہتی ہے ؎

ہے ہے مرا پھول لے گیا کون   ہے ہے مجھے داغ دے گیا کون
شبنم کے سوا چرانے والا   اوپر سے تھا کون آنے والا

سید بیان کے شعروں پر بھی صادق آتا ہے - لیکن اس سے یہ مطلب نہیں کہ وہ اس مضمون کو پُر درد انداز سے لکھنے پر قادر نہ تھے - اسی قسم کی ایک اور نظم کے مندرجہ تحت اشعار سے ہمارے خیال کی تصدیق ہو جائیگی ؎

چاند محرم کا نظر آیا   آنکھ میں یا لختِ جگر آیا
تڑپ رہے ہیں رسولؐ کے جانی   بند ہوا ہے دانہ پانی
روتے ہیں بچے پیاس کے مارے   دُرِ نجف بے آب ہیں سارے
شاہ کا سر اور نیزۂ اُمت   نقل ہے جس کی مہرِ قیامت
رہتے تھے جس پہ ہونٹ نبیؐ کے   ایسے گلے پر دانت چھری کے

صاف و سادہ الفاظ ہیں لیکن کم و بیش تاثیر سے مملو ہیں - حقیقت یہ ہے کہ وہ ہر قسم کے مضامین لکھنے پر قادر تھے - یہ اتفاقی بات ہے کہ کسی نظم میں طبیعت کا رُجحان کسی خاص سمت ہو جائے - واجد علی شاہ اختر کا فارسی مرثیہ بہت درد انگیز لکھا ہے - مفصلۂ ذیل انتخابی شعروں میں ہستیِ ناپائدار کا خاکہ اچھا کھینچا ہے ؎

بیا تا بنالیم چون قرنا   کہ شاہاں کجا یند و میراں کجا
نہ گورائے تاجداراں خرام   نہ چاؤش وہاروں نہ کوس و ما
نہ آں تاج بینی نہ آں تارکش   بہ زنداں سرائے سکندر دگر آ
کنوں یکدرم نیست زینساں اثر   فیا حسرتا ثم واحسرتا
نشیند یکے تا نہ خیزد دگر   ابر تخت اقبال تنگست جا
مکاری سرود الرحیل الرحیل   منادی زند الفنا الفنا

سید بیان جس زمانہ میں ایشیائی شاعری کے چمن کو اپنی آبیاریِ فکر سے نشو و نما کا سامان بہم پہنچا رہے تھے اُسی وقت ہندوستان میں وہ گروہ نمودار ہو رہا تھا جس کی دوربین نگاہوں نے بتا دیا تھا کہ مغربی شاعری کے اتصال سے اُردو شاعری میں یقینی طور پر انقلاب آنیوالا ہے - موخر الذکر گروہ کے افراد کی انقلاب انگیز کوششیں شروع ہو چکی تھیں اور پروفیسر آزاد و مولنا حالی کے مقلدوں کی ایک نئی جماعت کے ہاتھوں ایشیائی طرز سخن کی اصلاح کا کام شروع ہو چکا تھا - سید بیان ان حالات سے کیسے ناواقف رہ سکتے تھے - غالباً اُنھوں نے بھی اس بات کو تسلیم کر لیا تھا کہ ہماری قدیم شاعری ترمیم و اصلاح کی محتاج ہے - اُنکے کلام میں قومی غزلیات موجود ہیں - اس سے ثابت ہوتا ہے کہ بزم عزائے قومی میں جہاں حالی اپنا مرثیہ پڑھ پڑھ کر فدائیان قوم کو تڑپا رہے تھے سید بیان بھی آنسو بہانے کے لیے پہنچ گئے تھے - انکے یہاں اکثر قومی طرحیں ہوتی تھیں اور اُنپر وہ خود اور اُنکے تلامذہ طبع آزمائی کرتے تھے - انھوں نے ایک مسدس "ایشیائی شاعری کی الوداع" کے عنوان سے لکھ کر

قدیم شاعری کا حق رفاقت ادا کیا ہے جسکا ایک بند یہ ہے ؎

لٹا راج تیرا اسب اے شاہزادی　　غمی سے مبدل ہوئی تیری شادی
مرادوں کے بدلے ملی نامرادی　　زمانہ نے تصویر تیری مٹادی
نہ وہ چاندسی شکل نکھری ہوئی ہے
نہ وہ عنبریں زلف بکھری ہوئی ہے

ایک قومی غزل کا انتخاب ہدیۂ ناظرین ہے ؎

کیا عالم سکوت میں ہے گلستانِ قوم　　کوئی نہیں ہے بلبلِ جادو بیانِ قوم
وہ ٹوٹ کر گرا استحمل نہیں کوئی　　اللہ کس زمیں پہ رکھوں آسمانِ قوم
اب تک تو کچھ گیا نہیں دیکھ آنکھ کھولکر　　مٹ جائیگا تو پھر نہ ملے گا نشانِ قوم

کانفرنس والے قصیدہ میں علم کی ضرورت ان الفاظ میں بتائی ہے ؎

شاہنشہ دیں گفتہ است باشرع و آئیں گفتہ است　　لوکان بالصیں گفتہ است ایں گفتہ برہاں آمدہ
ہم علم ابداں باید ہم علم ادیاں باید　　ہم ایں و ہم آں باید کالعلم علماں آمدہ
خواہد سرت دیہیم را از کف مدہ تعلیم را　　کیں فاتح است اقلیم را فتحش نمایاں آمدہ

حضرتِ بیانؔ نیچرل نظمیں بھی خوب لکھتے تھے - نمونہ کے طور پر ہم ایک نظم کے چند اشعار نقل کرتے ہیں - ناظرین ملاحظہ فرمائیں کہ نیچرل مضامین کو کس ندرت اور کس خوبی کے ساتھ نظم کیا ہے - جاڑے کے عنوان سے لکھتے ہیں ؎

دھوم مچاتی سردی آئی　　دانت بجاتی سردی آئی
ڈھک گیا منھ اور چھپ گئے ہاتھ　　جاء البرد مع الجبات
دانت کی ڈونڈی گھر کا اکھاڑا　　روئی کے پیچ نے سب کو پچھاڑا
گھر گھر بانٹی دولت اِس نے　　سب کو دیا ہے خلعت اِس نے
کسی کا شالی مول میں بھاری　　کسی کا کمّل تول میں بھاری
آگ سے بیچ مچ لاگ ہے سب کو　　آس اولاد کی آگ ہے سب کو
گود میں لی چھاتی سے لگالی　　آج کل آگ ہے ننھی بالی
شب کو انگیٹھی سب کے قریں ہے　　کوئلوں پر اب مُہر نہیں ہے

مولٰنا جعفر علی کا مرثیہ ترکیب بند لکھا ہے - پہلے بند کے یہ دو چار شعر دنیا کی حالت کا آئینہ ہیں ؎

ہائے جہانِ گذراں کچھ نہیں　　غیرِ خداوندِ جہاں کچھ نہیں
وادیِ امکاں میں عبث دوڑ دھو　　ماحصلِ ریگِ رواں کچھ نہیں
کھانہ طلسماتِ فلک کا فریب　　گنبدِ نیرنگ ہے یاں کچھ نہیں
عالمِ مشہود نہیں کوئی شے　　آئی صدا غیب سے ہاں کچھ نہیں

اُن کے بعض حصۂ کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بڑے واقف کار شخص تھے - انگریزی الفاظ بہت برجستہ استعمال کرتے تھے اور غیر زبان کے الفاظ ہونے کے باوصف اس طرح باندھتے تھے کہ بھدّے نظر نہ آئیں - میرٹھ کے ایک سکول میں کوئی جلسہ منعقد ہوا تھا - صاحب ضلع وغیرہ رونق افروز ہوئے تھے - وہاں اُنھوں نے ایک نظم پڑھی تھی جسمیں انگریزی الفاظ کی کھپت قابل دید ہے ؎

لال کرتی کا سپاہی ہے گلاب　　کالی پلٹن کا ہے سنبل سولجر
جھانکتی ہے صورتِ نرگس خوشی　　کہتی ہیں کلیاں چٹک کر کم ہیر
کرتے ہیں پتے مسرت کے چیرز　　دیتے ہیں طائر خوشی کا لیکچر
لیتی ہے بلبل کنارِ شوق میں　　کہتے ہیں ہنس ہنس کے گل مائی ڈیر

مسٹر محمود کی تعریف میں ایک جگہ لکھتے ہیں ؎

در روے آں شیوا بیاں لرزد ایڈیسن را زباں　　پیچیدہ لکنت در دہاں لب زیرِ دنداں آمدہ
تادر ادب بکشادہ لب زی در گہش بکشادہ لب　　سحبانِ اقصاے عرب ہومر زیوناں آمدہ

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انھیں مختلف ممالک کے قدیم وجدید علوم تاریخ و ادب پر کافی دسترس حاصل تھی ورنہ ہمارے بزرگ جن کی تعلیم پرانے طرز پر ہوئی ہو اُن کے لیے ایڈیسن اور ہومر سے روشناس ہونا کچھ کم حیرتناک بات نہیں -

معلوم ہوتا ہے سید بیانؔ کو سہرا لکھنے کا شوق تھا - ذوقؔ و غالبؔ والی طرح پر کم وبیش تین چار سہرے لکھے ہیں اور دوسری زمینوں پر بھی طبع آزمائی کی ہے - ہم انکے منتخب اشعار نیچے لکھتے ہیں اور ان کے متعلق

اپنی رائے محفوظ رکھتے ہیں ؎

بنا ہے کعبۂ ابرو کا طاق چھو چھو کر　　نقاب نور حرم کی حریم کا سہرا
گلوں کو جان کے مہمان سر فراز کیا　　گواہ ہے ترے خُلقِ عظیم کا سہرا
لگی جو غنچۂ گُل کو چراغِ حُسن کی لَو　　تو بنگیا ید بیضا کلیم کا سہرا
پھول جھڑتے ہیں ترے خندۂ پیشانی سے　　ہے نباتاً حسناً حسنِ حسیں کا سہرا
پھول چوٹی کا وہی ہے جو میسر ٹھہرے　　کیوں نہ پھر ناز کرے چڑھکے ترے سر سہرا
دام ہمرنگ زمیں بود گرفتا رشدیم　　رُخ پر نور ہے کندن تو ہے پُر زر سہرا
لپٹی ہیں تارِ نظر پر جو چچا کی نظریں　　بنگیا روشنیِ صبح مکرّر سہرا
بوسے دیتا ہے جبیں پر کبھی رُخساروں پر　　زانکہ منظور نظر داشتہ ایں ہر سہ را
گرمیِ حسن سے ٹپکے جو عرق کے موتی　　بنگئے رُخ کی شعاعوں میں اُلجھکر سہرا

اشعار کو تضمین کرنے میں بھی بیاؔن کو امتیاز حاصل تھا۔ ناسخ کے مشہور و معروف مطلع سرِ دیوان پر کس برجستگی اور چُستی سے مصرعے لگائے ہیں کہ دل سے بیساختہ مرحبا نکلتی ہے ؎

مرا دیدہ ہے منبع آدمِ ثانی کے طوفاں کا　　مرا پہلو ہے مشہد کشتۂ امید وارماں کا
مرا حلقوم ہے مغرب ہلالِ تیغ بُرّاں کا　　مرا سینہ ہے مشرق آفتابِ داغِ ہجراں کا
طلوعِ صبحِ محشر چاک ہے میرے گریباں کا

ایسے ہی وزیر کے ایک شعر کو تضمین کیا ہے اور خوب کیا ہے ؎

حُسن و قبحِ روئے زیبا کھُل گیا　　شرح کے خط سے معمّا کھُل گیا
مو بمو مضمون سارا کھُل گیا　　عاقبت بنیوں پہ نکتا کھُل گیا
حُسنِ عارض عارضی تھا کھُل گیا
خط کے آتے ہی لفافا کھُل گیا

رعایتِ لفظی و معنوی کے اعتبار سے ناسخ کے شعر والی تضمین بالکل اچھوتی ہے۔ اس شعر پر اور لوگوں نے بھی مصرعے لگائے ہیں مگر کوئی بھی اسکی خوبی کو نہیں پہنچتے۔

تاریخی مادّے بھی بہت بامعنی اور برجستہ کہتے تھے۔ کسی عزیز کے یہاں لڑکا پیدا ہونے کی تاریخ کہی ہے ؎

ہوا احسانِ عظیم احدی سے لڑکا　　گُلِ رخ دیکھکے جس کا دلِ بلبل پھڑکا
رُخ فرزند سے ہے حق کی تجلی پیدا　　طور کا شعلۂ خاموش دوبارا بھڑکا
جوشِ عشرت کا ہوا نوبتِ اقبال بجی　　چرخ پر سے خوشی و عیش کا بادل کڑکا
زینتِ تاجِ سعادت ہے یہ تابندہ گہر　　فکرِ تاریخ میں یوں طبع کا توسن بھڑکا
دیکھ کر روے ولا ہاتفِ غیبی نے کہا
زیب کیا دیتا ہے ماں باپ کو موتی لڑکا
۱۳۱۵ھ

اپنے والد کے انتقال کی تاریخ کہی ہے ع گوہر افتاد ز تاجِ آفاق۔ ۱۳۱۰ھ

رباعیاتِ بیاؔن بھی قابل قدر چیزیں ہیں۔ بطور نمونہ دو ایک درج کی جاتی ہیں ؎

کیا نور ہے کیا نور ہے کیا نور ہے تو　　باطن سے عیاں بصر سے مستور ہے تو
عرشِ صمدی کجا۔ کجا حبلِ ورید　　کتنا نزدیک کس قدر دور ہے تو

حضرت کو طبیبِ دردِ امت پایا　　کیا نسخۂ تبصرہ یہ قیامت پایا
رحمت کا زلال اور شفاعت کی تنکر　　بیمار نے کس مزے کا شربت پایا

اکثر رباعیوں میں فخریہ مضمون باندھا ہے ؎

پروردۂ خلّاقِ جہاں ہے یہ فقیر　　سُن اسکی صدا کہ خوش بیاں ہے یہ فقیر
خلّاق نے بھرا ہے کوٹ کر مغزِ سخن　　ہر چند کہ مُشتِ استخواں ہے یہ فقیر

فیضِ سخن آفریں ہے دمساز مرا　　کیوں روحِ قدس نہو ہم آواز مرا
بیٹھے رہیں بس چرخِ چہارم پہ مسیح　　دکھلائے سخن زمیں پہ اعجاز مرا

پہیلیاں بھی کہتے تھے مثلاً یہ انگشتری کی پہیلی ہے :-

ہت ترے سر پر تھپر یٹ میں اُنگلی

غرض کہ ہر فن میں کمال رکھتے تھے۔ اُردو میں نثر بھی خوب لکھتے تھے لیکن اُنکی نثر بعض اوقات مقفّٰی ہونے سے تشنۂ لب کی لطافت سے عاری ہوتی تھی۔ با اینہمہ اکثر جگھوں پر بیساختہ لکھے گئے ہیں اور مقفّٰی ہونے کے باوجود اُس میں کوئی سُستی یا اور عیب نہیں پیدا ہونے پایا۔ ایک

جگہ دفتر وجود کے عنوان سے لکھتے ہیں :-

دفتر وجود ایک سپید و سیاہ کتاب ہے۔ آسمان وزمین کے پٹھے لگے ہوئے ہیں۔
منقش جلد بندھی ہے۔ بحر محیط کا دائرہ اُسکی لاجوردی جدول شمار کی گئی ہے۔
کرہ بسیط کا احاطہ اُسکا گنجان حاشیہ قیاس کیا گیا ہے۔ ایام ولیالی یعنی
دن اور رات اُسکے کالے اُجلے ورق ہیں۔ ذرّوں نے ورق پر رُپہلی افشاں
چُنی ہے۔ ستاروں نے سُنہرے نقطے لگائے ہیں۔ مہتاب نے جلد پر چاندی
کا کام کیا ہے۔ دھوپ نے اوراق پہ سونا پھیرا ہے۔ نشو نباتی کی رنگ
آمیزیاں صفحات کتاب کے مینائی نقش و نگار ہیں۔ لالہ و گل کا ظہور، سرو
سنبل کی نمود حواشی کی پھول پتیاں ؂

دلچسپ مرقع سے ہر اک نقش ہے یاں کا   نقشہ کسی اُستاد نے کھینچا ہے جہاں کا

نثر آزاد کی رنگینی اور نثر غالب کی لطافت کو یہ نثر نہیں پہنچ سکتی لیکن اس سے
اتنا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اگر سید بیانؔ کو اُردو میں "پنج رقعہ" لکھنے کی بہت
سپرد کیجاتی تو وہ اسے کس عمدہ اسلوب سے پورا کرتے۔

سندلینہ کی چمن سیر کے عنوان سے انکا ایک نثر مضمون اُس طرز تحریر کا
نمونہ ہے جو کسی زمانہ میں اُردو اہل قلم کا نصب العین تھا۔ اس قسم کی تحریریں
اب بھی ناولوں میں نظر آجاتی ہیں لیکن تبدیل مذاق کے ساتھ اب انکے
قدرداں یہاں رہے نہیں :-

قامت کی شوخیاں رو میں، قیامت کے فتنے جلو میں، پتی ہلتی تو ٹھٹک جاتی، پرچھائیں
پڑتی تو جھجک جاتی، نرگس آنکھیں بچھا کر منتیں کرتی تو سمندِ ناز سے نیچے اُترتی،
شوخی کا سُرنگ تراپے بھرتا تو آنچل سبزہ پر اٹھکیلیاں کرتا۔ پوشاک کی کلیاں
لہک، جاتیں۔ گل سے پیرہن کی لپٹ جاتی تو نکہتِ گُل دوڑ کر لپٹ جاتی۔

حضرت بیانؔ کے احسانات جو اُردو زبان پر ہیں یہیں ختم نہیں ہو جاتے
بلکہ اُنکا قلم ہر طریقہ سے اُردو علم ادب کی خدمت کرتا رہا ہے۔ ایک عرصہ تک
"جلوہ طور" اُن کے مفید مطلب مضامین سے مزین ہوتا رہا ہے۔ "طوطی ہند"
کا نام اُنھیں کی بدولت آج تک چل رہا ہے۔ وہ مدت تک اُسکے باقاعدہ

ایڈیٹر تھے۔ اُسکے پہلے دو صفحے میرٹھ پنچ کے عنوان سے چھپتے تھے جسکے
ظریفانہ مضامین خود حضرت بیانؔ کی ظرافت پسند طبیعت سے نکلتے تھے
ایک عرصہ تک اودھ پنچ سے معرکہ آرائی رہی۔ اودھ پنچ کے بیسیوں نامہ نگار
اپنے پرچہ کی مدد کے لیے کمر بستہ میدان میں نکل آئے تھے مگر اس شیر نے تن
تنہا سب کا جواب دیا اور اپنا نام رکھ لیا۔

آخر میں اُنھوں نے اپنا ایک خاص رسالہ لسان الملک کے نام سے
جاری کیا جو بارہ برس تک نکلتا رہا۔ اس میں مضامین نظم و نثر مساوی
طور سے درج ہوتے تھے۔ انکی غزلیات اور انکے شاگردوں کے کلام کے
لیے بھی اسمیں گنجایش نکالی جاتی تھی۔ لسان الملک ۱۸۸۶ء میں جب
جاری ہوا تھا شاید اُسوقت تک نظم و نثر کا مشترکہ مذاق پیدا کرنیوالا کوئی
پرچہ نہ نکلا تھا۔ علمی مضامین کے علاوہ ادبی مسائل پر بھی زوردار تحریریں
ہوتی تھیں۔ مولنا حالی کی مثنوی حقوق اولاد پر ایک اعتراضی مضمون
نظم حضرت بیانؔ نے اسی پرچہ میں مسلسل چھپوایا تھا۔

لسان الملک میں ایک عرصہ تک حل المطالب کے نام سے ایک سلسلہ مضامین
نکلتا رہا ہے۔ یہ حضرت بیانؔ کی شرح دیوان غالب ہے۔ غالباً یہ شرح کتابی
صورت میں آج تک شایع نہیں ہوئی ورنہ ادب اردو میں ایک قابل قدر
اضافہ ہوتا۔ نمونہ کے طور پر ایک شعر کی شرح درج کیجاتی ہے جس سے بیانؔ
کی نکتہ رسی اور سخن فہمی کا بھی ایک حد تک اندازہ ہو جائیگا :-

شعر غالبؔ :- سبزۂ خط سے ترا کاکُلِ سرکش نہ دبا
یہ زمرد بھی حریفِ دمِ افعی نہ ہوا

لغات :- سبزہ - روئیدگی، خط - مسیں، محاسن، کاکُل - سر کے اوپر کے بال
لیکن استعمال زلف و گیسو وغیرہ سب پر ہوتا ہے - زمرد - پنّا، ایک ہرے رنگ
کا جواہر ہے - حریف - مد مقابل، دَم - سانس، افعی - سانپ

معنی :- مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ جب تک معشوق کے سبزۂ خط نہ آیا تھا کاکُل
افعی کی طرح بل کی لیتا رہا، اور عاشقوں کو زہریلی اداؤں سے ایذائیں دیتا رہا۔ مگر

کے اثر سے سانپ اندھا ہو جاتا ہی اور اُسکی نیش زنی کی طاقت بالکل جاتی رہتی ہے اسکی کیا وجہ کہ خط زمردی پیدا ہوا اور زلف کی ایذارسانی کا وہی عالم رہا۔ شاید یہ وہ افعی ہے جس پر زمرد کا اثر نہیں چلتا۔ مراد یہ ہے کہ خط کے آنے سے سُلطان حُسن کی سپاہ کمزور ہو جاتی ہے۔ ہمارے معشوق کا بڑھا ہوا حُسن خط کے آنے سے بھی نہیں گھٹتا۔ ظاہر ہے کہ صاف چہرے پر زلف کی اداؤں میں کمی نہیں آتی۔ حاصل ؎

یہ آدمی ہے کہ برسوں جمال رہتا ہے وگرنہ ماہ کو اک شب کمال رہتا ہے

شرح معانی و مطالب کا اسلوب عموماً عام فہم ہی۔ لیکن اس شعر کے حل میں مارکو نیش زن کہا گیا ہی اسکی صحت میں ہمیں کلام ہی۔ مختصر یہ ہی کہ سید بیان ایک جامع کمال شخص تھے۔ اُنکی ادبی حیثیت ناظم و ناثر ہونے کے اعتبار سے یکساں ممتاز و مستند ہونی چاہیے اور ہی۔ افسوس کہ اُنکی عمر نے وفا نہ کی ورنہ اُردو ادب کی بہت سی خوشگوار اُمیدیں اُنسے پوری ہوتیں۔ ایسے ذی ہُنر مشاہیر کی موت کی تلافی اگر کوئی چیز اس عالم میں کر سکتی ہی تو وہ اُنکے بیش قیمت کارنامے ہیں۔ سید بیان آج دنیا میں موجود نہیں لیکن اُنکے کارنامے اور اُنکی علمی خدماتِ ادب ہمیشہ اُنکے نام کو صفحۂ تاریخ پر روشن رکھینگی۔ اُنھوں نے خود ہی کہا ہی ؎

نفس گُم اور سخن باقی رہیگا نہو گا تار اور ہوں گے ترانے

تنقید کتب

روزنامچۂ سیاحت اس نام سے، حال میں، آنریبل خواجہ غلام الثقلین صاحب بی اے، ایل ایل بی، کا سفرنامہ شایع ہوا ہی۔ خواجہ صاحب مئی ۱۹۱۱ء کے وسط میں ایک طویل سیاحت کی غرض سے گھر سے نکلے اور عراق، حجاز اور عجم وغیرہ کے مختلف اقطاع کا دورہ کرکے اُسی سال دسمبر میں واپس تشریف لائے۔ ہندوستان کے مسلمانوں میں اسوقت کئی بزرگ ایسے موجود ہیں جو ان مقامات کی سیاحی کر چکے ہیں اور اُنکی روداد سیاحت قلم بند ہو کر شائع ہو چکی ہی، مولنا شبلی، منشی محبوب عالم، منشی عبدالقادر، اور خدا غریق رحمت کرے عبدالرحمن امرت سری مرحوم، اِن سبھوں کے سفرنامے اُردو لٹریچر میں نمایاں درجہ رکھتے ہیں۔ لیکن خواجہ صاحب کا روزنامچۂ سیاحت کئی خصوصیات میں ان سب سے الگ ہی۔ مثلاً یہ کہ اُنھوں نے واقعات سفر کو تاریخ وار قلم بند کیا ہی۔ عمارات و قابل دید اور تاریخی مقامات کے تذکرہ کے عوض خواجہ صاحب نے وہاں کے باشندوں کی اخلاقی، معاشرتی اور تمدنی حالات پر روشنی ڈالی ہی۔ ایک اہم خصوصیت روزنامچۂ سیاحت کی یہ ہی کہ اس میں ایران کی موجودہ کیفیت پر زبردست اور نتیجہ خیز معلومات موجود ہی اور یہ بات کسی اور سفرنامہ میں اس وجہ سے نہیں پائی جاتی کہ اس سے پیشتر کسی سیاح نے سرزمین ایران کی سیر نہیں کی اور اگر کسی نے کی بھی تو خواجہ صاحب کے سے انہماک و دلچسپی کے ساتھ نہیں کی۔ بلکہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ خواجہ صاحب کی اصلی غرض سفر ہی یہی تھی کہ ایران کے چشم دید حالات سے مطلع ہو کر، بشرط ممکن، اُن خرابیوں کی اصلاح کے وسائل عمل میں لائے جائیں جن کی بدولت وہاں کی حالت ناگفتہ بہ ہو رہی ہی۔ سفرنامے کے صفحات اس بات کے ثبوت میں پیش کیے جا سکتے ہیں کہ ہندوستان کے اس اُولوالعزم سپوت نے ایران کے فلاح و بہبود کے لیے اُسی دردِ دل، اُسی جوش، اور اسی نیک نیتی کے ساتھ اپنے دل و دماغ کو وقف کر رکھا تھا، گویا علیگڈھ میں "صیغہ اصلاح تمدن" کا کام کر رہے ہیں۔ سب سے زیادہ رُجحان خواجہ صاحب کا ایرانیوں کی اخلاقی حالت کے سنوارنے کی طرف تھا۔ اسکے لیے اُن سے جو کچھ ہو سکا، کیا۔ اُمرائے سے ملے، مجتہدوں سے ملاقات کی، پبلک میں لیکچر دیے، مضامین لکھے، اہل الرائے طبقہ والوں سے مباحثہ کیا، آپس کے اتفاق و اتحاد کی ترغیب دی، اور دوسری ضروری اصلاحات کی طرف توجہ دلائی۔ خواجہ صاحب کا یہ انہماک اس درجہ تھا کہ قسطنطنیہ میں بھی اُنھیں ایران کی دُھن لگی تھی۔ یعنی زادہ

سے، جو ایران کے فرقہ ڈماکراٹ کا رہنما اور قسطنطنیہ میں مقیم ہے، کئی ملاقاتیں ہوئیں۔ ایران کے حالات کے متعلق تبادلۂ خیالات ہوا مختصر یہ ہے کہ نجف اشرف، کربلائے معلی، کاظمین شریف، بغداد، طہران قسطنطنیہ، اور دیگر مقامات میں خواجہ صاحب کو اُن لوگوں سے ملنا پڑا جنکا مذہبی یا سیاسی پہلو سے معتدبہ اثر ایران کی پالیٹکس اور معاشرت پر پڑتا تھا۔ لیکن افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ انکا نتیجہ خاطر خواہ نہیں نکلا۔ اسکا الزام خواجہ صاحب پر نہیں بلکہ اُن غیر مآل اندیش جماعتوں پر ہے جن کی افراتفری نے ملک کو تباہ و برباد کر رکھا ہے۔ عام طور پر عمارات وغیرہ کے تذکرے، روزنامچۂ سیاحت میں نہیں ہیں لیکن بعض مقامات پر یہ التزام قائم نہیں رہا۔ مثلاً قسطنطنیہ کی بعض مساجد اور عمارات اور نیز اکثر مناظر کے حالات نہایت دلچسپی سے قلم بند کیے گئے ہیں سب سے بڑی خوبی عبارت کا اختصار ہے جسکی وجہ سے غیر دلچسپ و غیر ضروری باتیں دخل نہیں پاسکیں۔

انصافاً کہنا پڑتا ہے کہ واقعات کے ساتھ خواجہ صاحب نے اپنی ذاتی آراء کے اظہار میں کمال احتیاط و دانشمندی سے کام لیا ہے۔ یوں بھی خواجہ صاحب نہایت اعتدال پسند واقع ہوے ہیں۔ مخالفت و موافقت میں، انکی جانب سے کبھی افراط و تفریط دیکھنے میں نہیں آئی۔ شیعہ کانفرنس کے واقعات گویا اسکا ثبوت ہیں۔

جو لوگ بیرونجات کی سیاحت کا شوق رکھتے ہوں اُنکے لیے اس کتاب میں کثیر التعداد مفید معلومات موجود ہیں۔

اس کتاب کے متعلق خواجہ صاحب سے ایک شکایت ضرور ہے کہ اسکی اشاعت میں کافی اہتمام نہیں کیا گیا۔ لکھائی، چھپائی، کاغذ، یہ تینوں چیزیں جیسی کہ چاہیے نہیں ہیں۔ "مقامی مطابع کی بے ترتیبی" کا عذر اس حالت میں قابل لحاظ نہیں ہو سکتا کہ باہر کے پریس والے اچھے سے اچھا کام کرنے کے لیے موجود ہیں۔ تاہم، پانسو صفحات کا یہ سفرنامہ، جس کا مطالعہ دلچسپی کا رآمد ثابت ہو سکتا ہے اور جس کے دیکھنے سے ہر شخص کچھ نہ کچھ حاصل کر سکتا ہے، عہ میں بہت ارزاں ہے اور منشی تراب علی صاحب، محرر آنریبل خواجہ غلام الثقلین صاحب وکیل ہائیکورٹ میرٹھ یا دفتر رسالۂ العصر لکھنؤ سے دستیاب ہو سکتا ہے

کُلیاتِ عنبر | اس نام کا کلیات، جسکی لکھائی چھپائی اور کاغذ وغیرہ سب قابل توصیف ہیں، گورکھپور سے شائع ہوا ہے جسکے مصنف منشی سنت لال صاحب عنبر، وکیل و رئیس گورکھپور ہیں۔ شروع میں چند مشاہیر کے قلم سے دو چار تقریظیں شامل کی گئی ہیں جنکے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عنبر خاندانی شاعر ہیں۔ انکے والد حضرت معنی، بقول علامۂ احسان اللہ عباسی اُستادِ وقت شمار کیے جاتے تھے۔ گویا ذوق سخن جناب عنبر کو وراثتہً ملا ہے، اور کلیات کے سرسری مطالعہ کے بعد اُنکی پُرگوئی کا اعتراف کرنا پڑتا ہے

منشی سنت لال اُس زمانہ شناس کمیونٹی سے تعلق رکھتے ہیں جسمیں ضروریات کے وقت سانچے میں ڈھل جانیکا عجیب و غریب فطری ملکہ پایا جاتا ہے۔ اس جگہ مراد کایستھوں سے ہے۔ اس قوم کے افراد نے اسلامی ادبیات سے جس قدر فائدہ اُٹھایا اُسکی نظیر کسی اور جماعت میں ملنا محال ہے۔ فارسی میں جو دست رس انھوں نے بہم پہنچائی تھی وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ اُنکی تصانیف و تالیفات قدیم نصاب تعلیم کا جزو بنی ہوئی ہیں۔ یہ کسی حد تک قابل مسرت امر ہے کہ حضرت عنبر نے اپنے بزرگوں کا مسلک ترک نہیں کیا بلکہ فارسی کے ساتھ اپنا شغف قائم رکھنے کے باوجود اُردو کو بھی نہیں چھوڑا۔ چنانچہ اُنکے کلیات میں فارسی اور اُردو دونوں زبانوں کی چیزیں موجود ہیں۔

جناب عنبر بظاہر اصول شاعری سے ناواقف نہیں نظر آتے۔ اگرچہ بعض فروگذاشتیں اُنکے کلام میں ایسی ضرور پائی جاتی ہیں جو اس زمانہ میں بہرصورت قابل گرفت ہو سکتی ہیں لیکن ان پر زور دینا

انصافاً ٹھیک نہیں ہو سکتا کیونکہ عنبر اس زمانہ کے شاعر نہیں ہیں۔

کلیات عنبر مختلف اقسام کی نظموں سے بھرا ہوا ہی۔ قصیدہ، غزل، مثنوی، مسدس، مخمس، اخلاقی نظمیں، نوحے، سہرے، تہنیت نامے اور اسی قبیل کی اور بہت سی چیزیں موجود ہیں، جن سے مصنف کی ہمہ گیر طبیعت کا پتہ چلتا ہی۔ ہز آنر لفٹنٹ گورنر صوبجات متحدہ کے ورود گورکھپور کے متعلق جو مسدس لکھا گیا ہی وہ غایت درجہ دلچسپ ہی۔ حضرت عنبر نے نہ صرف اُن تمام انتظامات کا ذکر نہایت خوش اسلوبی سے کیا ہی جو اُس موقع پر ہوے تھے بلکہ سارے واقعات بے کم و کاست اس عمدگی سے نظم کیے ہیں کہ باید و شاید۔ دربار کے موقع پر حضور لفٹنٹ گورنر بہادر نے اپنی زبان فیض ترجمان سے جو تقریر فرمائی تھی اُسکا ترجمہ نظم میں نہایت خوبی سے کیا گیا ہی۔ اسی طرح اور بہت سی نظمیں خاص خاص تقریبات اور سوشل مجمعوں سے متعلق ہیں اور اکثر اچھی ہیں۔ ہندو یونیورسٹی کے بارے میں جو ہمدردانہ خیالات ظاہر کیے ہیں اُنکا نمونہ یہ ہی

مبارک اہل گورکھپور کو ہو آج یہ منظر مبارک آپ کو یہ نظم جوانی حضرت عنبر
خدا سے یہ دعا ہی اسکا چرچا ہو یہاں گھر گھر برائے اکتساب علم دیویں لوگ سیم و زر

رہے دارالعلوم اب یادگار ہند دانی باقی
رہے جب تک فلک باقی نظام دو جہاں باقی

آخر میں "مخمس کریا" شامل ہی جو حضرت عنبر کے بڑے بھائی منشی دمان پرشاد صاحب کی تصنیف سے ہی اور اسکا جوڑ کلیات کے ساتھ صرف اس وجہ سے موزوں کہا جا سکتا ہی کہ دو بھائیوں کے نتائج افکار پر ناظرین کو غور کرنے کا پہلو بہ پہلو موقع مل سکتا ہی۔

اس کتاب کے آغاز میں منشی عنبر صاحب کی ہاف ٹون تصویر باعث زینت ہی۔ مصنف نے اپنی تصنیف کو دیدہ زیب بنانے کے لیے عمدہ طور پر مجلد بھی کرایا ہی۔ مجلد کی قیمت عہ ؍ اور غیر مجلد کی عہ ؍ کسی طرح زیادہ نہیں حضرت عنبر سے گورکھپور کے پتہ سے طلب کرنا چاہیے۔

خون شہادت کے دو قطرے دو جزکے ایک مختصر رسالہ میں، کارکنان نظام المشائخ دہلی نے منصور و سرمد کے پرجوش مگر صحیح او مستند حالات "شائع" کیے ہیں۔ جس طرح مضمون کتاب دو نامور عاشقان الٰہی میں مشترک ہی اسی طرح امتیاز تالیف میں بھی دو بزرگ شریک ہیں، یعنی حضرت منصور کے حالات مُلّا محمد الواحدی نے اور جناب سرمد کے سوانح مولٰنا ابو الکلام آزاد نے قلمبند فرمائے ہیں اور دونوں اپنی اپنی جگہ دلچسپ ہیں، خاص کر آزاد کا انداز تحریر، جس میں جوش اور اصلیت کا کچھ اور ہی عالم پایا جاتا ہی۔ کتاب دلچسپی سے خالی نہیں۔ اگرچہ بعض حالات نامکمل اور تحقیقات تشنہ ہیں۔ لیکن اسکے لیے قابل مولفین میں سے کوئی بھی قابل گرفت نہیں بلکہ اسکے برخلاف انصاف سے کہنا پڑتا ہی کہ ان ہمت والوں نے ادھر اُدھر سے جو کچھ لاکر اکٹھا کر دیا ہی وہ بسا غنیمت ہی، ورنہ کسی ایک کتاب میں اسقدر حالات کا ملنا اب تک غیر ممکن تھا۔ قیمت اسکی مع محصول ڈاک ۳ ؍ مناسب ہی شائقین کو دفتر نظام المشائخ دہلی سے فرمایش کرنا چاہیے۔

شکوہ و فریاد مندرجہ عنوان نام سے کارپردازان رسالہ نظام المشائخ نے ڈاکٹر اقبال کی مشہور نظم "شکوہ" کو مختصر تقطیع کی کتابی صورت میں شایع کیا ہی اور اُسی کے ساتھ حضرت سیماب صدیقی الوارثی، اکبر آبادی کا ایک مسدس، موسومہ "فریاد" بھی شامل کر دیا ہی۔ "شکوہ" حضرت اقبال کی مقبول عام و مشہور انام کلام میں نمایاں درجہ رکھتا ہی اور اس سے پیشتر وہ اخباروں اور رسالوں میں نکل چکا ہی اسلیے اُسکے متعلق کچھ کہنا تحصیل حاصل سے زیادہ نہو گا۔ البتہ حضرت سیماب کے نتائج افکار تازہ چیز ہیں۔ "شکوہ" و "فریاد" کا مابہ الامتیاز ایک تو یہی ہے کہ "شکوہ" جہاں اس مصرعہ کی تفسیر کا کام دیتا ہی ع شکوہ اللہ سے خاکم بدہن ہی مجکو، وہاں "فریاد" دربار رسالت میں کی گئی ہی جسکا انداز اور لب و لہجہ کہہ رہا ہی کہ اُس جوش سے مستفید ہو کر اظہار خیالات کیا گیا

ہی جو ایک زمانہ میں جنگ ترکی و اٹلی کے سبب مسلمانوں میں عام ہو رہا تھا مضامین کے اندر بھی اس لڑائی کا جابجا حوالہ دیا گیا ہی۔ دو ایک بند نمونہ کے طور پر درج کیے جاتے ہیں :-

باش اے کشمکشِ غم کہ مٹا جاتا ہوں — میں تری کاہشِ پیہم سے گھلا جاتا ہوں
تا درِ سیدِ لولاک لُٹا جاتا ہوں — لے کے دربارِ رسالت میں گلا جاتا ہوں

شنوا بھی نہ سُنے نا شنوا بھی نہ سُنے
میری فریاد کے لفظوں کو خدا بھی نہ سُنے

داد منظور نہیں قابلِ بیداد ہوں میں — خوگرِ درد ہوں منت کشِ جلاد ہوں میں
دوسروں کے لیے دلگیر ہوں ناشاد ہوں میں — اک بڑی ذات سے آمادہ فریاد ہوں میں

وہ جسے دردِ محبت کی دوا کہتے ہیں
ہاں خدا تو نہیں محبوبِ خدا کہتے ہیں

اکثر بند برجستہ و شگفتہ واقع ہوے ہیں۔ مضامین کے اعتبار سے بھی، درد، اور سوز و گداز کی مثالیں نایاب نہیں ہیں۔ کہیں کہیں طرزِ بیان حد درجہ موثر پایا جاتا ہی۔ ان تمام باتوں سے پتہ چلتا ہی کہ حضرتِ سیماب ایک مشاق شاعر ہیں جنھیں اپنے جذبات کے قلمبند کرنے پر قدرتِ تامہ حاصل ہی۔ اس مختصر رسالہ کی قیمت ۲/ علاوہ محصول ڈاک کھی گئی ہی اور ملنے کا پتہ دفتر نظام المشائخ دہلی ہے۔

تاریخ احسن | یہ کتاب جسکا دوسرا نام "معین الطلباء" ہی مولوی محمد عبد الحکیم صاحب سکنڈ مولوی ہائی انگلش سکول حاجی پور ضلع مظفر پور نے ترتیب دی ہی۔ اس میں اُن تمام اشخاص و مقامات کے حالات "تحقیق و تدقیق" سے ردیف وار قلمبند کیے گئے ہیں جنکا مجمل "تذکرہ تعلیم الاطفال" اور "انتخاب حبیب" میں آیا ہی۔ گویا "تاریخ احسن" ان دونوں کتابوں کے لیے ایک حد تک "شرح" کا کام دیتی ہی اور اس لحاظ سے اسکو مستقل کتاب کی حیثیت نہیں مل سکتی۔ تاہم حضرت مولف کی محنت شائقین کا معترف ہونا چاہیے، جنھوں نے طلباء کا کام بہت آسان کر دیا ہے۔ مناسب ہوتا کہ "یہ شرح" جداگانہ طور پر اشاعت پذیر ہونے کی جگہ اُنھیں کتابوں کے ساتھ شامل کر دیجاتی جن سے اسکا تعلق ہی۔ بہرکیف اس کی قیمت ۸/ ہی اور حضرت مولف سے مندرجۂ بالا پتہ پر مل سکے گی۔

دی پریکٹکل ٹرانسلیشن سیریز | اس سلسلہ کی دو کتابیں بغرض اظہار رائے موصول ہوئی ہیں۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہی اسمیں ترجمہ کرنے کے سہل اور آسان عملی طریقے بتائے گئے ہیں۔ اسکے مصنف مسٹر ایس ایم رضی، بی اے (علیگ) سابق صدر مدرس اسلامیہ ہائی سکول اٹاوہ، ہیں جنھوں نے کمال جان فشانی سے یہ سلسلہ مرتب فرمایا ہی۔ طلباء کے لیے یہ کتابیں غیر معمولی فائدہ کی چیز ہو سکتی ہیں بشرطیکہ اُنھیں تعلیمی کورس میں شریک کر دیا جائے۔ ان دونوں حصص میں مصنف نے ترجمہ کرنے کے اصول عملی طور پر نہایت عمدگی سے دکھائے ہیں۔ اگر کوئی طالب علم شروع سے آخر تک اُن تمام مشقوں کو از خود کرنے کی کوشش کرے، تو وہ آگے چلکر ایک کامیاب مترجم بن سکتا ہی۔ فن ترجمہ پر اسوقت تک کئی چھوٹی بڑی کتابیں اور رسالے نکل چکے ہیں اور شاید اپنی خوبیوں کے لحاظ سے مسٹر ایس ایم رضی کی کوشش سب سے زیادہ مشکور ہونے کی مستحق ہی۔ حصۂ اول کی قیمت ۸/ اور حصۂ دوم کی ۱۰/ ہی۔ نیجر صاحب منار بھارگو اسکول بکڈپو، امین آباد، لکھنؤ سے طلب کرنا چاہیے۔

بھرتری ہری شتک | بھرتری ہری جی ہندو کملاء میں عجیب خوبیوں کے بزرگ گزرے ہیں۔ بادشاہ ہونے کے علاوہ وہ ایک اعلیٰ درجہ کے پنڈت اور شاعر بھی تھے۔ فقیر منش وہ اسدرجہ کے تھے کہ آخر کار تختِ سلطنت چھوڑ کر دنیا سے تائب ہو گئے۔ انکی ایک کتاب سنسکرت زبان میں "بھرتری ہری شتک" کے نام سے بہت مشہور ہی جسمیں یوگ ور توحید کے مسائل پر صوفیانہ انداز میں روشنی ڈالی گئی ہی۔ اسی کا ترجمہ بابو گوری شنکرلال صاحب نے اُردو میں شایع کیا ہی جو سوقت ہمارے سامنے ہی۔ اسکا مطالعہ اخلاقی طور پر ہر شخص کیلیے بلا تفریق مذہب مفید ہوگا۔ ۱۰/ قیمت بہت زیادہ ہی۔ مترجم سے دفتر رسالہ "سادھو" دہلی کے پتہ سے منگوانا چاہیے

"القلم"

یک عشق وہزار بدگمانی

شام کے ساڑھے سات بجے ہین۔ لندن کے ایک متوسط طبقہ کا چھوٹا سا خوبصورت مکان ہو۔ صاحبہ خانہ مسز ایور سلائی اپنے شوہر کے انتظار سے تھک کر ٹیلیفون کے پاس جاتی اور گھنٹی بجاتی ہو (جواب آنے پر):-

مہربانی فرما کر نمبر ۱۲۹ سے البرن سے تار ملا دو (تار ملا دیا گیا)

مسز ایور سلائی:- "کون ہو؟ کیا کار بو اسٹیل کمپنی سے تار ملا ہو؟... اچھا!... کیا مسٹر ایور سلائی دفتر سے روانہ ہو چکے ہین! تو کہان گئے ہین؟ کیا کمپنی کے کسی کام پر؟ تو وہ رات تک واپس آسکین گے؟... آسکین گے؟ اچھا تو اُنھین آتے ہی فوراً مجھ سے تار کے ذریعے سے بات کرنے کو کہ دینا... کیا؟... اُفوہ! مین انکی بیوی مسز ایور سلائی ہون... شکریہ"

خاتون صاحبہ اب اپنے کمرہ مین واپس آئین اور آپ ہی آپ یون کہ رہی ہین:-

حقیقت مین بابی نے گزشتہ دو ایک ہفتون سے جو طرز عمل اختیار کر رکھا ہو وہ کسی بیوی کو پاگل بنا دینے کے لیے بالکل کافی ہو۔ مین سمجھتی ہون کاروبار بدستور چل رہا ہو اور بیچارہ غریب اسکو اور ترقی دینے مین سرتا پا منہمک ہو۔ مگر اس سے حاصل کیا؟ رات رات بھر اسی طرح انتظار مین گذر جاتی ہو۔ مین یا تو کھانا نہ کھا کر بھوکی بیٹھی رہتی ہون یا تنہا زہر مار کرنے پر بعض دفعہ مجبور ہو جاتی ہون۔ مجھے اس زندگی سے دیہات کی ایک جھونپڑی، سادہ غذا، اور افلاس و تنگدستی ہی زیادہ پسند ہو۔ جب وہ گھر واپس آتے ہین تو اسقدر تھکے ہوئے ہوتے ہین کہ اتنی بھی سکت نہین ہوتی جو "افسوس بڑی دیر ہو گئی پیاری" یا "ہان پیاری" سے کچھ زیادہ کہ سکین۔ آہ! افسوس!!...... لیکن مین کل ضرور ناشتہ پر ان کے سر ہو جاؤن گی کہ وہ کم از کم ایک مرتبہ تو جلد لوٹین۔ خواہ کچھ ہی آفت کیون نہ آسے مین ضرور اُن کو، ایک ہی بار جلد واپس آنے پر مجبور کرون گی۔

مین نے بیشک یہ وعدہ کیا ہو کہ ان کے ساتھ محبت اور انکی عزت اور اطاعت کرون گی لیکن مین نے ہرگز یہ عہد و پیمان نہین کیا کہ اس طرح تنہا بیٹھی ان کا انتظار کیا کرون گی۔ اِن نئی نئی پوشاکون کے پہننے کا فائدہ ہی کیا ہو جب کوئی اِن کا دیکھنے والا نہ ہو... اچھا! اب ایک تدبیر میرے ذہن مین آئی!... جمعہ کے روز چند احباب کی دعوت کرنی چاہیے۔ اِس بہانہ سے تو بابی کو جلد آنا پڑیگا۔ بابی تو رشک و محبت کا ایسا پتلا ہو کہ لبادہ اوڑھنے تک مین کسی اور کا میری مدد کرنا اُسے گوارا نہین ہوتا...

خیر تو مجھے اَب کس کس کو بُلانا چاہیئے؟ چند ہی لوگ کافی ہین۔ کھانے کے بعد تاش بھی ہو۔ اچھا تو کون کون ہوگا؟ ڈورا اسٹون... اور... اور... فرانک ولیس... لیکن ڈورا اسٹون کا نیا پتہ مین نے کہان رکھ دیا ہو؟ ابھی حال مین ڈورا نے مجھے اپنا نیا پتہ بھیجا تھا۔ مین سمجھتی ہون کہ مین نے... نہین... شاید وہ کہین پھینک دیا گیا۔ (ردی کی ٹوکری کی طرف جا کر) یا اللہ! یہ ٹوکری تو ہفتہ بھر سے خالی نہین کی گئی ہو۔ یہ چٹھیان تو کسی کام کی نہین۔ اسکو جواب دیدینا ہی بہتر ہو۔ (ردی کی ٹوکری کو فرش پر الٹ کر) اسمین تو ایسا کوئی کاغذ نہین نظر آتا (کاغذ کا ایک پُرزہ ہاتھ مین لیکر سخت حیرت کے ساتھ) یا الٰہی! یہ کیا تماشا ہو؟......

مجھ پر اعتماد کرو

میرے پیارے عزیز از جان بابی

ازل سے تمھاری محبت کرنے والی

ک

اَب ساری دُنیا مین بابی کو اسطرح لکھنے والا کون ہے؟ اِنکی مان تو وفات پا چکی ہین۔ انکی بوڑھی دایہ کا بھی انتقال ہو چکا۔ تحریر کسی عورت ہی

کی معلوم ہوتی ہی - اسکے سوا مرد تو اسطرح . . .

مجھ پر اعتماد کرو

میرے پیارے عزیز از جان بابی

ازل سے تمھاری محبت کرنے والی

ک

کیا ؟ . . . (اس کے ساتھ کا پرزہ ڈھونڈھنے لگتی ہے)

حقیقت مین یہ بہت اہم معاملہ ہی - مین کسی کے متعلق جاسوسی کرنے سے سخت نفرت کرتی ہون - میرے شوہر کی جاسوسی تو مجھے بالکل ہی پسند نہین - تاہم بیوی کے چند حقوق ہین - اہو ! یہ پرزہ نکل آیا !! . . .

ک . . . کیٹی سینگز ٹر -

مجھپر اعتماد کرو

میرے پیارے عزیز از جان بابی

ازل سے تمھاری محبت کرنے والی

خدایا ! کیٹی سینگز ٹر ! اس نے میرے شوہر کو اسطرح لکھا ہی - اس مہمل ذلیل اگر بہ نے ؟ آہ ! اب مجھے اسکی تہ دریافت کرنی چاہیئے - اِس شرمناک خط کے باقی حصّہ کو کسی طرح تلاش کر کے پیدا کرون گی . . . (ردی کاغذات مین تلاش کر کے خط کے باقی پرزے جمع کر لیتی ہی) . . . آہا !

"پیارے بابی" . . . اوہ !

ہفتہ کے روز سے مین تمھین سخت اضطراب کے ساتھ یاد کر رہی ہون غالباً تم مجھے روزانہ تماشہ مین لیجانیسے اُکتا گئے ہو - لیکن تمھین معلوم ہے کہ مین اس بارے مین . . . .

آہ ! اب مین آگے ایک لفظ بھی نہ پڑھونگی (اُٹھ کھڑی ہوتی ہی) آہ ! آہ ! ! آہ ! ! ! (کمرہ مین دیوانہ وار ٹہلنے لگتی ہے) -

اچھا تو یہ بات ہی ! اب وہ یہ کام کر رہے ہین - یہی وجہ ہی جو میرا شوہر ہان ہان ! میرا شوہر پچھلے دو ہفتون سے سخت مصروف ہی اور رات رات بھر اُسے فرصت نہین ملتی - اِس قطّامہ کے ساتھ سارے شہر مین یون وہ مارے مارے پھرتے ہین - بیشک کیٹی تو ضرور ایسا کرے گی لیکن بابی ! آہ ! بابی ! مجھے تم سے کبھی اس کی توقع نہ تھی . . . . . .

اب یہ سخت ناقابل برداشت ہی - مین کبھی اسکو گوارا نہین کر سکتی - نہین ہرگز نہین ! ایک لمحہ کے لیے بھی نہین ! اب مین اسکے متعلق ان سے کہنے سننے کا بھی انتظار نہ کرون گی - جب وہ ہر روز مجھے اس طرح دھوکا دیا کرتے ہین تو پھر بدرجہا بدتر افعال کے ارتکاب مین بھی انھین دریغ نہین ہو سکتا - جب وہ اس طرح کے خطوط میرے شوہر کو لکھتی ہی تو معلوم نہین وہ کیسے خط اس کو لکھتے ہون گے - یہ ذرا غور کرنے کی بات ہی - امان جان نے پہلے ہی کچھ اپنا شبہہ ظاہر کیا تھا - اب ان واقعات کو سنکر وہ کیا کہین گی ؟ -

"ازل سے تمھاری محبت کرنیوالی"

آہ ! یہ کسقدر شرمناک ہی - مین اب کبھی ان کے ساتھ نہ رہونگی - اب ہرگز مجھ سے ایک دن بھی یہان رہا نہ جائے گا - اب مین طلاق لے لون گی - بس اب طلاق ہونا چاہیئے -

ہان تو مجھے طلاق کے لیے کہان جانا چاہیئے ؟ کون وکیل کے پاس ؟ . . . کیا اچھا سا نام ہی ؟ . . . گیلی اور . . . ڈائرکٹری کہان ہی ؟ . . ہان گیلی اور پورٹر . . یہی نام ہی - پتہ . . . . . ۲۰۸۶۳ مے فیر . . . .

(ٹیلیفون کے پاس جاتی ہی) :-

"نمبر ۳ ۲۰۸۶ مے فیر سے تار ملادو"

مین مسٹر پورٹر سے گفتگو کرون گی - وہ بہت اچھا وکیل ہی - ابھی چند روز ہوے اس نے حیا ولسے کیا اچھا تصفیہ کرادیا (ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی ہی) -

ہان ! کیا مسٹر پورٹر ہین ؟ مجھے طلاق کی ضرورت ہی . . . کیا ؟ . . . مسٹر پورٹر نہین ہین ! تو پھر تم کون ہو ؟ . . . . بخافظ ! . . مسٹر پورٹر

کہاں گئے ہیں؟... باہر؟... اچھا! مسٹر گیلی کو بلاؤ.... وہ بھی باہر گئے ہیں!... یہ کیا مہملات ہیں؟ تمھارا فرض ہی کہ تم اپنے کاروبار پر بجا لاتے رہو۔ تمہارے دفتر میں ایسی سخت ضرورتوں کے وقت کسی نہ کسی کا موجود ہونا ازبس ضروری ہی!.... کیا؟.... دونوں گھر گئے ہیں! .... کیوں گئے؟.... دفتر بند ہو چکا!.... اچھا! تم جانتے ہو کہ آیا مسٹر پورٹر طلاق کے متعلق انتظام کر سکتے ہیں؟.... یہ مین صرف اسلیئے معلوم کرنا چاہتی ہوں کہ مین نے ایک نہایت ذلیل خط پایا ہی....

کیا؟.... نہیں! کوئی ضرورت نہیں! مسٹر گیلی کو اطلاع کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ مین صرف مسٹر پورٹر سے اسکا تصفیہ کرانا چاہتی ہوں۔ اُنھوں نے ایک مقدمہ مین میری مرضی کے مطابق کارروائی کی تھی۔ وہ بڑے قابل اعتماد شخص ہیں۔.... ہاں! تم مسٹر پورٹر کے مکان کے ٹیلیفون کا نمبر جانتے ہو؟ ۸۶، ویسٹ!... شکریہ!"

کیا مین اسکی جرأت کروں؟ طلاق کے معنی سخت بدنامی و رسوائی کے ہیں۔ تمام اخباروں میں ایک ایک بات شائع ہو گی۔ (خط کے پرزوں پر نگاہ پڑ جاتی ہی۔ انکو دوڑ کر پھر اُٹھاتی ہی۔ دیکھکر بڑے غصّے اور غیظ کے ساتھ پھینکدیتی ہی اور پھر ٹیلیفون کے پاس جاتی ہے)۔

"۸۶، ویسٹ سے تار ملا دو۔"

(تار ملا دیا گیا)

ہاں! کیا مسٹر پورٹر ہیں؟ آپ کو اس وقت تکلیف دینے کا مجھے نہایت سخت افسوس ہی لیکن ایک بہت وحشت ناک اور نہایت اہم واقعہ ہو گیا ہی۔ مین ردّی کاغذات کی ٹوکری مین کوئی کاغذ تلاش کر رہی تھی کہ مجھے اپنے شوہر کے نام کا ایک عاشقانہ خط ملا۔ آپ خود اس کا اندازہ فرما سکتے ہیں کہ اِس خط کا مجھپر کیا اثر ہوا ہو گا۔ خط مین نہایت دلی محبت کا اظہار کیا گیا ہی اور سب سے بڑھکر یہ کہ جس عورت نے وہ خط لکھا ہی اُس سے مین بخوبی واقف ہوں۔ وہ مجھسے کسی قدر کمسن ہی... جی!... مین کون ہوں!... افوہ! مجھے یہ پہلے ہی بتانا چاہیئے تھا۔ مین مسز ایورسلائی ہوں... مزاج شریف... بیشک آپ کو سخت تعجب ہو گا۔ خود مجھے بھی اس کے امکان کی توقع نہ تھی۔ بہرحال اَب مین طلاق چاہتی ہوں۔ مگر آپ اسمین حتی الامکان عجلت فرمایئے مین چاہتی ہوں کہ آپ تمام انتظام فرمائیں۔ اسکا زیادہ چرچا نہ ہونے دینا چاہیئے۔ اخباروں کو اسکی اطلاع.... اسمین شک نہین کہ یہ بہت سخت کارروائی ہی مگر مین کیا کر سکتی ہوں؟... آپ کو معاف کیا جائے! آپ کے ہاں احباب کی ضیافت ہی!.. اچھا! (سرد مہری سے) مجھے افسوس ہے کہ مین آپ کی مخل ہوئی لیکن آپ سمجھ سکتے ہین کہ معاملہ کس قدر اہم ہے... کیا؟۔ کل صبح آپ سے دفتر مین ملوں! بہت اچھا! مین گیارہ بجے آؤں گی۔ مین غم و غصّہ سے ازخود رفتہ ہوں۔ اسلیئے نہین کہ مجھے اس طرح دغا دی گئی بلکہ.... سنئے! کیا آپ سُن رہے.... یا الٰہی!...

ٹیلیفون کے پاس سے تو وہ چلدیئے۔ بد تمیز جانور! ہمدردی نام کو نہین۔ وہ سمجھتا ہی کہ میرا نقصان صرف ایک کتّے یا کسی کم قیمت زیور کے گم ہو جانے کے برابر ہے۔

اچھا! اَب مجھے کچھ کرنا چاہیئے۔ اکثر باتوں مین تو مین بالکل مجبور ہوں لیکن شکر ہی کہ جب کوئی بڑی مصیبت نازل ہوتی ہی تو مین اسکا مقابلہ کر سکتی ہوں۔ (لکھنے کی میز کے سامنے بیٹھ جاتی ہی)۔ اب اِس مبتذل کیٹی سینگر ٹر کو لکھتی ہوں کہ میرا اسکے متعلق کیا خیال ہے:۔

خاتون صاحبہ!

"میرے شوہر کے ساتھ تمھارے جو شرم ناک تعلقات قائم ہین اتفاقاً اُنکا تمھارے ایک حیا سوز خط کے ذریعے سے جو تم نے میرے شوہر کو لکھا ہی مجھپر انکشاف ہو گیا۔ مجھے یہ اچھی طرح معلوم ہی کہ تمھارے اِن افعال کی تشہیر سے تمھین کوئی ایسا نقصان نہین پہنچ سکتا مگر مین تمھین یہ اطلاع کر دیتی ہوں کہ مین نے اس کارروائی کو اپنے وکیل کے ہاتھ مین دیدیا ہی۔ اُمید ہی کہ اس طرح تمھاری

نیکنامی کی کسی قدر مزاج پرسی ہو جائیگی۔

راقمہ۔ فی لس ایو رسلائی

(غصّے کے ساتھ لفافہ بند کر رہی ہے۔ اتنے مین ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی ہے)

یقیناً بابی ہی غالباً کوئی عذر معذرت کرنے کی سوجھی ہوگی۔ اوہ!۔ شیطان سیرتی کی بھی حد ہوگئی! (ٹیلیفون مین" ہان! ہان!!... ہان! مین جانتی تھی کہ تم ہی ہوگے!... اوہو! تم نے اپنے تمام کام ختم کرلیے! اور اب تمھارا قصد ہے کہ دعوت مین جاؤ اور وہان سے تماشہ مین (طنز کے ساتھ) ہان! ہان!! ہان!!!.... کیا؟... تم چاہتے ہو کہ مین بھی تمھارے ساتھ چلون! نہین! مین کہ دیتی ہون کہ مین نہین چلون گی! مین نے تمھین پہچان لیا ہے۔ سب کچھ مجھے معلوم ہوچکا" (غصّے کے ساتھ ٹیلیفون کے پاس سے چلی جاتی ہے)۔

آہا پٹی سن! تم آگئین۔ ایلو یہ خط فوراً ڈاک خانہ مین ڈال آؤ۔ اسکے بعد میری ضرورت کی چند چیزین باندھ دو۔ مین بالفعل تو شب بسر کرنے کے لیے ہوٹل جاؤن گی۔ میرا لبادہ تو لادو... جلدی کرو!... (اس کی نگاہ تار کے لفافہ پر پڑتی ہے جو اسکے نام کا میز پر رکھا ہوا ہے)... یہ کب سے رکھا ہوا ہے؟ پٹی سن! تم نے مجھے یہ ابتک دیا کیون نہین؟ کتنی سُست چھوکری ہے! مگر ایک ایسے وقت مین اسکو برا بھلا کہنے سے کیا فائدہ! (کچھ سوچنے لگتی ہے اور تھوڑی دیر بعد کرسی پر گر پڑتی ہے اور کہتی ہے):-

بابی! بابی! تم نے میرا دل توڑ دیا (رونے لگتی ہے) اگر مجھے تم سے محبت نہ ہوتی، اگر مین تمھاری طرف ملتفت نہوتی، اگر مین نے کوئی بے توجہی کی ہوتی تو بیشک یہ برداشت بھی ہوسکتا۔ مگر ہائے! میری زندگی کے ہر دن کا ایک ایک لحظہ اور ہر ہفتہ کا ایک ایک دن بالکل تمھارے ہی دھیان مین گزرتا ہے۔ کیا اس کے بعد بھی اور میرے اسطرح تمھاری محبت و الفت کا بھروسہ کرنے اور تمھارے شوہر ہونے پر ناز کرنے اور تمھاری ذات پر فخر کرنے پر بھی... ایسا... ایسا نتیجہ نکلنا۔ میری محبت و اُلفت کو اس بیقدری کے ساتھ... اوہ! اگر مجھے یہ معلوم ہوتا.... ہائے!....

اس کی نگاہ پھر تار پر پڑتی ہے۔ وہ بمشکل اپنے تئین سنبھالتی ہے اور تار پڑھنے لگتی ہے... یہ تار آیا ہے... کس کے پاس سے؟... ہائین! اسکے کیا معنی؟... "ہماری شادی کی قرارداد ہوچکی ہمارے لیئے دعا کرو کیتھرائن سینگزٹر اور رابرٹ ولسن" یا الہ العالمین!... شادی کی قرارداد ہوچکی ہے۔ کیتھرائن سینگزٹر اور رابرٹ ولسن۔ رابرٹ ولسن؟ رابرٹ؟ رابرٹ؟ باب ولسن! بابی! یہی بات ہے! میرے پیارے عزیز از جان بابی" (دوڑ کر خط کے پرزے اُٹھا لاتی ہے) افوہ! بیشک یہی بات ہے! باب ولسن بیشک جمعہ کے روز یہان آیا تھا اور اسنے یہین چند چٹھیان بھی لکھی تھین۔ ایک چٹھی بھی چاک کرکے ڈال گیا تھا۔ وہی کیٹی سینگزٹر کا منگیتر بھی ہے۔ میرے بابی کا اسمین کوئی دخل نہین!.....

آہی! اب مین کیا کرون۔ مین کیا کر بیٹھی! (کرسی پر گر پڑتی ہے۔ پھر کھڑی ہو جاتی ہے) مین نے پوررٹر سے بھی طلاق کے متعلق گفتگو کی۔ میرے بابی سے بھی بات ہوئی۔ ہائے! اب وہ کیا خیال کرے گا؟ پورٹر کے پاس آج ہی بابی کی دعوت بھی ہے۔ دعوت مین جانے سے اسے روک لینا چاہیئے۔ ورنہ... (موٹر کی آواز آتی ہے۔ وہ دوڑ کر کھڑکی مین سے دیکھتی ہے)... بابی! ارے خود بابی ہے! اب مین کیا کرون؟... کیا کہون؟... پٹی سن!... (دروازہ پر گھنٹی بجتی ہے)... پٹی سن! گھنٹی کا جواب دو... الہی! اب مین کیا کرون؟... کیا کہون؟... مین... مین... مین یہ کہدونگی کہ کسی غلط نمبر سے تار ملا اور معلوم نہین وہ کون عورت تھی جسنے بات کی۔ مگر کسی طرح اب پورٹر سے جلد مگر بابی کی اس سے ملاقات ہونے کے قبل پورا واقعہ بیان کردینا چاہیئے.. مگر ہان! پٹی سن! کیا کیٹی سینگزٹر کے نام کا خط ڈاک مین ڈال دیا گیا؟ نہین! رحمت کے فرشتے! (خط لیکر جلدی سے چاک کر ڈالتی ہے)

(ترجمہ) سید خورشید علی

نظام الملک طوسی

علم تاریخ دُنیا کی تمام قومون مین رائج اور متداول ہی۔ بدقسمت ہی وہ قوم جو اپنے بزرگون کے یادگار کارنامون سے اور اُن کے حالات برگزیدہ سے ناواقف ہے۔ تاریخ کی تحصیل اور توسیع کے لیے وفور رغبت سے سیر و سفر کرتے رہے ہین اور عالم وجاہل زمانہ سلف مین اس کے برابر شائق پائے گئے ہین۔ اگر سطحی نظر سے دیکھیے تو تاریخ اسلاف کے گوناگون حالات و قرون ماضیہ کے رنگا رنگ واقعات کا مجموعہ ہی جسمین ہر طرح کی باتین ہر قسم کی مثالین، وحکایات، بیان کیجاتی ہین اور جب لوگ مجلس مین بیٹھتے ہین تو اس فن کے ذکر اذکار کو رغبت سے سُنتے ہین۔ تاریخ ہی سے معلوم ہوتا ہی کہ زمانہ کی حالت وقتاً فوقتاً کیونکر بدلتی رہی ہے، اور کسطرح اقوام مین مختلف سلطنتون کا آغاز اور اُنکا کمال ہوا، کیونکر وہ اول زمین پر پھیلین اور اُسے آباد کیا، اور زوال نے اُنکو صفحۂ ہستی سے حرف غلط کیطرح مٹا دیا۔ تاریخ حکمت کا سبق پڑہاتی ہی۔ کائنات اور اُسکے مبادی کی علتین بتاتی ہی۔ زمانہ کے واقعات اور اُنکے اسباب سے آگاہ کرتی ہے۔ فن وحکمت وفلسفہ علوم ثقہ اور غیر ثقہ و اساتذہ کے حالات اہل دنا اہل نسلون کے اخبار پر اس غرض سے روشنی ڈالتی ہی کہ قابل تقلید اُمور پر موجودہ اور آئندہ نسلین کاربند ہون اور قابل نفرت باتون سے آنیوالی نسلین پرہیز کرین اور نقادِ فن اُنکی روایات کو جانچ کر فیصلہ کرین کہ اساتذہ کی کونسی نقل و روایت انکار و ترک کے قابل ہے۔

آجکل کی کثرت ناول نویسی نے دو متضاد اثر ہندوستان کے مختلف طبقون پر ڈالے ہین:۔ اول کم علم اور حرف شناس نوجوانون کے اخلاق پر تو بُرے سے بُرا اثر ڈالا، دوسرے ذی علم ماہرین کے ایک زبردست ٹھوکر لگا کر اُردو زبان مین تاریخ کے پیدا کرنیکا ذوق پیدا کر دیا۔ یہ احسان ہی اور اول عیب۔ مگر ہمکو اپنے ہمدرد قوم مولوی عبدالرزاق صاحب کانپوری کا اسوقت بیحد شکریہ ادا کرکے اور اُنکی برسونکی محنت شاقہ اور وسیع کتب بینی کی داد دیکر اُنکی دوسری تصنیف سلسلۂ وزراے اسلام پر ایک نظر ڈالنا ہی، اور اپنے غیر مکمل اور کمزور خیالات کا اظہار کرنا ہی جو اگرچہ ناظرین کی تضیع اوقات کا باعث ہوگا مگر یقین ہی کہ مجھے معافی دیجائے گی۔

فاضل مؤلف نے یہ کتاب **نظام الملک طوسی** جس محنت سے لکھی ہی اُس سے قوم کو عموماً جو کچھ معلومات مین نفع پہنچے گا اُس سے تھوڑی دیر قطع نظر کرکے رؤسا اور والیان ملک کو اگر وہ عمل پیرا ہون تو سیاسی نفع بیحد پہنچ سکتا ہی اور عامہ کو تمدنی نفع فاضل مؤلف نے اس کتاب کو دو حصون پر تقسیم کیا ہی۔ اول حصہ دیباچہ کے بعد طوس کی مختصر تاریخ ہے اور ضروری فٹ نوٹ بھی دیئے گئے ہین، اور اُن شعرا اور بزرگان کا ذکر کیا ہی جو طوس کی شہرت عام اور بقاے دوام کا باعث ہوئے ہین مشاہیر طوس کی مختصر سی فہرست بھی دی ہی جسمین صوفیہ ائمہ، محدث، شعرا، وزرا، حکما کا ضروری تذکرہ کیا ہی۔ طوس کا موجودہ نام مشہد مقدس یا مشہد رضوی بتایا ہی اور یہ تقدس امام علی رضا علیہ السلام کی ذات پاک سے ہی۔ خواجہ حسنؒ کا نسب عباس طوسی تک پہنچتا ہی اور والدہ کی طرف سے عبدالحمید طوسی تک مفصل شجرۂ نسب بھی دیا ہی۔ خواجہ حسن کی ولادت ۴۰۸ھ بتلائی ہی اور وفات ۱۰ شوال ۴۸۵ھ اور پورے طور سے اُسکے اُستادونکی حالت بھی بتائی گئی ہی۔ خواجہ حسنؒ کی وزارت کی ابتدا، اور "نظام الملک" خطاب بہ عہد الپ ارسلان ہی۔ سب سے اہم اور ضروری شے جو دوسرے حصہ مین ہی اور جس مین خواجہ حسن کا ایسا مرقعہ دکھایا گیا ہی جو اُس مقدس کی صورت کا خط وخال دکھاتا ہی اور اصلی تصویر کا جلوہ آنکھون مین پھر جاتا ہی۔ خواجہ حسنؒ نظام الملک کا قانون سلطنت ہی جس کے مطالعہ سے ایک فرد واحد کی اعلیٰ قابلیت کا ثبوت ملتا ہی، جہان نہ

لیجسلیٹو کونسل کا پتہ ہو نہ عام آرا کی ہوا ہو- ایک دریا بہا یا گیا ہو، تجربات کا مجموعہ ہو، سیاست کا دستور العمل ہو، ملکی تمدن کا زبردست ضابطہ ہو جسمین گنجائش حرف زدن نہین ہو، ایک ایسی لازوال شے ہو جس کو کوئی شخص نہ لوٹ سکتا ہو نہ اسمین نقصان آسکتا ہو جو سلطنت یا ریاست اسپر عمل کرے یا اسکے مطابق قوانین مرتب کرکے سیاسی ضرورت کے موافق کاربند ہو تو کبھی سلطنت مین زوال یا وزارت پر الزام نہین آسکتا خواجہ کے ہم مکتب یا کلاس فیلو زغیاث الدین، ابو الفتح عمر خیام نیشاپوری، حسن بن صباح کی تصاویر دیگر اُن کے حالات بھی لکھے ہین مگر کوتاہ قلمی ضرور کی ہو- اگرچہ کتاب ہر حیثیت سے لاجواب ہو مگر صرف دقیق نظر سے کمی اسقدر ہو کہ قانون سلطنت کے بعد کتاب کے ضروری حالات نہین لکھے اور لکھے بھی تو بہت ہی مختصر لکھے ہین- الغرض ہر حیثیت سے کتاب اُردو تاریخ مین لاجواب ہو اور ایسے مصنف کی تصنیف ہو جسکی ابراکہ نے ولایت تک شہرت کردی ہو- اس کی لاجوابی کی حالت اس کے طرز بیان، وسیع معلومات اور بلند نظری سے قرار واقعی ظاہر ہوتی ہے- افسوس ہو کہ کتاب ایسے وقت شائع ہوئی ہو جب سلطنت ایران کے حصے بخرے ہوچکے ہین، اور یہ الزام نامی پریس پر ہے اور دیر سے شائع ہونیکا گناہ منشی محمد رحمت اللہ صاحب رعد کا حصہ ہے- اس وقت تک جس جس نے اس کتاب کا مطالعہ کیا ہے وہ دل سے دلدادہ ہے اور بہمہ صفت موصوف بیان کرتا ہے-

میری ذاتی رائے اس کی نسبت یہ ہے کہ تالیف اپنی آپ نظیر ہے- ہر کتب خانے مین اس کی ایک جلد ضرور ہونا چاہیئے- ایسے ملکی ریفارمرون کی تصنیف کی قدر نہ کرنا اُن کا حوصلہ پست کرنا ہے اور یہ سخت بدقسمتی ہمارے ملک کی ہوگی کہ اس کتاب کی دل سے قدر نہ کی جاے- رشید اعظم، اور آل سلجوق' بھی تیار ہین اور ولایت سے ٹائپ مین چھپوا نیکا مؤلف کا خیال ہے-

سیّد محمد علی

برجستہ جواب

کہتے ہین کہ لندن کے کسی قصبہ مین
ناگہ اک روز باپ کی چوری سے
جب بی بی کو ساتھ لیکے گھر مین آیا
پوچھا، یہ کون ؟ جمیس نے ہنس کے کہا
جھنجھلا کے کہا باپ نے، کیون نالائق ؟
اچھا، تو ابھی گھر سے نکل جا باہر
جب باپ نے گالیان سُنائین بیحد
بل ابرو پہ ڈال، نیلا پیلا ہوکر

اِک لڑکا تھا جمیس نام ہشیار و ذکی
اِک بھونڈی سی مس کے ساتھ شادی کرلی
سُسرے نے بہو کی شکل زیبا دیکھی
حضرت کی بہو ہے- اور میری بی بی
مجھ سے پوچھے بغیر شادی کرلی
ایسے خلفِ خلف کی ایسی تیسی،
بس حد نہ رہی جمیس کے بھی غصے کی
کہنے لگا، پہلے سُن لو اک بات مری

مجھکو نہ پوچھنے کا الزام دیا،
تم نے کب مجھ سے پوچھ کر شادی کی

احمد حسین امجد

حاصلِ عشق

کھل گیا حق جبکہ اُنسے شکوۂ باطل ہوا ۔۔۔ کیا کہون یہ مین کہ اس باطل سے کیا حاصل ہوا

قیس نے سمجھا کہ اب ہوتی ہی لیلی ہمکلام ۔۔۔ جب ذرا اونچا ہوا سے پردۂ محمل ہوا

دیکھنا میرا طرف بھی اے ادیب بزم عشق ۔۔۔ پھر نہ کہنا یہ کہ مین محفل مین کیون سائل ہوا

مرکے بھی پہنچا نہ اُن تک حیف اے آوارگی ۔۔۔ ہاے مین گم بھی ہوا تو بر سرِ منزل ہوا

تیغ قاتل کانپتی ہی کاٹکر رگہاے جان ۔۔۔ یہ تو اُلٹا رقص خنجر بر سرِ منزل ہوا

کس مین طاقت ہی کہ دیکھے کوئی تکوے نقاب ۔۔۔ یہ حجاب جسم بھی اچھا ہوا حائل ہوا

ذرہ ذرہ مین جمال دلربا تابندہ ہے ۔۔۔ حضرت موسیٰ نے کیا دیکھا کہان مائل ہوا

دل مرا بھی صرفِ سوز گرمی نظارہ ہی
اے شرارِ طور یہ تیرا ہی آتشپارہ ہی

ہر طرف اُس یار نے ہی آگ بھڑکائی ہوئی ۔۔۔ واہ کیا کہنا ہی اچھی محفل آرائی ہوئی

عشق حسن افزا نہان تھا حسن عشق انگیز مین ۔۔۔ کیا بھبھگی واعظو یہ اُنکی سلگائی ہوئی

چاک کر ڈالا ہی کیون دستِ جنون نے پیرہن ۔۔۔ یہ شکایت سچ ہی اس سے اُنکی رسوائی ہوئی

زاہد و اک سوز ہی ہر زیر و بم کے ساز مین ۔۔۔ یہ تو وہ سمجھے کہ جسنے چوٹ ہو کھائی ہوئی

شیخ پیری مین تو جسکے واسطے وارفتہ ہی ۔۔۔ مجھکو وہ صورت طفولیت سے ہی بھائی ہوئی

درد جو اُٹھا تھا پہلو مین وہی درمان بنا ۔۔۔ واہ کیسے ڈھب سے میری ہمت افزائی ہوئی

آنکھ کھلتے ہی کسی نے کر لیا دلکو شکار ۔۔۔ اک بلا تھی ہاے اُنکی زلف لہرائی ہوئی

حسرتِ خلد و جنان افسانۂ فرسودہ ہی
حاصلِ عشق و وفا اک ذوق دردآلودہ ہی

عاشق جانان میرِ الفتِ غلمان نہین ۔۔۔ بزم دل وہ کونسی ہی جسمین وہ مہمان نہین

چشم بینا ہو تو ہی حسن مقدس آشکار ۔۔۔ دیدہ جویا کو وہ جلوے کہین پنہان نہین

بحرِ بے پایان محیط قطرۂ شبنم ہوا ۔۔۔ آتشِ گل برقِ موسیٰ ہی گل خندان نہین

خرمن مستی کا حاصل ہی اک آہ سینہ سوز ۔۔۔ بے سبب شورِ فغان مین بلبل نالان نہین

عشق و الفت کیا ہین ؟ پروانہ سے پوچھا چاہیے ۔۔۔ شمع روتی ہی کہ حاصل مجکو یہ ارمان نہین

درد پنہان ہی صلاے لذتِ آلام عشق ۔۔۔ شیخ شاید واقفِ ذوقِ غمِ پنہان نہین

عاقلون کو ہی بیان پر بھی ہیولاے خلد ۔۔۔ رازِ جانان کھولدون لیکن مجھے شایان نہین

ہر دلِ اہلِ طلب واقف ہوا اس راز سے ۔۔۔ اے حمید اس شعر مین کیا شوکت جانان نہین

چون بہشتِ نقدِ من امروز حاصل میشود (حافظ)
وعدۂ فرداے واعظ را چرا باور کنم

حمید رکونکوی

ایک دوست کی وفات پر نوحہ

اے فداے یاس و حرمان اے شہید آرزو ۔۔۔ خاک کے دامن مین کیسا بیخبر سویا ہی تو

چشم دل کو باعثِ حیرت ہی تیری جستجو ۔۔۔ پھول تھا پر ہاتھ سے جاتا رہا مانند بو

لالہ و گل سے طبیعت تو نے بہلائی نہین
کیا ہوا باغِ جہان کی تجھکو راس آئی نہین

قلزمِ عالم کی تو نے سیر کی مثل حباب ۔۔۔ خواب کا نیرنگ تھا یا تھا ترا حسن شباب

برق کا جلوہ تھا یا قوسِ قزح کی آب و تاب ۔۔۔ یا شرر یا قطرۂ شبنم مین عکس آفتاب

خانۂ تن تھا ترا سیل فنا کے سامنے
شمع تیری زندگی کی تھی ہوا کے سامنے

ایک دم مین لٹ گئی تیری جوانی کی بہار ۔۔۔ آہ ایسے بھی زمانہ سے گئے کم سوگوار

خود مُرادین اور تمنائین ہین تجھسے شرمسار ۔۔۔ دل ہی پہلو مین ترے یا آرزوؤنکا مزار

کون کہتا ہی کہ ہی زیرِ کفن میت تری
خاک و خون مین منھ لپیٹے ہی پڑی حسرت تری

پاؤن پھیلا کر جو تو یون سو رہا ہی بیخبر ۔۔۔ کیا ہی خواب مرگ مین خواب جوانی کا اثر

دیکھ آنکھین کھولکر عالم ہی کیا پیش نظر ۔۔۔ آئی ہی فردوس سے سر پیٹتی روح پدر

سروِ قد اُٹھا نہین جاتا اگر تعظیم کو
ہاتھ ہی اپنا ہلا دے آخری تسلیم کو

کچھ خبر ہے تجھکو اے دلدادۂ خواب فنا ۔۔۔ ہے سر بالین پہ کیا ہنگامۂ حشر بپا

نعرہ ہاے درد یہ کیسے ہین یہ ماتم ہے کیا ۔۔۔ چاک ہی کسکا گریبان کون ہی سر [illegible]

ہو تڑپتا کیون دل چھننے سے کسکا سیر ہو
بال کسنے لاش پر کھولے یہ کیا اندھیر ہو

دیکھ تیری بیوہ غمگین پہ کیا اُفتاد ہے   محو حیرت یاس سے وہ کُشتۂ بیداد ہے
مہر خاموشی لبون پر دلمین تیری یاد ہو   خانۂ ویران کی صورت خاطر ناشاد ہے
خاک آلودہ مسرت ہائے پنہان ہوگئین
آرزوئین دلکی شیرازۂ پریشان ہوگئین

دردِ دل اسکا لب خاموش کہہ سکتا نہین   اشک حسرت دیدۂ پُرنم سے بہہ سکتا نہین
بند سینہ مین مگر طوفان رہ سکتا نہین   یہ وہ صدمہ ہو کہ دل انسان کا سہہ سکتا نہین
محو حیرت ہمنشین ہین اسکی آہِ سرد سے
سوزش پنہان عیان ہو اسکے رنگ زرد سے

خواب مین سُنتا ہو جیسے نغمۂ شیرین بشر   جس سے طاری دل پہ ہو کیفیت جادو اثر
یہ نوائے روح پرور بند ہو جائے اگر   آنکھ کھلتے ہی سیاہی شب کی ہو پیش نظر
اک عجب عالم ہو تب اُسکے دل بیتاب کا
جاگنے پر اس گھڑی اُلٹا گمان ہو خواب کا

بس یہی عالم ہے تیری بیوۂ ناشاد کا   نغمہ ہائے عیش سے تھے کان اُسکے آشنا
ہو گیا ہو اب جو تیرا ساز ہستی بے صدا   کس تحیر کس پریشانی مین ہو وہ مبتلا
کیا کہے دردِ جگر منھ سے کہا جاتا نہین
تیرے مرنیکا اُسے ابتک یقین آتا نہین

مادر ناشاد تیری وہ ازل کی سوگوار   پہلے ہی اُسکی نگاہون مین تھی دنیا تنگ و تار
تیرے دم سے تھا بندھا شیرازۂ صبر و قرار   ہاے اس بیکس کا اب بیڑا کریگا کون پار
آج اسکا مایۂ تاب و توان جاتا رہا
ناخدائے کشتیِ بے بادبان جاتا رہا

وہ اسیر بیخودی تیری یتیم خورد سال   پھول سے چہرہ پہ اسکے ہے جمی گرد ملال
کچھ طلسم آفرینش کا نہین کھلتا مآل   پیر گردون کے ستم سے مجھکو حیرت ہو کمال
ہاے معصومونپہ بھی ظالم ترس کھاتا نہین
یہ رُلاتا ہو اُنھین رونا جنھین آتا نہین

کیا وہ نادان ہین جو کہتے ہین نرے اعتبار   مصلحت رہتی ہو رنج و درد مین بھی آشکار
ہو فسانہ یہ حدیث صبر و تسکین و قرار   خواب ہستی کی نہین تعبیر ایسی زینہار
مین نظام دہر مین کچھ مصلحت پاتا نہین
اِس سمندر کا مجھے ساحل نظر آتا نہین

خاک مین تجھکو ملانا تھا اگر با اشک و آہ   کس لیئے تجھپر ہوئی وا منزل ہستی کی راہ
ساتھ تیرے کیون ملے مٹی مین اتنے بیگناہ   زندگی جنکی ہو اب وابستۂ حال تباہ
لب فغان کو چشم ہو آنسو بہانے کے لیے
دل ہو جلنے کو جگر ہے داغ کھانے کے لیے

وائے بر قسمت یہ کیا نیرنگ دوران ہوگیا   تو عدم آباد پہنچا گھر بیابان ہوگیا
ہائے کیا دل تھا کہ وقف یاس و حرمان ہو گیا   یا تمناؤن پہ اپنی آپ قربان ہوگیا
تو بہار زندگی مین تو رہا ناکام عشق
لب تلک آنے نہ پایا تھا کہ چھلکا جام عشق

عیش و عشرت کے ہزارون جسنے سامان کھو دیئے   وہ مے راحت کے بدلے خون دل اپنا پیئے
کیسے کیسے رنج تجھکو نامرادی نے دیئے   ہائے تو دنیا مین آیا تھا اِسی دن کے لیے
داغ حسرت یادگار اپنا ہمین دیکر گیا
خود زمانہ سے دل پُر آرزو لیکر گیا

پھر رہی ہو دیدۂ مشتاق مین صورت تری   کھیلتی رہتی تھی ہر دم تیرے ہونٹون پر ہنسی
ہو ہماری پردہ ہائے گوش مین ابتک بسی   گفتگو تیری جوانی کی اُمنگون سے بھری
اب وہ لطف گفتگو حاصل نہوگا خواب مین
جانشین تیرا کہان ہو صحبت احباب مین

اب وہ ربط و ضبط وہ اگلی ملاقاتین کہان   وہ بگڑنا اب کہان وہ میل کی باتین کہان
دل لگی کی ہر گھڑی ہر دم نئی گھاتین کہان   وہ زمانہ اب کہان وہ دن کہان راتین کہان
بے مزہ تیرے بے لطف جوانی ہوگئی
داستان عیش اپنی بھی کہانی ہوگئی

ساتھ کسکے ہو گئی اب وقتِ سحر سیرِ چمن　　گرم کسکی گفتگو سے ہوگی شب کی انجمن
خندہ پیشانی سے دیگا کون اب دادِ سخن　　کون ہوگا موت پر مجھ خستہ جان کی نوحہ زن

تو مرا ہمدرد سچّا آشنا جاتا رہا
زندگی کا لطف مرنے کا مزا جاتا رہا

چشمِ ظاہر بین کو اب دیدار ہی تیرا محال　　ہی مگر آراستہ تجھ سے مری بزمِ خیال
یہ وہ عالم ہی جسے مانا ہی سب نے لازوال　　ہو مخل اس اپنی صحبت مین فلک کی کیا مجال

ہان فنا کردون گا مین نیرنگی تقدیر کو
آئینہ مین دل کے رکھونگا تری تصویر کو

صحبتِ احباب مین ہین گرہی رنج والم　　کاشکے پیدا ہوے ہوتے کسی صحرا مین ہم
زندگی کا عیش ہوتا اور نہ مرنے کا ستم　　ہان اگر ہوتا تو ہوتا ایک تنہائی کا غم

نوحہ خوان ہوتا نہ کوئی چرخِ گردان کے تلے
قبر بنجاتی کہین ریگِ بیابان کے تلے

ہی مگر یہ دارِ فانی وہ طلسمِ دلنشین　　یاد کم رکھتی ہی اسکی زحمتین طبعِ حزین
یہ وہ عقدہ ہی جو غور و فکر سے کھلتا نہین　　جہل سے بدتر نظر آتی ہی عقلِ دوربین

ہاے اس دُنیا کی پابندی عجب دلگیر ہی
خود پہنتا ہی جسے انسان یہ وہ زنجیر ہی

ب۔ن چکبست

ایک صبح

تھا دور ایک منزل ابھی لشکرِ سحر　　سرہنگِ شب نے بھانپ کے دی ارض کو خبر
شبنم کے قاصد آے غبارو نمین چھپکر　　ان سے صبا نے سنکے کیا تار مشتہر

سرگوشیان تھی غنچو نمین ہی کسکا انتظار
جو رایتِ شفق ہوا مشرق مین آشکار

آ کر جو کی نسیم نے شوخی سے گدگدی　　تو ہر کلی کی آنکھ دہن جھٹ سے کھل گئی
بلبل کی جانب اُسنے جو ناگہ نگاہ کی　　دیکھا اِدھر اُدھر کو پھر اکبار ہنس پڑی

تھی تاک مین شمیم دہن پر لگی ہوئی
اُسکی بدولت اسکی چمن مین ہنسی اڑی

چپکے سے کیا نسیمِ سحر نے سُنا دیا　　غنچون کے دلکو فرطِ طرب سے کھلا دیا
بادِ سحر نے معجزہ اپنا دکھا دیا　　شبنم کے چھینٹے دیکے چمن کو جگا دیا

غنچے جو کھل کھلا کے گلستان مین ہنس پڑے
شبنم کے موتی سبزۂ خوابیدہ پر جھڑے

رنگِ شفق سے تھا جو افق ملکِ زرنگار　　گل نے بھی اک خزینۂ زر کر دیا نثار
دلکش عروسِ غنچہ کا تھا حسن او نکھار　　صدقہ ہزار جان سے تھی عندلیبِ زار

منہ شاہدانِ گل کے جو شبنم نے دھوئے تھے
سُنبل کے بال بال مین موتی پروئے تھے

چھایا ہوا تھا دہر مین اک نور کا سمان　　دھویا ہوا تھا آبِ رُخِ حور سے جہان
انجم کا آسمان سے ٹھٹکا تھا کاروان　　مہتاب کے بھی مُنھ پہ اڑی تھین ہوائیان

شب زندہ دار چرخ کا بھی رنگ فق ہوا
غالب ہر ایک رنگ پہ رنگِ شفق ہوا

پہنچا قریب جب شہِ گیتی ستانِ صبح　　حاضر پئے سلام ہوے افسرانِ صبح
فوجِ شعاع لیکے بڑھا قہرمانِ صبح　　لہرا رہا تھا پیلِ فلک پر نشانِ صبح

ڈنکا ہوا طیورِ چمن کی صفیر کا
اک غل تھا آمدِ شہِ گردون سریر کا

فوجِ شعاع کی ہوئی آمد کی جب دھوم　　تو ہو گیا فلک سے ہوا لشکرِ نجوم
مشرق مین آے خسروِ خاور کے جب قدم　　تو دوڑ کر وہین لیا ان کو افق نے چوم

اک دم مین شب کی تیرگی کافور ہو گئی
دُنیا چمک کے اِک کرۂ نور ہو گئی

لا غازۂ عذارِ عقیدت وہ صبح تھی　　یا قشقۂ جبینِ سعادت وہ صبح تھی
نورِ رُخِ نیازِ اطاعت وہ صبح تھی　　افشانِ روئے حسنِ ارادت وہ صبح تھی

جس صبح کیکئی نے سُنایا تھا یہ پیام
چودہ برس وطن سے رہین دُور جاکے رام

کیفی دہلوی

صبح بنارس

شبکو آیا جو سیہ خانے مین وہ رشک قمر
دل یہ کہتا تھا الٰہی نہ ہو اس شب کی سحر

اُسکا یہ ناز سے کہنا کہ رہے بخت ترے
میرا ہر بار یہ کہنا کہ مین قربان تجھ پر

ہائے کیا اُسکی جوانی کا ہے کافر عالم
ہو گیا پیر فلک اور نہ آیا وہ نظر

یون چمکتی نظر آتی ہو جبین پر افشان
ماہ کے گرد درخشندہ ہون جیسے اختر

نظر آتے ہین جوانی مین غضب کے جوبن
سرکے بیٹھے ہین اسی حُسن کے میرے دل پر

زلف سے آتی ہو بوئے سمن و مشک زباد
شب یلدا کی سیاہی ہو اسی مین مضمر

سامنے بادۂ گلرنگ کی آئی بوتل
بھر دیئے ساقی گلفام نے پیمانۂ زر

ڈالکر باہین گلے مین یہ کہا اُس گل نے
میرے ہاتھون سے مئے ناب کا پی اک ساغر

اپنے ہاتھون سے مجھے اُس نے پلائی مئے ناب
تاک انگور کی تھی نشہ چڑھا جب مجھ پر

سامنے آئین فواکہ کی بھی قابین سر بزم
دل کو فرحت ہوئی جب آئے نظر تازہ ثمر

دور مین جام ابھی تھا چشم کو بھی گردش تھی
مست آتی تھی نظر ساقی ہوش کی نظر

خوب چھینٹے دیئے دریائے کرم کے اُس نے
دم جو ساقی کا بھرا بھر گیا دم مین ساغر

لحن پُر درد مین گائی وہ غزل ہو کر مست
دیس کا بھیروی مین کچھ نظر آیا تھا اثر

پرج مین جھوم کے اُس شوخ نے گایا جو خیال
وجد کرنے لگی مرقد مین بھی روح حیدر

دل عاشق کو ہلانے لگی دھن سوہنی کی
رقص جب اُسنے کیا کھائی بل اُسکی کمر

گتین کافی کی بجائین تو سمان خوب بندھا
تان کھماچ کی جب لی تو ہوا اور اثر

نصف شب جب کٹی اس شغل مین با عیش و سرور
آگئی نیند اُسے سو گیا وہ رشک قمر

نیند کیا عہد جوانی کی ہے اللہ اللہ
کروٹین بھی نہین لیتا ہو ہمارا دلبر

فلک پیر یہ ریعان جوانی دیکھے
سب کو اُسکی ہے خبر اُسکو نہین کوئی خبر

مین تو سو جان سے ہون اس بیخبری پر قربان
خواب مین محو ہے ایسا نہین انچل رخ پر

اب بھی اُٹھتا نہین وہ نیند کا ماتا صدول
صبح کاذب کی ہوئی چھاؤنی مین تو بھی سحر

روئے مہ پر چھپی مہتاب ہوئی شب کا فور
خط ابیض ہوا ظاہر فلک اخضر پر

مرغ نے بانگ بھی دی بولے نشیمن مین طیور
باغ مین اپنی ہوا باندھتی ہے باد سحر

چرخ پر مہر بھی اب ہوگا کوئی دم مین طلوع
جھلملاتے نظر آتے ہین مجھے سب اختر

باغ سے آتی ہے ہر بار شمیم گل دور
ڈالیان جھومتی ہین آتی ہے جب باد سحر

دیئے شبنم نے جو گلزار مین چھینٹے دو چار
کھل گئے سبزۂ خوابیدہ کے بھی دیدۂ تر

گو ہے بیمار مگر کھولے ہے آنکھین نرگس
پتا پتا اُسے گلزار کا آتا ہو نظر

بڑھین جاتے ہین تہخانون سے گنگا کی طرف
وقت پوجا کا یہ ہو اور نہین اُسکو خبر

آئی ناگاہ جو کلیون کے چٹکنے کی صدا
ہو گیا خواب سے بیدار وہ رشک گل تر

نرگسی آنکھون سے یون بات کا ظاہر ہو خمار
جام بلور مین جیسے ہو شراب احمر

ہنسکے کہنے لگا کیون تم نے جگایا نہ مجھے
سیر کو جاتا ہون گلزار مین مین وقت سحر

آؤ تم بھی چلو ہمراہ مرے گلشن مین
دیکھو گلزار جہان مین روش برگ و ثمر

معتدل فصل ہو یہ ہو عمل باد بہار
پھونک کر باغ مین رکھتی ہو قدم اب صرصر

وہ سمان صبح کا گلزار کے وہ گل بوٹے
باغبان نے بھی لیا جن سے ریاضت کا اثر

برگ پر بار ہوئے پھول چمن مین دم صبح
اُسکے قطرون سے ثمر بار ہوئے سبز شجر

کیون نہ اُسکو کہون نو بادۂ گلزار جہان
وہ ریاضت کی کہ ہر پھول کے دامن مین ہے زر

پتیان ہلتی ہین شاخون مین تو آتی ہو صدا
پھولتا پھلتا رہے باغ کا ہر ایک شجر

آئے گلزار سے گنگا کا کیا رخ اسنے
شور ہو آج وہ آتا ہو جو یکتا ہے گہر

سبد گل بھی ہو اک ہاتھ مین اُس گلرو کے
گھاٹ پر اوڑھ کے جاتا ہے گلابی چادر

ہان مری طبع روان جوش کا ہنگام ہے
بحر معنی مین جو یکتا ہے لٹا وہ گوہر

غسل کرنے کو جو گنگا مین گیا وہ دلبر
اے تری شان صدف نے کیئے صدقے گوہر

جب لٹین زلف کی کھڑا ئین رُخ روشن پر
لوگ کہنے لگے لو آگیا بدلی مین قمر

زحل و مہر کا ظاہر ہوا عالم مین قران
رُخ روشن کے قرین آگئی زلف دلبر

بڑھ گئی مہر کی بھی آبرو گنگا جل سے
چھینٹے دینے لگا وہ طفل حسین سورج پر

کیون نہ آفاق مین خورشید کے دن پھر جائین
اُسکی پوجا مین ہو مصروف مرا رشک قمر

ہو چکا غسل سے فارغ جو وہ محبوب مرا
قطرۂ آب گرے زلف سے بن کر گوہر

سلہ الٰہی حیدر جان لکھنوی۔

لال ساری تن نازک میں جب اپنے پہنی — عکس پڑتے ہی شفق گون ہو گنگا کا بجنور
اُنے سیندور کا قشقہ جو جبین پر کھینچا — آگیا صاف نظر قوس کا سب کو منظر
کس قیامت کی ہے اُس طفل برہمن کی اٹھان — بت بھی آرزو رکھتے ہیں کہ وہ آئے اِدھر
کیون نہ سو جان سے ہو محو صنعت صانع بت — آج یہ شکل حسین آئی ہے مردم کو نظر
میرے اللہ تری قدرت و صنعت کے نثار — تو نے ایسے بھی بنائے ہیں خدائی میں بشر
آج تو وحدت اللہ کا اقرار کرینا — کیون ہیں بتخانے میں خاموش بتان آزر
ہائے کیا خوب سمان آج لب دریا ہے — گھاٹ پر شہر کے ہیں جمع حسین وقت سحر

کبھی ناقوس کی آتی ہے صدا مندر سے — اور اشلوک کبھی پڑھتے ہیں پنڈت فرفر
رام کے بادۂ اُلفت سے ہی ہر اک بدمست — جوش مستی میں بھی ہے نام انھیں کا لب پر
لب دریا تو نہاتے ہیں بنارس والے — ناؤ پر چڑھ کے سمان دیکھتے ہیں اہل نظر
کیا بھلا اور ثنا میں کرون گنگا جل کی — جو روان رہتا ہے بیشک ہے وہ آب اطہر
غسل کے بعد حسین جاتے ہیں ہر مندر میں — پھول کے ہار چڑھاتے ہیں وہ ہر اک بت پر

دیکھ لی صبح بنارس تو قمر آنکھون نے
دیکھنا اب ہے مجھے شام جوانی کی سحر

قمر گیاوی

کمار سمبھو

بھارت میں تھا ایک دیت[۱] تارک
پھر فریاد دیوتا سب نے
تارک کے ستم سے اے نکو ذات
وشنو نے کہا کہ دیوتاؤ!
ریشم ہو کر یہ ناگ ہوگا
اسکی تدبیر ہے فقط ایک
لذات جہان سے ہاتھ اُٹھا کر
بیٹھی ہے اُما ہمانچل کی
اُن سے جو کمار[۲] ہوگا پیدا
بولے ناکام سب کہ اے کام!
رُت[۳] کو ہمراہ لیکر آیا
آیا سے کھلا وہ کاغذی باغ
پوجا کرنے اما جب آئی
ابرو نے کہا کہ تیغ لاؤ
شنکر پہ اُما نے گل چڑھایا
آنکھیں کھولیں تو غیظ آیا
خود آئے اما کو آزمانے
تو شیو پہ عبث فدا ہوئی ہے
جو کھائے دھتورہ آک[۴] پھانکے
تیرا چہرہ ہے باغ کا گل
بولی یہ اما کہ سن اے جوگی!
جس نے دنیا کو تج دیا ہے
اسکی جو زہر کی ڈلی ہے
کس کام کی شے جو وہ نہیں ہے
اُن سے جو ہوا کمار پیدا

ظالم معبد[۵] درِ نا مبارک!
آئے وشنو کے گھر مودب
پربت بھی کھڑا ہے باندھ کر ہات
ناچار ہون کیا کرون بتاؤ؟
یہ لعل کوئی دن آگ ہوگا
اچھی خاصی۔ مفید اور رنگ
بیٹھے ہیں پہاڑ پر وہ جا کر
پیاسی ہے وہ شیو کے پریم جل کی
تارک کو وہی فنا کرے گا
شیو کو کرے اما کا تو رام
پھیلائی قریب شیو کے مایا[۶]
جو باغ ارم کو دے گیا داغ
مٹی میں لگی دیا سلائی
آنکھیں بولیں۔ چھری چلاؤ!
نقد دی نذرانہ دل دکھایا!
لیکن صادق اما کو پایا
سونے کو آگ پر تپایا نے
دیوانی تو اے اما ہوئی ہے؟
اسکی پیاسی کنوئیں تو جھانکے
اسکا گھڑا چراغ کا گل!
شاید تری شامت آئی ہوگی
بیکنٹھ میں اُس نے گھر لیا ہے
مجکو وہ نبات سے بھلی ہے
کس کام کی ہیں جو وہ نہیں ہے
موذی تارک کو اُس نے مارا
جو عشق حقیقی کا ہے طالب

خادم اسکی تمام مخلوق
کہنے لگے سب غضب ہوا ہے
سورج اسے تیج[۷] دے رہا ہے
اسکو میں نے ہی بر دیا تھا
میں نے سینچا ہے جو گل تر
عارف۔ کامل جو ہیں مہادیو
جب تپ میں ہیں وہ محو ایسے
شیو کی جو اما سے راہ ہو جائے
پاکر یہ جواب دیوتا سب
اس کام پہ مستعد ہوا کام
شیو جی تھے پہاڑ پر نمایان
تپ سے شنکر کا دل پھرایا
تھا حسن اما کا شعبدہ باز
کاٹو نخل ریاض شیو کا
غش کھا کے گری وہ شیو کے آگے
بھجوا دیا اس کو سمت گھر کے
کہنے لگے اے حسین گل اندام
جو سانپ گلے میں خود لپیٹے
تیرا زہرہ جبین ہو شنکر؟
تو لوٹ ہے ایسے سنگ دل پر
دلبر کی میرے نہ کر برائی
شیو کے گیسو جو مار ہون گے
شنکر نے خاک جو ملی ہے
پایا شیو نے جو عشق سچا
نیکون نے نجات غم سے پائی
وہ ہے دائم ہوس پہ غالب

نادم اُس سے جفائے معشوق
اب تک نہ ہوا تھا اب ہوا ہے
سورج سے بھی گرد وہ لے رہا ہے
لیکن میں یہ نہ جانتا تھا
اُسکو آپ ہی جلاؤن کیونکر؟
با حق۔ لے لوٹ اور لے رتیو[۸]
دیپک پہ فدا پتنگ جیسے
یعنے۔ دونون کا بیاہ ہو جائے
پیش کام آئے پھر مطلب
تارک کا تمام تا کہ ہو کام
یا مہر تھا آسمان پہ تابان
آندھی سے پیڑ کو گرایا
جادو کرنے لگا ستم ساز
آخر شنکر[۹] کا دھیان ٹوٹا
شیو جی خواب گران سے جاگے
اور آپ جتی کا بھیس کرکے
جو چنا رہے۔ وہ تراد لارام
اُس شیو کو تو زلف میں جگہ دے
ہیرے کا ہمنشین ہو کنکر؟
شیشہ ثابت رہے گا سل پر؟
گدڑی میں لعل ہے وہ بھائی!
وہ میرے گلے کے ہار ہون گے
اکسیر میرے لیے وہی ہے
خوش ہو کر اما کے ساتھ بیاہا
نیکی پھیلی۔ مٹی برائی

طالب بنارسی

۱؎ دیو یعنی بدکار ظالم ۲؎ پرورش کا دیوتا ۳؎ نور اقبال ۴؎ خراج ۵؎ گرز ۶؎ بیٹا ۷؎ عشق کا دیوتا ۸؎ فصل بہار کی دیوی ۹؎ شعبدہ باز ۱۰؎ شیوجی ۱۱؎ بجلکٹیا۔

خیر مقدم انصاری

کسکی آمد کی خوشی آج ہی انسانونکو کسکے دیدار کا ہے شوق مسلمانون کو
کسکے انوار سے زینت ہوئی کاشانونکو صاف کرتی ہی صبا کیون چمنستانون کو

"باغ مین گل کھلے جاتے ہین کہ وہ آتے ہین"
"انگلیان سرو اٹھاتے ہین کہ وہ آتے ہین"

اہل اسلام کا ہمدرد کوئی آتا ہے شیر دل اور جوانمرد کوئی آتا ہے
تجربہ کار جہان گرد کوئی آتا ہے یون تو لاکھون ہین مگر فرد کوئی آتا ہے

ڈاکٹر نام کا اپنے ہے جو مختار احمد
ہی اسی قوم کے جانباز کی آمد آمد

تمکو معلوم بھی ہی آپ کی عزت کیون ہی ڈاکٹر اور حکیمون پہ فضیلت کیون ہے
آپ سے قوم کے بچون کو محبت کیون ہی آپکی دید کی ہر شخص کو حسرت کیون ہے

آبرو پائی ہی ہمت سے جوانمردی سے
قوم ہمدرد بنی آپکی ہمدردی سے

ہاتھ پر ہاتھ دھرے آپ سے بیٹھا نہ گیا زخمی ترکونکو تڑپتے ہوے دیکھا نہ گیا
بسملِ تیغِ ستمگار سے سرکا نہ گیا آپ ہی اڑکے سرِ شمع پہ پروانہ گیا

یعنی ٹرکی مین گئے طبی مشن کو لیکر
ساتھ کچھ اور محبانِ وطن کو لیکر

ایک سے ایک سوا نمین ہنر رکھتا تھا بات جو کہنے کی ہوتی تھی وہ کر رکھتا تھا
ہاتھ شافی تھا دوا دون مین اثر رکھتا تھا رات دن زخم رسیدون کی خبر رکھتا تھا

ظالمون نے جو دیا توڑ شکستہ دل کو
مومیائی سے دیا جوڑ شکستہ دل کو

آپ ٹرکی مین رہے رشکِ مسیحا ہوکر کوئی مردہ بھی اگر تھا رہا زندا ہوکر
جینے پھرنے لگا بیمار بھی اچھا ہوکر چشم امید رہی زخم پہ پھاہا ہوکر

سر مین گر درد ہوا سر کو دبانے بیٹھے
آپ بیمار کی تسکین کو سرہانے بیٹھے

ہر کوئی ایسا جوانمرد مسلمانون مین جو محبت کا نمونہ بنے انسانون مین
جان ڈالے نئی ترکیب سے بیجانون مین تیر مارا ہی یہی آپ نے میدانون مین

بھولکر بھی نہ لیا ہاتھ مین تلوارون کو
یہ بڑا کام تھا اچھا کیا بیمارون کو

یون بہادر تھے بہت توپ چلانے والے بڑھکے میدان مین دو ہاتھ دکھانیوالے
ان سے بھی بڑھ کے ہین ہمت کے بڑھانیوالے ہاتھ سے زخم رسیدون کو اٹھانیوالے

قوم سیکھے گی سبق آپ سے ہمدردی کا
اے خلیق آپ نمونہ ہین جوانمردی کا

خلیق دہلوی

تاثیر الفت

نشان ملتا نہین مغرب مین اب مہرِ درخشان کا نظر آتا نہین جلوہ ہمین خورشید تابان کا
تھکا ماندہ مسافر منزلِ مقصود پر پہنچا نہ ٹھہرا راہ مین دم بھر بھی اپنی دھن کا پکا تھا
کہان غائب ہوا تو جلوہ افروزِ جہان ہوکر ستم ڈھایا ہی تو نے اہلِ ہستی پر نہان ہوکر
کہان اب روزِ روشن کا پتہ۔ نورِ درخشان کا تسلط ہو گیا سارے جہان پر شامِ ہجران کا
ستارونکی چمک سے ہی فقط چرخِ برین روشن چراغون سے ہوئی ہی جا بجا بزمِ زمین روشن
ہوا بازارِ عالم سرد۔ سونی بزمِ ہستی ہی جہان سیلابِ ہستی تھا وہان حسرت برستی ہی

بلا سے اس گھڑی ہی سامنا بیمارِ الفت کو ترقی ہو رہی ہی دمبدم آزارِ الفت کو
کبھی ہی دردِ دل پیدا کبھی دردِ جگر پیدا کیا ان ظالمون نے سینۂ بسمل مین گھر پیدا
وفورِ درد سے گھبرا کے آخر آہ کر اٹھا اٹھایا لاکھ بالین سے نہ اٹھنا تھا نہ سر اٹھا
نہین کھلتی ہین آنکھین خونفشانی اشکباری سے کہ بہلائے دل رنجور کو اختر شماری سے
بپا خونِ تمنا حسرتِ مردہ کا ماتم ہے کبھی وہ صورتِ تصویر ہی اور چپ کا عالم ہی
کبھی دل تھام کر ہاتھون سے سرگرمِ فغان ہونا کبھی آثار پھر دردِ نہانی کے عیان ہونا

مسیحائی یہ کی امید نے بیمارِ الفت سے تنِ مردہ مین پھونکی روح اکگلی کی قوت سے

اُمیدِ وصل نے ایسی طبیعت اُسکی گرمائی	کہ سیرِ کوچۂ جانان کے حیلے سے لگا لائی
ستم ایجاد کے آگے دلِ ناشاد جا پہنچا	اسی انداز سے وہ خانمان برباد جا پہنچا
وہان بیٹھا تو لب پر یون لگا کر مُہرِ خاموشی	کہ صورت سے عیان ہوتی تھی اُسکی خود فراموشی
فسُردہ خاطری چہرے سے اُسکے ایسی ظاہر تھی	کہ جسکے ذکر سے اُسکی زبانِ حال قاصر تھی

یہ کیا ہے اکیا کیا نالون نے میری کچھ اثر پیدا	یہ کیا ہے اکیا کیا اُلفت نے اُسکے دل مین گھر پیدا
یہ کیا ہے اکیا کہا اُس بُت نے مجھ سے مہربان ہوکر	یہ کیا ہے کون باتین کر رہا ہے بدگمان ہوکر
یہ کیا ہے اُسنے پوچھا مجھسے تم تصویرِ غم کیون ہو؟	خموشی معنی دار و سراپائے الم کیون ہو؟

وہ پوچھے ہمسے ہم تصویر سے خاموش رہ جائین	یہی موقع ہے باسط جو ہمین کہنا ہو کہہ جائین
بتا دین تجھ سے ظالم حال ہم آشفتہ حالی کا	نتیجہ ہے ستمگر سب یہ تیری پائمالی کا
ستا رکھا ہے قاتل تونے مجھکو اک زمانے سے	ملا دے خاک مین مٹی تو لگ جائے ٹھکانے سے
قیامت ہے کہ تجھپر مین تو ہون جان سے شیدا	قیامت ہے تجھے نفرت ہو میرے نام سے پیدا
غضب ہے رات فرقت کی کٹے خوابِ پریشان مین	بسر ہو تیری آرائش گیسوئے پیچان مین
غضب ہے مین پھرون باچشمِ نم دشتِ بیابان مین	رہے تو جلوہ فرما خوشدلی سے بزم خوبان مین
غضب ہے شمع سان ہو مجھکو سوز و سازِ بیمطلب	تجھے ہو فرشِ گل پر تجھکو خوابِ نازِ بیمطلب
غضب ہے مین ہون سرگرم فغان تیری جدائی سے	تجھے مطلب ترنم سے ہو اور نغمہ سرائی سے
غضب ہے مین اُڑاؤن دھجیان جیب و گریبان کی	تجھے مدِ نظر زینت ہو اپنے دورِ دامان کی
قیامت ہے نہ تیری چاہ کی کچھ قدردانی کی	قیامت کی تغافل کیش تونے سرگرانی کی

مری پُر درد باتون سے بہت گھبرا وہ قاتل بھی	سزاوارِ ترحم ہو گیا ہے آج بسمل بھی
مرے پہلو مین بیٹھا اور کہا طرفہ شکایت ہے	سمجھ ہی مین نہین آتی ہے یہ کیسی حکایت ہے
رہ و رسمِ محبت اے ستمگر عاشقی مین کیا جانون	بھلا آئین اُلفت کے مرے عاشق مین کیا جانون
ستانیکو مرے تونے عجب صورت نکالی ہے	سُنا کر داستانِ غم غضب مین جان ڈالی ہے
مجھے ایسا کبھی موقعہ نہ پیش آیا مین کیا جانون	کوئی عرضِ تمنا یون نہین لایا مین کیا جانون

پہ تیری دردسے در اصل دل مین درد پیدا ہے	جگر مین سوزِ نہان لب پہ آہ سرد پیدا ہے
مجھے تجھسے ہی ہمدردی نہ اب اسطرح غم کھا	جنون کو چھوڑ دے کیون ہو گیا ہے ایسا دیوانہ

جدا ہونگے نہ اب ملکر نہ اب رنج و الم ہونگے
مزے آئین گے باسط قدردان اب بیشتر ہم ہونگے

باسط بسوانی

حمد

حمد خالق مین عندلیبِ قلم	گلفشان ہے زہے نصیبِ قلم
غنچے دیتے ہین یون چٹک کے صدا	وحدہٗ لاشریک ہے وہ خدا
بیل بوٹون مین رنگ قدرت کا	پتا پتا گواہ صنعت کا
کوئی سمجھا نہ آجتک یہ راز	سرو قمری مین کیون ہے ناز و نیاز
کرتی ہے نالہ و بکا بلبل	گلِ تر پہ ہے کیون فدا بلبل
لالہ و گل کے رخ سے رنگین ہے	سُرخ مخمل کے ہین کھلے طاقے
ڈھنگ نرگس مین چشم مردم کا	رنگ غنچون مین ہے تبسم کا
سر اُٹھائے ہوئے بہار کہین	بلبل و گل مین چھیڑ چھاڑ کہین
اُسکی قدرت کا کچھ حساب نہین	اُسکی صنعت کا کچھ جواب نہین
کیسے کیسے حسین کئے پیدا	نازنین مہجبین کیئے پیدا
باغ عالم کو زیب و زینت دی	لوٹ ہو جائین دل وہ صورت دی
کیسا تارون کا خوشنما ہے چمن	آسمان کو بنا دیا ہے چمن

ہر جگہ ہے غرض وہی مستور
چاند سورج مین ہے اُسی کا ظہور

دیکھکر جلوہ اُسکی قدرت کا	ہے فرشتون مین شورِ صلِّ علیٰ
حمد کرتے ہین اُسکی جن و بشر	اُسکے اوصاف ہین زبانون پر
ایسی آنکھین کہان سے لائین ہم	اُسکی قدرت کو دیکھ پائین ہم
آنکھین بینا مری اگر ہو جائین	آئینہ صنعتین مگر ہو جائین
ذاتِ باری کو کوئی کیا جانے	آپ اپنے کو وہ خدا جانے
محوِ حیرت ہے چشمِ اہل نظر	خامشی یان سخن سے ہے بہتر

رسا ہمدانی (گیاوی)

مناجات

اے خداوند اے کریم اے خسرو جود و عطا   اے شہنشاہِ دو عالم مالکِ ارض و سما

دین و دُنیا کی شہنشاہی کا مالک تو ہی   پُرمعاصی ہم ہین بندی تیرا شیوہ ہی عطا

ہی تری سرکار اعلیٰ اور تو خلاق ہی   ہم تو ہین ناچیز بندے بینوا و ناسزا

جس طرف دیکھا ترا جلوہ نظر آیا ہمین   صاف ظاہر ہو گیا کوئی نہین تیرے سوا

واقعی ہی ذات تیری لاشریک و لاجواب   دونون عالم کا تو ہی مالک ہی میرے کبریا

ہم بھٹکتے پھرتے ہین لگتے نہین اب راہ پر   راستہ سیدھا بتا اور بخشدے ہمکو خدا

تیری بخشش تیری رحمت تیرے احسان بیشمار   عمر بھر کفرانِ نعمت ہمسے ہوتا ہی رہا

باہمی دشمن ہوئے رسوائے عالم ہو گئے   ہمکو اپنی کور بختی کا نتیجہ مل گیا

اپنی بداعمالیون کے ہم ہین یارب معترف   اپنی کرتوتون کی ہی جو کچھ بھگتے ہین سزا

دور کر یارب! نفاق اور حبِ قومی کر نصیب   ہو ہماری یہ دُعا مقبول بہرِ مصطفےٰ

بغض اور کینہ عداوت جہل ہم سے دور ہو   ہو ہمارا قلب پُر تنویر جیسے آئینا

دادرس فریادرس تیرے سوا کوئی نہین   بخشدے لطف و کرم سے اپنے بندونکی خطا

یا خدا شانِ کریمی کے ہین ہم اُمیدوار   حبِ قومی دے ہمین اور قوم کا شیدا بنا

مذہبی جھگڑونسے اور قومی تعصب سے نکال   متحد ہو جائین ہم سب یہ ہی تجھ سے دُعا

نورِ ایمان سے منور کر ہمارے قلب کو   تیرے پیغمبر کی اُمت کا ہو بہتر خاتما

ہی ابھی تک قوم مین تعلیم نسوان کی کمی   قوم مین تعلیم نسوان کا عطا کر ولولا

عورتین تعلیم پائین گر ہماری قوم کی   آجکل بھی ہم مین نکلین سیکڑون زیب النسا

رابعہ کی التجا تجھ سے یہی ہر وقت ہے
جوشِ قومی حبِ قومی سوزِ قومی کر عطا

رابعہ سلطان بیگم

انسان

اے بشر! او خاک کے پتلے! تجھے اتنا غرور   تیرے ہمجنس اور پھر تو ہی رہے اُنسے نفور

نشۂ زر نشۂ رز کی طرح کیون چڑھ گیا   ہو گئی اُلٹی سمجھ کیون؟ کیا ہوا تیرا شعور

تجھ سے ہین محرومِ سائل سہکے ذلت کا بھی غم   مفلسونکو کب سمجھتا ہے تو او منعمِ غیور

سینے مین تیرے ہو دل لیکن نہین کچھ دلمین درد   مُنھ مین تیرے ہو زبان لیکن زبان پر قول زور

اے ضعیف انسان! او کیڑے زمین کے! غور کر   کیا ہو تیری اصل؟ کیا کیا تجھ مین مضمر ہین قصور

اے بشر! تجھ پر نہ ہوتا فضل اگر اللہ کا   تجھکو کب ملتی یہ عزت، یہ شرافت، یہ شعور

کر خدا کا شکر کیا تھا کیا سے کیا تو ہو گیا   جو ہو کرنا آج کر لے کل تو ہے روزِ نشور

حاملِ بارِ امانت کون ہے تیرے سوا   تو ہی اشرف گر نہ ہو تجھ مین چھپا شر و فتور

ہو کے انسان پھر کرے تو ہی جفا انسان پر   کیا یہی ہی آدمیت کا شعار اے بے شعور!

دوسرون کے حق و باطل سے نہین کچھ واسطہ   عدل کا خواہان ہی ظالم سے جو ہو جائے قصور

وہ نہین انسان جسمین کبر و نخوت ہو ذہین
ہو تو ریا آدمی کو آدمیت ہے ذہین

سید غلام مصطفےٰ ذہین

غزل رعد (جونپوری)

چارۂ دردِ محبت نہین درکار مجھے   چھوڑ دین حال پہ میرے مرے غمخوار مجھے

یاد آئے ہین جو وہ ابروئے خمدار مجھے   آج ہر چیز نظر آتی ہے تلوار مجھے

دم بدم شمع کے مانند گھلا جاتا ہون ہا   کھائے جاتا ہے مرے عشق کا آزار مجھے

یہ جو سمجھے ہین کہ بچنے کا نہین یہ بیمار   دینے آتے ہین تسلی مرے اغیار مجھے

تنکے کہتی ہے یہ تلوار مرے قاتل کی   مردِ میدان تو وہی ہے جو کرے پیار مجھے

دلکی تسکین ہو تم جان کی راحت ہو تم   میری آنکھون پہ بھی بیٹھو تو نہو بار مجھے

کیسے کیسے مرے دشمن کو مزے آتے ہین   گالیان وہ جو سناتے ہین لگاتار مجھے

بن پڑی ہی جو شبِ وصل تو سوجھی ہی نئی   اُنسے کہتا ہون کہ تم آج کرو پیار مجھے

کیا تماشا ہے کہ رہتی ہے کمر مین تیری   سرخرو کرتی ہی قاتل تری تلوار مجھے

جانمن کہنے کا اُن کے مجھے بدلہ یہ ملا ہا   دلمین آئے تو کرے جانسے بیزار مجھے

مین دکھاتا ہون جو انکو دلِ پر داغ اپنا   وہ دکھاتے ہین بہارِ گلِ رخسار مجھے

دل تو کیا چیز ہی مین جان بھی دیدون تمکو   تم بناؤ تو سہی اپنا خریدار مجھے

بت پرستی مین ہوا مجکو یہ رتبہ حاصل   برہمن بھیجتے ہین تحفۂ زنار مجھے

اُسنے پوچھا جو مرا نام تو مین نے یہ کہا   لوگ کہتے ہین محبت کا گنہگار مجھے

وہ دن اچھے تھی وہ اچھا تھا زمانہ اے رعد   جبکہ ناصح نہ تھا عشق کا آزار مجھے

اڈیٹوریل

انجمن ترقی اُردو

شکر ہو کہ مدت تک خوابِ غفلت میں مدہوش رہنے کے بعد انجمن ترقی اُردو اب پھر بیدار ہوئی ہو، اور سب سے پہلا کام جو ضروری خیال کیا گیا از سر نو قواعد وضوابط کی اشاعت ہو۔ گویا جو کام اپریل ۱۹۰۳ء میں کیا جا چکا تھا اب پھر اُسکی تجدید ہوئی ہو۔ ترقی اسی کا نام ہو!

اس دس گیارہ برس کے عرصہ میں انجمن ترقی اُردو نے کئی پلٹے کھائے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ ہمیشہ قابل ہاتھوں میں رہی، مگر اسپر بھی ہنوز روزِ اول ہو۔ اس دفعہ جن مستعد ہاتھوں میں اسکی باگ دی گئی ہو، اُنکے نام نامی ہی اس امر کی کافی ضمانت ہیں کہ اب انجمن ترقیِ اُردو میدانِ عمل میں قدم مارے گی چنانچہ حسب ذیل عہدہ دار مقرر ہوے ہیں:۔

پریسیڈنٹ۔ عالیجناب نواب عماد الملک مولوی سید حسین بلگرامی بہادر سی آئی ای

سکرٹری۔ جناب مولوی عبد الحق صاحب بی اے (دہلوی)

اسسٹنٹ سکرٹری۔ جناب مولوی سید علی حیدر صاحب طباطبائی نظم (لکھنوی)

یہ ایسے نام ہیں جن کی موجودگی میں انجمن ترقیِ اُردو کا مستقبل نہایت شاندار و دلفریب نظر آتا ہو۔ ہر تحریک کی قدر و منزلت اسکی کامیابی و اہمیت کا اندازہ اُسکے کارپردازوں کی قدر و منزلت اور وسیع الخیالی سے کیا جاتا ہو، اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہماری مُلکی و مادری زبان کی احیاء ترقی و متوقعہ کامیابی کا اندازہ صاحبان موصوف الصدر کے گرامی قدر ناموں ہی سے ہو سکتا ہو۔ لیکن ہم ناموں کو سراہنا نہیں چاہتے بلکہ ہماری دلی تمنا یہ ہو کہ ہم اپنی آنکھوں سے انجمن ترقی اُردو کا کوئی علمی کام دیکھیں!

مناسب معلوم ہوتا ہو کہ اس جگہ ہم انجمن ترقی اُردو کے مشتہرہ قواعد وضوابط نقل کر دیں تاکہ ناظرین کو معلوم ہو سکے کہ انجمن کے مقاصد کیا ہیں، اور اُنکے حصول کے لیے کیا طریقہ تجویز کیا گیا ہو۔

قواعد وضوابط انجمن ترقی اُردو

۱۔ اِس انجمن کا نام "انجمن ترقی اُردو" ہوگا۔

۲۔ اسکے مقاصد حسب ذیل ہوں گے (۱) اصلاح زبان یعنی اُردو زبان میں جو خرابیاں پیدا ہوتی جاتی ہیں اُنھیں دفع کرنا اور غیر مانوس اجنبی الفاظ و محاورات جو غیر زبانوں کے بلا ضرورت زبان میں داخل ہوتے جاتے ہیں اُنسے بچنا۔ اور صحیح و فصیح زبان کے رواج دینے کی کوشش کرنا۔

(۲) جن اضلاعِ ہندوستان میں اُردو زبان کا رواج نہیں ہو۔ یا کم ہو۔ اُن میں اُردو زبان کے رواج دینے کی کوشش کرنا۔

(۳) قدیم کلام نظم ونثر کو ضائع ہونے سے بچانا اور جدید کو ترقی دینا۔

(۴) علمی کتب کی اشاعت کے ساتھ ساتھ اصطلاحات کا لغت مرتب کرنا۔

(۵) اُردو زبان کی قدیم و جدید تالیفات و تصنیفات کا ایک کتبخانہ قائم کرنا۔

(۶) ہر صوبہ کی اُردو ٹکسٹ بکس کو زبان کے لحاظ سے جانچنا۔ اگر اُنمیں نقص ہوں، تو اُس صوبہ کی گورنمنٹ سے اصلاح کی خواہش کرنا۔

(۷) اور اگر انتظام ممکن ہو اور انجمن کا سرمایہ مساعدت کرے تو اُردو زبان و ادب کے متعلق ایک ماہانہ رسالہ جاری کرنا۔

۳۔ ان مقاصد کے عمل میں لانے کے لیے حسب ذیل تدابیر اختیار کیجائینگی

(۱) السنۂ مشرقی و مغربی سے ایسی کتابوں کا ترجمہ کرنا جو ملک کے لیے مفید ثابت ہوں۔ اور تصنیفات و تالیفات کی ڈایرکٹری تیار کرنا۔

(۲) ایسی جدید تالیفات و تصنیفات کرانا جن کی اُردو زبان کو ضرورت ہو۔

(۳) قدیم اساتذہ کی ایسی قلمی کتابوں کا شایع کرانا، جو درحقیقت قابلِ قدر ہیں، اور جن کے ضائع ہونے کا اندیشہ ہو۔ یا جو کبھی کسی زمانہ میں طبع ہوئی تھیں اور اب نایاب ہیں۔

(۴) ماہران علوم و فنون سے علمی کتب و اصطلاحاتِ علمیہ کا لغت مرتب کرانا۔

(۵) علاوہ اسکے جو صاحب اپنی کتاب کا حق تصنیف فروخت کرنا چاہیں

تو بشرطیکہ وہ کتاب انجمن کی رائے میں مفید اور عمدہ ثابت ہو، مناسب صلہ دیکر اُسے خرید کرنا۔

(۶) انجمن کے لیے ایک ایسا سرمایہ قائم کرنا، جو اُسکی ضروریات کیلیے کافی ہو۔

(۷) انجمن کے مقاصد کی، اشاعت و امداد کے لیے مختلف صوبوں اور مناسب مقامات میں انجمن کی شاخیں مقرر کرنا۔

۴ - انجمن اُن تمام تالیفات اور تصنیفات اور ترجموں کے لیے جو انجمن کی تحریک سے کرائے جائینگے، یا جن کا حق تالیف وہ خریدنا چاہیگی معقول صلہ دے گی۔ صلہ کی دو صورتیں ہونگی:-

(۱) یا تو انجمن نقد معاوضہ دیگی۔ اس صورت میں حق تصنیف انجمن کو حاصل ہوگا۔

(۲) انجمن کوئی نقد معاوضہ نہ دیگی۔ لیکن کتاب اپنے صرف سے طبع کردیگی

۵ - انجمن کے ارکان حسب ذیل ہونگے:-

(۱) سرپرست - امرا و رؤساے ملک جو انجمن کو یکمشت ایک ہزار روپیہ ماہانہ یا سالانہ معتدبہ امداد عطا فرمائیں گے وہ انجمن کے سرپرست کہلائینگے۔

(۲) ارکان دائمی - جو یکمشت پانچ سو روپیہ عنایت کریں گے وہ رکن دائمی (لائف ممبر) قرار پائیں گے۔

(۳) ارکان معمولی - جو صاحب کم از کم ایک روپیہ ماہانہ یعنی ۱۲ عہ سالانہ یا اس سے زائد چندہ دینگے وہ رکن معمولی ہوں گے۔

(۴) وہ نامور ارباب قلم و صاحبان علم و فن انجمن کے ارکانِ شوریٰ قرار دیے جائیں گے، جن کی خدمت میں انجمن کی طرف سے کوئی کتاب بغرض اظہار راے یا دیگر امور متعلقہ انجمن مشورۃً پیش کیے جائینگے اور وہ اُسپر اظہار راے اور مفید مشورہ دینے کی زحمت گوارا فرمائیں۔

۶ - انجمن کا دفتر اور حساب کتاب آنریری سکرٹری کے پاس رہے گا اور انجمن کے متعلق ہر قسم کی خط و کتابت سکرٹری سے کیجائیگی۔ آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاس میں سکرٹری سال بھر کی کارروائی و حسابات کے متعلق رپورٹ پیش کرے گا اور ایسی رپورٹ عام طور پر شائع کیجائیگی

۷ - انجمن کی جو شاخیں ملک کے مختلف مقامات میں قائم ہونگی اُن کے سکرٹری انجمن کے جنرل سکرٹری کے اسسٹنٹ سکرٹری ہونگے اور اپنے اپنے صوبجات اور مقامات میں اُسکے مشورے اور صوابدید سے کام کرینگے۔ ایسی انجمنیں یا شاخیں بھی اپنی اپنی ایک سالانہ رپورٹ تیار کرینگی۔

دستخط عماد الملک (سید حسین بلگرامی) دستخط عبد الحق

پریزیڈنٹ آنریری سکرٹری

کچھ شک نہیں کہ انجمن کے اغراض و مقاصد نہایت اہم و ضروری ہیں، اور ہم اُمید کرتے ہیں کہ جملہ ابناے ملک بہی خواہانِ اُردو ان مقاصد کو نہ صرف نظر استحسان دیکھیں گے بلکہ انکی تائید و تکمیل میں حتی المقدور سعی بلیغ اور امداد دلی فرمائیں گے۔

دوسرے مقصد کے تحت میں لکھا گیا ہے کہ "اگر انتظام ممکن ہو، اور انجمن کا سرمایہ مساعدت کرے تو اُردو زبان و ادب کے متعلق ایک ماہانہ رسالہ جاری کرنا" یہ درست ہے کہ ہر جماعت کو اپنے اغراض و مقاصد کے اظہار و اشاعت کے لیے اپنے ہی ایک رسالہ یا اخبار کی ضرورت لاحق ہوتی ہے، لیکن ہم اسکے خلاف ہیں کہ انجمن اپنا پرچہ جاری کرے۔ اخبار یا رسالہ اُسوقت جاری کرنا چاہیے جب انجمن اس سے زیادہ ضروری و اہم مراحل کامیابی کے ساتھ طے کرلے۔ خدا کے فضل سے ملک میں بکثرت اخبار و رسائل جاری ہیں، مناسب ہے کہ انھیں میں سے کسی کو انجمن اپنا آرگن بنالے۔ خود العصر بھی اس خدمت کی انجام دہی کے لیے تیار ہے۔

انجمن ترقی اُردو کی رپورٹ بابت ۱۹۰۳ء میں مولنا شبلی نے تحریر فرمایا تھا کہ "ابتدا میں ہندو صاحبوں کو بطور خود یہ خیال پیدا ہوا کہ ان کو انجمن کی شرکت سے علحدہ رکھا گیا ہے، چنانچہ ایک ہندو اخبار نے اسکا اظہار بھی کیا ....." ہم سمجھتے ہیں کہ اب بھی یہ خیال پیدا ہوسکتا ہے۔ چنانچہ ارکانِ شوریٰ کی فہرست ۴۴ اصحاب پر مشتمل ہے۔ ان میں سے صرف

ہ ہندو ہیں - حالانکہ ملک میں بہت سے ہندو ایسے موجود ہیں جو اُردو زبان سے متعلق کافی واقفیت، استعداد، اور دلچسپی رکھتے ہیں - زیادہ تعجب کی بات یہ ہی کہ ارکان شوریٰ کی فہرست میں ایک بھی لکھنوی ہندو کا نام نہیں - حالانکہ پنڈت برج نرائن صاحب چکبست بی اے، اور منشی جوالا پرشاد صاحب سکرٹری اودہ خیابانِ اور منشی مہاراج کشن صاحب قمر، اور منشی نوبت رائے صاحب نظر ہر طرح اسکے اہل تھے -

ایک اور غلطی بھی انجمن سے ہوئی ہی کہ ارکان شوریٰ میں کوئی ہندوستانی مسیحی نہیں لیا گیا - ہمارا نام اس میں ضرور ہی مگر اسکو مستثنیٰ سمجھنا چاہیے ہندوستانی مسیحیوں میں پادری واعظ جوئیل نال صاحب ایم اے دہلی، مسٹر جے - آر - رلے جرنلسٹ، لاہور، مسٹر سلیمان شکور نگار زونر (آپ اساتذۂ لکھنؤ میں مستند استاد مانے جاتے ہیں) مسٹر دانی ایل گارڈنر، میاں کنور پور چھاونی ضلع ایٹہ، ڈاکٹر ٹی - ویل صاحب لطیف اجمیری، پادری تاراچند صاحب دہلوی اجمیر (وغیرہ) ہندوستانی مسیحی جماعت میں اہل زبان کی سی قابلیت رکھتے ہیں - ہماری رائے میں کم از کم تین ہندوستانی مسیحی بھی ارکان شوریٰ بنائے جائیں تو نہایت مناسب ہوگا -

ارکانِ شوریٰ میں ۳۸ نام مسلمان حضرات کے ہیں - ان ۳۸ ممبروں میں بہت سے نام زینت فہرست کے سوا کسی مصرف کے نہیں - مناسب ہی کہ "کام کے آدمی" نظر انداز نہ کیے جائیں - کیونکہ نام سے کام نہیں ہوتا بلکہ کام سے نام ہوتا ہی!

ہم اُمید کرتے ہیں کہ انجمن ترقی اُردو ہماری اس جائز نکتہ چینی سے فائدہ اُٹھاکر ہندوستان کے ہر فریق سے قابل قدر اصحاب کے نام ارکانِ شوریٰ کی فہرست میں داخل کریگی، ورنہ اُسے اپنے مقصد میں کما حقہٗ کامیابی نہ ہو سکے گی -

---

انجمن تعلیم ابتدائی

گزشتہ پانچ سال میں مسئلۂ تعلیم پر جس قدر توجہ کی گئی، اور جو کوششیں اس بارے میں کی گئی ہیں، انکی مثال ابتدائی تعلیم کی تمام تاریخ میں بھی نہیں ملتی - بالخصوص آنریبل مسٹر گوکھلے کی کوششیں اس بارے میں خاص طور سے بارآور ہوئی ہیں، اور اب ابتدائی تعلیم کا مسئلہ اُن معدودے چند مسائل میں شمار کیا جاتا ہی جن پر قوم کی آیندہ زندگی کا انحصار ہی - اب ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ ابتدائی تعلیم کے لحاظ سے ہماری حالت نہایت شرمناک ہی - ہم یہ بھی جاننے لگے ہیں کہ اگر ہم کو اس قعر ذلت سے نکلنا منظور ہی تو نہایت اہم مشکلات کا سامنا کرنا پڑیگا - لیکن اسی کے ساتھ ہم مایوس ہوکر ہمت نہیں ہارتے، بلکہ مسئلہ کی اہمیت اور اپنے فرائض کی ذمہ داری ہم میں وہ جوش و ولولہ پیدا کرتی ہی، جسکے روبرو ہر قسم کی مشکلات کے خوف بیجا معلوم ہوتے ہیں - گورنمنٹ بھی اپنی ذمہ داری کو اب، بہ نسبت سابق، زیادہ محسوس کرتی ہی اور قدم بڑھانے کا ارادہ رکھتی ہی - اگر ہم دیدۂ بصیرت سے دیکھیں تو اکثر ایسے آثار نظر آئینگے جن سے قوی اُمید پیدا ہوتی ہی کہ آیندہ پانچ سال کا زمانہ ابتدائی تعلیم کے حق میں ایک نہایت مبارک زمانہ ہوگا، جس میں نمایاں ترقی ہوگی اور ہمارے قدم آگے بڑھتے نظر آئینگے - نواب لفٹنٹ گورنر بہادر صوبجات متحدہ نے اُس رزولیوشن میں جس میں ایلمنٹری ایجوکیشن کمیٹی کے تقرر کا اعلان ہوا تھا اُمید ظاہر کی تھی کہ

> اگر صوبجات متحدہ کی مالی حالت کو کسی خاص آفت سماوی کا سامنا نہ کرنا پڑا تو یہ ممکن ہوسکے گا کہ آیندہ پانچ سال بعد ابتدائی تعلیم پر گورنمنٹ پینتیس لاکھ روپیہ سالانہ زائد صرف کر سکے، اور اس طور سے ابتدائی مدارس کے طلبا میں تین یا ساڑھے تین لاکھ کا اور اضافہ ہوسکے -

یہ سب باتیں نہایت ہمت افزا ہیں - لیکن اسکے ساتھ یہ امر بھی یاد رکھنے کے قابل ہی کہ ان کوششوں کا بہت کچھ حصہ جو گورنمنٹ اب ظاہر کر رہی ہی، اُن کوششوں کا نتیجہ ہی جو رعایا کی جانب سے کانگرس، کانفرنسوں اور کونسلوں میں کی گئی ہیں، اور جنکو اخبارات نے اپنے زور قلم سے تقویت بخشی ہی - پس اگر ہم گورنمنٹ کی پالیسی کی تبدیلی سے پورا فائدہ اُٹھانا چاہتے ہیں، اور ہماری یہ خواہش ہی کہ ابتدائی تعلیم جلد لازمی و مفت کر دی جائے تو ہمارا فرض ہی کہ ہم ہمیشہ مستعد رہیں اور اس مسئلہ کو کبھی نظرانداز نہ ہونے دیں -

حال میں ایک ایلمنٹری ایجوکیشن لیگ الہ آباد میں، قائم ہوئی ہی جو ان

صوبجات کی تعلیمی ترقی میں بدل وجان کوشش کریگی۔ اس لیگ کے اغراض ومقاصد حسب ذیل ہیں :-

(۱) ابتدائی تعلیم کے مفت ولازمی کیے جانے کے خیال کو عوام الناس میں بذریعہ مضامین لکچرد کانفرنس وقتاً فوقتاً اشاعت دینا۔

(۲) ابتدائی تعلیم کے مفت ولازمی کیے جانے کے مسئلہ پر بذریعہ عرضداشت وغیرہ گورنمنٹ کو توجہ دلانا۔

(۳) ایسے ابتدائی درجہ کے مدرسے کھلوانے کی کوشش کرنا جن میں غربا کے لڑکوں کو مفت تعلیم دی جا سکے اور اُن ابتدائی درجہ کے مدرسوں کی حالت کو سنبھالنا جو ردی حالت میں ہیں۔

لیگ کی کوشش ہمیشہ یہ ہوگی کہ وہ سب فرقوں اور سب مذہبوں کے لوگوں کی ہمدردی اپنے کام کے ساتھ وابستہ کر سکے اور بلا لحاظ مذہب وملت سب کی بھلائی کی کوشش کرے۔ البتہ اگر ممکن ہو تو غریب اور نیچ قوموں کی تعلیم کی طرف زیادہ توجہ کرے۔ یہ امر کہ لیگ کے مدرسوں میں کون سی زبان میں تعلیم دی جائے، اُن لوگوں کی مرضی پر چھوڑ دیا جائے گا جو مدرسہ کے قرب وجوار کے باشندے ہوں۔ حتی الامکان یہ کوشش کی جائیگی کہ اُردو ہندی دونوں زبانیں ہر مدرسہ میں پڑھائی جائیں۔

پراونشیل لیگ میں عنقریب تمام اضلاع کے ممبر شریک ہونگے اور اُسکے اغراض ومقاصد کے انجام دینے کے لیے ایک انتظامی کمیٹی مع عہدہ داران کے منتخب کیجائے گی اور لیگ کا صدر دفتر الہ آباد میں ہوگا۔ لیگ اس امر کی کوشش کریگی کہ اپنی شاخیں رفتہ رفتہ عنقریب تمام اضلاع میں کھولے جو اس کے زیر نگرانی کام کریں۔ لیکن پراونشیل لیگ خود مدرسے کھولنے کی ذمہ داری اپنے سر نہ لیگی۔ بلکہ یہ کام شاخوں کے سپرد ہوگا کہ جہاں ممکن ہو اور شاخیں ذمہ داری لینے کے لیے تیار ہوں وہاں مدرسے کھولے جائیں۔ پراونشل لیگ اپنے سکرٹری اور دیگر عہدہ داروں اور کام کرنے والوں کے ذریعہ سے شاخوں کو اس امر میں مدد دیگی کہ وہ اپنے اپنے اضلاع میں کمیٹیاں قائم کر سکیں، اور مدرسے کھول سکیں، لیکن مدرسوں کے لیے سرمایہ بہم پہنچانے اور اُنکی نگرانی کرنے کی ذمہ داری اُنھیں اضلاع کی کمیٹیوں اور شاخوں پر واجب ہوگی، مُلکی معاملات کے لحاظ سے اِن صوبجات کی جو کیفیت ہے وہ ظاہر ہے۔ یہاں کی آب وہوا قومی انجمنوں کی سرسبزی وشادابی کے لیے کچھ بہت زیادہ موافق نہیں ہے۔ پس اس امر کو ملحوظ خاطر رکھکر یہ امید کرنا کہ لیگ کے قائم ہوتے ہی کوئی خاص عجیب وغریب ترقی نمایاں ہوگی، امید موہوم ہے۔ لیگ اس امر کی ذمہ داری نہیں لیتی کہ وہ کسی بڑے پیمانہ پر عوام الناس کی تعلیم کا انتظام کریگی۔ لیکن ہم اس امر کی اُمید ضرور کرتے ہیں کہ موجودہ حالت میں ابتدائی تعلیم کے مسئلہ کو لیگ کے قائم ہونے سے خاص تقویت ہوگی اور بہت کچھ فائدہ پہنچے گا۔ علاوہ بریں یہ بھی اغلب ہے کہ لیگ کے ذریعہ سے اہل اسلام واہل ہنود پالیٹکس کے دنگل سے باہر نکل کر ان متفقہ اغراض ومقاصد کے حاصل کرنے کے لیے ایک دوسرے سے بغلگیر ہو سکیں گے اور بہت سی غلط فہمیاں دور ہو سکیں گی۔ بلا شبہہ یہ کام مشکل ہے اور بہت سی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑیگا۔ لیکن اگر ہم اپنی دُھن کے پکے ہیں، اگر ہمارے ارادوں وعقائد میں استقلال موجود ہے اگر ہم ایثار نفس کے لیے تیار ہیں تو کچھ شبہہ نہیں کہ ہمکو کامیابی ہوگی اور ہمارا صوبہ تعلیمی معاملات میں سب سے پیچھے نہیں رہے گا۔

مذکورۂ بالا تحریر چند نہایت ممتاز ہندو مسلمانوں کے دستخطوں سے شائع کیگئی تھی اور ۲۔ اگست انعقاد جلسۂ لیگ کی تاریخ قرار پائی تھی۔ اس جلسہ کو جیسی کچھ کامیابی ہوئی وہ نہایت حوصلہ افزا اور اُمید دلانیوالی ہے۔ ہر فرقہ اور ہر مذہب کے لوگ اس میں موجود تھے۔ پہلا رزولیوشن ڈاکٹر تیج بہادر سپرو نے پیش کیا اور دیگر صاحبوں نے اُسکی تائید کی۔ رزولیوشن حسب ذیل تھا۔

یہ جلسہ عوام الناس کے لیے ابتدائی تعلیم کو نہایت ضروری ولازمی سمجھتا ہے اور طے کرتا ہے کہ ان صوبجات کے لیے ایک ایلیمنٹری ایجوکیشن لیگ قائم کیجائے جس کے اغراض یہ ہوں۔ (۱) ابتدائی تعلیم کی اشاعت میں کوشش کرنا

جہاں مدرسے نہوں وہاں نئے مدرسے قائم کرانا جن میں تعلیم جہاں تک ممکن ہو مفت دیجائے اور جو مدرسے ردی حالت میں ہوں اُنکی حالت سنبھالنا (۲) لازمی اور مفت تعلیم کے مسئلہ پر بذریعہ لکچر و مضامین و کانفرنس وغیرہ لوگوں کو توجہ دلانا (۳) مفت و لازمی تعلیم کے مسئلہ پر گورنمنٹ کی توجہ مبذول کرانا۔

دوسرا رزولیوشن لیگ کے ممبروں اور انتظامی کمیٹی و عہدہ داروں کے انتخاب کے باب میں تھا۔ قریب سو اصحاب شریک لیگ ہوے ہیں، جن میں الہ آباد، لکھنؤ، کانپور، بنارس، فیض آباد، بریلی، گورکھپور، علیگڈھ، اور دیگر اضلاع کے حضرات شامل ہیں۔ آنریبل پنڈت موتی لال نہرو صاحب لیگ کے پریسیڈنٹ منتخب ہوے ہیں، اور آنریبل راجہ سر محمد علی محمد خاں صاحب بہادر کے سی آئی ای وائس پریسیڈنٹ۔ علاوہ آپ کے آنریبل پنڈت مدن موہن مالوی، پنڈت بشن نرائن در، رائے بہادر بابو گنگا پرشاد ورما، اور ڈاکٹر ستیش چندر بنرجی صاحب بھی وائس پریسیڈنٹ منتخب کیے گئے ہیں، اور لیگ کے سکرٹری پنڈت ہردے ناتھ کنزرو قرار پائے ہیں۔

لیگ کی ممبری کی درخواست و زرچندہ اور دیگر خط و کتابت بنام آنریری سکرٹری الیمنٹری ایجوکیشن لیگ ملا جنک روڈ، الہ آباد آنی چاہیے۔

مذکورۂ بالا تحریر سے ظاہر ہو کہ جو اصول لیگ نے ظاہر کیے ہیں، ان میں صاف طور پر اس بات کی خواہش کی گئی ہو کہ ہندو مسلمان، دونوں قومیں، مل کر اس باب میں کوشش کریں اور ابتدائی تعلیم کے دائرہ کو وسیع کرنے میں متفقہ کوشش سے کام لیں۔ یہ ابتدائی تعلیم کے لازمی اور مفت ہونے کی پہلی منزل ہو۔ آنریبل مسٹر گوکھلے نے ابتدائی تعلیم کے لازمی اور مفت ہونے کا جو مسودہ کونسل میں پیش کیا تھا، اگرچہ وہ نامنظور کر دیا گیا، مگر آیندہ وہ وقت بھی ضرور آے گا جس میں مسودۂ مذکور دوبارہ پیش ہو کر پوری قوت کے ساتھ پاس ہوگا۔ اُس وقت سے پہلے اہل ملک کا فرض ہو کہ وہ اپنے دست و بازو پر بھروسا کریں اور ابتدائی تعلیم کے دائرہ کو وسیع کرنے کی غرض سے ہر صوبہ میں متفقہ کوشش سے کثیر التعداد اسکول کھولیں، اور جن امور میں اُنکے درمیان اختلاف راے ہو اُسکا فیصلہ آپس میں کر کے، اس عمدہ تحریک کو ترقی دیں اور اپنے طرز عمل سے ثابت کر دیں کہ وہ اس میدان میں دوش بدوش رہکر چلنے کے لیے تیار ہیں، اور ایک دوسرے کے حقوق کی عزت کرتے ہیں۔

دیسی زبانوں سے ہماری غفلت

اگر ہماری تعلیمی درسگاہوں میں تہذیب و تربیت کے حصول کا ذریعہ دیسی زبانیں قرار دی جائیں تو یہ فعل سب سے زیادہ فائدہ رساں، معقول اور اقتضاے فطرت کے موافق ہوگا۔ لیکن مشکل یہ ہو کہ ہم ان زبانوں کو پسند نہیں کرتے، اور یہ غلط اندازہ ہمارے ذہن نشین ہو گیا ہو کہ اگر ہونہار طلباء کی تعلیم میں دیسی زبانیں استعمال کیجائیں گی تو تباہ کن نتائج پیدا ہوں گے۔ فی الحقیقت ہندوستانی طلباء کی قسمت بہت ہی زبوں ہو، اور غضب یہ ہو کہ اسے زبوں تر بنانے کی کوشش کا سلسلہ برابر جاری ہو۔ ہندوستان کے تعلیم یافتوں کی اوسط عمر ماہرین فن کے تخمینہ کے بموجب ۳۵ سال سے زیادہ نہیں ہو۔ اسپر بھی اس چند روزہ زندگی کا بیشتر حصہ ایک نہایت مشکل اجنبی زبان، انگریزی، کی تحصیل و تکمیل میں صرف ہو جاتا ہو۔ طلباء کی تمام اعلی قوتیں انگریزی کے ہجا، صرف و نحو اور ادبیات کے مطالعہ میں صرف ہو جاتی ہیں، جن میں سے اول الذکر دونوں محض خیالی اور نہایت عسیر الحصول ہیں، اور موخر الذکر بھی موجب پریشانی ہو۔ ہندوستانی طلباء کو صرف انگریزی میں کمال حاصل کرنے کے لیے اپنے گراں قدر ایام عمر میں سے بارہ سال کا زمانہ درکار ہوتا ہو، اور اسطرح سائنس وغیرہ کی نہایت ضروری نظری و عملی شاخوں کے مطالعہ کے لیے جو وقت باقی رہتا ہو وہ بہت ہی ناکافی ہوتا ہو۔ نتیجہ یہ ہوتا ہو کہ دیسی زبانوں کے ادبیات و علوم و فنون کے حصول کا کسی کو خیال ہی نہیں رہتا۔

"ویدک میگزین" کا یہ خیال بالکل صحیح ہو کہ ہماری ہندوستانی یونیورسٹیاں انگریزی زبان سے محبت کے باب میں لارڈ میکالے سے بھی بڑھ گئی ہیں۔ لارڈ موصوف کو ہندوستانی ادبیات اور علوم و فنون سے بالکل محبت نہ تھی اور

علیٰ ہذا القیاس ان یونیورسٹیوں کو بھی صرف انگریزی سے محبت ہے۔ اسکی وجہ غالباً وہ غلط خیال ہے جو ہماری بدقسمتی سے ان لوگوں کے دماغوں میں جاگزیں ہوگیا ہے کہ ہندوستانی طلباء صرف انگریزی پڑھنے کے لیے پیدا ہوے ہیں، اور انکی زندگی کا منتہاے خیال محض تعلیم انگریزی ہے۔ چنانچہ اسی بنا پر وہ ہر سال انگریزی کے بڑے بڑے مشکل نصاب مقرر کرتی ہیں اور اسی پر اکتفا نہیں بلکہ روز بروز اس بوجھ کو اور بھی وزنی کرنے کی فکر اُنھیں ہر وقت لگی رہتی ہے۔ ہر سال وہ اس قدر کتابیں منظور کرتی ہیں اور اتنے زائد از ضرورت مضامین مقرر کرتی ہیں جو ایک سال کی میعاد کے لحاظ سے نہ صرف نامناسب ہی ہیں بلکہ طلباء کی پریشانی کی موجب ہیں اور اس کا نتیجہ صریح یہ ہے کہ طلباء کی استعداد میں ترقی مسدود ہوتی جاتی ہے لیکن اسپر بھی انھیں اصرار ہے کہ انگریزی کے ناگوار اور تکلیف دہ نصاب میں چند اور کتابوں کا اضافہ طلبا کے لیے اچھے نتائج پیدا کرنے کا موجب ہوگا۔ یہ اُمید کس قدر غلط اور خلافِ واقع ہے!

لیکن ہمیں اس امر کے فوائد و نقصانات پر ٹھنڈے دل سے غور کرنا چاہیے کہ ہم اس بارِ گراں کو کس طرح ہلکا کر سکتے ہیں، اور ہمارے سابقہ علوم و فنون میں سے کون سا قابلِ حفاظت سرمایہ ہے جس کی حفاظت کرنے پر اب ہم بھی قادر ہیں۔ بقول ہمعصر وکیل اگر اس مہلک مرض کا دفعیہ مقصود ہے تو ہندوستانی نوجوانوں کو اپنی دیسی زبانوں میں تعلیم دینا ضروری ہے، اور اسکے ساتھ ہی کارآمد انگریزی علوم بھی اُنھیں اس قدر پڑھانا چاہیے جو عملی اور صحیح طریقوں سے چند مہینوں میں حاصل ہوسکتے ہیں۔ ہمیں یہ کام اس طریق سے فوراً شروع کر دینا چاہیے کہ ہم دیسی زبانوں سے پھر ایسا ہی فائدہ اُٹھانا شروع کر دیں جیسا کہ ان سے اُٹھانا چاہیے۔ ہمیں اپنے اسکولوں میں، کالجوں میں، غرض کہ ہر حالت میں انھیں حق کی جگہ دینا چاہیے۔ اور سب سے پہلے ہائی اسکولوں میں انھیں ذریعۂ تعلیم مقرر کرنا چاہیے۔ اگر ہم سے ہو سکے تو یہ کام ایسا ہے جو بغیر کسی توقف کے انجام پا سکتا ہے۔ انٹرنس کا نصاب اس وقت بھی دیسی زبانوں میں پڑھایا جا سکتا ہے۔ ایف۔ اے کا نصاب ایک ہی سال میں دیسی زبانوں میں تیار ہوسکتا ہے۔ ہمارا یقین ہے کہ اگر کوشش کیجائے تو بی۔ اے۔ کا کورس بھی زیادہ سے زیادہ دو سال تک تیار ہوسکتا ہے۔ صرف مستقل ارادہ اور اپنی دیسی زبانوں کی سچی محبت درکار ہے۔

ہماری راے میں اُردو زبان کی روز افزوں ترقی اور ہر دلعزیزی اس بات کی کافی ضمانت ہے کہ ہم اسکے ذریعہ سے ہر قسم کے کورس تیار کرنے پر قادر ہوسکتے ہیں۔ علمی مصطلحات کی کمی بے شک ایک بہت بڑی رُکاوٹ ہے لیکن اس رُکاوٹ کو بہت جلد رفع کیا جا سکتا ہے۔ انجمن ترقی اُردو اپنے مقاصد کے لحاظ سے اصطلاحات کا لغت تیار کر سکتی ہے اور اُس لغت سے انگریزی اور دوسری زبانوں کے علوم و فنون اور نصاب تعلیم کی کتابوں کے تراجم اُردو زبانوں میں شائع کیے جا سکتے ہیں اس سے جو فوائد عظیم ملک کی موجودہ اور آیندہ نسلوں کو حاصل ہوں گے انکو مبالغہ کے ساتھ بیان کرنا ناممکن ہے۔

رسالۂ اَدیبؔ الہ آباد

الہ آباد کا نامور رسالہ اَدیبؔ، جو اپنی ظاہری اور معنوی خوبیوں کے لحاظ سے دنیاے ادب میں چوٹی کا رسالہ سمجھا جاتا تھا اور جس کے علمی و لٹریری کارنامے مدت تک اربابِ ذوق نہیں بھول سکتے، افسوس ہے کہ جولائی سنہ ۱۹۱۳ء سے بند ہوگیا اور تشنہ کامانِ ادب کو اپنی یاد میں لذت کش حسرت چھوڑ گیا۔ اسکے بند ہو جانے کا افسوس گو تمام ہی خواہانِ اُردو کو ہے، لیکن جو صدمہ ہکو یا حضرت نظرؔ لکھنوی کو محسوس ہوسکتا ہے، وہ اور ہی ہے۔ اصل یہ ہے کہ اُردو میں صرف اَدیبؔ ہی پہلا رسالہ تھا جو یورپ اور مصر و قسطنطنیہ کے زریں رسائل کے مقابلہ میں فخریہ پیش کیا جا سکتا تھا۔ اُسنے ظاہر کر دیا تھا کہ نفاست طبع اور مذاقِ سلیم کا احساس ابھی ہندوستان کے افراد سے مفقود نہیں ہوا ہے۔ اس گلشنِ ادب کی آبیاری کا فخرِ اولیں جنابِ نظرؔ کو حاصل رہا۔ موصوف نے ایک برس چار ماہ اُسکو ایڈٹ کیا۔ انکے بعد ہم ایک برس آٹھ ماہ تک اپنی امکانی کوشش سے اُسکی خدمت کرتے رہے۔ ہمارے بعد میر حسیر چھ ماہ اَدیبؔ کی خدمتگزاری اور اپنے فرائضِ ایڈیٹری کی ادائی میں مصروف رہے، لیکن افسوس ہے کہ اس

تیسرے دور کا مستقبل جس قدر شاندار بتایا گیا تھا اُسی قدر نامبارک ثابت ہوا۔ اَدیب کو دیگر اُردو رسائل کی طرح عام ناقدردانی کی شکایت کبھی نہیں ہوئی بلکہ پبلک نے جس فراخ دلی سے اَدیب کی قدرافزائی فرمائی اُتنی کسی دوسرے رسالہ کو مشکل سے حاصل ہو سکتی ہے۔ ہمارے زمانہ میں وہ پندرہ سو چھپتا تھا اور تقریباً تیرہ سو اُسکے خریدار تھے۔ ہمعصر ہندو (لاہور) کا یہ قیاس بالکل خلاف واقع ہے کہ "اَدیب کو مالی مشکلات یا خسارہ نے اِس ناخوشگوار انجام کے لیے تیار و آمادہ کیا۔" اور یہ الزام بھی ہمعصر موصوف کا نہایت بیجا اور غلط ہے کہ "ملک کے بہترین رسالے اُردو داں پبلک کی لٹریری بدمذاقی اور ناقدردانی کے سبب بموت مر رہے ہیں اور جو زندہ ہیں وہ بھی کچھ بہت اطمینان بخش حالت میں نہیں ہیں ..... الخ۔" اِس کے بند ہو جانے کے سبب اُردو پبلک کی ناقدردانی اور بدمذاقی ہرگز نہیں ہے، بلکہ وہ اسباب اور ہی ہیں، جن کا اظہار یہاں کچھ بے ضرورت اور غیر مفید معلوم ہوتا ہے۔

ہمعصر ہندو نے یہ بھی لکھا ہے کہ اَدیب نے ساڑھے سات سال اُردو کی خدمات انجام دیں۔ خوب! اَدیب کے بند ہو جانے سے زیادہ ہمیں ایسے اخبار نویس حضرات پر افسوس آتا ہے جن کے معلومات اس قدر کوتاہ اور خیالات اس قدر پست ہیں کہ وہ سیاسی اور اقتصادی معاملات تو کجا ایک معمولی واقعہ کے متعلق بھی صحیح معلومات ہم نہیں پہنچا سکتے۔

یادش بخیر اَدیب پر دو آنسو بہاتے ہوے ہمعصر "آگرہ اخبار" نے العصر کا بھی ذکر کیا ہے، لیکن نامبارک الفاظ میں اور بُری پیشین گوئی کے ساتھ۔ ہم اسکو بھی غنیمت سمجھتے ہیں ع

ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اُس محفل میں ہے

لیکن ہم صرف اس قدر التماس کی جرأت کرتے ہیں کہ وہ بھی ہندو کی طرح رائے قائم کرنے میں اس قدر عجلت سے کام نہ لیا کریں، اور قیاسی شبدیز کی جولانی دکھاتے ہوے مستقبل کے واقعات کو حال یا گزشتہ سے مشابہ نہ مان لیا کریں۔ ممکن ہے کہ لفا کم بدہن، العصر کا بھی وہی حشر ہو جو اَدیب کا ہوا، مگر ایسی پیشین گوئی بدشگونی میں داخل ہے، اور جب بھی خواہان اُردو العصر کی ضرورت محسوس کرتے ہیں تو اُنکو ایسے الفاظ سے ہمارا حوصلہ پست نہ کرنا چاہیے، بلکہ اُنکا فرض ہے کہ اب پہلے سے زیادہ خود کوشش کریں اور ہمارا حوصلہ بڑھائیں تاکہ العصر پورے طور پر اَدیب کا قائم مقام ہو سکے۔ گو ہمارے خیالات کی جولان گاہ اُس سے بھی بہت وسیع ہے۔

مہاراجہ کشن پرشاد بہادر بالقابہم

دولت کے ساتھ علم و لیاقت اور اقبال و حشم کے ساتھ سادہ مزاجی بہت مشکل سے جمع ہو سکتی ہیں، اور جس میں جمع ہو جائیں حقیقۃً وہ ذات نہایت قابل قدر اور مغتنم زمانہ ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ مہاراجہ بہادر سر راجہ کشن پرشاد بالقابہم میں یہ سب باتیں موجود ہیں۔ پبلک موصوف کو صرف اسی حیثیت سے نہیں جانتی کہ وہ ہندوستان کی سب سے بڑی ریاست حیدرآباد کے سابق وزیر اعظم اور اب پیشکار ہیں، بلکہ علمی طبقوں میں اُنکا مرتبہ نہایت بلند ہے۔ فن شاعری میں آپ کی قوت تخیلہ زمانہ کو اپنے جوہر دکھا چکی ہے۔ آپکا لٹریری مذاق نہایت سُتھرا ہے۔ اُردو و فارسی کے علاوہ انگریزی اور عربی میں بھی اعلیٰ درجہ کی دستگاہ رکھتے ہیں۔ اُردو زبان میں آپ کی کئی نادر تصنیفات شائع ہو چکی ہیں، اور آپ کا کلام جس سے ناظرین العصر بھی بہرہ اندوز ہوتے رہتے ہیں، حُسن تخیّل کا اعلیٰ نمونہ ہوتا ہے۔ نثر بھی خوب لکھتے ہیں۔ فنِ ناول نویسی میں بھی کافی مہارت ہے چنانچہ فسانۂ شیدا کے نام سے ایک ناول شائع ہو چکا ہے جس کی زبان نہایت پاکیزہ ہے۔ مزاج میں صوفیت اور سادگی بھی بدرجۂ اتم موجود ہے، جو باکمالی اور حقیقی دولت مندی و غنا کی سچی علامت ہے۔ رفاہِ عام کے کاموں میں آپ بلاتفریق مذہب پوری دلچسپی لیتے ہیں۔ آپکی علم دوستی اور روشن خیالی اور بے نیازی تعارف و تعریف کی محتاج نہیں رہی۔ ملک کی خوش نصیبی سے حال میں آپ کے ایک طولانی سفر اور سفر میں جود و کرم اور حق شناسی نے ثابت کر دیا کہ ہماری وہ ثنا جو اس تحریر کا حصۂ زرّیں سمجھی جا سکتی ہے، محض خوشامد یا ذاتی اغراض پر مبنی نہیں ہے۔ پنجاب میں آپ نے رفاہِ عام کے لیے بہت کچھ مالی امداد فرمائی، اور جابجا ہندو مسلمانوں کو برابر تقسیم زر و دولت

سے سرفراز فرمایا۔ دفتر اہلِ حدیث (امرت سر) میں بذاتِ خاص تشریف لے جاکر
اُسے عزت بخشی۔ الہٰ آباد میں "عشرت منزل" کی بنے قدوم میمنت لزوم سے عزت
افزائی فرمائی۔ اور بھی بہت سی مخلوق کو فائدہ پہنچایا، جس کی آپ کی ذات سے
بجا طور پر اُمید کی جا سکتی تھی۔ سچ یہ ہے کہ دنیا میں اس وضع اور خیال کے
لوگ بہت کم ہوتے ہیں۔ وہ ملک نہایت خوش نصیب ہے جہاں آپ ایسے محترم افراد
کا وجود پایا جائے، اور وہ لوگ نہایت بلند اختر ہیں جن پر آپ ایسے عظیم الشان اور
عظیم القدر بزرگوں کا سایہ ہو۔ ہماری دلی دعا ہے کہ یہ سفر آپ کی ذات اور رعایا
دونوں کے لیے مبارک و مسعود ثابت ہو!

ڈاکٹر گھوش کا گرانمایہ عطیہ

ہندوستان میں تعلیم سائنس کا ایسا معقول انتظام نہیں ہے جیسا ممالک
یورپ و امریکہ میں ہے۔ ڈاکٹر بوس کے سوا ہندوستان نے کوئی اور ایسا ماہر سائنس
پیدا نہیں کیا جس کی شہرت کا ہنگامہ چار دانگ عالم میں پھیل گیا ہو۔ وہ ایجادات
جن کی بدولت طرح طرح کی سہولتیں حاصل ہوتی ہیں؛ جن کے ذریعہ سے ہماری زندگی
کی ضروریات جلد اور ارزاں مہیا ہو سکتی ہیں؛ جنکی وجہ سے ہمارے کاروبار میں بہت
آسانی اور سہولت پیدا ہوتی ہے؛ جو ہماری بہت سی تکلیفات اور دقتوں کو رفع کرنے
کا باعث ہوتی ہیں، انکا خیال کچھ امریکہ اور یورپ والوں ہی کے دل و دماغ میں
پیدا ہوتا ہے جن سے بعد کو ساری دنیا فیضیاب ہوتی ہے۔ وہ کون سی طاقت ہے
جسے ماہرین سائنس نے اپنے قابو میں نہیں کر لیا۔ وہ طاقتیں جو کسی زمانہ میں معبود
قرار پائی تھیں اور جن کو خوش کرنے کے لیے طرح طرح کی قربانیاں کیجاتی تھیں وہی
آج ہمارے سامنے سرِ تسلیم خم کیے ہوے ہیں اور بلا چون و چرا ہمارے احکام بجالاتی
ہیں۔ اسکی وجہ جانتے ہو؟ ذرا دنیا کے سب سے بڑے زندہ جادوگر (اڈیسن)
کو دیکھو کہ وہ کیونکر اپنی ایجادات سے دنیا کو محوِ حیرت بنا رہا ہے۔ یہ سب سائنس کی
برکت سے ہے۔ جن ممالک میں سائنس کا دَور دورہ ہے وہیں صنعت و حرفت کی ترقی
ہوتی ہے۔ سائنس ایک ایسی "دیوی" ہے جو ایک بڑی قربانی کے بغیر خوش نہیں
ہوتی جب تک آدمی اُسی کا ہو کر نہ رہے اور اُسکے لیے سب کچھ قربان نہ کر دے،
اُسوقت تک وہ کوئی "وَر" نہیں دیتی۔ کاش ہندوستان میں بھی اس دیوی کے
اُپاسک (عبادت گزار) پیدا ہوں۔

ہمارے یہاں کیوں ماہر سائنس پیدا نہیں ہوتے؟ اسکی سب سے بڑی وجہ یہ ہے
کہ یہاں وہ سامان اور ذرائع موجود نہیں ہیں۔ نہ تو یہاں اُس قسم کی اعلیٰ
درس گاہیں پائی جاتی ہیں، اور نہ ویسے قابل اور فخرِ روزگار اُستاد میسر ہو سکتے
ہیں۔ افلاس اور فلاکت کی وجہ سے ہمارے مُلکی نوجوانوں کو ڈگری لینے کے بعد
ہی فکرِ معاش دامن گیر ہو جاتی ہے، اور یوں انکی علمی ترقی جاری نہیں رہتی۔
یہاں ہونہار طلبا کو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے بہت کم وظائف ملتے ہیں
یعنی ایسی معقول امداد نہیں دی جاتی جس سے اُنھیں علمی مشاغل میں اپنی زندگی
صرف کرنے کا شوق پیدا ہو۔ ایک اور وجہ یہ بھی ہے کہ ہندوستان میں اکتساب
علم کا وہ شوق ابھی پیدا نہیں ہوا جو شائستہ ممالک میں نظر آتا ہے۔ لیکن اگر یہاں
بھی تعلیم سائنس کے لیے اعلیٰ درس گاہیں قائم کیجائیں تو بلاشبہہ ہمارے یہاں
بھی یہ شوق پیدا ہو سکتا ہے۔

ہمیں ہندوستان کے مشہور وکیل اور بنگال کے نامور لیڈر، ڈاکٹر راش
بہاری گھوش، کا ممنونِ احسان ہونا چاہیے جنھوں نے حال ہی میں دس لاکھ
کا گراں مایہ عطیہ کلکتہ یونیورسٹی کو اس غرض سے نذر کیا ہے کہ اس سے ہندوستان
میں اعلیٰ تعلیم سائنس کی اشاعت کیجائے۔ سر تارک ناتھ پالت نے بھی، کچھ عرصہ
ہوا، اسی غرض سے ایک بڑی رقم کلکتہ یونیورسٹی کے سپرد کی تھی۔ ڈاکٹر راش
بہاری گھوش، نے چند شرائط بھی قرار دی ہیں جنہیں قابلِ ذکر یہ ہیں: ـ

۱۔ مضامین ذیل کی تعلیم دینے کی غرض سے چار یونیورسٹی پروفیسر شپ
قائم کی جائیں۔

(۱) اعلیٰ علمِ ریاضی

(۲) فزکس یعنی علم طبعیات

(۳) علم کیمیا

(۴) علم نباتات (خصوصاً شعبۂ زراعت سے متعلق)

۲- پروفیسر ہمیشہ ہندوستانی اصحاب مقرر کیے جائیں -

۳- ہر پروفیسر کو چھ ہزار روپیہ سالانہ کے قریب شاہرہ دیا جائے لیکن سینٹ کو یہ اختیار ہوگا کہ یونیورسٹی یا کسی دوسرے سرمایہ سے اس شاہرہ میں وقتاً فوقتاً اضافہ کرے -

۴- ان پروفیسروں کی نامزدگی ایک بورڈ کے متعلق ہوگی لیکن تقرر سینٹ کے اختیار میں ہوگا - سینٹ کو یہ اختیار بھی ہوگا کہ کسی پروفیسر کو کم از کم ایک سال اور زیادہ سے زیادہ دو سال کے لیے خاص تجربہ یا تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے یورپ، امریکہ، یا جاپان جانے کی ہدایت کرے - اس صورت میں پروفیسر مذکور کو خاص وظیفہ دیا جائیگا -

۵- ہر پروفیسر کا یہ فرض ہوگا کہ وہ اپنے خاص مضمون میں نئی تحقیقات کرنے میں مصروف رہے اور طلباء میں بھی اس قسم کا شوق پیدا کرے اور اس باب میں اُنھیں ہدایت دے -

۶- آٹھ وظائف قائم کیے جائیں اور ہر ایک وظیفہ نو سو روپے کا ہو - بورڈ کی سفارش پر یہ وظیفے ایسے ہونہار گریجوئٹوں کو دیے جائیں جنھوں نے علم ادب یا سائنس میں ایم - اے - کی ڈگری حاصل کی ہو - ہر پروفیسر دو طالبعلموں کی نگرانی اپنے ذمہ لے - ایسے طالب علم کا یہ فرض ہوگا کہ وہ اپنا تمام وقت کسی خاص شعبۂ علم کی تازہ تحقیقات میں صرف کرے -

۷- بورڈ کی سفارش پر سینٹ لیبوریٹری، عجائب خانہ، اور دیگر ضروری آلات و سامان کا انتظام کریگی -

۸- حسب ذیل اصحاب بورڈ کے ممبر ہوں گے :-

(۱) کلکتہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر

(۲) ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیم

(۳) یونیورسٹی کے فیکلٹی آف سائنس کے ڈین

(۴) انجینرنگ فیکلٹی کے ڈین

(۵) وہ چار پروفیسر جنکے تقرر کا ذکر اوپر ہوچکا ہی

(۶) یونیورسٹی کے ایسے چار ممبر جنکو سینٹ نامزد کرے گی

(۷) اس فنڈ کے قائم کرنیوالے کی طرف سے تین ممبر نامزد ہونگے - یعنے (۱) سر آسوتوش مکرجی (۲) پروفیسر رائے (۳) بابو ہمندر و ناتھ رائے - ان تین ممبروں کو اپنے جانشین مقرر کرنے کا اختیار حاصل ہوگا اور یہی اختیار اُن کے جانشینوں کو بھی حاصل رہے گا -

یہ ہے اُس اسکیم کی مختصر کیفیت جو ڈاکٹر گھوش نے تیار فرمائی ہے - ہماری دلی دعا ہے کہ خدا اُنھیں تا دیر زندہ و سلامت رکھے - تاکہ وہ اپنی آنکھوں سے اس کا کوئی عملی نتیجہ دیکھ سکیں -

حکیم سقراط

سقراط کا درجہ تاریخ میں

تاریخِ عالم میں بالعموم اور قدیم تاریخِ یونان میں بالخصوص جو بلند مرتبہ سقراط کو حاصل ہے، وہ محتاجِ تشریح نہیں۔ حکمائے یونان میں اس کا نام سب سے زیادہ مشہور ہے لیکن اُس کی اس شہرت کا یہ سبب نہیں ہے کہ دیگر حکماء کے مقابلہ میں اس کا دماغ زیادہ فلسفانہ تھا، یہ کہ اُس نے فلسفہ میں جدید مسائل دریافت کئے ہوں۔ اس کی شہرت کا صرف یہی ایک سبب ہو سکتا ہے کہ اُس کی زندگی کے مطالعہ سے طالبِ حق کو ایک مفید سبق حاصل ہو سکتا ہے۔ اُس کی زندگی نہایت خوبصورتی اور نرالی شان کے ساتھ ختم ہوتی ہے، اور کچھ شک نہیں کہ اُس کے حالات نہایت مفید اور سبق آموز ہیں۔

ولادت اور ابتدائی حالات

سقراط کا باپ سفرونسکس سنگتراش، اور ماں فیناریتی دایہ تھی۔ ۴۶۹ء قبل از مسیح میں سقراط کی ولادت ہوئی۔ والدین اگرچہ غریب تھے مگر اپنے لڑکے کو اُنھوں نے معمولی ابتدائی تعلیم دلائی۔ تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ اُس نے اپنا آبائی پیشہ سنگتراشی بھی سیکھا تھا۔ اس پیشہ میں اُس نے کچھ کمال حاصل کیا یا نہیں؟ یہ بتانا ذرا مشکل ہے۔ مگر معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اُس نے کچھ کمال حاصل نہیں کیا کیونکہ بہت جلد اُس نے یہ کام ترک کر دیا۔ دیوجانس نے ڈیمیٹریس کے حوالہ سے لکھا ہے کہ ایتھنس کا ایک متمول شخص (کریٹو) سقراط کی عادات سے اس قدر خوش ہوا کہ اُس نے اُسے دوکان سے اُٹھا لیا اور اپنے خرچ سے تعلیم دلانے لگا۔ یہی کریٹو ایک وقت اپنے آوردہ کا باادب شاگرد بنا اور اُسی غریب نوجوان سے عقل و حکمت کا سبق لینے لگا۔

سقراط کس کا شاگرد تھا؟ اس کے متعلق بہت اختلاف ہے۔ عام مورخین اُسے اینکساغورس، اور پرڈیاغورس اور پروڈیکس کا شاگرد بتاتے ہیں مگر سقراط نے اپنی ایک تقریر "کورنی ویم" میں (جو زینوفن کی تصنیف ہے) بیان کیا ہے کہ کسی کی تعلیم سے استفادہ حاصل نہیں کیا۔ ہو سکتا ہے کہ سقراط گاہے گاہے مذکورہ بالا معلمین کے درسوں میں جایا کرتا ہو۔ اُس زمانہ میں طریقۂ تعلیم ایسا نہیں تھا جیسا زمانۂ حال میں ہے بلکہ اُس وقت صرف زبانی لکچر اور مباحثے ہوا کرتے تھے۔ یہی درست معلوم ہوتا ہے کہ سقراط باقاعدہ طور پر کسی کا شاگرد نہیں ہوا اور یہ ناممکن بھی ہے کہ ایسا آزاد منش شخص کسی خاص اُستاد کا

مقلد ہوتا۔ ہاں، اس میں شک نہیں کہ مختلف معلّمین، اور بالخصوص انکساغورس کی تقریروں سے اُس نے فائدہ حاصل کیا۔

ابتدا میں سقراط کو طبعیات کا بہت شوق تھا۔ اُس زمانہ میں طبعیات کی تحصیل ایسے غلط طریقہ پر ہوتی تھی کہ اُس کے سمجھنے اور سیکھنے میں مابعد الطبعیات سے بھی زیادہ بکھیڑا تھا۔ چونکہ وہ طبعیات زیادہ تر فلسفی تخیلات اور نظریات تھے، لہذا ان میں سقراط کا جی نہ لگا۔ متنفر ہو کر اس کو ترک کر دیا۔

باپ سے علیحدگی اور تعلیم و تلقین شروع کرنے کی درمیانی مدت کے واقعات بہت کم معلوم ہیں۔ مگر یہ بات پوشیدہ نہیں کہ آپ نے تیس سے شادی کی اور جس عُرد یا خاموش خاتون کو آپ نے اپنی زوجیت میں قبول کیا وہ زینطپی تھی جس کی بدمزاجی اور بدزبانی ضرب المثل ہے۔ اس سے سقراط کے دو بچے پیدا ہوئے۔ سقراط نے نہایت خوش مزاجی اور تحمّل کے ساتھ اپنی بیگم صاحبہ کے غصہ کو برداشت کیا۔ ایک دفعہ اُس نے اپنی بیوی کے متعلق تمسخر آمیز لہجہ میں کہا کہ

جو لوگ شہسواری میں طاق ہونا چاہتے ہیں وہ زیادہ تر گھوڑے کو اپنی سواری کے لئے انتخاب کرتے ہیں۔ جب وہ قابو میں ہو جائے گا تو پھر سب گھوڑے قابو میں ہو سکیں گے۔ چونکہ میں آدمیوں کے ساتھ رہنا اور اُن سے معاملہ کرنا چاہتا ہوں اس لئے میں نے اس عورت سے نکاح کیا ہے، کیونکہ مجھے اس بات کا یقین ہے کہ اگر اس سے بن گئی تو سب سے نبھ جائے گی۔

زینطپی کو خواہ کتنا ہی بدمزاج کیوں نہ کہا جائے، مگر ہمیں اُس نیک بی بی سے ہمدردی ہے۔ خاوند کے اطوار تو یہ کہ گھر کی مطلق خبر نہیں کہ آیا بیوی کے پاس کپڑا اور بچوں کے لئے ٹکڑا ہے کہ نہیں۔ تمام دن شہر میں مارے مارے پھرنا اور سب سے لڑائی مول لینا آپ کا شیوہ۔ آپ سب کے سامنے یہ تقریر کرتے تھے کہ "ہم اور تم سب احمق ہیں، اگر اس میں کچھ شک ہو تو آؤ بحث کر لیں!" طبیعت میں استغناء اس قدر کہ اگر شاگرد کچھ نذر کرتے تو آپ کو اس کے قبول کرنے میں انکار۔ ایسی حالت میں ایک صاحبزادی بی بی خواہ وہ فرشتہ ہی کیوں نہ ہو، کیا وجہ ہے کہ بدمزاج نہ ہو جائے۔ چرب زبان اور تیز مزاج تو وہ پہلے ہی تھی، اُس پر سقراط کا یہ حُسنِ سلوک! اگر اُس نے کبھی سقراط کو اُس کے دوستوں کے سامنے دھمکایا اور طیش میں آکر برتنوں کا دھوون اُس پر پھینک دیا تو کون تعجب کی بات ہے۔ رہا سقراط کا تحمّل اور اُس کی خوش مزاجی، اس کی کیفیت زینطپی سے دریافت کرنا چاہیے کہ اُسے سقراط کی لطیفہ گوئی اور تحمّل پر کس قدر غصہ آتا ہوگا۔

تعلیم و تلقین کا پیشہ اختیار کرنے سے پہلے سقراط جنگ اسپارٹہ اور ایتھنس کی تین لڑائیوں میں بھی شریک رہا اور لڑائی میں دادِ شجاعت دی۔ پہلی لڑائی میں بہادری کا انعام بھی اُس کو ملا مگر یہ اُس نے اپنے دوست ایلسی بائیڈیز کو دلا دیا کہ اُس کا حوصلہ بڑھے۔ میدانِ جنگ میں سقراط کی کیا حالت تھی؟ اس کے متعلق مختلف قصے مشہور ہیں۔ جاڑے کی ایسی شدت کہ تمام زمین برف سے پٹی ہوئی مگر سقراط ننگے پاؤں اور بہت کم لباس پہنے ہوئے اُس پر پھرتا تھا۔ ایک موقعہ پر وہ چوبیس گھنٹے تک ایک ہی مقام پر غور کی حالت میں کھڑا رہا۔ میدان جنگ کی کیفیت اور اہل ایتھنس کی شکست کے بعد سقراط کی حالت کی تصویر افلاطون نے نہایت دلکش الفاظ میں کھینچی ہے جس کے مطالعہ سے طبیعت پر عجیب اثر ہوتا ہے، مگر بخوفِ طوالت ہم اس کو نظر انداز کرتے ہیں۔

پبلک زندگی

اب ہم سقراط کی پبلک زندگی پر نظر ڈالتے ہیں۔ اُس کی تعلیم اور اُس کے اصول اخلاقی تھے۔ پس یہ دیکھنا چاہئے کہ وہ خود اُن پر کہاں تک عامل تھا۔ سقراط کا یہ اعلان تھا کہ "زندگی کے سب طریقوں پر نیکی کو ترجیح ہے!" اُس کی ہدایت تھی کہ "بہادری اور استقلال کے ساتھ انصاف سے وابستہ رہو کہ حقیقی خوشی وہی ہے"۔ اس کا قول تھا کہ "نامنصف مزاج آدمی ہی دُنیا میں ناخوش رہتا ہے"۔ پس یہ سوال بیجا نہ ہوگا کہ آیا وہ خود خوش تھا کہ ناخوش؟

سپاہی کی حیثیت سے جو دادِ مردانگی اُس نے دی اُس کا ذکر اوپر

ہوچکا ہے۔ مگر پارلیمنٹ ایتھنس کا ممبر ہونے کے وقت جو دلیری اُس نے دکھائی اس کا پلّہ بہت بھاری ہے۔ اُس میں اخلاقی جراءت و دلیری اس درجہ تھی کہ وہ موت سے بھی نہیں گھبراتا تھا۔ عام رائے کی مخالفت میں اُس نے کبھی پس و پیش نہیں کیا۔ دُنیا کی تاریخ میں ایسی مثالیں بہت کم ملیں گی کہ ایک ہی شخص ظالم و جابر حکام اور عوام کالانعام کے گروہ کا مقابلہ کرسکے۔ مگر سقراط نے ایسا کرکے دکھا دیا۔

سقراط کے زمانہ میں ایک دفعہ تیس غاصب ایتھنس پر حکمراں تھے۔ ایک مرتبہ اُنھوں نے سقراط کو مع چار دیگر اشخاص کے تھولوس میں جو دارالامارۃ تھا طلب کیا اور حکم دیا کہ سقراط ان چاروں کو ساتھ لیکر لیئون (باشندہ سلیمیس) کو گرفتار کرکے ایتھنس میں لائے۔ لیئون نے ایتھنس والوں کے حقوق حاصل کرلئے تھے مگر غاصبوں کے ڈر سے وہ سلیمیس میں رہتا تھا۔ سقراط نے لیئون کی گرفتاری سے صاف انکار کیا۔ وہ خود اپنی آخری تقریر میں کہتا ہے کہ

اگرچہ گورنمنٹ زبردست تھی، مگر اُس کے عتاب اور دھمکیوں سے میں باوجود یکہ میں نامنصفانہ کام کرنے سے باز رہا۔ دارالامارۃ سے نکل کر وہ چاروں شخص تو سلیمیس کو گئے اور میں سیدھا اپنے گھر چلا آیا۔ مجھے اس حکم عدولی کے لئے ضرور سزائے موت ملتی، مگر خیر گذری کہ چند روز بعد ان غاصبوں کی حکومت کا خاتمہ ہوگیا۔

ایسا ہی ایک اور بھی واقعہ گذرا تھا۔ ایتھنس میں ایک پارلیمنٹ یا پنچایت تھی جس کا نام ممبروں کی تعداد کی مناسبت سے "پانسو" تھا۔ اس کے ممبر وہاں کے دس قبائل میں سے منتخب ہوتے تھے۔ ہر ۳۵ یا ۳۶ دن کے بعد ایک قبیلہ کے صدر مجلس بننے کی باری آتی تھی۔ صدر مجلسی کے درجہ کو "پرائی ٹینس" کہتے تھے۔ پچاس پرائی ٹینس میں سے ہر ہفتہ دس آدمی میر مجلس ہوتے تھے، اور ان دس میں سے ہر روز ایک آدمی قرعہ اندازی کے ذریعہ سے سب کا افسر چنا جاتا تھا۔ ریاست میں سب سے زیادہ معزز شخص وہی ہوتا تھا۔ وہی لوگوں کی رائے لیتا اور اُن کا شمار کرتا تھا۔ الغرض صدر مجلس پارلیمنٹ کا سب کام کرتا تھا حتیٰ کہ ریاست جمہوری کے خزانہ کی کنجیاں بھی اُسی کے پاس ہوتی تھیں۔ مگر کوئی شخص ایک دن سے زیادہ اس عہدہ پر قائم نہیں رہ سکتا تھا۔ ایک دن کا ذکر ہے کہ بعض امیر البحر مجرم قرار دیئے گئے تھے کہ اُنھوں نے آرگنوسی کی لڑائی کے بعد مردوں کو دفن کرنے میں غفلت کی۔ مردوں کا دفن ہونا نہایت اہم فرض تھا ورنہ اُن کی ارواح سو برس تک نہر جہنم کے کنارے پریشان پھرا کرتی تھیں۔ صورت مقدمہ یہ تھی کہ آرگنوسی کی لڑائی کے بعد ایک سخت طوفان آیا جس کی وجہ سے مقتولین کی لاشیں دستیاب نہ ہوسکیں، اور امیر البحر اپنے ماتحت افسروں کو اُن کے دفن کے لئے چھوڑ آئے۔ مگر طوفان کی وجہ سے وہ بھی یہ فرض ادا نہ کرسکے۔ اب اُن امیر البحروں پر مقدمہ قائم ہوا۔ انھوں نے صفائی کے گواہ پیش کئے جن کے بیانات سے ثابت ہوا کہ طوفان کی وجہ سے لاشیں دفن نہیں ہوسکتی تھیں، اور اگر کچھ قصور ہے تو ان ماتحتوں کا جو اس کام کے لئے وہاں چھوڑ دئے گئے تھے۔ ان بیانات کا بہت اچھا اثر ہوا اور اگر اُس وقت رائے لی جاتی تو وہ افسر جن پر جرم عائد کیا گیا تھا صاف بری ہوجاتے۔ مگر مقدمہ ملتوی کرالیا گیا کہ اب اندھیرا ہوگیا ہے اور ہاتھوں کا شمار نہ ہوسکے گا۔ دوسرے دن مقتولین کے عزیز و اقارب اور دیگر اجرتی ماتم دار تمام شہر میں روتے پیٹتے پھرے اور عوام میں جوش پیدا کرتے رہے کہ ان بحری افسروں کو ہرگز نہیں چھوڑنا چاہئے۔ اس گریہ و زاری کا ممبران پارلیمنٹ پر بہت اثر ہوا۔ دوسرے دن حسن اتفاق سے سقراط تمام پرائی ٹینس کا سردار تھا۔ سوال یہ درپیش تھا کہ آیا بحری افسروں نے غفلت کی یا نہیں، نیز یہ کہ کثرت رائے سے ان کو پھانسی اور ضبطی مال و متاع کی سزا ملنی چاہئے یا نہیں؟ سقراط کے کہنے سے پرائی ٹینس نے اس ناجائز سوال کی بابت رائے لینے سے انکار کیا۔ عوام غضبناک ہوئے اور اُنھوں نے چلا چلا کر کہا کہ یہ شخص ہماری مخالفت پر آمادہ ہیں، خود انھیں پر مقدمہ قائم ہونا چاہئے۔ تمام پرائی ٹینس متزلزل ہوگئے مگر سقراط ایک آہنی برج کی طرح اپنی جگہ پر استقلال کے ساتھ جما رہا۔ اور عوام کی دھمکیوں کی اُس نے مطلق پروا نہ کی۔ اُس نے کہا کہ میں یہاں پر صرف انصاف کے لئے کھڑا ہوں، ظلم کے لئے نہیں۔ میں نے

متعلق میں کوئی رائے نہیں لے سکتا" غرض اجلاس ملتوی ہوا۔ دوسرے دن کوئی اور شخص میر مجلس تھا۔ رائے لی گئی اور بحری افسروں پر قتل کا فتوے لگایا گیا۔

سقراط کے حالات کا ماخذ | سقراط کے حالات زیادہ تر اُس کے شاگردوں زینوفن اور افلاطون کی تصنیفات سے معلوم ہوتے ہیں۔ زینوفن اپنی کتاب میموبیلیا میں اس بات کا دعویٰ کرتا ہے کہ اس میں اصل الفاظ اور گفتگو سقراط ہی کی ہے اور یہ کتاب اس غرض سے لکھی گئی تھی کہ بیدینی یعنی مذہب ریاست سے انحراف کا جو الزام سقراط پر لگایا گیا تھا اس سے اُس کا ازالہ ہو سکے۔ رہی افلاطون کی ضخیم تصنیفات اور بے شمار مکالمے، جن میں زیادہ تر حصہ سقراط کا ہوتا ہے، ان میں اس بات کا اندازہ کرنا مشکل ہے کہ کہاں سقراط کے خیالات ختم ہوتے اور کہاں سے افلاطون کے خیالات شروع ہوتے ہیں۔ افلاطون خود ایک حکیم تھا اور فلسفہ میں سقراط کا غلامانہ مقلد نہ تھا۔ اُس نے سقراط کا طرز تحقیق اختیار کیا اور اپنے خیالات سقراط کی زبان سے ادا کئے ہیں۔ چند تصنیفات مثلاً "معذرت نامۂ سقراط" اور "فیڈیو" اور "کریٹو" کی نسبت عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ یہ سقراط ہی کے الفاظ و خیالات ہیں۔ باقی مکالمے عموماً افلاطون کے خیالات ہیں۔ البتہ فلسفۂ اخلاق جو افلاطون نے بیان کیا ہے وہ بالکل سقراط کا ہے۔ ممکن ہے کہ افلاطون نے اُسے زیادہ وسعت کے ساتھ بیان کیا ہو۔

ذاتی خصائل | تاہم ایک بات میں زینوفن اور افلاطون بالکل متفق ہیں۔ اپنے اُستاد کی خصائل اور عادات کی جو تصویر انھوں نے کھینچی ہے یا دوسرے لوگوں کی زبان سے بیان کی ہے ان میں کسی قسم کا اختلاف نہیں، اور کچھ شک نہیں کہ اگر سقراط کے دوسرے شاگردوں کی تصنیفات موجود ہوتیں تو اُن میں بھی وہی سقراط نظر آتا جس سے افلاطون کی تصنیفات پڑھنے والے واقف ہیں۔ زینوفن ایک بہادر سپاہی تھا، مگر تعلیم یافتہ اور سیدھا سادہ۔ اس کا دماغ افلاطون کی طرح حکمت کا مخزن نہ تھا۔ اُس نے سقراط کی جو تعلیم قلبند کی ہے وہ عملی قسم کی ہے، یعنی جس کا مقصد عام طور پر بدی اور معائب شخصی کی اصلاح کرنا ہے۔ مگر ان تقریروں سے صاف طور پر ظاہر ہو جاتا ہے کہ سقراط کی گفتگو منفی قسم کی ہوتی تھی یعنی وہ دوسروں کے تمام غلط خیالات کی تردید کرتا تھا۔ وہ تجزیۂ خیال کو کام میں لاتا تھا، یعنی ہر خیال کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے الگ الگ اُن سے بحث کرتا تھا۔ پھر اُس کی تقریروں میں تعمیم بھی ہوتی تھی، یعنی وہ کسی مثال یا تشبیہ کو ایک عام قاعدہ بنانا چاہتا تھا۔ زینوفن کی تصنیفات کے مطابق سقراط کا رجحان یہی ہے۔ افلاطون نہایت حکیمانہ طور پر یہ ظاہر کرتا ہے کہ سقراط کے فلسفہ کا طریقہ یہی تھا، حالانکہ وہ فلسفۂ سقراط کے عملی رُخ کو بیان نہیں کرتا بلکہ اصولی (تھیوریٹیکل) کو واضح کرتا ہے۔ تاہم وہ بھی اُسی سقراط کو پیش کرتا ہے جس کی تصویر زینوفن نے کھینچی ہے۔

سقراط کے خصائل کے متعلق ہم دو واقعات کا ذکر کر چکے ہیں ہم جانتے ہیں کہ وہ موٹا کپڑا پہنتا اور معمولی کھانا کھاتا تھا۔ وہ تمام عمر مفلس اور جسمانی خوشیوں سے محروم رہا۔ سقراط کی خاص صفات جن کا ذکر گروٹ صاحب نے "تاریخ یونان" میں کیا ہے، حسب ذیل ہیں:-

(۱) اُس کی تمام عمر قناعت آمیز مفلسی، اور نصیحت آمیز و نتیجہ خیز مکالموں اور مناظروں میں گزری۔

(۲) اُس کی طبیعت پر گہرا مذہبی اثر تھا، اور اس کو یقین تھا کہ خدا نے ایک خاص مقصد کی تکمیل کے لئے اُسے پیدا کیا ہے۔

(۳) اُس کی قوائے عقلی میں ایجاد و جدلیت کا مادہ بے انتہا تھا۔ وہ اپنے ذہن سے نئے نئے مضمون نکالتا تھا، اور اس کا طریقۂ بحث بھی نیا تھا۔

یہ تینوں صفات اُس میں اس طرح ملی ہوئی تھیں کہ ان کو علیحدہ کرنا مشکل ہے۔ ان سب صفات میں وہ تمام سابقہ حکمائے یونان سے ممتاز تھا۔

افلاطون اور زینوفن کی تصنیفات سے جہاں تک معلوم ہو سکتا ہے

یہی ثابت ہوتا ہے کہ سقراط کسی خاص عقیدے یا اصول کی تعلیم نہیں دیتا تھا۔ اُس کا مقصد صرف یہ تھا کہ حکیم و فلسفی اور مدبر سلطنت، شاعر و مصور، غرض اہلِ فن اور اہلِ علم جو کسی صنفِ خاص میں ماہر ہونے کے مدعی ہیں، اُن پر یہ ثابت کرے کہ وہ کچھ نہیں جانتے۔ سقراط کی یہ نفی تعلیم اگرچہ بادی النظر میں غیر مفید معلوم ہوگی لیکن فلسفہ اور علوم کی تاریخ میں اسی سے عجیب و غریب انقلاب پیدا ہوا ہے۔ غور سے دیکھیے تو انسان کے ذہن میں صرف چند خیالات اور سماعی باتیں ہوتی ہیں، جن کو وہ علم اور دانائی کے نام سے نامزد کرتا ہے۔ سقراط نے سمجھا دیا ہے کہ دانائی غور و فکر اور محنت کیے بغیر محض سُنی سُنائی باتوں سے نہیں میسر ہو سکتی۔

خاتمہ ۳۹۹ قبل از مسیح میں علانیہ سقراط پر یہ جرم عاید کیا گیا وہ بے دین ہے یعنی مسلّمہ دیوتاؤں سے انکار کرتا اور اُن کے بجائے نئے دیوتاؤں کی تلقین کرتا ہے۔ نیز یہ جرم بھی اس پر لگایا گیا کہ وہ نوجوانوں کے اخلاق بگاڑتا ہے۔ افلاطون نے "معذرت نامۂ سقراط" میں سقراط کی وہی تقریر قلمبند کی ہے جو اُس نے جواب دعویٰ میں کی تھی۔ مگر سب کوششیں رائگاں گئیں اور اس پر موت کا فتویٰ صادر کیا گیا۔ اس واقعہ کے ایک ماہ بعد اُسے زہر کا پیالہ پینے کو دیا گیا، جو اپنا اثر کیے بغیر نہ رہا۔ اور اس طرح تقریباً ستر برس کی عمر میں سقراط کی مقدس زندگی کا خاتمہ ہو گیا۔

غلام الثقلین

داستانِ ذوق

نمودِ عالم میں ہر قدم پر جمالِ حیرت فزا نہاں ہے
ہر ایک صورت سے گنجِ مخفی کی شانِ معنیٰ نما عیاں ہے

شہودِ کثرت میں جلوہ گر ہے جلالِ وحدت کی دل رُبائی
صنم کدہ میں بتوں کا چرچا بھی دلستانی کی داستاں ہے

ہر ایک ذرہ کی ذوقِ دل سے بلائیں لیتا ہوں مست ہو کر
الٰہی کس کس پہ ہوں میں قرباں یہاں تو ہر چیز دلستاں ہے

نگاہِ جویا کو ہر نظارہ نگار خانہ ہے دل بری کا
جہانِ زیبا ترا الٰہی ہزار حیرت کا اک سماں ہے

جہانِ ظاہر میں ہر قدم پہ کھلے ہیں اسرار و رازِ باطن
اگر بصیرت کی ہوں نگاہیں تو ذرہ ذرہ جہانِ جاں ہے

قدم قدم پر ہے دلربائی سے کون مصروفِ خود نمائی
بڑی عجب ہے یہ جا نفزائی جو غازۂ حسنِ کن فکاں ہے

جہاں تو سارا ہے بزمِ الفت چھڑی ہے کیوں شیخ و برہمن میں
فضائے دیر و حرم میں ہر جا انھیں کی بجلی شرر فشاں ہے

یہاں تمنائے وصل دل میں وہاں انھیں فکرِ آزمائش
اِدھر یہ حیرت کہ اُنکو دیکھیں اُدھر تقاضائے امتحاں ہے

کسی کے عشقِ نہاں کی گرمی نے پھونک ڈالا ہے دل جلوں کو
الٰہی وہ برقِ طورِ موسیٰ ہمارے خرمن میں کیوں نہاں ہے

ہوے ہیں دیر و حرم سے فارغ کسی دل آرا کی جستجو میں
دلوں میں نکلا مکیں وہ ظالم بتا یہاں جسکا لامکاں ہے

بٹھائیں پہلو میں اپنے کس کو کہ ڈھنگ بگڑا ہے دوستوں کا
خلوص و الفت سے ملنے والا بجز تمھارے کوئی کہاں ہے

بیانِ ذوقِ حمیدِ مضطر سنبھل کے سننا جناب زاہد
نہیں ہے حوروں کا یہ فسانہ یہ سرفروشوں کی داستاں ہے

حمید (کوٹلوی)

فلسفۂ تربیت

مصنفۂ اسپنسر پر ریویو (۲)

چوتھا مسئلہ یہاں تک جو کچھ لکھا گیا، وہ صرف فلسفیانہ حیثیت سے تھا، یعنی اصولی طور پر یہ بتا دیا گیا، کہ تربیت کی ماہیت کیا ہے؟ تربیت کا لفظ کس مفہوم پر دلالت کرتا ہے؟ ایک عملی تربیت کے ارکان کیا ہیں؟ اور اس معیار پر کون سا نصاب پورا اترتا ہے؟ لیکن عملاً نقطۂ خیال سے ابھی یہ نہیں بتایا گیا کہ بچوں کو کیونکر تعلیم دینی چاہیے؟ اور عملی تربیت کے وقت اُستاد و طالب علم کو کن کن شرائط کا لحاظ رکھنا چاہیے؟

عام مصنفین کے حسب معمول اسپنسر بھی انسانی زندگی کو ان تمام فلسفیانہ تقسیم کرتا ہے، ذہنی، اخلاقی، اور جسمانی، اور انسان کی تربیت انھیں تین حیثیات سے ہو سکتی ہے۔ تربیت کی ماہیت چونکہ پہلے بیان ہو چکی ہے، اس لیے اس حصہ میں اسپنسر کو جو کچھ کرنا رہ گیا ہے وہ یہ ہے کہ حصۂ اول کے طے شدہ اصول کو یہاں عملی قوانین کی صورت میں ترتیب دیدے، یعنی اُس تھیوری کو یہاں چسپاں کر دے۔ قوانین تربیت کا اصل راز یہ ہے کہ تعلیم ہمیشہ ارتقائی اصول پر ہونا چاہیے۔ یعنی تربیت، چونکہ نام ہے، انسانی قوتوں کی نشو و نما کا، اس لیے ہماری مصنوعی تربیت کو قدم بہ قدم اسی راستہ پر چلنا چاہیے جس پر کہ خود فطرت، انسانی تربیت کا سامان کرتی ہے۔ اور اسی فطری روش تربیت کا نام ارتقاء تعلیمی ہے۔ اس اجمال کی تفصیل وہ ذہنی، اخلاقی، اور جسمانی حیثیات کو علحدہ علحدہ لیکر کرتا ہے۔

(الف) سب سے پہلے ذہنی تعلیم کو لیجیے۔ عام خیال ہے کہ بچہ کی تعلیم بالکل ابتدا ہی سے شروع ہو جانا چاہیے۔ اسپنسر اس رائے سے متفق ہوکر کہتا ہے کہ

> جس شخص نے ذرا بھی غور و تامل سے شیر خوار بچہ کو دیکھا ہے، جو کھلی آنکھوں سے گھور گھور کر گرد و پیش کی چیزوں پر نظر ڈالتا ہے، وہ اس امر کو بخوبی جانتا ہے کہ خواہ ہم قصد کریں یا نہ کریں، تعلیم ابتدائے عمر میں بالضرور شروع ہو جاتی ہے اور یہ جو بچہ ہر شے کو جو اُسکے ہاتھ میں آجاتی ہے ٹٹولتا، چھوتا، اور چوستا ہے، ہر ایک آواز کو کان کھول کر سنتا ہے یہ اسی سلسلہ کے ابتدائی مدارج ہیں، جو آخرکار ستاروں کی تحقیقات، کلوں کی ایجاد، اور دیگر علمی و ادبی کمالات پر جاکر منتہی ہوتا ہے۔ قدرت کا یہ عمل چونکہ ابتدا ہی سے قدرتی اور اٹل ہوتا ہے، اس لیے اس سوال کا جواب، کہ آیا ہمیں بچوں کے لیے ابتدا ہی سے مختلف قسم کے مواد کی کافی مقدار بہم پہنچانی چاہیے تاکہ اُن پر وہ اپنے قویٰ کی مشق کر سکیں، بجز اثبات کے اور کچھ نہیں ہو سکتا۔

اور اسی لیے شیر خواروں کی قوت امتیاز کے باقاعدہ نشو و نما کے لیے انکے سامنے

> جو آوازیں بلندی اور آواز کے زیر و بم میں بہت مختلف ہوں، جو رنگ باہم مختلف ہوں، اور جو چیزیں سختی یا نرمی میں مختلف نا مشابہ ہوں، انھیں کو سب سے پہلے مہیا کرنا چاہیے۔

شیر خوارگی کے بعد جب بچہ کسی قدر ذی ہوش ہو چلے اُس وقت اُسکی ذہنی تربیت، چند واقعات بتا دینے یا کچھ معلومات کے حفظ کرا دینے سے نہیں، بلکہ سباق الاشیا (Object Lessons) کے ذریعہ سے ہونا چاہیے۔ سباق الاشیا کا منشا یہ ہے کہ گھر کی معمولی چیزوں سے لیکر لکڑیوں، پتھروں، پھولوں، پتیوں، سیپیوں، اور کیڑوں تک مختلف قدرتی اشیاء بچوں کے مشاہدہ میں لائی جائیں، تاکہ اُنکے قوائے مشاہدہ کو ترقی ہو، اور وہ اُنکی ساخت و صفات پر از خود غور کرکے اپنی قوت توجہ، حافظہ، اور ہیا کو تقویت دیں۔ اسی قوت مشاہدہ کی ترقی کے ضمن میں اسپنسر مصوری کی خاص طور پر سفارش کرتا ہے۔

ہم یہ بات مکرر بیان کرتے ہیں کہ معلم کو وہی راستہ اختیار کرنا چاہیے جسپر قدرت اُسے توجہ دلاتی ہے۔ یہ ہر شخص جانتا ہے کہ بچے گرد و پیش کے آدمیوں، مکانوں، درختوں، اور جانوروں کی تصویریں بنانے کی از خود کس قدر کوشش کیا کرتے ہیں، اور اگر کوئی چیز بہتر نہیں ملتی، تو سلیٹ یا کاغذ پنسل ہی سے تصویریں بنا لیتے ہیں۔ اُنکی نہایت اعلیٰ درجے کی خوشیوں میں سے ایک خوشی یہ ہے کہ اُنکو تصویروں کی کتاب دکھائی جائے۔ اور نقل اُتارنے کا قوی میلان جو بچوں میں پایا جاتا ہے اُس سے اُنکے دلوں میں یہ شوق بالعموم فی الفور پیدا ہو جاتا ہے کہ خود بھی تصویر اُتاریں۔ یہ کوشش کہ جو چیز عجیب دیکھیں اُسکی تصویر اُتار لیں، قوائے مدرکہ کی ایک طبعی مشق ہے۔ یعنی یہ ایسا وسیلہ ہے جس سے ترغیب ہوتی ہے کہ مشاہدہ زیادہ صحیح و مکمل طور پر کیا جائے۔ اور چونکہ بچے اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ اشیاء کے محسوس قوا اس کے متعلق اپنی تحقیقات کی طرف ہم کو بھی متوجہ کریں، اور خود بھی تصویر بنانے میں مصروف رہتے ہیں اس لیے گویا وہ ہم سے زبان حال سے یہ درخواست کرتے ہیں کہ اُنکو نقاشی کی تعلیم دی جانی چاہیے، اور اسی کی اُنکو سخت ضرورت ہے۔

مصوری کے پہلو بہ پہلو، تربیت ذہنی کا ایک نہایت ضروری جزو، علم ہندسہ کی عملی، اور اسکے بعد اُسکی علمی تعلیم ہے۔ چونکہ ارتقائی حیثیت سے آرٹ، سائنس پر مقدم ہے، اس لیے
علم ہندسہ کی مناسب تمہید یہ ہے کہ طالب علم کو مدت تک اپنے ہاتھ سے شکلیں بنانے کی مشق کرائی جائے، جس سے علم ہندسہ میں سہولت پیدا ہو جائیگی۔ دیکھو فطرت یہاں بھی رہنمائی کرتی ہے۔ بچے اس بات کی طرف قوی میلان ظاہر کرتے ہیں کہ کاغذ کو کتر کر کچھ چیزیں بنائیں، اور اپنے ہاتھ سے کوئی چیز تعمیر کر دیں۔ یہ ایسا میلان ہے کہ اگر اسے تقویت دیجائے اور راہ راست پر ڈال دیا جائے تو اس سے نہ صرف علمی تصورات کا راستہ صاف ہو جائیگا، بلکہ دستکاری کی اُن قوتوں کو بھی ترقی ہوگی جو اکثر آدمیوں میں بہت کم پائی جاتی ہے۔ پھر جب مشاہدہ اور قوائے موجدہ میں مطلوبہ قوت پیدا ہو جائے اُسوقت طالب علم کو ہندسہ علمی کی تعلیم شروع کرائی جاسکتی ہے۔

عملی ہندسہ سے مراد یہ ہے کہ بجائے نقطہ، خط، اور سطح کی تعریف بتانے کیلیے جو بچے کے فہم سے بالاتر ہوتی ہیں، اُنکے سامنے مجسمات و مکعب اشکال پیش کیے جائیں، جنکو وہ دیکھ کر، اور ان پر عملی مشقیں کر کر کے، وہ از خود ان دقیق تصورات تک پہنچے گا، اور اس طرح رفتہ رفتہ مسائل کو عملی طور پر خود ہی حل کرنے لگے گا۔

بیانات بالا سے معلوم ہوا ہوگا، کہ بچے کی تعلیم کی ابتدا کن مضامین سے ہونا چاہیے۔ مگر معلم کے لیے ایک اہم ترین شے اُن ہدایات سے واقفیت حاصل کرنا ہے، جن پر کاربند ہونا ہر نصاب تعلیم کی کامیابی کے لیے لازمی ہے۔ وہ ہدایات ارتقاء ذہنی کے مندرجہ ذیل سات اصول ہیں:۔

(۱) تعلیم میں آسان و زود فہم باتوں سے دقیق و غامض مسائل کیطرف جانا چاہیے۔

یہ مسلم ہے کہ نفس انسانی میں ارتقاء ہوتا رہتا ہے، اور مثل تمام ارتقاء پذیر چیزوں کے نفس بھی ہم جنس چیزوں سے مختلف الجنس چیزوں تک بتدریج پہنچتا ہے۔ اب چونکہ باقاعدہ تربیت، اسی معنوی عمل کی ایک صوری شبیہہ ہوتی ہے، اسلیے اسمیں اسی کے مثل تدریجی ترقی ہونا چاہیے۔ اس ہدایت کی تحت میں یہ بات بھی داخل ہے، کہ نہ صرف علم کی ہر شاخ میں علیحدہ علیحدہ، مفرد شے سے مجموعہ کی طرف جانا چاہیے، بلکہ سارا علم اسی طریقہ سے حاصل کرنا چاہیے، اور اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ابتدائی تعلیم میں ایک ہی دو مضمونوں کی تعلیم ایک ساتھ شروع ہونا چاہیے اور بتدریج اُن مضامین کی تعداد میں اضافہ کر کے آخر کار تمام مضامین کی تعلیم کو ساتھ ساتھ جاری رکھنا چاہیے۔ نہ صرف جزئیات میں، بلکہ مجموعی حیثیت سے بھی آسان سے مشکل کی طرف جانا چاہیے۔

(۲) بچوں کو ابتدا میں علمی مصطلحات و تعریفات نہیں بتانا چاہیے، بلکہ اُنکی سمجھ کے مطابق موٹی موٹی باتیں بتا دینا کافی ہیں:۔ ارتقاء کا ایک قانون یہ ہے کہ اسکی رفتار ہمیشہ مبہم و غیر معین چیزوں کی طرف ہوتی ہے، ذہن و

دماغ بھی اسی قانون کا پابند ہی، چنانچہ جسمانی حرکات کی طرح، بچہ کی ابتدائی ادراکات و خیالات بھی مبہم و غیر متعین ہوتے ہیں، اور اس وقت اسکی عقل بجز نہایت موٹے اور نمایاں امتیازات کے، خواص اشیاء کی قسموں اور درجوں اور انکی تشکل کے جزئیات میں تمیز نہیں کر سکتی، اسلیے وہ معلم سخت غلطی پر ہیں جو ایسی حالت میں دقیق منطقی تعریفات و اصطلاحات، بچوں کے ذہن میں ٹھونس دیتے ہیں۔ صحیح اصول تعلیم کی بنا پر ہمیں چاہیے کہ

ابتدائی تعلیم میں نامکمل خیالات پر قناعت کریں۔ لیکن ان خیالات کو بتدریج زیادہ صاف و واضح کرتے رہیں، اور یہ مقصد صرف اس طرح پورا ہو سکتا ہے کہ پہلے بچوں کو ان تجربات و واقعات کے حصول میں مدد دیجائے، جن سے موٹی موٹی غلطیاں رفتہ رفتہ از خود دور ہوتی جاتی ہیں۔

(۳) اسباق، مادیات سے شروع اور مجردات پر ختم ہونے چاہییں۔

اصول مجردہ یعنی Abstractions کے متعلق ایک عام غلط فہمی یہ ہوتی ہی، کہ لوگ چونکہ ان تعمیمات کو جزئیات کے مجموعہ سے منتزع کرتے ہیں، یعنی بہت سے واقعات کو ملا کر ایک قاعدہ بنا لیتے ہیں، اس لیے وہ یہ سمجھتے ہیں کہ بچوں کو بھی اس قسم کے تصورات ضرور آسان معلوم ہونگے۔ حالانکہ وہ اس امر کو نظر انداز کر جاتے ہیں، کہ یہ عام اصول تو انکے لیے تمام جزئی واقعات کے معلوم کر لینے کے بعد آسان ہوا ہی، اور اس نفس کے لیے، جس میں اس مجموعہ کے جزئیات فرداً فرداً موجود نہیں، تو ایک مجرد اصول ضرور ایک عقدۂ لاینحل رہیگا۔ اس بنا پر ایک دانشمند معلم کو

نفس کو کسی عام اصول کی تعلیم، مثالوں کے ذریعہ سے دینا چاہیے، تاکہ ذہن کی رہنمائی تدریجاً خاص سے عام، جزئیات سے کلیات اور مادیات سے مجردات کی طرف

(۴) بچوں کی تعلیم کا سلسلہ اسی اصول پر ہو، جسکے مطابق نوع انسان نے تعلیم پائی ہی۔ مسئلۂ توارث نے ثابت کر دیا ہی، اور اسکی تصدیق ہمارے ہر روزہ تجربہ و مشاہدہ سے بھی ہوتی ہی، کہ خط و خال، شکل و شباہت، کی طرح ذہنی اوصاف و خصائل بھی نہ صرف نسلاً بعد نسلٍ، بلکہ قرناً بعد قرنٍ مستقل طور پر قائم رہتے ہیں، جس کے یہ معنی ہیں کہ جس ترتیب کے ساتھ نسل انسانی نے مختلف علوم پر عبور حاصل کیا ہی، اسی ترتیب کے ساتھ ان علوم کو حاصل کرنے کی قابلیت ہر بچہ میں بھی پیدا ہوگی۔ اس لیے ہمیں چاہیے کہ

افراد کے نفس کو اسی راستہ پر قدم بہ قدم لیجائیں، جسکو نسلِ انسانی نے من حیث المجموع طے کیا ہے۔

(۵) تعلیم کی ہر شاخ میں عملی علم کو عقلی علم پر تقدم زمانی حاصل ہونا چاہیے۔

انسانی ترقی کے دوران میں ہر علم (سائنس) اپنے اپنے فن (آرٹ) سے نکلا ہی خواہ وہ نفسی ہو یا اجتماعی حیثیت سے، ہمارا ذہن بجز اسکے کہ مادیات کے ذریعہ سے مجردات تک رسائی حاصل کرے، اسی ضرورت کا یہ نتیجہ ہو کہ سائنس کے وجود سے پہلے مشق، تجربہ، و مشق کے عملی نتائج کا وجود ضروری ہی۔ سائنس نام ہی منضبط علم کا۔ لیکن انضباط علم سے پیشتر ضروری ہی کہ اسکا کسی قدر حصہ ہمارے قبضہ میں ہو۔ اس لیے ہر مطالعہ کی تمہید، تجربہ ہونا چاہیے، اور جب مشاہدات کا ذخیرہ وافر جمع ہونے، اسکے بعد دلیل کا نام لینا چاہیے۔

اسی اصول کی بنا پر زبان کی تعلیم میں ادب کا نمبر پہلے، اور صرف و نحو کا درجہ بعد کو ہونا چاہیے۔

(۶) بچوں کی اس طرح رہنمائی کرنا چاہیے کہ وہ خود تحقیقات کریں اور اپنے نتائج آپ نکالیں۔ نوع انسان نے آج، بحیثیت مجموع جو اس قدر ترقی کی ہی۔ اس میں کس معلم کا ہاتھ شریک ہی؟ بجز خود اسکی طبیعت، اس کے نفس کے، اور کسی کا نہیں۔ اسی طرح دنیا میں جو ممتاز ترین افراد ہوے ہیں، وہ عموماً ایسے ہی ہیں جو کسی خارجی معلم کے ممنون احسان نہیں۔ اسکے علاوہ، ہر بچہ، پیدا ہوتے ہی اپنے گرد و پیش کی اشیاء کا نہایت ضروری علم بلا خارجی مدد کے حاصل کرتا ہی، اپنی مادری زبان از خود سیکھ لیتا ہی، اور مدرسہ سے باہر نکل کر اپنے ذاتی تجربات سے عقل میں بے انتہا ترقی حاصل کرتا ہی۔ اس لیے اگر بچہ کو تنہا پا جائے، اور انھیں باقاعدہ طور پر اپنے اوپر بھروسا کرنا سکھایا

جائے، تو تھوڑی مدت میں وہ بہت سہولت کے ساتھ علم کی کافی مقدار حاصل کر سکتے ہیں۔

(۷) طریقۂ تعلیم ایسا ہونا چاہیے، جس سے بچوں کو فرحت حاصل ہو۔ یہ مسئلہ اگرچہ حکما کے گروہ میں ایک بہت معرکۃ الآرا، مختلف فیہ حیثیت رکھتا ہے لیکن اسپنسر اس امر کا نہایت معتقد ہے، کہ ایک نسانی قوت سے، جبتک کہ اعتدال کے ساتھ کام لیا جاتا ہے، اُسوقت تک کام لینے والے کو بجائے اذیت کے فرحت حاصل ہوتی ہے، اور اسی حصول فرحت کو وہ طریقۂ تعلیم کی عمدگی کا آخری معیار قرار دیتا ہے۔ اگر کسی مضمون کا مطالعہ بچہ کو ناگوار گزرتا ہے، تو اسپنسر کے نزدیک اُسکی تعلیم اسکے لیے مُضر ہے۔ لیکن اس تعمیم کے ساتھ اس دعوے کا ثابت کرنا دشوار ہے۔

(ب) اخلاقی تربیت۔ اگر یہ سچ ہے (جیسا کہ صفحات گذشتہ میں ہر ہر سطر سے، الفاظ ہی کے ذریعہ سے نہیں، بلکہ لہجۂ تحریر سے، مترشح ہوتا ہے) کہ بچوں کی ذہنی تربیت کی ذمہ داری، بہ نسبت اتالیق کے والدین پر زیادہ ہے، تو یہ اس سے بھی زیادہ سچ ہے کہ انکی اخلاقی تربیت کی ذمہ داری تقریباً تمام تر والدین پر ہے۔ فلسفۂ اخلاق میں چونکہ اسپنسر افادیت (Utilitarianism) کا قائل ہے، اس لیے اخلاقی حیثیت سے افعال کے حُسن و قبح کا معیار، اُسکے نزدیک صرف مسرت وغم کی وہ مقدار ہے، جو ارتکاب افعال سے پیدا ہوتی ہے، یعنی مدار اخلاق، نتائج افعال ہیں۔ اگر کسی فعل کے نتائج اُسکے فاعل کے لیے مسرت بخش ہیں، تو وہ فعل نیک ہے، اور اگر اذیت رساں ہیں تو مذموم۔ اس بنا پر، طبعی طور پر، ہمکو بد افعالیوں سے روکنے والی، نیز خوش اعمالیوں پر آمادہ کرنیوالی شے، صرف نتائج کا خوف یا انعام ہوتا ہے، جو فطرت کے مقرر کردہ قوانین کے بموجب، اسی دنیا میں ہمیں جلد یا بدیر مل جاتے ہیں، اور یہ سلسلہ زندگی کے ہر حصہ میں جاری رہتا ہے۔ پس اخلاقی تربیت کا منشا صرف یہ ہے کہ انسان کو اعمال کے قدرتی نتائج کی ناگزیری کا خوگر کیا جائے۔ اسپنسر شیر خوارگی اور سنِ بلوغ کے زمانہ سے بہت سی مثالیں پیش کر کے کہتا ہے:—

کیا ان مثالوں میں ہمکو اخلاقی تعلیم کا ہدایتی اصول نہیں مل گیا؟ کیا ہمیں یہ نتیجہ نہیں نکالنا چاہیے، کہ جو طریقہ، اپنے نتائج کے اعتبار سے شیر خواری اور بلوغ کے زمانہ میں نہایت مفید ثابت ہوتا ہے، کیا وہ زمانۂ طفولیت میں بھی اسی قدر مفید نہیں ثابت ہوگا؟ کیا یہ بات صاف ظاہر نہیں ہے کہ ترجمان و کارکنِ قدرت کی حیثیت سے اس امر کا دیکھنا والدین کا فرض ہے، کہ انکے بچے، عادۃً اپنے چال چلن کے حقیقی نتائج، یعنی قدرتی سزاؤں کا تجربہ حاصل کریں۔ اور والدین نہ تو ان سزاؤں کو ٹالیں، نہ اُنہیں سخت بنائیں، اور نہ مصنوعی سزاؤں کو اُنکا قائم مقام بنائیں؟

قدرتی سزاؤں کی مثالیں یہ ہیں کہ فرض کیجیے، ایک بچہ ہے، جسے اُس کے والدین روزانہ شام کو تفریح کے لیے اپنے ہمراہ باہر لیجاتے ہیں، لیکن وہ اپنی کاہلی سے ٹھیک وقت پر کپڑے پہن کر تیار نہیں ہو پاتا۔ ایسی حالت میں عموماً والدین کو غصہ آتا ہے، اور وہ بچہ کو جھڑکتے ہیں، کہ اسکے انتظار میں انھیں بھی دیر ہوئی، اور جب بچہ تیار ہو لیتا ہے، تو اُسے ساتھ لیجاتے ہیں لیکن یہ اظہار غضب سر بسر مصنوعی سزا ہے۔ وقت پر تیار نہ ہونے کی عادت اگر بچہ میں راسخ ہو گئی، تو آیندہ زندگی میں ہر ہر قدم پر ناکامیابیوں کا سامنا ہوتا رہیگا، کبھی ریل چھوٹ جائیگی، کبھی جہاز چھوٹ جائیگا، کبھی احباب سے وعدہ خلافی پر محجوب ہونا پڑیگا، کبھی دفتر یا عدالت میں (جہاں کہیں ملازم ہے) بعد از وقت پہنچے گا۔ پس والدین کا اصل فرض، بچہ میں اس عادت کا راسخ نہ ہونے دینا ہے، اور اسکا بالکل قدرتی طریقہ یہ ہے، کہ اگر وہ وقت مقررہ پر تیار نہیں، تو بغیر زجر و توبیخ کے چُپ چاپ اُسے چھوڑ کر چلے جائیں، اور واپسی پر تفریح کے فوائد، دلکش مناظر، اور خوشنما نظاروں سے جو لطف اُنھیں حاصل ہوا ہے، اُسے بچہ کے سامنے بیان کریں۔ اس سے اُس بچہ کو سخت تنبیہ حاصل ہوگی، اور اُسے یقین ہو جائیگا، کہ کاہلی و غیر مستعدی خود اُسی کے حق میں مضر ہے۔

یا مثلاً، فرض کیجیے کہ ہمنے کسی بچہ کو ایک کھلونا لے دیا، جو اُس نے

دوسرے ہی دن محض اپنی لاپروائی سے کھو دیا، اور اب ہمسے دوسرے کھلونے کے لیے تقاضا کر رہا ہی۔ ایسی صورت میں قدرتی سزا، اُسکو ڈانٹ ڈپٹ کرکے اُسکی خواہش پوری کردینا نہیں ہی، بلکہ اُسکی خواہش کو نہ پورا کرنا ہی۔ اور متانت کے ساتھ اُس سے کہدینا ہی کہ "اِس کھلونے میں میرے دام صرف ہوے تھے، اور روپیہ کمانے کے لیے محنت درکار ہی، میرے پاس اتنا روپیہ نہیں، کہ تمھیں روز روز نیا کھلونا دیا کروں"۔ بچہ کے ذہن میں مال کا مفہوم، اور اُسکے حصول کے لیے محنت کا لازمی ہونا، اسی طرح ثابت ہوگا۔

اس قدرتی طریقۂ تادیب پر پوری پابندی کے ساتھ عمل کرنے سے چند ایسے فوائد پیدا ہوتے ہیں، جو مصنوعی سزاؤں کے ذریعے ممکن نہیں:۔

اولاً۔ اس سے بچہ کو علت و معلول کا صحیح تصور پیدا ہوتا ہی۔ جب اُسے ہر قصور کی ہمیشہ سزا ملیگی، اور بلا قصور کبھی سزا نہ ملیگی، تو اُسے یقین ہوجائیگا کہ اعمال اور اُنکے نتائج میں ایک ناقابل انفصال تعلق ہوتا ہی۔

دوسرے۔ اس سے خالص انصاف کی تربیت ہوتی ہی۔ یعنی جس قسم کا قصور ہوتا ہی، اُس میں اور اسکی سزا میں ایک خاص مناسبت ہوتی ہے۔ مثلاً بچہ نے کیچڑ میں اپنے کپڑے لت پت کر ڈالے اور ہمنے اُسکی گوشمالی کی، تو بچہ کی صاف سمجھ میں نہ آئیگا، کہ اُسکی شرارت کو سزا سے ربط کیا ہی، بخلاف اسکے اگر ہم صرف اتنا کریں کہ اُسی سے اُسکے کپڑے صاف کرائیں، تو اس سزا کے انصاف کی گواہی بچہ کا دل دے گا۔

تیسرے۔ یہ طریقہ والدین کے حق میں زیادہ سودمند ہی۔ بچوں پر ہر وقت اظہار غیظ و غضب کرنے سے والدین کو ایک قسم کی کوفت ہوجاتی ہے، اور پھر جب بچوں کی فرمائش پوری کرتے ہیں، تو گویا مالی حیثیت سے اپنے اوپر ایک اور جرمانہ کرتے ہیں۔ حالانکہ قدرتی طریق سزا دہی میں وہ اِن دونوں تکالیف سے محفوظ رہیں گے

چوتھے۔ اس سے والدین و اولاد کا باہمی تعلق زیادہ دوستانہ اور زیادہ موثر رہتا ہی۔ مصنوعی سزاؤں سے بچہ کے ذہن میں عموماً یہ خیال جم جاتا ہی، کہ والدین کو اُس سے پرخاش ہی، اور وہ اُسے ستانے کی غرض سے اُسے بعض چیزوں سے روکتے اور سزا دیتے ہیں۔ لیکن قدرتی سزاؤں سے خود بچہ کی سمجھ میں بھی یہ بات آجاتی ہی، کہ والدین صرف اُسی کی بہبود و بھلائی کے لیے اُسے بعض افعال سے منع کرتے ہیں۔

الغرض، اسپنسر کی رائے میں، بچوں کے ضابطۂ تعزیرات کا معیار تمام تر قدرتی طرز سزا دہی ہونا چاہیے۔ اور والدین و معلم کو خود کوئی سزا تجویز کرنے کے بجاے، محض فطرت کے ہاتھ میں ایک آلۂ تعزیر رہنا چاہیے۔ لیکن جیسا کہ حال کے اکثر ماہرین فن نے نکتہ چینی کی ہی، ہمارے نزدیک اس رائے میں اسپنسر کسی قدر حدّ اعتدال سے بڑھ گیا ہی۔ اصل یہ ہی کہ فطری سزائیں ہمیشہ جرائم کے تناسب نہیں ہوتیں، مثلاً کسی بچہ کا ایک کھلا ہوا اُسترہ ہاتھ میں اُٹھا لینا، اگرچہ ایک نہایت خفیف بداحتیاطی ہی، لیکن اگر والدین ایسے موقع پر دخل نہ دیں، تو بالکل ممکن ہی کہ بچہ کی جان کا خاتمہ ہوجانے۔ اسی طرح دیگر صدہا مواقع ایسے پیش آتے ہیں، جن میں اگر سزا کو محض فطرت پر چھوڑ دیا جائے، تو نہایت ادنی خطاؤں کی شدید ترین پاداش ملتی ہے۔

نصائح کی صورت میں تربیت اخلاق کے متعلق اسپنسر نے جو عملی ہدایات دیے ہیں وہ خصوصیت کے ساتھ قابلِ توجہ ہیں:۔

(۱) بچوں سے زیادہ اخلاقی نیکیوں کی توقع نہ کرو۔ عام خیال یہ ہی کہ بچے معصوم ہوتے ہیں، اِس جھوٹھ میں سچ صرف اتنا ہی کہ بچوں کو بداخلاقیوں کے وقت اسکا احساس نہیں ہوتا کہ وہ کوئی مذموم فعل کر رہے ہیں، ورنہ اگر اُنکی روزانہ زندگی کا مشاہدہ کرتے رہو تو معلوم ہوگا کہ وہ کثرت سے ہر قسم کے ذمائم اخلاقی کے مرتکب ہوا کرتے ہیں، جسکی وجہ، قانون ارتقا کی روشنی میں یہ ہی کہ ہر متمدن شخص کو ابتدائی عمر میں، اس اخلاقی منزل سے ہوکر گزرنا پڑتا ہی، جس میں اُسکے اجداد بعیدہ یعنی قدیم وحشی افراد تھے۔ جس طرح بچہ کا قیافہ، مثلاً چپٹی ناک، کھلے ہوے نتھنے، موٹے موٹے ہونٹ، پھٹی پھٹی آنکھیں، چہرہ کی غیر موزونی،

متانت کی عدم موجودگی وغیرہ، کچھ عرصہ تک وحشیوں کے قیافہ سے مشابہ رہتا ہی اسی طرح اسکی فطرت بھی انکے مشابہ رہتی ہی۔ یہی وجہ ہی کہ بیرحمی، دغابازی، جھوٹ، اور چوری کا میلان بچوں میں نہایت عام طور پر پایا جاتا ہی، اور جس طرح رفتہ رفتہ انکے جسمانی قیافہ میں تغیر ہوتا جاتا ہی، اسی طرح اس میلان میں بھی۔

(۲) اس لیے متوسط درجہ کی تجویزوں اور متوسط نتیجوں پر قناعت کرو۔

قوائے عقلی کی طرح، قوائے اخلاقی بھی نہایت پیچیدہ ہوتے ہیں۔ پس جس طرح اعلیٰ درجے کی عقل آہستہ آہستہ حاصل ہوتی ہی، اسی طرح اعلیٰ درجے کی اخلاقی زندگی تک بھی رفتہ رفتہ تدریجی نشو و نما ہو سکتا ہی۔ اسلیے والدین کا اولاد کو بات بات پر ٹوکنا، اور انکے تمام جزئیات کو اعلیٰ اخلاقی معیار پر مکمل پانے کی توقع رکھنا خود انکی خام خیالی ہے۔

(۳) بچوں کے حق میں محض بحیثیں آلہ کی طرح برتاؤ نہ کرو۔

یاد رکھو کہ بچہ کے افعال کی ان قدرتی سزاؤں کے علاوہ جو مختلف حالات کے اثر سے اسپر عائد ہوتی ہیں، تمھاری خوشنودی یا ناراضی بھی ایک قدرتی سزا ہے۔ ہمکو جس طریقہ پر اعتراض ہی وہ یہ ہی کہ جو سزائیں فطرت نے رکھی ہیں، انکے بجائے مصنوعی سزاؤں اور والدین کی ناراضی کو رکھا جاتا ہی، لیکن ہمارا یہ منشا ہرگز نہیں کہ قدرتی سزاؤں کے ساتھ ساتھ بھی انکو استعمال نہ کرنا چاہیے۔ یہ بیشک نہ ہونا چاہیے کہ، دوم درجہ کی سزا، اول درجہ کی سزا کی جگہ غصب کر لے، تاہم اسے اول درجہ کی سزا کے ساتھ، بطور ضمیمہ، اعتدال کے ساتھ شامل کر دینا مناسب ہے۔

(۴) احکام کی تعداد میں کمی کرو۔ حکم صرف اسوقت دینا چاہیے جب وسائلِ تربیت بچہ کی سمجھ سے باہر ہوں، یا وہ ناکام رہے ہوں۔ اسکے علاوہ تمھارے احکام کا محرک، تمھارا ذاتی رنج یا غصہ نہ ہونا چاہیے، بلکہ اسکا مقصود صرف بچہ کی اصلاح، اور اسکے قصور پر ملامت ہونا چاہیے۔

(۵) مگر جب کبھی حکم دو، قطعیت و استقلال کے ساتھ دو۔ اگر صورت واقعہ تمھیں تحکم پر مجبور ہی کر رہی ہی، تو اپنا حکم ناطق جاری کرو، اور پھر ہرگز اس سے انحراف نہ کرو۔ جو حکم دینے والے ہو، اسکے تمام پہلوؤں کو سوچ لو، اسکے تمام نتائج کا وزن کر لو، اور اس بات پر غور کر لو کہ تمھارے ارادہ میں کافی استقلال ہی یا نہیں، پھر جب آخر کار ایک قانون بنا لو، تو چاہے کتنا ہی نقصان ہو، اسکی تعمیل پر زور دو۔ تمھاری سزائیں ان سزاؤں کے مشابہ ہونی چاہئیں، جو موجوداتِ غیر ذی روح دیتے ہیں، یعنی اٹل ہونا چاہیے۔ بچہ جب پہلی مرتبہ آگ کے قریب ہاتھ لیجاتا ہی، تو گرمی محسوس کرتا ہی، دوسری مرتبہ بھی محسوس کرتا ہی سہ بارہ بھی یہی ہوتا ہی، یہاں تک کہ اسے یقین ہو جاتا ہی، کہ آگ ہمیشہ جلائے گی۔ پس اگر تم بھی اپنے احکام میں مستقل رہو، تو قوانین قدرت کی طرح، تمھارے قوانین کی وقعت بھی انکے ذہن میں پیدا ہو جائے گی۔ ورنہ یاد رکھو کہ تمھارا ہر تلوّن، تمھاری ہر کمزوری، بچہ کو عدول حکمی کی ترغیب دے رہی ہی۔

(۶) بچہ کے عقلی نشو و نما کے ساتھ اپنی تحکمانہ مداخلتوں کو کم کرتے جاؤ

تربیت کا مقصد، ایسے شخص کا پیدا کرنا ہونا چاہیے، جو اپنے نفس پر آپ حکومت کر سکے، نہ ایسا کہ جسکے اوپر دوسرے حکومت کریں۔

اگر تمھاری اولاد کی قسمت میں دائمی غلامی لکھی ہو، تو بیشک انھیں جس قدر غلامی کا خوگر بناؤ، بہتر ہی، مگر چونکہ انھیں رفتہ رفتہ آزاد بنانا ہی اس لیے جب وہ تمھارے زیر نظر ہیں، اسی وقت سے انھیں اپنے نفس پر قابو رکھنے کی عادت ڈلواؤ۔ اس لیے جوں جوں انکی عقل میں نمو ہوتا جائے اپنی روک ٹوک میں کمی کرتے جاؤ۔

(۷) اگر بچہ زیادہ ضد اور خود رائی ظاہر کرے، تو اسکا افسوس نہ کرو۔

اگر ہمیں آیندہ نسل میں آزادی رائے و اجتہاد فکری کی اسپرٹ پیدا کرنا مقصود ہی تو اسکا لازمی مقدمہ یہ ہی کہ ان میں بچپن ہی سے آزادی افعال کا، حدودِ جائز تک نشو و نما ہونے دو۔

(۸) آخری نصیحت یہ ہی، کہ صحیح طریقہ پر بچوں کو تربیت دینا آسان نہیں، بلکہ ایک پیچیدہ و مشکل کام ہی۔ اس لیے اگر کوئی کامیاب اخلاقی

معلم ہونا چاہتا ہی، تو اُسکے لیے مطالعہ، ذہانت، محنت، و نفس کُشی کے مجموعہ سے تیار رہنا لازمی ہے -

اسپنسر کے نصائح ختم ہو چکے، لیکن ہمارے نزدیک جو نکتہ اخلاقی و عقلی دونوں چیزوں کی تربیت میں سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہی، اُسے اسپنسر نے تصریح کے ساتھ کہیں نہیں بیان کیا، اور وہ سائکالوجی کا یہ زبردست قانون ہی، کہ "عملی نمونہ، ہمیشہ زبانی ہدایت سے زیادہ کارگر و موثر ہوتا ہی"- اسی لئے والدین و معلمین کے لیے شرط اوّلین یہ ہی، کہ وہ خود، اپنے بچوں کے لیئے اخلاقی و نیز عقلی حیثیت سے ایک زندہ نظیر ہوں، ایک کمل نمونہ ہوں، جسکی تقلید کے لیے بچوں کا نفس اُنھیں غیر محسوس طور پر یعنی Unconscions ۱۷ مجبور کرے گا -

(ج) جسمانی تربیت - صحت جسمانی، جس عام کیفیت سے عبارت ہی، اس میں عموماً جتنی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں، اُنکے اسباب تحلیل ہو کر آخر کار ذیل کے چار عنوانات پر ٹھہرتے ہیں : -

(۱) غذا کی خرابی سے،

(۲) لباس کی خرابی سے،

(۳) ورزش نہ کرنے سے،

(۴) دماغی محنت، زائد از اعتدال کرنے سے،

اسپنسر نے اس موضوع پر بجاے اصولی مباحث چھیڑنے کے، مرض کے انھیں اسباب اربعہ کو کسی قدر پھیلا کر بیان کر دیا ہی، اور اُسکے پیش نظر مقصد کے لیے اتنا کافی تھا، اس لیے کہ مذکورۂ بالا بداحتیاطیوں سے بچنے ہی کا نام صحت ہی، اور قوانین صحت کے سمجھنے اور سمجھنے کے بعد انکے برتنے ہی کیلیے دوسرا لفظ، تربیت جسمانی ہے -

سب سے پہلے غذا کی خرابیوں کو لیجئے، ظاہر ہی کہ غذائی بداحتیاطی کی دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں یعنی ایک کمیّت یا مقدار کے لحاظ سے بداحتیاطی دوسرے کیفیت، نوعیت غذا کے لحاظ سے - پھر ان میں سے کمی بداحتیاطی کی بھی دو قسمیں ہیں - ایک پُرخوری، یعنی بھوک سے زیادہ کھا لینا، دوسرے کم خوری، یعنی بھوک سے کم کھانا - عام خیال ہی کہ کم خوری بہرحال مستحسن ہی لیکن اسپنسر اس استدلال کی بنا پر کہ انسان و نیز دیگر حیوانات کے بہترین رہبر خود اُنکے طبعی حاجات ہوتے ہیں، یہ فیصلہ کرتا ہی کہ بچوں کے لیے بھوک سے کم کھانا مضر ہی، بلکہ انھیں جب جب اشتہاے صادق معلوم ہو، کھانا کھانا چاہیے - یہاں تک کہ اُسکے نزدیک پُرخوری اور کم خوری اگرچہ دونوں یکساں مُضر ہیں، تاہم مدارج مضرت کے لحاظ سے اول الذکر بہتر و قابل ترجیح ہی- ایک مستند طبی شہادت کے حوالہ سے کہتا ہی کہ

اگر کبھی خوب ڈٹ کے کھانا کھا لیں، تو اسکے نتائج بھوکے رہنے کے مقابلہ میں بکمتر مضر ہوتے ہیں، اور انکا تدارک زیادہ آسانی سے ہو سکتا ہی۔

اسپنسر کا یہ دعوے اگرچہ بخوبی ثابت نہیں، اس لیے کہ جس طبی شہادت کا اسنے حوالہ دیا ہی، اُس سے صرف اتنا ثابت ہوتا ہی کہ کبھی اتفاقی طور پر زیادہ کھا لینا، دائمی کم خوری سے بہتر ہی، اور اس نتیجہ کی صحت سے کبھی کسی کو انکار نہیں، بلکہ سوال یہ تھا کہ دائمی پُرخوری اور دائمی کم خوری میں کون نسبتاً قابل اختیار ہی- لیکن خیر، یہ سوال چنداں اہمیت نہیں رکھتا- اصل مسئلہ جس پر اسپنسر اور اُسکے مخالف خیال رکھنے والے دونوں متفق ہیں وہ یہ ہی کہ بچوں کو اپنی اشتہا کے موافق کھانا چاہیے، اور افراط و تفریط دونوں سے بچنا چاہیے، اول الذکر سے تو اس لیے کہ اُسکا نتیجہ یقیناً سوء ہضم اور سلسلہ امراض ہی، اور آخر الذکر سے اسلیے کہ کم خوری سے ان میں طاقت کم آئے گی اور اس طرح آیندہ نسل جوان ہو کر بھی کمزور رہیگی -

مقدار غذا کے مساوی اہمیت رکھنے والا سوال، نوعیت غذا کا بھی ہی- بعض حلقوں میں ایک عام خیال پھیل گیا ہی کہ بچوں کے لیے مقوی خوراک مضر ہی- بلکہ اُنھیں نہایت ہلکی غذا دینی چاہیے، اور اس بنا پر اُنھیں گوشت سے محروم رکھا جاتا ہی، لیکن اسپنسر، علم الحیات اور طب کے قوانین کی بنا پر اس عقیدہ کی پوری تردید کرتا ہی، اور یہ ثابت کر کے کہ گوشت خوری جب تمام

بالغ وسن رسیدہ اشخاص کے لیے عموماً مفید ہی، تو بچے اس قانون سے کیوں مستثنیٰ ہوں؟ ہاں صرف شیرخوار بچہ کے معدہ کے لیے البتہ گوشت شاید ناموافق غذا ہو، اس لیے کہ اُس میں عضلاتی قوت ابھی کافی طور پر نہیں ہوتی، جو گوشت کے ہضم کے لیے ضروری ہی۔ لیکن اوّلاً تو یہ نقص محض اُس گوشت پر عائد ہوتا ہی جسکے ریشے نکال لیے جاتے ہیں، دوسرے یہ کہ شیرخواروں (یعنی دو ڈھائی سال کے بچوں) کے لیے کوئی شخص گوشت خوری کی وکالت بھی نہیں کرتا۔

تیسری ہدایت، غذا سے متعلق، اسپنسر یہ کرتا ہی کہ خوراک میں تنوع ہوتا رہنا چاہیے۔ یعنی مختلف اوقات میں اور نیز ایک ہی وقت میں مختلف اقسام کے کھانے ہونے چاہییں، اس لیے کہ علم افعال الاعضا میں ثابت ہو چکا ہی کہ تنوعِ غذا معدہ کے لیے ایک قوی محرک ہی، اور اس سے ہضم میں نہایت سہولت ہوتی ہی۔ لیکن اس تنوع میں بھی اعتدال رہنا چاہیے۔ بہت کثرت سے کھانوں کا مختلف ہونا بجائے مفید ہونے کے مضر ہوتا ہی۔

غذا کی طرح لباس میں بھی ہمیں بچوں کے احساسات پر کامل اعتماد رکھنا چاہیے۔ یعنی سردی و گرمی کے ناگوار حاسات سے جسم کو محفوظ رکھنا لباس کی علت غائی قرار دینا چاہیے۔ اس بنا پر اسپنسر کی پہلی نصیحت یہ ہی، کہ

۱- بچوں کا لباس ہرگز اس قدر زیادہ نہ ہونا چاہیے، جس سے حرارت پیدا ہو، اور ہمیشہ اس قدر کافی ہونا چاہیے کہ سردی کا عام احساس نہ ہو۔

اسکے علاوہ، اُسکے نصائح ذیل بھی قابل لحاظ ہیں:-

۲- روئی، سن، یا مخلوط بُناوٹ کے باریک کپڑوں کے بجاے، کسی عمدہ مادّہ کا کپڑا ہونا چاہیے، جس سے جسم کی حرارت باہر نہ نکلنے پائے۔ مثلاً دبیز اونی کپڑا۔

۳- کپڑا ایسا مضبوط ہونا چاہیے، جو طفلانہ کھیل کود کے باعث گھِسنے اور پھٹنے سے محفوظ رہے۔

۴- اُسکا رنگ ایسا ہونا چاہیے کہ استعمال میں آنے اور کھُلے رہنے سے جلد اُڑ نجائے۔

تربیت جسمانی کے ذیل میں تیسرا عنوان ورزش کا ہی۔ لیکن چونکہ عموماً لوگ ورزش اور اُسکے فوائد، اور اسکی اہمیت سے از خود واقف ہیں، اسپنسر کو اسکے متعلق کچھ زیادہ کہنے کی حاجت نہیں۔ اس سلسلہ میں وہ جن امور پر زور دینا چاہتا ہی وہ صرف دو ہیں۔

اوّلاً یہ کہ ورزش کو لڑکوں تک محدود نہ رکھا جائے، جیسا کہ عام دستور ہی، بلکہ لڑکیوں کو بھی اس میں مساوی شرکت کا موقع دیا جائے۔ جو قوانین حیات لڑکوں کے لیے ہیں، وہی لڑکیوں کے لیے ہیں، جو اصول صحت ایک کے لیے ہیں، وہی دوسرے کے لیے بھی، پس کوئی وجہ نہیں ہی کہ محض رسمی شرم و مصنوعی حیا کی خاطر، لڑکیوں کو ورزش کا موقع نہ دیکر، اُنکو ساری عمر کے لیے کمزور و ناتوان رکھا جائے۔ رواج پرستوں کو سمجھنا چاہیے کہ جس شے کو وہ لڑکوں کے لیے تمغاے امتیاز خیال کرتے ہیں، یعنی حسن صورت، اسکا حصول بھی تمامتر صحت جسمانی پر منحصر ہی۔ ورزش نہ کرنا، رخساروں کی سرخی کا نہیں، بلکہ زردی کا باعث ہو سکتا ہی۔

دوسرے یہ کہ بچوں کے حق میں بجاے جمناسٹک وغیرہ مصنوعی ورزشوں کے، کھیل کود، دوڑ دھوپ، کی قدرتی ورزشیں زیادہ مفید ہیں۔ کچھ تو اسلیے کہ جمناسٹک وغیرہ میں بہ نسبت کھیل کود کی حرکتوں کے تنوع بہت کم پایا جاتا ہی، اور اس سے جسم کے سارے حصوں میں محنت کی ساوی تقسیم نہیں ہوتی۔ جسکا نتیجہ یہ ہوتا ہی کہ بعض اعضا پر زیادہ بار پڑ جاتا ہی، اور اس طرح مختلف حصص جسم کے نمو میں تناسب نہیں قائم رہتا۔ اور زیادہ تر اسلیے کہ ان مصنوعی ورزشوں سے بچوں کو بجاے فرحت حاصل ہونے کے تکان بہت جلد ہو جاتا ہی۔ برخلاف اسکے کھیل کود سے اُنھیں دلی فرحت حاصل ہوتی ہی، اور یہ ایک مسلّمہ طبی مسئلہ ہی کہ "فرحت تمام مقویات سے بڑھکر ہی"۔

تربیت جسمانی کی بحث ناتمام رہ جائے گی، اگر اس میں صحت کے سب سے بڑے، مگر مخفی دشمن کا ذکر نہ کیا جائے، اور وہ زائد از اعتدال دماغی محنت ہی۔

یہ امر بظاہر سخت حیرت انگیز ہی کہ آج بیسویں صدی میں، جبکہ حفظانِ صحت کے اصول سے بچہ بچہ واقف ہو گیا ہی، اور جبکہ طبی امداد و طبی مشوروں سے فائدہ اُٹھانے میں بےحد سہولتیں پیدا ہو گئیں، نئی نسل، بجاے کشیدہ قامت،

تومند و قوی ہونے کے، پستہ قد، نحیف اور ضعیف الجثہ ہوتی جارہی ہی، اور گزشتہ نسلوں سے موازنہ کرکے کہا جا سکتا ہی کہ اس میں جسمانی انحطاط ہی۔ اس انحطاط کا خاص باعث یہ ہی کہ ہماری تعلیم گاہوں، اسکولوں، کالجوں میں علی العموم جو نصاب تعلیم ہوتا ہی، وہ ہمیں حد مناسب سے زائد دماغی محنت پر مجبور کرتا ہی۔ مگر چونکہ بقول اسپنسر کے،

> فطرت بہت سخت محاسب ہی، اور جس قدر خرچ کرنے کے لیے وہ آمادہ ہی، اگر تم کسی مد میں اُس سے زائد کا مطالبہ کرو، تو وہ کسی دوسری مد سے کاٹ کر اپنا حساب برابر کرلیتی ہی، اور اسی واسطے جسم کی محدود قوت سے، ایک مقدار مقررہ سے زیادہ نتائج حاصل کرنا ممکن ہی۔

اس لیے دماغ پر جب ضرورت سے زائد بار پڑجاتا ہی، تو جسم کی ساری نمو بخش قوتوں (مثلاً خون) کا رُخ اُسی طرف پھر جاتا ہی، اور دیگر اعضاء جسم گویا فاقہ کشی کرنے لگتے ہیں۔ اسپنسر نے انگلستان کے بعض مدارس کی مثالیں پیش کی ہیں، جن طلبا کو لازمی طور پر ۱۳-۱۴ گھنٹہ روزانہ پڑھنا ہوتا تھا، اور اسکا لازمی نتیجہ، طلبا میں، سوء ہضم، قبض، اسہال، اختلاج قلب، عام اضمحلال و لاغری کا پیدا ہوجاتا تھا، جس سے بعض مرتبہ تپ کہنہ اور دق کی نوبت آجاتی تھی۔ (اسپنسر جیسے مُصلحین کی جدوجہد سے اب انگلستان کے مدارس کی تو یہ حالت نہیں رہی، لیکن ہندوستان کے اسکولوں و کالجوں کا جو حال ہی، وہ ہر شخص بچشم خود دیکھ رہا ہی) لیکن اگر ۱۳-۱۴ گھنٹہ روزانہ کی دماغی محنت، غیر معتدل ہی، تو معتدل دماغی محنت کے لیے کتنے گھنٹے روزانہ کا اوسط قرار دینا چاہیے؟ یہ ایک ضروری سوال ہی، جس کا جواب اسپنسر سے نظر انداز ہوگیا ہی، مگر ہم عام طبی رائے کی بنا پر کہہ سکتے ہیں کہ زیادہ سے زیادہ آٹھ گھنٹہ روزانہ، ورنہ ضعیف الجثہ لوگوں کے لیے اس سے کم۔

پھر نفس دماغی محنت کی افراط اتنی مضر نہیں، جتنا وہ خاص طریقہ مضر ہی، جس سے ہمارے دماغ سے، کالجوں و اسکولوں میں کام لیا جاتا ہی، اور وہ طریقہ الفاظ کو حفظ کرنے اور ازبر کرنے کا ہی۔ طوطے کے مثل رٹ لینے سے جو خاص نقصانات ہوتے ہیں، اگرچہ وہ جسمانی اور ذہنی صحت سے یکساں تعلق رکھتے ہیں، مگر اسپنسر نے انھیں بحیثیت جسمانی کے زیر عنوان رکھا ہی:-

(۱) یہ طریقہ خراب ہی اس لحاظ سے کہ جو کچھ علم اس سے حاصل ہوتا ہی وہ جلد فراموش ہوجاتا ہی۔ جس طرح جو غذا، بغیر چبائے ہوئے اوپر تلے نگل لی جاتی ہی، وہ جزو بدن نہیں ہوتی اور معدہ اُسے فوراً نکال دیتا ہی، اُسی طرح رٹے ہوئے معلومات بھی دیرپا نہیں ہوتے۔ رٹنے والے پاس شدہ طلبا کو دیکھو امتحان کے بعد اپنا کورس کتنا جلد بھول جاتے ہیں۔

(۲) خراب اس لحاظ سے کہ چونکہ اس طریقہ سے بچہ کو دلچسپی نہیں پیدا ہوتی اسلیے آخر کار اُسکا ذہن علم سے نفرت کرنے لگتا ہے۔

(۳) خراب اس لحاظ سے، کہ اس سے تعلیم کا مقصد اصلی، یعنی "انضباط علم" فوت ہوتا ہی۔ ممکن ہی کہ قوی الحافظہ آدمی اپنے دماغ میں بہت سے معلومات ٹھونس لے، لیکن چونکہ وہ مرتب و مربوط نہیں ہوتے اسلیے اُن سے کام نہیں لے سکتا۔

(۴) خراب اس لحاظ سے، کہ چونکہ یہ صحت جسمانی کو متزلزل کردیتا ہے، اگر اس طریقہ سے انسان کامیاب بھی ہوگیا، تو زندگی کا لطف نہیں حاصل کرسکتا، ایسی دولت و شہرت سے انسان کو کیا لطف مل سکتا ہی جسکا لازمی ضمیمہ مراق یا اختلاج ہو؟

(۵) خراب اس لحاظ سے، کہ یہ جسم کو لاغر و ناتوان کرکے، قوت ارادی و مستعدی کو ضعیف کردیتا ہے، جس کے بغیر انسان اپنی عقل سے کچھ کام نہیں لے سکتا۔

الغرض، غذا، لباس، ورزش، اور دماغی محنت میں اعتدال، یہی چار چیزیں ہیں، جن پر عمل درآمد کرنے سے، اسپنسر کی رائے میں جسمانی تربیت پوری طرح پر حاصل ہوسکتی ہی، اور ہمارے نزدیک اگر اس میں ایک چیز یعنی انضباط وقت کا اور اضافہ کردیا جائے، تو یہ فہرست بالکل مکمل کہی جا سکتی ہے۔

"متعلم"

ہمارے تمدنی تصورات میں انقلاب

عام خیالات اور تصورات میں انقلاب

اہل نظر اور اربابِ فکر اُن تغیرات سے واقف ہیں جو کچھ مدت سے مہذب دنیا کے خیالات و قیاسات میں نظر آ رہے ہیں۔ اسکی علت چارلس ڈاروِن کی بیس سالہ تحقیقات، غور و فکر، مشاہدہ اور سیاحت کے نتائج کی اشاعت قرار دیجاتی ہے علمی تصورات کا انقلاب مسئلۂ ارتقا بذریعہ انتخاب طبعی یعنی "نیچرل سیلکشن" منسوب کیا جاتا ہے۔ خود انسان عمل ارتقا کا اعلےٰ ترین نتیجہ قرار دیا گیا ہے۔ بریں وجہ جملہ علوم میں ایک نیا اثر محسوس ہو رہا ہے۔ علمِ انسان اور اُسکی تمدنی ترقی کے مسائل پر بھی ارتقائی پہلو سے بحث کی جاتی ہے۔ اخلاقیات، سیاسیات، اقتصادیات، دینیات، اور فلسفہ کے تمام مسائل بھی اسی عالمگیر قانون کے تابع کیے گئے ہیں اور اب انپر اسی اصول کی روشنی میں بحث کیجاتی ہے۔ صدیوں کے تصورات اور مفروضات اور علمی مسلمات تہ و بالا ہو گئے ہیں۔ الغرض ایک نہایت عظیم الشان انقلاب خیالات میں واقع ہو رہا ہے۔ پرانے اصولوں سے انکار اور اصول ارتقاء کا اقرار ہر عالم اور محقق کی زبان پر ہے۔ یہاں پر مجھے خصوصیت کے ساتھ یہ دکھانا منظور ہے کہ ہمارے خیالات دربارۂ نظام تمدن پر ارتقا کا کیا اثر ہوا ہے۔ مگر اس سے قبل ارتقا کا تذکرہ لازم آتا ہے۔ کیونکہ بالعموم لوگ اس مسئلہ کی ہیئت اور معنی سے بخوبی ماہر نہیں ہیں۔ اور اسکی نسبت اُنکا علم "بندر سے انسان بننے" ہی تک محدود ہے

مسئلۂ ارتقا کی تاریخ

کون و فساد کا خیال بہت پرانا ہے

"کون و فساد" کے معنی میں ارتقا نیا مسئلہ نہیں بلکہ پرانا ہے یعنی کئی پرانے فلاسفر جن میں مشہور ہند و فلاسفر کپل[1] بھی ہے، یہ مانتے تھے کہ عالم اور عالم و مافی العالم شروع سے اسی صورت میں نہیں ہیں جو ہمیں اب نظر آ رہی ہے، بلکہ عمل تغیر سے اُنکی صورتیں

---

[1] مہرشی کپل نے ارتقا کی دو صورتیں مانی ہیں۔ ایک تو "العالم متغیر" اور دوسرا اشیاے ذی اعضا کا بتدریج پیچیدہ اور مرکب صورتیں قبول کرنا۔ اصول العالم متغیر تو اسکے فلسفہ کی جان ہے۔ اور دوسری صورت محض اسکی شاخ ہے۔ کپل کے اصول العالم متغیر (Cosmic Evolution) کو کماحقہ سمجھنے کے لیے پُرش اور پرکرتی کو سمجھ لینا ضروری ہے۔ دنیا کے مظاہر معروف کا اصلی مبدأ (Noumenon) پرکرتی ہے۔ پُرش "شعور مجہول" کا اصل اصول ہے۔ دنیا کے تمام مظاہر کی تہ میں تین قوتیں ہیں (۱) رجس۔ یعنی قوت متحرک (۲) تمس۔ یعنی قوت انفصال (۳) تیسری قوت ان سے بالکل نرالی ہے جو حرکت و سکون میں موافقت پیدا کرتی ہے۔ ہر ایک عمل تغیر میں قوت مثبت قوت منفی اور قوت ارتباط ہوتی ہے اور انکی متوازن حالت یعنی ان سب کے مساوات کے ساتھ موجود ہونے کا نام پرکرتی ہے اور انکا توازن حالت سکون ہے جو حالت تغیر کی ضد ہے۔ سچ پوچھو تو یہ مجرداتِ فلسفہ سے ہے۔ پرکرتی اپنی محسوس صورت میں پردھان یعنی دنیائے ظہورات کہلاتی ہے اور مختلف صورتوں میں اپنی قوت اور اصلیت کو ظاہر کرتی ہے۔ مگر پرکرتی یا پردھان (کائنات) پُرش سے لازم و ملزوم کا تعلق رکھتی ہے۔ پرکرتی کا پُرش کے بغیر تصور کرنا محال ہے۔ پُرش کا وجود سنسار پر ارتعاش یعنی اس تعلق باہمی سے عیاں ہے۔ مگر پرکرتی غیر ذی عقل اور متحرک ہے۔ پُرش ذی عقل مگر ساکن ہے۔ پھر ارادت کی فعلیت، تخیل کی تحریک، اور اسکا سکون کیسے پیدا ہوتا ہے؟ کپل اسے اصول العالم متغیر سے منسوب کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ گو پُرش عدم فعلیت کی حالت میں اور شعور مجہول سے بہرہ یاب ہے تاہم وہ پرکرتی کے عمل پر حکمراں ہے کیونکہ پرکرتی ہر جگہ موجود ہے۔ جیسے مقناطیس کی کشش لوہا قبول کرتا ہے ویسے ہی پرکرتی پر پُرش کا اثر ہوتا ہے یعنے اسکی ہدایت یا بالفاظ دیگر روح کی حکومت کائنات پر اسکی قربت کی وجہ سے ہے جیسے مقناطیس کی نزدیکی سے لوہا اثر پکڑتا ہے (پہلا کھنڈ ۹۶ اشلوک) اس اصول کو قبول کرنے سے یہ ظاہر ہے کہ دنیا کے تمام مظاہر پرکرتی کے پُرش کے پاس ہونے کی وجہ سے انقلابات اور تغیرات ہیں۔ پرکرتی سے اسی طرح پہلے ارادت کی فعلیت اور تخیل کا عمل مخرج ہوتا ہے۔ پرکرتی عمل ارتقا سے اپنے وجود سے ارادت اور تخیل کے خانے یا پنجر پیدا کرتی ہے جسکے اندر پُرش رہتا ہے۔[2]

بدلتی چلی آئی ہیں۔ ابتدائے عالم میں نہ تو انواع و اقسام کے اتنے نباتات تھے اور نہ مختلف قسم کے اتنے جاندار تھے۔ چند ہزار سال پیشتر انواع انسانی بھی اتنی نہ تھیں جتنی اب دنیا کے ہر گوشہ میں تمدنی ترقی کی مختلف منزلوں میں نظر آرہی ہیں، مگر اصول ارتقا انسان اور اسکی وجہ سے اسکے تمدنی حالات و مسائل پر حال ہی میں عائد کیا گیا ہے۔ ڈاروِن کی مشہور کتاب "ابتدا الانواع" (ORIGIN OF SPECIES) کی اشاعت سے پیشتر کئی عالم اور محقق ایسے گزرے ہیں جنھوں نے ارتقا کا تصور پیش کیا تھا

ڈاروِن سے سو برس پیشتر کی حالت

اسکا مختصر ذکر مناسب ہے۔ ڈاروِن کی کتاب محولۂ بالا کی اشاعت سے پیشتر کئی عالموں نے ارتقا کا تصور پیش کیا تھا، جسکی ابتدا اٹھارہویں صدی کے دوسرے نصف حصّہ میں ہوئی تھی۔ جرمنی کے مشہور و معروف فلاسفر عمانوئیل کانٹ کے مسئلۂ سحاب (Nebular Hypothesis) کو فرانسیسی فلکی عالم لاپ لاس اور مشہور انگریز محقق فلکیات سر ولیم ہرشل کی کوششوں سے سائنسی اور تحقیقی صورت حاصل ہو چکی تو عالم کے ارتقاء طبعی کے خیال کی قبولیت کے لیے رستہ صاف ہو گیا۔ ادھر بایالوجی (علم الحیوٰۃ) کے کئی محقق علماء تحقیقات کی بنا پر یہ ماننے کو تیار ہو گئے تھے کہ انواع نباتی اور حیوانی کی تدریج صورتیں بدلتی رہتی ہیں اور یہ قاعدہ مدت دراز سے کائنات میں رائج ہے۔ اٹھارھویں صدی کے وسط میں فرنچ محقق بفون (Buffon) نے یہ خیال پیش کیا تھا کہ پودھوں اور جانوروں کے درمیان صورتہائے متعلقہ کا پتہ چلتا ہے نیز اولاد اور والدین کی مشابہت باہمی کے اصول کو دیکھکر یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ انکی ابتدا ایک ابتدائی جوڑے سے ہوئی ہے۔ لامارک (Lamarck) اور سینٹ ای لیر (St. Hilaire) نے جو فرانسیسی عالم تھے اسی قسم کے خیالات ظاہر کیے تھے۔ لامارک کی رائے میں تمام انواع ایک یا چند ابتدائی صورتوں سے وجود پذیر ہوئی تھیں۔ گرد و پیش کے طبعی حالات اور اسباب کی وجہ سے جانوروں کے اعضا میں استعمال یا عدم استعمال سے ترقی ہوتی رہی اور اسی کی بدولت شکل و صورت اور قد و قامت میں تغیر و تبدل ہوتے چلے آئے ہیں۔

جرمن محققوں کی تحقیقات

جرمنی اور انگلستان کے کئی محقق بھی اس نتیجہ کی طرف قدم بڑھا رہے تھے۔ کانٹ کے نظریۂ سحاب کے ساتھ یہ خیال بھی پیدا ہو گیا تھا کہ ذی اعضا ہستیوں کی صورتیں بتدریج تغیر قبول کرتی چلی آتی ہیں۔ مشہور فلسفی شاعر و فاضل گیٹی (Gœthe) اور طبعیات کے نامی عالم اوکن (Oken) نے یہ رائے دی کہ جانداروں کی صورتوں میں انقلاب پیدا ہوتا چلا آتا ہے۔ وولف (جس نے علم جنین [Embryology] کی بنیاد قائم کی تھی) میکل، اور بئر نے مضغہ کی نشو و نما اور رحم کے اندر کی تبدیلیوں کا مشاہدہ اور تجربہ کرکے انسان اور جانوروں کے ارتقا کا خیال قائم کیا تھا۔ اس

لھ اور یہ کائنات کا اول تخم یا نتیجہ ہے جسے سحاب یا غیر معین وجود کہنا بجا ہوگا۔ اسکا مقصود ایتھر، ظرف، زمان، ہوتا ہے۔ پھر اس سے افرادی ہستیاں پیدا ہوتی ہیں جو اہنکار یا شعور سے بہرہ اندوز ہوتے ہیں۔ پھر ارادت اور خیال کے ڈھیر تھیرے پیدا ہوتے ہیں جسے دہ چرم اہنکار کہتا ہے۔ ایتھر سے ظرف و زمان پیدا ہوتے ہیں۔ ارادت اور خیال کے خانوں کے بعد شخصیت پیدا ہوتی ہے لنگ شریر (جسم ایتھری) سے جس شعور اور رو چار شکتی ہے پانچ تن منتر یعنی حواس خمسہ کے اعضا پیدا ہوتے ہیں۔ پھر لنگ شریر سے جسم کثیف پیدا ہوتا ہے اور اسکے ساتھ دس گیارہ جسمانی حسیں پیدا ہوتی ہیں اور انھیں پانچ تن منتروں سے عناصر خمسہ پیدا ہوتے ہیں۔ یہ ہے اسکا ارتقاء عالم۔ اسکی دوسری شاخ یہ ہے کہ یہ لنگ شریر یا اہنکار سے شروع ہوتا ہے۔ کپل یا ہندو فلاسفروں کے خیال میں انسانوں، جانوروں اور درختوں کے مختلف صورتوں میں نمایاں ہونے سے پیشتر ہر نوع لنگ یعنی ایتھری جسم میں ہوتی ہے کپل اسے جسم کثیف کا اصل مادہ قرار دیتا ہے۔ سانکھیہ کے پیرو کہتے ہیں کہ اجسام کثیف تخم، انڈے یا مضغہ سے ارتقا پذیر ہوتے ہیں اور یہ دو وجودوں سے پیدا ہوتا ہے۔ انواع تخموں کے انقلاب سے پیدا ہوتی رہتی ہیں یعنی انواع سے بیج اور بیجوں سے انواع۔ یہ انقلابی چکر چلتا رہتا ہے۔ تغیر کا سلسلہ تخم یا انڈے یا مضغہ سے شروع ہوتا ہے۔ مگر تخم کیسے پیدا ہوتا ہے؟ یہ پرش کے زیر نگرانی اُسکے خادم یعنی لنگ شریر کے ذی شخصیت ڈھیر سے تیار ہوتا ہے۔ کپل کے مسئلۂ ارتقا کا یہ مختصر خاکہ ہے جو مسٹر کشوری لال سرکار کے ایک مضمون سے ماخوذ ہے جو چند سال ہوئے رسالہ "دی انڈین" میں شائع ہوا تھا۔ مغربی مسئلۂ ارتقا سے اسے کیا نسبت ہے؟ اہل فکر خود فیصلہ کرلیں۔

گیٹی وغیرہ کے نظریہ کی تائید ہوئی۔ ہیکل نے ۱۸۳۱ء میں یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ کوئی عالم فزیالوجی ایسا نہ ہوگا جسکے مشاہدہ میں یہ نہ آیا ہو کہ تمام جاندار وں کی ابتدائی صورت یکساں ہے"۔ ۱۸۳۲ء میں ہیئر نے یہ رائے ظاہر کی تھی کہ اگر کائنات کی نسبت طفلانہ خیال ہی قائم کیا جائے تاہم اسوقت بھی یہ رائے درست ٹھہر سکتی ہے کہ انواع مستقل صورتوں سے آرہتے ہیں۔ اور انکی ظاہری صورت میں کوئی تغیر یا تبدیلی واقع نہیں ہوتی"۔ انگلستان میں کئی عالم مسلسل تغیر اور نشو ونما کے خیال کے

برطانیہ کے عالموں کا خیال

قائم ہو چکے تھے۔ ۱۷۹۸ء میں پادری میل تھس نے "اصولِ آبادی" پر ایک کتاب شایع کی تھی جس میں اُس نے تمدنی حالات کے انقلابات سے بحث کی تھی۔ اسی سے ڈارون کو انتخاب طبعی کے مسٔلہ کا خیال پیدا ہوا تھا۔ ادھر عالمانِ ارضیات کرۂ ارض کے طبقات کی ترکیب اور انکی ساخت کی تحقیقات میں مصروف تھے۔ مرچی سن، بکلینڈ، منٹل، لائل اور دیگر محققوں کی تحقیقات سے اس خیال کی کافی تصدیق اور تائید ہو چکی تھی کہ ہماری زمین ابتدا سے موجودہ صورت میں نہیں چلی آتی، بلکہ بتدریج اسکی ہیئتِ ظاہری میں انقلاب ہوتا چلا آیا ہے۔ نیز یہ کہ طبقات کی ساخت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انواع نباتی اور حیوانی بھی مختلف صورتیں اختیار کرکے اس درجہ تک پہنچے ہیں۔ سر چارلس لائل نے تو یہاں تک کہا کہ جو انقلابات اس وقت سطح زمین پر نظر آتے ہیں انھیں کی بدولت گذشتہ تغیرات بھی ہوتے رہے اور وہ اسی نوع کے تھے۔ مگر ان خیالات کی عام طور پر بہت مخالفت ہوئی۔ عالموں کی ایک کثیر جماعت انکی معقولیت تسلیم کرنے سے انکار کرتی رہی کہ انسان ارتقا کے عمل سے جانوروں کے طبقہ سے نکل کر ترقی کی اس اعلیٰ منزل تک پہنچا ہے۔ اسکی ایک وجہ تو دینی خیالات تھے اور دوسری یہ کہ اس مسٔلہ کے حق میں مشاہدات اور تجربات کی بنا پر زبردست ثبوت پیش نہیں کیے گئے تھے جس سے اس کی صحت شک وشبہ سے بالا سمجھی جاتی۔ ڈارون خود بتاتا ہے کہ بڑے بڑے عالمانِ علم حیوانات و نباتات اور مشہور ماہران ارضیات انواع کے تغیر کے قائل نہ تھے۔ جن عالموں سے میری بات چیت ہوئی وہ سب انواع کے استقلال وثبات کے قائل تھے۔ لائل اور ہوکر نے بھی مجھ سے اتفاق نہ کیا گو وہ میری باتوں کو شوق سے سنا کرتے تھے"۔ آخر کار ڈارون کی معرکۃ الآرا

اوریجن آف اسپیشیز کا اثر

کتاب "ابتداء الانواع" شائع ہوئی جس سے دورِ جدید کی ابتدا ہوتی ہے۔ اس کتاب میں اُسنے انواع کے استحالہ کو اصول انتخاب طبعی کے تابع کیا ہے جسکا عمل از خود ہوتا رہتا ہے۔ نیز ضروری شہادت پیش کر کے مسٔلۂ ارتقا کو مضبوط بنیادوں پر قائم کیا ہے۔ ڈارون نے عالمِ نباتات وحیوانات کے تغیرات نوعی وصوری کا اصولِ عظیم ظاہر کر کے اُسے عملِ ارتقا کے نام سے موسوم کیا ہے۔ اس سے انسان کے جسمانی، اخلاقی، اور تمدنی حالات کا مطالعہ وتحقیقات لازم ٹھیرا۔ انسان کو بھی اُن ہی اسباب کے زیر اثر سمجھنا پڑا جنکی بدولت انواع نباتی اور حیوانی کا استحالہ ہوا اور غیر ذی روح سے ذی روح بنی تھیں۔

اصولِ ارتقا کو تمدنی مسائل پر عائد کرنے میں بڑی دشواریاں درپیش ہوئیں۔ اوّل تو تمدن کو بحیثیت مجموعی اسکے تابع کرنا محال تھا۔ پھر وہ عقائد تھے جو صدیوں سے مروج چلے آتے تھے اور انھوں نے دلوں پر نہایت زبردست گرفت حاصل کر رکھی تھی۔ پھر انسان کے بنیادی خیالات جیسے اخلاقیات، سیاسیات، دینیات وغیرہ کے مسائل تھے جو ارتقا کے محکوم ہو کر خود نشو ونما کی گردش میں پھنسنے والے تھے یعنی انکو بھی اصول نمو کے تابع کرنا تھا۔ گویا ارتقا کو انسان پر عائد کرنا سیکڑوں برس کے خیالات وعقائد اور اصول کو بیخ وبنیاد سے اکھاڑ کر ایک نیا مسٔلہ پیش کرنا تھا۔ خیر۔ رفتہ رفتہ انقلاب شروع ہوا اور انسان اور اُسکے متعلقہ حالات پر بھی اصول ارتقا سے غور وخوض ہونے لگا۔ مشہور ومعروف انگریز عالمِ جارج رومینز کہتا ہے کہ "اصولِ ارتقا کی ہمہ گیری کا یہ اثر ہوا ہے کہ ہمارے جملہ علمی میلانوں اور خیالوں میں ایک ایسا عظیم انقلاب پیدا ہو گیا ہے جسکی نظیر تاریخِ عالم بہم پہنچانے میں قاصر ہے"۔

بنی آدم کو عمل ارتقا کے تابع کرنے کی ابتدائی کوشش

ڈارون کے مسٔلہ کے متعلق دو ایک باتیں قابل غور ہیں۔ ڈارون نے عمل ارتقا کے حق میں جو شہادت پیش کی تھی اس سے بعض اصول ماخوذ ہوتے ہیں۔ اوّل یہ کہ ہر زندہ ہستی کی اولاد اس کثرت سے بڑھتی ہے

کہ وسائل زیست بالکل محدود اور غیر مکتفی ہو جاتے ہیں۔ بلا استثنا ذی اعضا وجود اتنی سرعت سے بڑھتے ہیں کہ اگر وہ برباد نہ ہوں تو ایک ہی جوڑے کی اولاد سے تمام جہان بھر جائے۔ دوم اس قوتِ پیدائش و افزائش کے ساتھ جانوروں کے اندر یہ جبلی خو بھی موجود ہے کہ ایک خاص مدت کے اندر اندر انکی اندرونی اور بیرونی صورت میں تغیر واقع ہوتا ہے۔ جسم کا کوئی حصہ، کوئی عضو، اور انکا کوئی فعل تغیر کے عمل سے بالا نہیں رہتا۔ اور یہ فرق والدین سے اولاد میں اور اولاد کی اولاد میں ہوتا چلا جاتا ہے۔ ان واقعات سے جنکی صحت میں کوئی شبہہ نہیں ہو سکتا انتخاب طبعی کا اصول[1] ماخوذ ہوا۔ ڈارون کہتا ہے کہ

> ہر نوع کے بہت سے افراد پیدا ہوتے ہیں مگر سب زندہ نہیں رہتے۔ جہد الحیوٰۃ کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ اگر اسکے اندرونی یا بیرونی ڈھانچہ میں ذرا سی بھی تبدیلی واقع ہو جائے تو اسے زندہ رہنے کا بہتر موقع ملجاتا ہے کیونکہ کشاکش زیست میں کامیابی ہونے کے لیے اُسے کوئی نیا وسیلہ یا طریقہ اختیار کرنا پڑتا ہے گویا قدرت کی طرف سے زندہ رہنے کو منتخب کیا گیا ہے۔ وراثہ کے زبردست اصول سے منتخب نوع سے نئی اولاد پیدا ہوگی۔ جس کے فطری ڈھچر میں تھوڑا سا فرق ہوگا۔

ڈاکٹر الفرڈ رسل والس کہتے ہیں کہ جس جانور کو قدرت کی طرف سے عمدہ وسائل اور سامان مہیا ہیں وہ جہد الحیوٰۃ کے مقابلہ میں اوروں پر سبقت لیجاتا ہے۔ یعنی بہترین جانور اس کشاکش میں کامیاب اور زندہ رہنے کے قابل سمجھا جاتا ہے۔ اور وہ اپنی اولاد کو بھی وہی طاقتیں بخشتا ہے جنکی بدولت اس میں جہد الحیوٰۃ کی قابلیت اور خوبی پیدا ہوتی ہے۔ اس اصول کی تشریح ضروری تھی، کیونکہ انسانی سوسائٹی پر اسے عائد کیا گیا ہے۔

اصول ارتقا کا اطلاق تمدنی مسائل پر

اصولِ ارتقا کی رو سے تمدنی مسائل پر سب سے پہلے ہربرٹ اسپنسر نے بحث کی تھی۔ ۱۸۵۲ء میں اُسنے "ترقی" پر ایک مضمون لکھکر اصول انتخاب طبعی کو سوسائٹی پر بھی عائد کیا تھا۔ اس سے علم المعاشرت کے مسائل پر خاص اثر نمایاں ہوا۔ اور ذی اعضا ہستیوں کے ارتقا کا خیال بہت وسیع ہو گیا۔ انتخاب طبعی کے اصول کو تمدنی مسائل پر عائد کرتے وقت اس امر کو مد نظر رکھنا ضروری ہے کہ ارتقاے تمدن کے تمام مظاہر اور واقعات اس اصول کے تابع کیے جاتے ہیں۔ یہ امر مسلّم ہے کہ سوسائٹی کی قابلیت مخفی افراد کی لیاقت مجہول[2] کے مجموعہ سے جو انکے کردار انفرادی سے پیدا ہو کہیں بڑھ کر ہے۔ اسکی تائید روزانہ زندگی کے مشاہدہ سے ہو سکتی ہے۔ اور یہ خیال ترکیب و ترتیب مجلس تقسیم محنت، ایک کام اور پیشہ کو چند خاص گروہوں تک محدود کرنے، اور خاص کر سوسائٹی کے وسیلہ سے اس علم و تجربہ کے اجتماع و انتقال کے انتظام میں جنسے جہد الحیوٰۃ کی قابلیت اور طاقت پیدا ہوتی ہے منتج ہوتا ہے۔ اس سے ایک اور خیال بھی ماخوذ ہوتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ ارتقاے تمدن میں انتخاب طبعی کا عمل افراد پر براہ راست اثر نہیں ڈالتا بلکہ سوسائٹی کے وسیلہ سے انھیں متأثر کرتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں اسکے معنے یہ ہیں کہ افراد کے فوائد مجلس کے فوائد پر مقدم نہیں ہیں۔ ہلاف کے فلسفۂ تمدن میں افراد کی نہیں بلکہ مجلس یا حکومت کی ہستی تسلیم کر لی گئی تھی۔ افراد اسکی فلاح و بہتری کو ترقی دینے کے لیے مخصوص

---

[1] پروفیسر کارل پیرسن صاحب انسائیکلوپیڈیا برٹانکہ دہم ایڈیشن جلد آٹھ کے مقدمہ میں صفحہ پر لکھتے ہیں: مسئلۂ ارتقا بذریعہ انتخاب طبعی چار باتوں پر مبنی ہے (۱) انواع کے خواص بدلتے رہتے ہیں (۲) خواص جدی اور جبلی ہوتے ہیں (۳) موت کے ہاتھوں سبھی ہستیاں جلد ہلاک ہوتی ہیں جنکے خواص اعلیٰ یا ادنیٰ ہوتے ہیں (۴) جو افراد جلد مر جاتے ہیں انکی اولاد بہت تھوڑی پیچھے رہجاتی ہے۔ یہ باتیں کس حد تک انسان پر عائد ہو سکتی ہیں؟ (انسان کی جسمانی اور عقلی خصوصیات بلا شبہہ بدلتی رہتی ہیں (۲) انسان اپنے بزرگوں کی عقلی اور جسمانی خوبیاں ورثہ میں پاتا ہے موروثی اثر ایسا اعلیٰ و نمایاں ہوتا ہے کہ تین چار پشتوں میں انسان کی نسل میں اہم تغیر واقع ہو سکتا ہے (۳) رشتہ داروں کی شرح موت پر غور کرنے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بنی آدم کے درمیان پچاس اور ساٹھ فیصدی کے درمیان انتخابی موتیں ہوتی ہیں یعنی اُن افراد کے طبعی خواص ایسے ہوتے ہیں کہ وہ مدت دراز تک زندہ نہیں رہ سکتے گویا قدرت نے انھیں زندگی کے پورے سامان نہیں دیے ہیں اسلیے وہ جلد مر جاتے ہیں (۴) برطانیہ، امریکہ، آسٹریلیا کے اعداد سے ظاہر ہوتا ہے کہ جو لوگ چھوٹی عمر میں مر جاتے ہیں انکی اولاد نہیں ہوتی پس ہم یہ نتیجہ نکالنے پر مجبور ہیں کہ ڈارون کا مسئلہ بنی آدم کی حالت میں "خوشگوار نظریہ" نہیں بلکہ قانون ہے۔

[2] انجمن کو۔ ماخوذ از انسائیکلوپیڈیا برٹانکہ۔ دہم ایڈیشن جلد پنجم صفحہ ۱۰۔

ہیں۔ جن خوبیوں سے سوسائٹی کی قابلیت بڑھتی ہی انکے افراد کے اندر پیدا ہونے سے اصول انتخاب طبعی سے بالآخر ارتقاے انسان میں خاص نتائج پیدا ہونگے۔ ارتقاے تمدن بذریعہ انتخاب طبعی کا اصل اصول[1] یہ ہی کہ افراد خود کو سوسائٹی کے تابع کر دیں۔ جن قوموں کے افراد اس عمل کا مقابلہ کرینگے انکی ترقی کا میدان بہت جلد تنگ ہو جائیگا۔ انھیں اُن قوموں کے سامنے سر جھکانا پڑیگا جن کے ممبر اپنے فوائد کو ملکی و قومی فلاح کے تابع کر دیتے ہیں۔ اخیر میں وہ نظام تمدن غالب آئیگا جس میں افراد کے حقوق کی نہایت اعلی حفاظت ہوگی مگر وہ قومی فوائد کے محکوم ہونگے۔ جن علماوں نے اصول ارتقا کو سوسائٹی پر عائد کیا تھا اُنھوں نے اس امر پر زور دیا تھا کہ اسے ایک ذوالاعضا جسم یا وجود تصور کیا جائے۔

ہربٹ اسپنسر

مذکورہ صدر اصول ارتقا کو مد نظر رکھکر ہربٹ اسپنسر نے ارتقاے تمدن پر بحث اُٹھائی تھی۔ اس نے ۱۸۶۰ء میں سوشل آرگنزم (نظام تمدن) کے عنوان سے ایک مضمون شائع کیا تھا جو بہت اہم سمجھا جاتا ہی۔ اسپنسر نے اپنا فلسفۂ تمدن اسی پر مبنی کیا تھا اور دیگر عالم بھی اسی اصول سے ہدایت پذیر ہوتے رہے۔ دوسرے اس میں وہ دشواری بھی ظاہر کی گئی ہی جو ارتقاے مجلس پر اصول ارتقا کے عائد کرنے میں پیش آتی ہی۔ ہربرٹ اسپنسر نظام تمدن اور ذی روح جسم میں خاص مشابہت سمجھتا ہی۔ سوسائٹی کے ڈھانچہ اور جانور کے جسم میں چار امور مشترکہ پائے جاتے ہیں (۱) ابتدا میں ایک چھوٹا قبیلہ ہوتا ہی جو رفتہ رفتہ بڑھکر ایک بڑی قوم میں تبدیل ہو جاتا ہی اسکے افراد کا شمار نامعلوم طور پر سیکڑوں گنا بڑھ جاتا ہی۔ (۲) شروع میں ڈھانچہ بہت ہی سیدھا سادہ ہوتا ہی مگر عمل نمو سے وہ بڑھتا، پھیلتا، اور پیچیدہ صورت قبول کر لیتا ہی، اور اسکی یہ پیچیدگی ہمیشہ بڑھتی ہی جاتی ہی۔ (۳) شروع میں اجزا ایک دوسرے کے محتاج نہیں ہوتے مگر جب ڈھانچہ بہت بڑھ جاتا ہی اور پیچیدگی اختیار کر لیتا ہی تو جسے ایکدوسرے کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ آخر کار انکی احتیاج باہمی اس قدر ترقی کر جاتی ہی کہ انکی زندگی اور مصروفیت ایک دوسرے کی مدد و تحریک کے بغیر ناممکن ہو جاتی ہی۔ (۴) سوسائٹی کی ترقی اور ہستی اسکے افراد کی زندگی اور نمو سے بڑھکر ہوتی ہے اور اسکی نسبت زیادہ عرصہ تک رہتی ہی۔ افراد پیدا ہوتے، بڑھتے، کاروبار چلاتے، اولاد پیدا کرتے، اور مرجاتے ہیں۔ مگر نظام تمدن جو انسے مرکب ہی پشت در پشت قائم رہتا ہی۔ اسکا حجم، اسکی ترکیب اور اسکا اندرونی انتظام بڑھتا اور ترقی کرتا رہتا ہے۔ جوں جوں سوسائٹی تمدن اور تمدنی لوازم میں ترقی کرتی ہی اسکے اندرونی ڈھانچہ میں تفریق در تفریق پیدا ہوتی چلی جاتی ہی۔ حکومت کے مختلف شعبے اور انتظامات، سڑکیں، نہریں، راستے وغیرہ وسائل آمد و رفت اور پھر تجارتی، صنعتی، اور زرعی کاروبار کے پھیلاؤ وغیرہ معاملات وسعت پکڑتے ہیں۔ اسپنسر کہتا ہی :۔

جانور کے جسم میں تو صرف کسی خاص حصہ میں حس پیدا ہوتی ہی مگر سوسائٹی کے تمام افراد حس سے بہرہ یاب ہوتے ہیں۔ جسم میں سب اعضا کی بہتری نظام اعصاب کی فلاح کی تابع ہوتی ہی جسکی راحت بخش یا دردانگیز معرفتوں پر زندگی کی بھلائی برائی موقوف ہی مگر سوسائٹی میں یہ بات نہیں دیکھی جاتی۔ اگر افراد حکومت کے فائدہ کے لیے نہیں تو حکومت کیوں افراد کی بھلائی کے لیے ہو؟ یہ امر لازمی ہی کہ اجتماعی زندگی (Corporate Life) اجزا کی زندگی کے تابع ہو نہ کہ اجزا اجتماعی زندگی کے محکوم کیے جائیں۔

اسپنسر کی رائے میں "نظام تمدن" حکومت ہی، اور مذکورۂ صدر اصول پر اُسنے اپنا فلسفۂ تمدن مرتب کیا ہی۔ اس سے ظاہر ہی کہ اُسنے انتخاب طبعی کو سوسائٹی پر کس طریقہ سے عائد کیا ہی۔ ڈارون نے خود نظام تمدن کے مطالعے اور تمدنی مظاہر کی تحقیقات پر زیادہ وقت صرف نہیں کیا تھا۔ اُسنے "ڈسینٹ آف مین" (DECENT OF MAN) میں چند فصلیں ان مسائل

ڈارون کی رائے تمدن کی بابت

کے لیے وقف کی ہیں اور اُنسے ظاہر ہی کہ اُسے اصول انتخاب طبعی کو نظام تمدن پر عائد کرنے میں کچھ تذبذب تھا۔ اسکی رائے یہ تھی کہ ترقی یافتہ سوسائٹی میں انتخاب طبعی کچھ بہت کارآمد ثابت نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ وہ کہتا ہے :۔

---

[1] بنجمن کڈ۔ انسائیکلو پیڈیا بریٹانکہ صفحہ ۱۰ جلد ۵ دسویں ایڈیشن۔

نہایت متمدن قوموں کی مسلسل ترقی بہت تھوڑی حد تک انتخاب طبعی پر منحصر ہے۔ ہم مہذب لوگ عمل اخراج کے رستہ میں بہت سخت دقتیں مائل کر دیتے ہیں۔ بیماروں، اپاہجوں اور ناتوانوں کے لیے غریب خانے بناتے ہیں۔ لائق و تجربہ کار ڈاکٹر ہر شخص کی زندگی بچانے کے لیے دل و جان سے آخری وقت تک کوشش کرتے ہیں۔

ڈاکٹر الفرڈ رسل والس کا خیال | ڈاکٹر والس نے جو مسئلۂ ارتقا کی اختراع میں ڈارون کے برابر کے شریک ہیں ۱۸۸۹ء میں "ڈارون ازم" (DARWINISM) یعنی "مذہب ڈارون" شائع کر کے اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا۔ اس امر کو سمجھ لینا چاہیے کہ وہ جسم کا مسلسل ارتقا تو مانتے ہیں مگر انسان کی ذہنی، اخلاقی، اور روحانی قوتوں کو عمل ارتقا کا نتیجہ نہیں سمجھتے۔ اس کتاب کی آخری فصل میں وہ لکھتے ہیں :۔

انسان کی ذہنی اور اخلاقی فطرت کے بعض خاص حصے ہیں جو صرف اصول تغیر اور انتخاب طبعی سے منتج نہیں ہو سکتے۔ بعض طاقتیں جن میں ریاضی، حُسن پسندی کا میلان اور فلسفیانہ قوتیں شامل ہیں، جہد الحیوٰۃ میں ہرگز ہرگز کار آمد نہیں ثابت ہو سکتیں۔ اس لیے اصول انتخاب طبعی ان کی توجیہ میں لاچار اور قاصر ہے۔ اس وجہ سے ڈاکٹر والس ان قوتوں کی نمو ان اسباب سے بالکل مختلف قرار دیتے ہیں جن سے زندگی کی نشو و نما ہوتی ہے۔

ہکسلے والس سے متفق الرائے ہے | ہکسلے سب سے پہلے ڈارون کا معتقد بنا تھا مگر ۱۸۹۳ء میں "رومینز لیکچر" (ROMANES LECTURE) میں اصول انتخاب طبعی کو نظام تمدن پر عائد کر کے نتائج پر بحث کرتے ہوئے اسی نتیجہ پر پہنچا جس پر ڈاکٹر والس عرصہ سے پہنچ چکے تھے۔ ہکسلے نے سوسائٹی کے اندر کے عمل اخلاقی کو عمل عالم (Cosmic Process) یعنی سنسار گتی کے بالکل متضاد ٹھہرایا۔ چنانچہ وہ کہتا ہے :۔

تمدنی ترقی کے معنی سنسار گتی کی قدم قدم پر مزاحمت کرنا اور اسکی جگہ دوسرے اسباب کو پیدا کرنا ہے۔ جیسے اخلاقی افعال جن کی علت غائی یہ ہے کہ صرف وہی افعال زندہ رہنے کے قابل ہیں جو اخلاقاً بہترین ہیں نہیں جو مار دھاڑ کے فن میں طاق اور طبعی قوتوں سے آراستہ ہیں۔ یہ خیال سراسر غلط ہے کہ چونکہ پودے اور جانور جہد الحیوٰۃ سے اپنے اجسام کے کمال کو پہنچے اور اس سے "بقاے بہترین" منتج ہوتا ہے، اس وجہ سے انسان کو بھی بطور اخلاقی ہستی کے اسی عمل سے کمال حاصل کرنے کی توقع کرنا چاہیے۔

ارتقاے تمدن پر تاریخی نظر

جب ڈارون کے نظریہ کو عالموں نے قبول کر لیا تو اُن میں سے کئی ایسے دل چلے اور بیباک تھے جنھوں نے انسان اور اُسکے تعلقات کو بھی ہمہ گیر عمل کے تابع کیا۔ اگر جسمانی اعضا اور قوانے اصول انتخاب طبعی کے مطابق کشاکش زیست میں تغیر اور ارتقا قبول کیا ہے تو کیا وجہ ہے کہ اخلاق، مذہب، تمدن، سیاسیات وغیرہ نے نہ کیا ہو۔ چنانچہ پروفیسر جارج رومینز نے ارتقاے ذہن؛ ہربرٹ اسپنسر نے ارتقاے اخلاقیات؛ پروفیسل ایڈورڈ کیرڈ نے مذہب و عقائد؛ اور بنجمن کڈ نے تمدن اور خیالات کے ارتقا کو اپنی تحقیقات کا موضوع بنایا اور اپنی تلاش و تجسس اور غور و فکر کے نتائج کو "سوشل ایوولیوشن" SOCIAL EVOLUTION میں پیش کیا۔ اس میں فاضل مصنف نے ہر پہلو سے انسانی مجلس کے ارتقا پر بحث کی ہے۔ اس مضمون کے بہت سے خیالات اسی مصنف سے ماخوذ ہیں۔

تمدن کا پہلا مرحلہ | شروع میں جب سوسائٹی ارتقا کی ابتدائی مرحلوں میں تھی تو جداگانہ کوششوں کی بجاے افراد مِل جُل کر کام کرتے تھے جس سے انتخاب طبعی کے مطابق نظام تمدن میں خوبی اور عمدگی پیدا ہوئی ہوگی۔ یعنی قبیلہ کی بہتری کے لیے افراد کی جداگانہ کوشش ایسی مفید نہ تھی جیسی سب کے اتحاد و اتفاق سے کام کرنے سے۔

دوسرا مرحلہ | اسکے بعد دوسرا مرحلہ آیا۔ جب قبیلہ کی بہبودی اور قابلیت ایک فرد واحد کی کوشش پر محدود رہی اور یہ سردار کی شخصیت تھی جو اپنی قوم کو ہمسایہ اقوام کے مقابلہ میں شاہراہ ترقی و آسائش پر کامیابی سے چلانے کے

لیے مختلف تجاویز کرتا تھا۔ اس طرح سوسائٹی میں ردوبدل ہوتے رہے جن میں قومی سرداروں کے خیالات کو بڑا دخل رہا یعنی یہ کہ آیا افراد کو سرداری سے الگ رہنا چاہیے یا اُسکے ماتحت اسکی دانشمندی اور ہدایت کے تابع رہنا چاہیے۔ بہتری کا جیسا خیال غالب ہوتا ویسا انتظام اور ترتیب مجلس ترکیب قبول کرتی۔ اسی طرح ایک زمانہ آیا جب افراد نے قومی قابلیت اور اقتدار کو

تمدنی ترقی میں مذہب کا درجہ اور سب باتوں پر مقدم قرار دیا۔ دوسروں سے الگ رہنا اور اُن بزرگوں کی روحوں کی پرستش جنھوں نے قوم کی بہتری کے لیے بیحد کوشش کی تھی اس زمانہ کے نظام تمدن کی خصوصیات ہیں۔ مذہب کو تمدن سے الگ کرنا دشوار تھا بلکہ قوم کے شیرازہ کو متحد اور مستحکم کرنے کے لیے ضروری تھا، کہ افراد کے چند تعلقات مشترک اور عام ہوں جو اُنکی قومی قابلیت میں اضافہ کرنے کے باعث ہوتے ہیں۔ اس زمانہ میں قانون تجبُّر Law of Force سب سے اعلیٰ اور زبردست تھا۔ افراد کی بہتری کو حکومت کے تابع کیا گیا۔ انکا یہ فرض تھا کہ جو کام کیا جائے اُس میں اجتماعی زندگی کی فلاح سب باتوں پر مقدم سمجھیں اور حکومت کا منصب اعلیٰ مُلک گیری تھا جس سے نظام تمدن کا عظیم اصول ”جسکی لاٹھی اُسکی بھینس“ مرتب ہوا۔

تمدنی تغیرات کا اصل محرک تخیّل ہی

تیسرا مرحلہ اسکے بعد تیسرا مرحلہ نظام تمدن کے ارتقا کا آتا ہی جہاں افراد ایک طرف تو خود کو دوسرے طبقہ کے قبیلوں اور گروہوں کی دست بُرد سے محفوظ رکھنے کے لیے فوجی جمعیت کا مستقل اہتمام کرنے کو مجبور تھے ادھر ایسے تصورات سے اثرپذیر ہوتے تھے جن کی بدولت انسان کی ذمہ داری حکومت اور موجودہ ضروریات قومی کے ماسوا اور باتوں پر بھی حاوی تھی۔ اس سے مراد یہ ہی کہ اس مرحلہ میں انسان اپنی اخلاقی ذمہ داری اور عالم غیرمرئی میں کچھ عرصہ کے بعد داخل ہونے کے میلان سے باخبر ہوگیا۔ کئی مذاہب کی شرع میں اس قسم کے خیالات پائے جاتے ہیں۔ قدیم ایرانیوں اور چند دیگر قوموں نے فوجی انتظام کو معراج ترقی پر پہنچایا، ناشائستہ اقوام کے درمیان تمدن پھیلایا اور اس طرح انتخاب طبعی اور بقاے بہترین کا ثبوت بہم پہنچایا جیسا کہ یونانیوں اور رومیوں کی تاریخ سے عیاں ہی۔ اور اس سے بھی کچھ مدت پیشتر ہندوؤں نے اپنی تمدنی اہلیت کا ثبوت دیا تھا۔ اس بات کو مدِ نظر رکھنا چاہیے کہ انسان اور اُسکے فرائض نظامِ تمدن کی ترکیب کے تصورات ایک بڑی حد تک اصول انتخابِ طبعی اور تمدنی تغیرات کے محرک ہوتے رہے ہیں۔ جب یہ خیال غالب تھا کہ ”ہم اکیلے کچھ نہیں کرسکتے بلکہ سب کو مل جُل کر ترقی کی گاڑی کو چلانا چاہیے نیز یہ کہ افراد اجتماعی زندگی کی بہتری کو سب پر مقدم سمجھیں“ تو نظام حکومت کچھ اور تھا اور سب کی ترقی اور عروج کی تمناؤں کا مرجع حکومت کی عظمت و شان تھی۔ اسی سے فوجی غلبہ کا خیال ماخوذ ہوا تھا۔ سوشل انسٹی ٹیوشن مطلق العنانی اور شخصی جبر کے تابع تھے۔ لیکن جب کچھ مدت کے بعد یہ تصور بدل گیا تو اُسکے ساتھ نظام تمدن کے بنیادی اصول بھی بدل گئے۔ آئین میں تغیر واقع ہوا اور اس طرح تمدن کی ترکیب کی نشو و نما ہوتی رہی۔

چوتھا مرحلہ آزادی کا خاتمہ نظامِ تمدن کے انقلاب کا آخری مرحلہ یہ ہی جس میں ہم رہتے ہیں۔ پُرانے خیالات تہ و بالا ہوگئے ہیں۔ ہم خود کو حکومت کی ترقی اور بہتری کے لیے مخصوص نہیں سمجھتے بلکہ حکومت یا بقول ہربرٹ اسپنسر اجتماعی زندگی افراد کے لیے ہی۔ تمام جابرانہ آئین بدل دیے گئے ہیں غلامی موقوف کردی گئی ہی۔ افراد کی مساوات مسلّمہ ہی۔ رواداری کا ہر طرف دَور دَورہ ہی۔ حالانکہ ایک زمانہ تھا جب لوگ اپنی مرضی کے خلاف بعض عقائد کو ماننے پر مجبور تھے۔ مگر اسکے ساتھ زبردست قوتیں معرض وجود میں آگئی ہیں اور جن کی کشاکش اور دھینگا مشتی جاری ہی اُن سے اسلاف بالکل ناواقف تھے۔ جن خیالات پر غلامی قائم ہوئی تھی وہ خورد بُرد ہوگئے ہیں، اور جن تصورات سے بعض گروہوں کا حکومت کے اندر غلبہ و اقتدار سمجھا گیا تھا وہ تتر بتر ہوگئے ہیں۔ قرون وسطیٰ میں جن آرا کی وجہ سے

حکومت کی ملکی قوت کی تائید ہوتی تھی وہ مفقود ہوگئی ہیں۔ اب یہ خیال ہو کہ حکومت کی رائے یا اختیار راستی مطلق کا نمایندہ نہیں ہو سکتا۔ اسی سے کئی ترقی یافتہ قوموں میں یکے بعد دیگرے مختلف پولیٹیکل فریقوں کی حکومت قائم ہوئی ہو جیسے برطانیہ میں لبرل اور کنسرویٹو اور صوبجات متحدہ امریکہ میں ڈیماکریٹ اور ای پبلکن پارٹیاں باری باری ملک کا انتظام انجام دیتی ہیں۔ اس سے یہ بھی لازم آیا ہو کہ جو تجربہ تحقیق و تجسس کے ایک شعبہ میں حاصل ہوا ہو اس سے صنعت و حرفت اور کاروبار کے دیگر شعبوں میں مستفید ہونا مناسب ہو۔ سب آدمیوں کی جبلی مساوات کا اصول مسلمہ ہوگیا ہو جسکی بنا پر قومی بہتری کے معاملات میں سب کو رائے دینے کا عام استحقاق عطا کیا جانا ضروری ٹھہر گیا ہو اور اسی سے ملکی معاملات میں بلا امتیاز سب کو رائے دینے کا عام استحقاق عطا کیے جانے کی تحریک پیدا ہوگئی ہو۔ اور سب کے اخیر میں یہ خیال ہو کہ مال و متاع سب کے حصے میں برابر برابر آنا چاہیے تاکہ حکومت تمدنی معدلت گستری میں باحسن الوجوہ کامیاب ہو۔ یہ مسائل بیسویں صدی کے نظام تمدن میں پیدا ہوئے ہیں جو ارتقا کا نتیجہ ہیں۔ انھیں قوتوں کی بدولت آیندہ بھی تبدیلیاں اور انقلابات ہوتے رہیں گے۔ ایک زمانہ آئیگا جب ہمارے موجودہ تصورات تمدن اسی طرح ناقص و نامعقول ٹھہرینگے جیسے ہم متقدمین کے خیالات اور آراکو دقیانوسی اور مخالف ارتقا سمجھتے ہیں۔

قابلیتِ فاضل کا خبط

مغرب کی قوموں کے درمیان جہد الحیوٰۃ کا سلسلہ جاری ہو۔ ایک قوم دوسری سے آگے بڑھنے کی کوشش میں ہو، اور انتخاب طبعی اپنا عمل و اثر دکھا رہا ہو۔ اس عمل کی خصوصیت "قابلیت فاضل" (Projected Efficiency) عرصہ سے چلی آتی ہو۔ جو قومیں اسکے زیر اثر ہیں انھیں ہر مرحلہ پر دوسروں سے دھینگا مشتی کرنے کی ضرورت لاحق ہوتی ہو اور اُسکے لیے فوجی قابلیت لازمی ٹھہرتی ہو۔ وہ تمام خوبیاں جو زمانۂ آیندہ کی عظمت سے تعلق رکھتی تھیں صدیوں تک ان کے ہاں بیکار پڑی رہیں بلکہ ترقی کی شاہراہ پر چلنے میں گلے میں سانپ بنکر لٹکی رہیں۔ اس کے علاوہ موجودہ ضروریات کو مد نظر رکھ کر انھیں نئے سامان بہم پہنچانے کی آفت سے الگ سامنا رہا جس کی وجہ سے ارتقا کا عمل بہت دھیمی رفتار سے ہوتا رہا۔

جہد الحیوٰۃ مغرب میں کس طرح جاری ہے

اسوقت جو جہد الحیوٰۃ ہو رہی ہو اس میں زندگی کی ذمہ داری کا اعلیٰ تر قانون کام کر رہا ہو۔ ہمارے فرائض جو حلقۂ حکومت سے بھی آگے پہنچ گئے ہیں جن کی وجہ سے ہم بیماروں کمزوروں اپاہجوں اور بیکاروں کی بہتری کا انتظام کرتے ہیں، یا یوں کہو کہ یہ فرائض ہمارے موجودہ تمدن نے ہمپر عائد کر دیے ہیں اور اصول انتخاب طبعی کے رُو سے انسے بہتر نتائج برآمد ہوں گے۔ اس کشاکش کے متعلق اس امر کو ذہن نشین کر لو کہ نہایت ترقی یافتہ قومیں موجودہ ضروریات کے اعتبار سے قومی قابلیت پیدا نہیں کر رہی ہیں بلکہ آنیوالی ضروریات زندگی کی رعایت ہو یا یوں کہو کہ وہ غیر متوقع واقعات اور ناگہانی مجادلہ کے لیے حتی المقدور اعلیٰ قابلیت اپنے میں رکھنا چاہتی ہیں۔ کچھ اسی قسم کے اصول سے تحریک پذیر ہوکر جرمنی نے تین ماہ ہوے اپنی سپاہ اور فوجی سامان بڑھانے کا فیصلہ کر لیا۔ برطانیہ اسی خیال سے جنگی بیڑوں پر ہر سال کروڑوں روپیہ خرچ کرتا ہو۔ یہ "قابلیت فاضل" کا اصول ہو جو آج کل دنیا کی سب سے زیادہ مہذب قوموں کو فوجی اور مالی تیاریوں کی طرف مائل کر رہا ہو جب سے نظام تمدن کے اس آخری مرحلہ کا آغاز ہوا ہو یورپ کا تمدنی دیوتا "قابلیت فاضل" قرار دیا گیا ہے۔

اصول ارتقا کو تمدن پر عائد کرنے کے نتائج

مسئلۂ ارتقا کو نظریۂ تمدن پر عائد کرنے سے جو انقلابات ہونے شروع ہوے ہیں وہ ہنوز ابتدائی منزل میں ہیں۔ گو فلسفۂ سیاست پر اسکا کچھ اثر نمایاں ہوا ہو مگر اخلاقیات اور سائیکالوجی (علم النفس) کے خطہ میں اسکا اثر بہت کم نمایاں ہوا ہو۔ انسانی سوسائٹی اور انسانی ترقی کا جو نظریہ غالب چلا آتا ہو اس میں انسان کے نفس کی تمناؤں اور خواہشوں کو ہر قسم کی ترقیوں کا بانی اور محرک قرار

دیا جاتا ہے۔ گویا یہ معنوی نظریہ ہے، خارجی نہیں جو ارتقائی ہے۔ لیکن جو حب اصول ارتقا کے پہلو سے انسان کے تمدنی حالات سے بحث ہوگی ویسے ہی نفس اور اسکی خوبیوں کو تمدنی ارتقا میں غالب ماننا پڑیگا۔ جب یہ صورت ہوگی اور جب انسان کے قوائے عقلیہ و روحانیہ اور اخلاقی جذبات اور خواہشات بھی ارتقا سے ماخوذ سمجھی جائیں گی تو نظام تمدن میں انقلاب عظیم واقع ہوگا۔

نظامِ تمدن کا ارتقا ایک نہایت دلچسپ بحث ہے مگر اس مختصر مضمون میں اسپر بحث کرنا دشوار ہے۔ اس مضمون کے دوران میں ارتقائے تمدن کے تعلق میں جو باتیں ذکر ہوئی ہیں اور جو اصول عام لکھے ہیں انکی اصلیت اور حقیقت پر اور بھی روشنی اُسوقت پڑتی ہے جب آسٹریلیا، افریقہ، امریکہ، ایشیا کے وحشیوں اور نیم وحشیوں، بھیلوں، گونڈوں اور سنتھالیوں، ترکستان اور عربستان کے قبائل چینیوں اور منگولیوں، ہندوستان، ایران، روس، برطانیہ، جرمنی، فرانس، صوبجات متحدۂ امریکہ، اور جنوبی امریکہ کی مخلوط النسل قوموں کی تمدنی حالت اور اُنکے عقائد کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ ارتقائے تمدن کے تقریباً سب طبقے اور درجے موجود ہیں جنکی بنا پر معقول نتائج نکل سکتے ہیں۔

جے۔ آر۔ رلے (رجزلسٹ لاہور)

ہادیانِ چین
اور اُن کی حکیمانہ و اخلاقی تعلیمات

تمام باشندگانِ چین (مسلمانوں کو چھوڑ کر) تقریباً تین مذاہب کے پیرو ہیں (۱) مذہب کنفیوشش (۲) مذہب لاؤ دیڑہی (۳) مذہب بودھ۔ اِن تینوں مذاہب کی اصل جداگانہ ہے، عقائد اور مذہبی رسومات مختلف ہیں، اور ہر ایک کے فلسفیانہ نقطۂ خیال میں بُعدِ عظیم ہے، لیکن یہ عجیب اتفاق ہے کہ تینوں مذاہب کے بانی ہم عصر ہیں، کنفیوشش، لاؤتزی اور بُدھ تینوں نے اپنے اپنے مذہب کی اشاعت چھٹی صدی قبل از مسیح یا اس سے قریب زمانہ میں کی۔ طرفہ یہ ہے کہ تینوں معاصر ملل ایک ہی ملک میں مروّج ہیں، اور سب سے بڑھ کر حیرتناک امر یہ ہے کہ ان تینوں مذاہب کے پیروؤں میں ہمیشہ نہایت یگانگت، مساوات اور رواداری کا برتاؤ قائم رہا ہے جسکی نظیر دیگر ممالک کی تاریخ میں مشکل سے دستیاب ہوسکتی ہے۔ اہل چین، باوجود تین (بلکہ اس سے بھی زائد) مذاہب کے پابند ہونے کے ایک قوم کہلاتے ہیں، اور فی الحقیقت ایک قوم ہیں۔ مذہبی تعصب، تنفر، اور ناروا داری سے انکے دل پاک و صاف ہیں، اور کسی ایک مذہب کی پابندی انکی دوسرے مذاہب سے بے اعتنائی یا نفرت کا باعث نہیں ہوتی۔ آپس میں اس درجہ میل جول ہے کہ مشہور ہے کہ ایک چینی مختلف لحاظ سے تینوں مذاہب کا پیرو ہوسکتا ہے۔[۵]

ہر چند کہ محققین مذاہب و ملل اس مسئلہ کے جواب میں کہ مذہب و اخلاق کا کیا تعلق ہے، آیا وہ ہمیشہ یکجا پائے گئے ہیں، اور ایک کا وجود بغیر دوسرے کے یا دوسرے کا بغیر پہلے کے ممکن ہے یا نہیں، نہ ہم آہنگ ہیں اور نہ آیندہ کبھی ہونے کی امید ہے، لیکن اسپر سب اتفاق رائے رکھتے ہیں کہ دنیا کے تمام بڑے مذاہب میں، جو اسوقت موجود ہیں یا جو تاریخی شہرت رکھتے ہیں، تعلیم اخلاق مذہب سے وابستہ پائی جاتی ہے۔ چاہے ان میں اعتقادات اور رسوم مذہبی کا کیسا ہی اختلاف کیوں نہو، بہرحال اخلاق کی تعلیم جزو مشترک پائی جائے گی۔ عیب جوئی اور نکتہ چینی کسے نہیں آتی اور وہ کونسی شے ہے جسکی مخالفت میں آج تک کسی نے زبان نہ کھولی ہو؟ جس آدمی کا مرکوز خاطر صرف تلاش معائب و نقائص ہو، یہ یقینی امر ہے کہ اُسے اپنے سوا کسی میں کوئی بھلائی نظر نہ آئیگی، اور نہ دنیا کی کسی چیز سے وہ متمتع او منتفع ہو سکے گا۔ مبارک ہیں

---

[۵] چینیوں کے اس اتحاد اور یکرنگی کا حال دیکھنا ہو تو ڈاکٹر جوزف ایڈکنس کی کتاب "چین میں مذہب کی حالت" یا سر الفرڈ لائل کی کتاب "ایشیاٹک اسٹڈیز" ملاحظہ ہو۔

وہ لوگ جو بہرحال جو پائے محاسن ہیں اور ہمیشہ نفع رسانی خلائق کو مدنظر رکھتے ہیں آدمی چاہے جس مذہب و ملت کا پابند ہو اور اُسکے خیال میں کوئی ایک مذہب سچا ہو، لیکن جب فراخدلی اور بے تعصبی سے دوسرے مذاہب کا مطالعہ کریگا اُسے بکثرت ہر جگہ ایسی باتیں دستیاب ہونگی جنکا تعلق کسی ملک، زمانہ اور قوم سے نہیں ہے، بلکہ جن کی عام سچائی قید تخصیص سے آزاد ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ مذاہب عالم کا مطالعہ اس نقطۂ خیال سے نہ کیا جائے کہ اُن میں وہ کون سی باتیں ہیں جو بہرحال غیرفانی حصہ سمجھی جا سکتی ہیں۔ یہ تو ظاہر ہے، اور اسکی سچائی سے کسے انکار ہو سکتا ہے؟ کہ کسی مذہب کی اخلاقی تعلیم سے آگاہ ہونا یا اُسکی حکیمانہ پند و نصائح سے متاثر ہونا کسی کے دین اور ایمان میں خلل انداز نہیں ہو سکتا۔ بلاشبہہ یہ مذاہب کی مستقل عظمت ہے کہ وہ انسان کو اُنکے فرائض زندگانی سے جن کا دوسرا نام اخلاق ہے، مختلف طریقوں سے مطلع اور متنبہ کرتے ہیں۔ اس کلیہ سے کوئی مذہب مستثنیٰ نہیں۔ چنانچہ چین کے مذکورۂ بالا تینوں مذاہب باحسن الوجوہ اخلاقِ حمیدہ اور اعمال پسندیدہ کی رہبری کرتے ہیں۔ ان میں سے ایک مذہب بودھ تو ہماری پاک سرزمین کا مولود ہے۔ اُسکا تخلیہ مہاتما شاکیہ مُنی گوتم بدھ مادرِ ہند ہی کا سپوت تھا۔ باقی دونوں مذہبوں کے بانی کنفیوشش اور لاؤزی چین ہی کے رہنے والے تھے۔ بہ نسبت بدھ کے یہاں کے لوگ ان دنیا کے دو بڑے معلموں کے حالات اور اخلاقی تعلیمات سے بہت کچھ ناواقف ہیں۔ لہٰذا ذیل میں ان مذاہب کا تذکرہ ناظرین کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے۔ نہایت ضروری ابتدائی حالات کے بعد ان میں سے ہر ایک کی اخلاقی تعلیمات کو مقصود اصلی سمجھا گیا ہے نکتہ چینی اور عیب جوئی سے کہیں کام نہیں لیا گیا۔ امید ہے کہ یہ تذکرہ خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔

(۱) مذہب کنفیوشش

کنفیوشس مسیح کی پیدائش سے تقریباً ۵۵۰ سال پہلے پیدا ہوا۔ اسکے زمانہ میں چین کی حالت نہایت ابتر تھی؛ جا بجا چھوٹی بڑی خودمختار ریاستیں اور بادشاہتیں قائم تھیں جن میں آئے دن معرکۂ جدال و قتال گرم رہتا تھا؛ قدیم تہذیب و تمدن کو ظالم حاکموں اور فرماں رواؤں کے ظلم و تعدی سے بہت کچھ صدمہ پہنچ رہا تھا؛ انصاف معدوم تھا، عوام الناس کے حقوق پامال کیے جاتے تھے اور سیاسی و مدنی حقوق کا کوئی خبرگیر اور محافظ نہ تھا۔ کنفیوشش نے ایسی خراب و خستہ حالت دیکھ کر اپنی زندگی کا یہ نصب العین قرار دے لیا کہ اہل مُلک کو قعرِ مذلت سے نکال کر اُنکی اخلاقی، سیاسی، اور مدنی حالت درست کرے۔ اُس نے اپنی ساری زندگی ہم وطنوں کے اخلاق و اطوار سدھارنے کی کوشش میں صرف کی۔ لیکن اپنی محنتوں کا ثمرہ اپنی زندگی میں اسے دیکھنا میسر نہ ہوا۔ بظاہر معلوم ہوتا تھا کہ اُسکی عمر بھر کی تندہی اور دردمندی بالکل ضائع گئی، اس لیے کہ مبتذل قوم نے اُسکی پند و نصیحت پر توجہ نہ کی۔ وہ ایک امیر کے دربار سے دوسرے کے دربار میں جاتا تھا، اور جاتا اسی لیے تھا کہ کہیں تو اُسکی شنوائی ہو؛ اُس نے بہت سی ملازمتیں کیں، کہیں وزیر رہا، کہیں مشیر، کہیں منصف، کہیں مفتی، لیکن کہیں اُسکی قدر دانی نہیں ہوئی۔ اُسے اپنی قابلیت اور سعی پر بڑا بھروسا تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ اگر مجھے موقع دیا جائے تو تباہ سے تباہ حکومت کی بارہ ماہ میں نمایاں اصلاح کر سکتا ہوں، اور تین سال کے اندر ایسا انتظام کر کے دکھا سکتا ہوں کہ ہر قسم کے جرائم مسدود ہو جائیں۔ اُسکی یہ آرزو کبھی پوری نہ ہوئی اور اُسکے بدقسمت ملک نے اُسے کبھی اتنا موقع نہ دیا۔ کنفیوشش نقارخانے کی طوطی کی طرح تھا جسکی آواز کوئی نہ سنتا تھا۔ ہاں چند رفقا اور تلامذہ اسکا اخیر دم تک ساتھ دیتے رہے۔ ۴۷۹ قبل از ولادت مسیح اُس نے نہایت فلاکت و محن کی حالت میں انتقال کیا۔

کنفیوشس کی تعلیم کو حکمت علمی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، جس کا منشا اہل ملک کے اخلاق اور افعال کی اصلاح تھی۔ وہ واجب الوجود اور عالم روحانی کا قائل تھا لیکن بجائے تعلیم آخرت کے اُس نے صرف دنیاوی اصلاح کی جانب اس وجہ سے توجہ کی کہ اُسکے اہل وطن سیاسی، مدنی، اور اخلاقی حالت میں بہت زوال کر رہے تھے۔ گو اُس نے مردہ آبا و اجداد کی پرستش اور دیگر مراسم مروجہ کو اپنی تعلیم میں مصلحتاً برقرار رکھا مگر اُسکی تعلیم کا منتہائے مقاصد

اس دنیا میں اعلیٰ اخلاقی زندگی بسر کرنے کے طریقوں سے آگاہ کرنا تھا۔

کنفیوشس کی ادبی خدمات تو صرف یہ تھیں کہ اُس نے تواریخ، نظم اور اخلاق کی قدیم کتابیں بڑی تلاش اور جستجو سے بہم پہنچائیں اور انھیں خود ایڈٹ کیا۔ ان قدیم کتب کے اسما یہ ہیں: ۔

(۱) یی کنگ (ی ی ک ن گ)۔ "مقدس کتاب تغیرات"
(۲) شُو کنگ (ش ُو کِ ن گ)۔ "کتاب تاریخ"
(۳) شی کنگ (ش ِی کِ ن گ) "کتاب اشعار"
(۴) لی کی (ل ی ک ی)۔ "کتاب مراسم"

شو کنگ میں جو عہد مابعد کے واقعات موجود نہ تھے انھیں اُس نے خود تحریر کیا اور اس اپنی تصنیف کا نام "سوانح بہار و خریف" رکھا۔ اخلاقی تعلیم زبانی دیتا تھا۔ اُسکے شاگردوں نے اسکے اقوال و نصائح کو تین مختصر جلدوں میں فراہم کرلیا جو کنفیوشسی مذہب کی چار کتب مقدسہ میں شامل ہیں۔ ان چاروں کے نام یہ ہیں: ۔

(۱) تاہیو (ٹ ا ۔ ہِ ی ُو) "علم مکبراں"
(۲) چنگ ینگ (چ ن گ ۔ ی ن گ) "حکمت اوسطہ"
(۳) لن یو (ل َن ی ُو) "متفرقات"
(۴) منگ ٹزی (م ن گ ۔ ٹِ زِ ی) "تصانیف منشس"

کنفیوشس نے اپنی تعلیم میں اسلاف کی تعظیم و توقیر اور والدین کی اطاعت اور خدمت گزاری پر سب سے زیادہ زور دیا ہے۔ ایک پورا حصہ جسکا نام ہساو کنگ (ہِ س َا و ۔ کِ ن گ) یعنی "کتاب متعلق فرماں برداری والدین" ہے اسی مبحث کے لیے مخصوص ہے۔ حسب ذیل اقتباسات اسی کتاب سے لیے گئے ہیں

۱۔ ہمارے اجساد ہمیں اپنے والدین سے ورثتاً ملے ہیں، لہذا ہمیں اپنے والدین کو صدمہ پہنچانے یا مضرت دینے کا کبھی قصد نہ کرنا چاہیے۔ یہ اطاعتِ والدین کا پہلا سبق ہے۔ پھر جب ہمنے اسکے ساتھ اپنے اخلاق درست کر لیے، اور آنیوالی نسلوں کے لیے نام نیک چھوڑا، تو گویا ہمنے حقوق والدین کی آخر منزل طے کرلی۔ اسکی ابتدا والدین کی فرماں برداری سے ہے۔ مابعد بادشاہ کی اطاعت سے اور اسکی تکمیل نیک عادات کی ملکوت سے۔ (ب ۱)

۲۔ والدین کے ساتھ عام برتاؤ میں اولاد کو حد درجے کے ادب اور لحاظ کا اظہار کرنا چاہیے جب انکی خدمت کرے تو یہ پیش نظر رہے کہ انھیں حد درجے کا آرام پہنچے، اُن کی بیماری سے دل مضطرب اور بیقرار ہو جائے، جب وہ مرجائیں اُنکے غم میں بیحد انہماک ہو، جب اُنکے نام کی قربانی کیجائے تو نہایت عقیدت مندی کا اظہار کیا جائے۔ (ب ۲)

کنفیوشس نے جہاں اطاعت والدین پر اس قدر زور دیا ہے، والدین کو اولاد کی تعلیم و تربیت کے حقوق کی ادائگی کی بھی شدید تاکید کی ہے۔ ایک مرتبہ جب ایک باپ نے اپنے بیٹے کی نالائقی کی شکایت کی تو کنفیوشس نے باپ اور بیٹے دونوں کو قید میں ڈالدیا۔ جب باپ کی طرف سے اپیل دائر ہوئی تو کنفیوشس نے یہ فیصلہ صادر کیا: ۔

کیا مجھے ایک ایسے شخص کو اپنے باپ کے ساتھ نافرمانی سے پیش آنے کی سزا دینی چاہیے، جسے اُسکے باپ نے ایسی تربیت ہی نہ دی ہو کہ ماں باپ کی اطاعت اسکے جاں گزیں ہو جائے؛ انسان فطری طور پر جرائم پیشہ نہیں ہے؛ اسلیے باپ خاندان کے اندر اور حکومتِ ملک میں اُن خطاؤں کے ذمہ دار ہیں جو اُنکے مقابلہ میں بیٹے یا اہل ملک سے سرزد ہوں۔ اگر بادشاہ اشاعت قانون میں بے پرواہ ہے اور رعایا کو احکام قانون کی خلاف ورزی کی سزا دیتا ہے تو وہ دھوکہ باز ہے؛ اگر وہ خراج رعایا کو بغیر اطلاع دیے وصول کرتا ہے، تو وہ ظالم ہے؛ اگر وہ لوگوں کو بغیر تعلیم و تربیت دیے قتل کرتا ہے تو وہ ستم پیشہ ہے۔

یہ بھی صاف طور سے بتلا دیا ہے کہ تمام حالتوں میں اولاد کے اوپر اطاعتِ والدین فرض نہیں!

جب کوئی معاملہ باپ کی بدکرداری کا پیش آئے تو بیٹے کو شکایت اور داد خواہی کا حق ہے؛ اسی طرح وزیر کو اپنے بادشاہ سے۔ چونکہ لڑکا باپ کی بد اطواری کی وجہ سے داد خواہ ہے، اس لیے محض باپ کے احکام کی اطاعت کو کس طرح فرماں برداری والدین کی نیکی میں شمار کرسکتے ہیں؟

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فرائض اور حقوق کی بنا بہرحال راست کرداری پر رکھی گئی ہے

چاہے وہ ماں باپ کا معاملہ ہو یا حاکم و محکوم کا -

کنفیوشس انسان کی فطری نیکی پر بڑا بھروسا رکھتا تھا، اور نمونہ اور مثال پر بہت زور دیتا تھا - اسکا قول تھا کہ جس طرح سونے کی خاصیت سختی، اور آگ کی گرمی ہی اُسی طرح انسان کی فطری خاصیت نیکی، راست بازی، عقل اور دیانت ہی - گرد و پیش اُسے بدکردار لوگ نظر آتے تھے مگر وہ ہمیشہ یہی کہتا رہا کہ طبعاً انسان درحقیقت نیک ہی ہی -

انسانی فطرت اور اُسکی استعداد و قدرت کی بابت جو خیالات کنفیوشس نے ظاہر کیے ہیں وہ تحیر خیز ہیں - اُسکی تعلیم ہی کہ

انسان اپنی قسمت کا آپ مالک ہی! یہی نہیں بلکہ وہ ارض و سما کے برابر ہی اور قدرت پر حکمرانی کر سکتا ہی - کامل خلوص سے وہ اپنی فطرت اور سرشت کی بدرجۂ اتم تکمیل کر سکتا ہی جب ایسا کرلے تو دوسروں کی طبیعت کی بھی اسی طرح اصلاح کر سکتا ہے - انسانی طبائع کی درستی کے بعد وہ حیوانات اور تمام اشیا کو مکمل کر سکتا ہے - حیوانات اور دیگر اشیاء کی تکمیل طبائع کے بعد وہ زمین و آسمان کی قوتوں کے تغیر و تبدل اور تربیت میں کامیاب ہو سکتا ہی - اس کے بعد وہ ارض و سما کا شریک ثالث ہو سکتا ہی - تب وہ ارض و سما کے برابر ہو جاتا ہے - اور جب ایسا ہو جائے تو امن و امان اور عیش و راحت کا راج ہو جائے، اور تمام چیزیں مکمل ہو جائیں - یہ ہے انسان کا منصب عالم میں - انسان کامل کی طبیعت بھی کامل ہوتی ہے - تمام انسان فطرۃً صالح ہیں؛ اور انکے اندر روحانی اوصاف مستتر ہیں جن سے وہ اپنی طبائع کو کامل بنا سکتے ہیں - جو چیز انسان کے اندر موروثی ہی وہ نیکی ہے اور جب وہ درجۂ کمال کو پہنچ جاتی ہے تو وہ اسکی فطرت ہو جاتی ہے[عہ] -

اس سے کون انکار کر سکتا ہی کہ یہ خیال کہ انسان اپنی سرشت سے حقیقتاً نیک ہی اس خیال سے بدرجہا افضل ہی کہ وہ فطری بد ہی -

ایک مرتبہ کنفیوشس سے کسی نے دریافت کیا کہ وہ کون سا لفظ ہی جس میں تمام اعمال زندگی کی نیکی کا راز مخفی ہی - کنفیوشس نے جواب دیا "کیا وہ لفظ شفقت نہیں ہے - انچہ بخود نہ پسندی بر دیگراں مپسند" اسی مقولہ کو کسی دوسرے موقع پر اس طرح وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے :

اعلی انسان میں یہ چار خوبیاں، جو میں اپنے میں کسی طرح جمع نہیں کر سکا، ہوتی ہیں (۱) اپنے باپ کی ایسی خدمت کرنا جیسی میں اپنے بیٹے سے اپنے لیے چاہتا ہوں، (۲) اپنے بادشاہ کی ایسی خدمت کرنا جیسی میں اپنے ماتحت وزیر سے چاہتا ہوں، (۳) اپنے بڑے بھائی کی ایسی خدمت کرنا جیسی میں اپنے لیے اپنے چھوٹے بھائی سے چاہتا ہوں، (۴) اور دوستوں کے ساتھ ایسا سلوک پہلے آپ کرنا جیسا میں اپنے دوستوں سے اپنے واسطے توقع رکھتا ہوں -

(چنگ یُنگ باب ۴)

مذہب کنفیوشس کی رو سے نیکی کی پانچ قسمیں ہیں (۱) کرم (۲) صدق (۳) علم (۴) وفاشعاری و تدین (۵) شایستگی اطوار (یا حسن معاشرت) ان میں سے پہلی نیکی تمام نیکیوں کی جڑ ہی - بلکہ منشس نے جو کنفیوشس کا سب سے بڑا شاگرد ہی یہاں تک لکھا ہی کہ "کرم ہی انسان ہی" کو انگ تزی نے جو لاؤتزی کا شاگرد رشید ہی یہ لکھا ہی کہ کنفیوشس نے کرم کی تعریف اس طرح کی تھی کہ "کرم یہ ہی کہ انسان نہایت خلوص باطن کے ساتھ تمام موجودات سے گہری ہمدردی رکھتا ہو، تمام آدمیوں سے محبت کرتا ہو اور خود غرضانہ خیالات اُسکے دل میں جگہ نہ پاتے ہوں" الغرض کرم سے کنفیوشس کی مراد محض 'خیرات' نہیں ہی بلکہ وہ نیکی ہی جو تمام تعلقاتِ زندگانی پر حاوی ہی - وہ ایک دوسرے موقع پر کہتا ہے : -

نیکوکار کا کرم محض اپنے اعزا و اقربا تک محدود نہیں بلکہ اُسکے دائرہ میں حاکم و محکوم کے تعلقات بھی شامل ہیں - نیز اُسی کا قول ہی کہ "کرم تمام بنی نوع سے محبت کا نام ہے"

دیانت کو کنفیوشس انسانی عادات کا سنگ بنیاد قرار دیتا ہی - وہ کہتا ہے

۱ - دیانت کو اصل الاصول سمجھو (۲) میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کس طرح کوئی بغیر دیانت کے زندگی بسر کر سکتا ہے -

کسی دوسرے موقع پر کنفیوشس نے انسانی نیکیوں کا یہ لب لباب نکالا ہے : -

وہ شخص جو یہ پانچ چیزیں کر سکتا ہی 'نیک انسان' ہی! اپنی اور دوسروں کی عزت کرنا - سخاوت، وفاداری و خلوص، نیک کاموں میں چستی اور تمام انسانوں سے محبت کرنا -

عدل و انصاف اور رواداری کی تعلیم اس طرح دی ہے : -

عہ ملاحظہ ہو ڈگلس صاحب کی کتاب "کنفیوشینزم" ۳۴ ص

۱- افضل انسان زندگی کے تمام حالات میں تعصب اور عناد سے معرا رہتا ہے۔ صرف انصاف اسکا رہنما ہوتا ہے، اور اسکی تمام قوتیں عدل و انصاف اور بہی خواہی بنی نوع پر صرف ہوتی ہیں۔

۲- افضل انسان وہ ہے جو سب کے ساتھ مساوی بہی خواہی کا برتاؤ کرے، جو خود غرضی اور جانب داری سے پاک و صاف ہو۔

۳- بد ہے وہ آدمی جو صرف خود غرضی کے خیالات کو اپنے دل میں جگہ دے اور دوسروں کے ساتھ نیکی کرنے کا خیال اپنے دل میں نہ رکھتا ہو۔

برتر انسان یا انسان کامل کون ہے؟ اسکے جواب میں اس حکیم کے خیالات حسب ذیل ہیں:-

۱- برتر انسان وہ ہے، جس کی روح میں ہمواری و مساوات کے صفات ہوں۔ رذیل کا دل ہمیشہ پریشان اور متفکر رہتا ہے۔

۲- برتر انسان ہمیشہ ذہن اور قوت عمل میں ترقی کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ نالائق آدمی روز بروز جہالت اور بدکاری کی راہ میں بڑھتا ہے۔

۳- افضل انسان کے دل میں عدل و انصاف کا خیال رہتا ہے۔ کمینہ کے دل پر طمع غالب رہتی ہے۔

۴- اعلیٰ انسان عدل و مساوات کو تمام چیزوں سے بالا جانتا ہے۔

۵- برتر انسان اپنی لیاقت سے زیادہ نفع کا خواہاں نہیں۔ وہ تو یہ چاہتا ہے کہ اسکی قابلیت اسکے نفع سے بڑھی ہوئی ہو۔

۶- افضل انسان منھ سے الفاظ نکالنے سے پہلے یہ سوچ لیتا ہے کہ آیا یہ الفاظ منھ سے نکالنے کے قابل بھی ہیں یا نہیں۔ وہ پہلے سوچ لیتا ہے کہ آیا یہ کام مفید ہے یا مضر، تب وہ اس کام پر ہاتھ ڈالتا ہے۔ وہ ایسا نیک اور راست باز ہوتا ہے کہ لوگ اسکی عزت کرتے ہیں۔ جس کام کو وہ ہاتھ لگاتا ہے اور پورا کرتا ہے، وہ ایسا ہوتا ہے کہ دوسرے اسے نظیر کے طور پر سمجھتے ہیں۔ اسکے چال چلن کو دیکھکر لوگ سدھرتے ہیں۔ اسکے تمام حرکات و سکنات صحیح قوانین کے موافق ہوتے ہیں۔ اس طرح وہ اپنے آپ کو لوگوں کے سامنے پیش کرتا ہے۔ لوگ اسکی عزت کرتے ہیں، اسے محبوب رکھتے ہیں، اسکی پیروی کرتے ہیں اور مثل ہیبے ہو جاتے ہیں۔

۷- افضل انسان یہ نہیں چاہتا کہ سارا نفع اپنی ہی ذات کے لیے ہو بلکہ وہ دوسروں کو بھی متمتع اور مستفیض ہونے کا موقع دیتا ہے۔

۸- برتر انسان سب کا منظور نظر اور محبوب کل ہے، وہ آسمان کی طرح وسیع، سرچشمۂ آب کی طرح عمیق اور متحرک، وہ مثل بحر ہے۔ جہاں جہاز پہنچ سکتے ہیں، جہاں انسانی قوت کی رسائی ہے، جہاں آسمان کا سایہ اور زمین کا فرش ہے، جہاں آفتاب و ماہتاب درخشاں ہیں، جہاں کہرا اور شبنم پڑتی ہے۔ تمام ذی روح اور تمام متنفس اسکی عزت کرتے ہیں اور اس سے محبت رکھتے ہیں۔[1] (ل - کی ۳۱)

۹- افضل انسان جب لوگوں کی زبانی اپنی تعریف سنتا ہے تو صرف اس سے وہ خوش نہیں ہوتا۔ جب وہ ایسے شخصوں کا حال دریافت کرتا ہے جو سردی سے تکلیف اٹھا رہے ہوں تو وہ انھیں لباس دیتا ہے بھوکوں کو پیٹ بھر کے کھانا کھلاتا ہے۔ (ل - کی ۲۹)

۱۰- برتر انسان خفیہ طور سے اپنے باطن کا معائنہ کرتا ہے کہ مبادا کوئی بدی وہاں جاگزیں ہو۔ یا کوئی موقع بے اطمینانی کا ہو۔

۱۱- برتر انسان بننے کی یہ ترکیب ہے کہ اپنے دلی جذبات کو نکوئی اور راستی کی جانب مائل کیا جائے، مطالعۂ کتب سے محبت کیجائے، مطالعۂ کتب علم اور نیکی کا سرچشمہ ہے جسکی ثانی کوئی دوسری چیز نہیں۔ جب صدق پر خلوص کے ساتھ عمل کیا جائے اور دل خود فریبی سے منزہ ہو تو قلب درست ہو جاتا ہے۔

۱۲- برتر انسان کے الفاظ اور اعمال میں مطابقت ہوتی ہے۔ کیا برتر انسان کی یہ صفت نہیں کہ وہ نہایت با اخلاص ہوتا ہے؟ (ل - کی ۲۸)

۱۳- جب برتر انسان اپنے درجے کے موافق لباس زیب تن کرتا ہے تو وہ اسکی آرایش افضل انسان کے اطوار و طرق سے کرتا ہے۔ اطوار و طرق کی زیبایش بڑے آدمیوں کے سے کلام سے کرتا ہے۔ زبان کی آراستگی برتر انسان کے نیک اعمال سے کرتا ہے اسلیے کہ وہ اس سے شرمسار ہوتا ہے کہ لباس تو برتر لوگوں کا پہنے اور ان کے سے طور و طریق نہ ہوں۔

---

[1] کہا جاتا ہے کہ یہ عبارت چین کی کتب مقدسہ میں نہایت فصیح و بلیغ ہے۔

یا ان کے سے طور و طریق ہوں لیکن گفتگو ویسی نہ ہو۔ یا نیکیاں تو ہوں لیکن وہ عملاً ظاہر نہوں (ل۔کی)

مندرجۂ ذیل نصائح کا منشا بھی تزکیۂ نفس اور تہذیبِ نفس ہے: ۔

جب تم کسی عقلمند کو دیکھو تو اپنے دل میں غور کرو کہ تم میں بھی اسکی خوبیاں ہیں یا نہیں۔ جب کسی بدکار کو دیکھو تو اپنے اوپر نظر غائر ڈالو اور اپنے حال کی جانچ پڑتال کرو۔

کاش خود ضبطی کی عادت ڈالو، دوسروں کا اپنے سے مقابلہ اور انکے ساتھ ایسا برتاؤ کرو، جیسا تم چاہتے ہو کہ وہ تمہارے ساتھ کریں۔ یہ انسانیت کی تعلیم ہے، اور اس سے بڑھ کر کچھ نہیں ہے۔

دوسری نصیحت کا جزوِ اخیر اُسی حکمت کا اعادہ ہے جسے اُسنے لفظ "معاوضہ" میں مضمر بتایا تھا۔ نیک و بد کی صحبت سے پندآموز ہونے کا کیسا اچھا طریقہ بتایا ہے:

اگر ہم سفر کرنیوالے تین آدمی ہیں تو مجھے بہرحال دو استاد (اپنے ساتھیوں میں) مل جائینگے نیک آدمی کو میں تقلید کی نیت سے منتخب کرونگا اور بدکار کو دیکھ کر اپنی ذات کی اصلاح کروں گا۔

کنفیوشس دنیا کے اُن چند لوگوں میں سے تھا جن کے قول اور فعل میں مخالفت نہیں ہونے پاتی۔ وہ منکسر المزاجی میں مشہور خلائق تھا۔ تعصب اور ہٹ دھرمی، خودغرضی اور خودفریبی کا جن سے بچنے کی وہ دوسروں کو نصیحت کرتا تھا، اُسکے عادات میں نام و نشان نہ تھا۔ لیکن پاکبازی اور نیکدلی کا تقاضا یہ ہے کہ انسان اپنی طرف سے مطمئن نہ رہے۔ کنفیوشس ایسا پاک نفس اور صاف باطن تھا لیکن اپنی بابت جو رائے رکھتا تھا، اُسے دیکھ کر ہر شخص پتہ لگا سکتا ہے کہ محاسبۂ قلب میں جیسی تاکید دوسروں کو کی ہے اُسے اپنے اوپر بھی ویسا ہی اہم فرض سمجھتا تھا:۔

میں ایسا نیک نہیں ہوں کہ خواہشات پر غالب آجاؤں، نہ اتنا عقلمند ہوں کہ اپنے آپ کو بند مصائب و آلام سے رہا کرلوں، نہ اتنا بہادر ہوں کہ خوف و دہشت سے میرا دل کبھی ہراساں نہ ہو۔ (لن یو ب ۲ آیت ۲۵)

ایک اور موقع پر کہتا ہے: ۔

اگر میں ایک ایسے شخص کا تصور کروں جس کی ذات میں "اتقا اور انسانیت" جمع ہوں تو بھلا میں اپنا موازنہ اُس سے کرنے کی جرأت کیسے کر سکتا ہوں؟ میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ ان نیکیوں پر بغیر ہمت ہارے عمل کرنے اور بغیر مایوس ہوئے دوسروں کو تعلیم دینے کی کوشش کرتا ہوں۔

جھوٹی باتیں بنانیوالوں اور چکنی چپڑی باتوں سے لوگوں کو دھوکا دینے والوں کو اس طرح متنبہ کیا ہے: ۔

ناصبوری اور مصیبت میں مبتلا ہوگا وہ آدمی، جس کے دل لبھانے والے اقوال کا ایفا افعال مطابقہ سے نہ ہو۔ (ل۔کی ب ۲۸)

ہمدردی بنی نوع، جو اُسکی تعلیم کا جزوِ اعظم ہے، اور جسکی بابت اوپر کی نصائح میں بھی جابجا ذکر آیا ہے اُسکی بابت ذیل کا فقرہ کیسا دلپذیر ہے: ۔

جہاں گہری ہمدردی کا مادہ ہے وہاں انسانیت کا اظہار دوسروں کے ساتھ محبت کرنے سے ہوتا ہے۔ (ل۔کی ب ۲۹)

شاید ہی کوئی شخص، جو فلسفۂ اخلاق سے واقف ہو، کنفیوشس کے اس بےنظیر قول سے اختلاف کرنے کی جرأت کر سکتا ہے کہ "نیکی کی محبت ایسی ہونی چاہیے جیسی حُسن کی محبت ہوتی ہے"۔

اس سے یہ باتیں ظاہر ہوتی ہیں کہ جس طرح حُسن کی محبت صرف حُسن کے واسطے ہوتی ہے، اُسی طرح نیکی کی محبت محض نیکی کے واسطے ہو۔ یعنی کسی معاوضہ یا منفعت کی توقع امورِ خیر میں نہیں کرنا چاہیے ورنہ بحالت توقع نفع، نیکی حقیقی نہ ہوگی۔ دوسرے جس طرح حُسن کی محبت کا تعلق دل سے ہوتا ہے، اور دل حُسن سے بغیر متاثر ہوئے نہیں رہ سکتا اُسی طرح نیکی کا تعلق دل سے ہونا چاہیے اور انسان کے دل میں ایسی صلاحیت موجود ہونا چاہیے کہ امورِ خیر سے بغیر متاثر ہوئے نہ رہ سکے۔ سبحان اللہ کیا پاک تعلیم ہے جسے ہر ذی ہوش کو اپنے دل میں جگہ دینا چاہیے۔

ایک جگہ تربیتِ حُسنِ معاشرت کے بعد وہ کہتا ہے: ۔

تربیت نفس اول اپنے گرد و پیش کے لوگوں پر اثر ڈالتی ہے اور رفتہ رفتہ تمام مُلک پر

ہر شخص کو اپنے الفاظ کا لحاظ رکھنا چاہیے اور اپنے اطوار کی حفاظت کرنا چاہیے۔ خلاقِ ذمیمہ کو اپنے دل سے نکال کر پھینک دینا چاہیے اور نیکی کو اپنا محل، کرم کو اپنا راستہ، شائستگی و حُسنِ لیاقت کو اپنا لباس، عقل کو اپنا چراغ اور دیانت کو اپنا جادو قرار دینا چاہیے۔ متانت، ادب، اور وفاداری تربیت یافتہ آدمی کی خصلتیں ہیں۔ متانت اسے عوام الناس سے ممتاز کرتی ہے؛ معزز ہو کر وہ محبوبِ خلائق ہوتا ہے؛ مطیع ہو کر وہ مطاعِ عالم ہوتا ہے؛ باوفا ہو کر وہ متدیّن ہوتا ہے۔

نیز اُسی کا قول ہے کہ "خوش خلقی لیاقت کے قریب ہے، کفایت شعاری انسانیت کے قریب ہے؛ اور ایمان داری سچائی کے قریب ہے"۔ ہر حالت میں سچائی پر قائم رہنے کی ان الفاظ میں اُس نے تاکید کی ہے کہ "تم شمال یا جنوب کے وحشیوں کے مُلک میں بھی رہتے ہو تو بھی تمھارے اطوار خطا و قصور سے پاک ہونے چاہییں"۔ وہ لوگ اس نصیحت کو بالخصوص سُن رکھیں جو اپنے جرائم کو جھوٹی سچی مجبوریوں کا نام لے کر چھپانا چاہتے ہیں۔

اسی طرح بادشاہوں کو ذیل کی نصیحت کس قدر عاقلانہ ہے:—

بادشاہ کو اپنے وزرا کے انتخاب میں اپنے وجدان کے موافق سارا ناس کے نفع کو ملحوظِ خاطر رکھنا چاہیے۔ اُسے اپنے فرائض کی تکمیل کا خیال رکھنا چاہیے اور اولے فرائض کے قانون کو انسانی نیکی میں، جو تمام انسانوں کی محبت کا سرچشمہ ہے، تلاش کرنا چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ بادشاہ کے لیے بھی سوا اسکے چارہ نہیں ہے کہ اپنی ذات کی اصلاح کرے اور تکمیلِ فرائض میں ہمیشہ سرگرم رہے۔

کنفیوشس بعض معلمین کی طرح دولت کو نظرِ حقارت سے نہیں دیکھتا تھا بلکہ وہ اسکی قوت سے بخوبی واقف تھا، لیکن وہ اسکی برائیوں سے بھی ویسا ہی آگاہ تھا۔ چنانچہ مندرجہ ذیل نصیحت ہمارے زمانہ میں، جبکہ حصولِ دولت کا سودا عالمگیر ہے، خصوصیت کے ساتھ نفع بخش ثابت ہوگی:—

دولت اور عزت انسان کے مطلوب ہیں۔ اگر جائز طریقوں سے وہ میسر نہ ہوں، تو انکے حصول کی خواہش دل سے نکال دینا چاہیے۔ غریبی اور بے توقیری وہ چیزیں ہیں، جو انسان کو مرغوب نہیں۔ اگر انسان راست کرداری کے ذریعہ سے ان کے پنجے سے رہائی حاصل نہیں کر سکتا تو انکو مردانگی سے برداشت کرنا چاہیے۔

ایک مرتبہ کسی نے کنفیوشس سے دریافت کیا کہ عوام کے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہیے؟ اُس نے جواب دیا "اُنھیں فارغ البال اور متمول بنانا چاہیے"۔ دوبارہ پوچھا گیا کہ اس سے زیادہ کیا کیا جائے؟ تو اُس نے کہا "اُنھیں تعلیم دینا چاہیے"۔

کنفیوشس نے علم کی جو تعریف کی ہے اور اُسکی تحصیل کا جو طریق بتایا ہے وہ اس قابل ہے کہ دنیا کے تمام طالبِ علم اپنے لوحِ دل پر اسے نقش کر رکھیں:

جب تم کسی چیز کو جانتے ہو تو یہ کہنا کہ تم اُسے جانتے ہو اور جب نہیں جانتے تو یہ تسلیم کرنا کہ تم اُسے نہیں جانتے، یہی علم ہے۔

مطالعہ بغیر غور و خوض کے تضیعِ محنت ہے؛ ذاتی غور و خوض کے بغیر مطالعہ خطرناک ہے۔

کنفیوشس سے ایک مرتبہ دریافت کیا گیا کہ موت کیا چیز ہے؟ اُس نے جو عاقلانہ جواب اس سوال کا دیا ہے وہ اس قابل ہے کہ ہر شخص اُسے اخیر فیصلہ مان کر شاعرانہ قیاسات سے باز آجائے:—

جب انسان کو یہی نہیں معلوم کہ زندگی کیا چیز ہے تو موت کا اُس پر کیا حال کھل سکتا ہے۔

کنفیوشس نے اعتدال پر بہت زور دیا ہے اور "خیر الاُمور اوسطھا" کی جابجا تعلیم دی ہے۔ اخلاقی جرأت، جس کا وجود معدودے چند لوگوں میں پایا جاتا ہے، اُسکا سبق بھی جابجا سکھایا ہے۔ وہ کہتا ہے:—

دریا میں جاکر پانی کے دندوں اور خوفناک جانوروں کا مقابلہ کرنا ماہی گیر کی بہادری ہے؛ زمین پر شکار کرنا۔ شیر اور گینڈے کو مار ڈالنا شکاری کی بہادری ہے؛ میدانِ جنگ میں تیر و تفنگ کا مقابلہ کرنا اور موت کو حیات تصور کرنا سپاہی کی بہادری ہے؛ لیکن یہ معلوم کرنا کہ غریبی آسمانی حکم ہے، اور انسانی معاملاتِ زندگی مد و جزر کے ماتحت ہیں اور مصائب سے کسی طرح خائف نہ ہونا عقل مند کی بہادری ہے۔

عادات کس طرح سنورتی ہیں:—

علم کا شوق علم کی نزدیکی ہے؛ استقلال نیکی کا قرب ہے؛ خجالت اور شرمساری سعادت مندی کی ہمسائگی ہے۔ جو شخص ان تینوں باتوں سے آگاہ ہے وہ یہ بھی جانتا ہے کہ عادات

کس طرح سنوارتی ہیں۔ (لی۔کی)

ذیل میں چین کی کتب مقدسہ سے چین کے حکماے متقدمین کے چند پند و نصائح کی گل چینی کر کے ناظرین کی خدمت میں ایک گلدستہ پیش کیا جاتا ہے، جس کے ہر پھول کی رنگت و بو شام دماغ کو معطر اور چشم بصارت کو منور کرتی ہے چونکہ ان کتابوں کا مدیر کنفیوشس ہے اس لیے ممکن ہے کہ بعض خیالات جو دیگر حکماے متقدمین کی طرف منسوب کیے ہیں خود اُسی کے خیالات کا پرتو ہوں۔

(ا) شاہنشاہ کوُہ، جس کا عہد سلطنت مسیح کی ولادت سے ۲۳۴۵ سال پیشتر تھا، کہتا تھا کہ

تمام انسانوں کی محبت سے بڑھ کر کوئی دوسری نیکی نہیں ہے اور مہات سلطنت میں اس سے بڑھ کر اور کوئی کام اہم نہیں ہے کہ تمام آدمیوں کو نفع پہنچایا جائے۔

اس قول کی بزرگی اور قدامت ہمیں حیرت میں ڈالتی ہے۔

(ب) ایک مرتبہ شہنشاہ شن نے (جس کا عہد سلطنت مسیح کی ولادت سے دو ہزار سال سے بھی پیشتر تھا) اپنے وزیر سے دریافت کیا کہ نو اخلاق حمیدہ کون سے ہیں۔ اُس وزیر نے جواب دیا:۔

(۱) خوش خلقی خودداری کے ساتھ (۲) نرمی استقلال کے ساتھ (۳) صاف گوئی ادب و تعظیم کے ساتھ (۴) امور سلطنت میں چستی توقیر کے ساتھ (۵) انکسار تہوّر کے ساتھ (۶) راست بازی مہربانی کے ساتھ (۷) اطمینان عاقبت بینی اور دقیقہ شناسی کے ساتھ (۸) ہمت خلوص باطن کے ساتھ (۹) شجاعت اتقا کے ساتھ۔ (شوکنگ)

(ج) متقدمین میں سے ایک حکیم نے جسکا نام یُو ہے ایک بادشاہ کو مہات سلطنت کی بابت اس طرح نصیحت کی ہے:۔

ہوشیار رہ۔ قوانین اور آئین کی بجا آوری میں تساہل نہ کر۔ آرام طلبی میں جادۂ اعتدال سے مت ہٹ۔ لائق لوگوں کو ملازم رکھنے میں اپنے اور اُنکے درمیان کسی واسطے سے کام نہ لے۔ بُرائی کو بلا تامل اپنے سے جدا کر دے۔ ایسی تدابیر پر عمل نہ کر جنکی خوبی کی نسبت تجھے خود شبہہ ہو۔ مطالعہ کیا کر تاکہ تیری اغراض عقل و حکمت کے مطابق ہوں۔ لوگوں کی مدح و ثنا کی طمع میں راست بازی کے خلاف کوئی کام نہ کر۔ لوگوں کے مقاصد کی مخالفت ذاتی منفعت کے خیال سے ہرگز نہ کر۔ (شوکنگ جلد اول)

(د) ایک وزیر نے جس کا زمانہ حیات مسیح کی پیدائش سے اٹھارہ صدی پیشتر تھا، حسب ذیل تحیر خیز خیالات کا اظہار کیا ہے:۔

۱۔ نیکی کا کوئی یکساں معیار نہیں ہے۔ نیکی کی نسبت اعلیٰ خیال ہی اپنی آپ مثال ہے۔ نیکی کی کوئی مستقل اور یکساں صفت نہیں ہے جس کی بابت اعلیٰ خیال کیا جائے وہ صفت اُس جگہ پائی جاتی ہے جہاں وجدانِ عالم سے موافقت و مطابقت ہو۔ (ایضاً)

۲۔ کبھی بجز خلوص قلب کے مت رہو۔ اگر تم نہایت سختی سے اپنے چھوٹے چھوٹے کاموں کی حفاظت نہیں کرتے تو نتیجہ یہ ہوگا کہ بڑے بڑے کاموں میں تمھاری نیکی کو صدمہ پہنچے گا۔ (ایضاً)

۳۔ کم عقل کا خیال ہوتا ہے کہ نیکی کے چھوٹے چھوٹے کام غیر مفید ہیں اور اسلیے وہ اُنھیں نہیں کرتا۔ نیز وہ خیال کرتا ہے کہ بدی کے چھوٹے چھوٹے کام بے ضرر ہیں اس لیے اُن سے پرہیز نہیں کرتا۔ (یی کنگ)

۴۔ قابلیت کم عہدہ بڑا، عقل تھوڑی تدبیریں لمبی چوڑی، قوت کم اور بوجھ بھاری، جہاں کہیں یہ اسباب جمع ہو جائیں شاذ ہی ایسا ہوگا کہ انکا انجام بد نہو۔ (ایضاً)

۵۔ تکبر کو بڑھنے دینا نہ چاہیے۔ خواہشات نفسانی کو پورا نہ کرنا چاہیے۔ اپنی ہی رائے کی ہمیشہ تقلید نہ کرنی چاہیے۔ آرام و راحت میں کثرت سے کام نہ لینا چاہیے (لی کی)

مندرجۂ بالا حصۂ مضمون کے مطالعہ سے ثابت ہوگیا ہوگا کہ کنفیوشس کی تعلیمات میں پند و حکمت کے کیسے کیسے جواہر آبدار موجود ہیں۔ اُسکی تعلیمات سے ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ وہ ایک عالمگیر اتحاد اور یکجہتی کا خواستگار اور ساعی تھا جس کے رو سے اُن لوگوں کی عزت کیجائے جو اُسکے واقعی مستحق ہوں۔ راحت، غصہ، رنج اور خوشی کے جذبات کو انکے جائز حدود کے اندر رکھا جائے۔ انانیت کو مغلوب اور خواہشات نفسانی کو مطیع کیا جائے متانت، صدق، خلوص باطن، لطف و مدارات، خوش خلقی اور خوش لیاقتی کی صفات اپنے اندر پیدا کیجائیں اور تقویٰ کے ساتھ حسن معاشرت کو لازمی سمجھا جائے اسلیے کہ ان میں سے کسی ایک کی عدم موجودگی انسان کو "انسان کامل" کے پایہ سے گرا دیتی ہے۔

(۲) مذہب لاؤ ٹزی

(تاؤ مذہب)

لاؤٹزی اپنی عمر کے اخیر حصہ میں کنفیوشس کا ہمعصر تھا۔ اُسکا سالِ پیدایش ۶۰۴ قبل مسیح ہے، یعنی کنفیوشس سے پچاس سال وہ بڑا تھا۔ سالِ وفات تحقیق نہیں، اتنا ثابت ہے کہ اُس نے بہت بڑی عمر پائی۔ چنانچہ جب لاؤٹزی کی کنفیوشس سے پہلی ملاقات ہوئی تو اُسوقت کنفیوشس کی اکاون سال کی عمر تھی۔ اُسوقت بھی لاؤٹزی ایک ریاست میں عہدہ دار تھا جس سے بعد میں دستکش ہوکر ایک عرصہ تک سیر و سیاحت کرتا رہا اور پھر گوشہ نشین رہا۔

لاؤٹزی بہت ذہین اور طباع شخص تھا۔ کنفیوشس کے برخلاف اُسے رسم و رواج کی پابندی اور شائستگی اطوار کے بجائے سادگی پسند تھی۔ نیز لاؤٹزی ابنائے وطن کی اصلاح کی جانب سے مایوس تھا اور کنفیوشس کی کوششوں کا اُسے کوئی نتیجہ نکلتا معلوم نہ ہوتا تھا۔ شاہنشاہ چاؤ کے دربار میں جب کنفیوشس سے اُسکی ملاقات ہوئی تو معمر اور تجربہ کار لاؤٹزی نے کنفیوشس کی زبانی اُسکی ناکامیوں کا حال سنکر مایوسی ظاہر کی اور مدد خواہی کا جواب نفی میں دیا۔

گو لاؤٹزی کنفیوشس کی طرح انسان کی فطری نیکی کا قائل تھا اور بعض دیگر تعلیمات بھی اول الذکر کے خیالات سے ملتی تھیں، اُسکی اور کنفیوشس کی تعلیمات میں بہت بڑا اصولی اختلاف ہے۔ لاؤٹزی رسوم اور ظاہری پابندیوں کا حامی نہ تھا، بلکہ اُنکا مخالف تھا۔ اُسکی تعلیمات میں روحانیت اور فلسفہ کو زیادہ دخل ہے۔ اُسکے مذہب کا منشا تزکیۂ باطن اور تربیتِ نفس تھا۔ کنفیوشس یہ چاہتا تھا کہ لوگ اپنے آبا و اجداد کے مراسم و اطوار کا تحفظ اور اُنکی پیروی کریں۔ لاؤٹزی یہ کہتا تھا کہ لوگ اُس ابتدائی حالت کی طرف رجوع ہوں جب انسان قیود رسوم سے آزاد تھا۔ ہرچند کہ لاؤٹزی خیالات یاس رکھتا تھا، کنفیوشس کی طرح وہ بھی رہبر و رسوم کی تھا اور اُسکا مطمحِ نظر بھی لوگوں کی اخلاقی، سیاسی اور مدنی حالت سدھارنا تھا۔ پابند و حامی تکلفاتِ ظاہری کو مخاطب کرکے وہ کہتا ہے:-

اپنی عقل و دانش کو چھوڑ دو، اپنی خیر سگالی اور مآل اندیشی کو دور پھینک دو، پھر دیکھو لوگ سوگنا اچھے ہوجائیں گے، اپنی ہمدردی کو اٹھاکر طاق میں رکھ دو، اپنی نصفت پسندی کو پس پشت ڈالدو، تب لوگ مطیع والدین اور بہی خواہ اولاد ہوں گے، اپنی ہوشیاری کو برطرف کردو اور طلبِ منفعت کا خیال دل سے نکال دو ...... اور اپنی فطری سادہ حالت میں ظاہر ہو، عفت و عصمت کی حفاظت کرو، خود غرضی کو دباؤ اور اپنی خواہشوں اور امنگوں کو مغلوب کرو۔ (ٹاؤ تہ کنگ ۱۹)

تین روحانی اوصاف کا وہ اس طرح تذکرہ کرتا ہے:-

میرے پاس تین قیمتی چیزیں ہیں جنکو میں ہمیشہ عزیز رکھتا ہوں اور جن کی میں ہمیشہ قدر کرتا ہوں۔ اول رحم، دوسرے کفایت شعاری، تیسرے انکسار۔ رحمدل ہوکر میں بہادر ہوسکتا ہوں، کفایت شعار ہوکر میں سخی ہوسکتا ہوں، منکسر ہوکر میں بزرگ خلائق ہوسکتا ہوں۔ اس زمانہ میں لوگ رحمدلی کو چھوڑ دیتے ہیں اور صرف بہادر بننے کی کوشش کرتے ہیں۔ کفایت شعاری کو چھوڑ دیتے ہیں اور سخی بننے کا خیال رکھتے ہیں اور اخیر جگہ چھوڑکر اول جگہ تلاش کرتے ہیں۔ یہی اُنکی موت ہے۔ رحمدل وہ ہے جو حملہ میں فتحمند اور مدافعت میں محکم ہوتا ہے۔ جسکا خدا حامی ہے اُسے آغوشِ رحمدلی میں جگہ دیتا ہے۔

لاؤٹزی کے بعض سیاسی اصول اُسکی نہایت روشن دماغی کا پتہ دیتے ہیں چنانچہ یہ خیال کہ "سب کچھ سائر الناس کے لیے اور سب کچھ سائر الناس کی رائے اور منظوری سے" جو فی زماننا جمہوریت کا منتہائے خیال سمجھا جاتا ہے اُسکی سیاسی تعلیم کا ایک جزو ہے۔ نیز اُسکے اقوال سے معلوم ہوتا ہے کہ اُسکی بے نظیر ذہانت یہ معلوم کرچکی تھی کہ "قوم جاندار چیز کی طرح نشو و نما پاتی ہے اور بے جان چیز کی طرح مصنوعی نہیں ہے"۔ وہ قتال و جدال بلکہ سزائے موت تک کا مخالف تھا۔ اُسکا قول تھا کہ اگر حکومت کا انتظام معقول ہو تو سزائے موت کا کیا ذکر، کسی قسم کی سزا کی ضرورت پیش نہ آئے۔

اگر لوگوں کو سادگی اور صفاتِ قلب کی تعلیم دیجائے تو بالکل انسدادِ جرائم ہوجائے۔ یہ دولت، منصب اور علم کی طمع ہے، جو لوگوں کے دلوں کو پریشان کرتی ہے، اُن کے جذبات کو مشتعل کرتی اور موت کو اُنکے لیے معمولی چیز بنا دیتی ہے ..... جو لوگ عیش و طرب کے لیے جیتے ہیں یا جنکا مقصودِ حیات خود غرضانہ خیالات ہیں وہ موت پر آمادہ

ہو جاتے ہیں، جب کسی نہ کسی وجہ سے انکے مقاصد حاصل نہیں ہوتے اور انکی طاعت تدابیر خاک میں مل جاتی ہیں۔ جب کوئی قوم اس خطرناک منزل پر آجاتی ہے تو کسی قسم کی سزا اُنھیں معاصی سے باز رکھنے میں کامیاب نہیں ہو سکتی۔

جب لوگ موت سے نہ ڈریں تو بتاؤ موت سے اُنھیں کیسے مغلوب کیا جا سکتا ہے؟ اگر کوئی شخص موت کا مستحق ہے تو وہ بڑا مارنیوالا تو موجود ہے جس کے ہاتھ میں موت اور زندگی کی باگ ہے ۔۔۔۔۔۔

لہذا جو شخص قاتل کا کام کرے وہ صانع عالم کے ہاتھوں سے اُسکا کام چھیننا چاہتا ہے، اور جو صانع عالم کا اختیار چھیننے کا خیال رکھتا ہے وہ خود اپنے ہاتھ کاٹتا ہے[۵]۔

اخوت اور رواداری کا سبق اس طرح دیتا ہے :-

اپنے بھائیوں کی عیب جوئی نہ کرو۔ اپنا حال جان لینے پر قناعت کرو۔ خود پاک اور باعصمت رہو، لیکن دوسروں کو تنبیہ نہ کرو۔ اپنے آپ راست باز رہو لیکن دوسروں کو اسکیلیے ایذا نہ دو۔ بدقسمت کو بدمعاشی کی تہمت نہ لگاؤ۔ ایک شخص مر جائے اور دوسرا زندہ رہے تو یہ مت سمجھو کہ ان میں سے ایک پر خدا کا غضب نازل ہوا۔ جو واقعی نیک ہے وہ تمام انسانوں سے محبت کرتا ہے اور کسی کی تردید نہیں کرتا، وہ سب کی عزت کرتا ہے اور کسی کی مخالفت نہیں کرتا۔ وہ نیک لوگوں کے ساتھ رہتا ہے اور انکی صحبت سے مستفید ہوتا ہے، لیکن بد آدمیوں کی اصلاح اُسکا کام ہوتا ہے اور لوگوں کو تاؤ (خدا) کی جانب متوجہ کرنا اُسکی زندگی کا مقصود۔

لاؤزی خود ضبطی، ترکِ انانیت اور محاسبۂ باطن پر بہت زور دیتا تھا۔

۱۔ جو شخص خود بیں ہے وہ کبھی فروغ نہیں پا سکتا۔ جو خود پسند ہے وہ معزز نہیں ہو سکتا۔ جو خود ستا ہے وہ لائق نہیں ہو سکتا۔ جو تعلّی پسند ہے وہ عالی مرتبت نہیں ہو سکتا۔

۲۔ ترکِ نفس پروری کا ایک فعل خود رائی کے ایک لاکھ کاموں سے افضل ہے۔

نیک آدمی کی مندرجۂ ذیل تصویر کیسی من موہنی اور مقبول صورت ہے :-

وہ کج راہ پر کبھی نہ چلے گا۔ وہ کبھی اپنے نفس کو دھوکے میں نہ ڈالے گا۔ وہ نیکی کا ذخیرہ فراہم کریگا اور نیک کام جمع کریگا۔ وہ تمام مخلوقات کے ساتھ رحم سے پیش آئیگا وہ اپنے چھوٹے بھائیوں پر شفقت کرے گا اور بڑوں کی اطاعت فرزندانہ کریگا۔ وہ یتیموں پر رحم کھائے گا اور بیواؤں کی غمگساری کرے گا۔ وہ اپنی اصلاح کریگا اور اس طرح دوسروں کی اصلاح کریگا۔ کیڑوں، گھاس اور درختوں اور کسی چیز کو اُسکے ہاتھ سے آزار نہ پہنچے گا۔ اُسے دوسروں کی بدخصلتوں پر نظرِ افسوس و ترحم ڈالنا چاہیے۔ لوگوں کی نیک عادتوں سے اُسے خوش ہونا چاہیے۔ ان کی مصائب و آلام میں دستگیری کرنا چاہیے۔ اُنھیں خطرہ سے نجات دلانا چاہیے۔ انکے منافع کو اپنا نفع سمجھنا چاہیے، اور انکے نقصان کو اپنا نقصان۔ انکے معائب کو شائع نہ کرنا چاہیے اور نہ اپنی خوبیاں اُچھالنا چاہییں۔ بدی کا خاتمہ کر دینا چاہیے اور نیکی کا اظہار کرنا چاہیے۔ دوسروں کو اپنی ذات سے نفع کثیر پہنچانا چاہیے، اور اپنی ذات کے لیے تھوڑے پر قناعت کرنا چاہیے تحقیر و توہین کو بلا خیال انتقام قبول کرنا چاہیے اور عزت کو بلا اندیشہ خوف۔ بھلائی کرنا چاہیے بلا امید معاوضہ۔ اور دوسروں کو دینا چاہیے بلا شائبۂ تاسف۔ یہ ہے وہ جسے "مرد صالح" کہتے ہیں۔ (تقانی تسنگ، یعنی رسالۂ اعمال و مکافات)

دنیا کی کسی دوسری مذہبی کتاب میں اتنی جگہ میں شاید اس سے بڑھ کر اخلاقی تعلیم نہ پائی جائے گی۔

مسیح کا قول ہے کہ "بدی کے بدلے نیکی کرو" اسی تعلیم کو مسیح سے چھ سو سال پہلے لاؤزی نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے :-

جو میرے ساتھ نیکی کرتا ہے میں اُسکے ساتھ نیکی کرتا ہوں، اور جو میرے ساتھ نیکی نہیں کرتا، اُسکے ساتھ بھی میں نیکی کرتا ہوں (تاؤتے کنگ)

نصائح کے یہ گوہرِ آبدار بھی لاؤزی کے بحرِ دماغ کے آغوش پروردہ ہیں :-

۱۔ دوسروں کو جاننا عقلمندی ہے، لیکن جو اپنے آپ کو جان لے وہ روشن دماغ ہے۔ جو دوسروں پر ظفریاب ہوتا ہے وہ قوی ہے، لیکن جو اپنے اوپر فتح پائے وہ بہادروں کا بہادر ہے۔ جس کے پہلو میں قانع دل ہے وہ متمول ہے۔ جو مستعدی سے کام کرتا ہے فائز المرام ہوتا ہے۔ جو اپنی فطرت کے خلاف نہیں کرتا وہ بہت عرصہ تک زندہ رہتا ہے، لیکن جو مر جاتا ہے اور زندہ رہتا ہے وہ ابدی خوشیوں سے محظوظ ہوتا ہے۔ (ایضاً باب ۳۳)

---

[۵] ملاحظہ ہو ڈگلس صاحب کی کتاب کنفیوشینزم اور تاؤازم صفحہ ۱۹۲

۲۔ جو شخص جلدی سے وعدہ کر بیٹھتا ہے وہ اُسے پورا کرنے میں بہت کم کامیاب ہوتا ہے۔ جو شخص آسان چیزوں کا متلاشی ہے اُسے تمام چیزیں مشکل معلوم ہونگی (ایضاً ب ۶۳)

۳۔ انتظام بے انتظامی سے پہلے ہونا چاہیے، اور تیاری ضرورت کی رونمائی سے پیشتر (ایضاً ب ۶۴)

یہ اخلاقی تعلیمات "مجلد الطہارت" سے جو تاؤ مذہب کی کتب مقدسہ میں سے ہے، مقتبس ہیں:۔

انسانی روح کا میل جانبِ طہارت ہے، لیکن اُسکا دل اُس میں خلل انداز ہوتا ہے انسان کا باطن خموشی پسند ہے، لیکن خواہشات مخل ہوتی ہیں۔ اگر انسان اپنے دل سے خواہشیں نکال کر پھینکدے تو اُسکے قلب کو خودبخود سکون حاصل ہو جائے۔ دل صاف ہونا چاہیے پھر روح خود منزّہ ہو جائے گی۔ (کھنگ کائیم کنگ ب ۳)

لاؤتزی جن متقدمین کی فطری سادگی کی طرف لوگوں کو دعوت دیتا تھا وہ عہدِ قدیم کے پاکباز لوگ زندگی کی محبت اور موت کی نفرت سے ناآشنا تھے۔ نہ اس دنیا میں آنا اُنکی مسرت کا باعث ہوتا تھا اور نہ یہاں سے چلا جانا اُنکے دل کو مشوش کرتا تھا۔ مطمئن روح کے ساتھ وہ یہاں آتے تھے اور یہاں سے جاتے ہیں (مقالات کوانگ تزی ب ۴)

ایسے لوگ کہاں جاتے تھے؟ تاؤ میں جو غیر محدود ہے۔ یعنی محدود غیر محدود میں واصل ہوتا ہے، اور فنا کے بعد بقا میں شامل ہوتا ہے۔ یہ تعلیم بدھ مذہب کے مسئلہ نروان سے مشابہ ہے۔

تاؤ کیا ہے ؟:۔

تاؤ خلا ہے۔ فعل و عمل میں اتھک ہے۔ عمق میں وہ تمام اشیا کے مستقبل پر حاوی ہے۔ وہ نوک و زاویوں کو ہموار کرتا ہے۔ وہ بدنظمی کو دُور کرتا ہے۔ وہ چکاچوند کو دل پسند کرتا ہے۔

تاؤ کی صفات کا خلاصہ یہ ہے:۔

مثل پیار کرنے والے باپ کے وہ تمام مخلوقات پر نظرِ شفقت رکھتا ہے۔ تمام مخلوقات اُسکے دروازہ سے عالمِ حیات میں آئی، اور ہستی کے تمام و کمال تغیرات و تبدلات میں وہ مدام اُنکے راست و چپ رہتا ہے۔ اور محبت سے نشو و نما دیتا ہے سب کو زندگی عطا فرماتا ہے اور کسی چیز کے دینے سے انکار نہیں کرتا۔ گو سب کے سامنے، سب کے اوپر، اور سب کے اندر ہے، وہ دخل نہیں دیتا۔ گو تمام اشیا اُسکے تابع ہیں وہ اپنے آپ کو اُنکا آقا نہیں سمجھتا۔ وہ انسان کے ساتھ سعی نہیں کرتا۔ وہ ہر فرد واحد کی زندگی کے اندر رہتا ہے۔ اُسکا نفوذ ایسی اشیا میں ہے جنکے اندر کوئی داخل نہیں ہو سکتا۔ وہ پیدا کرتا ہے، نشو و نما دیتا ہے، بڑھاتا ہے، کھلاتا ہے، پورا کرتا ہے، پکاتا ہے، قوت بخشتا ہے، اور تمام چیزوں کو ڈھکتا ہے۔ وہ نیک آدمی کی شوکت اور بد آدمی کی اُمید ہے۔ وہ اُن لوگوں کو جو دوسروں کی حاجت روائی کرتے ہیں، دُگنا دیتا ہے۔ وہ سب کچھ ہے اور کچھ بھی نہیں۔ وہ ممکن سے ممکن چھوٹی مقدار ہے اور پھر بھی کُل ہے۔ وہ عالم کی وحدت ہے اور لہذا مدد کرتا ہے، قوت بخشتا ہے اور تمام کائنات کو نشو و نما دیتا ہے۔

مذہب تاؤ کی کتب مقدسہ میں دو چھوٹی سی کتابیں ہیں جن میں سے ایک کا نام کن ینگ پین یعنی کتابِ جزا و سزا ہے۔ ذیل کے گُہر ہائے آبدار اُسی سے ہاتھ لگے ہیں:۔

(۱) جانوروں کے ساتھ رحم سے پیش آؤ (۲) راست بازی اور اطاعتِ والدین کی عادت ڈالو۔ اپنے چھوٹے بھائیوں سے محبت اور بڑے بھائیوں کا ادب کرو۔ (۳) اپنا تزکیہ باطن کر اور دوسروں کو نیک بنا (۴) بیواؤں اور یتیموں پر رحم کھا۔ (۵) دوسروں کی واژگونی بخت کو دیکھ کر ستالم ہو (۶) دوسروں کی خوش حالی سے مسرور ہو (۷) ضروتخواہوں کی مدد کر (۸) مبتلائے آلام کو مصائب سے نجات دلا۔ (۹) دوسروں کے عیوب فاش نہ کر (۱۰) اپنی فضیلت کا اظہار نہ کر (۱۱) بدی کو روک اور نیکی کو ترقی دے (۱۲) بہت ترک کر اور کم لے (۱۳) نیکی کر اور معاوضہ کی توقع نہ رکھ۔ (۱۴) نیکی کو بدی یا بدی کو نیکی مت سمجھ (۱۵) خطا کو جرم خیال نہ کر (۱۶) جب اپنی کوئی خطا تمھیں معلوم ہو جائے تو اُسکی اصلاح کر دو (۱۷) جس بات کو حق جانتے ہو اُسے ضرور کرو (۱۸) اپنا نفع دوسروں کو نقصان دیکر حاصل مت کر (۱۹) دوسروں کا دماغ مت چاٹو (۲۰) دوسروں کے محاسن پر پردہ نہ ڈالو (۲۱) عیش و طرب کے بندے نہ ہو

(۲۲) کبھی ایسی بات نہ کہو جو تمھارے دلی منشا کے خلاف ہو۔

دوسری کتاب کا نام "بن چہ وان" یعنے کتاب راز نعمات ہے۔ یہ بقدر چھوٹی کتاب ہے کہ کُل الفاظ کی تعداد صرف ۱۴۱۵ ہے۔ لیکن پند و حکمت کے جواہر سے یہ بھی مالا مال ہے۔ مندرجۂ بالا نصائح کے اعادہ کے علاوہ چند پند سود مند اس میں ایسی ہیں جنھیں بغیر لکھے ہم نہیں رہ سکتے :۔

صحیح اوزان اور پیمانے استعمال کرو اور لوگوں سے زیادہ دام نہ لو۔ بیماروں کی تیمارداری کرو اور پیاسے کو پانی پلاؤ۔ اپنے ہمسایہ کی بُرائیوں کو پوشیدہ رکھو اپنے تمام افعال میں خدا کے قوانین کی پابندی کرو اور تمام اقوال میں صاف باطنی کا اظہار کرو۔ تمام سلف صالحین کو اپنے پیش نظر رکھ کر اپنے ضمیر کا محاسبہ کرو۔ وہ کون سی نعمات ہیں جو ایسے شخص کو میسّر نہیں ہوسکتیں جو خفیہ طور پہ کارہائے خیر کرتا ہے ؟

سیّد حسن برنی (علیگ)

کنیز

(۱)

اس کے سوا کہ ہم دونوں بد قسمت بھائی بہن اپنے چچا کے گھر میں پیدا ہوئے تھے، ہمیں اپنی بابت کچھ علم نہیں۔ چچا کو بھی ہماری پرورش کا بار زیادہ دنوں نہیں اُٹھانا پڑا۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ہماری بدولت اُنکی مالی حالت درست ہوگئی۔ ہم دونوں بھائی بہن چھ سات ہی برس کے تھے کہ ہمارے چچا نے میرے بھائی علی کو درویشوں کے ہاتھ فروخت کرڈالا۔ کچھ دن بعد مجھے بھی بازار میں بیچ کر ٹکے سیدھے کرلیے۔ اسکے بعد میں نہیں جانتی کہ میرے بھائی کا کیا حشر ہوا۔ میں اپنے نئے مالکوں کے ساتھ قسطنطنیہ چلی آئی۔ میرا آقا ایک معمر شخص تھا۔ کئی برس اُسکے یہاں رہتے رہتے گزر گئے۔ اس اثنا میں وہاں سیکڑوں لونڈیاں آئیں اور چلی گئیں۔ ابتدا میں تو میں اس کا مطلب کچھ نہ سمجھ سکی، مگر رفتہ رفتہ سب معلوم ہوگیا، جوں جوں میری عمر بڑھتی گئی، میرے خریدار آآکر میرے آقا کو تنگ کرنے لگے۔

اب میری عمر زیادہ ہوگئی تھی۔ جب میں ندی کے کنارے باغیچہ میں بیٹھ کر دیکھتی کہ کتنے ہی مسافر کشتیوں پر سوار گاتے بجاتے چلے جارہے ہیں، تو میں اُنکی حالت سے اپنی حالت کا مقابلہ کرکے سخت بے چین ہوا کرتی۔ ایسا معلوم ہوتا کہ گویا میرے چاروں طرف ایک دیوار کھنچی ہوئی ہے، اور آسمان نے ایک سرپوش سے مجھے ڈھانپ رکھا ہے۔ اُف! وہی روزانہ کاروبار، وہی محنت و مشقت، وہی رُوکھی سوکھی روٹی، اور وہی غلامی! جب میں یہ یاد کرتی کہ میں صرف لونڈی ہوں، تو غم کے مارے میری چھاتی پھٹنے لگتی۔ آخر اس ارادہ پر مضبوط ہوکر کہ خواہ چھاتی پھٹے یا رہے ہنسی خوشی تو رہنا ہی ہوگا کہ قسمت میں یہی کچھ لکھا ہے مطمئن ہوجاتی۔ مگر اُس وقت مجھے مطلق اطمینان حاصل نہیں ہوتا تھا جب میں یہ خیال کرتی تھی کہ ایک نہ ایک دن میرے خریدار بازار میں سبزی ترکاری کی طرح میری بھی دیکھ بھال کریں گے۔

اسوقت میری عمر چودہ برس کی تھی۔ اب دنیا مجھے کچھ اور ہی نظر آنے لگی تھی۔ بھولے ہوئے خواب کی طرح وہ سب باتیں اب یاد آتی ہیں۔ ایکدن میرے آقا نے مجھ سے کہا "نورالنہار! غور سے سنو۔ یہ صاحب جو میرے ساتھ ہیں، آج سے یہی تمھارے مالک ہیں۔ اِنکو خوش رکھنا تمھارا فرض ہوگا۔ یہ بہت اچھے آدمی ہیں۔ میں تمھارا خیرخواہ ہوں، تمھاری بھلائی کے خیال سے میں یہ کہہ رہا ہوں۔ تم جانتی ہو کہ یہ کوئی نئی بات نہیں۔ تم لوگوں ہی کے آرام کے لیے ہم لوگ پیدا ہوے ہیں۔ ہمارا کچھ نہیں، جو کچھ فائدہ ہے تم لوگوں ہی کا ہے"۔

(۲)

میرے اُس عمر آقا نے غلط نہیں کہا تھا۔ میرا یہ نیا آقا، عادل، بہت اچھا آدمی تھا۔ خدا کی اس مہربانی کے لیے میرا دل شکریہ سے پُر تھا۔ میرے ساتھ کی لونڈیاں غریب آدمیوں کے گھر میں پڑی تھیں۔ وہ دن بھر کام کاج کرتیں اور تکلیف جھیلتی تھیں، مگر مجھے عادل کے زیر سایہ ہر طرح کی عزت و حکومت حاصل تھی۔ لیکن ایک تکلیف تھی! عادل کے بھائی، مُراد، کا مزاج بہت کڑا تھا۔ وہ جا و بیجا مجھپر سختی کیا کرتے۔ کوئی دن خالی نہ جاتا کہ میں اُنکے تیر ملامت کا نشانہ نہ بنتی۔ کبھی کبھی اس صدمہ سے میرے آنسو بھی جاری ہو جاتے، مگر مُراد کی زبان سے کبھی کوئی میٹھی بات سننے میں نہ آتی۔ اسکے لیے میں ہمیشہ ترستی رہی۔ لیکن میں نے کبھی اپنے غم و غصہ کا اظہار نہیں کیا بلکہ مُراد کی ان بیجا سختیوں کے لیے ہمیشہ دل سے اُنھیں معاف کر دیتی۔

ایک روز کا ذکر ہے کہ شام کے وقت میں برآمدہ میں کھڑی ہوئی گنگنا رہی تھی اُسوقت آفتاب غروب ہو رہا تھا۔ مجھے اپنے پس پشت کسی کی آہٹ معلوم ہوئی میں ایکدم کانپ اُٹھی، مگر فوراً ہی سمجھ گئی کہ مُراد کے سوا اور کون ہوگا۔ مگر یہ خیال کر کے کہ کہیں مُراد نے میری گنگناہٹ نہ سن لی ہو، میرے ہوش حواس جاتے رہے۔

مُراد نے جلدی سے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ "نورالنہار!" ہاتھ پکڑنا تھا کہ میرے رہے سہے ہوش بھی جاتے رہے۔ میں نے اُنکی طرف دیکھا ہی تھا کہ میرا سر خود بخود جھک گیا۔

مُراد نے کہا "نورالنہار! تم یہاں کھڑی ہوئی کیا کرتی ہو؟"

میں۔ "آج وطن کا خیال آگیا تھا۔ وہاں شام کے وقت باغیچہ میں بیٹھا کرتی تھی، اور یہی منظر وہاں بھی دیکھتی تھی کہ کس طرح آفتاب اپنے تمام دن کا سفر ختم کر کے تھکا ماندہ درختوں کی آڑ میں چھپتا ہے۔" یہ کہتے کہتے میری آواز کانپنے لگی۔

مُراد۔ "میری طرف دیکھو، نورالنہار! ہیں، یہ کیا؟ تم روتی کیوں ہو؟"

میں۔ "نہیں، روتی تو نہیں ہوں۔"

مُراد۔ "نہیں کیسی؟ تمھاری آواز ہی صاف بتا رہی ہے۔"

میں "آج میری طبیعت اچھی نہیں ہے۔"

مُراد۔ "خیر۔ تمھیں معلوم ہے نورالنہار! کہ میری شادی ہوگی؟"

مُراد کے مُنھ سے یہ لفظ سننا تھا کہ یہ معلوم ہوا گویا کسی نے کھینچ کر تیر مارا ہے۔ میں نے بہت سوچا، مگر اس سوال کا جواب نہ دے سکی۔ مُراد نے پھر کہا

"نورالنہار! شاید تم میری سخت مزاجی کے باعث یہ سمجھتی ہوگی کہ جو عورت میری بیوی ہوگی، وہ میرے ساتھ خوش نہیں رہے گی۔"

میں نے حوصلہ کر کے جواب دیا "نہیں۔ نہیں۔ ہرگز نہیں۔ وہ کیوں نہیں خوش رہے گی۔ یقیناً تم اُس سے محبت کروگے۔ اگر کبھی کبھی مجھپر خفا ہوتے ہو تو اسکا یہ مطلب نہیں ہے کہ اُسپر بھی خفا ہوگے۔"

مُراد نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا اور میرا سر اپنے سینہ کی طرف کھینچ کر کہا "تم سمجھتی ہو کہ میں تم پر صرف غصّہ ہوتا ہوں، اور تم سے الفت نہیں کرتا۔ اچھا، سُنو۔ میں تمھیں پیار کرتا ہوں، اور دل سے پیار کرتا ہوں۔ جتنا کوئی شخص کسی کو پیار کر سکتا ہے، اُتنا ہی میں تمھیں پیار کرتا ہوں۔ اور سنو، میں تمھیں اتنا پیار کرتا ہوں کہ اگر مجھے یہ معلوم ہو جائے کہ تم میری نہیں بلکہ کسی اور کی ہوگی تو میں اپنی جان پر کھیل جانے کو تیار رہوں۔"

مجھے سخت حیرت ہوئی۔ آج پہلی مرتبہ مجھے یہ معلوم ہوا کہ یہ دُنیا اسقدر خوشنما اور مسرت بخش ہے۔ میں نے کہا "مُراد! پھر کیا وجہ ہے کہ تم مجھپر اسقدر غُصّہ ظاہر کیا کرتے ہو؟"

مُراد۔ "نورالنہار! تم یہ معلوم کرنا چاہتی ہو کہ میں غصّہ کیوں ظاہر کرتا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ میری سخت کلامی سے تمھاری آنکھوں میں آنسو بھر آتے ہیں۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ تم دل میں بے چین ہوتی ہو۔ مگر تم یہ نہیں جانتیں کہ تم پر سختی کر کے میں خود بھی بے چین ہوتا ہوں۔ یہ تمھارے آنسوؤں ہی کی طاقت ہے کہ مجھ ایسے وحشی کو اپنے قابو میں کر لیا ہے۔ یہ انھیں آنسوؤں کا صدقہ ہے کہ آج تم اس گھر کی لونڈی نہیں بلکہ نورالنہار خانم اس گھر کی ملکہ اور میری پیاری ہو!"

اتنا کہہ کر مراد نے مجھے سینے سے لگالیا اور میری زلفوں کا بوسہ لیا۔ خوشی کے مارے میری آنکھیں بند ہوگئیں۔ مراد چلے گئے، مگر میں وہیں برآمدہ میں کھڑی ہوئی سوچتی رہی کہ "یہ کیسا خواب ہے"

اسوقت چاندنی پھیل چکی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا کسی نے شام کی تاریکی کو روپہلے پانی سے دھو ڈالا ہے۔

(۳)

جنم کی لونڈی کو آج دوسرے ہی لوگ نہیں بلکہ ساتھ والی لونڈیاں اور مراد کے بڑے بھائی عادل بھی نورالنہار خانم کے نام سے پکارتے ہیں۔ میں اپنی عادت جلد ترک نہ کرسکی۔ اب بھی کبھی کبھی عادل کے قدموں میں بیٹھ جاتی؛ لونڈیوں کی موجودگی میں بھی کبھی کبھی گھر کے کام کاج میں لگ جاتی۔ ایسی حالت میں عادل نہایت محبت سے مجھے محل میں بیٹھنے کو کہتے۔ یہ ہے محبت اور درگزر کا نتیجہ! رہی مراد کی محبت، سو وہ ایسی تھی کہ قدرتی سینریاں بھی ایسی دلکش نہ تھیں۔

لونڈیاں مجھے پنکھا جھلتیں، میرے جوتے صاف کرتیں، اور ہر طرح ادب و تعظیم سے پیش آتیں۔ ایک وہ دن تھا کہ میں بھی انکے ہمراہ اپنے آقا کے آرام کے لیے خدمت میں مشغول رہتی تھی۔ لیکن آج وہ میرے آرام کے لیے کوشش کرتی ہیں۔ میں نے انکی خدمات یا دُکھ سُکھ کا خیال نہیں کیا، اور خیال کرتی بھی تو کیونکر؟ مجھے مراد کی محبت مل چکی تھی، اور میں اسی محبت میں دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو رہی تھی۔

ہمارا نکاح ہو جانے کے بعد عادل مجھے اور اپنے چھوٹے بھائی مراد کو اپنا سب مال و متاع سونپ کر بغرض سیاحت کہیں چلے گئے۔ اُسوقت سے آج تک اُنکا پتہ نہیں چلا۔

(۴)

مراد کی الفت دن بدن بڑھتی گئی۔ میرے آرام و آسایش کا اُنھیں اسقدر خیال رہتا تھا کہ مجھے کسی قسم کی تکلیف نہ تھی۔ اسکے بعد ہمیں ایسی خوشی حاصل ہوئی جو حدِ بیان سے باہر ہے۔ اسکے بعد ہمارا جامِ مسرت چھلکنے لگا۔ خدا نے ہمیں فرزند نرینہ عنایت فرمایا، جس سے ہم اس قدر خوش ہوئے کہ امید بندھ گئی کہ اب مصیبتوں کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ مگر افسوس! ما در چہ خیالیم و فلک در چہ خیال۔ یہ امید موہوم تھی۔ کیونکہ اس اثنا میں ایک ایسا واقعہ گزرا جس کو ہماری مصیبتوں کا شروع کہنا چاہیے۔ یہ واقعہ کیا تھا؟ میری لونڈیوں کے رشک و عداوت کا نتیجہ!

میں ایک روز دریچہ کے پاس کھڑی تھی کہ مجھے کسی کے بات چیت کرنے کی آواز معلوم ہوئی۔ میں نے کان لگا کر سُنا تو معلوم ہوا کہ میرا ہی ذکر خیر ہو رہا ہے ——— "وہ بھی تو ہم لوگوں کی طرح غلام ہی ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ ہم اُس کی خدمت کریں، اور وہ ملکہ بنی بیٹھی رہے۔ کیا صرف اس لیے کہ ذرا صورت شکل کی اچھی ہے؟ نہیں، اب یہ ہم سے ہرگز نہیں سہا جائے گا ....." گفتگو اسی قسم کی تھی۔ مگر لونڈیوں کے جلاپے سے میرا کیا نقصان ہو سکتا تھا؟ علاوہ ازیں میرے پاس اتنا وقت ہی کہاں تھا کہ ان باتوں کا خیال کرتی۔ مراد، اور میرا پیارا اچھوتا سا بچہ، دنیا میں یہ دو چیزیں ایسی تھیں کہ مجھے انھیں کے خیال سے رہائی نہیں ہوتی تھی۔

ایک دن مراد کے کسی دوست نے انکی دعوت کی تھی، وہ شام کو اُدھر روانہ ہوئے اور میں بچہ کو اپنی چھاتی سے لگا کر پڑ رہی۔ لونڈیوں کے رشک و عداوت کا مجھے خیال نہ تھا۔

رات کے تقریباً گیارہ بجے ہوں گے۔ چاروں طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ کیا دیکھتی ہوں کہ ایک لونڈی میرے کمرے میں آئی۔ استقلال اور مضبوطی ارادہ کے نشان اُسکے چہرہ پر نمایاں تھے۔ لیکن کیوں؟ اتنا سوچنے کا موقع نہیں ملا۔ اُس نے کہا "گھر میں آگ لگی ہے!" اور فوراً کھِل کھِلا کر ہنس پڑی۔ اُف! کیسی بے موقع ہنسی! میں ابھی کچھ بولنے نہیں پائی تھی کہ وہ نظروں سے غائب ہوگئی۔ اور چلتے وقت باہر سے زنجیر لگا گئی۔

"گھر میں آگ لگی ہے!" اسکا کیا مطلب ہے؟ موت، اور اٹل موت! اپنی

مجھے چنداں فکر نہ تھی۔ اگر فکر تھی تو صرف اپنے پیارے بچہ کی، ہاں، وہی بچہ جس کو میں اپنی زندگی کا سہارا سمجھتی تھی۔ وہ بستر پر لیٹا ہوا خوشی میں اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھ پاؤں مار مار کر ہنس رہا تھا۔ اسوقت ہنسی! ا نادان بچہ!! نہیں جانتا کہ اسوقت وہ کس مصیبت میں پھنسا ہوا ہے۔ اُسکو معلوم ہی نہیں کہ آج اُسکی بے یار و مددگار ماں بھی اُسے اس مصیبت سے نہیں بچا سکے گی۔

کھڑکی کھول کر دیکھا تو گھر کے چاروں طرف آگ ہی آگ نظر آئی۔ خونخوار شعلے ہوا میں لہرا رہے تھے۔ "آج میری زندگی انھیں شعلوں کی نذر ہوگی!" میں نے بستر، چادر، اور مسہری میں بچہ کو خوب اچھی طرح لپیٹا، اور چھاتی سے باندھ کر برآمدہ میں آکر دیکھنے لگی۔ شعلے اوپر کو اُٹھ رہے تھے۔ اُف! جدھر دیکھتی تھی موت کے سوا کچھ اور نظر نہ آتا تھا۔

میں اُسوقت حواس باختہ تھی۔ میں نہیں سمجھ سکتی تھی کہ میں کیا کر رہی ہوں۔ کوئی غیر محسوس طاقت مجھے اُبھار رہی تھی۔ بچہ کا خیال آتے ہی میں برآمدہ سے نیچے کود پڑی۔

(۵)

ہوش آیا۔ آنکھیں کھول کر دیکھا کہ جنگل میں ایک درخت کے نیچے پڑی ہوں۔ یہ کیا؟ کیا ابھی تک آگ فرو نہیں ہوئی؟ نہیں، آگ تو بجھ گئی، اب کچھ اور ہی سمجھنا چاہیے۔ ہیں! یہ نئی زندگی ہے کہ مصیبتوں کا شروع؟ سرہانے کون بیٹھا ہے؟ قمراو۔ ان کی شکل اُداس کیوں ہے؟ "بتاؤ! میرا بچہ، میری زندگی کا سہارا کہاں ہے؟"

قمراو نے کہا "نورالنہار!" اس سے زیادہ کچھ اور نہ کہہ سکے، آواز بیٹھ گئی۔ شدت غم کے باعث چہرہ اور آنکھوں پر چھائیاں پڑ گئی تھیں۔ میں نے دوبارہ دریافت کیا "میرا بچہ کہاں ہے؟"

"وہ دیکھو، درخت کی آڑ میں سو رہا ہے۔ فکر و اندیشہ کی کوئی بات نہیں۔ آگ سے اُسے مطلق ضرر نہیں پہنچا۔ مگر نورالنہار! ہمارا سب مال و متاع جل کر خاک سیاہ ہوگیا۔" اتنا کہہ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ میں نے کہا "یہ کیا؟ روتے کیوں ہو؟ بچہ بچ گیا، یہی کیا کم ہے۔ تم لوگوں کی موجودگی میں مجھے کسی قسم کا رنج و غم نہیں۔ خدا کا شکر کرو۔"

قمراو۔ "ہاں، یہ بات تو ٹھیک ہے۔ نورالنہار! میرا مال و متاع تمھیں ہو! میں اسکو بہت غنیمت سمجھتا ہوں کہ اس آفت میں تمھیں نہیں کھو بیٹھا۔"

آج ہم لوگ مفلس ہیں۔ سب کچھ آگ کی نذر ہوگیا۔ غلاموں اور لونڈیوں نے اپنی اپنی راہ لی۔ قمراو، میں، اور بچہ، بس صرف ہم تین موجود تھے۔ آہ! اگر اُسوقت لونڈیوں کی باتوں سے درگزر نہ کرتی، اگر اُنکی باتوں کو کم نظری سے نہ دیکھتی، تو آج یہ دن دیکھنا کیوں نصیب ہوتا۔ انھوں نے ہی تو آتش رشک سے جل بھن کر گھر میں آگ لگا دی تھی۔

ہم لوگ اب ایک جھونپڑی میں رہتے ہیں۔ قمراو نے ایک ادنیٰ سی ملازمت اُٹھائی ہے جسکی آمدنی سے ہم لوگوں کا گزارہ ہوتا ہے۔ کام کاج کرنے کیلئے کوئی نہیں، گھر کا سب کام میں خود کرتی ہوں۔ قمراو جب کام پر چلے جاتے ہیں تو میں بچہ کی پیاری صورت دیکھ دیکھ کر دن گزارتی ہوں۔ شام ہوتے ہی گھر کا کام کاج ختم کر کے بچہ کو گود میں لے بیٹھتی اور اپنے قمراو کی راہ دیکھا کرتی ہوں۔ جب وہ آتے ہیں تو اُن کو کھلا پلا کر اُنکے پاؤں دابتی ہوں اور جب وہ سو جاتے ہیں تو میں بھی سو رہتی ہوں۔ یہی میرا روزمرہ کا شغل ہے۔ ایک روز سب کام کاج کر کے میں مراد کے پاؤں داب رہی تھی، کہ اُنھوں نے نہایت محبت آمیز لہجہ میں کہا "نورالنہار! تمھیں بہت تکلیف ہوتی ہے۔ مجھے یہی فکر رہتی ہے کہ کہیں اس محنت سے تمھاری صحت نہ خراب ہو جائے۔"

میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ غور کرنے لگی کہ مجھے کون سی تکلیف ہے۔ آخر یہ بھی تو کام کرنے کے عادی نہیں۔ میں نے فوراً اپنا سر اُن کے قدموں پر رکھدیا اور بولی "میری محنت؟ پیارے! اسکے لیے کچھ غم نہ کرو، میں تو تمھاری کنیز ہوں۔"

پلٹ

اُردو رسالوں پر سرسری نظر

سنا ہے کہ ایک مرتبہ زبان اور دانتوں میں بے طور چشمک ٹھنی۔ دانتوں نے زبان سے کہا "پانی میں رہنا ہے تو مگر مچھ سے بیر خوب نہیں۔ ہم بتیس ہیں اور تو ایک۔ پیس ہی نہ ڈالیں تو کہنا"۔ زبان بھی کب دبنے والی تھی۔ اس نے جواب دیا "بیشک! تم ہو تو زیادہ۔ مگر یاد رکھنا کہ مجھ سے عداوت مول لی تو تمہاری بھی خیر نہیں۔ جب تک میں اچھی رہی تو تم بھی سلامت ہو۔ میں بگڑی تو خیال کرو تم کہاں ہو گے"۔ یہی حال اس زمانہ کے رسالوں اور اخباروں کا ہے۔ ان کی زبان درست نہیں تو صوری اور معنوی ساری خوبیاں خاک ہیں۔ یہ رسالے جس آب و تاب و پابندی وقت سے شائع ہوئے کیا کسی کو انکار ہے؟ کاغذ، لکھائی، چھپائی، ضخامت، تصاویر، مضامین وغیرہ، کے اعتبار سے یہ اپنی آپ نظیر تھے۔ اعلیٰ مضامین نہایت شرح و بسط کے ساتھ لکھے گئے، جس سے قابل مضمون نگاروں کی کوشش اور جگر کاوی کا پتہ چلتا ہے۔ خاص و عام نے بھی ان کی خوب حوصلہ افزائی کی۔ ہزاروں نے شوق کے ہاتھوں میں ان کو لیا، اور قدر کی نگاہ سے دیکھا۔ یہ سب کچھ سہی۔ لیکن ان کی زبان کے متعلق ہمارا خیال کچھ زیادہ اچھا نہیں۔ جس پرچہ کو دیکھا (بجز ایک یا دو کے) اُردو کے دامن پر بدنما داغ ہی نظر آئے۔ اُردو رسالوں کا پہلا مقصد تو یہی ہے کہ اُردو کو مکمل اور اعلیٰ زبان کے رتبہ کو پہنچائیں۔ لیکن اس مقصد کے پورا کرنے میں یہ ناکام اور پیچھے ہی رہے۔ جن میں ایسے فقرے دیکھنے میں آئیں "جب پھول کھلتا ہے اور خوشبو ہوا میں چھوڑتا ہے"، ان کی زبان کو بھلا ہم کس طرح کہیں کہ صحیح و شستہ ہے۔

خاص اہلِ دہلی و لکھنؤ پر تو ان کا اتنا اثر نہیں پڑتا جتنا کہ ان لوگوں پر جو اہلِ زبان نہیں اور یہی گروہ بڑا بھی ہے۔ نامی گرامی رسالوں میں جب غلطیاں جگہ پائیں تو ایک اجنبی شخص کا مغالطہ میں پڑ جانا قرین قیاس ہے۔ ان کی وجہ سے سیکڑوں اور ہزاروں کی زبان بگڑ جائے بلکہ خود اُردو کی صورت مسخ ہو جائے تو تعجب نہیں نتیجہ ظاہر ہے۔ اُردو پر احسان کرنا تو کیا، اُلٹے اس کے حق میں کانٹے بو دیئے۔ کاش زبان کی خاطر سے اس قسم کے مضامین رد کر دئے جائیں۔ یا کم از کم حاشیہ پر ان غلطیوں کی تصحیح کی جایا کرے تو اُردو مرہونِ منت رہے گی اور کسی کو شکوے کا موقع نہ ملے گا۔

اس خوف سے کہ کوئی اس کو گستاخی اور کفرانِ نعمت نہ کہہ بیٹھے ہم اپنی اس تحریر کا ثبوت پیش کرنے پر مجبور ہیں۔ ہمیں یہ گوارا نہیں کہ مضامین کی سُرخی اور مضمون نگاروں کے نام کو ظاہر کر کے دلشکنی کریں۔

میر مونس کا مصرع ہے "بوتلیں سُرخ ہیں ساقی ترے میخانہ کی" اس میں "بوتلیں" گو انگریزی لفظ ہے مگر کس قدر پیارا معلوم ہوتا ہے۔ اسی طرح ٹکٹ، ریل، گلاس وغیرہ الفاظ ہیں کہ بالکل اُردو کے ہو گئے ہیں۔ ان کے استعمال سے کوئی مانع نہیں لیکن یہ ملاحظہ فرمائیے۔

"ایک جج یا ایک افسر کے جانے پر دوسرا جج یا دوسرا افسر باضابطہ چارج لیتا ہے اور اس کا گزٹ بھی ہوتا ہے"۔ اس کو ہم نہ اُردو کہہ سکتے ہیں نہ انگریزی۔

"اب پھر جا بجا زرعی کالج اور اسکول قائم کر کے لوگوں کو اس لاین کی طرف متوجہ کر رہی ہے"۔ لاین کا لفظ لکھنا مقصود ہو تو اور بات ہے ورنہ ضرورت نہ تھی۔ زرعی کالج!

"ایک مخصوص نظام یہاں کے بیرونی ارگنایزیشن پر سبقت رکھتا ہے"۔ محض اُردو داں حضرات اس کے سمجھنے سے قاصر ہیں۔

"اس لئے اسکولی تعلیم کے بعد" اسکول کو "ی" لگا کر خوب اجراء کار کیا ہے۔

"آپ کے رسالے کے خریدار اور پرانے ہمدرد فرنٹ ہو گئے"۔ فرنٹ ہونا ملاحظہ ہو۔

"وہ ایک آزاد خیال تھنکر تھے"۔ کیا کہنا!

"یہ کتاب درحقیقت برہمو سماج کے ڈیفنس میں لکھی گئی ہے۔" بہت بہتر!

"وہ ان عہدوں سے ریٹائر ہو جائیں۔" ضرور!

"کیونکہ اس میں اعلیٰ اسپیکر اور بہت بڑے تھنکر کے خیالات اور تجربات نہایت پسند آمیز اور دلچسپ طریقہ سے بیان کئے گئے ہیں۔" سپیکر اور تھنکر! ماشاءاللہ!! اور پسند آمیز طریقہ کی بھی ایک ہی کہی۔

"اس کی ترکیب میں دو گیسی اجزا اکسیجن و ہائیڈروجن شامل ہیں۔" گیسی اجزا! خوب! جہاں چاہا "ی" لگا دی۔

"فلسفی حقائق کو اعلیٰ ترین سائینسی سچائیوں سے وہی نسبت ہے۔" سائینسی سچائیوں! دوسرا گل کھلا۔

"جن کے باپ دادا تیری خاک چومتے تھے۔"

"پھر عمدہ ساعت کے آنے پر برہمنوں کے۔" نیک ساعت محاورہ ہے۔

"ہاتھی دانت کے مونٹھ کی تلواریں بھینٹ میں پیش کیں۔" تلوار کا قبضہ ہوتا ہے یا مونٹھ؟

"مگر اس مصیبت سے چھٹانے کے لئے انھوں نے۔" چھڑانا فصیح ہے۔

"اس کے سر کو پاؤں سے ٹکرایا۔" پاؤں سے ٹھکراتے ہیں نہ کہ ٹکراتے۔

"انھیں معہ ان کے معاونوں کے جان سے مار دینا چاہئے۔" مار دینا یہاں بالکل غلط ہے۔ "مار ڈالنا" چاہئے۔ اور مع کی اضافت بھی غلط ہے۔

"شاید یہ سوال پوچھا جائے۔" سوال پوچھنا آج ہی سنا ہے۔

"جب وہ ہوا میں ملا تو موٹ پیدا ہوا جسے بعض کیچڑ کا اور بعض ترکیب آبی کا فضلہ پکارتے ہیں۔" کیونکر؟ چیخیں مار مار کر!

"لیکن جارج اسمتھ کی ان تھک کوششوں سے جو اس نے خط میخی پڑھنے میں مصروف کی تھیں۔" صرف کی تھیں چاہئے۔

"سمجھدار آدمی کو اس وقت تک فیصلہ نہ دینا چاہئے۔" فیصلہ دینا خلاف محاورہ ہے۔

"اور قریباً تو بیا تعلق" "ب" کو الف لگایا اور الف پر دو زبر۔ مگر کس قاعدے سے حضور؟ تقریباً میں تو مصدر کے ساتھ عربی قاعدے کے موافق یہ عمل کیا گیا تھا۔

"گفتگو کے دوران میں جواباً کہا تھا۔" یہ بھی ویسی ہی بات ہے۔

"اپنے فرض کی ادائیگی اور بندگانِ خدا کی خدمت گزاری کی۔" ادائیگی قابل داد ہے۔

"وہ اس کام میں اپنی زندگی کے اندر کامیاب نہ ہو سکے۔" تو پھر زندگی کے باہر کامیاب ہو جائیں گے۔ حرج ہی کیا ہے؟

"تم جانتے ہو کہ چاند زمین کے گرد چرخ کھاتا ہے۔" چرخ کھانا بمعنی چکر کھانا نئی اصطلاح ہے۔

"لی ہان نے کئی درجن بار اس دعوی کی تکرار کی۔" کئی بار کافی تھا۔ درجن کو خواہ مخواہ بیچ میں اجنبی بنا کر داخل کیا۔

"مادہ کے وزن میں خفت واضافہ نہیں ہو سکا ہے۔" خفت ملاحظہ ہو۔

"قاعدہ کلیہ ہزار یا پانچسو لڑکیوں کی کیفیت اور شوق کو مشاہدہ کرنے کے بعد قائم کیا گیا ہے۔" لفظ پانچ کے ساتھ جب سات و سو کے الفاظ ملائے جاتے ہیں تو "چ" کو گرا کر پان سات اور پانسو کہتے ہیں۔

"اور دولہا سے یورپ خصوصاً۔" دول کو واحد تو نہیں سمجھ لیا، اور پھر عربی لفظ کے ساتھ "ہائے" فارسی! خوب!!

"اور برسہا برس ایک ایک کتاب کو لائق علما نے درست کر کے شائع کیا۔" برسہا برس!! انشا پردازی کے صدقے!

"ایک تارک الدنیا وعظ دے رہا تھا۔" وعظ کرنا نہ کہ وعظ دینا۔

"ننگی شخصیت لوگوں کے سامنے ظاہر کرنا پڑتی ہے۔" ننگی شخصیت قابل داد ہے۔

"جیسا کہ اس کے دینی اور غیر دینی لٹریچر سے ظاہر ہے۔" غیر دینی کی جگہ غیر مذہبی لکھا جاتا تو درست ہوتا۔

"پڑھنے والوں کو خاص عقلی حظ حاصل ہونے کے علاوہ" عقلی حظ! نقلی حظ! بھئی واہ !!

"عالمان اثریات بھی اثری شہادت کی بناء پر" اثری شہادت وغیرہ نئی اصطلاحیں ہیں۔

"وہ ایک معدوم زرعی سائنس کا بقیہ ہی معلوم ہوتا ہے"۔ زرعی سائنس کی جگہ فن زراعت ہوسکتا تھا لیکن نہیں لکھا۔

"تارکان وطن کی لہر پہ لہر بہتی تھی۔ لہرا رہی تھی۔

"لیکن بعض حالتوں میں ان لوگوں کے اندر بھی خود ضبطی، ایثار اور خدمت گزاری کا قابل ذکر مادہ پایا جاتا ہے"۔ خود داری کہتے ہیں۔ خود ضبطی تو کسی نے بھی نہ سُنا ہوگا۔

"ماں کی تعلیم و تربیت اس کے نیک خصائل اور نیک چال چلن کا خاموش اثر چھوٹے بچوں کے دل پر ایسا گہرا پڑتا ہے"۔ خاموش بھی خوب! پکارتا ہوا نہیں؟

"لا کلام دہلی و لکھنؤ کے شعرا نے اعلیٰ درجہ کی فارسیات اُردو لکھی ہے"۔ فارسیات اُردو کی داد ہم ناظرین سے طلب کرتے ہیں۔

"نہ ان کے حالات کسی خود نوشت یا غیر نوشت سوانح عمری میں مذکور ہیں" Biography اور Autobiography کا ترجمہ غیر نوشت سوانح عمری اور خود نوشت سوانح عمری کیا گیا ہے۔ زباں داں حضرات پسند فرمائیں تو ہمیں کچھ عذر نہیں۔

"یہ سب باتیں واقعی تکلیف دہ اور شرمساری دلانے والی تھیں"! جس قدر داد دیجئے کم ہے۔

"یا الیشور! تو میری مدد کر"! "یا" عربی زبان کا حرف ندا ہے۔ یارب، یا الٰہی بالکل صحیح ہیں یا خدا کہنا بھی درست نہیں۔ مگر یا ایشور کو دیکھئے۔

"اپنی اور اپنے بچوں کی تعلیم کے متعلق کتابوں کے جنگلستان و خارستان سے چیدہ چیدہ کتابیں اپنے اپنے مذاق کے موافق چن لیں"۔ جنگلستان خوب کہا ہے۔ستاں جہاں چاہا لگا دیا چنانچہ "تھوڑی سی مفید و منتخب لائبریری بمقابلہ بڑی کتابستان کے بہتر ہے"۔ کتابستان بھی ملاحظہ ہو۔ کیا لائبریری کے لئے کتاب خانہ کا لفظ نہ تھا۔

"لیکن سورج، چاند، اور پانچوں سیارے جو ننگی آنکھ کو نظر آتے" ننگی آنکھ Naked Eye کا ترجمہ کیا ہے۔ مگر بھدا۔ اس سے بہتر تھا کہ بغیر دُوربین وغیرہ کے نظر آتے، لکھ دیا ہوتا۔

"اس کے پرائیوٹ حقوق و فرائض کو اس کے سرکاری حقوق و فرائض جانا جاتا ہے"۔ پرائیوٹ کو خواہ مخواہ تکلیف دی ہے۔ خانگی کا لفظ اُردو میں موجود تھا۔ حقوق و فرائض جانا جاتا ہے۔ جانے جاتے چاہئے۔

"چند سال یا کروڑ سالوں کے بعد دُنیا بگڑ جاتی ہے"۔ سال کی جمع سالوں خوب بنائی ہے۔

"جس نے ابتدا میں پانیوں کو جنبش دی"۔ پانیوں پر تو بے اختیار ہنسی آتی ہے۔

"اس کے مرنے میں کئی برسیں گزرتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں اگرچہ فی الواقع ایک ہی گھنٹہ گزرا"۔ برسیں گزرتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں! واللہ زباں دانی کو بٹہ لگتا ہے۔

"جب تک ماں کے اخلاق اچھے نہیں ہوں لڑکوں کا اخلاق اچھا ہو نہیں سکتا"۔ ایک ہی سطر میں اخلاق جمع بھی واحد بھی۔

"سچ پوچھو تو یہ جزر و مد نہیں ہے اس کو تلاطم اور امواج جو چاہو کہہ سکتے ہو"۔ امواج موج کی جمع ہے۔

"پانی انسان کی مصروفیتوں کے کتنے بڑے شعبوں پر حاوی ہے"۔ مصروفیتوں نئی جمع بنائی ہے۔

"سائنس کی دریافتوں کے لئے لازم ہے"۔ دریافت کی جمع دریافتہا اُردو میں مستعمل نہیں۔

"اس کی تحقیقی اور علمی مصروفیتیں گوناگوں تھیں"۔

فصیح الملک نواب مرزا داغ دہلوی مرحوم

[illegible]. RAY & SONS, CALCUTTA

"دہلی زمانہ قدیم سے ہندوستان کا دارالسلطنت رہا ہے۔" رہی ہے چاہئے۔

"یہ عمارت اپنی آپ ہی نظیر تھی اور اس معمار کی کاریگری کی سب سے اعلیٰ نمونہ تھی۔" اس معمار کی کاریگری کا سب سے اعلیٰ نمونہ تھی چاہئے کیونکہ نمونہ مذکر ہے۔

"تقدس مآب پوپ کا نیاز حاصل کرکے وہاں کے حالات شائع کئے۔" پوپ کا نیاز ملاحظہ فرمائے۔

"گرد و غبار ہیر نہیں پڑتا اور گھاس جمتا ہے۔" گھاس کو کہیں بھی مذکر نہیں کہتے ہیں۔

"اس قسم کی معاشرتی یا نسلی ایکمائیت پائی جاتی ہے۔" اسم فاعل یا اسم مفعول کے آخر میں یئت لگا کر مصدر بناتے ہیں لیکن آجکل دیکھا جارہا ہے کہ جس لفظ کے آخر میں چاہا ئیت لگا دیا اور کام نکال لیا۔ ملاحظہ ہو۔

"جو تعلق ویلینگٹن کو برطانیت کے جزو مرکزی سے ہے کیا وہی اور قریباً ویسا ہی تعلق ...."

"قدیم ہندوستان میں راجہ کو عام طور پر "وشم تی" کے لفظ سے یاد کیا جاتا تھا۔" فعل مجہول میں "کو" کس طرح آسکتا ہے؟ لیکن اکثر اصحاب اس میں غلطی کرتے ہیں۔

"رات کا ایک بجا ہو گا کہ مجھے جگایا گیا۔" بالکل غلط۔ رات کو ایک بجا ہو گا کہ میں جگایا گیا، چاہئے۔

اس کو مشتے از خروارے کی مثال سمجھئے۔ ایسی سیکڑوں غلطیاں ہوا کرتی ہیں۔ اس کے علاوہ نظم کے حصے پر تو کچھ بھی نہیں لکھا۔ انشا اللہ نثر پر صرف لکھا جائے گا۔ بہتر تو یہی ہے کہ کوئی اور صاحب قلم اٹھائیں تاکہ نثر و نظم پر کچھ نہ کچھ تنقید ہو جائے۔

اب ہم ایڈیٹروں سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ توجہ فرمائیں۔ زبان کا خیال خاص طور پر ملحوظ خاطر رکھا جائے۔ ہمیں امید ہے کہ ہماری تحریر خالی نہ جائے گی۔

محمد اسد اللہ

فصیح الملک داغ دہلوی

نواب مرزا خاں داغ اُن مقدس اور قابل پرستش نفوس کی آخری یادگار تھے جو اپنے کمال کے زور سے دہلی کے افق سے طلوع ہو کر آسمان سخن پر آفتاب و ماہتاب بن کر چمکے اور خاکدان ہند کو اپنی نورانی فکر کی شعاعوں سے منور کیا۔ پروفیسر آزاد مرحوم نے صفحات آب حیات میں بہارستان اُردو کی جو تماشا انگیز تصویر دکھائی ہے وہ پانچویں دَور پر آکر ختم ہو گئی ہے لیکن اگر زمانہ مساعدت کرتا اور وہ اپنے تذکرے کی تکمیل پر قادر ہوتے تو یہ ایک یقینی امر ہے کہ اس دَورِ آخر کے شعراء میں داغ کا ذکر نہایت جلی الفاظ میں کیا جاتا اور شہ نشین شاعری پر جو جگہ ذوق نے خالی کی تھی بلا شبہ داغ کے حصے میں آتی۔

اُردو شاعری کی کوئی مبسوط تاریخ موجود نہیں لیکن جو کچھ بھی معلومات مولینا آزاد کے رشحات قلم کی صورت میں ہم تک پہنچی ہے اُس پر سرسری غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سلف سے لے کر خلف تک کئی نوع کے شعر گو ہمارے یہاں پیدا ہو چکے ہیں لیکن مجموعی طور پر داغ کا سا جامع خصوصیات شاعر آج تک اُردو میں نہیں گذرا۔ یہ خصوصیات کچھ تو ان کے کلام اور کمال سے متعلق ہیں اور کچھ ان کی ذات سے اور ان سبھوں نے مل کر اُن کی شخصیت کو یقیناً ایک قابل رشک چیز بنا دیا تھا۔

حضرت داغ ۲۵ مئی ۱۸۳۱ء (مطابق ۱۲ ذی الحجہ ۱۲۴۶ھ) کو مقام دہلی

پیدا ہوئے ۔ اس زمانہ میں شعر و شاعری کا جو چرچا وہاں تھا اُس کے دلچسپ تذکروں سے باخبر اصحاب ناواقف نہ ہوں گے ۔ بادشاہ و ولیعہد دونوں شعرگوئی کے دلدادہ تھے اور حکمرانوں کے اس شوق نے امراء اور متوسطین کے طبقے میں بھی شاعری کی روح پھونک دی تھی ۔ داغ بھی سن تمیز کو پہنچتے ہی اسی دیوی کے پرستاروں میں شریک ہوگئے لیکن خون لگا کر شہیدوں میں نہیں ملے ۔ مبدء فیاض سے اُنھیں وجدان سلیم کا وافی حصّہ ملا تھا اور فطرت نے اُنھیں ذہین، نکتہ رس، اور طباع بنانے میں بخل سے مطلق کام نہ لیا تھا ۔ ممکن نہیں کہ انسان جس آب و ہوا میں پلے اُس سے دل و دماغ متاثر ہوئے بغیر رہیں؛ خصوصاً اُس صورت میں کہ جذب تاثیر کی قوت بھی درمیان میں کام کرتی ہو ۔ اُس زمانہ میں قلعہ معلیٰ میں شاہی اہتمام سے مشاعرے ہوا کرتے تھے ۔ مخصوص اشخاص کو شرکت کی اجازت ملتی تھی ۔ بادشاہ خود تشریف لاتے تھے ۔ اساتذہ وقت کے علاوہ دوسرے مشہور شعراء کو بھی باریابی کا موقع ملتا تھا ۔ جب کسی امیر و رئیس کے صاحبزادے بہ حیثیت شاعر اس جلسے میں آتے تو سب سے پہلے بادشاہ سلامت کے سامنے پیش ہوتے اور پھر وہ اپنا کلام سناتے ۔ اسی حیثیت اور اسی صورت سے ہم داغ کو بھی بہ عالم نوعمری بادشاہ کے سامنے یہ غزل سناتے دیکھتے ہیں ؎

نکال اب تیر سینے سے کہ جانِ پُر الم نکلے
جو یہ نکلے تو دل نکلے جو دل نکلے تو دم نکلے

خدا ہے حشر کے دن التجا تیری نہ مانوں میں
مرے منہ سے نہیں نکلے ترے منہ سے قسم نکلے

مرے دل سے کوئی پوچھے شب فرقت کی بیتابی
یہی فریاد تھی لب پر کہ یا رب جلد دم نکلے

ہوئے منظور وہ جب آہ میری بے اثر دیکھی
کسی کا اس طرح یا رب نہ دنیا میں بھرم نکلے

مبارک ہو یہ گھر غیروں کو، تم کو، پاسبانوں کو
ہمارا کیا اجارا ہے، نکالا تم نے، ہم نکلے

سمجھ کر رحمدل تم کو دیا تھا ہم نے دل اپنا
مگر تم تو بلا نکلے، غضب نکلے، ستم نکلے

دم پرسش جو دیکھا اس بت سفاک کو مضطر
صفِ محشر سے دل پکڑے ہوئے گھبرا کے ہم نکلے

کہیں کیا دل میں کیا آیا کہیں کیا منہ سے کیا نکلا
کبھی جو چلتے پھرتے ہم سوئے بیت الصنم نکلے

گئے ہیں رنج و غم اے داغ بعد مرگ ساتھ اپنے
اگر نکلے تو یہ اپنے رفیقانِ عدم نکلے

یہ غزل بادشاہ سلامت کے طرحی مصرعہ پر کہی گئی تھی ۔ کسی شاعر کی ابتدائی کوششیں اس سے زیادہ بارور نہیں ہوسکتیں کہ سامعین سے قبولیت اور پسندیدگی کا سرٹیفکٹ لے لیں ۔ داغ کا ایک ایک شعر اہل مجلس کو لطف بخش رہا تھا اور جب غزل تمام ہوئی تو بادشاہ بیساختہ کہ اُٹھے کہ "کیا اچھی طبیعت پائی ہے"۔

لیکن یہ پہلا ہی موقع نہ تھا کہ داغ مشاعرے میں آئے ہوں ۔ شاہی مجلس شعر و سخن کے علاوہ دہلی میں اُس وقت عام طور پر شعر کے مشاعرے ہوا کرتے تھے ۔ اور اُن میں داغ اس سے کچھ پیشتر اپنی نازک خیالی کا ثبوت خاص و عام کے سامنے پیش کرچکے تھے ۔ شاہی مشاعرے میں اُنھیں جو کامیابی ہوئی اُس نے اُن کے طایر شہرت کے پر لگادئے اور اُس کے بعد پھر کوئی مشاعرہ ایسا نہ ہوتا تھا جس میں مشتاقانِ فن کی نگاہ داغ پر خصوصیت سے نہ پڑتی ہو ۔

تھوڑے ہی دن میں داغ کے کلام نے قبولیت کے وہ تمام مدارج طے کرلیے جو اکثر حالتوں میں معمولی شعراء کے لئے بہت دشوار بلکہ ناممکن ہوتے ہیں ۔ قاعدے کی بات ہے کہ اُستاد کی زندگی تک شاگرد کی نام آوری کا حلقہ بہت محدود رہتا ہے ۔ اس کلیہ کا استثناء کچھ تو داغ کے اُستاد ذوق کے حالات میں پایا جاتا ہے جنھوں نے شاہ نصیر کی موجودگی ہی میں غیر معمولی ہر دلعزیزی پیدا کرلی تھی اور کچھ داغ کی سرگذشت میں کہ اُنھوں نے اپنے اُستاد کے سامنے اپنا نام چمکا لیا ۔ ذوق کی کامیابی کا راز شاہی سرپرستی میں چھپا ہوا ہے لیکن داغ محض اپنے کلام کے زور سے مشہور ہوئے ۔ غرض داغ کا ابتدائی رنگ اس قدر شوخ تھا کہ ہر کس و ناکس کی نگاہ اُس پر پڑتی تھی اور اس کے

ساتھ تاثیرِ کلام نے مل کر سونے میں سہاگے کا کام کیا کہ جن مشاعروں میں غالب، ذوق، شیفتہ، اور نیّر وغیرہ معرکہ آرائیاں کرتے تھے وہاں داغ بھی اپنے کمال کے زور سے خراجِ تحسین حاصل کرنے میں کبھی ناکام نہیں رہے۔

داغ شیخ ابراہیم ذوق کے ارشد تلامذہ میں سے تھے یقیناً ذوق کو ایسے سرمایہ ناز شاگرد کے وجود پر فخر رہا ہوگا لیکن ان دونوں کی پرائیویٹ زندگی اور ذاتی روابط کے وہ نقش و نگار معدوم ہیں جو غالب کے "اُردوئے معلّٰی" میں کھینچے گئے ہیں اور جن سے استاد اور شاگرد کے ارتباط و خلوص کی صحیح اور سچی کیفیت پیش نظر ہو جاتی ہے۔ مولانا آزاد نے ذوق مرحوم کے حالات میں اُن کی زندگی کے ہر پہلو پر ضرورت سے زیادہ روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے لیکن ان کے شاگردوں کا معمولی سا تذکرہ بھی نہیں کیا گیا ورنہ اُس سے بہت سے ادبی فواید مترتب ہو سکتے تھے۔ بہرکیف ذوق کے شاگرد ہونے کا فخر خواہ داغ کے لئے ذاتی طور پر مایۂ نازش رہا ہو، لیکن اُن کی عظمت و شہرت کی کفالت ان تعلقات سے نہیں بلکہ اُن کے کلام سے ہے۔ استاد کے فیضانِ صحبت سے داغ متمتع ہوئے ہوں گے۔ لیکن داغ کی ناموری اور اقبالمندی اُن کی ذہنی اور دماغی قابلیتیں تھیں، اور اس لئے ہر دلعزیزی اور قبولیت عامہ کا تمام کریڈٹ خود اُن کی ذات کو ملنا چاہئے۔ مولانا حالی فرماتے ہیں اور کس قدر صحیح فرماتے ہیں کہ

ہمارے ملک میں جو شاعری کے لئے ایک اُستاد قرار دینے کا دستور اور اصلاح کے لئے ہمیشہ اُس کو اپنا کلام دکھانے کا قاعدہ قدیم سے چلا آتا ہے اس سے شاگردوں کے حق میں کوئی معتدبہ فائدہ مترتب ہونے کی امید نہیں ہے اُستاد شاگرد کے کلام میں اس سے زیادہ اور کیا کر سکتا ہے کہ کوئی گریمر کی غلطی بنا دے یا کسی عروضی یا لغزی کی اصلاح کر دے لیکن اس سے نفسِ شعر میں کچھ ترقی نہیں ہو سکتی۔ رہی یہ بات کہ اُستاد شاگرد کے پست کلام کو بلند کر دے یا شاگرد کو اپنا ہمسر بنا دے، سو یہ امر خود اُستاد کی طاقت اور اختیار سے باہر ہے۔ اگر اُستادوں میں شاگردوں کو اپنا ہمسر بنانے کی طاقت ہوتی تو ملّا نظامی ؒ صاحبزادے کو یہ نصیحت نہ کرتے ؎

در شعر مپیچ و در فنِ او   کایں ختم شد است بر نظامی

اور اگر کمال شاعری کے لئے کسی کا تلمذ اختیار کرنا ضروری ہوتا تو سنائی، نظامی، سعدی، خسرو، اور حافظ کے ضرور ایسے اُستاد نکلتے جن کی شہرت شاگردوں سے زیادہ نہیں تو اُن کے برابر یا ان سے کمتر تو ہوتی۔

حضرت ذوق کے کمال سے انکار کرنے کی جرائت کس کو ہو گی لیکن اس جگہ صرف یہ دکھانا مقصود ہے کہ داغ ماں کے پیٹ سے ایک صحیح اور حقیقی شاعر بن کر پیدا ہوئے تھے اور خود اُن میں وہ صفات بوجہ احسن موجود تھیں جو کسی سخن گو کو "فطری شاعر" کا لقب دلا سکتی ہیں۔ اس میں کلام نہیں کہ قابل اُستاد کا ہونہار شاگرد کے ساتھ ایسا ہی تعلق ہے جیسے حکاک کو الماس کے ساتھ کہ وہ اُس میں جلا پیدا کرتا ہے لیکن اگر پتھر میں چمکنے کی قابلیت ہی سرتاپا مفقود ہو تو حکاک کیا کر سکتا ہے۔

الغرض داغ کی شہرت کا دائرہ روز بروز وسیع ہوتا گیا اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ قلعہ معلّٰی میں اکثر شاہزادے بڑے بڑے اساتذہ کو چھوڑ کر اُن سے اصلاحِ سخن لینے لگے اور دلّی کا کوئی مشاعرہ بارونق نہ سمجھا جاتا تھا جس میں داغ زمزمہ سنج نہ ہوں لیکن غدر ۱۸۵۷ء نے رنگ میں بھنگ کر دیا مجلسیں برہم ہو گئیں جلسے منتشر ہو گئے۔ نہ قدردان رہے نہ قدردانی کے سامان۔ اسی حسرتناک سین کی تصویر پُر اثر الفاظ میں داغ نے یوں کھینچی ہے ؎

عجیب شکل گُل و گلستان نظر آئی   پڑیں جدھر کو نگاہیں خزاں نظر آئی
جب اُٹھ کے تا مژۂ خونفشاں نظر آئی   تو کوئی عیش کی صورت نہ یاں نظر آئی

وہ گلرخانِ سمن بر کے قہقہے نہ رہے
وہ بلبلانِ خوش الحاں کے چہچہے نہ رہے

زمیں کے حال پر اب آسمان روتا ہے ہر اک فراقِ مکیں میں مکان روتا ہے
گدا و شاہ و ضعیف و جوان روتا ہے غرض یہاں کے لئے اک جہان روتا ہے

جو کئے جوشش طوفان نہیں کہی جاتی
یہاں تو نوح کی کشتی بھی ڈوب ہی جاتی

صحت واقعات اور تاثیر سخن کے لحاظ سے داغ کا یہ مسدس شہر آشوب مستقل دلچسپی کی چیز ہے۔ اور بھی شعراء نے دہلی کے مرثیے لکھے ہیں لیکن داغ کو کوئی نہیں پہنچا۔ معلوم نہیں داغ نے اس مسدس کا یہ آخری شعر

الٰہی! پھر اسے آباد و شاد دیکھیں ہم
الٰہی! پھر اسے حسب مراد دیکھیں ہم

کس وقت اور کس دل سے کہا تھا کہ اُن کی یہ آرزو پوری ہو کر رہی۔ حضور جارج پنجم خلد اللہ ملکہٗ نے دہلی کو ہندوستان کا دارالسلطنت قرار دیکر اس قدیم شہر کی عظمت و شان کی روایات کو زندہ کرنے کا سامان بہم پہنچا دیا ہے۔ کاش داغ اس وقت زندہ ہوتے اور دیکھتے کہ اُن کی دعا بیکار نہیں گئی۔

دہلی کی بربادی گویا فصل خزاں تھی۔ جس طرح بہار کے خاتمہ پر باغ کی ساری دلچسپیاں معدوم ہو جاتی ہیں اسی طرح غدر کے بعد دہلی اسی طرح تاراج اور ویران ہوگئی تھی کہ اور تو اور خود وہاں کے باشندوں کو بھی دلی کا قیام دو بھر تھا۔ اب یہاں کی زندگی میں وہ "چٹخارے" مفقود ہو چکے تھے جو حیوان مطلق کو بھی اپنی جگہ سے ہلنے نہ دیتے تھے۔ ذوق کا مقولہ کہ

کون جائے ذوق پر دلی کی گلیاں چھوڑ کر

علمی حیثیت سے بے معنی الفاظ کا مجموعہ بنا ہوا تھا اور غالب کے اس مصرعہ کی صداقت آفریں کیفیت دلوں پر طاری ہو رہی تھی ع

ہم نے یہ مانا کہ دلی میں رہیں کھائیں گے کیا

ذاتی ضروریات اور فکر معاش سے مجبور ہو کر کملاء دہلی کا مجمع منتشر ہوا اور جس کی جدھر بن آئی چلتا بنا۔ اُس زمانے میں ریاست رامپور علمی قدر افزائی کی وجہ سے مشہور ہو رہی تھی۔ امیر، تسلیم، جلال، قلق، ایسے نامی گرامی شعراء کی ذات سے دربار کو زینت حاصل تھی۔ نواب مرزا داغ بھی بامید قدر دانی رامپور پہنچے۔ اس وقت نواب یوسف علی خاں ناظم مسند آرائے حکومت تھے۔ علم دوستی اور معارف پروری کا مادہ اُن کی خلقت میں کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ ایک طرح سے وہ داغ کے اُستاد بھی تھے کیونکہ ایک روایت کے مطابق داغ نے سکندر نامہ انھیں سے پڑھا تھا اُس وقت یہ دہلی میں تھے۔ داغ کو بہت خندہ پیشانی سے خیر مقدم کہا۔ نواب کلب علیخاں کا زمانہ ولیعہدی تھا۔ یہ ان کے مصاحب مقرر ہوئے اور بالآخر داروغہ اصطبل کی خدمت ان کو تفویض ہوئی۔

داغ جب تک رامپور میں رہے بہت بے فکری اور آرام سے رہے۔ نواب کلب علی خاں جب حکومت پر پہنچے تو اُن کے وقت میں رامپور لکھنؤ بنا ہوا تھا اور وہ خود گویا آصف الدولہ تھے۔ امیر و داغ اور ان کے اکثر معاصر اسی دریا دل نواب کے خوان کرم کے ریزہ چیں تھے۔ نواب کا دربار علمی و ادبی نکتہ خیال سے جلال الدین اکبر کا دربار تھا جس میں صاحبانِ فضل و کمال بجائے خود نورتن اکبری کے قایم مقام تھے۔

قیام رامپور کے زمانے میں داغ کی شہرت کا حلقہ اور بھی وسیع ہوتا گیا۔ وہاں آئے دن مشاعرے ہوتے تھے حکمران وقت خود شعر و سخن کا شیدائے غالی تھا۔ یہ امر عوام کی حوصلہ افزائی کا سب سے بڑا سبب ثابت ہوا۔ اُردو شاعری کے آخری دور کے سارے قائم مقام گویا رامپور میں تھے پھر اُن مشاعروں کی گوناگوں دلچسپیوں کا اندازہ ہو سکتا ہے جس میں امیر، داغ، تسلیم وغیرہ، ایسے جید شاعر طبع آزمائی کرتے ہوں۔ ان شعراء میں سے ہر ایک بجائے خود آسمانِ سخن کا ایک درخشندہ ستارہ تھا کسی ایک کو دوسرے پر فضیلت دینا ایک حد تک قرین انصاف نہ ہوگا لیکن

داغ کی زبان، اُن کا تخیل، اُن کا رنگ آغاز شاعری سے ممتاز تھا اور یہ امتیاز رامپور میں اور پختگی حاصل کرتا گیا۔ جہاں اور بہت سے سخن گو نفس شاعری کے لحاظ سے یک رنگ اور یکساں تھے وہاں صرف داغ کی سب سے جداگانہ حیثیت تھی۔ اکثر شعرا کا کلام صرف مشاعرے تک محدود رہتا لیکن داغ کی غزلیں جو مشاعرے میں پڑھی جاتیں وہ غیر معمولی سرعت کے ساتھ شہرت پذیر ہو جاتی تھیں۔ امیر مرحوم بجائے خود اُردو شاعری کے بہترین اُستاد تھے لیکن یہ بات اُن کے کلام کو بھی نصیب نہ تھی حالانکہ ذاتی جوہر کمال کے ماسوا نواب وقت کو مشورہ سخن دینے کی عزت اُن کے کلام کی شہرت کا خاص اور موثر ذریعہ بن سکتی تھی۔

جب تک نواب کلب علی خاں زندہ رہے اہل دربار اُن کے قدموں سے لگے رہے۔ نواب کی ذات اُن لوگوں کی تقویت کا باعث تھی۔ کم از کم فکر معاش سے سبھوں کو نجات تھی۔ داغ اُن لوگوں میں تھے جو امیر کے بعد نواب کی قدر شناسی کے مرجح طور پر حقدار تھے۔ داغ بھی احسان فراموش نہ تھے۔ ان کے اولین دیوان میں جابجا اس کا ثبوت ملتا ہے۔ مثلاً چند شعر درج کئے جاتے ہیں ؎

دست نواب گہر بار فلک دریا بار　　داغ برسات نئی آئی ہے برسات کے ساتھ

جس کو ہو داغ بہت حسن شجاعت پہ غرور　　میرے نواب بہادر کے مقابل آئے

رہے کیا مصطفےٰ آباد میں داغ　　مزے سارے تھے وہ خلد آشیاں تک

ہر چند رامپور میں گھبرا رہا ہے دل　　کس طرح جائے کلب علی خاں کو چھوڑ کر

نواب خلد آشیاں کے ساتھ انھیں بھی فریضۂ حج بیت اللہ ادا کرنے کا موقع ملا تھا چنانچہ کہتے ہیں ؎

ساتھ نواب کے حج کرکے پھرے ہم اے داغ
ہند میں دھوم ہے مہمانِ حجاز آتے ہیں

غرضکہ نواب کلب علی خاں کی فیاضی نے داغ کو اور افکار سے فارغ البال بنا دیا تھا۔ پھر اُنھیں کہیں دریوزہ گری کرنے کی ضرورت نہیں ہوئی۔ حضرت

ایک مرتبہ کلکتہ کے سفر کا اتفاق ہوا تھا جس کی دلچسپ کیفیت سے مثنوی فریاد داغ کے صفحے لبریز ہیں۔ کلکتہ جاتے ہوئے عظیم آباد میں بھی ٹھہرے تھے اور غالباً اُن کی یہ غزل ؎

بھویں تنتی ہیں خنجر ہاتھ میں ہے تن کے بیٹھے ہیں
کسی سے آج بگڑی ہے جو وہ یوں بن کے بیٹھے ہیں

وہیں کی کہی ہوئی ہے جیسا کہ اس کے مقطع سے ظاہر ہوتا ہے ؎

کوئی چھینٹا پڑے تو داغ کلکتے چلے جائیں
عظیم آباد میں ہم منتظر ساون کے بیٹھے ہیں

پٹنہ میں داغ کی موجودگی میں مجلس مشاعرہ بھی منعقد ہوئی تھی افسوس ہے کہ اس کے متعلق تفصیلی حالات نہیں مل سکے ورنہ مستقل دلچسپی کی چیز ہوتے۔

ان کے کلام کا شہرہ مختلف اقطاع ہند میں پہنچ چکا تھا سکنان کلکتہ نے ان کو سر آنکھوں پر لیا۔ دعوتیں ہوئیں۔ آؤ بھگت کی گئی۔ مشاعرے ہوئے غرض علمی طبقے میں ان کے جانے سے غیر معمولی جوش پیدا ہو گیا تھا۔ مہمان پر بھی خاطر مدارات نے بہت اثر کیا، اور جب وہ کلکتہ سے واپس ہوئے ہیں تو عرصہ تک وہاں کی یاد دل سے محو نہیں ہو سکی۔ اسی کیفیت کا اظہار ان لفظوں میں کیا ہے ؎

یہ حسیں یہ مہ جبیں یہ شہر ایسی لہر بہر
داغ کلکتے سے ہزاروں داغ دل پر لے چلا

اس سفر کے مفصل حالات فریاد داغ میں شاعرانہ انداز سے قلمبند کئے گئے ہیں۔ جب ہم داغ کے یہ اشعار دیکھتے ہیں ؎

آئی ایسی ہوائے کلکتہ　　دل پکارا کہ ہائے کلکتہ

ریل پر دوستانِ نیک خصال　　آئے اکثر برائے استقبال

شہر میں دھوم تھی کہ داغ آیا　　داغ آیا تو باغ باغ آیا

تو ذہن اضطراری طور پر غالب کے ان شعروں کی طرف

منتقل ہوتا ہے جن میں وہ اپنی غریب الوطنی کی حالت اور اہل کلکتہ کی نامہری کا فوٹو یوں کھینچتے ہیں ؎

اے رئیسان ایں سوادِ عظیم — اے فراہم شدہ زہفت اقلیم

ہمچو آرمیدۂ ایں شہر — بہ ہر کارے رسیدۂ ایں شہر

اسد اللہ بخت برگشتہ — در خسم ہیچ عجز سرگشتہ

گرچہ ناخواندہ مہمان شماست — بے نحن، ریزہ چین خوان شماست

بہ تفضلم رسیدہ است اینجا — بامید آرمیدہ است اینجا

. . . .

آں رہ و رسم کارسازی کو — شیوۂ میہمان نوازی کو

بامن ایں خشم و کیں دریغ دریغ — من چناں تا چنیں دریغ دریغ

مصطفےٰ آباد یا رامپور میں جو بزم سخن نواب کلب علی خاں کی علم دوستی کی بدولت برپا ہوئی تھی وہ اُن کی زندگی تک قایم رہی اور دن دونی رات چوگنی ترقی کے ساتھ، لیکن نواب نامدار کی آنکھیں بند ہوتے ہی گویا وہ بھی خواب وخیال تھی۔ افلاطون نے اپنی کتاب "ری پبلک" میں حکومت کے لئے شاعروں کی کوئی ضرورت نہیں سمجھی۔ رامپور میں بھی جب نواب کلب علی خاں کے بعد اصلاح کا کام جاری ہوا تو سب سے پہلے انھیں شاعروں کا گروہ فضول ثابت ہوا جو خلد آشیاں کے زمانہ میں اراکین دربار میں خصوصی حیثیت رکھتے تھے۔ داغ کا تعلق بھی ریاست سے جاتا رہا اور اُنھیں اپنی زندگی میں پھر ایک دفعہ اُن کلفتوں اور پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا جن سے دلی کی تاراجی کے بعد سابقہ ہوا تھا۔ اُن کی یہ رباعی اُس وقت کی دلی افکار کا آئینہ اور ان کی حقیقی حالت کا مرقع ہے ؎

نواب نے کی جو قدر دانی میری — اے داغ گذر گئی جوانی میری

لیکن یہ خبر نہ تھی کہ وقت پیری — مر مر کے کٹے گی زندگانی میری

لیکن یہ عام قاعدہ ہے کہ تکلیف کے بعد آرام اور رنج کے بعد خوشی میسر ہوتی ہے چنانچہ کچھ عرصہ تک خانہ نشین اور بیکار رہنے کے بعد داغ حیدرآباد پہنچے اور فرمانروائے دکن کی دریا نوالی اور فیاض منشی نے انھیں آخر اُس رتبے تک رہنمائی کی جس سے زیادہ کی امید وہ کبھی خود نہ کرسکتے تھے۔

حضور مغفور میر محبوب علی خاں آصف کا دربار ہمیشہ سے مرجع اہل کمال رہ چکا ہے اور سلاطین اسلام کی علم دوستی اور معارف شناسی کی روایات اُن کی ذات بابرکات سے زندہ۔ حضرت داغ انھیں کے دامن دولت سے وابستہ ہوکر ماہتاب بنکر چمکے، ورنہ اُن کی وقعت بہ حیثیت ایک شاعر ملک میں تو ہوتی لیکن اعزاز وجاہ کے یہ مراتب وہ کبھی نہ طے کرسکتے۔

۱۸۸۸ء میں داغ سب سے پہلے حیدرآباد گئے۔ پبلک نے نونہایت گرمجوشی سے اُنھیں ہاتھوں ہاتھ لیا لیکن باوجود متوسلین ریاست کی جانفشانیوں کے اُس زمانے میں ان کی رسائی حضور تک نہ ہوئی اور ایک عرصہ تک قیام کرنے کے بعد آخر داغ گھبرا گئے اور ناامید ہوکر واپس چلے آئے لیکن جن لوگوں کو حیدرآباد کی زندگی کا تجربہ ہے اُنھیں معلوم ہے کہ وہاں کاربرآری بہت دیر میں ہوتی ہے۔ داغ کا بھی یہی حال ہوا۔ ان کے واپس آجانے کے بعد بھی کچھ دنوں کوئی خبر نہ لی گئی تو یہ بالکل مایوس ہوگئے لیکن جس طرح گھٹا ٹوپ بادل سے سورج کی کرن ظاہر ہوجاتی ہے اسی طرح داغ کی مایوسی یکایک مبدّل بہ شادمانی ہوگئی۔ برسوں کی آرزوئیں اور مہینوں کی دعائیں آخر پوری ہوئیں اور اُنھیں ایک معمولی شاعر کے طور پر نہیں بلکہ اُستاد السلطان کی حیثیت سے حیدرآباد جانا پڑا۔ داغ کی یہ کامیابی غیر معمولی تھی اسی لئے اس خبر کو تمام ہندوستان میں کسی قدر تعجب سے سُنا گیا تھا لیکن دربار آصف جاہی کے لئے یہ اعزاز واکرام کوئی نئی بات نہ تھی۔

داغ کی پہلی تنخواہ ساڑھے چار سو روپیہ مقرر ہوئی تھی لیکن پھر پندرہ سو روپیہ ماہوار تک پہنچ گئی تھی عطئے اور انعامات اس کے ماسوا ہیں۔ ان کے اہل خاندان میں سے اکثر کو بیش قرار وظائف معین تھے غرضکہ حیدرآباد جانا نہ صرف داغ کے لئے ذاتی طور پر بلکہ اُن کے

اعزا و اقارب کے لئے بھی نہایت کارآمد ہوا اور وہ آخر وقت تک عیش مخلّد میں بسر کرتے رہے۔

بیرون شہر افضل گنج حیدرآباد کا ایک مشہور محلہ ہے۔ اس میں ایک خاص حصہ محبوب گنج کے نام سے موسوم ہے۔ یہاں اجناس غلہ وغیرہ کی دوکانیں ہیں۔ عام طور پر یہاں لوگ سکونت پذیر نہیں ہیں لیکن داغ غالباً ۱۸۹۱ء تک یہیں ایک مکان میں جو بظاہر کچھ وسیع اور شاندار بھی نہ تھا رہتے تھے۔ میرے ایک دوست احمد اللہ قیصر حیدرآبادی مرحوم جو ایک نوجوان شاعر تھے اور داغ صاحب کے ہمسایہ ہونے کی وجہ سے اُن کے اکثر عزیزوں سے رسم اتحاد رکھتے تھے مجھ سے بیان کرتے تھے کہ محبوب گنج کا قیام باوجود اُس جگہ کی ناگوار آب و ہوا کے اس شگون پر مبنی تھا کہ اُس مکان میں ٹھہرنے کے بعد ہی داغ صاحب کو حضور نظام کے پاس رسوخ حاصل ہوا تھا لیکن آخر میں وہ رزیڈنسی کے علاقہ میں ایک شاندار اور پُرفضا کوٹھی میں چلے گئے تھے اور پھر وہیں آخر دم تک رہے۔

حیدرآباد کے تعلقات نے داغ کی شہرت کو گویا پر لگا دئے اور واقعی حضور نظام مرحوم کی فیاضی اور جود کی بدولت اُنھیں وہ دُنیاوی اعزاز نصیب ہوا جس کی مثال پچھلی تاریخ اُردو میں نہیں مل سکتی۔ سوداؔ نے آصف الدولہ کے دربار میں اعزاز حاصل کیا۔ سید انشا نے سعادت علی خاں کی توجہات سے فائدہ اُٹھایا۔ ذوق شاہنشاہ دہلی کے اُستاد تھے لیکن یہ باتیں اب پُرانی ہو گئی تھیں۔ البتہ داغ کے مناصب و مراتب کا بچشم خود مشاہدہ کرنے والے لوگ ہندوستان میں عموماً اور دکن میں خصوصاً ہزاروں اور لاکھوں کی تعداد میں اب تک زندہ ہیں۔ انھیں نہ صرف مشورۂ سخن کی عزت حاصل تھی بلکہ درباری اشخاص میں بھی اُن کو نمایاں فوقیت اور ترجیح تھی۔ استاد السلطان ناظم یار جنگ دبیر الدولہ فصیح الملک جہاں اُستاد کے خطابات سے سرفراز ہوئے اور یہ خطابات اس قدر مشہور ہوئے کہ اُن کے تخلص کے بعد گویا اُن کے اصلی نام کے مترادف بن گئے تھے۔

داغ کی موجودگی حیدرآباد ایشیائی شاعری کے فروغ کا خاص سبب ثابت ہوئی اور شروع شروع میں تو شعر گوئی کا وہ چرچا ہوا کہ معمولی الفاظ میں اُس کی کیفیت بیان نہیں کی جا سکتی۔ مشاعروں کی کثرت کے ساتھ شعراء کی تعداد میں بھی غیر معمولی اضافہ ہوتا رہا یہاں تک کہ آج بھی جس قدر شاعر خاص حیدرآباد میں موجود ہیں اُتنے ہندوستان کے کسی اور شہر میں نہیں نکل سکتے اور اُن میں سے اکثر نہایت خوش فکر واقع ہوئے ہیں۔

ابتدائی زمانے میں تو کوئی مشاعرہ ایسا نہ ہوتا تھا جس میں داغ باوجود موانع کے شرکت پر مجبور نہ کئے جاتے ہوں لیکن آخر آخر میں وہ عام مجالس میں کم شریک ہوتے تھے۔ محمد ابراہیم صاحب خان سامان حضوری کے یہاں سالانہ محفل شعر و سخن منعقد ہوتی تھی۔ اس میں اعلیٰ حضرت حضور آصف جاہ مرحوم کی غزل بھی آتی تھی۔ داغ اُسے پڑھتے تھے اس لئے اس مشاعرہ میں ان کی شرکت بالعموم ہو جایا کرتی تھی۔ اسی طرح اور خاص خاص مشاعروں میں جایا کرتے تھے لیکن انحطاط عمر کے ساتھ بوجہ کبر سنی وضعیف العمری یہ التزام بھی باقی نہ رہا۔

۱۹۰۰ء میں امیر مینائی مرحوم مغفور بامید سرفرازی حیدرآباد آئے اور داغ کے مکان پر فروکش ہوئے اُمید ہوئی تھی کہ اب حیدرآباد میں رامپور کا نقشہ کھنچے گا اور ان دونوں اُستادوں کی معرکہ آرائیوں کا لطف جس کا حال کتابوں میں پڑھا اور کانوں سے سُنا تھا ذاتی طور پر اُٹھانے کا موقع ملے گا۔ لیکن اے بسا آرزو کہ خاک شدہ! امیر مرحوم کو حیدرآباد کی آب و ہوا کچھ ایسی ناموافق ہوئی کہ وہ ایک دن بھی اچھے نہ رہے۔ سوء مزاجی کا سلسلہ آخر کار موت پر منتہی ہوا اور شیدائیان سخن کی حسرت خاک میں مل گئی۔ اہل حیدرآباد کو آپ کے واقعۂ ارتحال کا جو صدمہ ہوا اُس کا اندازہ غیر ممکن ہے۔ حضرت داغ کو بھی اپنے ایک پُرانے رفیق اور ہم مشرب کی موت کا بیحد قلق ہوا

امیر مرحوم کے انتقال کے تقریباً پانچ برس بعد داغ نے بھی داعی اجل کو لبیک کہا۔ ۹ - ذیحجہ ۱۳۲۲ھ مطابق ۱۴ - فروری ۱۹۰۵ء اُنکا روز وفات ہے، اور اب وہ بمقام حیدر آباد درگاہِ حضرت یوسف شریف قدس سرہ العزیز کے احاطہ کے اندر امیر مرحوم کے پہلو میں آرام کی نیند سو رہے ہیں۔ سچ کہا ہے

دو چیز آدمی را ستاند بزور　　یکے آب و دانہ دوم خاکِ گور

قدرت کی نیرنگیاں بھی عجیب ہیں۔ کہاں دہلی اور کہاں حیدر آباد، لیکن داغ کے خمیر میں دکن کی مٹی تھی آخر وہیں پیوندِ خاک ہوئے اور شعر و سخن کی یہ شمع اس طرح عالمِ غربت میں "کل من علیہا فان" کے ایک جھونکے سے گُل ہو گئی۔

داغ کی موت معمولی موت نہ تھی بلکہ اُنکے مرنے سے ملک کا ایک باکمال شخص اُٹھ گیا تھا اور بزمِ سخن سے ایک ایسی جگہ خالی ہو گئی تھی جس کے پُر ہونے کی اب صدیوں امید نہیں ہو سکتی۔ پبلک نے اس نقصان کو نہایت درجہ محسوس کیا۔ شعراء نے مرثیے لکھے اور تاریخیں نکالیں۔ اخبارات نے تعزیتی مضامین لکھے اور انجمنوں اور سوسائٹیوں نے اُنکے ماتم میں یادگاری جلسے منعقد کیے۔ ڈاکٹر اقبال جنھیں ابتدا میں داغ سے تلمذ بھی تھا انکا ماد‌ۂ تاریخ "نواب میرزا داغ" معنوی خوبیوں، اختصار، اور برجستگی کے لحاظ سے سب میں ممتاز سمجھا گیا تھا۔ اُنکی ماتمی نظم بھی سوز و گداز کا ایک موثر مرقع ہے۔ جن دردناک الفاظ میں داغ کے تاسف خیز واقعۂ مرگ کا بیان کیا گیا ہے اُنکی کیفیت ان منتخب اشعار سے ظاہر ہو سکتی ہے۔

چل بسا داغ آہ میت اُسکی زیبِ دوش ہے　　آخری شاعر جہان آباد کا خاموش ہے

تھی زبانِ داغ پر جو آرزو ہر دل میں ہے　　یعنی یہ لیلے وہاں بے پردہ یاں محمل میں ہے

کم نہیں محشر سے کچھ ایسی صدا کی خامشی　　آہ دل سوزی تو تھی گو نکتہ آموزی نہ تھی

لکھی جائیں گی کتابِ دل کی تفسیریں بہت　　ہونگی اے خوابِ جوانی تیری تعبیریں بہت

ہو بہو کھینچے گا لیکن عشق کی تصویر کون　　اُٹھ گیا ناوک فگن مار یگا دل پر تیر کون

اشک کے دانے زمینِ شعر میں بوتا ہوں میں　　تو بھی رو اے خاکِ دلی داغ کو روتا ہوں میں

وہ گلِ رنگیں ترا رخصت مثالِ بو ہوا　　یعنی خالی داغ سے کاشانۂ اُردو ہوا

ہز اکسلنسی مہاراجہ سرکشن پرشاد نے جو حضرت آصف غفران مکان کے تلمیذِ رشید ہونے کی حیثیت سے داغ ہی کے شجرۂ شاعری کی ایک سرسبز و پربہار شاخ ہیں کس قدر سچی تاریخِ انتقال نکالی ہے

دہلی کا چراغ بجھ گیا آہ
۱۳۲۲ھ

اس میں شک نہیں کہ ایشیائی شاعری کی آخری رونق ہندوستان میں داغ کے دم سے تھی، اور جہاں تک ان کے مرنے سے نہ صرف دنیائے اُردو کا ایک مایۂ ناز شاعر اُٹھ گیا بلکہ اُسی کے ساتھ دلی کے امتیاز و وقعت کی روایات بھی ہمیشہ کے لیے زمین کے نیچے دب گئیں۔

داغ حضرت ذوق کے تلمیذِ رشید تھے لیکن دنیاوی جاہ و منزلت اور ذاتی شہرت کے اعتبار سے وہ کسی کے شرمندۂ احسان نہ تھے۔ اُنکے تمام اعزاز و مناصب انکی اکتسابی چیزیں تھیں۔ اُنکے کمال نے اُنھیں اس درجہ پر پہنچایا اور اُنکے کلام نے اُنھیں قبولیتِ عامّہ کی سند دلوائی۔ کسی شاعر کے کلام کا اسکے عینِ حیات میں شہرت پذیر ہو جانا شاعر کے خاص فخر و مباہات کا سبب ہوتا ہے اور اس امر میں داغ سب سے زیادہ خوش نصیب ثابت ہوئے ہیں۔ اُنکی زندگی ہی میں اُنکی غزلیں تمام ہندوستان میں پڑھی اور گائی جاتی تھیں۔ اسوقت بھی کوئی مجلسِ نشاط داغ کے گرما گرم کلام کے بغیر رونق نہیں حاصل کر سکتی۔ سودا، میر، جرأت، اور انکے علاوہ اور بھی اکثر شعرا کا کلام اُنکی زندگی میں مشہور ہو گیا تھا، بلکہ میر کی غزلیں تو لکھنؤ سے بطور تحفہ کے دلی جایا کرتی تھیں لیکن داغ کا شہرہ سب سے زیادہ وسیع اور پائدار ہوا ہے۔ اس زمانہ کے دو چار شاعروں کا کلام ایک حد تک مطبوعِ خلائق ضرور ہے مثلاً ریاض اور مضطر جو علی الترتیب شوخ بیانی اور معاملہ بندی میں خاص ملکہ رکھتے ہیں لیکن ان کی شہرت صرف چند غزلیات تک محدود ہے۔ امیر مینائی مرحوم کا بھی یہی حال ہے۔ آجکل اُنکی چند غزلیں کبھی کبھی حقانی رنگ میں سننے میں آجاتی ہیں ورنہ اُنکی زندگی میں تو شاید اُنکا ایک شعر بھی ایسا نہ تھا جو خاص و عام کی زبان پر ہوتا۔ ان الفاظ سے اُنکی کسرِ شان مقصود نہیں

بلکہ اظہار حقیقت مقصود ہی۔ شہرت اور ہر دلعزیزی خداداد باتیں ہیں اسمیں انسان کی کوشش کو مطلق دخل نہیں۔

داغ کی غزلیں جس سرعت کے ساتھ خاص و عام تک پہنچ جاتی تھیں اُنکا اندازہ ان سطور سے ہو سکتا ہی۔ مولوی علی حیدر صاحب طباطبائی مالک الدولہ صولت والے مضمون میں جو بہ اقساط رسالۂ ادیب میں نکل چکا ہی فرماتے ہیں

ایک غزل اُنھوں نے (داغ نے) اپنی سنائی کہ تازہ فکر ہے ؂

پھر سے راہ سے وہ یہاں آتے آتے اجل مر رہی تو کہاں آتے آتے

ساری غزل مرصع اور نہایت برجستہ تھی مگر اس شہرت عام کو دیکھیے کہ وہاں سے میں اُٹھا تو راہ میں وہی غزل گائی جا رہی تھی ......

اس شہرت عام اور مقبولیت کے اسباب جو کچھ رہے ہوں لیکن اسکی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ داغ کا کلام خواص اور عوام دونوں کے مذاق کے مطابق ہوتا تھا اور اُسپر زبان کی صفائی اور خیالات کا نیچرل اور موثر ہونا گویا سونے میں سہاگہ تھا کہ سامع کو روحانی سرور حاصل ہوتا اور اُسکے دل و دماغ ایک خاص کیفیت سے متاثر ہو جاتے تھے۔ بعض خوش فہموں کی رائے ہی کہ داغ نے "چوما چاٹی" کے مضامین نظم کرکے عوام کے قلوب کو مسخر کر لیا ہی۔ اس میں شک نہیں کہ یہ اعتراض بہت بڑی حد تک صحیح ہی۔ اور جہاں تک طبقۂ عوام کا تعلق ہی داغ کی مقبولیت بہت کچھ اسی سبب سے ہی لیکن آخر خواص انکے کلام کے کیوں دلدادہ ہیں؟

اس بحث پر پہنچکر کسی قدر تفصیل سے لکھنے کی ضرورت معلوم ہوتی ہی لیکن ہم اپنا عندیہ ظاہر کرنے میں اختصار کو ہاتھ سے جانے نہ دیں گے۔ (باقی آیندہ)

سید محمد فاروق

کلامِ شاد

(از ہز ایکسلنسی سر مہاراجہ بہادر راجۂ راجایان سر کشن پرشاد صاحب شاد یمین السلطنت جی سی آئی ای)

نہیں ہے تیرے سوا اور رو آشنا کوئی
نظر نہیں مجھے آتا ہے دوسرا کوئی

ترے ہی نور کا جلوہ ہے دیر و کعبہ میں
بس ایک تو ہے نہیں اور دوسرا کوئی

مثالِ گردشِ پرکار ذات ہے اُسکی
نہ ابتدا ہے کوئی اور نہ انتہا کوئی

کبھی ہیں دیر میں جاتے کبھی حرم میں مگر
ہمارے یار کا دیتا نہیں پتا کوئی

نصیب اور مقدر جدا ہے ہر اک کا
کوئی گدا ہے جہاں میں تو بادشا کوئی

اُسی کی دل میں تمنا ہے چاہتے ہیں اُسے
نہیں ہے اُسکے سوا اور مدعا کوئی

غرض بُرے سے ہے ہمکو نہ ہے بھلے سے کام
کوئی بھلا ہو ہمیں کیا کہ ہو بُرا کوئی

جو مصلحت ہے خدا کی وہی ہے عین صواب
مجال کیا کرے چون و چرا ذرا کوئی

جیسے کہ خواجۂ اجمیر کہتے ہیں اے شاد
ہے کائنات میں اُسکے سوا بھلا کوئی

تنقید کتب

کوکبۂ مُلوکی و مملوکی اس کتاب کے لیے جسے مختصر تاریخ کہنا چاہیے اور جس میں "ہندوستان کے فرماں روایانِ مملوک و خلجی کے تاریخی کارنامے" کسی قدر دلچسپی کے ساتھ قلمبند کیے گئے ہیں، ملک کو مولوی سید ضمیر الدین احمد صاحب، آنریری مجسٹریٹ پٹنہ کا ممنون ہونا چاہیے۔ ہمارے یہاں تاریخی مذاق کا فقدان نہایت تاسف انگیز ہے حالانکہ مطالعہ تاریخ کے فوائد سے کسی کو مجالِ انکار نہیں۔ اسباب خواہ کچھ ہوں لیکن یہ ایک بدیہی بات ہے کہ ہم میں سے اکثر ناولوں اور فسانوں کے دل دادہ ہوتے ہیں اور اُن مضامین سے متنفر پائے جاتے ہیں، جن سے ذہنی اور دماغی تربیت یقینی طور پر متاثر ہوتی ہے۔ اس شکایت کو رفع کرنے کا شاید بہترین طریقہ یہی ہو سکتا ہے کہ ان طبائع کو رفتہ رفتہ سیدھے راستہ پر لانے کے لیے مختلف علوم و فنون کی مختصر کتابیں شائع کی جائیں۔ ان کے وسیلہ سے مذاق علمی میں خوش گوار تبدیلی پیدا ہو سکتی ہے جس سے کارآمد نتائج اخذ کیے جا سکتے ہیں۔ اس لحاظ سے ہم مولوی سید ضمیر الدین احمد کو اصولاً قابل مبارکباد سمجھتے ہیں۔ اگرچہ ہماری رائے ناقص میں "کوکبۂ ملوکی و مملوکی" کئی پہلو سے قابل اصلاح بھی نظر آتی ہے۔

اس کتاب میں، جس کی ضخامت کم و بیش ڈیڑھ سو صفحات کی ہے، ملک قطب الدین ایبک (جسکے سر پر ہندوستان کا پہلا اسلامی تاجدار ہونے کا طرۂ امتیاز لگا ہوا ہے) سے لیکر سلطان قطب الدین خلجی تک کے مورخانہ حالات اس طرح قلمبند کیے گئے ہیں کہ اختصار کی خوبیاں بھی ہاتھ سے جانے نہیں پائیں اور تفصیلات بھی اس قدر مجمل نہیں رہیں کہ مطالب کی تشنگی کا الزام لگایا جا سکے۔

تاریخی مضامین، جن سے کوکبہ کے صفحات کو زینت دی گئی ہے وہی ہیں جو کم و بیش دوسری تاریخوں میں پائے جاتے ہیں۔ ترتیب اور طرز بیان میں بھی کوئی خاص جدت نہیں پائی جاتی، بلکہ بعض اوقات نثر آرائی میں شاعرانہ رنگ اس درجہ غالب آگیا ہے کہ تاریخی انداز قائم نہیں رہ سکا۔ ایک کمی یہ بھی ہے کہ واقعات کے ساتھ رائے زنی کا حصہ بہت کم ہے اور جو کچھ ہے بھی وہ ستقامت واصابت سے قطعی خارج ہے۔ مثلاً سلطانہ رضیہ کی بعض اُن کمزوریوں کا ذکر، جن پر مختلف مورخوں نے عجیب و غریب طور پر ایک چوکھا رنگ چڑھا رکھا ہے، اس طور پر کرنا کہ گویا اُنکی حقیقی وجہ اُسکا عورت ذات ہونا تھا، ہر پہلو سے قابل اعتراض ہے۔ حضرت مؤلف نے یہ بہت اچھا کیا ہے کہ واقعات کا ذکر زیادہ تر صاف صاف کر دیا ہے، ورنہ اس قسم کی جرح و تعدیل، جن کا جوڑ ایسی کتابوں میں، جو زمانۂ جدید کی ضروریات پوری کرنے کے لیے تالیف کی گئی ہوں، بھونڈا معلوم ہوتا ہے، کتاب کی وقعت کو بہت گھٹا دیتی۔

بلاشبہ بعض مقامات خصوصیت سے دلچسپ ہیں۔ مثلاً سلطان علاء الدین خلجی اور علاء الملک کا مکالمہ، جس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ راست گفتاری کیا چیز ہے اور جو شیرک نفوس اس صفت سے متصف ہوتے ہیں وہ اپنے نازک فرض کو کس خوبی سے ادا کرتے ہیں۔

قدیم ہندوستان کے اکثر مورخوں پر یہ الزام عائد کیا جاتا ہے کہ وہ خوں ریز لڑائیوں کے تذکرہ سے اپنی تاریخوں کو اس طرح پر کرتے ہیں کہ بقول مولنا شبلی انکا ایک ایک صفحہ "قصائی کی دوکان" نظر آتی ہے۔ مولوی ضمیر الدین صاحب کے "کوکبہ" میں بھی زیادہ تر انہیں معرکہ آرائیوں اور خانہ جنگیوں کا ذکر ہے لیکن شکر ہے کہ کہیں کہیں وہ اس دائرہ سے باہر بھی ہو گئے ہیں۔ اور جہاں کہیں ایسا ہوا ہے وہ مقام غیر معمولی دلچسپی کی چیز ہے۔ مثلاً بعض رفاہ عام کاموں کا بیان، یا بلبن کی طرز معاشرت اور اخلاق و عادات پر جو تبصرہ لکھا گیا ہے وہ دیکھنے کے قابل ہے۔

"کوکبہ" میں اکثر قدیم جگہوں کے نام آئے ہیں۔ مثلاً لکھنوتی، تبرہند، وغیرہ انکی تشریح بذریعہ فٹ نوٹ ہونا ضروری تھی کہ یہ مقامات اس زمانہ میں بھی باقی ہیں یا نہیں اور بصورت اول انکا جدید نام اور محل وقوع لکھنا چاہیے تھا۔

بہرحال کتاب دلچسپی سے خالی نہیں۔ ترتیب واقعات کا قابل تعریف طور پر لحاظ رکھا گیا ہے اور جو کچھ بیان کیا گیا ہے صاف اور سلجھی ہوئی زبان میں۔ اسکی قیمت عہ، مناسب ہے۔ ملنے کا پتہ یہ ہے:۔

سکرٹری صاحب مُسلم لٹریری سوسائٹی۔ کرانی گھاٹ۔ گیا

کفایت شعاری — ڈاکٹر اسمائلز کی اُن تصانیف میں، جن کی شہرت وہردل عزیزی اُنکے مفید و کارآمد ہونے کی ناقابل انکار دلیل ہے، اور جن سے نہ صرف باشندگان انگلستان کو بلکہ تمام اہل عالم کو اسوقت تک معتدبہ منفعت پہنچ چکی ہے، تھرفٹ ("THRIFT") کا پایہ کسی دوسری سے کم نہیں جس قدر و منزلت کا استحقاق ڈاکٹر ممدوح کی کتابوں نے جتایا ہے اُس میں ڈیوٹی، کیرکٹر، سلف ہلپ، وغیرہم کے ساتھ تھرفٹ بھی بجنسہٖ مساوی شریک ہے

اسی کا ترجمہ "کفایت شعاری" کے موزوں و پُرمعنی نام کے ساتھ جناب سید مرتضیٰ صاحب سٹی مجسٹریٹ بھوپال نے دو حصہ ہوا شایع کیا تھا۔ جسکی خوبیوں کا ثبوت یہی کیا کم ہے کہ اسوقت پہلے ایڈیشن کی کوئی کاپی موجود نہیں بلکہ سنہ حال میں اسکو دوبارہ چھپوانے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ چنانچہ زیر ریویو نسخہ دوسرے ایڈیشن کا ہے۔

شروع میں جناب راشد تھانوی نے ایک مختصر دیباچہ لکھا ہے جس کے مطالعہ سے منکشف ہوتا ہے کہ سید مرتضیٰ صاحب پہلے بزرگ ہیں جنھوں نے ڈاکٹر اسمائلز کی مشہور کتاب "کیرکٹر" کو "تہذیب" کے نام سے اُردو کا جامہ پہنایا اور پھر سنہ ۱۹۰۱ء میں تھرفٹ کا ترجمہ شائع کیا۔ اس لحاظ سے سید صاحب دنیائے اُردو کی جانب سے شکریہ کے مستحق ہیں کہ ایسی کارآمد کتابوں کا ترجمہ اُن کی بے غرضانہ سعی سے اُردو میں ہُوا۔

جن لوگوں کو اصل کتاب تھرفٹ کے دیکھنے کا موقع ملا ہے وہ اگر "کفایت شعاری" کو مقابلتہً دیکھیں گے تو انھیں مضامین کے اعتبار سے کمی محسوس ہوگی لیکن اسکی وجہ یہ ہے کہ جو ابواب ہندوستانی خصوصیات سے غیر متعلق ہیں اُنکو ترجمہ میں چھوڑ دیا گیا ہے اور غالباً یہ ترمیم قابل مواخذہ نہیں ہے۔ ترجمہ میں جو حصہ لیا گیا ہے اُسکی تفصیل یہ ہے:۔

پہلا باب - محنت

دوسرا باب - کفایت شعاری کی عادت

تیسرا باب - ناعاقبت اندیشی

چوتھا باب - بچت کے وسائل

اور ان چاروں مضامین میں جو مفید اور عملی ہدایات قلمبند کی گئی ہیں وہ ہر قوم، ہر طبقہ، اور ہر متنفس پر یکساں موثر ہیں اور اس اعتبار سے ہم "کفایت شعاری" سے وہی فوائد حاصل کرسکتے ہیں جو "تھرفٹ" کے وجود سے انگلستان میں ظہور پذیر ہوے اور جن پر عمل پیرا ہوکر مہذب ممالک کے باشندے اب تک ہزاروں اور لاکھوں اقتصادی نفع حاصل کرچکے ہیں۔

ڈاکٹر اسمائلز کی ہدایات اور اُنکے بیش بہا خیالات تعریف و توصیف سے مستغنی ہیں۔ اُنکی تصنیفات نے شہرت اور قدر و منزلت کے جو مراتب طے کیے ہیں وہ بجائے خود اس بات کی کافی شہادت ہے کہ ڈاکٹر موصوف کی تصانیف کو انسانی زندگی کے کامیاب و مقصدور بنانے میں کمال تک دخل ہے۔ یہی صفت "کفایت شعاری" میں بھی بہمہ وجوہ موجود ہے۔ اسکا مطالعہ ہندوستان میں جس کثرت سے کیا جائے اچھا ہے اور اُن ہدایتوں کی، جو اس میں مندرج ہیں جس حد تک بھی پابندی کیجائے بہتر ہے۔

حضرت مترجم نے ترجمہ میں اصل کتاب کی روانی عبارت، سلاست زبان، اور اسی قسم کی اکثر ادبی خوبیوں کا پورا پورا التزام رکھا ہے اور "کفایت شعاری" کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ اگر وہ مشق جاری رکھیں تو ایک کامیاب مترجم بن سکتے ہیں۔

اس کتاب کی قیمت آٹھ آنہ ہے۔ اور درخواست کرنے پر دفتر العصر لکھنؤ سے دستیاب ہوسکتی ہے۔

افسانۂ بنگال — یہ کتاب، جس کی ضخامت چھ جزو ہے، مشہور اہل قلم منشی تیرتھ رام صاحب کی سعی سے معرض وجود میں آئی ہے۔ اس میں آٹھ

نہایت دلچسپ اور معنی خیز بنگالی قصوں کا ترجمہ اُردو میں شامل کیا گیا ہے۔ اگرچہ مختصر فسانہ نگاری کا رواج اُردو میں اب شروع ہو گیا ہے لیکن بلاشبہ اس امر خاص میں بنگالی زبان زیادہ ترقی یافتہ سمجھی جا سکتی ہے۔ منشی تیرتھ رام صاحب نے بنگالی زبان کے چند قصص کا ترجمہ اُردو میں محض اس وجہ سے کیا ہے کہ جو اہل قلم، علم ادب کی اس شاخ سے دلچسپی لینا چاہیں اُن کے لیے اصول و فروع کے سمجھنے کا ایک ذریعہ پیدا کر دیا جائے۔ منشی صاحب کے الفاظ حسب ذیل ہیں :-

مختصر فسانہ نگاری زمانہ موجودہ میں تمام ترقی یافتہ زبانوں کے علم ادب کا جزو لازمی سمجھی جاتی ہے۔ اور سچ پوچھو تو ایک دلچسپ موثر اور پاکیزہ چھوٹی کہانی سے جس قدر مفید نتائج اخذ ہو سکتے ہیں وہ نہ تو کسی طویل اور خشک فلسفیانہ مضمون سے حاصل ہونے ممکن ہیں نہ کسی ضخیم و بسیط ناول سے۔ اس میں شک نہیں کہ ملک کے بعض سربرآوردہ رسائل میں کچھ عرصہ سے طرز جدید کی بعض کہانیاں درج ہونے لگی ہیں لیکن ان کے لکھنے والوں کی کوششیں اسوقت تک ایک تنگ دائرہ میں محدود ہیں۔ اور اس چھوٹے سے حلقہ کے اندر بھی بعض اوقات اس قسم کے نقائص دیکھنے میں آجاتے ہیں جنکا دور ہونا ہرچند کہ اُسوقت کچھ بھی مشکل نہ ہوگا جبکہ ملک کے سربرآوردہ مایۂ ناز انشا پرداز اس طرف اپنی توجہ مبذول کرینگے تاہم سردست ان کا وجود مضر ضرور ہے .... الخ۔

انھیں نقائص کو دور کرنے کا سامان منشی تیرتھ رام صاحب نے اس شکل میں مہیا کیا ہے کہ نامور اور مستند مصنفین بنگال کی چیدہ اور منتخب کہانیوں کا ترجمہ اُردو میں شائع فرمایا ہے اور اُنکی یہ کوشش انصافاً مستحق مبارکباد ہے۔

جن مصنفوں کے قصے اس ترجمہ میں لیے گئے ہیں اُن میں دو چار نام نہایت ممتاز نظر آتے ہیں مثلاً بابو رابندر ناتھ ٹیگور۔ مترجم کے حُسنِ انتخاب کی بھی تعریف کرنا چاہیے۔ اگرچہ یہ کہنے کی گنجایش پھر بھی باقی رہتی ہے کہ مزید کوشش سے بعض بہتر کہانیاں بنگالی زبان ہی سے مل سکتی تھیں۔

نفس ترجمہ کے متعلق، قابل مترجم کی محنت و سعی کا اعتراف کرنے کے ساتھ ہی، اسکا اقرار افسوس سے کرنا پڑتا ہے کہ اکثر مقامات پر زبان کی نفاست اور روانی قائم نہیں رہ سکی۔ جہاں تک ان نقائص کا تعلق محاورات و تشبیہات وغیرہ سے ہے اُس حد تک فاضل مترجم قابل معافی ہیں لیکن اس سے قطع نظر کرنے کے بعد بھی کہیں کہیں عیوب لسانی شدت کے ساتھ قابل گرفت دکھائی دیتے ہیں جن کی موجودگی ایک ایسے اہل قلم کے ترجمہ میں جسکا نام متعدد کتابوں کے مصنف و مولف ہونے کی حیثیت سے لیا جاتا ہو خالی از حیرت نہیں۔ اُمید کرنا چاہیئے کہ ان نقائص کی اصلاح آیندہ ایڈیشن میں باحسن الوجوہ کر دی جائے گی۔

زبان کی فروگزاشتوں کے علاوہ کتاب عمومی حیثیت سے بے عیب ہے اور استحقاق رکھتی ہے کہ اہل ملک اُسکے ساتھ اپنی قدردانی کا ثبوت دیں۔ یہ کتاب بارہ آنے قیمت میں مسرس رام لال برادرس پبلشرز و بک سیلرز ۱۱۔ پاسنز روڈ۔ نولکھا، لاہور کے پتہ سے مل سکتی ہے۔

رموز الاطبا | طب یونانی اور ویدک کی آج کل کساد بازاری پائی جاتی ہے۔ اول الذکر ایک غیر ملک سے تعلق رکھنے والی چیز تھی پھر بھی مسلمانوں نے یونانیوں سے اسکو اس طرح حاصل کیا کہ اپنا بنا لیا اور انھیں کے ساتھ ہندوستان آئی۔ فن ویدک کا تعلق سرزمین ہند ہی سے ہے اور علم طب کی ان دونوں شعبوں نے یہاں ایک زمانہ میں وہ عروج پایا جسکے وہ مستحق تھے۔ لیکن آج کل دور دورہ ڈاکٹری کا ہے۔ برٹش گورنمنٹ کے زیر سایہ رفاہ عام کے کام جس بڑے پیمانہ پر جاری ہوئے ہیں، اُسکی مثال ازمنۂ گذشتہ میں من وعن ملنا مشکل ہے۔ ان میں سے ایک کام شفاخانوں اور خیراتی اسپتالوں کا قیام و اجرا بھی ہے جس کی بدولت لاکھوں اور کروروں نفوس انسانی بروقت ضرورت ایک پائی خرچ کیے بغیر فائدہ اُٹھا رہے ہیں اور گورنمنٹ کو دعا دیتے ہیں۔

یورپین طریق علاج کے روز افزوں رواج کا قدرتی نتیجہ یہ ہونا چاہیئے تھا کہ طب یونانی اور ویدک کا دائرہ اثر محدود ہو۔ چنانچہ یہی ہوا اور ہو رہا ہے۔ تاہم اس خیال سے کہ یہ دونوں اسلامی و ہندی تہذیب و تمدن کی نشانیاں

ہیں اور ہباا اوقات یہی قدیم طریقے اہل ہند کے معالجہ میں آب وہوا اور مزاج کی موافقت کی وجہ سے کامیاب ثابت ہوئے ہیں، اس بات کی ضرورت ہے کہ انکے زندہ رہنے کے اسباب فراہم کیے جائیں۔

دہلی و لکھنؤ میں مدت دراز سے احیاء طب یونانی و ویدک کے لیے غیر معمولی عملی کوششیں کیجا رہی ہیں، جو چند سال سے طبی کانفرنس کی شکل میں مستقل طور پر صورت پذیر ہو چکی ہیں۔ لاہور بھی کچھ دنوں سے اس باب میں غیر معمولی دلچسپی لے رہا ہے۔ اگرچہ اس میں شک نہیں کہ "پنجابی اشتہاری حکما" نے پبلک کو اچھے اچھے اطبا سے بدظن کر دیا ہے اور اکثر "پنجابی حکیم" کا لقب امثالاً بنظر تحقیر مستعمل ہونے لگا ہے، مگر اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ احاطہ پنجاب میں بعض قابل و حاذق اطبا اپنے فن شریف کی حفاظت و بقا کے لیے جان توڑ کوشش کر رہے ہیں اور وہ اپنی کارگذاریوں کے اعتبار سے ہر نوع مستحق مبارکباد ہیں۔ اس سلسلہ میں حکیم محمد فیروز الدین صاحب کا نام تشکر گزاری کے ساتھ لینا چاہیے جن کی مساعی جمیلہ سے اسوقت تک کئی مفید کتابیں فن طب کے متعلق نکل چکی ہیں، اور جن کی مشہور تالیف "رموز الاطبا" نہایت خوبی و اہتمام سے، حال میں، دوبارہ اشاعت پذیر ہوئی ہے۔

"رموز الاطبا" کے غائر مطالعہ کے بعد کہنا پڑتا ہے کہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے یہ ایک عجیب دلچسپ چیز ہے۔ حکیم صاحب موصوف نے اس میں یہ التزام کیا ہے کہ ہندوستان کے اکثر و بیشتر موجود الوقت اطبا اور ویدوں کے حالات جمع کیے ہیں بعض مشاہیر کے ہاف ٹون فوٹو بھی شامل کر دیے گئے ہیں۔ جن سے کتاب کی دیدہ زیبی اور نفاست کئی درجہ بڑھ گئی ہے۔ سب سے زیادہ کارآمد صفت اس کتاب کی یہ ہے کہ حالات کے بعد اطبا کے مجرب و آزمودہ نسخہ جات حاصل کر کے شامل کر دیے گئے ہیں۔ اور حقیقت میں یہی سب سے زیادہ مفید چیز ہے۔

یہ بالکل ممکن ہے کہ ان نسخہ جات میں بعض یا اکثر بیہدف ثابت ہوں لیکن اس قدر یقینی ہے کہ ان میں سے کئی "اسرار سینہ بسینہ" کے مترادف ثابت ہوں گے۔ حکیم مولوی محمد فیروز الدین صاحب مبارکباد کے لائق ہیں کہ ان کی یہ تالیف اس درجہ مکمل ہو کر نکلی ہے۔ بلا کلام انھیں اپنے معاصر اطبا کے سوانح فراہم کرنے میں غیر معمولی دقت کا سامنا کرنا پڑا ہوگا اور سب سے زیادہ دشواری اُنھیں ان نسخوں کے دستیاب کرنے میں پیش آئی ہوگی جن کے اس طرح افشا کرنے کی مشرقی طبائع مطلق عادی نہیں ہیں۔

حکیم صاحب نے جڑی بوٹیوں اور غیر معروف ادویہ کی تشریح بھی ایک فرہنگ کے ذریعہ سے کر دی ہے جس سے بہت امداد مل سکتی ہے۔

کتاب کی اصل قیمت بلا جلد ۶؍ اور رعایتی قیمت ۱۲؍ ہے۔ مجلد نسخہ کی کاپی غالباً ۸؍ کے اضافہ پر حاصل ہو سکتی ہے۔ جلد نہایت نفیس اور انگریزی وضع کی ہے، اور ضخامت تقریباً ایک ہزار صفحات۔ اور اس لحاظ سے قیمت میں یہ کچھ گراں نہیں۔ ملنے کا پتہ منیجر صاحب دار الکتب رفیق الاطباء، موچی دروازہ، لاہور۔

"سید القلم"

رُباعی

یہ عشرت و عیش و شادمانی کب تک — عشرت بھی سہی تو نوجوانی کب تک
گر یہ بھی سہی قیام دولت ہے کہاں — دولت بھی سہی تو زندگانی کب تک

انیس لکھنوی

عصریات

موجودہ نمبر سے یہ جدید عنوان قائم کیا جاتا ہے۔ اسکے تحت میں بالالتزام مفید علمی نوٹ درج ہوا کریں گے۔ یہ نوٹ عموماً مختلف علوم وفنون اور جدید انکشافات کے متعلق ہوں گے۔ ہماری خواہش ہے کہ اپنے ناظرین کی خدمت میں ادبی، تاریخی، اور علمی مضامین پیش کرنے کے علاوہ اُن کے لیے تازہ معلومات کا ذخیرہ بھی فراہم کریں۔ اگر ناظرین نے اس عنوان کو قدر کی نگاہ سے دیکھا تو ہم اسکے صفحات کی تعداد میں اَور اضافہ کردیں گے۔ (ایڈیٹر)

پروفیسر جے۔ سی۔ بوس کی تحقیق

فیفر اور ہاربرلینٹ (Pfeffer & Harberlandt) نے جو نباتات کے علم افعال الاعضا کے ماہرین میں نہایت ممتاز درجہ رکھتے ہیں مجتہدانہ طور سے بتایا تھا کہ مِموسا (Mimosa) ایسے پودوں پر تحریک کا اثر اس طرح نہیں ہوتا جس طرح حیوانات کے اعصاب پر ہوتا ہے۔ ان علماء کے مقتدر درجہ کی وجہ سے تمام دُنیا نباتات اور حیوانات میں علم افعال الاعضا کے نقطۂ نظر سے یہی مابہ الامتیاز سمجھتی رہی۔ مگر پروفیسر بوس نے ثابت کیا ہے کہ جس طرح حیوانات کے اعصاب میں حرکت ہوتی ہے اُسی طرح نباتات میں بھی ہوتی ہے۔ اس انکشاف میں ایک نو ایجاد آلہ کی مدد سے بہت کامیابی ہوئی ہے جس میں نہایت نفیس قوتِ حِس رکھی گئی ہے۔ اس قوت کی وجہ سے یہ آلہ خود بخود تحریک کا اثر اور اعصابی حرکت کی رفتار لکھتا جاتا ہے۔ یہ "صوت نگار" (Resonant-Recorder) سیکنڈ کا $\frac{1}{1000}$ حصہ تک بتا دیتا ہے۔ اس کے ذریعہ سے معلوم کیا گیا ہے کہ پودے کو کسی خارجی صدمہ کے محسوس کرنے میں سیکنڈ کا $\frac{1}{10}$ حصہ درکار ہے۔ جس طرح حیوانات کا وقفۂ احساس حالات کے لحاظ سے بدلتا رہتا ہے اُسی طرح مِموسا کا وقفۂ احساس بھی مختلف حالتوں میں مختلف ہوتا ہے۔ حرارت سے یہ رفتار بڑھتی اور سردی سے گھٹتی ہے نیز جس طرح حیوانات میں کیمیائی، برقی، اور حرارتی ذرائع سے حرارت تیز، کم، یا بالکل بند ہوسکتی ہے اُسی طرح مِموسا کی اعصابی حرکت پر بھی ان ذرائع کا اثر ہوتا ہے۔ مختلف زہریلی اور سُن کرنیوالی ادویات کا بھی اُسکے اعصاب کی حرکت کو سُست یا سلب کرنے میں اثر معلوم ہوا ہے۔ کچھ شک نہیں کہ اس انکشاف سے بہت سے مفید نتائج مترتب ہوں گے۔

ہماری دیسی زبانیں اور یونیورسٹیاں

سر تھیوڈور ماریسن نے حال میں انڈیا ہوس میں لیکچر دیتے ہوے اس مسئلہ کی تائید کی ہے کہ ہندوستانی یونیورسٹیوں میں تعلیم دیسی زبانوں کے ذریعہ سے ہونی چاہیے۔ آپ نے فرمایا کہ "ہمیں ہندوستان میں ایسی یونیورسٹیاں بنانا چاہییں جو دیسی زبان میں تعلیم دیں۔ اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ انگریزی تعلیم ہندوستانیوں کے حق میں مفید ثابت ہوئی ہے، اور مغربی خیالات نے ہندوستانیوں کے دماغ کو ایک مفید رستہ پر لگا دیا ہے، لیکن یہ اثر زیادہ مفید اور وسیع ہوتا اگر یہ خیالات مادری زبان کے ذریعہ سے شائع کیے جاتے۔ انگریزی زبان کو ذریعہ تعلیم قرار دینے سے یہ نقصان ہوا ہے کہ ہندوستانیوں کے علم اور خیالات سے اگرچہ تمام دُنیا فائدہ حاصل کررہی ہے مگر خود ہندوستان کی زبانیں اور دیسی زبانیں استعمال کرنے والے لوگ اس سے بہرہ ور نہیں ہوسکتے۔ طالب علم کے لیے ایک بڑی مشکل ترجمہ کی ہے، کیونکہ اکثر الفاظ کے ٹھیک معنی دوسری زبان میں ادا نہیں ہوسکتے۔ ہمیں یونیورسٹیوں میں دیسی زبانوں کی توسیع و ترقی کی کوشش کرنا چاہیے تاکہ وہ ہندوستانیوں کے خیالات و جذبات کا صحیح ذریعہ بن سکیں۔" سر تھیوڈور کی یہ راے اس قابل ہے کہ ہمارے مُلک کی یونیورسٹیاں اسپر غور کریں۔

منجمد تیل بطور ایندھن

یورپ میں یہ کوشش کیجارہی ہے کہ جہازوں میں بجائے ایندھن کے منجمد پٹرولیم استعمال کیا جائے۔ پٹرولیم کو جوش دے کر صابن، شراب، اور دیگر ادویات کی مدد سے منجمد کرنے میں کامیابی ہوئی ہے۔ اسکو مربع اینٹوں کی شکل میں ڈھال لیتے ہیں جو ٹھنڈی ہونے پر گلیسرین صابون کی طرح شفاف رہتی ہیں۔ یہ اینٹیں بھربھری یا کڑکول نہیں ہوتیں، اور نہ ان پر موسم کا کچھ اثر ہوتا ہے۔ اس لیے ان کو اٹھانے رکھنے، یا لیجانے میں ذرا بھی دقت نہیں ہوتی۔ یہ منجمد تیل بہت آہستہ جلتا ہے اور حرارت بھی اس میں کافی ہوتی ہے، ایک ٹن پٹرولیم کی حرارت ڈھائی ٹن کوئلہ کی حرارت کے برابر ہوتی ہے۔ برطانیہ کے بحری انجینیروں نے اس منجمد تیل کی بہت تعریف کی ہے، اور بتایا ہے کہ جہازرانی کے لیے اس انکشاف سے ایک عمدہ مستقبل کھل گیا ہے۔

انگلستان کا ملک الشعرا

چاسر کے وقت سے، جو ۱۳۶۰ء میں انگلستان کا ملک الشعراء قرار دیا گیا تھا آج تک انگلستان میں یہ عہدہ نہایت ممتاز سمجھا جاتا ہے۔ کئی بار اس عہدے کے انتخاب میں حق تلفی بھی ہوئی ہے۔ چنانچہ ہنری جیمس پائی کی نسبت، جو ۱۷۹۰ء سے ۱۸۱۳ء تک ملک الشعرا رہا، بائرن کو یہ کہنا پڑا کہ "پائی کی ہر بات نہایت قابل وقعت ہے، مگر نظم"۔ ملک الشعرائی کے مسئلہ پر ٹینی سن کے انتقال (۱۸۹۲ء) پر بہت گرم بحث چھڑی تھی جو مرحوم الفرڈ آسٹن کے تقرر سے بہت جلد ختم ہو گئی۔ اس سال مسٹر الفرڈ آسٹن کے انتقال ہونے پر اسی زور شور کے ساتھ یہ سوال پھر اٹھا۔ مگر اسی سرعت اور آسانی سے فیصل بھی ہو گیا۔ اس باب میں مسٹر آسکوتھ کی تدبیر قابل تعریف ہے۔ یہ عہدہ اب ڈاکٹر رابرٹ برجز (Dr. Robert Bridges) کو دیا گیا ہے، جو پولیٹکل شاعر نہونے کی وجہ سے لبرل اور کنسرویٹو دونوں فرقوں سے الگ ہیں۔ لیکن تعجب ہے کہ انگلستان ایسے ملک میں بھی فن سخن کی کافی قدر نہیں کیجاتی۔ وہاں اس عہدے کے لیے صرف ۹۹ پونڈ سالانہ پنشن مقرر ہے۔

نئی موت

علم افعال الاعضاء میں انٹر سلیولر لائف Inter-Cellular Life (یعنی وہ زندگی جو جسم کی ان مفرد کوٹھریوں میں پائی جاتی ہے جو جسم کی اکائی مانی گئی ہیں) کا نظریہ بہت مدت سے شامل ہے۔ اسکی بنیاد پر کہنہ زخمیوں کا علاج تندرست جگہ کی کھال کا پیوند زخم پر لگانے سے کامیابی کے ساتھ ہوا ہے۔ ڈاکٹر کیرل کے تجربات سے معلوم ہوا تھا کہ جسم کے جو اجزا ظاہر میں مردہ معلوم ہوتے ہیں، وہ حقیقت میں بہت مدت تک زندہ رہ سکتے ہیں۔ مگر کیرل کے جدید تجربات سے اب یہ ثابت ہوا ہے کہ بعض اعضاء ظاہری موت کے بعد بھی اپنا وہ اصلی فعل پورا کر سکتے ہیں جسکے لیے وہ مخصوص تھے۔ مثلاً معدہ کھانا ہضم کر سکتا ہے، پھیپھڑے سانس لے سکتے ہیں، وغیرہ۔ ڈاکٹر کیرل کا قول ہے کہ موت کوئی فوری تغیر نہیں ہے جیسا کہ ہم خیال کرتے ہیں۔ انھوں نے امید دلائی ہے کہ ممکن ہے کہ ایک درجہ ترقی کا اور طے کرنے پر ہوش و حواس بھی دوبارہ قائم ہو سکیں۔ جلد کے نیچے پچکاری لگا کر کچھ عرصہ سے ڈاکٹر قلب کی حرکت حالت اصلی پر لا سکتے ہیں۔ چنانچہ ایک فرانسیسی ڈیوک کا واقعہ ہے کہ اسکا انتقال دس بجے شب کو ہوا۔ بارہ بجے شب کو اسکا بیٹا سن بلوغت کو پہنچتا۔ ان دو گھنٹے کی کمی کے باعث تمام جائداد قانونی پھندوں میں الجھ جاتی۔ فوراً جلدی پچکاریاں لگائی گئیں، دل حرکت کرنے لگا۔ سانس آنے جانے لگی۔ اس طرح از سر نو زندگی اسے حاصل ہوئی اور وہ ضرورت سے پاؤ گھنٹہ زیادہ زندہ رہا۔

ادراک حیوانی

آج کل جرمنی کے ایک بولنے والے کتے کا بہت چرچا ہے۔ اس کتے کا نام "ڈان" ہے۔ اسکو جرمنی زبان کے چند لفظ یاد ہیں۔ جب اس سے دریافت کیا جاتا ہے کہ تمھارا کیا نام ہے؟ تمھارا کیا حال ہے؟ تو وہ کہتا ہے "ڈان" "بھوک"۔ اسی طرح چند اور سوالات کا جواب دیتا ہے۔ جرمنی کے فلسفیوں نے اس امر کی فلسفیانہ تحقیق کی ہے، اور انھوں نے نطق کی

تین قسمیں قرار دی ہیں :-

(۱) حلق سے ایسی آوازیں پیدا کرنا جس سے سامع اُس مفہوم سے واقف ہو جائے جس سے خود متکلم آگاہ ہے۔

(۲) حلق سے ایسی آوازیں پیدا کرنا جو دوسری آوازوں کی نقل ہوں، مگر سامع ان کا مفہوم نہ سمجھتا ہو۔

(۳) ایسی آوازیں نکالنا جو نطق انسانی کی نقل نہ ہوں، مگر سامع کو لفظ بامعنی کا دھوکا ہو۔

مسٹر فنگسٹ (Pfungst) نے ڈوان کے الفاظ نطق کی تیسری نوع کے تحت میں رکھے ہیں۔ کیونکہ سوالات کی ترتیب بدل دینے سے وہ اپنے جوابات کی ترتیب نہیں بدلتا، گویا خود اپنے الفاظ کے معنی نہیں سمجھتا اُسکے لہجہ میں بھی تغیر نہیں ہوتا جو نقل کی صورت میں ہونا چاہیے۔ مسٹر فنگسٹ نے اس مضمون پر جانوروں کے افعال دماغی سے بحث کرتے ہوئے، کارل کیرال کی کتاب THINKING ANIMAL (سوچنے سمجھنے والے جانور) کا حوالہ دیا ہے جس میں دو گھوڑوں کے جمع، تفریق، ضرب، تقسیم جاننے کا حال مذکور ہے :-

یہ گھوڑے جزر، جزر الکعب، جزر الربع، اور جزر الخمس تک بتا سکتے تھے۔ فرنچ فلاسفک سوسائٹی نے اس معاملہ پر بہت غور کیا تھا۔ بعض کی رائے تھی کہ کوئی شعبدہ یا لاگ ہے۔ مسٹر کونٹن نے خود جزر الخمس کے سوالات کا جواب چند لمحہ میں دے کر لوگوں کو متعجب کیا اور بتایا کہ اس قسم کے جزر کے لیے ایسے عدد کی ضرورت ہے جس کا جزر پورا حاصل ہو، اور یہ تحریر بیان کیا کہ جزر الخمس میں اصل عدد کی اکائی ہی جزر ہوگی۔ مثلاً ۳۲ کا جزر الخمس ۲ ہے، ۲۴۳ کا ۳۔ جزر الکعب کا قاعدہ بھی بتایا کہ ۱-۴-۵-۶-۹ کے کعب میں اکائیاں بھی عدد ہی ہوں گی۔ ۲-۳-۷-۸ کے کعب کی اکائیاں ۸-۷-۳-۲ ہوں گی اور جواب ۱۰ میں سے تفریق کرنے نکلے گا۔ مگر مسٹر کونٹن نے کہا کہ میں یہ وثوق کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ ایلبرفیلڈ کے گھوڑوں کی ریاضی دانی کا بھی یہی راز تھا۔ مسٹر فنگسٹ کی رائے ڈوان کے بابت بہت مدلل خیال کی گئی ہے۔

مہلک تشنج پیدا کرنیوالے کیڑے

بہت مدت سے بخار، طاعون، ہیضہ، اور دق وغیرہ کے اجرام کا انکشاف ہوچکا ہے۔ ایک خردبینی کیڑا ٹیٹانس بکی لس (Tetanus Bacillus) دریافت ہوا ہے۔ اس کیڑے کے جسم میں داخل ہونے سے نہایت مہلک اور خوفناک علامات ظاہر ہوتی ہیں۔ پہلے بخار ہوتا ہے، پھر تمام جسم میں اعضا شکنی شروع ہوجاتی ہے، گردن اور پیٹھ کے عضلات پر سخت تشنج طاری ہوتا ہے۔ یہ مرض ۱۲-۳۶ گھنٹے کے درمیان مریض کا کام تمام کردیتا ہے۔ یہ کیڑے عموماً کھیتوں اور شفاخانوں کی زمین میں پائے جاتے ہیں، اور زخم یا خراش کے ذریعہ سے جسم میں داخل ہوتے ہیں۔ گذشتہ ششماہی میں ہندوستان میں اس مرض کی اموات کی تعداد غیر معمولی رہی ہے۔ ان میں اکثر پہلوان بھی تھے، اور تحقیقات سے معلوم ہوا کہ ہاتھ پاؤں میں خفیف خراش ہونے کی حالت میں اُنھوں نے اکھاڑے میں ورزش کی تھی۔

تحقیقات کا مستقبل

ڈاکٹر بوس کا ایک مضمون حال میں بنگال ایجوکیشنل جرنل میں شایع ہوا ہے، جس میں اُنھوں نے بتایا ہے کہ ہندوستانی یونیورسٹیوں میں تعلیم کے ساتھ تحقیق کی بھی نہایت ضرورت ہے۔ وہ سوال کرتے ہیں کہ کیا ہماری یونیورسٹیوں کا منتہاے خیال صرف یہی ہے کہ وہ غیر ممالک کی یونیورسٹیوں کے لیے طلبا تیار کریں؟ کیوں یہ کوشش نہیں کیجاتی کہ بیرونی یونیورسٹیوں سے طلبا ہماری یونیورسٹیوں میں آیا کریں؟" اُنھوں نے بجاطور پر کہا کہ "علم مفید اور کارآمد نہیں ہوسکتا تاوقتیکہ تعلیم اور تحقیق دونوں ساتھ ساتھ نہ ہوں۔ صرف لیبوریٹریوں سے کام نہیں چلتا، خواہ وہ کتنی ہی شاندار کیوں نہ ہوں۔ اصل چیز طلباء کے دل میں تحقیقات کی ایک دُھن پیدا کرنا ہے۔" آخر میں ڈاکٹر بوس نے چند وجوہ کی بنا پر ہندوستان میں تحقیقات کا بہت شاندار مستقبل ہونے کی امید دلائی ہے اُنھوں نے بتایا ہے کہ

۱- جو سہولتیں ہندوستان کو گرم ملک ہونے کی حیثیت سے سائنس کی

ضروریات کی فراہمی میں حاصل ہیں، وہ سرد ممالک کو حاصل نہیں۔

۲- ہندوستان کے طلبا کا دماغ تحقیقات اور تجربات کی خاص صلاحیت رکھتا ہے۔

۳- اُن میں صبر و استقلال، جفاکشی اور فہم بدرجۂ اتم موجود ہیں، اسلیے اگر وہ کوشش کریں گے تو دُنیا کے علوم میں معتد بہ اضافہ کر سکیں گے۔

علم سکھانے کی مشین

اہل امریکہ عرصہ سے اِس امر پر غور کر رہے تھے کہ کس طرح انسانی دماغ میں تمام باتیں جو انسان پڑھتا یا سُنتا ہے، محفوظ ہو جاتی ہیں، اور وہ کون سی طاقت ہے جو تمام دُنیا کے علم کو جذب رکھتی ہے۔ اسکا حال امریکہ والوں نے معلوم کر لیا ہے۔ ایک ایسے شخص کو جو بالکل ہی جاہل مطلق ہوتا ہے لا کر ایک کمرے میں بٹھا دیتے ہیں اور ایک برقی ٹوپی جو انگریزی ٹوپی سے بہت مشابہ ہے سر پر رکھ دی جاتی ہے، اور خاص قسم کا بنا ہوا کپڑا ٹوپی سے لگا کر کمر تک لٹکا دیا جاتا ہے۔ اور بائیں ہاتھ کی جانب گراموفون رکھ کر بجاتے ہیں۔ اسکے ریکارڈ چھ فٹ قطر سے زیادہ ہوتے ہیں جنمیں مختلف علوم کی کتابی عبارتیں معمولی گانیوالے ریکارڈوں کی طرح محفوظ ہوتی ہیں۔ معمول غور سے کرسی پر بیٹھا ہوا لفظ بلفظ سنتا ہے اور سر کی برقی ٹوپی میں حرکت ہوتی رہتی ہے۔ جوں ہی ریکارڈ ختم ہوا معمول پر بیہوشی طاری ہو گئی۔ تھوڑے عرصہ تک اُسکے اوسان بجا نہیں رہتے، مگر بعد ازاں وہ اُس کتاب کو ابتدا سے انتہا تک حرف بحرف سُنا دیتا ہے اور پھر کبھی نہیں بھولتا۔ گورنمنٹ امریکہ نے اِس امر کا فیصلہ کر دیا ہے کہ آئندہ یوں ہی تعلیم دی جائے گی۔ چنانچہ مقررہ کورس کے ریکارڈوں کی تیاری کے لیے پانچ لاکھ پونڈ کی منظوری دی گئی ہے۔ حساب سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتدائی درجہ اسکول کی تعلیم سے لے کر کالج کی آخری تعلیم تک صرف چھ ماہ کا زمانہ صرف ہوگا، اور یوں امریکہ کی تمام آبادی دو سال کے اندر پوری لکھی پڑھی ہو جائے گی۔

ستاروں کی حرارت

اس بات سے تقریباً سب لوگ واقف ہیں کہ چھوٹے چھوٹے ٹمٹماتے ستارے در اصل سُورج ہیں، جو ہمارے سُورج کی طرح اپنے اپنے نظام شمسی کو سنبھالے ہوئے ہیں۔ اِن کے گرد اور چھوٹے ستارے، جو دُور ہونے کی وجہ سے ہمیں نظر نہیں آتے، گھومتے رہتے ہیں۔ حال میں جرمن کے ایک مشہور منجم، ڈاکٹر روزن برگ، نے ستّر ستاروں کا ٹمپریچر لیا ہے۔ اِن ستاروں کے درجۂ حرارت کا اندازہ سپکٹرم کے مختلف حصّوں کی شوخ رنگت سے ہو سکتا ہے۔ انکا بیان ہے کہ ہمارے سُورج کی حرارت ۴۹۵۰ سنٹی گریڈ ہے۔ اِن ستّر ستاروں میں سے سب سے سرد ستارے کی حرارت ۲۱۵۰ درجہ ہے، اور ایک کی حرارت تو ۴۰۰۰۰ درجہ سے بھی زیادہ ہے۔

پاگل حساب داں

نیننس کے پاگل خانہ میں ایک پاگل ہے جو غضب کا شمار کنندہ ہے، یوں تو وہ حروف تہجی بھی بمشکل پڑھ سکتا ہے لیکن جس پھرتی سے وہ سوالات کے جواب دیتا ہے اُس سے سخت حیرت ہوتی ہے۔ ذکر ہے کہ ایک روز امتحاناً اُس سے دریافت کیا گیا کہ ۳۹ سال ۵ ماہ ۱۲ دن کے کتنے سیکنڈ ہوتے ہیں تو اس کا جواب اُس نے نصف منٹ سے بھی کم میں دے دیا۔ پھر اُس سے دریافت کیا گیا کہ ۲۰ سال میں کتنے سیکنڈ ہوتے ہیں تو اسکا جواب اُس نے ۴ سیکنڈ میں دیا۔ پھر سوال کیا گیا کہ دس ارب سیکنڈ کے کتنے سال اور مہینے وغیرہ ہوئے تو اس کا جواب اُسنے ۴۸ سیکنڈ میں دیا۔ لطف یہ ہے کہ یہ شخص دیوانگی کی حالت میں تندرستی کی نسبت زیادہ پھرتی سے جواب دیتا ہے۔ شاید کچھ دن بعد علمائے سائنس اسکی وجہ بتا سکیں گے۔

ہنسی

پیرس کے ایک ڈاکٹر جو علم صوت کے ماہر ہیں بیان کرتے ہیں کہ ہنسی سے انسان کے اطوار و خصائل معلوم ہو سکتے ہیں۔ اگر کسی کی ہنسی میں اے کی آواز نکلتی ہو جیسے کہ لفظ آہا تو وہ شخص وفادار اور نڈر ہے۔ اگر ای کی آواز نمایاں ہو تو وہ سست اور مغموم ہوتا ہے۔ اگر او کی آواز نمایاں پائی جائے تو وہ شریر مگر خوش مزاج اور مجنون ہے۔ اگر اُو کی آواز نمایاں ہو تو بنی انسان کا دشمن و بدخواہ ہے۔

فسانۂ عبرت

ایک دن شہرِ خموشاں میں ہوا میرا گزر		حسرت و عبرت کے ساماں چار سو آئے نظر
کھوپڑی بوسیدہ کہنہ اک پڑی تھی خاک پر		میں نے پوچھا اُس سے گزرا ماجرا با چشمِ تر

رو کے بولی میں حسینِ ماہ پیکر تھا کبھی
گُل عذار و لالہ رُو رشکِ صنوبر تھا کبھی

سنبلِ پیچاں سے بہتر تھے مرے پُرپیچ بال		رنگ و بو میں لالہ و گُل سے فزوں تر میرے گال
مشکِ چین و عنبرِ سارا سے بڑھکر خط و خال		ماہِ کامل لوحِ پیشانی تو ہر ناخن ہلال

شکل و صورت حسن و رعنائی میں کامل فرد تھا
مرہمِ زخمِ جگر دارو ئے اہلِ درد تھا

ایک عالم حلقۂ زلفِ دوتا میں تھا اسیر		آستاں پر جبہہ سا دن رات سلطان و وزیر
ترکشِ چشمِ فسوں پرواز میں جادو کے تیر		ماہِ کامل کوئی کہتا تھا کوئی بدرِ منیر

سیکڑوں مرتے تھے اعجازِ لبِ جاں بخش پر
سیکڑوں جیتے تھے میری شکل و صورت دیکھکر

ابرو خمدار تھی محراب یا بانکی کماں		موے مژگانِ سیہ تھے نوکِ پیکانِ سناں
تھیں نشیلی سرمگیں آنکھیں کہ تیغِ اصفہاں		موتیوں سے دانت پر برقِ درخشاں کا گماں

لعلِ لب سے حمرتِ لعلِ بدخشانی خجل
عارضِ تاباں سے نورِ ماہِ کنعانی خجل

قامتِ موزوں جوابِ سرو و شمشادِ جناں		شوخیِ رفتار سے ہنگامۂ محشر عیاں
ناز و انداز و ادا چھل بل پہ صدقے نفس و جاں		حسن و رعنائی پہ قرباں جانِ پاکِ قدسیاں

وہ حسیں تھا صانعِ قدرت کو جس پر ناز تھا
حُسن و زیبائی میں یکتا شاہدِ طنّاز تھا

سر سے پا تک مثلِ شمعِ طور ٹپکا نور کا		نور کے سانچے میں تھا سارا بدن میرا ڈھلا
خامۂ قدرت نے کھینچا وہ پری نقشہ مرا		حُسن انداز و ادا و ناز میں بے مثل تھا

دیکھکر صورت نہ اپنے ہوش میں مانی رہے
خامۂ بہزاد کو تا حشر حیرانی رہے

بن سنور کر جب کسی جانب گزر اپنا ہُوا		زیرِ پا عشاق نے رستے میں دیں آنکھیں بچھا
کوئی صدقے چال پر گفتار پر کوئی فدا		طالبانِ دید کا تھا چار سُو میلہ لگا

سیکڑوں اُلجھے تھے دل گیسوے عنبر فام میں
طائرانِ قدس پھنس جاتے تھے اپنے دام میں

جب ہوئی دشمن زمیں اپنی مخالف آسماں		آئیں پیہم صرصرِ فوت و فنا کی آندھیاں
گلشنِ حُسن و جوانی ہوگیا وقفِ خزاں		لشکرِ غم نے کیا پامال مُلکِ جسم و جاں

زور و قوت مال و دولت سب اکارت ہوگیا
کیا ہرا بھرا پھولا چمن دم بھر میں غارت ہوگیا

گلشنِ جنت کو مرغِ جاں روانہ ہوگیا		اُڑ گیا بُلبُل تو ویراں آشیانہ ہوگیا
درہم و برہم وہ سارا کارخانہ ہوگیا		اپنے بیگانے بنے دشمن زمانہ ہوگیا

عیب کی صورت چھپایا لاکے کُنجِ خاک میں
رہ گئے ارمان لاکھوں خاطرِ غمناک میں

تیرہ و تاریک پست و تنگ و ویراں مکاں		روشنی کا اور ہوا کا دخل ناممکن جہاں
سیکڑوں کیڑے مکوڑے سانپ بچھو جانستاں		ہیبت و دہشت سے جنگلی کانپ جائے جسم و جاں

تھی سراپا ظلمت و وحشت شبِ تاریکِ گور
حسرت و عبرت جو مونس تھی تو ہمدم مار و مور

فاتحہ پڑھنے کو بھولے سے نہ آیا پھر کوئی		مٹ گئی مرتے ہی اپنے سب وہ رسمِ دوستی
ہوگیا جھوٹا فسانہ ذکرِ حُسن و عاشقی		تیرگی چھائی مٹی وہ چار دن کی چاندنی

جز غم و اندوہ و حسرت مونس و غمخوار کون
جز خدا کی ذات تھا اپنا رفیق و یار کون

زیست میں تھے سیکڑوں اُلفت جتانے کیلیے		ظلم و ایذا ناز اور غمزے اُٹھانے کیلیے
کون لایا پھول تربت پر چڑھانے کیلیے		ایک بھی آیا نہ دو آنسو بہانے کیلیے

رشتۂ مہر و محبت ہاے توڑا موت نے
چلتی گاڑی میں دیا اڑکا یہ روڑا موت نے

چشم و ابرو گوش و بینی فرق و دندان و دہاں صدر و ساعد دوش و بازو عارض و کام و زباں
پنڈلیاں نازک بھری رانیں وہ پتلی انگلیاں عقل و ہوش و حلم و تمکیں ہمت و تاب و تواں
کھا لیا کیڑوں نے سب بیکار اعضا ہو گئے
نور کی مورت سے اب مٹی کا پتلا ہو گئے

مٹ گیا سب نقشِ باطل کی طرح حسن جمال حسن و رعنائی ادا و ناز و غمزہ خط و خال
لٹ گئیں وہ عنبریں زلفیں مٹے وہ گل سے گال راہ چلتے ٹھوکروں سے کرتے ہیں پامال
سیکڑوں یوسف لقا دیں جان جسکی چاہ میں
حیف وہ سر ٹھوکریں کھاتا پھرے یوں راہ میں

ہستیٔ موہوم پہ نازاں نہ ہو انساں کبھی چند روزہ عیش و عشرت کا نہ ہو خواہاں کبھی
دے نہ ان کافر بتوں کو دولتِ ایماں کبھی جلوۂ رخسارِ خوباں پر نہ ہو حیراں کبھی
رات دن دل میں خیالِ خالقِ اکبر رہے
ہر گھڑی لب پر ثنائے شافعِ محشر رہے

الفتِ گیسوئے عنبر فام کا سودا عبث مہ رخوں کے عارضِ پر نور کا چرچا عبث
عشق قد میں ہر گھڑی محشر ہے برپا عبث شوخیِ رفتار پر انساں نہ ہو شیدا عبث
کیوں گنوائے جان عشقِ شاہدِ طناز میں
کیا دھرا ہے عشوہ و غمزہ ادا و ناز میں

مٹنے والی چیز ہے عشق و محبت ہے فضول دین کھو کر جستجوئے مال و دولت ہے فضول
کم ہوں جو طاقت میں انپر زور و قوت ہے فضول خاکساروں عاجزوں سے کبر و نخوت ہے فضول
لطف و خلق و حلم سے ملتا ہے ماں باپ سے
مثلِ کوثر جانے ہر ادنیٰ کو اعلیٰ آپ سے

کوثر خیرآبادی

جوانی اور بُری صحبت

کچھ نہ پوچھ اے ہمنشیں مجھ سے کہ میں نے کیا کیا اِس جوانی نے زمانہ میں مجھے رسوا کیا
تو نے چھیڑا ہے سرِ محفل تو سن لے کیفیت حسرت و ارمان نے اس طرح سے اندھا کیا
راہ چلتے چلتے اک بے مہر پر عاشق ہوا سامنے احباب کے جب تک کہ اُس ہنستا کیا
دشمنِ جاں ہو گئے افسوس وہ بنکر رقیب مجھ سے برگشتہ اُسے اُن سب نے پھر ایسا کیا
نام لینے سے مرا اُسکو تھی نفرت ہو گئی اُسکی صورت بزم میں حیرت سے میں دیکھا کیا
دردِ دل کہنے جو بیٹھا پڑ گئے چتون پہ بل آہ کی میں نے تو اُسنے حشر اک برپا کیا
مدتوں اس طرح سے کاٹا کیا شام و سحر سامنے آیا کبھی۔ مجھسے کبھی پردا کیا
رفتہ رفتہ عشق میں اُسکے ہوا مجھکو جنوں بڑھتے بڑھتے اسکی الفت نے مجھے سودا کیا
رات بھر آتی نہ تھی مجھکو شبِ فرقت میں نیند بسترِ غم پر کبھی لوٹا کبھی تڑپا کیا
بنکے سودائی چلا گھر سے میں جنگل کیطرف وادیٔ وحشت میں مجھکو بیکس و تنہا کیا
میں اُسی حالت میں پھرتا تھا کہ جاگے پھر نصیب حق نے اُس جنگل میں مردِ غیب اک پیدا کیا
دیکھکر حالت مری رویا وہ پہلے زار زار کیا کروں تدبیر اپنے دل میں وہ سوچا کیا
چھوڑ کر تنہا مجھے بستی کی آخر راہ لی اور حسینانِ جہاں کو غور سے دیکھا کیا
ناگہاں آئی نظر اُسکو وہ شکلِ دلفریب حسن نے جسکے تھا عالم میں مجھے اندھا کیا
میری خاطر سے بڑھایا اسنے اُس سے ربط و ضبط رفتہ رفتہ بزم میں بھی یار کی جایا کیا
ایک دن تنہا اُسے پا کر یہ اُس نے عرض کی ایک بیکس پر ستم کیوں آپ نے ایسا کیا
لیگیا جنگل سے مجکو پھر کے رہبر بزم میں وہ مجھے دیکھا کیا اور میں اُسے دیکھا کیا
کچھ محبت کی نظر تھی کچھ ادا میں شرم تھی سر جھکائے سوچتا تھا وہ کبھی یہ کیا کیا
چھیڑ کی باتیں ہوائیں دیر تک شکوے رہے بعد اسکے پھر تو شغلِ ساغر و مینا کیا
چاندنی شب میں کبھی صحنِ چمن میں جشن تھا اُسکے کہنے سے کبھی خیمہ لبِ دریا کیا
کامیابی دیکھکر یہ پھر طبیعت چل پڑی پھر بُری صحبت نے میرے دل میں گھر اپنا کیا
رات دن احباب سب رہتے تھے میرے ساتھ ساتھ راہ چلنے میں حسینوں کو سدا گھورا کیا
ایک تو جوشِ جوانی دوسرے صحبت خراب سر پہ جن کے یا پری نے خلق میں سلا کیا
جس طرف جاتا تھا سودائی مجھے کہتے تھے لوگ دوستوں نے دوستی کا حق ادا اچھا کیا
ابتدائے عشق کا یہ واقعہ تھا ہمنشیں نوجوانی کی بدولت عمر بھر رویا کیا
کوئی دنیا میں نہ چھوٹا حیف تجھ سے فعلِ قبیح جو نہ کرنا تھا زمانہ میں ترے تنہا کیا
ابتدا میں کس لیے سوچا نہ میں انجامِ عشق ساتھ اپنے غیر کو بھی میں نے کیوں رسوا کیا
چشم سے جاری نہ ہوں اشکِ ندامت کس طرح حیف ہے دل میں نہ میں نے کچھ غمِ فردا کیا

روسیاہی کیا کہوں اپنی وہ اک طوبار ہے   شرم دامنگیر ہے ہر فعل ہے ایسا کیا
کانپ جاتا ہوں جو یاد آتی ہے اپنی سرگذشت   اور کفِ افسوس ملتا ہوں میں نے کیا کیا
سخت حیرت ہے کہوں کیا خضر کی ملت کیا   جسنے دنیا میں مجھے نہان ہے پیدا کیا
چُپ ہوا گر میں تو یہ اعضا کہینگے نیک و بد   عمر بیسے کاٹی منھ کس کس سے ہے کالا کیا

بابِ توبہ ہے کھلا کہتے ہیں یہ موے سفید
جلد توبہ کر ارے جو کچھ کیسا اچھا کیا

ماہر لکھنوی

جان لیوا ہار

اندومتی راجہ اِندر کے اکھاڑے کی پری تھی۔ کسی قصور پہ اُس کو یہ سزا دی گئی تھی کہ تو قالبِ انسانی اختیار کرے گی۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا گیا کہ اگر تیرے جسم سے کوئی آسمانی شے مَس کریگی تو تو فوراً اپنی اصلی حالت پر آجائیگی۔ اندومتی قالبِ انسانی اختیار کرکے راجہ آج کی رانی ہوئی۔ راجہ اور رانی دونوں باغ میں محوِ عیش و عشرت تھے کہ اتفاق سے نارومنی کا ہار اندومتی پر گر پڑا۔ نارومنی آسمان پہ پرواز کر رہے تھے۔ ہار کے مَس ہوتے ہی اندومتی کی روح پرواز کر گئی، جسے دیکھکر راجہ آج کے حیرت اور رنج و ملال کی کچھ انتہا نہ تھی۔ ذیل کی نظم اِسی قصہ سے تعلق رکھتی ہے۔

ہار تو آہ تو نہیں، قہرِ خدا اگر ہے تو   ہار تو آہ تو نہیں، برقِ بلا مگر ہے تو
ہار تو آہ تو نہیں، تیغِ جفا اگر ہے تو   ہار تو آہ تو نہیں، دامِ قضا مگر ہے تو

زہر اثر ہیں اُف، تری نکہتِ خوشگوار ہے
حلقۂ خوشنما ترا حلقۂ جسمِ مار ہے!

گرتے ہی تیرے چرخ سے ہائے یہ کیا غضب ہوا   تیرا نزول، باعثِ رنج و غم و تعب ہوا
تجھ ہی سے آج ستمِ نصیبِ خستہ و جاں بلب ہوا   اندومتی کی موت کا حیف! تو ہی سبب ہوا

آکے شگفتگی ایسی کچھ تو نے ہرے باغِ خلد
راہیِ خلد ہو گئی ایک فدا سے باغِ خلد

ہائے یہ کیوں حجاب ہے؟ اندومتی کہاں ہے تو   گو ہے نظر کے سامنے پھر بھی تو اُف نہاں ہے تو
حیف کہ اب بھی باعثِ حیرتِ قلب و جاں ہے تو   تو ہی بتا زمیں پہ یا برسرِ آسماں ہے تو؟

وہم سے کیا عذاب ہے، زیست اِدھر محال ہے
خوف اُدھر جو مر کے بھی پھر نہ ترا وصال ہو!

اب بھی تو باغِ حسن میں تیرے وہی بہار ہے   اب بھی وہی ادائے مست سلبِ کنِ قرار ہے
اب بھی وہی ہے آن بان اب بھی وہی نکھار ہے   اب بھی تو شانِ دلبری شکل سے آشکار ہے

یہ تو ہے سب، مگر دریغ! تجھکو مری خبر نہیں!
نالۂ دلخراش کا دل پہ ترے اثر نہیں!

بن نہ پڑی تھی مجھسے کیا، ہائے جو تو مگر گئی   تو مرے حالِ زار سے حیف ہے بے خبر گئی
اپنے ہی ساتھ لیکے تو تابِ دل و جگر گئی   جان کو کھو کے نیم جاں مجکو بھی آہ کر گئی!

ہے یہ غضب کہ نرم دل ہو کے تو سنگدل بنے!
حیف کہ تجھسا دل نواز ظالم و جاں گسل بنے!

سوچ کے تیری شوخیاں قلب کو اضطراب ہے   دیکھ تری صفائے جسم، چشمِ غمیں پُر آب ہے
یاد سے پھر رہا ہے سر اور غمِ شباب ہے   موت سے تیری ہائے ہائے جان پر اک عذاب ہے

تھی جو یگانۂ زماں حسن کی آب و تاب میں!
حیف کہ تو ہی آگئی چرخ کے انتخاب میں!

تیرہ نظر میں ہے جہاں، غیرتِ ماہ! تجھ بغیر   منظرِ قدرت آج ہے، حیف سیاہ تجھ بغیر
ہیچ ہیں سب یہ دولت و حشمت و جاہ تجھ بغیر   لطفِ کشش کسی میں بھی اب نہیں آہ تجھ بغیر

دردِ دروں کی تجھ بغیر، ہائے کوئی دوا نہیں
عشق میں جز کنارِ دوست اور کہیں شفا نہیں!

چشمِ فسونگرِ صنم! کھُل کے دکھا کمال تو   نورِ طرب سے دور کر تیرگیِ ملال تو
لے لبِ جانفزائے یار! ہو متحرک چال تو   نغمۂ پُر اثر سے پھر تازگی دل میں ڈال تو

اندومتی! اگئی جو تو عہدِ وفا کو توڑ کر
پھینکدے آج رشتۂ جور و جفا کو توڑ کر

ہار! تری تو شکل سے مجکو نہیں ہراس ہے   دشمنِ عقل و ہوش ہائے تیری یہ بُو ہے باس ہے
ظلم سے تیرے جان زار گو کہ ہمیں یاس ہے   پھر بھی ہے کچھ سکوں، یہ دیکھ اب بھی تو میرے پاس ہے

سُونگھ لوں ہار ا میں تجھے ، مجکو بھی کچھ اثر دکھا
ہجر و الم سے مٹے نجات ، وصل و خوشی کا گھر دکھا

اقبال ورما سحر

چشمِ بد دور

نقشِ رُخِ بشر کے لیے ہے نگار آنکھ ۔ ہر رنگ ہر چمن میں ہے گویا بہار آنکھ
اظہارِ راز میں کسی صورت نہیں ہے بند ۔ ہے بے زباں مگر ہے بڑی ہوشیار آنکھ
تعبیرِ مدعائے بیاں سچ ہو یا غلط ۔ جوہر کھلے اُٹھی جو ذرا ایک بار آنکھ
شرما کے اُس سے کیوں نہ مکدر ہو آئینہ ۔ رکھتی نہیں ہے دل کی طرح سے غبار آنکھ
باغ و بہار و خشک و تر و کوہ و سبزہ زار ۔ ہے ذوقِ سیر کے لیے بس افتخار آنکھ
دُوری کو منزلوں کی نہ طے کس طرح کرے ۔ برقِ نظر فرس ہے تو ہے شہسوار آنکھ
دُنیا کی سیر کھیل تماشے اِسی سے ہیں ۔ دُنیا کی زندگی میں ہے ذی اختیار آنکھ
ہے فرق اسی کے سامنے شیر و شراب میں ۔ ہے معرفت میں اس سے فزوں ہوشیار آنکھ
بڑھتا ہے ذوقِ جذبۂ دل اسکی دید سے ۔ بنتی ہے روح و جان ہمہ تن انتظار آنکھ
بند آنکھ ہو خیال میں تو دل کا حال دیکھ ۔ رکھتی ہے اک نگاہ میں رنگت ہزار آنکھ
پہچان اسکے رُوپ سے ہے خوب و زشت کی ۔ آرایشِ جہاں کے لیے ہے سنگار آنکھ
شہرے اسی کی دید کے مشہورِ عام ہیں ۔ طبعِ خیال و ہر میں ہے اشتہار آنکھ
رُخ کو کوئی چھپائے جو تو بہ کی آڑ میں ۔ پڑتے ہی اک نگاہ بتادے خمار آنکھ
آنکھوں کے نُور سے ہے اُجالا جہان میں ۔ آنکھیں نہوں تو کس سے کرے کوئی چار آنکھ
اللہ ایک تِل میں سمائی پہاڑ کی ۔ کس طرح ہو نہ قدرتِ پروردگار آنکھ

بندہ سے رکھ نہ چشمِ امیدِ کرم صمیم
غربت میں تجھ سے پھیر نہ لے روزگار آنکھ

صمیم بلند شہری

کتاب

اے مری تنہائی کی مونس ، رفیق و غمگسار ۔ تیری دلداری و غمخواری پہ ہوں دل سے نثار
تو رہا کرتی ہے ہر دم رنج و راحت کی شریک ۔ صبحِ راحت کی ہے ہمدم شامِ غربت کی شریک
جدولیں ہیں لوح پر یا سبزۂ رُخسار ہے ۔ یا نشاط انگیز یہ پھولا پھلا گلزار ہے
نورِ ارشاد و ہدایت کا بھی سرچشمہ ہے تُو ۔ نیکی و پاکیزگی کا ایک سرمایہ ہے تُو
علم کی تُو کان ہے اخلاق کی تُو جان ہے ۔ اور فروغِ حسن و نقل و عقل کا بُستان ہے
عقل تیری ضوفشانی سے یہ نورانی ہوئی ۔ یا شعاعِ مہر سے پیدا درخشانی ہوئی
اشرف المخلوق تجھ سے عالمِ خاکی ہُوا ۔ ہم کو تیری ہی بدولت رُتبۂ عالی ملا
جلوۂ قدرت ہوا ہے تیرے دم سے آشکار ۔ گلشنِ ہستی میں ہے تجھ سے بہارِ لالہ زار
ہر جگہ چرچے ہُوا کرتے ہیں علم و فضل کے ۔ ہر طرف دانائیوں کے تجھ سے شُہرے ہیں مچے
جلوہ آرائی بھی تیری کیا ہی دل آویز ہے ۔ مُصحفِ رُخ کی زیارت بھی مسرت خیز ہے
بے مثال و بے نظیر و بے بہا تحفہ ہے تُو ۔ ہر بشر کے واسطے اک گوہرِ یکتا ہے تُو
باغِ ہستی میں گُلِ اخلاص سے تُو ہی بسی ۔ عطرِ الفت میں تری ہر سطر ہے ڈوبی ہوئی
تو ہے لیلائے معانی اے مری دلکش کتاب ۔ تیرا دلدادہ ہے یہ الحج حزیں خانہ خراب

تیرے ہی دم سے ہے وابستہ یہ میری زندگی
تو نہ ہو گر ساتھ تو کیسی کہاں کی زندگی (ماخوذ)

اوم جی گیاوی

تصویر کی قدردانی

خانِ خاناں کے زمانہ میں مصوّر کوئی ۔ لایا اک نادر و نایاب بنا کر تصویر
دیکھ کر حکم دیا پانچ ہزار اسکو دو ۔ اور سجا دو کہیں موقع سے اُٹھا کر تصویر
تب مصوّر نے کہا قدر ہے سرکار کی یہ ۔ ورنہ ہے تیرہ و تاریک مکدّر تصویر
سچ اگر پوچھیے دو تین سے زائد نہیں ۔ اچھی اچھی کہیں اس سے بھی ہیں جا کر تصویر
ہاں یہ ہے عرض اگر آپ کو ہے قدرِ کمال ۔ تو بتا دیجیے کیونکر ہے یہ بہتر تصویر
تب یہ فرمایا کہ ہاں غور کیا ہے ہمنے ۔ بے سبب ہی اسے سمجھا نہیں برتر تصویر
اک گُل اندام حسینہ و جمیلہ ہے کہیں ۔ اُس کی لایا ہے تو محنت سے بنا کر تصویر
لُطف یہ ہے کہ نہا کر وہ اُٹھی ہے گویا ۔ اور کھنچوائی ہے انداز دکھا کر تصویر
خادمہ ہاتھ میں جھانواں لیے بیٹھی ہے کوئی ۔ پانوں ملتی ہے وہ پیروں کو بتا تصویر
گرگدی جھانویں کے لگنے سے جو کلفت ہوئی ۔ تو نے دکھلائی ہے نایاب بنا کر تصویر

لی پھریری جو گل اندام نے اُس دم کوئی منعکس ہوگئی تصویر میں بنکر تصویر
قدر اس واسطے ہے یہ کہ تو ہو اہل کمال ورنہ دیکھی ہیں بہت رشک گُل تر تصویر
جب مصوّر نے سُنا یہ تو گرا قدموں پہ اور کہا داد ملی مجھکو بنا کر تصویر

آج وہ بات کہاں آج کہاں قدر شناس
چند پیسوں میں اب ہوتی ہے میسر تصویر

اشک بلند شہری

رُباعیاتِ طالب

کہتے تھے جوانی میں۔ جہاں گزرےگی مستی میں، مسرّت میں، وہاں گزریگی
طالب یہ نہ سمجھے تھے کہ آگے چل کر ہستی بھی ضعیفی میں گراں گزریگی

طفلی میں یہ کہتے تھے جواں ہونگے ہم آرام جہاں ہونگے، جہاں ہونگے ہم
پیری میں یہ اندیشہ ہوا ہے طالب دُنیا سے گئے بھی تو کہاں ہونگے ہم

ہر اپنے بیگانے کی یہی راہ ملی دولت کے لیے پیار ملا، چاہ ملی
ہر دوسری یا تیسری کو بیوی نے پُوچھا تو یہ پُوچھا "تمھیں تنخواہ ملی؟"

تہذیب برتنے کے لیے سُوٹ لیا کالر لیے، نکٹائی لی، اور بُوٹ لیا
نقّل کی طرح بڑھ کے کٹے ہم طالب فیشن کی ترقی نے ہمیں لُوٹ لیا

ہم زر کے لیے ضارب زرگر بھی بنے رہزن بھی بنے، ہادی و رہبر بھی بنے
رستے جو لگائے تو کچہری بھی چڑھے لیڈر بھی بنے، اور پلیڈر بھی بنے

دم بھر ہمیں دُنیا میں نہ آرام ملا جو کام ملا مصدرِ آلام ملا
جب نشۂ پندار میں سرشار ہوئے جب جا کے کہیں جم کی طرح جام ملا

باغبان

کس مزے سے عمر کٹتی ہے تری ای باغباں بُلبل و گُل کی ہے ہردم یاد تجھکو داستاں
ہے جو ہر اک گُل کو فکرِ آمدِ فصلِ خزاں لپٹی جاتی ہیں چمن میں ڈالیوں سے ڈالیاں

تیرے ہی دم سے ہیں سارے عیش و عشرت کے مزے
تجھکو حاصل ہیں عجب نیرنگِ قدرت کے مزے

صبح کا سناٹا دل کش اور کلیوں کی چٹک شوق نظارہ میں نرگس کی نہ جھپکی اک پلک
شور اک صلِ علیٰ کا ہے زمیں سے تا افلاک دمبدم آتی ہے بھینی بھینی پھولوں کی مہک

باغ کی ہے زندگی اور کس مزے کی زندگی
پھولوں ہی میں کٹتی ہے ازبسکہ تیری زندگی

تُو نہ ہو تو یہ گُل و بُلبل کی چاہت پھر کہاں رات دن آپس میں یہ شکوہ شکایت پھر کہاں
چپے چپے کی چمن میں زیب و زینت پھر کہاں ہلکی ہلکی وضع کی پھولوں میں رنگت پھر کہاں

کس قرینے کے لگائے گُل چمن میں چار سُو
مختلف پھولوں کی صورت مختلف پھولوں کی بُو

نرگسِ بیمار کو ہے باغ میں رہنا پسند بُلبلِ ناشاد کو گلشن کی ہے ہر جا پسند
گُل کھلاتا ہے نئے انساں کرے کیا کیا پسند کوئی شے ایسی نہیں جو ہو کسی کے ناپسند

گو نہیں زیبا ہے یہ شانِ نفاست کے لیے
تُو نے کانٹے بھی لگائے تو حفاظت کے لیے

تجھ سے کیا ہل مل گئے ہیں رہتے رہتے بے زباں سب سُنا جاتے ہیں آکر اپنی اپنی بولیاں
اپنے اپنے قصّے خوش ہو ہو کے کرتے ہیں بیاں داد پاکر تجھ سے ہو جاتے ہیں کیسے شادماں

ایک تُو ہے اور سارے باغ کا ہے اہتمام
دے رکھا ہے تجکو کیا قدرت نے حُسنِ انتظام

ماہ عظیم آبادی

تازہ غزلیں

سیّد الشعراء حضرت قمیم بلند شہری

کھُلیگا راز سارا ضبطِ الفت کے نہ ہونے سے تمھاری آبرو جاتی رہیگی میرے رونے سے

بیانِ غمِ چمن میں ہوں زبان خارِ صحرا ہوں   فقیر آزاد ہوں کانٹا ہے پھولوں کے بچھونے سے
مٹایا آرزوے دید کو ضبطِ محبت نے   اندھیرا چھا گیا آنکھوں میں میرے دل کے رونے سے
پسِ خمِ جان دینگے گو رہی ساقی نہیں ہو گی   اٹھینگے رند روزِ حشر میخانہ کے کونے سے
جوانی ڈھل چلی اب آنکھ کھولو ہوش میں آؤ   خمار اترا ہوا چکرا نہ دے غفلت کے سونے سے
کوئی طعنہ تمھارا ناوکِ دلدوز ہی کیا ہے   کچو کے بھی تمھارے کم نہیں نشتر چبھونے سے
پڑیں سو شوب بھی تو کیا ہے اب تو جم گئی رنگت   کوئی داغِ محبت چھٹ نہیں سکتا ہے دھونے سے
حقیقت عشق کی ہم جانتے ہیں کوہکن کیسا   کہاں مزدور کی یہ شان تیشہ سر پہ ڈھونے سے
ڈراتے ہیں نگاہیں آپ کیا اشکوں سے ہنس ہنس کر   گلے کا ہار ہو جاؤ نگا یوں موتی پرونے سے
تم اور اغیار کا پہلو ہم اور اغیار کے طعنے   بڑی ہی خیر گزری رہ گئی تکرار ہونے سے
بتوں پر مرنے والے سے کوئی اتنا نہیں کہتا   ارے مردِ خدا کیا فائدہ ہے جان کھونے سے
ہماری چپ کی داد اللہ دیگا ہم دکھا دینگے   پڑیگا صبر اپنا غیر پر خاموش ہونے سے
قیامت تک نہ یہ کشتِ عمل سرسبز دیکھیگا   ملیگا کچھ نہ پھل اے مدعی کانٹوں کے بونے سے
نظر تصویرِ قاتل اب کسی صورت نہ آئے گی   کہ پردہ رہ گیا ہے میری آنکھیں بند ہونے سے

صمیمِ زار کا یہ داغِ دل ہے آپ کیا جانیں
تقابل آئینہ میں کیجیے پھولوں کے دھونے سے

(دیگر)
زخم گہرے ہیں کھنچاوٹ کے اثر کیجے ہیں   ٹوٹ جائیں نہ کہیں تارِ نظر کیجے ہیں
جھوٹے موتی ہی سہی اشک مری آنکھوں کے   دامنِ گل میں بھی شبنم کے گہر کیجے ہیں
مٹ گئے دل تو دلوں میں تری صورت اتری   جلوہ افروز جہاں تو ہے وہ گھر کیجے ہیں
حسن کار از دہن ہے تو کھلے گا یہ ناز   وہم تو یہ ہے کہ انداز نگر کیجے ہیں
پھل وفاؤں کا زمانہ میں کسی کو نہ ملا   آج تک نخلِ محبت کے ثمر کیجے ہیں
ہم نہیں وہ جو کریں ضبطِ محبت کا گلہ   انکا رونا ہے کہ جو دل کے بشر کیجے ہیں
وہ جو ٹوٹا تو ادھر پھوٹ کے روئے یہ بھی   دل کے چھالے کی طرح دیدۂ تر کیجے ہیں
چاہیے منزلِ مقصود کی لے یار تلاش   ورنہ سارے یہ ترے عزمِ سفر کیجے ہیں
دیکھ ٹھکرا کے نہ چل ٹوٹ نہ جائیں ساقی   یہ بھی ساغر کی طرح کاسۂ سر کیجے ہیں
جوڑ نظروں کے چلے ہیں کہ ہے آفت کا نچوڑ   تھر کے توڑ ہیں یہ بندِ جگر کیجے ہیں
وہ سنیں مجھ سے ذرا میری تباہی کا بیان   کہنے والے تو مصیبت کی خبر کیجے ہیں
تو گرفتار کہاں جائیں گے تیرے اڑ کر   کچی کلیاں ہیں ابھی تو ابھی پر کیجے ہیں

روز اک رنگ حسینوں پہ جتا ہوں صمیم
کیا ہوں ہائے وہ کانوں کے گہر کیجے ہیں

سید نظیر حسین صاحب نظیر

بیقراری کی بلا میں خود پڑی کا ہیکو تھی   برق آخر آہِ سوزاں سے لڑی کا ہیکو تھی
ہجر کی ساعت میں ہم جیتے رہے شانِ اللہ   الاماں روزِ قیامت تھا گھڑی کا ہیکو تھی
خود مصیبت سے مصیبت مانگتی ہے ابپناہ   تیرے دیوانہ کے سر آخر پڑی کا ہیکو تھی
آئی تھی لینے کو میرے، آ گئے تم پھر گئی   ورنہ بالیں پر اجل آکر کھڑی کا ہیکو تھی
حضرتِ موسیٰ کا دل کیونکر نہ ہوتا محوِ شکر   اسقدر اونچی جگہ قسمت لڑی کا ہیکو تھی
ہجر کی شب خانۂ تن گرتے گرتے بچ گیا   کیسے اک طوفان اشکوں کی جھڑی کا ہیکو تھی
دیکھنا تھا ناخنِ عقدہ کشا کی شان کا   بے سبب ورنہ گرہ دل میں پڑی کا ہیکو تھی
جم گیا تھا رنگ وہ میرے ہی دودِ آہ کا   اس لبِ نازک پہ مستی کی دھڑی کا ہیکو تھی
دل کی حالت روبروے یار کہتا کس طرح   اپنے قابو میں طبیعت اس گھڑی کا ہیکو تھی
بے گمان داغِ دلِ عاشق کا گلدستہ تھا وہ   پھول سے ہاتھوں میں پھولوں کی چھڑی کا ہیکو تھی
ہم صفیرو یوں خزاں نے باغ کو لوٹا تھا آہ   کوئی بتا کوئی گل یا پنکھڑی کا ہیکو تھی
تو ہی کہہ ساقی نہ تھا دلکش اگر حسنِ شباب   پھر بھلا بنت العنب پیچھے پڑی کا ہیکو تھی

کی نہ تھی جب تک محبت دل کو راحت تھی نظیر
درد کی شدت یہ ہر دم ہر گھڑی کا ہیکو تھی

قاضی مولوی مظہر الاسلام صاحب طالب (میرٹھی)

کھینچ لائی ہے یہاں تک مجکو غربانی مری   تو ہی رکھ لے شرم اے گردِ بیابانی مری
عمر بھر کرتی رہی ہے یہ نگہبانی مری   کیوں نہ پیاری ہو مجھے زنجیرِ زندانی مری
میں یہاں ہوں پہلوئے تربت میں اور اب تک وہاں   ڈھونڈھتی پھرتی ہے مجکو خانہ ویرانی مری
بانیِ جور و ستم ہو۔ ظلم کے خوگر ہو تم   رحم کی امید تم سے کی۔ یہ نادانی مری
توڑ کر زنجیر جاؤں گا نہ میں زنداں سے اب   پاؤں پڑتی ہے مرے زنجیرِ زندانی مری

اُس بھری محفل میں دل تھامے ہوئے پھرتا تھا میں
دیکھتے تم آکے محشر میں پریشانی مری

منہ دیکھا ؟ بس یہی نقشہ مری حیرت کا ہے
ہو بہو آئینہ ہے تصویرِ حیرانی مری

دل لگا بیٹھا بتوں سے ہاے میں نے کیا کیا
حشر تک اب جا نہیں سکتی پشیمانی مری

ہوتے جاتے ہیں وہ رسوائے جہاں نامِ خلق
راز افشا کرتی جاتی ہے بد اوسانی مری

ذبح کر جلدی بس اے صیاد شرمندہ نکر
دیکھ صورت تک رہے ہیں مرغِ بستانی مری

یا الٰہی یہ نیا صدمہ ہے میری جان پر
آرزو میری ہوئی ہے دشمنِ جانی مری

فصلِ گل پھر آئی پھر مجکو ہوا جوشِ جنوں
پھر وہی وحشت وہی ہے چاک دامانی مری

اُنکے [illegible] جبہہ سائی بھی نہ کی تو کیا کیا
ہاے پھر کس کام آئے گی یہ پیشانی مری

یار کی شرم و حیا نے پانی پانی کردیا
حشر کے دن آبرو ہو ہو گئی پانی مری

طالب اس قابل تھا میں وہ تو یوں کہئے ہاں
دامنِ رحمت نے رکھ لی شرمِ عُریانی مری

منشی محمد عبدالحمید صاحب حمید (میرٹھی)

بڑھا کر دوستی وہ دشمنِ جاں ہوتے جاتے ہیں
مری قسمت سے بربادی کے ساماں ہوتے جاتے ہیں

طبیعت اُنکی مائل ہو رہی ہے خوشخرامی پر
فراہم میری پامالی کے ساماں ہوتے جاتے ہیں

اُدھر وہ شوخیوں سے ترکِ الفت پر ہیں آمادہ
ادھر چھن چھن کے میرے دل کے ارماں ہوتے جاتے ہیں

چلے آتے ہیں رنج و غم ہمارے خانۂ دل میں
الٰہی جمع کیوں ناخواندہ مہماں ہوتے جاتے ہیں

مجھے دل کی پریشانی کا اب باقی نہیں شکوہ
وہ خود زلفِ پریشاں سے پریشاں ہوتے جاتے ہیں

بہار آئی ہے سودائی تمھاری زلفِ مشکیں کے
چمن میں بوے گل نکہر پریشاں ہوتے جاتے ہیں

سلامت اے تغیر راس آئی بے خودی مجکو
مبارک اے تحیر وہ بھی حیراں ہوتے جاتے ہیں

جنوں کا ہے عمل حکمِ اسیری پھر ہوا نافذ
گنہگارانِ الفت پا بجولاں ہوتے جاتے ہیں

کہا میں نے حمید اُنسے خفا کیوں ہوتے جاتے ہو
تو کس انداز سے بولے کہ ہاں ہاں ہوتے جاتے ہیں

سید محمد اسمٰعیل صاحب رسا ہمدانی گیاوی

بلبل ہوں اے صبا گلِ رُخسارِ یار کا
پھیکا ہے جس سے رنگ عروسِ بہار کا

وہ قصد کر رہے ہیں اگر لالہ زار کا
آئیں کھلا ہے باغ دلِ داغدار کا

زلفیں ہیں یہ گھٹا نہیں چھائی ہے باغ پر
موباف کھل گیا ہے عروسِ بہار کا

ناصح خیال تو بہ ہے لیکن میں کیا کروں
مجبور ہوں کہ ہے ابھی موسم بہار کا

چل چل یہ میکدے میں نہیں آج بے سبب
تقوے ہے ٹوٹتا کسی پرہیزگار کا

اپنے حنائی ہاتھوں کی مٹھی کو کھولیے
کچھ کچھ پتا چلا ہے دلِ بے قرار کا

خالق کو بھول کر ابھی بُت پوجنے لگے
واعظ جو حُسن دیکھ لے میرے نگار کا

تختے کھلے ہوے نہیں پھولوں کے باغ میں
جوبن نکھر رہا ہے عروسِ بہار کا

کس چشمِ سرمگیں کا میں کشتہ ہوں اے رسا
آہو طواف کرتے ہیں میرے مزار کا

منشی عبدالرحمٰن محمد محسن صاحب خوشتر منگرولی

اب تو ہم آنکھ حسینوں سے لڑا بیٹھے ہیں
مرغِ دل دامِ محبت میں پھنسا بیٹھے ہیں

شمع رو جائیں کہاں اُٹھکے تری بزم سے ہم
دل کو پروانہ کے مانند جلا بیٹھے ہیں

کچھ ٹھکانا ہے بھلا اُنکی زبردستی کا
صاف انکار ہے اور دل کو دبا بیٹھے ہیں

شربتِ وصل ہے بیمارِ محبت کا علاج
چارہ گر کیوں لیے بالیں پہ دوا بیٹھے ہیں

منتظر موت کے ہیں ہم جو نہیں آتے وہ
سر جھکائے ہوے مشتاقِ قضا بیٹھے ہیں

جستجو میں تری منظور یہ گمنامی ہے
اپنی ہستی کو ہم اے شوخ مٹا بیٹھے ہیں

مہرباں پاکے اُنھیں دور کی سوجھی ہے ہمیں
مدعاے دلِ بیتاب سنا بیٹھے ہیں

ہوکے مایوس تمنا نہ رکی ہاے زباں
کرکے اُنسے گلۂ جور و جفا بیٹھے ہیں

کیوں نہ قربان کریں نقدِ دل و جاں عشاق
بن سنور کر وہ بت نامِ خدا بیٹھے ہیں

شاد کیوں ہو نہ مرا دل کہ دکھا کر آنکھیں
تیر دشمن کے جگر پر وہ لگا بیٹھے ہیں

کوچۂ غیر میں دیکھو تو ذرا اے خوشتر
آج ہونے کو وہ انگشت نما بیٹھے ہیں

رُباعی امیر مینائی مرحوم

بالفرض حیاتِ جاودانی تم ہو
بالفرض کہ آبِ زندگانی تم ہو
ہم کو نہ ملو تو خاک سمجھیں تم کو
ہیں نام نہ پیاس کا جو پانی تم ہو

شمس العلماء مولانا نذیر احمد صاحب مرحوم

بھاکا کی شاعری

(از ہز اکسلنسی سر مہاراجہ بہادر راجۂ راجایان راجہ سر کشن پرشاد صاحب شاد یمین السلطنت جی سی آئی ای)

بھاکا کی شاعری بھی ایک عجیب اثرِ صبر شکیب ہے اور اسکا پتا دیتی ہے کہ سنسکرت کی شاعری کے آفتاب کو کیا شرف حاصل ہے۔ تشبیہات، استعارات، صفائی، جدتِ مضامین، ندرتِ بیان، توحید و معارف کی بارکیاں جو سنسکرت میں ہیں، ممکن ہے کہ اسکا جواب کسی اور زبان کی شاعری بھی دے سکے مگر سوز و گداز، حسرت و یاس، بروگ، عاشقانہ رنگ، جو بھاکا کی شاعری میں پایا جاتا ہے وہ بے مثل ہے۔

بھاکا اصل میں برج (متھرا) کی زبان ہے جو کنہیا جی کا مسکن ہے، اور بقول "تیغ چوں بشکست خنجر می شود" سنسکرت سے بگڑ کر بنی ہے۔ مگر ایسی دلکش دل فریب اور پیاری زبان ہے کہ اہلِ ہند کے دل سے کبھی اسکا نقش مٹ نہیں سکتا۔ گو اب نیا کلام دیکھنے سننے میں نہیں آتا اس لیے کہ بھاکا کی شاعری کا مشغلہ اب نہیں ہے، مگر پچھلے شاعروں کے کہے ہوے اشعار جب کان میں پڑ جاتے ہیں تو دل میں اُتر کر نشتر کا کام کرتے ہیں۔ یہ دل آویز شاعری برج تک محدود نہیں رہی بلکہ تیغِ زبان کے جوہر نے اکثر مقاماتِ ہند پر اپنا قبضہ کیا اور اکثر بلاد میں اپنا عمل دخل پیدا کر لیا۔ لطفِ زبان کے ساتھ ترجمانِ دل بننا اور دلی کیفیات کا اصلی فوٹو کھینچکر دکھانا اسی کا حصہ ہے۔ اگرچہ اور زبانوں نے بھی اسکی تقلید کی۔ مَا تَشَاؤُنَ اِلَّا اَنْ یَّشَاءَ۔ اکثر مقامات پر بھاکا کے نامور شاعر ہوے اور آفتاب بنکر چمکے، مثلاً تلسی داس، کبیر داس، اور انکے علاوہ اور بہت سے سخنور، جادو زبان مشہور ہیں جن کے اشعار آج تک دلوں کی اقلیم پر اپنا پورا تسلط کیے ہوے ہیں۔ بعض مقاماتِ ہند کو اس شاعری سے خاص مناسبت تھی۔ پدماوت جو بھاکا میں اعلیٰ درجہ کی تصنیف مانی جاتی ہے اُسکے مصنف اودھ کی خاک سے پیدا ہوے۔ اور اِس زمانہ میں کدپیا (وزیر مرزا) کی ٹھمریاں اور مختلف چیزیں جو مقبولِ عالم ہو رہی ہیں وہ بھی اودھ بلکہ خاص لکھنؤ کے نواب زادے تھے۔ اِسوقت تک اودھ کے قصبات و قریات میں عوام کی زبان وہی ہے جو برج کی زبان (بھاکا) کہلاتی ہے۔ اِس سے اِس بات کا ثبوت ہوتا ہے کہ ہندوستان میں اُردو کا وجود ہونے سے قبل سرزمینِ اودھ بھاکا شاعری سے چمن ہو رہی تھی۔ وہاں کے طبائع اِس بامزہ زبان اور شاعری

سے صرف آشنا ہی نہ تھے بلکہ اُن میں خاص اسکا مادہ اور ملکہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ دارالسلطنت دہلی سے اُردو کی شاعری جب اودھ میں پہنچی تو اُردو کو اپنا رنگ جمانے اور پھولنے پھلنے میں کچھ دیر نہیں ہوئی۔ یوں تو اُردو کے قدم تمام مقامات پر پہنچے، اور اسکے قدموں کی برکت سے سرسبزی ہر طرف پھیل گئی، اور ایسی پھیلی کہ ہر ایک مقام کو نہال کر دیا، مگر لکھنؤ نے اس میں زیادہ حصّہ لیا۔ یہ مضمون اسکا بھی ثبوت دیتا ہے کہ بھاکا اور اُردو جداگانہ زبانیں نہیں ہیں، تھوڑے سے تغیر سے بھاکا اُردو ہوگئی ہے۔ اگر اُردو شعر میں فارسی عربی کے الفاظ گھُل مِل کر شیر و شکر نہ ہوں تو وہ شخص جسکی زبان بھاکا ہے اس سے وہی لذت اُٹھائے گا جو ہم خالص بھاکا کی شاعری میں پاتے ہیں۔ بھاکا کی شاعری میں جن الفاظ سے ہم کو بیگانگی ہوتی ہے وہ دراصل ٹھیٹ بھاکا اور سنسکرت کے الفاظ ہیں۔ اس امر سے ہند کے کسی شخص کو انکار نہیں ہو سکتا کہ بھاکا کے لفظ لفظ میں قدرت نے شیرینی کے کوزے گھول دیے ہیں۔ اُردو کا جو شعر تڑپا نیوالا ہوتا ہے اُس میں غور کیجیے تو زیادہ تر وہی الفاظ ہوتے ہیں جو بھاکا سے لیے گئے ہیں۔ بھاکا کے اشعار میں الفاظ کی نشست اور ترکیب نرالی ہوتی ہے۔ اسکی نئی تراشوں کی پھبن، اور ایجادوں کا بانکپن، فصاحت اور سادگی، اُس پر طرّہ شوخی، نئی نئی تشبیہیں، شگفتہ استعارے، خوش ادائی، خوش نمائی، صفائی کا رنگ نزاکت کا ڈھنگ اِس زیورِ حُسن سے اور کوئی زبان آراستہ و پیراستہ نظر نہیں آتی۔ اُسی مضمون کو اُردو میں ادا کیجیے تو وہ بات باقی نہیں رہتی اور تھوڑے سے الفاظ بھاکا کا بہت سے معانی کا پتہ دیتے ہیں۔ مثلاً ایک حسینہ اور جمیلہ الّھڑ پنے سے بال کھولے ہوئے کوٹھے پر جا کھڑی ہوئی اور اُسوقت اُسکا جو عالم تھا خود اُسنے اُسپر نظر کی اور اپنی اس ادا اور ناز سے فدا ہو جانے کا خیال اُسکے دل میں پیدا ہوا کہ شرمائی ہوئی آواز میں اُسکی زبان سے یہ الفاظ نکلے:۔

لٹ کھولے اٹریا پہ ٹھاڑی۔ موری راجہ سُن پیہیں تو مار ڈریں۔

شبِ وصال کا خاتمہ اور رخصتِ محبوب کی حسرت اُردو فارسی میں ہم رات دن کہا کرتے ہیں۔ مگر یہی معمولی مضمون ہے جس کو بھاکا کے الفاظ اور ترکیبوں نے کس قدر پُر اثر کر دیا ہے۔ کیسا درد اس بیان سے ٹپک رہا ہے:۔

سجن سکارے جائیں گے اور نین مریں گے روئے
بدھنا ایسی رَین کر وکہ بھور کبھو نہ ہوئے

ایک فراق زدہ جو مدّت سے جمالِ یار کا ترسا ہوا ہے اُسکو اسکی اُمید نہیں دوست سے ملاقات ہو۔ وہ قاصد بھیجنا چاہتا ہے مگر حسرتِ دیدار اُسپر ایسی چھائی ہوئی ہے کہ کوئی پیام اُسکے خیال میں نہیں آتا۔ وہ اپنے شوق سے مجبور ہو کر مرغِ نامہ بر کو مخاطب کرتا اور کہتا ہے:۔

کاگا! نین نکاس دوں پیا پاس لیجا ے
پہلے درس دکھائے کے پا پیچھے لیجیو کھائے

ایک دُور اُفتادہ سراپا حسرت و ارمان آرزومندِ دیدارِ یار، جس کے پاس نہ پیام و سلام کا کوئی ذریعہ ہے نہ معشوق کا پتہ معلوم نہ اپنے آپ میں محبوب تک پہنچنے کی طاقت پاتا ہے، نہ اُسکے آنے کی اُمید، ہلال کو دیکھ کر جو آسمان پر نمودار ہوا ہے، اپنے مایوس دل کو یوں سمجھاتا ہے کہ ماہِ نَو کو سارا جہان دیکھتا ہے۔ ضرور ہے کہ اسوقت میری طرح میرے معشوق کی نگاہ بھی اِسپر پڑ رہی ہوگی، تو گویا عاشق و معشوق کی نگاہیں یکجا ہو گئی ہیں۔ یہ بالکل نیا اور عجیب پُر لطف مضمون ہے:۔

آج چندرماں دوج ہے جگ چتوت چوندھ اور
مورے اور وا متر کے نین بھئے اک ٹھور

دو دوہے اور ہم لکھتے ہیں جن میں کچھ الفاظ سنسکرت کے ہیں مضمون کی جدّت طبیعت کو پھڑکا دیتی ہے۔ حق یہ ہے کہ شاعری اسکا نام ہے:۔

مُکتا وا کے کان میں کہ کارن کنپا ے
ترچھی چتون سے ڈرے کہ پھر نہ بیدھا جاے

مُکتا موتی۔ کہ کارن کس واسطے۔ کنپا ے کانپتا ہے۔ معنی یہ ہیں کہ معشوق کے کان میں جو موتی لٹکتا ہے اُسکے کانپنے کا سبب کیا ہے کہ ترچھی چتون سے ڈرتا ہو کہ ایسا نہو میرے جگر کو برمائے جیسا ایک بار بیدھا جا چکا ہے۔

دوسرا دوہا جو بہت مشہور ہے یہ ہے :-

امین ہلاہل مدھ بھرے سیت سیام رتنار
جیت مرت جھک جھک پرت جہ چتوت اکبار

امین آبِ حیات - ہلاہل زہر - مدھ شراب - سیت سفیدی - سیام سیاہی - رتنار سرخی - اس میں لف و نشر دو صورتوں سے آیا ہے، اور تشبیہیں ایسی ہیں کہ گویا شاعر نے شاعری ختم کر دی - مصرعۂ اولیٰ کا لف و نشر یہ ہے کہ چشم معشوق میں جو سفیدی ہے وہ آبِ حیات ہے اور سیاہی زہر ہے اور جو سُرخی کی جھلک ہے وہ شراب کی مستی ہے - اب دوسرا لف و نشر اور مناسبات شاعری ملاحظہ ہوں - معشوق جسکو ایک بار دیکھ لیتا ہے تو بیاضِ چشم کے اثر سے جو آبِ حیات ہے وہ مرتا ہو تو جی اُٹھتا ہے، اور سوادِ چشم کے اثر سے جو زہر ہے مردہ کی سی کیفیت ہوجاتی ہے اور سرخی کے اثر سے جو شراب کی مستی ہے متوالوں کی طرح جھک جھک پڑتا ہے -

شاد

کیا قدرت ظالم ہے؟

ڈاکٹر رسل والس اپنی معرکۃ الآرا تصنیف "دُنیاے زندگی" یعنے The World of Life میں حسب ذیل لکھتے ہیں "بہت سے آدمی جن کے خیالات اور معلومات اور درجے کے ہیں، کائنات کے اندر جان داروں کی مار دھاڑ دیکھ کر بہت رنج اور تکلیف محسوس کرتے ہیں، اور جب سے ارتقاے نامیہ (Organic Evolution) بذریعہ بقاے بہترین (Survival of the Fittest) قدرت کا قانون مسلم ہوا ہے انکا درد اور زیادہ بڑھ گیا ہے، اور جانوروں کی مار دھاڑ اور آپس کی خونریزی ایک راز سربستہ بن گئی ہے - ڈارون کے مسئلہ کی تشریح سے تعلیم یافتہ لوگوں پر یہ ظاہر ہوگیا ہے کہ کائنات کے اندر بیشمار جانور ایک دوسرے کے ساتھ برسرِ پیکار رہتے ہیں، زور آور کمزوروں کو ہڑپ کر جاتے ہیں، اور یہ معرکہ آرائی ترقی کا بہترین وسیلہ ہے، اور اسی کشاکش کی وجہ سے جان دار اپنے نواحی حالات کے مطابق اپنی حالت بنا لیتے ہیں جو ذی اعضا ہستیوں کی ترقی اور بہتری کے لیے بہا ضروری ہے"!

یہ مسئلہ ہمیں اُسوقت معلوم ہوا ہے جبکہ دُنیا میں انسانیت اور شایستگی ایک اعلیٰ مرحلۂ ترقی پر پہنچ گئی ہے، اور ہر قسم کی بیرحمی و خوں ریزی سے نفرت اور اپنے ہم جنس کو قتل کرنا گناہ کبیرہ سمجھا جاتا ہے - یہ خیال بہت قابل اعتراض معلوم ہوتا ہے کہ نظام قدرت ابتدا سے لیکر آج تک جان داروں کی بربادی پر قائم ہوا ہے یعنے زور آور جانور کمزوروں کی زندگی پر بسر اوقات کرتے چلے آتے ہیں - بڑی مچھلی چھوٹی مچھلیوں سے پیٹ بھرتی ہے جسکی قابلیت اُسے قدرت نے عطا کر رکھی ہے اس خیال کی اس مسئلہ سے کیسے تطبیق ہو کہ اس عالم کا خالق قادر مطلق حکمت اور نیکی کا مصدر ہے - اہلِ مذہب اسے ایک راز اور اہلِ مادہ اسے اپنے خیال کی تصدیق سمجھتے ہیں کہ "عالم آپ سے آپ پیدا ہوا ہے، اور کوئی ذی عقل ہستی اسکی خالق نہیں ہو سکتی"۔

میں نہیں جانتا کہ ڈارون نے اس مسئلہ پر کبھی غور کیا ہے - مگر وہ اپنی کتاب "اوریجن آف اسپیشنز" ("Origin of Species.") کے اخیر میں لکھتا ہے :- "قدرت کے اندر ہر وقت خوفناک جنگ جاری رہنے، قحط اور مری سے ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اعلیٰ درجے کے جان دار پیدا ہوں"۔ اسی کتاب میں ڈارون "جہد الحیواۃ" (Struggle for Existence) کے اخیر میں لکھتا ہے :- "جب ہم اس کشاکش پر غور کرتے ہیں تو ہمارے دل کو اس امر سے پوری تسلی حاصل ہوتی ہے کہ قدرت کی معرکہ آرائی مسلسل نہیں ہے، اور یہ کہ جانوروں کو اس سے خوف و دہشت لاحق نہیں ہوتی بلکہ انکی موت فی الفور واقع ہوتی ہے - اور توانا، تنومند، اور خوش نصیب اس معرکہ میں کامیاب

ہوتے ہیں"۔ پروفیسر آرتھر جے۔ٹامسن (متعلقہ ایبرڈین یونیورسٹی) لکھتے ہیں:۔ "ڈارون کے اصول کے رُو سے جانور جہد الحیوٰۃ سے آگے بڑھتے ہیں، اور شخصی مقاصد سے بعض دفعہ اپنے ہم جنسوں کی نعشوں کو روندتے ہوے اگلے مرحلہ پر پہنچتے ہیں۔ بعض دفعہ خوں خواری کے مجادلہ سے، اور بعض دفعہ مکر و فریب اور خوں ریزی سے اپنا مطلب نکالتے ہیں۔ آگے بڑھنے کی تمنا میں وہ اپنے ساتھیوں کو برباد کرنے میں دریغ نہیں کرتے"۔ ہکسلے نے کہا تھا کہ "سبزی پر بسر اوقات کرنے والے جانوروں کی بشیار پشتوں کو گوشت خور ہلاک کرتے رہے۔ مگر دونوں بڑھاپے، بیماری، اور کثرتِ اولاد کی آفتوں کے تابع رہے"۔ اس قسم کی غلط بیانیوں کی وجہ سے جو اخبارات و رسائل میں آئے دن شائع ہوتی رہتی ہیں وہ ہیکل کے اس خیال کو ماننے پر مجبور ہو گئے ہیں کہ "عالم کا کوئی خالق نہیں ہے۔ بلکہ ہمیشہ سے اِسی طرح چلا آتا ہے اور جانوروں کی کشاکش باہمی اور مار دھاڑ کا سلسلہ غیر متناہی اور دائمی ہے"۔

مگر ان عالموں نے یا کسی اور عالم ارتقا نے کبھی اس مسئلہ کی اصلیت پر غور نہیں کیا ہے کہ دُکھ اور مار دھاڑ ارتقار کا کیوں ضروری جزو ہے اور یہ کہ عالمِ حیوانات میں دُکھ ایک خاص فائدہ اور مقصد سے موجود ہے، اس وجہ سے جان کی حفاظت کے لیے جتنی ضرورت تھی اس سے زیادہ کبھی نہیں تھا۔ ہم اسی نقطۂ نظر سے اس مسئلہ پر بحث کریں گے لیکن اس امر کو نقش ذہن کر لینا ضروری ہے کہ جب جان دار پہلے پہل نمودار ہوے تھے تو کیا حالت تھی

اب سب سے پہلے ادنیٰ ترین قسم کے جان دار لو۔ مسٹر ڈبلیو۔بی۔ہارڈی نے پچھلے سال رائل انسٹیٹیوشن میں "زندگی کے طبعی اصول" پر بحث کرتے وقت تجربات کی بنا پر پیمیسیم (Paramecium.) کی بابت بیان کیا تھا کہ وہ کتنی جلدی بڑھ جاتا ہے۔ یہ ننھا سا کیڑا ½ انچ ہوتا ہے۔ تین روز میں اس نوع کے اجرام کا شمار دگنا ہو جاتا ہے۔ اسکی ایک سو پشتوں کی نشو و نما مشاہدہ کی گئی ہے۔ اگر حالات موافق ہوں اور پرمیسیم مارنے تین سو پشت تک بڑھتا چلا جائے، جسکے لیے دو سال درکار ہوں گے، تو انکا شمار اتنا ہو جائیگا کہ ان کے رہنے کے لیے یہ عالم کافی نہ ہوگا۔

پرمیسیم ایک سل والے نہایت ننھے جان داروں کا نمونہ ہے، جو "پروتوزوا" (Protozoa) کہلاتے ہیں۔ ان ایک سل (Cell) والے جان داروں اور پودوں کے ہزاروں انواع موجود ہیں۔ ہم تصور کر سکتے ہیں کہ جان داروں کی وسیع دنیا اسی سے شروع ہوتی ہے۔ اگر یہ بڑھتے چلے جائیں تو یہ کرۂ ارض ہزاروں قسم کے ننھے کیڑوں اور پودوں سے آباد ہو جائے اور پھر انکی جگہ رفتہ رفتہ اعلیٰ قسم کے جان دار پیدا ہوں جو ادنی جانوروں پر بسر اوقات کریں گے اس سے ظاہر ہے کہ جب پہلے پہل نباتی سِل ہوا کی کاربانک ایسڈ گیس اور پانی سے کاربن حاصل کر کے اسے پروٹوپلازم (Protoplasm) میں تبدیل کرنے کے قابل ہوئی تو پہلے حیوانی سِل پیدا ہوے۔ اور نباتی و حیوانی سِلوں نے مختلف صورتیں اختیار کر لی ہونگی تاکہ پانی ایک نوع کے حصہ میں نہ آ جائے اس سے اعلیٰ جانور پیدا ہونے سے رُک گئے۔ پس ظاہر ہوا کہ تغیر اور انتخاب (Variation and Selection) شروع ہی سے ضروری ٹھہرا۔ تاکہ ایسا نہ ہو کہ ایک ہی ادنی قسم کے جان داروں سے تمام عالم بھر جائے۔ چونکہ ادنی جان دار شمار میں زیادہ بڑھتے تھے اسلیے ارتقاء کی رفتار زیادہ تیز رہی۔

زندہ ہستیوں کے اِرتقا سے ظاہر ہے کہ ادنی جان دار اعلیٰ جانوروں کی خوراک بہم پہنچاتے ہیں اور یہ سلسلہ عالم حیوانات میں جاری ہے۔ یہ قانون شان دار کامیابی کے ساتھ کائنات میں کامیاب رہا ہے کیوں کہ اسکا انجام "انسان" ہے، جو عالمِ حیوانات کی خوب صورتی اور گوناگونی کی قدر کرنے کے قابل ہے، اور اس سے اپنے حسب منشا کام لے سکتا ہے۔ عالم مادہ، عالم حیوانات، اور اقلیم عقل کی بابت جو چاہو خیال کرو، مگر اس نتیجہ سے ظاہر ہے کہ یہی طریقہ سُود مند اور کارگر ہو سکتا ہے۔ اگر ہم وحدت الوجود (مادّی) کے حامیوں کے خیال کو قبول کریں کہ قدرت کی اندھی قوتوں کے عمل پا رینہ سے

انسان پیدا ہُوا ہے تو بھی اُنکے خیال کے مطابق یہ ظاہر ہے کہ آزمائش اور خطا کی گذشتہ ابدیت سے انسان وجود پذیر ہُوا ہے۔ اگر برعکس اسکے جیسا کہ میں مانتا ہوں، یہ عقل اعلیٰ کے مقررہ قانون سے وجود میں آیا ہے تو بھی یہ ظاہر ہے کہ یہی طریقہ بہترین ہو سکتا ہے جو بیشمار زمانوں کے دَوران میں رائج رہا اور آخر کار ایک ایسا مخلوق پیدا ہُوا جو اس طریقہ اور قانون کو کچھ سمجھکر اُسکی قدر کر سکتا تھا۔ انسان کا فخر اور امتیاز یہ ہے کہ وہ اس عالم کے بھید اور اسکی وسعت کو سمجھنے میں ترقی کر رہا ہے۔ پھر کوئی محقق کیونکر یہ مان سکتا ہے کہ انسان اور باقیماندہ جانوروں میں صرف "درجہ" کا فرق ہے۔ یعنی یہ کہ وہ باقی حیوانات سے چند درجے بہتر ہے، جیسا جرمنی کا عالم ارنسٹ ہیکل فطرت انسانی کو دودھ پلانیوالے جانور کے مساوی مانتا ہے۔

اس سے یہ منتج ہوتا ہے کہ عمل عالم ابتدائی ہستیوں، خاصیتوں، اور قوتوں پر مبنی ہے جس کے ظاہری نتائج "قوانینِ قدرت" کے نام سے موسوم ہیں اور ذی اعضا جان داروں کی دُنیا میں ان ہی سے ارتقا واقع ہوتا ہے۔ اسکا ایک نتیجہ یہ ہے کہ کوئی عضو اور کوئی قوت جب تک اُسکی ضرورت نہ ہو پیدا نہیں ہوتی، اور نہ حِس پیدا ہوتی ہے۔ اس سے ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ شروع میں جان داروں کی زندگی بہت کوتاہ ہوتی تھی اس لیے انکی حِس بھی بہت ہی کمزور تھی، لہذا اُنھیں درد بھی بہت کم محسوس ہوتا تھا۔ چونکہ انکی زیست کا مقصد اعلیٰ تر جان داروں کی پرورش بنا تھا اس واسطے مَوت ان کے لیے تکلیف دہ نہ تھی۔ وہ اس سے گریز نہ کر سکتے تھے اور اُنکی ہستی کا مقصد بھی اس سے بچنا نہ تھا۔ اس وجہ سے مَوت راحت معلوم ہوتی تھی۔ پہلے کچھ گرمی کا احساس ہوتا پھر ہوش غائب ہو جاتے، اس طرح گویا "نیند اور فراموشی" سب کچھ غائب ہو گیا۔ دُکھ اور موت کا مقصد یہ ہے کہ اعلیٰ اور زیادہ کامل ذی حیات جانوروں کی جان کی حفاظت ہو تا دقتیکہ وہ اپنی نسل پیدا کرنے کے قابل نہ ہو جائیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ جو جان دار بڑے بڑے جانوروں کا شکار بنتے ہیں اُنکے اندر دُکھ درد کا احساس بہت تھوڑا ہوتا ہے۔ انکا شمار بہت جلد بڑھتا ہے۔ مگر چونکہ یہ اور جانوروں کی خوراک بنتے ہیں اس وجہ سے انکی آبادی بڑھنے نہیں پاتی، جب دوسرے جانور انپر جھپٹتے ہیں تو انھیں بہت تھوڑی تکلیف ہوتی ہے۔ انکی ہستی کا اصل مقصد دوسرے جانوروں کی خوراک بننا ہے۔ درد نا آشنا جان داروں میں آبی جان دار (مچھلیاں وغیرہ) بھی شامل ہیں۔ پھر حشرات الارض اور ملیکہ (جنکے بدن پر گھونگے یا چھلکے ہوتے ہیں) کیڑے، اور رینگنے والے اس طبقہ میں شامل ہیں۔ شروع میں بھی یہ تھے اور اب بھی ہیں جس سے درد تکلیف کا حلقہ بہت محدود ہو گیا ہے۔

بعض جانوروں کے ناخنوں اور پنجوں کو دیکھکر یہ خیال پیدا ہوتا ہوگا کہ انکے شکار کو بے حد تکلیف اُٹھانا پڑتی ہے۔ مگر نہیں۔ دانت اور پنجے چھوٹے جان داروں کو پکڑنے کے لیے قدرت نے عطا کیے ہیں۔ اس سے تکلیف کم ہوتی ہے۔ یہی اصول چھوٹے جانوروں پر بھی عائد ہوتا ہے۔ قدرتی حالت میں انھیں حوادث سے کم تکلیف ہوتی ہے حالانکہ ہمیں بہت زیادہ تکلیف محسوس ہوتی ہے۔ پرندے، چوہے، گلہریاں، وغیرہ جانور گر کر اپنے بازو اور اعضا نہیں توڑتے، وہ اپنی بساط سے آگے نہیں بڑھتے۔ ہاں البتہ بجلی، ژالہ باری، اور جنگلی آگ وغیرہ سے کبھی انھیں کچھ تکلیف ہوتی ہے، یا کبھی آپس میں لڑ مرتے ہیں۔ مگر جنھیں ایسے اسباب سے گزند پہنچتا ہے انکا شمار بہت ہی تھوڑا ہے اور اُنکے زخم بھی بہت جلد اچھے ہو جاتے ہیں، اسی وجہ سے انکا درد بہت قلیل ہوتا ہے۔

جو جانور بھاری بھرکم اور چلنے والے ہوتے ہیں اُنھیں درختوں اور چٹانوں کے گرنے، آتش فشاں پھٹنے، یا سیلابوں سے ضرر پہنچتا ہے مگر بالعموم بہت سے جانور ان سے بچ نکلتے ہیں اور بعض فی الفور مر جاتے ہیں، اس وجہ سے انھیں دُکھ بہت ہی تھوڑا ہوتا ہے۔ البتہ جب جنگلی جانور آپس میں لڑتے ہیں تو انھیں سب سے زیادہ دُکھ پہنچتا ہے مگر یہ شاذونادر ہوتا ہے اور تکلیف بہت تھوڑی مقدار میں ہوتی ہے۔ زنبور، بچھو، سانپ وغیرہ زہریلے جانوروں سے ضرور گزند پہنچتا ہے، مگر فائدہ بھی ہے۔ کیونکہ انکے زہر سے ننھے جانور مثلاً

مینڈک، چوہے وغیرہ بے ہوش ہو جاتے ہیں، انھیں درد نہیں ہوتا۔ یہ بات تجربہ میں آچکی ہے کہ شیر، بھیڑیے، جنگلی بلی، بگھیلے، چیتے، وغیرہ جن جانوروں کو ہلاک کرتے ہیں اُنھیں بہت تھوڑی تکلیف ہوتی ہے۔ انکی جھپٹ سے شکار وحشت زدہ ہو جاتا ہے۔ چونکہ تیز ناخن اور دانت سے نظام اعصاب کا تمام احساس مُردہ ہو جاتا ہے اس لیے درد نہیں ہوتا۔ جنگل کے درندے دوسرے جانوروں کو پیٹ پالنے کے لیے مارتے ہیں اپنا دل بہلانے کے لیے نہیں۔ جو آدمی شیر کے پنجے میں پھنس چکے ہیں وہ جانتے ہیں کہ کس قدر کم جسمانی یا ذہنی صدمہ محسوس ہوتا ہے۔ اپنی تیز حِسوں کی بنا پر سب جانوروں کو ویسا ہی ذکی الحس سمجھنا سخت غلطی ہے۔ جس طرح اخلاقی اور ذہنی قوتوں میں انسان وحوش وطیور سے افضل واعلیٰ ہے، اُسی طرح وہ دُکھ درد کے احساس میں بھی اُنسے بالا و بہتر ہے۔ ہمیں درد اس وجہ سے ہوتا ہے کہ ہماری جلد پر چھلکے یا اور قدرتی حفاظت کی کوئی چیز نہیں ہے جس سے صدموں کی پیش بندی ہو سکے۔ بال اِسکے اُسی وقت جھڑ گئے جب سے انسانیت کا جامہ پہنا، یعنی روح جسم کے اندر آئی۔ اس سے وہ بہت ذکی الحس بنگیا، اور اسی کی بدولت اُسنے تمدن میں ترقیاں کیں۔ عقل بھی اسی وجہ سے بڑھنے لگی۔ اس نے خود کو ہزاروں آفتوں کے درمیان پایا اور اُن سے بچنے کے لیے طرح طرح کی تجاویز اور اختراعات کیں جس سے شائستگی اور علوم وفنون میں اس قدر ترقی ہوئی ہے۔ وحشی اور شایستہ انسان کی حِسوں میں بھی بہت فرق ہے۔ سیاح بیان کرتے ہیں کہ جن اذیتوں کو وحشی باشندے بغیر دَم مارے برداشت کر لیتے ہیں ہم اُنھیں عذاب سمجھتے اور اُنکی صورت سے بھاگتے ہیں۔ مثلاً مجرم سردار قبیلہ کے سامنے لایا جاتا ہے، مظلوم کے رشتہ دار آتے ہیں، یکے بعد دیگرے اُسکے ہاتھ پاؤں وغیرہ کاٹ لیتے ہیں، مگر وہ چُپ چاپ ہے دَم نہیں مارتا۔

انسان کو دُکھ درد کا سب سے زیادہ احساس ہوتا ہے۔ مسئلۂ ارتقا کے رُو سے یہ مانا جاتا ہے کہ زندگی قائم رکھنے والی تبدیلیاں، خوبیاں اور طاقتیں ہی ہیں جو بہت قدر و قیمت رکھتی ہیں، اور درد اِن میں سے ایک نہایت ضروری شے ہے جو ہمارے فائدہ اور بہتری کے لیے ہے۔ دوسرے جانوروں کو اسکی ضرورت نہیں ہے، اس وجہ سے انکے درد کا احساس بہت گھٹیا درجے کا ہوتا ہے۔ یوں کہنا بجا ہوگا کہ اگر وحشی انسانوں میں مہذب آدمیوں کی نسبت روپیہ میں آنہ ڈیڑھ آنہ درد ہوتا ہے تو جانوروں میں وحشیوں کا عشر عشیر بھی نہیں ہوتا۔

اس ساری بحث کا مطلب یہ ہے کہ درد اور دُکھ دُنیا میں بہت تھوڑا ہے، اور جس قدر ہے وہ غیر ضروری نہیں ہے۔ دُکھ کا احساس جانوروں کو اتنا نہیں ہوتا جتنا انسان کو ہوتا ہے۔ جتنا چھوٹا کوئی جانور ہوتا ہے اُتنا ہی کم درد کا احساس رکھتا ہے۔ جب بڑے جانور چھوٹے جانوروں پر جھپٹتے ہیں تو اُنھیں درد بہت ہی کم محسوس ہوتا ہے۔ مگر ارتقائی عمل اور جانوروں کے طبعی نشو و نما کے لیے یہ ضروری ہے۔ اس وجہ سے یہ کہنا کہ قادرِ مطلق، دانا، اور محبت کرنے والے خدا نے مخلوقات کو دُکھ درد میں پھنسا دیا ہے، سراسر غلطی ہے۔

ڈاکٹر والس "پیر فرتوت اقلیم سائنس" کی رائے پیچھے دی گئی ہے جس میں قدرت کے جور وظلم اور بے رحمی کی حقیقت آشکارا کی گئی ہے۔ اب ایک اور عالِم مسٹر ہرسٹ کی شہادت پیش کیجاتی ہے:۔ "جو لوگ شیر، چیتے، سُوَر، ریچھ، وغیرہ کا شکار کھیلتے ہیں، اُنھیں بارہا تجربہ ہو چکا ہے کہ وہ گولی کھائے اور جھلّائے ہوئے درندوں کے چنگل میں پھنسے اور صحیح سلامت بچ گئے۔ انکا تجربہ اور خیال یہ ہے کہ نہایت رقیق القلب آدمی اسکے سوا اور کسی قسم کی موت کو پسند نہیں کر سکتا۔ اُس وقت کوئی دُکھ درد نہیں معلوم ہوتا۔" "فزیالوجی" کے ماہر خواہ اسکی کچھ اور وجہ بتائیں مگر اصل یہ ہے کہ خالق نے اپنے رحم و فضل سے جانداروں کے مرتے وقت کا دُکھ درد اِس طریقہ سے گھٹا دیا ہے کہ وہ درندوں اور تُندخو جانوروں کے ہاتھ سے ہلاک ہوتے اور انکی پرورش کا وسیلہ بنتے ہیں۔ گویا گوشت خور جانور غریب جانداروں کے لیے رحم دل اجل کا کام دیتے ہیں۔"

چند سال ہوئے ڈاکٹر ہڈسن نے رائل کرو سکوپکل سوسائٹی کے سامنے ایڈریس دیتے ہوئے فرمایا تھا :- "عالم حیوانات کے اندر کیسی راحت اور خوشحالی پائی جاتی ہے! وہاں آسایش، قناعت، خوشی، اور ایک شان نظر آتی ہے ان ننھے پتنگوں اور بھنگوں کو دیکھو کس دلربائی اور ادا کے ساتھ اُڑتے پھرتے ہیں۔ ان کی حالت میں بےفکری، راحت، اور ایک شان نظر آتی ہے؛ گویا انھوں نے ابدی زندگی اور شادمانی کا قبالہ لکھوا لیا ہے۔ وہاں قدرت کے وسیع دسترخوان پر جو انکے لیے بچھایا گیا ہے، دھینگامُشتی، سینہ زوری اور کشاکش نہیں ہوتی۔ وہاں ایک کو دوسرے کے ظلم و زیادتی کا خوف نہیں۔ وہ اپنے حسب منشا خوراک پھولوں اور پتّوں سے حاصل کرتے ہیں، اور مزے سے قدرت کے باغوں میں پھرتے ہیں۔ نہ بھوک کا غلبہ ہے، نہ دشمن کی مار دھاڑ کا خدشہ"

اور بہت سے علماء کے خیالات قدرت کے ظلم اور انتظامِ الٰہی کی بےرحمی کے متعلق پیش کیے جا سکتے ہیں مگر ہمارے مطلب کے لیے یہی کافی ہیں۔ اس بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ جب تک کسی معاملہ کی اصلیت پر غور نہ کیا جائے حقیقت سے انسان بےبہرہ رہتا ہے، اور سطحی نظر رکھنے والے کی رائے معتبر سمجھنا سخت غلطی ہے۔

جے۔ آر۔ رائے

دارا شکوہ کے آخری ایام

تاریخِ ہند میں اکبر سے زیادہ ذی شہرت اور دلپذیر شخصیت کا شاید ہی کوئی بادشاہ گزرا ہو۔ اُسکو اپنے باپ ہمایوں سے وراثتاً ایک ایسی سلطنت ملی تھی جو مختتم و منتظم ہونے کی اُمید سے کوسوں دُور تھی۔ شمالی ہند پٹھانوں کی چھوٹی چھوٹی لیکن پُرقوت سلطنتوں میں منقسم تھا، جن سے خدشہ تھا کہ اگر یہ باہم متحد ہو جائیں گی تو نوزائیدہ حکومت مغلیہ کا قلع قمع کر دیں گی۔ اس قسم کے نازک مواقع پر تمام موروثی سلطنتوں کی خوش قسمتی صرف ایک ایسے شخص کے پیدا ہونے پر منحصر ہوا کرتی ہے جس میں موقع و محل کے لحاظ سے تکمیل ضروریات کا مادّہ موجود ہو۔ اکبر قدرتی طور پر ایسا ہی آدمی تھا۔ خوش نصیبی سے اُسکو غیر معمولی دل و دماغ مبدأ فیاض سے عطا ہوا تھا، جسکی اِن حالتوں میں عام طور پر ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ اُسنے اپنے فوجی جوہر کو سیاسی قابلیت کے ساتھ ترتیب دیا اور اُسی کا یہ نتیجہ تھا کہ ایک طرف اُسکی جنگی مہمات کا سلسلہ بیرونجات میں قائم رہا اور دوسری طرف اندرونِ ملک کے فتنہ و فساد کا قلع و قمع ہوتا رہا۔ قانونِ فرماں روائی کے اصول سے وہ بہت اچھی طرح واقف تھا۔ اور اُسکی عاقلانہ حکومت کا یہ اثر ہوا کہ جو اقوام بزورِ شمشیر مفتوح ہوئی تھیں وہ بھی اُسکے زیر سایہ مطمئن و ساکت تھیں۔ اُس نے رشتۂ مناکحت باہمی کے توسط سے راجپوتوں کو حکومت کے استحکام میں دلچسپی لینا سکھائی اور اپنے آزادانہ خیالات اور معتدل حکمت عملی کے زور سے رعایا کے تمام طبقوں میں اپنا اعتبار قائم کیا۔ مختصر یہ ہے کہ اُسکی سیاسی فراست کچھ ایسی تھی کہ اُسنے باشندگانِ ہندوستان کو، جن میں اختلافِ عقائد و مذاہب کی وجہ سے لامرکزی کا ایک عجیب عالم تھا، متحد و متفق کر کے ایک کر دیا۔ اور جسوقت اُسکا انتقال ہوا ہے تو اُسنے اپنے پیچھے ایک عظیم الشان سلطنت چھوڑی اور وہ بھی اسقدر بہتر حالت میں، کہ اندرونی خرخشوں اور بیرونی حملوں کا خوف مطلق نہ تھا۔ اُسکے دو جانشینوں، یعنی جہانگیر و شاہجہان، نے محض اس وجہ سے امن کے ساتھ حکمرانی کی کہ وہ اپنے باعظمت پیش رَو کے نقشِ قدم پر چلنے میں نہایت سختی سے قائم رہے۔

حکمرانِ وقت کے آخری ایام کا اولاد کی بغاوت سے تلخ ہونا شاید خاندانِ تیموریہ میں کوئی بددُعا تھی۔ شاہجہان نے بزمانۂ شاہزادگی اپنے باپ کے مقابلہ میں علمِ بغاوت بلند کیا اور اسکے عوض اُسے اپنے لڑکوں کے ہاتھوں اُس سے بھی زیادہ بُرا دن دیکھنا پڑا۔ ۱۶۵۷ء میں وہ نہایت سخت بیمار ہوا۔ اُسکی عمر ۶۷ سال کی ہو چکی تھی اس لحاظ سے شاہزادوں نے خیال کیا کہ

اسکا آخری وقت آگیا ہے، ہر ایک نے دہلی کی طرف کوچ کیا اور اس طرح بھائیوں میں حصول تخت کے لیے ایک خونریز جنگ کا پایہ پڑگیا۔

اُن ممالک میں، جہاں توریثِ سلطنت کے انضباط کے لیے کوئی قاعدہ اور قانون نہیں ہے، بادشاہِ وقت کی علالت یا وفات کا ثمرہ خانہ جنگیوں کی شکل میں پیدا ہوتا ہے۔ متنازعہ فیہ جانشینی کی بیشمار مثالوں کا تاریخ سے پتہ چلتا ہو کہ کسی فردِ خاندان نے پہلے تو اپنی لیاقت، قوت، یا خوش قسمتی کی بدولت سے حکومت کا درجہ حاصل کیا ہے اور پھر اس خیال سے کہ اس میں کوئی رخنہ انداز نہو دوسرے تمام دعویداروں کو یا تو قتل کرا دیا ہے یا کوئی اور صورت اس خدشہ کے رفع کرنے کی نکالی ہے۔ محمد ثالث سلطانِ ترکی کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ اُسنے اپنے اُنیس بھائیوں کو قتل کرایا اور اپنے باپ کی بارہ حرموں کو، جنکے حاملہ ہونے کا خیال تھا، دریا میں غرق کرا دیا۔ تاہم خانہ جنگیوں میں، خرابیوں کے ساتھ، اچھائی کا بھی ایک پہلو ہوتا ہے۔ ایک طرف اگر ان کے سبب سے اہلِ خاندان کو بربادی، تباہی، دائمی غلامی، یا موت کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو دوسری طرف انھیں کے اثر سے عنانِ حکومت خاندان کے بہترین و لائق ترین رکن کے ہاتھ آجاتی ہے۔ گویا "بقاے بہترین" کی تھیوری کی صداقت اُس سے آشکار ہوتی ہے۔ سلاطینِ مغلیہ نے، جن میں بابر سے لیکر اورنگزیب تک شامل ہیں، ڈیڑھ صدی سے زیادہ عرصہ تک محض اس سبب سے شاندار حکومت کی کہ اُن میں سے ہر ایک نے جنگ آزمائی کے ذریعہ سے فیصلہ کرکے تخت پر قابو پایا تھا اور وہ اپنے ذاتی اقتدار کے زور سے تمام مدعیوں کی آنکھوں کے سامنے اُسپر قابض رہے۔ جب تک یہ انتظام قائم رہا، تاج اُسی سر کی زینت بنا رہا جو خاندان میں سب سے زیادہ فضیلت دکھاتا تھا اور حکومت بھی انکے زمانہ میں نہایت عروج پر رہی۔ لیکن جب یہ طریقہ ٹوٹ گیا تو شاہنشاہی کا منصب کمزوروں کو ملنے لگا۔ حریص وزراء اور خودغرض مصاحب، اپنی مصلحت سے جسکو چاہتے بادشاہ بنا دیتے تھے اور جسکو چاہتے تخت سے علیحدہ کر دیتے۔ انکا عدم و وجود برابر تھا اور وہ قابل لیکن غیر انجام بیں کارپردازوں کے ہاتھوں میں بمنزلہ کٹھ پُتلی کے تھے انکا قدم تخت پر اُس وقت تک رہتا تھا جب تک کارپردازوں کی کوئی غرض اُن سے وابستہ ہوتی تھی اور اسکے بعد وہ الگ کر دیے جاتے تھے۔

سررشتۂ بیان ہاتھ میں لینے سے پیشتر یہ ضروری ہے کہ شاہجہان کے چاروں بیٹوں کے خصائلِ ذاتی پر روشنی ڈالی جائے جنھوں نے جنگِ حصولِ سلطنت میں حصہ لیا۔ چونکہ اسوقت ہمیں زیادہ تر واسطہ پہلے اور تیسرے بیٹے سے ہے اس لیے نسبتاً اُنھیں کے حالات زیادہ تشریح اور تفصیل کے محتاج ہیں۔ دارا شکوہ جو سب میں بڑا تھا، اُسکی عمر ۴۲ سال کی تھی۔ وہ خلیق، متواضع، بے تکلف، اور آزادمنش تھا۔ اُسکا تقرب سہل الحصول، اور اُسکی طبیعت معنی فہم واقع ہوئی تھی۔ وہ تعلیم یافتہ تھا، اور اس لیے اُسکے تمام کاموں سے ذکاوت و شفقت کا اظہار ہوا کرتا تھا۔ چستی، چالاکی، ہمت، اور جوش سے بھی وہ عاری نہ تھا اور بذاتہ وہ ایک دلیر آدمی تھا۔ کامیاب زندگی کا عادی ہونے کے باوجود جب اُسپر کوئی مصیبت آجاتی تو وہ بیدل نہ ہوتا۔ اور اگرچہ کسی صفت سبب الاسبابی کا قائل نہ تھا تاہم حادثاتِ زندگانی کو اُسی صبر و تحمل سے برداشت کرتا تھا گویا کہ تقدیر کا نوشتہ یہی تھا۔ بیلک نائفت پر نظر کی جائے تو اُس میں بعض اوقات کی ترش مزاجی گاہے گاہے کی غضبناکی اور دائمی ضد اور تبختر کا پتہ چلتا ہے۔ اُسے اپنی رائے پر اس درجہ بھروسا ہوا کرتا تھا کہ دوسروں کے مشورہ کو صبر و تحمل سے نہیں سُن سکتا تھا اور اپنے شناساؤں اور ماتحتوں سے عاجلانہ تعمیلِ حکم کا متوقع رہا کرتا تھا۔ اُسکے مزاج میں مہربانی اور ہمدردی انسانی بھی تھی۔ اُسکا غیظ تادیر نہیں تھا بلکہ تھوڑے وقفہ کے بعد اُسکا اثر بھی دل سے زائل ہو جاتا تھا۔ خانگی زندگی کے اعتبار سے اُسپر کسی پہلو سے کوئی الزام نہیں عاید ہو سکتا شفیق باپ، وفادار شوہر اور فرماں بردار اولاد کی سہ گونہ خوبیاں اُس میں موجود تھیں۔ شاہجہان کی سخت علالت کے زمانہ میں وہ اکثر ساری ساری رات تیمارداری کرتا رہا۔ جب یہ ہوا کہ اب بادشاہ کا اخیر وقت ہے تو وہ بیچتیا

گریہ وزاری کرنے لگا - اسکی اشکباری مصنوعی نہ تھی - اسی طرح جب علالت میں تخفیف ہوئی اور بادشاہ سلامت کا مزاج کسی قدر روباصلاح پایا گیا تو اسکے چہرے سے آثار مسرت خود بخود نمایاں تھے - اور جب رات کو وہ اپنے بال بچوں میں آیا تو اسکی صورت دن کی طرح مغموم و ملول نہ تھی بلکہ خوشی سے چمک رہی تھی - اسوقت اسنے جو کچھ بھی کہا سنا اس سے غیر معمولی فرحت و انبساط کا پتہ چلتا تھا - اصولاً اگرچہ عیش و تفریح کا مخالف نہ تھا لیکن نیک کاموں سے بالطبع زیادہ رغبت تھی - اسکے اوقات فرصت، بجائے ان غارت کن عیاشانہ مشاغل کے جن کا اثر ہمارے مشرقی شاہزادوں کو ضعیف و بزدل بنا دیا کرتا ہے مطالعہ کتب میں صرف ہوتے تھے -

مذہبی عقائد کے اعتبار سے دیکھیے تو دارا، اکبر کا تبع نظر آتا ہے، وہ ذی علم تھا اور آزاد خیال، وہ ہندوؤں کا دوست تھا اور یورپیوں کا ایک فراخ دل معاون، اسکے مختصر دربار میں یہ دونوں عنصر موجود تھے - اسکی مصاحبت میں متعدد راجپوت رئیس رہا کرتے تھے اور کئی یورپین افسر، اسکے یہاں تعمیرات اور توپ خانہ کے عہدوں پر ممتاز تھے - تین واعظ مذہب جیسوئٹ کے تھے ایک ان میں سے نیپلز کا باشندہ تھا، جس کا نام مالپکا تھا - ایک پرتگالی، جیکزرٹی تھے اور ایک ملک فلینڈرس کا رہنے والا، ہنری بوزتھا، جسکا ذکر فرانس کے مشہور و معروف سیاح برنیر نے اس طرح کیا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسکا اثر شاہزادہ دارا پر بیحد تھا - برنیر ہی کا بیان ہے کہ شاہزادۂ موصوف کے پاس ویدوں کے ماہر، چند برہمن رہا کرتے تھے، جنکو گراں قدر وظائف ملتے تھے. اس نے کئی برہمنوں کو بنارس سے بلواکر، ان سے اپنشد کا فارسی ترجمہ کرایا اور کہا جاتا ہے کہ اسکا مقدمہ خود دارا نے اپنے قلم سے لکھا تھا -

یہ تمام باتیں صاف طور پر بتا رہی ہیں کہ اس نے اکبر کو اپنے سامنے نمونہ بنا کر رکھ چھوڑا تھا، اور کوشاں تھا کہ اگر اس سے آگے نہ بڑھ سکے تو کم از کم برابر ہو کر رہے - لیکن تقدیر کی نیرنگی عجیب چیز ہے کہ کیرکٹر کی جن خصوصیات سے ایک سلطنت کو استحکام پہنچا انھیں کی بدولت دوسرے کو نہ صرف تخت سے بلکہ اپنی عزیز زندگی سے بھی ہاتھ دھونا پڑا - اسکی وجہ تلاش کر لینا چنداں دقت طلب نہیں - اکبر نے اپنے نو ایجاد اور مغائرانہ خیالات کا افشا اسوقت کیا کہ تاج شاہی سر پہ زیب پا چکا تھا - برخلاف اسکے یہ دارا کی حماقت اور غیر انجام بینی تھی کہ تخت پر قابض ہونے سے پہلے ہی اسنے اپنے جد کے نقش قدم پہ چلنے کی ٹھہرالی - حالانکہ اسے معلوم تھا کہ اسکا ایک خوفناک حریف، خود اسی کے بھائی اورنگ زیب کی شخصیت میں موجود ہے - مسٹر کین کہتے ہیں کہ "حصول جانشینی سے پیشتر ہی اکبر کے رنگ میں ظاہر ہونے کی کوشش غیر مآل اندیشی کا انتہائی درجہ تھا جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ اسے اپنی عزیز جان سے کنارہ کش ہونا پڑا"!

شجاع جو بنگال کا صوبہ دار تھا، اپنے بڑے بھائی (دارا) سے کئی باتوں میں مماثلت رکھتا تھا لیکن وہ نسبتاً زیادہ ذہین، خاموش طبع اور راسخ الخیال واقع ہوا تھا - ہندو روسا و امرا کو رشوت دیکر اپنا بنا لینے کا گر اسے خوب یاد تھا بلکہ اسنے اپنے معاملہ میں ذی اقتدار ایرانی امیروں کی ہمدردی حاصل کرنے کی غرض سے شیعہ بن جانے میں بھی باک نہیں کیا - لیکن اس میں ایک زبردست کمزوری تھی، وہ حرم کی عیاشانہ دلچسپیوں اور تفریحوں پہ مٹا ہوا تھا خوبصورت اور مہ جبین خواتین سے قصر عالی کی زیب و زینت بڑھانے میں اسکا روپیہ اگر پانی کی طرح بہتا تو بھی وہ پروا نہ کرتا اور جب انکی صحبت میں شریک ہوتا تو اسکی حالت راجہ اندر کی سی ہوتی - رات رات اور دن دن بھر رقص و سرود اور شراب و کباب میں کٹ جایا کرتے تھے -

اورنگ زیب، فرزند ثالث، دکن کا گورنر تھا - اسکی کیفیت بالکل جداگانہ تھی - وہ بہادر بھی تھا اور سمجھدار بھی، مصیبت میں منتشر نہ ہوتا اور ہمیشہ تدابیر میں محو رہتا - عقائد و عبادات میں وہ پکا سنی تھا - اوائل عمر سے اس میں زہد و اتقا کی صفات موجود تھیں اور وہ کہا کرتا تھا کہ مجھے دنیاوی جھگڑوں اور نمایشوں سے بیزاری ہے اور میری تو دلی تمنا یہ ہے کہ مکہ معظمہ جاکر اپنی بقیہ زندگی خدائے واحد کی عبادت میں بسر کروں - طبیعت کا خاموش لیکن متین تھا اور شک کا مادہ اس میں قدرتی طور پر موجود تھا - شاہجہان نے اس کے متعلق

ایک دفعہ کہا تھا کہ اُسکا مزاج حد سے زیادہ شکی واقع ہوا ہے اور بمشکل کوئی آدمی ہوگا جس پر وہ بھروسہ کرتا ہو۔ یہ پیشین گوئی غیر معمولی طور پر صحیح ثابت ہوئی۔ اورنگ زیب نے کسی متنفس پر کبھی اعتماد نہیں کیا۔ اخفاے حقیقت میں اُسے کمال حاصل تھا۔ کرنل ڈو کہتے ہیں کہ

بالکل معمولی کاموں میں بھی اس کا طرز عمل سکوت آمیز، عیارانہ اور شک آمیز تھا۔ مذہب جو ملکی رخنہ پردازی کا سب سے بڑا ہتھیار ہے، اُسپر اورنگ زیب نہایت سختی سے قائم تھا۔ اسی کے زور سے اُس نے کمزور طبیعتوں کو دھوکہ میں ڈالا اور اسی طاقت سے بڑے سے بڑے دشمن کو بھی مغلوب کرکے اپنی عزت و احترام پر مجبور کر دیا۔ انسانی ہمدردی اور رحم دلی کے واسطے اگرچہ وہ مشہور نہیں ہے لیکن خونریزی میں بھی اُسے مزا نہیں آتا تھا۔ ہوا و ہوس البتہ اُسکا ایک محبوب جذبہ تھا اور اسی کی وجہ سے نازک تر حسیات طبعی زائل ہوگئی تھیں۔ جو لوگ اُس کے ارادوں کے خلاف ہوتے اُنکی مخالفانہ آراء کے دبا دینے کا اس میں ایک خاص ملکہ تھا اور اُسکی شاطرانہ چالیں دشمن کے حق میں تلوار سے زیادہ خوفناک تھیں۔

اگر کوئی چیز اورنگ زیب کے خصائص میں خصوصیت سے قابل ذکر نظر آتی ہے تو وہ یہ صفات تھیں۔ خوف کے وقت بُردباری و اطمینان کا قائم رکھنا؛ دوسرے مذہب کے ساتھ اسکا مستقل اور ناقابل تغیر تعلق۔ ایک مرتبہ وہ اُزبک قوم کے مقابلہ میں صف آرا تھا، دشمن اُسکو چاروں طرف سے محصور کیے ہوئے تھے۔ اتنے میں آفتاب غروب ہوا اور مغرب کا وقت آگیا۔ اورنگ زیب نہایت خاموشی اور سکون کے ساتھ گھوڑے سے اُترا اور نماز میں اس اطمینان سے مشغول ہوا گویا کہ جامع مسجد دہلی میں ادائے فریضہ کر رہا ہے۔ اس منظر کا اثر حکمران اُزبک کے دل پر بہت پڑا اور بیساختہ اُسکی زبان سے نکل گیا کہ ”ایسے آدمی سے لڑنا اپنے ہاتھوں ہلاک ہونا ہے“۔

عام اس سے کہ رقاصہ عورتوں کو تقاریب شاہی میں شریک ہونے کی ممانعت ہو، یا رقص و سرود کی بندش؛ جزیہ کا ازسرنو رواج ہو یا ہندوؤں کی تکلیف رسانی یا اُنکے معابد کا انہدام؛ مختلف العقیدہ اور مینوش بھائیوں کی تخت سے محرومی ہو یا شیعہ سلاطین دکن کے مقابلہ میں غیر مختتم لڑائیوں کا وجود؛ یہ تمام کام وہ محض اس لیے کرتا تھا کہ احکامِ شریعت کے مطابق ہیں۔ سوال یہ ہوتا ہے کہ اُس نے کیوں نہیں اکبر کے غیریت پسند فلسفہ سے فائدہ اُٹھایا؟ یا جہانگیر کی سی خوش باشانہ، یا شاہجہان کی سی راحت بخش زندگی بسر کرنا کیوں نہیں قبول کیا؟ اسکا جواب یہ ہے کہ صرف اسی وجہ سے کہ اُسکو اپنے ضمیر کے خلاف کوئی فعل کرنا گوارا نہ تھا۔ اورنگ زیب کے حقیقی کیرکٹر کی منزلت دریافت کرنے کا محض یہی ایک راستہ ہے ورنہ کسی اور معیار سے اُسکو جانچنا گویا نہ جانچنے کے برابر ہے۔

مُراد جو اپنے بھائیوں میں سب سے چھوٹا تھا، گجرات کا صوبہ دار اور طبعًا خوش مزاج اور جلدباز تھا۔ کام کی طرف زیادہ رغبت نہ ہونے سے وہ اپنا وقت زیادہ تر لہو و لعب میں کاٹتا تھا۔ وزراء کے ساتھ سازش کرکے کامیاب ہونے کے عوض وہ شجاعت و مردانگی سے مطلب برآری کو زیادہ پسند کرتا تھا۔ ہنسی اور مذاق میں وقت گذاری کرتا اور سمجھتا کہ اوقاتِ عزیز اچھے کٹ رہے ہیں۔ میدانِ جنگ میں وہ ایک خوفناک چیز تھا۔ اچھے اچھے جنگ آوروں میں اُسکا شمار ہوتا تھا۔ اُسکا بیان تھا کہ ”تختِ سلطنت کا باپ کی عنایت یا حق وراثت کے وسیلہ سے حاصل کرنا ایک عالی وقار شہزادے کے شایانِ شان نہیں، اور اگر بھائی نے سلطنت کے لیے تیغ آزمائی کا سامان نہ کیا ہوتا تو میں اُسکی طرف رُخ بھی نہ کرتا“۔

یہ تھے تختِ شاہجہانی کے حریف، اُس موقع پر کہ بادشاہ سلامت کی علالت نے قصر شاہی کے بھرے ہوئے ہوائے سلطنت کے آتشگیر مادہ میں گویا آگ لگا دی، جس کی وجہ سے آخرکار اسکے شعلے سلطنت کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک مشتعل ہوگئے۔

۱۶۵۶ء سے بعض ایسے مصائب کا آغاز ہوا جسکی نظیر زمانہ گذشتہ میں

---

[1] یہ ضرور نہیں کہ اصل مضمون کے بعض اختلافی مسائل اور معاندانہ آراء سے جنکا اظہار جا بجا ہوا ہے مترجم کو بھی اتفاق ہو۔

نہیں ملتی۔ پہلی مصیبت، جس کی وجہ سے سلطنت مغلیہ کو ناقابل تلافی نقصان اُٹھانا پڑا، وزیرِ اعظم سعد اللہ خاں کا واقعۂ ارتحال تھا۔ یہ ایک ہندو نومسلم تھے اور انکی نسبت یہ عام خیال تھا کہ عہدِ اکبری کے بعد سلطنت کو انکا سا قابل اور شاندار مدبر نہیں نصیب ہُوا۔ ٹھیک بارہ مہینہ کا عرصہ منقضی ہونے پایا تھا کہ علی مردان خاں کا انتقال ہوگیا، یہ ایرانی اُمراسے تھے۔ انہوں نے بزمانۂ جنگ و بحالت امن سلطنت کی نمایاں خدمات کی تھیں۔ دہلی کی مشہور نہر انھیں کی تعمیر کردہ ہے جس کے سبب سے انکی ایک دائمی اور تشکریہ آمیز یادگار دلوں میں مدت العمر قائم رہے گی۔ ان واقعات پر طرّہ یہ کہ خود بادشاہ سلامت کا مزاج اُسی سال (۱۶۵۷ء) اگست کے مہینہ میں ناساز ہوگیا۔ "گُردہ کی اچانک بیماری کے ساتھ حبسِ بَول کی شکایت پیدا ہوگئی تھی، جسکے باعث سے وہ بیٹھنے اُٹھنے سے بالکل معذور ہوگیا اور حالت اس درجہ نازک ہوتی گئی کہ زندگی کے آثار مفقود ہوگئے" (کرنل ٹوڈ) ایسی حالت میں انصرام مہمات حکومت کی گراں بار ذمہ داری قدرتی طور پر داراشکوہ کے سر آپڑی۔ اسکو کاروبار سلطنت کی انجام دہی کے علاوہ بادشاہ سلامت کی تیمارداری بھی کرنا پڑتی تھی اور یہ آخری فرض وہ غایت درجہ کی پسرانہ محبت کے ساتھ ادا کیا کرتا۔ بادشاہ کی طبیعت قدرے رُوبا صلاح ہونے کے بعد دارا کے ساتھ اُسکی محبت اور زیادہ بڑھ گئی جسکا ثبوت کئی صورتوں میں دیا گیا۔ شصت ہزاری منصب ملا، ۱۵ لاکھ کے جواہرات، ۲۰۰ راس اسپ عربی، متعدد ہاتھی معہ مغرق جھولوں کے مرحمت ہوئے، ۳۰ لاکھ کی جاگیر عطا کی گئی، شاہ بلند اقبال کے خطاب سے سرفراز ہونے کے علاوہ بادشاہ سلامت کے حضور میں طلائی کرسی پر بیٹھنے کا اعزاز حاصل ہُوا۔ اور یہ ایک ایسا اعزاز تھا جو خاندانِ شاہی میں کسی اور کے حصہ میں نہ آیا تھا۔ فرمان جاری ہُوا کہ احکام سلطنت داراشکوہ کے دستخط سے جاری ہُوا کرینگے۔ شاہجہان کہتا تھا کہ "جو شخص اپنے معمر باپ کی زندگی کو تخت ہندوستان کے مقابلہ میں قابل ترجیح سمجھے اُسکی سعادت مندانہ روش کا بدلہ دینا غیر ممکن ہے" غرض کہ اِس طریقہ سے گویا بادشاہ سلامت نے اپنے قول و فعل سے دارا کے ولیعہد ہونے کا اظہار اہل دربار کے سامنے کر دیا تھا۔ اور اسی پر قناعت نہیں کی بلکہ دارا کے فرزند یعنی سلیمان شکوہ کو منصب دہ ہزاری مرحمت کیا اور پسر ثانی سپہر شکوہ کو صوبۂ بہار کی گورنری پر ممتاز کیا۔ جسونت سنگھ، جو داراشکوہ کے مقربین میں تھا، اُسکے اعزاز و منصب میں بھی مناسب اضافہ کیا گیا۔

بادشاہ سلامت کی علالت نے سلطنت کے اندر ایک غیر معمولی ہلچل پیدا کر دی تھی۔ دارا اس کوشش میں تھا کہ یہ خبر دور دراز مقامات میں نہ پھیل سکے۔ خبر رسانی کا سلسلہ بالکل بند کر دیا، مشتبہ خطوط کے روکنے کا بندوبست ہوا، جن عہدہ داروں پر دور دست صوبجات میں پیغام رسانی کا شبہہ ہُوا وہ نظر بند کر دیے گئے، ہر سہ شاہزادگان (شجاع، مُراد، اورنگزیب) سے رسل و رسائل کی ممانعت اور اسکے خلاف عمل درآمد کرنے والے کے لیے سزائے موت قرار دی گئی۔ اُنکے متوسلین جو دربار میں تھے وہ قید اور انکے متعلق جتنے کاغذات اور احکام تھے وہ سارے کے سارے ضبط ہوگئے۔ حکم جاری ہُوا کہ افواجِ شاہی نبرد آزمائی کے لیے کیل کانٹے سے تیار رہیں۔ اسکے بعد جو کچھ وقوع میں آیا اُس کا انکشاف برنیر نے ان الفاظ میں کیا ہے :۔

> مغل کی علالت نے تمام ممالک محروسہ کو خوف و مضطرب کر دیا۔ دارا نے آگرہ اور دہلی میں جو حکومت کے ممتاز شہروں میں تھے، زبردست فوجی جمعیتیں اکٹھا کریں۔ بنگال میں سلطان شجاع کی جانب سے اسی قسم کی تیاریاں نہایت زور و شور سے عمل میں آئیں۔ اورنگزیب دکن میں تھا اور مُراد گجرات میں۔ ان دونوں نے بھی بقدر حاجت فوجی اجتماع کا انتظام کیا۔ چاروں بھائیوں نے اپنے اپنے یاروں اور مددگاروں کو اپنے گرد جمع کیا۔ خطوط لکھے گئے، وعدے وعید ہوئے، اور اس طرح مختلف اور مناقض سازشیں مرتب ہوگئیں۔ بعض خطوط جو انھیں باتوں سے تعلق رکھتے تھے دارا کے ہاتھ آگئے، اور اُس نے انکو اپنے باپ کے سامنے پیش کرکے اُسے بھائیوں کی طرف سے نہایت برافروختہ کر دیا۔ .... اسی اثناء میں

بادشاہ کی طبیعت دائرۂ اعتدال سے پھر متجاوز ہونے لگی اور یہ خبر مشہور ہو گئی کہ بادشاہ سلامت نے انتقال کیا۔ اہل دربار میں پریشانی کا عجیب عالم تھا۔ آگرے کا طبقۂ عوام خوف و ہراس یا خستہ ہو رہا تھا۔ کئی دن تک دوکانیں مطلقاً بند رہیں۔ چاروں شاہزادگان والا تبار نے گویا یہ اعلان کر دیا تھا کہ باہمی اختلافِ عظیم کے تصفیہ کے لیے ثالث بالخیر کا کام تلوار دیگی۔ اسوقت مصالحت باہمی یا نزاعِ خصومت کا موقع حقیقۃً ہاتھ سے نکل جا چکا تھا۔ اب یہ بات متیقن تھی کہ اگر تخت حاصل ہو سکتا ہے تو فتح سے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی ایک کھلی ہوئی بات تھی کہ بحالت شکست زندگی سے ہاتھ دھونا پڑیگا۔ گویا ایک بازی تھی جس میں سوائے "سلطنت" یا "موت" کے کوئی تیسری چیز ہاتھ آنیوالی نہ تھی۔

باوجودیکہ دارا نے حفظ ماتقدم کا کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا، تاہم صورت معاملات چھپائے نہ چھپ سکی۔ بادشاہ کی وفات کی خبر آتش مشتعل کی طرح پھیلی اور دُور دراز مقامات میں پہنچ گئی۔ شجاع نے سب سے پہلے بہار کی طرف پیش قدمی کی اور آگرے کی طرف کوچ کر دیا۔ دارا نے وقت کو ضائع نہیں جانے دیا، بلکہ شاہزادۂ سلیمان کو بمعیت راجہ جے سنگھ والی امیر بعجلت تمام شجاع کی مزاحمت کی غرض سے روانہ کیا۔ شجاع کو جو بالکل عالم بیخبری میں تھا شکست فاش حاصل ہوئی اور وہ پسپا ہونے پر مجبور ہوا۔ راجہ جسونت سنگھ کی ماموری بھراہی قاسم خاں، مراد کے مقابلہ پر ہوئی تاکہ اسکی جمعیت، دکن والے چالاک وشاطر بھائی کی فوج سے متحد نہ ہونے پائے۔

اورنگ زیب یکایک میدان میں نہیں اترا۔ بلکہ اُسنے سب سے پہلے اپنی تمام اعلیٰ دماغی قوتوں سے اپنی پوزیشن کو مستحکم اور اپنے حربہ کو کامیاب بنانے کی کوشش کی۔ آگرے میں جو واقعات ظہور پذیر ہوے تھے اُنکی رتی رتی خبر اُسکے ماموں شایستہ خاں اور بہن روشن آرا کی معرفت اُسے پہنچتی رہتی تھی۔ جس شخص سے دارا سب سے زیادہ خائف تھا وہ اورنگ زیب کی ذات تھی۔ اور اسی لیے اُسنے کوئی سعی، جس سے موخر الذکر کے اثر کو صدمہ پہنچنے کی خفیف سی بھی اُمید تھی، اُٹھا نہیں رکھی۔ اُسنے بادشاہ کے نام سے میرجملہ اور دیگر افسران فوج متعینۂ دکن کے نام احکام جاری کیے کہ وہ فوراً دارالخلافہ کو روانہ ہو جائیں۔ آگرے میں شایستہ خاں کی بڑی گت بنائی گئی، اور عیسیٰ بیگ، جو دربار شاہجہانی میں اورنگ زیب کے وکیل کی حیثیت رکھتا تھا اُسکے ساتھ بدسلوکیاں کی گئیں۔ امین پسر میرجملہ کو نظربند کر دیا گیا۔ اورنگ زیب کو، جو میرجملہ ایسا ہنرمند وذی اثر سپہ سالار ہاتھ سے دینا نہ چاہتا تھا، اس موقع پر ابلہ فریب طرزِ عمل اختیار کرنا پڑا۔ اُسنے نمایشی طور پر میرجملہ کو مقید کر دیا۔ اس سے اتنا تو ضرور ہُوا کہ دارا کے پاس اب کوئی معقول بہانہ میرجملہ کے اہلِ خاندان سے تعرض کرنے کا باقی نہ رہا۔

یہ سیاسی حکمتِ عملی کامیاب ثابت ہوئی۔ اور اس طرح میرجملہ کی فوج کے ساتھ اُسکی دماغی قوتیں بھی اورنگ زیب کے تصرف میں آئیں۔ اُسکی برافروختگی کا سامان دارا کی جانب سے پورا پورا ہُوا تھا لیکن اورنگ زیب، صبر وتحمل سے کام لے کر، دارالسلطنۃ کی طرف، نہایت خاموشی سے اس طرح روانہ ہُوا کہ کسی کو اُسکے منشا کی اطلاع تک نہ تھی۔ شجاع و مراد کو اُسنے اپنے حال پر چھوڑا کہ علانیہ مخاصمت کے نتیجے بھگتیں اور دارا سے جنگ آزمائی کرکے اپنی متفرق قوت کو اور کمزور کریں۔ البتہ وہ اسکے بعد اس تدبیر میں ضرور تھا کہ مراد کو اپنے حصول مطلب کا ذریعہ گردانے۔

اُس نے نہایت موثر و محبت آمیز لہجہ میں اُسے خط لکھا جس میں تخت نشینی کی مبارکباد دیتے ہوے تحریر تھا کہ میں تمھاری مدد کو ہر وقت موجود ہوں۔ آخر میں یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ جب تخت سلطنت تمھارے قبضہ میں آجائیگا تو اسکے بعد میری اور کوئی خواہش سوائے اسکے نہ ہوگی کہ دنیائے ناپائدار سے کنارہ کش ہو کر بیت اللہ ہجرت کر جاؤں اور وہاں اللہ اللہ کیا کروں۔ اُسکی یہ تمام باتیں اس قدر بناوٹی اور پُرفریب تھیں کہ سوائے مراد کے جو ذاتی طور پر فراخ دل ہونے کے علاوہ دوسروں کو بہ نگاہ شک دیکھنے کا مطلقاً عادی نہ تھا، اُنکا یقین کسی کو بمشکل آتا۔ اسی خط میں ایک جگہ لکھا تھا کہ دارا لامذہب ہے اور شجاع بے دین، اور اس لحاظ سے یہ دونوں حکمرانی

کے قابل نہیں"۔ اپنے متعلق لکھا تھا کہ "میں نے بہت دنوں سے اپنے آپ کو عبادت الٰہی کے لیے وقف کر رکھا ہے، میری صرف یہ خواہش ہے کہ اطمینان قلب کے ساتھ اپنے کام میں لگا رہوں۔ تاہم اپنی عاجزانہ امداد کے ساتھ تمہاری معاونت کو ہر وقت آمادہ ہوں کہ عصائے شاہی تمہارے ہاتھ میں آئے، جو اہل ہند نے اپنی متفقہ خواہشات کی بنا پر پہلے ہی سے تم کو دے رکھا ہے۔ اسکے بعد اگر تم سے ہو سکے تو میرا خیال کرنا اور میرے لیے انتظام کر دینا کہ کُنج عزلت میں بیٹھکر زندگی کے چند انفاس عبادت و ریاضت میں گذار دوں"۔ غیر قرین قیاس ہے کہ مراد کو اس قسم کے ناقابل اعتبار بیان کا یقین آگیا ہو لیکن اس شاطرانہ چال پر ایک لاکھ روپیہ نقد ہدیہ کا سنہیں پردہ پڑا ہوا تھا جو اورنگ زیب نے اپنے صادقانہ جذبات کے ثبوت میں بطور پیشکش بھیجا تھا۔ غرضکہ اس طرح سادہ لوح مراد کے حلق سے یہ تلخ دوا، جسکی طلائی آب و تاب دلکشی کی شان رکھتی تھی، اُتار دی گئی۔ اور مراد نے اسکے جواب میں لکھ بھیجا کہ وہ مع اپنی فوج کے اورنگ زیب کا ساتھ دینے اور احمد آباد کی طرف کوچ کرنے پر ہمہ تن تیار رہے۔

مارچ ۱۶۵۸ء کے آخر میں اورنگ زیب برہان پور سے چل کر نربدا کنارے خیمہ زن ہوا، جہاں چند دنوں کے بعد مراد بھی اُس سے آملا۔ اس جگہ انھیں یہ معلوم کر کے حیرت و استعجاب کے ساتھ مایوسی کا بھی سامنا کرنا پڑا کہ جسونت سنگھ بعد فتح اُجین، انکی مزاحمت کے لیے موجود ہے۔ اگر راجہ جسونت سنگھ نے غنیم کی فوج پر اُسی روز حملہ کر دیا ہوتا جس دن وہ لب نربدا اُتری تھی تو چونکہ تکانِ سفر سے وہ ماندہ و شکستہ ہو رہی تھی اس لیے بہت آسانی سے اُسکو ہزیمت دے سکتا تھا، لیکن اُسکے اندر راجپوتی غرور و تبختر کا اس درجہ اثر تھا کہ اُسنے ایک ہی وقت میں دونوں شاہزادوں کی متحدہ افواج کو شکست پہنچانے کا ارادہ کیا اور اس طرح ایک کامیاب حملے کا موقع ہاتھ سے جاتا رہا۔ اسی اثنا میں اورنگ زیب نے کچھ ایسا کیا کہ افواج شاہی میں مخالفت باہمی کا بیج پڑ گیا اور اُسنے قاسم خاں کو یہ کہہ کر کہ ہم مذہبوں کے مقابلہ میں صف آرا ہونا بجائے خود کفر ہے، اپنی طرف توڑ لیا۔ پہلا مقابلہ شاہی رسالہ سے ہوا لیکن اُسے شکست ملی۔ اسکے بعد راجہ جسونت سنگھ نے اپنے بہادر و شجاع راجپوتوں کو لے کر حملہ کیا اور باقی تمام فوج معرکۂ کارزار سے کنارہ کش رہی۔ عین اُسی وقت مراد میدان جنگ میں اُترا، اور قاسم مع دوسرے مسلمانوں کے راجہ جسونت سنگھ سے علیحدہ ہو کر اِدھر چلا آیا اور غریب راجپوتوں کو خوں ریز لڑائی کا نتیجہ بھگتنا پڑا۔ اُنھوں نے نہایت بے جگری سے مقابلہ کیا یہاں تک کہ اٹھارہ ہزار میں سے صرف ۶۰۰ جانیں باقی رہ گئیں۔ جسونت سنگھ کو اس ہزیمت سے اس درجہ انفعال ہوا کہ وہ اپنے ملک کو واپس چلا گیا۔

اس جگہ ایک موثر واقعہ کا ذکر کرنے سے باز نہیں رہا جا سکتا جسکا تعلق روایات راجستان سے ہے۔ جس وقت راجہ اپنی عفت مآب و باغیرت رانی کے پاس پہنچا تو موخر الذکر کو اسکی شکست کی پہلے سے اطلاع ہو چکی تھی لیکن اُسنے بجائے اسکے کہ راجہ کی مع الخیر واپسی پر خوش ہوتی یا تسکین و تشفی آمیز کلمات کہہ کر اُسکو ڈھارس دیتی، محل کے پھاٹک بند کرا دیے اور کہنے لگی کہ میں ہزیمت خوردہ شوہر کا مُنہ دیکھنا نہیں چاہتی۔ راجہ نے کہلوایا کہ اگرچہ مجھے شکست ہوئی ہے لیکن اسلاف کی بہادری کا نمونہ میں نے لڑائی میں دکھا دیا ہے، جسکی شہادت مقتولین کی تعداد سے مل سکتی ہے۔ لیکن رانی نے اسکو قبول نہیں کیا بلکہ اُسنے جواب میں کہا کہ

مرنے والے تو مر گئے اور شکست کھانا بھی راجوں مہاراجوں کے لیے کوئی نئی بات نہیں لیکن شکست کھانے کے بعد بھی زندہ رہنا البتہ نئی بات ہے۔ عورت کی طرف سے اور اس لحاظ سے بھی کہ جسونت کو اُن باعظمت بزرگوں کے گھر میں داماد بن کر آنے کی عزت حاصل ہوئی تھی اُنھوں نے گویا اپنے ناموس کا کفیل جسونت کو بنا دیا تھا لیکن اُس کے میدان جنگ سے بھاگنے کی وجہ سے اُسپر تمام پانی پھر گیا اب میرے شوہر کا صرف یہ کام رہ گیا ہے کہ وہ اپنی فوج کی ہزیمت کی داستان لوگوں کو خود سنائے اور لوگوں کو بتائے کہ گویا وہ بے عزتی کی بہ نسبت موت سے زیادہ ڈرتا ہے۔ لیکن اب میرا شوہر کہاں ہے وہ آدمی جو باہر کھڑا ہے محض ایک غاصب ہے۔ جسونت سنگھ میرے لیے اب ہمیشہ کو

مرگیا - راجاؤں کی زندگی، عظمت و شہرت کے ضائع ہو جانے کے بعد قائم نہیں رہتی۔

شجاعت و دلیری کے متعلق یہ پُرعظمت اور قابلِ فخر جذبات تھے جو اس راجپوت خاتون کے دل میں جاگزیں تھے! راجہ نے آخر یہ اقرار کرکے رانی کو پھاٹک کھولنے پر راضی کیا کہ وہ ایک نئی فوج مرتب کرکے گنوائی ہوئی عزت دوبارہ حاصل کریگا - مسٹر ایم لین پُول فرماتے ہیں کہ

رانی کا راجہ سے بالآخر راضی ہو جانا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ چیتور کے نیور خاندان کی لڑکی ہونے کے باوجود وہ پھر بھی عورت ذات تھی -

جسونت سنگھ کی شکست سے دارا نہایت غضبناک ہوا - نہ اُسنے باپ کے مشورہ پر کان رکھا، نہ سلیمان کا انتظار کیا بلکہ بذات خود مقابلہ کے لیے فوج لیکر، جسکی تعداد اور جسکا تزک و احتشام گویا اس امر کی ضمانت تھی کہ اسکے آگے کوئی نہ ٹھہر سکے گا، دریائے چمبل کے کنارے وارد ہوا - اورنگ زیب اس سے پہلے ہی اس دریا کو پار کرچکا تھا - شاہی چوکیاں وہاں تھیں لیکن غدار شایستہ خاں نے دو رہبر ایسے بھیج دیے تھے جن کی رہنمائی میں اورنگ زیب پہاڑیوں میں سے ہوکر ایک غیر معروف راستہ سے نکل گیا - برنیر کے قول کے مطابق چمپٹ کو جو اُس ملک کا راجہ تھا، رشوت دیکر اسس امر پر راضی کرلیا گیا تھا کہ وہ شاہزادے کو ندی کے پایاب حصہ سے گزر جانے دے - مختصر یہ کہ اس طریقہ سے ہندوستان کے آیندہ شاہنشاہ نے ندی کو طے کیا اور یلغار کرتا ہُوا آگرے کی طرف بڑھا - دارا نے نہایت جاں کاہی اور مشکل کے بعد اُسکو روک کر طرح جنگ ڈالنے پر مجبور کیا - ۷ - جون ۱۶۵۸ء کو بمقام ساموگڑھ، جو آگرے سے بجانب جنوب مشرق چند میل کے فاصلے پر واقع ہے دونوں فوجوں کا مقابلہ ہوا[ف ۵] - آگرے کی سی فرمایشی گرمی پڑ رہی تھی اور تپش کی یہ شدت تھی کہ تمازت آفتاب سے آدمیوں کی جان نکل رہی تھی - اس اثنا میں شاہجہاں نے ولیعہد (دارا) کو متعدد مرتبہ لکھا کہ سلیمان کے پہنچنے تک جنگ ملتوی رکھی جائے - لیکن دارا کے جوابات سے اُسکی غیر ضروری عجلت اور ناعاقبت اندیشی کا پتہ چلتا ہے - غیر مآل اندیش شاہزادے نے لکھ بھیجا کہ تین دن کے اندر میں اپنے باغی بھائیوں کو پابزنجیر و دست بستہ حضور میں آخری فیصلہ کے واسطے لاکر پیش کرتا ہوں - اور اس عریضہ کی روانگی کے بعد اس نے جنگ کا انتظام شروع کر دیا -

باقی دارد

فلسفۂ اخلاق

انسان کو کھانا کھانے کی خواہش نہ پیدا ہوتی اور وہ بھوک سے بیتاب نہ ہو جاتا تو یہ خیال کہ غذا جسم انسان کی پرورش کے لیے ضروری ہے کبھی انسان کو جسم کی نگہداشت اور بدل ما یتحلل مہیا کرنے کی طرف مستعدی سے رجوع نہ کرتا، اور انسان کا جسم روز بروز نحیف ہوتا جاتا - اگر ماں باپ کو بچہ کی محبت فطری نہ ہوتی اور وہ ایک بیکس بچہ کی پرورش پر طبعاً مجبور نہ ہوتے تو محض اس خیال سے کہ نسل انسان کی حفاظت دنیا کی آبادی اور رونق کا موجب ہے، غریب اور بیکس بچوں کی پرورش و حفاظت کی تکالیف اور مصارف بہت کم برداشت کرتے - اور شاید نسل انسانی دُنیا میں باقی نہ رہتی - اسی طرح اگر انسان کی تمام حاجتیں صرف سمجھ اور عقل کی خبرگیری ہی پر منحصر ہوتیں اور علم و دولت، آزادی و شہرت، دوست و احباب کا حاصل کرنا فقط اُسی کے ایما سے ہوتا تو انسان کی زندگی طرح طرح کی مشکلوں اور پیچیدگیوں کا جال بنجاتی - لیکن قدرت کا قانون اس سے بالکل جدا ہے - قدرت نے انسان کے دل میں خود اپنی

ف ۵ اگر ساموگڑھ وہی مقام ہے جس کو حسب فٹ نوٹ مضمون اصل اب فتح آباد کہتے ہیں تو اسکا آگرہ سے چند میل کے فاصلہ پر واقع ہونا از روئے جغرافیہ غیر صحیح ہے - فتح آباد اُجین سے چند میل کے فاصلہ پر البتہ واقع ہے اور یہیں وہ فیصلہ کن جنگ بھی ہوئی تھی جسکی کامیابی کے بعد اورنگزیب اورنگ عالمگیری پر متمکن ہوا - (مترجم)

پیدا کی ہے جو اُن تمام اشیا اور حالتوں اور کیفیتوں کو طلب کرتی ہے جو انسان کے لیے ضروری اور نافع ہیں اور خواہش انسانی سے وہ کام لیتی ہے جس سے وہ اشیا یا وہ حالتیں اور کیفیتیں حاصل ہوتی ہیں۔ یہاں تک کہ جس قدر زیادہ اہم کام ہو اُسی قدر قوی خواہش پیدا ہوتی ہے اور اسی قدر زائد اُس کے حصول سے حظ حاصل ہوتا ہے۔ اس سبب سے خوراک، مکان، لباس اور ضروریات کا مہیا کرنا یا تمدن کی طرف مائل ہونا انسان کسی عقل کی پیروی یا مصلحت اندیشی سے نہیں کرتا بلکہ خواہش فطرتی اُس سے ان تمام کاموں کا سرانجام کراتی ہے۔ بقاے نسل کی خواہش انسان میں اس قدر قوی ہے کہ اسکی تعمیل انسان بہ اتباع عقل و دور اندیشی کرتا تو درکنار اکثر خلاف عقل و مصلحت بھی کر بیٹھتا ہے۔ اسی طرح دولت جمع کرنے کی خواہش بخیلوں میں مآل اندیشی کی راہ سے نہیں ہوتی بلکہ وہ اُن نتائج اور فوائد کو بھی جو دولت سے حاصل ہونے چاہییں دولت جمع کرنے پر قربان کردیتے ہیں، اور اُس سے کوئی حقیقی نفع نہیں اُٹھاتے۔ اسی طرح انسان کی تحریکات طبعی اُسکی صحت و بقاے جسم کی رہنمائی کرتی ہیں، اور تحریکات سے وہ تعلقات پیدا ہوتے ہیں جن پر انسان کی دنیوی راحت اور حفاظتِ جان و مال منحصر ہے۔ منزل اور شہر کا انتظام باضابطہ اور باقاعدہ رکھنے کے لیے ضرور ہے کہ لوگوں کا چال چلن ایسا عمدہ اور منصفانہ ہو کہ وہ دوسرے لوگوں پر ظلم و زیادتی نہ کریں اور جس طرح اپنے حقوق اور فوائد کا خیال مدنظر رکھتے ہیں اُس طرح دوسروں کے حقوق اور فوائد کا بھی خیال کرکے اُن کو پامال نہ کریں تاکہ سررشتۂ انتظام تمدن جس پر اسکی بہبودی کا انحصار ہے باہمی برتاؤ سے درہم برہم نہ ہوجاے۔ اس ضرورت نے انسان کی طبیعت میں دوسرے لوگوں کے ساتھ ایسا برتاؤ کرنے کی خواہش پیدا کی جس سے نہ اپنے تئیں کسی طرح کا نقصان پہنچے اور نہ دوسروں کو۔ اس خواہش کا نام اخلاق ہے۔ لیکن انسان کی طبیعت میں اخلاقی مادہ موجود ہونے پر بھی ہزاروں آدمی اُسکے احکام کی پوری پوری تعمیل نہیں کرتے اور تقریباً ہر شخص سے خلاف اخلاق کچھ نہ کچھ ظہور پذیر ہوتا ہے۔ ایک قوم اور ایک فرقہ جن امور کو داخلِ حسنات سمجھتا ہے دوسری قوم اور دوسرا فرقہ اُسکو افعال قبیحہ سے تعبیر کرتا ہے مثلاً غارت گری ایک ٹھگ کے لیے مذہبی فعل ہے اور ایک مہذب شخص کے لیے گناہ عظیم۔ بات یہ ہے کہ فقط اخلاقی تحریک ہی پر منحصر نہیں ہے، ہر خواہش کی یہی کیفیت ہے کہ انسان اُسکے اقتضا کی کماحقہ تعمیل میں غلطی کرتا ہے۔ غذا بقاے جسم کے لیے ضروری ہے، اور بھوک اور قوت ذائقہ اُسکا تقاضہ کرتے اور اُسکو خوشگوار بناتے ہیں، لیکن انسان اکثر ایسی غذا کھاتا یا اسقدر کھا جاتا ہے کہ بجاے نفع اسکو نقصان پہنچ جاتا ہے۔ محبت اولاد کا اقتضا بچوں کی پرورش اور تربیت ہے لیکن انسان اُس میں ایسی غلطیاں کرتا ہے کہ بچوں کے قواے جسمانی اور دماغی دونوں کو اکثر اوقات نقصان پہنچ جاتا ہے۔ محبت کے اقتضا کے خلاف دختر کشی کی رسم مدت تک اکثر قوموں میں جاری رہی ہے، جو محض پابندی رسم اور اقتضاے رواج سے تھی نہ کہ اخلاقی تحریک سے۔

اخلاقی تحریک اخلاقی تحریک کا اثر اکثر اور اُسکا ظہور مختلف طبیعتوں میں مختلف پہلوؤں سے ہوتا ہے۔ ہر شخص ایک ہی شے کے اُس پہلو کو اختیار کرتا ہے جس سے اُسکو خوشی اور اطمینان حاصل ہو سکتا ہے۔ مثلاً بخیل شخص جزرسی اور انتہائی کفایت شعاری کے پہلو کو اختیار کرتا ہے اور اُس میں جہاں تک اُس سے ہوسکتا ہے مبالغہ کرتا ہے، اور فضول خرچ اسرافِ بےجا کو اختیار کرتا ہے۔ ان میں سے پہلا شخص روپیہ جمع کرنے کو اور دوسرا خرچ کرنے کو کار خیر سمجھتا ہے۔ پس کسی شے کو اچھا سمجھ کر اُسپر کاربند ہونے کی خواہش کرنا اور جس کو بُرا جاننا اُس سے نفرت کرنا ہی اخلاق کی بنیاد ہے۔ رہی یہ بات کہ آیا نتائج بھی اُس سے عمدہ اور بہتر نکلتے ہیں یا اسکے خلاف بُرے اور مضر اخلاق کی عدم موجودگی ظاہر نہیں کرتی بلکہ اگر کسی ایسی شئے کو جو فی الحقیقت مضر ہے عمدہ سمجھ لیا ہے تو یہ قوتِ تمیز کا قصور ہے اور اسکے لیے عقل و علم کی حاجت ہے۔ انسان کی طبیعت میں یہ استعداد ہے کہ وہ اجسام کی پیمایش کر سکتا ہے۔ وہ کسی شئے کے حدود اربعہ رقبہ جسامت وغیرہ کو معلوم کرتا اور اُنکا اندازہ کرسکتا ہے لیکن اگر انسان طبیعت کی اس قوت پر ہی اکتفا کرکے ابعاد ثلاثہ یا رقبہ وغیرہ

کا اندازہ کرے تو بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ وہ اندازہ صحیح ہو بلکہ انسان نے اسکے واسطے اصول موضوعہ اور علوم متعارفہ وضع کرکے بہت سی ایسی اشکال علمی دریافت کی ہیں جن کی مدد سے خطوط زاویوں مربعوں دائروں اور تمام اشکال ہندسہ کے خواص معلوم ہوجاتے ہیں۔ یہ ناممکن تھا کہ انسان اِن تمام نتائج کو حاصل کرنے کے لیے، جنھیں وہ قواعد ہندسہ کے استعمال سے حاصل کرتا ہے، فقط اپنی عقل ہندسی پر بھروسا کرتا اور صحیح نتائج معلوم کرلیتا۔ اسی طرح صرف طبیعت میں تحریک اخلاقی موجود ہونے سے تمام نتائج اخلاقی نہیں ہوجاتیں بلکہ جس طرح عقل ہندسی سے اصول علم ہندسی پیدا ہوتے ہیں اسی طرح تحریکات اخلاق کا کام یہ ہے کہ اصول اخلاق وضع کیے جائیں اور وہ غلطیاں جو صرف تحریکات اخلاقی کے اندھا دھند استعمال سے پیدا ہوتی ہیں دُور ہوجائیں۔

علم اخلاق | علم اخلاق ایسا ضابطہ قانون ہے جسپر عمل کرنے سے ہر شخص انسان کامل بنجاتا ہے۔ جو شخص جسقدر قانون اخلاق کا زیادہ پابند ہوگا وہ اسی قدر کمال تہذیب کے زینہ سے قریب ہوگا۔ علم اخلاق کا موضوع اعلیٰ درجہ کی راست کرداری ہے اور اُسکا مقصد ایسے تعلقات قائم کرنا ہے جن پر تمام انسان باہمدگر قائم رہکر فلاح و بہبود حاصل کرسکتے ہیں۔ وہ اصول اخلاق کی خلاف ورزی بیان نہیں کرتا۔ مثلاً وہ بیان کرتا ہے کہ قرضہ ادا کرنا فرض ہے، لیکن یہ کہ آیا قرضدار قید کیا جائے یا نہ کیا جائے، اخلاق کے قانون سے باہر ہے۔ علم اخلاق صرف اسقدر کہیگا کہ قرضہ نہ ادا کرنے سے اخلاق کا ایک قانون ٹوٹ گیا جو ایک خرابی پیدا کرنے والا ہے۔ ایک مہندس کسی مسئلہ ہندسی کو اُسی صورت میں حل کرسکتا ہے جبکہ خط نقطہ دائرہ زاویہ وغیرہ انھیں تعریفات کے مطابق ہوں جو علم ہندسہ میں مقرر کی گئی ہیں۔ اگر اُس سے ایسا سوال کیا جائے جس میں یہ چیزیں اپنی تعریفات کے مطابق نہوں تو وہ صاف جواب دیگا کہ یہ حل نہیں ہوسکتا۔ یہی حال فلسفۂ اخلاق کا ہے۔ مثلاً وہ یہ بیان کرتا ہے کہ ایک انسان کامل دوسرے انسان کامل کے ساتھ کس طرح پیش آتا ہے اور کامل انسان کس طرح ایک قوم یا گروہ بناتے یا ایک تمدن قائم کرتے ہیں۔ علم الاعضاء سے جسم کے مختلف اعضاء کے کام معلوم ہوتے ہیں مگر اُس میں یہ فرض کرلیا جاتا ہے کہ جسم کا ہر ایک عضو کامل صحت کی حالت میں ہے اور وہ اپنا کام پوری طاقت اور قوت سے کر رہا ہے۔ وہ یہ نہیں بیان کرتا کہ بیماری کی حالت میں یہ عضو کیسا کام کریگا۔

اخلاقی خرابیوں کی وجہ | تمام اخلاقی خرابیاں اس وجہ سے پیدا ہوتی ہیں کہ جسم اپنی مناسب حالت میں نہ ہو۔ اگر کوئی درخت کسی زمین میں مرجھا جائے یا روشنی نہ پہنچنے کے سبب پژمردہ ہوجائے یا شدت سرما سے ٹھٹھر جائے تو اُسکی یہ وجہ ہے کہ درخت کی طبیعت اور حالات خارجی میں توافق اور مناسبت نہیں رہی ہے۔ ہر ایک تکلیف و حادثہ یا بیماری کا واقعہ جو انسان کو پہنچتا ہے خواہ وہ خفیف دردسر ہو یا مرض موت، ذراسی موچ یا کوئی ایسا حادثہ جو مرگ مفاجات پیدا کردے، سب کا سبب یہی ہے کہ جسم ایک ایسی حالت میں ہوتا ہے جسکے لیے اُسکی قوت مناسب نہ تھی۔ یہی حال تمام قسم کی خرابیوں کا ہے کہ ملکات طبعی اور اُنکے حلقہ عمل کے درمیان تناسب و توافق نہونے کے سبب پیدا ہوئی ہیں۔ یہی حال تمدنی اور معاشرتی خرابیوں کا ہے کہ جب لوگوں کا چال چلن اور رویہ قانون اخلاق کے موافق نہوگا تو اُن میں خلفشار پیدا ہوگا۔ تمدن میں سکون اور اطمینان رہنے کا اصول یہ ہے کہ ہر شخص کی خواہشیں اُس حد تک محدود رہیں کہ دوسرے لوگوں کے امن اور اُنکی جائز خواہشوں کے پورا کرنے کی قابلیت میں خلل نہ پڑنے پائے اگر ہر شخص کی خواہشیں ایسی محدود نہ ہونگی تو یا سب لوگوں کی سب خواہشیں پوری ہوے بغیر رہ جائیں گی یا بعض لوگ اپنی خواہشیں من مانی پوری کرینگے اور دوسرے محروم رہ جائیں گے۔ تہذیب کا مادہ انسان میں اکتسابی نہیں بلکہ فطرتی ہے۔ جو اصلاحیں انسان کی حالت میں ہوچکی ہیں اور ہوتی جاتی ہیں وہ اُس قانون فطرت کا نتیجہ ہیں جو تمام انسانوں میں مخفی ہے۔ اور تمدنی حالت میں یہ اصلاحیں اُسوقت تک جاری رہیں گی جب تک کہ

انسان کمال کے درجے تک نہ پہنچ جائے۔

عدالت | تمدنی حالت میں ہر شخص کا حق اور دائرۂ عمل محدود ہے اور تمدن کی تمام و کمال برکتیں حاصل کرنے کے لیے ضرور ہے کہ ہر شخص اپنے ہی حق اور دائرۂ عمل میں اپنی خواہشات کو پورا کرے اور دوسروں کے حقوق پامال نہ کرے کیونکہ یہ ظاہر ہے کہ اگر ایک شخص کسی دوسرے شخص یا بہت سے لوگوں کی حق تلفی کیے بغیر اپنی خواہش کو پورا نہیں کر سکتا تو یا وہ خود اس کامل خوشی سے محروم ہیگا جو تمدن میں اسکا حصہ تھی یا ایک یا زیادہ آدمیوں کو اس خوشی سے محروم رکھے گا۔ ایسی حالت میں پورے تمدن کی حالت ویسی اعلیٰ اور عمدہ نہ ہوگی جیسی کہ چاہیے۔ لہذا ہر شخص کو اپنے حقوق کے دائرہ پر قناعت کرنا اور دوسروں کی حق تلفی نہ کرنا اخلاقاً واجب اور فرض ہے اور اسی کا نام عدالت ہے۔

اخلاق و تمدن | انسان کی طبیعت میں اخلاق کی بنیاد اسکے متمدن ہونے کی وجہ سے قائم ہوئی۔ جہاں تمدن نہ ہو وہاں اخلاق ایک بےمعنی لفظ ہے جب انسانوں میں باہم مل کر رہنے کی عقل آئی اور ان میں اتنا تمدن پیدا ہوگیا کہ وہ بچوں کی پرورش کرنے اور گروہ بنا کر رہنے لگے تو انکے دل میں اخلاقی تحریک پیدا ہوگئی، کیونکہ تمدن کی خواہش کے ساتھ اپنے ابنائے جنس میں شامل ہونے کی خوشی حاصل ہوتی ہے اور انکے ساتھ دل میں ایک قسم کی ہمدردی پیدا ہوجاتی ہے

دوم - جب قوائے عقلی زیادہ کامل ہوجاتے ہیں تو تمام گذشتہ افعال و حرکات کی تصویریں ہر شخص کے دماغ میں گزرتی رہتی ہیں اور اگر یہ معلوم ہو کہ کسی وقت کوئی عمدہ فعل جسکا فائدہ قیام پذیر تھا اس سبب سے ترک ہوا یا کما حقہ ادا نہ کیا گیا کہ کوئی دوسری ایسی خواہش یا جذبہ جو فی نفسہ ویسا عمدہ اور نتیجہ خیز نہ تھا جیسا کہ وہ ترک شدہ فعل اور جسکی لذت و منفعت بہت ناپائدار تھی اسپر غالب آگیا تو طبیعت کو ملال ہوتا ہے۔

سوم - جب نطق کی قوت پیدا ہوگئی اور سوسائٹی کے ضروریات اور جذبات کا اظہار کیا جانے لگا تو یہ رائے کہ سوسائٹی کے ہر ممبر کو کس طرح عمل کرنا چاہیے کہ عموماً سب کو اس سے فائدہ اور راحت پہنچے تمام جذبات پر غالب آگئی، اور اسکا انسان کے افعال و اعمال پر اثر پڑنے لگا۔ مگر یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ پبلک کی رائے کی خواہ کسی قدر وقعت و عزت کیوں نہ کیجائے دوسروں کی راحت رسانی کی اصلی بنیاد ہمدردی کا فطرتی مادہ ہے اور وہی تمدن کا سنگ بنیاد ہے۔

چہارم - عادت کو بھی انسان کے اعمال کی راہ نمائی میں بہت بڑا دخل ہے۔ امور معاشرت و تمدن کے انجام دینے کی قابلیت بھی دوسری استعدادوں کی طرح عادت سے زیادہ قوی ہوجاتی ہے اور انسان خود بخود سوسائٹی کی ضروریات کا تابع ہوجاتا ہے۔

اخلاق اور قانون | قانون کا بھی یہی مقصد ہوتا ہے جو علم اخلاق کا ہے اور اگرچہ ان دونوں علوم کی غایت ایک ہی ہے مگر انکی وسعت میں بہت بڑا فرق ہے۔ انسان کے تمام افعال پر خواہ ظاہر ہوں یا پوشیدہ اخلاق کا اثر پڑتا ہے۔ لیکن قانون کی دسترس انسان کے تمام افعال پر نہیں ہے اور بعض افعال میں باوجود علم کے بھی مداخلت نہیں کر سکتا۔ بہت سی برائیاں اور خرابیاں اس قسم کی ہیں کہ اخلاق انکو منع کر سکتا ہے لیکن قانون انکی نسبت کوئی حکم نہیں دے سکتا۔

اخلاق اور قانون کا مرکز ایک ہی ہے لیکن ان دونوں کے محیط میں بہت بڑا فرق ہے، اس فرق کی دو وجوہ ہیں۔ اول تو یہ کہ قانون کا لوگوں کے رویہ پر بلاواسطہ کوئی اثر نہیں ہے بلکہ انکا تمام اثر سزا کے خوف میں ہے۔ سزا فی نفسہ ایک برائی ہے اور اس وقت تک اور اس حد تک جائز ہے جبکہ اس سے بہ نسبت برائی کے بھلائی زیادہ صادر ہو۔ قانون کی تعمیل کے زیادہ ذرائع اختیار کرنا سوسائٹی میں خوف و دہشت پیدا کرتا ہے جو بجائے خود ضرر رساں ہے، اخلاق کی یہ کیفیت نہیں، اسکے اثر سے سکون و اطمینان حاصل ہوتا ہے۔ بعض جرائم ایسے ہیں کہ قانون انکو جرم کی تعریف میں داخل نہیں کر سکتا مثلاً سنگدلی، ناشکرگزاری، بیوفائی وغیرہ اور جب تک انکی تعریف ایسی صحیح اور واضح نہ ہو جیسے چوری، قتل عمد، اور دروغ حلفی کی ہے اس وقت تک وہ

قانون کے احاطے سے باہر ہیں۔

اخلاق کے اثر کی وسعت اخلاق کا اثر انسان کے تمام افعال پر خواہ اُسکی ذات سے تعلق رکھتے ہوں یا دوسروں سے، پڑتا ہے۔ جو افعال انسانی اپنی ذاتی نفع رسانی کے لیے کرتا ہے وہ ذاتی حقوق کہلاتے ہیں۔ اور جو دوسروں کو آرام دینے یا انکی خدمت گزاری کے لیے انجام دیتا ہے وہ حقوق بنی نوع کہلاتے ہیں۔ دوسروں کو فائدہ اور راحت پہنچانے کے دو طریقے ہیں ایک تو ایسے افعال اور امور کا اجتناب کرنا جو دوسروں کے لیے باعث تکلیف ہوں دوسرے ایسے کام کرنا جو دوسروں کے لیے نفع رساں اور راحت بخش ہوں۔

اپنے ذاتی نفع کا خیال انسان کو فطرتاً بہت ہے اگر اس میں ہکو ناکامی ہوتی ہے تو عمداً نہیں بلکہ اُسکی عقل کے قصور سے۔ اور اگر وہ اپنے تئیں کوئی ضرر پہنچاتا ہے تو کسی نہ کسی غلطی کی وجہ سے۔ بلکہ ہمیشہ وہ یہ احتیاط رکھتا ہے کہ اُسکی ذات کو کوئی رنج و تکلیف نہ پہنچے۔ اس لیے قانون کو ضرورت نہیں کہ اس مقصد کے حصول کے لیے کسی سزا کی دھمکی دے۔ لیکن حق بنی نوع کی حفاظت قانون کا فرض ہے اور اسکے لیے دوسروں کی حق تلفی کی سزا قانون نے سخت سے سخت مقرر کی ہے۔

اخلاقی حالات کی درستی کے اسباب اخلاقی حالت کی درستی میں بہت ضروری ہے کہ بد اخلاقی کے تخیلات فاسدہ کو دور کیا جائے اور نیکی و پرہیزگاری کے خیالات کو دل میں جمایا جائے۔ انسان کی یہ قوت کہ وہ اپنے حرکات و سکنات کو اپنے قابو میں رکھے اور خیالات کی تصحیح کرکے اعمال حسنہ کا مرتکب ہو اخلاقی ترقی کا ذریعہ ہے۔ خوف و غم، غصہ، ہمدردی، رنج، خوشی کے تمام اثرات اپنی مقدار اور اُس طریقہ کے مطابق جس میں ظاہر ہوتے ہیں اخلاقی یا خلاف اخلاق ہو سکتے ہیں۔ مثلاً بے انصافی کے خلاف غصہ کرنا اخلاق میں داخل ہے اور بلا قصور کسی پر خفا ہونا خلاف اخلاق ہے۔ ادب اور عظمت کا خیال خوف پیدا کرتا ہے جسکی انتہائی ترقی خداوند تعالیٰ کی پرستش اور عبادت کرنا ہے۔ ہمدردی ترقی پاکر بے غرض محبت حب وطن اور بنی نوع انسان کی خیر اندیشی بنجاتی ہے۔

انسان کے لیے ادائے فرض کا خیال اور حیا کا اثر ایسا ہے جو اُسکے تمام اخلاق کی بنیاد ہے اور وہ جانتا ہے کہ مجھے ہر وقت ایک خاص کام کرنا ہے۔ انسان کی اعلےٰ درجہ کی اخلاقی قابلیت اُس وقت ظاہر ہوتی ہے جبکہ تکلیف یا نقصان کی دھمکی کے باوجود اپنے فرائض ادا کرنے اور احقاق حق سے باز نہ آئے۔

ناپسندیدہ افعال سے شرم کا احساس بھی اُسکو بد اخلاقی کے افعال سے باز رکھتا ہے۔ اُسکا دل نہیں چاہتا کہ لوگ اُسکو نظر حقارت سے دیکھیں، اسی وجہ سے وہ افعال شنیعہ سے باز رہتا ہے۔

حکیم سید شاہ ولی الدین چشتی

نور یا روشنی

نور کی اہمیت اور ضرورت اُن ضروریات میں سے جو انسانی زندگی کے لیے لابدی بلکہ اجزاء لا یتجزیٰ ہیں نور یا روشنی بھی ایک ہے۔ اگر سچ پوچھو تو انسانی زندگی کے تمام حظوظ اور دیگر اقسام کے کاروبار نور کے بغیر بیکار ہیں۔ زندگی کے اگر تمام کاروبار پر اور جو تعلق اُن سے انسان کو ہے اُسپر غور کیا جائے تو یہ بات بالکل حق ثابت ہوتی ہے کہ "آنکھ گئی تو جہان گیا" دوسرے الفاظ میں بدن کا چراغ (یا نور) آنکھ ہے اگر انسان کے جسم سے یہ نور جاتا رہا تو اُسکا تعلق بیرونی دُنیا سے ایک گونہ بالکل قطع ہوگیا۔ انسان نور کے بغیر کچھ کر ہی نہیں سکتا۔ ذرا رات کے وقت ہی پر غور کیجیے۔ انسان کے جسم میں تندرستی، خوبصورتی، طاقت، لیاقت، علمیت سب کچھ موجود ہوتا ہے۔ گھر میں تمام اسباب راحت و انبساط کافی بلکہ بہ افراط مہیا ہوتا ہے۔ اپنے عزیز و اقارب اپنے گرد و پیش بیٹھے ہوتے ہیں، مگر "دمڑی کے لعل"

بغیر ساری چیزیں بے مصرف ہوتی ہیں۔ اُسوقت یہ انسان ضعیف البنیان باوجُود
اپنی کامل صحت اور طاقت و خوب صورتی کے، مثل بُت کے ایک جگہ مقید بیٹھا رہتا ہے۔
وہ اُسوقت نور کا کیسا محتاج نظر آتا ہے۔ ہر شئے کی قدر و قیمت اُسکی ضد کی موجودگی
سے پہچانی جاتی ہے، اسی طرح نُور کی اہمیت و ضرورت تاریکی سے امتیاز ہوتی ہے۔
نور کے بغیر انسان تمام بہجت افزا و مسرت بخش اشیا سے کچھ بھی فائدہ اور حظ
اُٹھا نہیں سکتا۔ پیاروں کے خوب صورت چہرے آنکھوں سے اوجھل ہوتے
ہیں اور دل اُنکی نادید سے بیقرار ہوتا ہے۔ غرضیکہ انسان کا کوئی کام ہو،
سب کے سب نور کے بغیر بے لطف ہوتے ہیں۔ نُور انسان کے لیے نہایت ہی
ضروری مفید اور دلکش ہے۔

نُور جس طرح انسان کے لیے لابُدی اور فیض رساں ہے اُسی طرح حیوانات
نباتات اور جمادات کے لیے بھی لازمی ہے۔ اُنکی زندگی اور روئیدگی اور بالیدگی
سب کا انحصار نور ہی پر ہے۔ عالم کی پیدائش، پرورش، اور نشوونما اور تمام
خوبصورتیاں نور ہی سے ہیں۔ اسی لیے توریت شریف میں حضرت موسیٰ نے
بتایا ہے کہ خدا تعالیٰ نے آفرینش عالم کی ابتدا میں سب سے اول نور پیدا
کیا۔ اور اسی نہج سے سائنس نے بھی بتایا ہے کہ موجودہ صورت میں منجمد ہونے
سے پیشتر آفتاب اور سیارے روشن ہیولے کی صورت میں موجود تھے۔ یہی ہیولے
وہ نُور یا اُجالا ہے جس کو خداوند عالم نے سب سے پہلے خلق کیا۔ نُور ہر شئے کے
اندر مخفی و مستتر تھا جسکو خالق نے ظاہر کیا۔ اور اب بھی ہر شئے میں موجود ہے
جو رگڑ یا کسی اور کیمیاوی ترکیب سے پردۂ کتم سے منصۂ ظہور پر آجاتا ہے۔ اگر نُور
کو کُل اشیا کا ست یا روح کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔

نُور کی اہمیت اور قدر و منزلت اس طرح پر بھی ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی
نسبت ہر مذہب اور ملت میں بیان ہُوا ہے کہ وہ نُور ہے اور نُور میں رہتا ہے،
وہ اور اُسکے فرشتے سب نوری ہیں۔ وہی ذات الٰہی نُور اور نُور کا مخرج ہے۔ سارے
انوار اُسی سے ضیا پاتے ہیں۔ اُس میں تاریکی کا سایہ تک نہیں ہے۔ اگر اِس پہلو
سے غور کیا جائے تو نور ازلی اور ابدی ہے۔ جب سے خدا ہے تب سے نُور ہے۔
اگر نُور نہ ہوتا تو اس عالم کا ظہور بھی نہ ہوتا۔

نُور اگرچہ ایک ہے تو بھی اپنے طبعی اخلاقی اور روحانی معنی کے لحاظ سے
مختلف اقسام کے کہلاتے ہیں۔ ہمارا مقصد اس جگہ نُورِ طبعی پر غور کرنے کا ہے۔

نور کی بابت قیاسات

نُور کی تحقیقات میں سب سے پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ
نُور کیا ہے؟ نُور کے بیان میں متفرق قیاسات ہیں۔ مگر سب سے زیادہ مشہور
اور مروج دو قیاس ہیں۔ پہلا قیاس یہ ہے کہ روشن اجسام ہر سمت میں ایک
مادہ اپنے اندر سے نکالتے رہتے ہیں اُس میں غایت درجے کے لطیف ذرات
مشتمل ہیں۔ یہ ذرات نہایت ہی سرعت کے ساتھ سیدھی سطروں میں برابر پھیلتے
رہتے ہیں اور آنکھوں کے اندر جاکر "ریٹینا" پر اپنا اثر کرتے ہیں اور اُس اثر
سے ہم میں وہ احساس پیدا ہوتا ہے جس سے نظر بنتی ہے۔ اِس قیاس کو
قیاس شعاع نُور کہتے ہیں۔ اس قیاس سے یہ بتایا جاتا ہے کہ روشنی کے ذرات
منور اجسام سے ایسے طور پر متواتر اور نہایت عجلت کے ساتھ ناشکستہ سلسلے
میں لگاتار نکلتے رہتے ہیں۔ اس قیاس کا رواج سر آئزک نیوٹن صاحب کی
زبردست تائید کی وجہ سے مدت دراز تک سائنٹیفک عالم میں جاری رہا اور
اب بھی ایک بڑا زبردست فرقہ سائنس دانوں کا ایسا موجود ہے جو اِس قیاس
کا بڑا حامی ہے۔ دُوسرا قیاس یہ ہے کہ تمام اجسام اور خلا، ساوی نہایت
ہی درجہ کے لطیف اور لچکدار مادہ سے مملو ہیں جسکو روشن ایتھر کہتے ہیں۔ اور
اجسام اس لیے منور ہوتے ہیں کہ اُنکے ذرات خلا میں انتہائی درجہ کی سُرعت
اور تیزی کے ساتھ تھرتھراتے رہتے ہیں، اور جب وہ ایتھر میں مل جاتے ہیں، تو
دائرہ نما لہروں کی شکل میں ہر سمت پھیلتے رہتے ہیں اور یہ تھرتھراہٹ ریٹینا
پر پڑکر احساس نظر پیدا کرتی ہے۔ اِس قیاس کو قیاس تموّج نُور کہتے ہیں۔
یہ تھرتھراہٹ خط مستقیم میں رواں نہیں ہوتی بلکہ ایسے طور پر چلتی ہے کہ
قائمے زاویے پیدا ہوتے جاتے ہیں۔ یہ تھرتھراہٹ اُس روانی کے مشابہ
ہے جو اُس وقت رسّی میں ہوتی ہے جب رسّی کو ایک سرے سے پکڑ کر آہستہ
آہستہ گردش دی جاتی ہے۔ اس قیاسی تموّج میں ذرات کی کسی حرکت کا

تصور مشتمل نہیں ہے بلکہ ذرات کی بے قراری کی ایک حالت ہوتی ہے جو جسم منور سے ظہور میں آتی ہے۔ اسکی مثال عین پانی کی لہروں کی سی ہے۔ قیاس تموج نور کا سب سے پہلا محقق ہوجنس ہے اور اسکے بعد یولر نے اس قیاس کی بڑی حمایت کی اور اسکو رواج دیا۔ اسکے بعد ڈاکٹر ینگ اور فرنیزل اسکے بڑے حامی گزرے ہیں۔ قیاس تموج سے نہ صرف ظہوراتِ نورانی کی توضیح ہو جاتی ہے بلکہ اس سے وہ علاقہ بھی منکشف ہو جاتا ہے جو روشنی اور حرارت کے ظہورات کے درمیان نہایت قرب میں واقع ہے، اور اس سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ ظہوراتِ نور اور ظہوراتِ صدا میں کیسی پوری مشابہت موجود ہے۔

نور کے مخارج | نور کے سلسلۂ بیان میں دوسری بات اسکے مخارج کا بیان ہے۔ اگرچہ نور دنیا میں کثرت سے موجود ہے، خواہ ظاہر ہو یا باطن، تاہم نور کا اصل منبع سائنس دانوں کی نظر تحقیقات سے مخفی ہے۔ ظاہر طور پر جہاں تک عام مشاہدہ اور سائنسی تجربات و مشاہدات کی رسائی ہوئی ہے وہاں تک یہی نتیجہ نکالا اور بتایا گیا ہے کہ نور یا روشنی سورج، تاروں، حرارت، کیمیاوی ترکیب، بجلی، شہابوں اور اُن اشیاء سے نکلتی ہے جن میں فاسفورس ہوتا ہے۔ لیکن اگر پوچھا جائے کہ انکے اندر نور کہاں سے آیا جو ہر وقت کسی نہ کسی ترکیب یا ذریعہ سے ظاہر ہوتا ہے؟ تو سائنس اسکا جواب دینے سے عاری ہے۔ البتہ موسیٰ نے پیدائش کی کتاب کے شروع میں اشارۃً ظاہر کر دیا ہے۔ وہ بیان قرینِ عقل اور قابلِ تسلیم بھی ہے۔ وہ یہ ہے کہ حرارت و روشنی کا نہایت ہی قریبی اور لابدی تعلق ہے۔ جہاں حرارت ہے وہاں نور۔ یہ بات اور ہے کہ کیا نور ہمیشہ ظاہر ہی رہتا ہے یا باطن، مگر تجربہ اور مشاہدہ یہ ضرور بتاتا ہے کہ حرارت میں نور ہے۔ خدائے تعالیٰ نے عین ابتداءِ پیدائش عالم میں سب سے پہلے مادہ کے اندر حرارت ڈالی۔ اور اس حرارت کے ساتھ ہی جو "خدا کی روح" کے "پانیوں پر جنبش کرنے" سے خارج ہو کر مادہ کے اندر گئی نور بھی اُسکے ساتھ ہی مادہ کے اندر پہنچا، اور جب خدا نے فرمایا کہ "اُجالا ہو" تو فوراً ہی مادہ زور کے ساتھ متحرک ہوا۔ اور اس حرکت سے آپس میں رگڑ اور نور کا ظہور ہوا۔ نور کا یہ ظہور سب سے پہلے نبولے کی صورت میں ہوا۔ ڈاکٹر کینس نور کی پیدائش کا بیان یوں کرتے ہیں اور موسیٰ کی رؤیا میں نور کے ظہور کا نظارہ اس طرح پر دکھاتے ہیں کہ جب موسیٰ کو وہ طور پر حق تعالیٰ کے روبرو عالمِ رؤیا میں اس دنیا کی پیدائش کا سارا واقعہ مسلسل طور پر دکھ رہا تھا تو اُس نے "اپنی آنکھیں اوپر اُٹھا کر اُن بادلوں کو دیکھا جو اُسکے گرداگرد گھوم رہے تھے (وہ کیا دیکھتا ہے کہ) فوراً ایک کالا بادل اُسکے سر پر چھایا ہوا ہے۔ اور جبکہ وہ اس نظارہ کو تعجب کی نگاہوں سے دیکھتا اور غور کر رہا تھا کہ اسکے کیا معنی ہیں تو اُس نے خدائی وہی آواز سُنی کہ "اُجالا ہو جا" اور فوراً ہی سارا خلا ہر قسم کی شکلوں کے نورانی نبولوں سے معمور ہو گیا۔ وہ حیرت کی نگاہوں سے تاکتا ہے۔ اور وہ دیکھ ہی رہا تھا کہ یہ نبولے منجمد ہو گئے اور آسمان کے کُل سائبان میں سورج (بصیغۂ جمع) اور ستارے جگمگا اُٹھے" (موزس اینڈ جیالوجی صفحہ ۱۹ و ۲۰) اور پھر لکھتے ہیں (صفحہ ۲۹) "اگرچہ فی الحال ہم نہیں بتا سکتے کہ کن قوانین سے نبولے بنے اور انکو یہ روشن خاصیتین عطا ہوئیں تاہم یہ ایک بدیہی امر ہے کہ نور بلا کسی معلومہ مرکزی منبع اشعاع کے موجود تھا۔ پس موسیٰ کا بیان بالکل درست ہے کہ آفتاب سے پیشتر روشنی موجود تھی"۔ موسیٰ کے بیان اور سائنس کے ساتھ اسکا مقابلہ کرنے سے بخوبی پتہ لگتا ہے کہ اصل منبع اور مخرج نور کا وہی قادر متعال بے چون و بے مثال ہے۔ پانی پر اُسکی روح کے جنبش کرنے سے مادہ میں حرارت و نور داخل ہوئے۔ اُسکے فرمانے سے مادہ بڑے زور کے ساتھ متحرک ہوا۔ اور قسم قسم کی شکلوں کے روشن اور گرم نبولے (سحاب) متشکل ہو گئے اور نور فضا میں پھیل گیا۔ پھر یہ نبولے رفتہ رفتہ منجمد ہوتے گئے اور انھوں نے سورجوں اور ستاروں کی شکلیں اختیار کریں جو نور کے مخارج ثانی ہیں۔

سورج ایک منجمد نبولا ہے جو بذاتہ روشن ہے اور چاند کی طرح کسی غیر فلکی جرم سے روشنی حاصل نہیں کرتا۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ سائنس کی تحقیقات کے مطابق اُس میں اُن بے شمار جلتے ہوئے شہابوں

سے بھی روشنی پیدا ہوتی ہے جو حرکت کرتے ہوئے سورج کے اندر آپڑتے ہیں۔ "کیونکہ تمام لاتعداد شہابی گولے جب مدارِ آفتاب میں آجاتے ہیں تو وہ ہر ایک ممکن زاویہ پر آکر ایک دوسرے کا تقاطع کرتے ہیں۔ اور چونکہ ان میں سے بعض شہاب آگے جاتے اور بعض پیچھے ہٹتے ہیں اس لیے وہ بالضرور آپس میں لگاتار ٹکراتے رہتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ دونوں اجسام ناگہاں ٹھہر جاتے ہیں، اور اُن سے غایت درجہ کی حرارت اور روشنی پیدا ہوتی ہے اور وہ آفتابی گولے میں آگرتے ہیں اور اس طرح اُس میں متواتر نئی نئی حرارت اور روشنی پہنچاتے ہیں" (ایضاً ۵۳ صفحہ) یہ سورج کی روشنی کا حال ہے۔

حرارت سے جو روشنی پیدا ہوتی ہے وہ اُس وقت نظر آتی ہے جب اشیا (ملّیٹ صاحب کے بیان کے مطابق) ۵۰۰ سے ۶۰۰ درجے تک گرم ہوتی ہیں اور اس درجے سے آگے جوں جوں حرارت کی مقدار بڑھتی جاتی ہے روشنی بھی زیادہ ہوتی جاتی ہے۔

فاسفورس ایک ایسی شئے ہے جو اکثر اقسام کی چیزوں میں موجود ہے اور جب وہ چیزیں کسی خاص حالت میں رکھی جاتی ہیں تو خود بخود روشن ہو جاتی ہیں۔ اور بعض نباتات اور حیوانات میں بھی یہ خاصہ پایا جاتا ہے مثلاً یہ نور شب چراغ (جگنو) میں بہت تیز ہے۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ روشنی اُنکی مرضی کے مطابق ظاہر اور پوشیدہ ہو سکتی ہے۔ سمندروں میں بھی بہت سی ایسی مچھلیاں پائی جاتی ہیں جو راس السرطان اور جدی میں ہیں اُنکے بدن سے روشنی برابر نکلتی اور سمندر کو روشن کرتی رہتی ہے۔ اسی طرح اور بہت سی اشیا ہیں جن سے روشنی نکلتی ہے اور انسان و حیوان اُنسے اکتسابِ نور کرتے ہیں۔ اور وہ نور میں اپنے سارے کام کرتے اور خوش ہوتے ہیں۔ یہاں تو انسان مخارجِ ثانی سے نور حاصل کرتا ہے مگر موت کے بعد جب آرام اور خوشی کی حالت میں جائیگا تو اصل منبع سے نُور اور خوشی حاصل کریگا۔

نور کی تیز رفتاری یوں تو نور کا ہر ایک پہلو قابلِ ذکر اور اُسکا بیان نہایت مفید اور دلکش ہے، مگر ہم طوالت کے خوف سے صرف نُور کی تیز رفتاری کا ذکر کرینگے جو نہایت دلچسپ اور حیرت میں ڈالنے والا مگر سریع الفہم ہے۔ روشنی اس قدر سرعت اور تیزی کے ساتھ چلتی ہے کہ عام مشاہدہ کے مطابق سطحِ زمین پر کسی نورانی ظہور اور آنکھ کے احساس کے درمیان کوئی قابلِ قدر فاصلہ نہیں ہوتا۔ یہ سرعت رفتاری سب سے پہلے علمِ نجوم کے مشاہدات کے ذریعہ سے معلوم کی گئی ہے۔ سب سے پہلے رومر نامی ایک ڈنمارک کے منجم نے ۱۶۷۵ء میں جوپیٹر کے پہلے خادم ستارہ کے گہن کے مشاہدہ سے روشنی کی تیز رفتاری دریافت کی تھی۔ نتیجہ اسکے تجربہ اور مشاہدہ کا یہ ہے کہ روشنی ایک سکنڈ میں ۱۹۰۰۰۰ میل کا فاصلہ طے کرتی ہے۔ ایک اور بیان کے مطابق روشنی ایک سکنڈ میں ۱۸۶۰۰۰ میل مسافت میں دوڑ جاتی ہے۔

نور کی ترکیب ایک عجیب بات یہ ہے کہ روشنی کے اندر سات رنگ پائے جاتے ہیں۔ یا دوسرے الفاظ میں یوں کہیے کہ نُور سات رنگوں سے بنا ہے۔ سرخ۔ نارنجی۔ زرد۔ سبز۔ نیلا۔ زعفرانی۔ بنفشی۔ اِن میں سے سرخ بہت ہی مدھم ہے اور بنفشی نہایت ہی انتشار پذیر ہے۔ یہ سر آئزک نیوٹن کے تجربہ کا نتیجہ ہے، مگر ڈاکٹر ینگ اور فرینل نے یہ ثابت کیا ہے کہ ہر ایک رنگ سلسلِ تموج یا لہروں سے پیدا ہوتا ہے، اور اُن موجوں یا لہروں کی لمبائی کا بھی اندازہ لگایا گیا ہے۔ چنانچہ ایک انچہ سرخ روشنی میں ۳۹۰۰۰ لہریں ہوتی ہیں، اور چونکہ روشنی تقریباً ۱۸۶۰۰۰ میل ایک سکنڈ میں طے کرتی ہے لہذا جب ہم سُرخ گلاب کے پھول کی جانب دیکھیں گے تو ہماری آنکھ کا پتینیا ایک سکنڈ میں ۴۳۱.......... بار تھرائیگا۔ بنفشی کرنوں میں لہریں بہت چھوٹی ہوتی ہیں۔ یعنی ایک انچہ روشنی میں ۶۴۰۰۰ لہریں۔ پس جب ہم بنفشی رنگ کے گچھے کی جانب دیکھتے ہیں تو ہماری آنکھ کی پتینیا کی تھرتھراہٹ ۷۵۷.......... دفعہ ہوتی ہے۔

نُور کے بیان سے ناظرین پر واضح ہو گیا ہوگا کہ نور انسان کے لیے کس قدر ضروری چیز ہے کہ بغیر اسکے انسان کسی قسم کا فائدہ یا حظ کسی شے سے کبھی نہیں اُٹھا سکتا۔ اور یہ بات بھی روزِ روشن کی طرح ظاہر ہے کہ

خدا نے نور کی ترکیب میں کیسی اعلیٰ اور کامل دانائی اور حکمت رکھی ہے کہ
اُس سے دل اور دماغ کو تازگی اور روح کو فرحت ملتی ہے۔ اور یہ بھی
معلوم ہو گیا ہوگا کہ نور کا منبع اور مخرج خود وہی خدائے ذوالجلال ہے
سورجوں اور ستاروں وغیرہ کے انوار اور لوامع اُسی پروردگار کے ذاتی
انوار کے پرتو ہیں۔ یہ نُور ہی ہے جو ہمکو اُس لایزال نُور کا اندرونی احساس
دلاتا ہے اور اُس نور کی تحصیل کا ذوق و شوق ہم میں پیدا کرتا ہے۔
اے خدا! تو جو نُور ہے اور نُور میں رہتا ہے، جس طرح تو نے ہمیں
اس دُنیاوی نُور سے منور کیا اُسی طرح اپنی تجلی کے نُور سے ہمارے
باطن کو منور کر اور ہماری موت کے بعد اپنے چہرے کے ذاتی نُور کی تجلی سے
سرفراز فرما! آمین ثم آمین۔

پی۔ کیول سنگھ

فصیح الملک داغ دہلوی (۲)

اگر غور سے دیکھا جائے تو اُردو شاعری کی بنیاد ہی "چوما چاٹی" پر رکھی
گئی ہے۔ انسانی فطرت اور صحیفۂ قدرت کا مطالعہ ہمارے شعراء نے گویا
کیا ہی نہیں۔ اور اگر نظر کو اُس سے وسیع کیا جائے تو ثابت ہوگا کہ غزل
اسی قسم کے مضامین کے لیے ابتداءً موضوع بھی ہوئی تھی۔ لیکن ازمنۂ وسطیٰ
میں اُسکی یہ خصوصیت قائم نہیں رہی بلکہ عشق و محبت کے ساتھ معرفت،
توحید، اخلاق، تصوف، غرض کئی رنگ اُسپر چڑھا دیے گئے ہیں۔ لیکن
مبصرین کا خیال ہے کہ یہ صنف زیادہ تر عشقیہ مضامین ہی کے لیے موزوں
ہے۔ متقدمین میں سے اکثر نے اُن جذبات کو قلمبند کیا ہے جن سے عشقِ
حقیقی مترشح ہوتا ہے لیکن کثیر التعداد شاعروں نے عشق مجازی کی حدود
سے باہر قدم نہیں رکھا۔ اُنکے دیوان گواہی دے سکتے ہیں کہ اس بیان
میں صداقت کا حصہ کتنا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ معمولی عشقیہ باتوں کو
کھینچ تان کر معرفت کا لباس پہنانے کی طرفدارانہ کوشش کی جائے۔ اس
بات کا اعتراف کیا جا سکتا ہے کہ متقدمین میں معاملہ بندی کو پسند نہ کرتے
تھے یا خلوت و وصل کے بے تکلفانہ واقعات کا ذکر کھلے الفاظ میں کرنے
سے رُکتے تھے۔ لیکن متوسطین نے یہ التزام قائم نہیں رکھا۔ میر نے غزلیات
کو جس رنگ میں لکھا تھا اُسے جرأت نے نہایت شوخ کر دیا تھا اور
داغ مرحوم کے قلم نے تو بعض مناظر اس بیباکی سے دکھائے ہیں کہ بعض
اوقات تنہائی میں بھی اُنکا مطالعہ ناظر کو عرق عرق کر دیتا ہے۔ مثلاً
یہ اشعار اعتدال اور متانت سے بہت دُور ہیں۔ ان میں سے بعض
صاف گوئی کا تاریک پہلو بخوبی دکھا سکتے ہیں ؎

مزا ہو وصل کی شب اس طرح ہوں پیار کی باتیں
ہمارا ہاتھ سینے پر تمہارا ہاتھ گردن میں

زلف برہم، عرق آلودہ جبیں، دہن چاک — کس کے آغوش سے تو جان چھُڑا کر نکلا

یاد ہے کہنا وہ کسی وقت کا — ہوش میں آؤ تمہیں کیا ہو گیا

نکل کر مرے گھر سے یہ جان لو تم — نہ ہوگا کسی گھر گذارا تمہارا

سُنا ہے کسی اور کو چاہتا ہے — وہ دشمن ہمارا وہ پیارا تمہارا

نہ بنا ہو یہ کہیں غیر کے سر کا تکیہ — مسکراتے ہیں وہ کیوں دیکھکے زانو اپنا

بعض اشعار میں سُوقیانہ طرزِ تکلم کی جھلک پائی جاتی ہے مثلاً

کہہ دو سمجھ کے جائیں وہ کوئے رقیب میں — اک رشک آشنا کا ہے مُردہ پڑا ہوا

ہو گیا پرتوِ رخسار سے کچھ اور ہی رنگ — میں نے منہ چوم لیا اُس کے تماشائی کا

کیوں صرفۂ نگاہ مری جان ہو گیا — اک تیر اور میں ترے قربان ہو گیا

بیشک اس قسم کے خیالات سخت قابل اعتراض ہیں اور خصوصاً
آج کل جبکہ تعلیم کی اشاعت کے ساتھ انسانی دل و دماغ کی جلا ہوتی
اور نیک و بد کی تمیز آتی جاتی ہے، یہ اشعار کون پسند کریگا؟ لیکن جو لوگ

داغ کے تمام دواوین کو اسی قبیل کے مضامین سے مملو بتاتے ہیں وہ یقیناً بے خبر ہیں اور محض ایک عام قیاس کی بنا پر کہ داغ "چوما چاٹی" کی تصویر بہت دلکش الفاظ میں کھینچتے ہیں بلا امتیاز اُنکے سارے کلام کی تضحیک کرنے لگتے ہیں۔ وہ ٹھنڈے دل سے دیکھیں کہ تمام مجموعۂ کلام میں اس قسم کے کتنے شعر نکلتے ہیں اور پھر کوئی فیصلہ کن رائے قائم کریں۔ بڑی سے بڑی غزل میں بھی ایک دو سے زیادہ ایسے شعر نہ ملیں گے۔ جب حقیقت حال یہ ہو تو معترض خود انصاف کرے کہ اُسکا فعل کس حد تک درست ہے۔

بدنام کرنے کا ارادہ کرلینا اور بات ہے لیکن کیا داغ کے علاوہ کسی اور شاعر نے واقعات حُسن و عشق نظم کرنے میں بے اعتدالی نہیں کی؟ بدر منیر، گلزار نسیم، زہر عشق، یہ تمام مثنویاں میانہ روی کے اصول سے کوسوں دُور ہیں۔ ان میں بعض بعض مقامات پر ایسے سین دکھانے کی فخریہ کوشش کیگئی ہے جس کا نظارہ غیرت پسند طبائع کے لیے زہر قاتل سے کم نہیں۔ اسکے باوجود اُنکے نئے ایڈیشن چھاپے جاتے اور تنقیدی دیباچے لکھے جاتے ہیں اور اُنکے مسلمہ عیوب کی پردہ پوشی کرنے کے لیے خون اور پسینہ ایک کیا جاتا ہے۔ لیکن اگر ایسا کیا جاتا ہے تو ہمارے خیال میں یہ کوئی قابل مواخذ بات نہیں۔ کیونکہ ان کتابوں میں بہت سے ادبی محاسن بھی ہیں جن کی وجہ سے ان میں مستقل دلچسپی کی شان موجود ہے۔ بعینہ یہی حال داغ کے کلام کا ہے۔ وہ ایک باغ ہے جس میں پھول بھی ہیں اور کانٹے بھی۔ اِن کانٹوں سے کسی کا چمن خالی نہیں۔ اگر داغ کا طرز بیان واقعی ایک کانٹا ہے تو انصاف پسند نظروں میں امیر مرحوم کا دوسرا دیوان "صنم خانۂ عشق" جس میں اسلوب تحریر اور زبان کے اعتبار سے داغ کے تتبع کا رنگ نمایاں طور پر موجود ہے سرتاپا خارستان ثابت ہوگا۔ مگر ہم اِسکے بھی خلاف ہیں۔ یہ سب یک طرفہ رائیں ہوسکتی ہیں اور منصف مزاجی اور راست بازی سے انھیں کوئی تعلق نہیں۔

یہ امر بزرگانِ لکھنؤ کی علمی قدردانی کی گذشتہ روایات کے سراسر منافی ہے کہ جہاں تمام ہندوستان نے کلام داغ کی مناسب عزت و توقیر کی، وہاں اہل لکھنؤ کی زبان سے کوئی حوصلہ افزا لفظ کبھی نہ نکلا۔ لیکن انھوں نے اپنے گریبان میں منھ ڈال کر نہ دیکھا کہ واسوخت امانت اور دیوان جان صاحب کے مالک بننے کے بعد انھیں داغ پر خردہ گیری کا حق کیا ہے۔ مولوی علی حیدر صاحب ایسے فاضل نقاد بھی جہاں کہیں داغ کا ذکر کرتے ہیں تو تعریفی الفاظ میں تعریض کا پہلو نکال لیتے ہیں۔ مولوی صاحب ایسے بزرگ سے عموماً کوئی شکایت نہیں ہوسکتی کیونکہ آخر یہ کچھ فدا لگتی بھی کہدیتے ہیں اور انکی علمیت، قابلیت اور تحقیق انھیں اس قسم کی رائے زنی کا مستحق بناتی ہے خواہ اُنکے خیال سے صریحی اتفاق نہ کیا جائے۔ لیکن الناظر بابت ماہ جون ۱۲ء میں ایک پردہ نشیں مضمون نگار نے اپنی قوتِ فیصلہ کا ثبوت عجیب طور سے بہم پہنچایا ہے۔ کہاں کشمیر کا کوہستانی سبزہ زار اور کہاں داغ و امیر کا تصفیہ! معزز خاتون کے الفاظ یہ ہیں :-

منشی امیر احمد صاحب مرحوم اور داغ مرحوم کا تذکرہ چلا۔ جب کوئی ان دونوں کا مقابلہ کرتا ہے تو مجھے بڑا غصہ آتا ہے۔ میں داغ کو بُرا نہیں کہتی وہ شاعر تھے لیکن منشی صاحب اور داغ کا مقابلہ کیا۔ داغ شاعر تھے اور امیر اُستاد۔۔۔۔

اسے پڑھ کر ہمنے مضمون نگار صاحبہ کے تبحر علمی اور وسعت نظری کا جو اندازہ لگایا تھا وہ افسوس ہے کہ اُسی مضمون کے خاتمہ پر پہنچکر غلط ثابت ہوگیا۔ آپ لکھتی ہیں :-

خیالات نے بڑھتے بڑھتے بچپن کا زمانہ پیش کردیا۔ کیا زمانہ تھا کیا معصومیت تھی۔ سچ یہ ہے کہ بچپن کا زمانہ انسان کی زندگی کا بہترین حصہ ہے، مجھے تو ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔ داغ مرحوم کی ایک رباعی مجکو بہت پسند ہے اور وہ یہ ہے ؎

لگے بڑھنے جب سے کہ ہوش و خرد — لگیں ساتھ بڑھنے پریشانیاں
بڑھاپے کی دانائی لے کر کوئی — بدل دے وہ بچپن کی نادانیاں

یہ عبارت پڑھ کر بے اختیار ؎

چہ خوش گفت ست سعدی در زلیخا

الا یا ایہا الساقی ادر کاساً و ناولہا

کی خندہ آفریں یاد آجاتی ہے۔ جو آدمی رباعی اور قطعہ اور داغ اور حالی کو ایک سمجھتا ہو وہ اپنی واقفیت کے لحاظ سے کسی علمی و ادبی مسئلہ کا تصفیہ کیا خاک کر سکتا ہے۔ ہاں اس قسم کی غیر ذمہ دارانہ تحریریں سوسائٹی کے اندرونی جذبات کا اظہار البتہ کر سکتی ہیں۔ بزرگانِ لکھنؤ نے داغ کے کلام کا صرف تاریک رخ خود دیکھا اور اوروں کو دکھایا ہے۔ اُن میں حضرت امیر مرحوم ایسے انصاف پسند لوگوں کی مثال شاذ ہے جنہیں یہ کہنے میں کوئی چیز مانع نہیں ہوئی کہ ؎

امیر اچھی غزل ہے داغ کی جس کا یہ ہے

بھویں تنتی ہیں خنجر ہاتھ میں ہے، تن کے بیٹھے ہیں

ہماری ذاتی رائے ہے کہ کلام داغ مجموعی حیثیت سے عیاشانہ جذبات کا مظہر ہرگز نہیں ہے بلکہ اگر اس میں کئی چیزیں قابل گرفت نظر آئیں گی تو بہت سی لائق تعریف بھی ملیں گی۔ یہ کہنا کہ متین اور ستھرے جذبات اُنکی غزلیات میں مفقود ہیں، غلط ہے۔ اگر اُنکے تمام مجموعۂ کلام کا انتخاب اس طریقہ سے کیا جائے کہ قابل اعتراض شعر ایک بھی نہ رہنے پائے تاہم حصۂ منتخبہ کی ضخامت کئی کئی دیوانوں کے برابر ہوگی۔ ہم اوپر کچھ اشعار جو کسی نہ کسی حیثیت سے گرفت کے لائق قرار پا سکتے ہیں لکھ چکے ہیں، اب ان کے بالمقابل یہ اشعار ملاحظہ ہوں ؎

جلوے مری نگاہ میں کون و مکاں کے ہیں — مجھ سے کہاں چھپیں گے وہ ایسے کہاں کے ہیں

قاصد یہاں سے برق تپاں نصف راہ سے — بیمار کی ہے چال قدم ناتواں کے ہیں

کیا جواب حضرت دل دیکھیے ذرا — پیغامبر کے ہاتھ میں ٹکڑے زباں کے ہیں

کھویا گیا ہوں ڈھونڈنے کے پیچھے نامہ بر کو میں — اپنی خبر کو جاؤں الٰہی کدھر کو میں

مجھکو نگاہ چشم مروت نے گرا دیا — مل جائے تو گراؤں کسی کی نظر کو میں

جا کر درِ قبول پہ [illegible] کی گئی دُعا — صد شکر آپ جا کے نہ لایا اثر کو میں

اس چمن میں گو برنگِ سبزۂ بیگانہ ہوں — گُل ہے رنگیں، ہو مگر اپنے رنگ کا دیوانہ ہوں

مجھ سے اے گبر و مسلماں کس لیے اتنا تپاک — قابلِ سجدہ نہ ہرگز، نئی بت خانہ ہوں

یاں دل میں خیال اور ہے واں مد نظر اور — ہے حال طبیعت کا اِدھر اور اُدھر اور

ٹھہرا ہے وہاں مشورۂ قتل ہمارا — لو حضرت دل ایک سنو تازہ خبر اور

شوخی نے تیری کام کیا اک نگاہ میں — صوفی ہے بت کدہ میں صنم خانقاہ میں

آنکھیں چھپائیں ہم تو عدو کی بھی راہ میں — پر کیا کریں کہ تو ہے ہماری نگاہ میں

دل میں سمائی ہیں قیامت کی شوخیاں — دو چار دن رہا تھا کسی کی نگاہ میں

اُس توبہ پر ہے ناز تجھے زاہد اسقدر — جو ٹوٹ کر شریک ہو میرے گناہ میں

کیا نظارہ، کس کا اشارہ، کہاں کی بات — سب کچھ ہے اور کچھ نہیں نیچی نگاہ میں

کون کہہ سکتا ہے کہ یہ اور اسی قسم کے ہزاروں اشعار کا مطالعہ وجدان صحیح پر گراں گزر سکتا ہے؟ البتہ اگر ان میں بھی ؎

ہاتھا پائی میں ہانپتے جانا — کھلتے جانے میں ڈھانپتے جانا

کا وہی منظر کسی کے آگے محض اس وجہ سے آجائے کہ یہ داغ کے شعر ہیں تو اور بات ہے ورنہ کیا خیالات کی نفاست، جذبات کا ستھراؤ، زبان کی صفائی، مفہوم کی بلندی، یہ تمام صفات ان میں بدرجۂ غایت موجود ہیں اور داغ کے یہی اشعار سنجیدہ طبیعت والوں کو اپنی طرف متوجہ اور طبقۂ خواص کو مسخر کرتے ہیں اور سب سے بڑا سبب داغ کے کلام کی خاص و عام دونوں قسم کے افراد میں مقبولیت کا یہی ہے۔

ہم ذیل میں کچھ اور شعر درج کرتے ہیں ان سے پتہ چل سکتا ہے کہ داغ نے سوسائٹی کے اعلیٰ طبقہ کی ضیافت طبع کے لیے کیسی کچھ لطیف روحانی غذائیں تیار کی ہیں ؎

جو عاشقی میں خاک ہو اکسیر ہوا — کہتا تھا آج خاک میں کوئی ملا ہوا

داغ وہ بہتر ہے جو مرہم بنا — درد وہ اچھا جو دوا ہو گیا

خسرو سے جو چاہیں تو محمود بنے — اللہ رے اللہ رے سرکار محبت

نہ کرنا منفعل اے ناخن غم تیغ قاتل سے — کہ رنگ گریہ کہتا ہے جگر کے زخم بھرتے ہیں

مزا عشق کا کچھ وہی جانتے ہیں — کہ جو موت کو زندگی جانتے ہیں

کیا ڈبوئے گا ترے عشق کا قلزم مجھکو — موج ساحل ہے سفینہ ہے تلاطم مجھکو

عمر دراز خضر کو کیوں ہو گئی عطا — یہ تو مجھے کسی کی محبت میں چاہیے

لطف ایذا طلبی کیا کہیے — درد آرام ہوا جاتا ہے

مندرجہ بالا انتخاب میں خصوصیت سے ایسے شعر لیے گئے ہیں جن میں کسی نہ کسی پہلو سے حسن و عشق کا پہلو نکلتا ہے۔ ناظرین انصاف کریں کہ یہ جذبات اعلیٰ قسم کے ہیں یا ادنیٰ درجے کے؟ جو لوگ کہیں کہیں اس طرح کے شعر ؎

تم کہتے ہو معشوق اطاعت نہیں کرتے
عاشق بھی تو معشوق کا نوکر نہیں ہوتا

دیکھکر تعمیم و تخصیص کا درمیانی فرق قائم نہیں رکھتے اور کہنے لگتے ہیں کہ داغ کا عشق بازاری ہے وہ غور فرمائیں کہ داغ کے گلدستہ میں کانٹوں سے پھول بہت زیادہ ہیں۔ یہ غزل دیکھیے کس انداز میں کہی گئی ہے ؎

ثبات بحر جہاں میں اپنا فقط مثال حباب دیکھا
نہ جوش دیکھا نہ شور دیکھا نہ موج دیکھی نہ آب دیکھا

ہماری آنکھوں نے بھی تماشا عجب عجب انتخاب دیکھا
برائی دیکھی بھلائی دیکھی عذاب دیکھا ثواب دیکھا

نہ دل ہی ٹھہرا نہ آنکھ جھپکی نہ چین آیا نہ خواب پایا
خدا دکھائے نہ دشمنوں کو جو دوستی میں عذاب دیکھا

پڑے ہوئے تھے ہزاروں پردے کلیم دیکھو تو جب بھی غش تھے
ہم اسکی آنکھوں کے صدقے جسنے یہ جلوہ یوں بے حجاب دیکھا

جو راہ میں تیری آکے بیٹھے وہ فکر دیر و حرم سے چھوٹے
کہ تیرے کوچے کے ساکنوں نے بہشت میں بھی عذاب دیکھا

سرور عیش و نشاط کیسے بدل گئے رنگ ہی جہاں کے
سنا جو کانوں سے تھا نہ ہمنے وہ آنکھ سے انقلاب دیکھا

شراب غفلت سے داغ غش تھے دکھائے غفلت نے کیا تماشے
کہ سوتے سوتے جو چونک اٹھے مگر کوئی تم نے خواب دیکھا

اسی طرح سیکڑوں اور ہزاروں متفرق شعر ایسے مل سکتے ہیں جو اخلاقی اور روحانی فوائد سے مملو ہیں یا جن میں معرفت و تصوف کے نکات کی موشگافی کی گئی ہے۔ جہاد اکبر کی تعریف داغ کے الفاظ میں یوں ہے ؎

مارا دل کا سمجھتا ہوں جہاد اکبر
وہی غازی ہے بڑا جس نے یہ کافر مارا

حرص کا کار آمد ہونا کس خوبی سے ثابت کیا ہے ؎

یہ نہ کہیے کہ نہیں کام کی حرص
اور جو کافر کو ہو اسلام کی حرص

مطلب یہ ہے کہ اچھے کاموں کی حرص بھی اچھی ہے۔

انسانی طاقت کا غیر محدود اور پھر مجبور ہونا کتنے عام فہم طریقہ پر ذہن نشین کیا ہے گویا جبر و قدر کا مسئلہ حل کر دیا ہے ؎

جو ہو سکتا ہے اس سے وہ کسی سے ہو نہیں سکتا
مگر دیکھو تو پھر کچھ آدمی سے ہو نہیں سکتا

فنا فی الذات و فی الصفات کی کیفیت دیدنی ہے۔ کہتے ہیں ؎

زہے تلاش کہ سرگرم جستجو ہو کر
ملا ہوں رنگ میں رنگ اور بو میں بو ہو کر

عیش و غم کا توام ہونا کس خوبی سے بیان کرتے ہیں ؎

فلک دیتا ہے جن کو عیش انکو غم بھی ہوتے ہیں
جہاں بجتے ہیں نقارے وہاں ماتم بھی ہوتے ہیں

صلح کل زندگی بسر کرنے کی ہدایت اس طرح کی ہے ؎

دشمنوں سے دوستی غیروں سے یاری چاہیے
خاک کے پُتلے بنے تو خاکساری چاہیے

ان اشعار کا رنگ ملاحظہ ہو۔ یہ غزل کی غزل مرصع ہے اور ایک ایک شعر معنوی خوبیوں کا مجموعہ بنا ہُوا ہے ؎

سبق ایسا پڑھا دیا تو نے دل سے سب کچھ بُھلا دیا تُو نے
ہم نکمے ہوے زمانے کے کام ایسا سکھا دیا تُو نے
لاکھ دینے کا ایک دینا ہے دلِ بے مدعا دیا تُو نے
کیا بتاؤں کہ کیا لیا میں نے کیا کہوں میں کہ کیا دیا تُو نے
بے طلب جو ملا۔ ملا مجھ کو بے غرض جو دیا۔ دیا تُو نے
جس قدر میں نے تجھ سے خواہش کی اُس سے مجکو سوا دیا تُو نے
مٹ گئے دل سے نقشِ باطل سب نقشہ اپنا جما دیا تُو نے
مجھ گنہگار کو جو بخش دیا تو جہنم کو کیا دیا تُو نے
داغؔ کو کون دینے والا تھا
جو دیا اے خدا دیا تُو نے

اسی طرح یہ شعر کس قدر کیفیت انگیز ہیں ؎

کشتۂ یاس ہوں مقتولِ تمنا ہوں میں اور اس زندگیِ عیش پہ مرتا ہوں میں
کچھ خبر ہی نہیں اللہ ری مری بیخبری کس کا مشتاق ہوں میں کون ہوں میں کیا ہوں میں
نظر آتا نہیں لے جوشِ سرشکِ پا شاب کشتیِ نوحؑ نہیں ہوں کفِ دریا ہوں میں

خاک میں مل جائے دل گر مدعا پیدا کروں جب مٹا لوں ایک کو تو دوسرا پیدا کروں
آفرینش سے مری کچھ اور تو مطلب نہ تھا مدعا یہ تھا کہ پیدا کرکے ناپید کروں

عدم سے دیکھنے رنگِ ظہور ہم آئے ملا نہ جس کے لیے اتنی دُور ہم آئے
مدینہ چھوڑ کے پھر رامپور ہم آئے یہ کس بلا میں دلِ ناصبور ہم آئے
یہ خوفِ اہلِ وطن تھا کہ دشتِ غربت میں وطن سے بچتے ہوے دُور دور ہم آئے

طرزِ قدسی میں کبھی شیوۂ انساں میں کبھی ہم بھی اک چیز تھے اس عالمِ امکاں میں کبھی
رنج میں رنج کا راحت میں ہیں راحت کا شریک خاک ساحل میں کبھی موج ہوں طوفاں میں کبھی

دامن پہ ترے لگی رہے خاک اتنا ہی مرا نشاں بہت ہے
کونین کے لطف کس سے اُٹھیں مجکو غمِ دو جہاں بہت ہے

ناظرین اندازہ کریں گے کہ پاکیزگی جذبات اور حُسنِ تخیل کی یہ مثالیں کیسی کچھ دلفریب ہیں۔ سب سے بڑی صفت یہ ہے کہ دقیق سے دقیق مسائل بیان کیے ہیں لیکن زبان کی سادگی جو داغؔ کا خاص انداز ہے ہاتھ سے جانے نہیں پائی۔ متقدمین اور متاخرین میں سے بھی اکثر نے انھیں مضامین کو باندھا ہے لیکن اُنکا اسلوب بیان اس قدر صاف و شستہ نہیں بلکہ مغلق الفاظ اور پیچیدہ عبارت سے مطالب اکثر عسیر الفہم ہو گئے ہیں۔ داغؔ کی یہ امتیازی خصوصیت ہے کہ وہ مشکل سے مشکل مضمون کو آسان سی آسان زبان میں ادا کر دیتے ہیں اور غزل میں اسی قسم کی صاف و شستہ بندشوں کی ضرورت بھی ہوتی ہے۔

داغؔ کی زبان کی بابت زیادہ لکھنا تحصیل حاصل ہوگا۔ مضامین کے اعتبار سے خواہ کوئی شخص اُنکے مذاقِ سخن کو ادنیٰ درجے کا سمجھے لیکن اُنکے معترضین کو بھی اسکا اعتراف ہے کہ جو سادگی اور صفائی اُردو میں انھوں نے پیدا کی ہے وہ اُنھیں کا حصہ ہے۔ فصیح الفاظ، عام فہم ترکیبیں، برجستہ محاورے، سلجھی ہوئی بندشیں، روزمرہ کی صفائی، ان تمام اعتبارات سے اُنکا طرزِ بیان بے نظیر ہے۔ اُنکا ہر ایک دیوان اسالیب بیان کی خوبیوں اور زبان کے محاسن سے لبریز ہے۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ اُنکی زبان میں صناعی کو مطلق دخل نہیں بلکہ "اُنھوں نے محاورے اور چٹکلے بجنسہ اُسی طرح نظم کر دیے ہیں جس طرح روزمرہ کی گفتگو میں بولے جاتے ہیں"۔ لیکن انصاف

سے دیکھیے تو اسکی ضرورت بھی تھی۔ غزلوں کی زبان جس قدر صاف و شستہ اور عام گفتگو کے قریب ہو اتنا ہی اچھا ہے۔ اسی وجہ سے سوداؔ کے بالمقابل میرؔ کی غزلیں اصولاً بلند پایہ سمجھی گئی ہیں اور اسی لیے جرأتؔ و انشاءؔ و مصحفیؔ و ظفرؔ کا کلام جہاں تک اسکا تعلق غزلیات سے ہے صفائی و شستگی کے اعتبار سے قابل تعریف خیال کیا جاتا ہے۔

ہمیں مسٹر چکبست ایسے سخن فہم و نکتہ شناس کے اِن الفاظ پر حد درجہ حیرت ہوتی ہے کہ

وہ جوہر عالی جو شاعرانہ زبان کی جان ہے داغؔ کی زبان میں موجود نہیں۔ یہ وہ جوہر ہے جو ہر زبان میں الفاظ سے صناعی کرنے سے پیدا ہوتا ہے۔ صناعی سے میری مراد تصنع نہیں ......

اس میں شک نہیں کہ یہ خیال کسی حد تک صحیح ہے لیکن جہاں تک اسکا تعلق غزل سے ہے اُسکے خلاف واقع ہونے میں کلام نہیں ہو سکتا۔ تجربہ اور مشاہدہ دونوں سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ غزلیات میں خصوصیت کے ساتھ صفائی اور سادگی کی ضرورت ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو میرؔ کی غزلیں کبھی سوداؔ کے مقابلہ میں مقبول عام نہ ہوتیں۔ ان دونوں اُستادوں کے کلام کا موازنہ جب کبھی اور جس کسی نے کیا، غزل گوئی میں میرؔ کو اور قصیدہ نگاری میں سوداؔ کو ترجیح دی ہے۔ اگر زبان کی صناعی کا بار غزلیات اُٹھا سکتیں تو کبھی یہ شعر؎

سرہانے میرؔ کے آہستہ بولو ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

اس شعر کے آگے سر سبز نہ ہو سکتا ؎

سوداؔ کی جو بالیں پہ گیا شور قیامت خدامِ ادب بولے ابھی آنکھ لگی ہے

اصل یہ ہے کہ تغزل کا رنگ کچھ سلاستِ زبان ہی سے زیادہ نکھرتا ہے مثلاً سوداؔ کا ایک شعر ہے ؎

کیفیت چشم اُسکی مجھے یاد ہے سوداؔ ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

مضمون کے بلیغ اور لطیف ہونے میں شک نہیں۔ لیکن دیکھیے یہی مضمون میرؔ کس انداز سے ادا کرتے ہیں ؎

یاد آئی کسی کی چال ہمیں ہمنشیں ہم چلے سنبھال ہمیں

دونوں شعر بجائے خود قابل تعریف ہیں لیکن پہلے میں شکوہ الفاظ سے کام لیا گیا ہے اور دوسرے میں ایک خاص حالت کا اظہار سادہ الفاظ میں اس طرح کیا گیا ہے کہ سننے والوں کے قلوب متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے یہی حال غالبؔ کی اُن غزلوں کا ہے جو صاف اور سادہ زبان کی بہترین مثال قرار پا سکتے ہیں۔ اُنکے یہ اشعار ؎

کوئی اُمید بر نہیں آتی کوئی صورت نظر نہیں آتی

موت کا ایک دن معین ہے نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی اب کسی بات پر نہیں آتی

سامع کے دل و دماغ کو جن کیفیات سے لبریز کرتے ہیں وہ مندرجہ ذیل اشعار سے پیدا ہونا ناممکن ہے ؎

ہوئی ہے مانعِ ذوقِ تماشا خانہ ویرانی کفِ سیلاب باقی ہے برنگِ پنبہ روزن میں

نکوہش مانع بے ربطیِ شورِ جنوں آئی ہوا ہے خندۂ احباب بخیہ جیب و دامن میں

مسٹر چکبست آتشؔ لکھنوی کے ان اشعار کو صناعی کی دلپذیر مثال کے طور پر پیش کرتے ہیں ؎

وہی نشو و نمائے سبزہ ہے گور غریباں پر ہوائے چرخ زنگاری جو آگے تھی سو اب بھی ہے

تراشا تجھ کو جس بت ساز نے اے بت قیامت کی بنایا شیشہ سے نازک مزاج سنگ خارا کو

چمن میں جاکے بھولے سے خمیدہ دل کراہا تھا کیا کی گل سے بلبل حیلۂ درد گلو برسوں

لیکن ہمیں انکے ساتھ متفق نہ ہونے کا افسوس ہے۔ اگر یہی صناعی ہے تو تصنع اور مبالغہ کس چیز کا نام ہے؟ حق تو یہ ہے کہ صناعی بجائے خود تصنع کا پہلا زینہ ہے اور اس سے شاعر کا عجز ظاہر ہوتا ہے۔ گویا جب اُسے ایسا مضمون نہیں ملتا جو جدت رکھتا ہو تو وہ معمولی ہی مضمون کو خوبصورت الفاظ سے زینت دیتا ہے تاکہ عام نگاہیں لفظوں میں محو ہو کر معانی و مطالب پر نہ پڑ سکیں۔ اسکے علاوہ اکثر شعراء کی طبیعتیں کچھ ایسی دقت پسند

ہوتی ہیں کہ وہ ایک سیدھے مضمون کو بھی پیچیدہ طریقہ پر باندھتے ہیں۔ غالب کے اُردو دیوان کا ایک حصہ اسی قبیل کا ہے اور مومن بھی اسی طرزِ خاص کے پیرو تھے۔ لیکن اس قسم کے اشعار کو زبان کی صناعی کا نمونہ کہنا درست نہیں لیکن اگر بہ فرضِ محال مسٹر ہکیبت کی رائے تھوڑی دیر کے لیے تسلیم بھی کر لیجائے تو بھی صناعی، تصنع، اور پیچیدہ طرزِ بیان کی تمیز اُنکے مقررہ معیار کے مطابق بہت مشکل ہے۔ وہ ایک طرف مومن کے اس شعر کو ؎

دشنامِ یار طبعِ حزیں پر گراں نہیں ۔۔۔ اے ہمنشیں نزاکتِ آواز دیکھنا

مرصّع زبان کی خوبیوں سے مالامال سمجھتے ہیں اور امیر مرحوم کے اس شعر میں ؎

ہے چرخ پر یہ ایا ابروے ماہِ نو کا ۔۔۔ کچھ کچھ خمیدگی بھی لازم ہے بانکیں میں

اُنھیں خمیدگی کا لفظ ثقیل اور مغلق معلوم ہوتا ہے۔ بہرکیف ہم اس افراط وتفریط دونوں کے خلاف ہیں اور ہماری ذاتی رائے یہ ہے کہ غزلیات میں زبان کا رنگ وہی پسندیدہ ہو سکتا ہے جو میر، جرأت، اور سب سے آخر داغ اختیار کر چکے ہیں اور جو خاص و عام سے قبولیت اور ہردلعزیزی کی سند پا چکا ہے۔

زبان کی طرح داغ نے حسبِ ضرورت تشبیہات واستعارات سے جہاں کام لیا ہے میانہ روی کو مدِنظر رکھا ہے اور شاعر کو اس بارے میں عموماً نہایت احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے کیونکہ جب طبیعت کو اسکا چٹخارا پڑ جاتا ہے تو صلاحیت جاتی رہتی ہے۔ اور اُسے صرف الفاظ ہی الفاظ کا طلسم تیار کرنے کی لگی رہتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ تشبیہات اور استعارے زبان کا زیور ہیں لیکن زیور بھی جب حد سے بڑھ جاتے ہیں تو بدنما معلوم ہوتے ہیں۔ خاتونانِ فرنگ بھی زیورات کا استعمال کرتی ہیں اور ہندوستان کی عورتیں بھی جو سیروں سونے چاندی کا بوجھ اُٹھائے پھرتی ہیں اور اپنی فرسودہ حالت پر خوش ہیں، یہ صرف ناواقفی اور تنگ خیالی کا سبب ہے۔ یہی حال زبان اور صنائع وبدائع کا ہے۔ بعض اسی میں کمال پیدا کرنے کو منتہا ے شاعری سمجھتے ہیں لیکن جو لوگ زبان کے اصول و فروع سے آگاہی رکھتے ہیں اُنھیں معلوم ہے کہ صاف اور سیدھی زبان کا حُسن تصنع سے جاتا رہتا ہے۔

داغ کے متعلق یہ اعتراض کیے جاتے ہیں کہ وہ پیش پا اُفتادہ تشبیہات وتلمیحات کے عادی تھے۔ لیکن انصاف پسند نظروں میں یہ صحیح نہیں سمجھے جا سکتے۔ داغ کی صاف اور فصیح زبان بعید از خیال استعاروں اور عسیر القیاس تشبیہوں کی کبھی متحمل نہ ہو سکتی تھی۔ اُسکے لیے وہی استعارے اور تشبیہیں موزوں کہی جا سکتی ہیں جنکا ادراک سامع کی طبیعت پر بجاے کاوش پیدا کرنے کے شگفتگی پیدا کرے۔ داغ کی زبان میں ایک سادہ رُو حسین کی سی کیفیت ہے جسکی ناک میں نیم کا ایک تنکا دل فریبی کی وہ شان رکھتا ہے جو ہزاروں اور زیوروں میں نہیں ہو سکتی۔

اسوقت تک ہم کئی پہلوؤں سے داغ کی شاعری پر بحث کر چکے ہیں، دو ایک معمولی باتیں اب بھی رہی جاتی ہیں لیکن بخوفِ طوالت ہم اُنھیں نظرانداز کرتے ہیں اور اب داغ کے کلام پر عمومی حیثیت سے ایک اجمالی نظر ڈالنا چاہتے ہیں۔ اب ہمیں اُن کے اشعار کی کسی خاص نوعیت سے تعلق نہ ہوگا بلکہ ہر صنف کلام پر سرسری تنقید کرینگے۔

یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی ہے کہ داغ اپنے رنگ کے موجد اور مالک تھے۔ اُنکی دیکھا دیکھی اور بھی شاعروں نے اُن کی تقلید کی لیکن نقل میں اصل کا رنگ نہ آسکا۔ متقدمین میں جرأت کا رنگ داغ سے ملتا ہوا ہے لیکن داغ جس منزل پر پہنچے ہیں جرأت کو وہاں کی ہوا بھی نہیں لگی، اور صفات کے ماسوا سب سے بڑی خصوصیت داغ کے کلام کی یہ ہے کہ اُنکے جذبات و محسوسات بالکل نیچرل ہیں اور اسی وجہ سے تاثیر سے دست و گریباں ہیں۔ کلام کی شوخی، طرزِ بیان کی جدت، خیالات کی برجستگی، یہ تمام باتیں داغ کے اشعار میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہیں۔ عشق ومحبت کے رمز وکنائے، محاورے، چٹکلے، روزمرہ، یہ چیزیں داغ کی خاص ملکیت ہیں۔ یہ خصوصیات اور شعرا کے کلام میں بھی ایک حد تک موجود ہیں لیکن داغ نے ان پر جدت کا ایسا گہرا رنگ چڑھایا ہے کہ گویا یہ اُنھیں کا

خاص ایجاد ہے۔

حشو و زوائد اور تقریباً عیوب شعری سے اُن کا کلام عموماً پاک و صاف ہے اور اُن کا ایک ایک شعر نازک خیالی اور مضمون آفرینی کا نمونہ ہے۔ اُن کے خیالات میں تازگی ہے اور اسلوبِ بیان اس قدر سلجھا ہوا ہے کہ باید و شاید۔ کوئی خیال اور کیسا ہی مضمون کیوں نہ ہو اُسے اس طرح ادا کر دیں گے کہ اُس کی نزاکت اور شگفتگی دوبالا ہو جائے گی۔

نظر بندی اور مبالغہ اُن کے تخیل کے حدود سے باہر ہیں۔ جو بات کہتے ہیں اس قدر سادہ اور سچی ہوتی ہے کہ دل پر اثر کرتی ہے۔ علمی دقائق اور فلسفیانہ نکات اُنھوں نے حل نہیں کیے لیکن جو کچھ بھی کہا ہے مؤثر طریقہ پر کہا ہے۔

میر تقی کے حال میں مولانا آزاد مرحوم فرماتے ہیں

انکا صاف اور سلجھا ہوا کلام اپنی سادگی میں ایک انداز دکھاتا ہے اور فکر کو بجائے کاہش کے لذت بخشتا ہے اسی واسطے خواص میں معزز اور عوام میں ہر دل عزیز ہے۔

یہی کیفیت داغ کی غزلیات کی ہے کہ پڑھنے والا اپنی استعداد اور مذاق کے مطابق اس میں دلچسپی کا سامان پا سکتا ہے۔ اگر ایک شاہد باز اُن کے اس شعر سے

کسی کی شرم آلودہ نگاہوں میں یہ شوخی ہے ۔۔۔ اسے دیکھا اُسے دیکھا اِدھر تاکا اُدھر جھانکا

کو پڑھ کر مزا لیتا ہے تو اصحابِ ذوق سلیم اس کے لطف سے بہرہ اندوز ہوتے ہیں کہ سے

فلک پردہ بنا اہلِ زمیں کی پردہ داری کو ۔۔۔ مگر اِس دشمن جان نے کیسا عیب کب ڈھانکا

یہ غزل اُسی طرح میں کہی گئی جسے ناسخ، آتش، غالب، امیر، سب رَوند چکے ہیں۔ اس قسم کی زمینوں میں پھولنا پھلنا شاعر کے پختہ کار ہونے کی دلیل ہے۔ داغ کے یہ چند اشعار قابل ملاحظہ ہیں سے

مزا ہر ایک کو تازہ ملا ہے عشق جاناں کا ۔۔۔ نگہ کو دید کا لب کو فغاں کا دل کو ارماں کا

یہ کیا ہے آج غیروں سے مری تعریف ہوتی ہے ۔۔۔ یہ کیا ہے خود بیاں ہوتا ہے اپنے جوہر پنہاں کا

مرض جاں بلب دیکھے ہیں پر ایسے نہیں دیکھے ۔۔۔ خدا حافظ نہیں ہوتا ترے بیمارِ ہجراں کا

سرِ محفل کبھی سے تجھ کو ظالم پردہ کرنا تھا ۔۔۔ پھر اُس پر یہ قیامت غیر کے دامن سے منھ ڈھانکا

ان اشعار کی کیفیت کچھ اور ہی ہے سے

سرشک تلخ کی تلخی گوارا ہے تو ہمکو ہے ۔۔۔ زمیں پیتی نہیں آنسو ہماری چشم گریاں کا

بنا کر اپنا دیوانہ الگ بچ کر نکل جانا ۔۔۔ ترے دامن سے لینا ہے ہمیں بدلہ گریباں کا

وہ چشم آبلہ بھی دید کے قابل ہوئی اے وحشت ۔۔۔ نظر میں جسکی پہلے چبھ گیا کانٹا بیاباں کا

غالب کی یہ غزل بہت مشہور ہے سے

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں ۔۔۔ خاک میں کیا صورتیں ہونگی کہ پنہاں ہو گئیں

اس زمین میں بھی داغ اپنا جداگانہ انداز قائم رکھنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ کہتے ہیں سے

جوشِ گریہ سے یہ آنکھیں ابر نیساں ہو گئیں ۔۔۔ اب مری بیتابیاں مشہورِ دوراں ہو گئیں

رازِ الفت چھپ سکا ہے نہ اُس کے روبرو ۔۔۔ صاف دل کی حسرتیں منھ پر نمایاں ہو گئیں

اب کسی سے دل لگا کر ہم نہوں گے پائمال ۔۔۔ جو خطائیں ہو گئیں اے چرخ گرداں ہو گئیں

وہ نہ آئے جب شب وعدہ نہ آئی مجھکو نیند ۔۔۔ آرزوئیں دل کی سب خواب پریشاں ہو گئیں

داغ اب یوسف کہاں لیلی کہاں شیریں کہاں
جو حسیں شکلیں تھیں زیرِ خاک پنہاں ہو گئیں

یہ غزل بھی غالب کی طرح پر کہی گئی ہے سے

قول تیرا شوق میرا چاہیے ۔۔۔ جھوٹ سچ کے واسطے کیا چاہیے

اس میں یہ چند شعر بیت الغزل ہیں سے

اے فلک سامانِ محشر ہی سہی ۔۔۔ اپنی آنکھوں کو تماشا چاہیے

گو تری نظروں سے کل گر ہی پڑیں ۔۔۔ آج تو کوئی سہارا چاہیے

تیرے جلوے کا تو کیا کہنا مگر ۔۔۔ دیکھنے والے کو دیکھا چاہیے

اسی طرح میں ایک اور مختصر سی غزل زمانہ اخیر کی یادگار ہے۔ دیکھیے مطلع کی کیا شان ہے سے

سب متاعِ دین و دُنیا چاہیے		اے ہوس تجکو بھی کیا کیا چاہیے
اُڑ گیا بادِ خزاں سے آشیاں		مجکو تنکے کا سہارا چاہیے
اب تو دیکھی ہے بُری حالت مری		پھر بھی دیکھیں گے وہ دیکھا چاہیے

آتش کی غزل ہے ؎

یہ بزم وہ ہے کہ لاخیر کا مقام نہیں		ہمارے گنجفے میں بازیِ غلام نہیں

اسیر ناسخ نے بھی خوب کہا ہے۔ مگر داغ کا رنگ سب سے نرالا ہے۔ کہتے ہیں ؎

کبھی فلک کو پڑا دلجلوں سے کام نہیں		اگر نہ آگ لگا دوں تو داغ نام نہیں
وہ کاش وصل کے انکار ہی پہ قائم ہوں		مگر انھیں تو کسی بات پر قیام نہیں
الٰہی تو نے حسینوں کو کیوں کیا پیدا		کچھ ان کی ذات سے دُنیا کا انتظام نہیں
پیوں پلاؤں تجھے دُور ہی سے ترساؤں		یہ روزِ عید ہے زاہد یہ میا م نہیں

داغ کا یہ رنگ وہی ہے جو عام پسند کہلاتا ہے لیکن جیسا ہم اوپر لکھ آئے ہیں صرف یہی انداز اُن کی شہرت کا ضامن نہیں۔ اکثر مقامات پر اُنکا طرزِ کلام آزادانہ ہوتا ہے لیکن نازک خیالی کا سررشتہ ہاتھ سے نہیں جانے پاتا۔ مثلاً کہتے ہیں ؎

کیا کہا پھر تو کہو دل کی خبر کچھ بھی نہیں		کیوں یہ کیا ہے خمِ گیسو میں اگر کچھ بھی نہیں
آنکھ پڑتی ہے کہیں پاؤں کہیں پڑتا ہے		سب کی ہے تمکو خبر اپنی خبر کچھ بھی نہیں
لامکاں میں بھی تو کچھ جلوہ نظر آتا ہے		بیکسی میں تو اُدھر ہوں کہ جدھر کچھ بھی نہیں

ہمنے اب تک اساتذہ کے کلام سے صریحی موازنہ کرنے سے عمداً اجتناب کیا ہے لیکن اسکی دو ایک مثالیں پیش کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ اس سے کسی شاعر کا نقص کمال ظاہر کرنا مقصود نہیں بلکہ صرف یہ دکھانا ہے کہ اور شعراء کے ساتھ داغ کی کیا حالت ہے اور اُن کے اور اِن کے تخیلات میں کون امتیازی فرق نمایاں ہے

آتش ؎		سمجھتے ہیں مرے دل کی وہ کیا نا فہم و ناداں ہیں
حضورِ شمع بے مطلب نہیں پروانہ آتا ہے

امیر ؎		ہما یوں اُستخوانِ سوختہ پر میرے گرتا ہے
تڑپ کر شمع پر جیسے کوئی پروانہ آتا ہے

داغ ؎		تڑپتا لوٹتا اُڑتا جو بے تابانہ آتا ہے
یہ مُرغِ نامہ بر آتا ہے یا پروانہ آتا ہے

داغ نے پروانہ کا قافیہ ایک اور باندھا ہے اور نازک خیالی وجدت طرازی کی ایسی مثال پیش کی ہے جس کی نظیر نہیں مل سکتی۔ کہتے ہیں ؎

رُخِ روشن کے آگے شمع وہ رکھکر یہ کہتے ہیں
اُدھر جاتا ہے دیکھیں یا اِدھر پروانہ آتا ہے

میر ؎		برقع کو اُٹھا چہرہ سے وہ بُت اگر آئے
اللہ کی قدرت کا تماشا نظر آئے

سودا ؎		اس دل کی تفِ آہ سے کب شعلہ بر آئے
بجلی کو دمِ سرد سے جسکے حذر آئے

داغ ؎		جب اُسکے مقابل مرے داغِ جگر آئے
خورشیدِ قیامت کو بھی تارے نظر آئے

نظر کا قافیہ داغ نے ایک اور بھی بہت اچھا باندھا ہے ؎

حُسن آئینۂ عشق ہو عشق آئینۂ حُسن		میں تجکو نظر آؤں مجھے تو نظر آئے

امیر و داغ کا جھگڑا ایک مدت تک رہ چکا ہے۔ ہم اُس آگ پر تیل ڈالنا نہیں چاہتے جو اِن دونوں باکمالوں کی موت سے سرد ہو چلی ہے۔ قصداً ان دونوں کے ہم قافیہ و ہم ردیف اشعار لکھے نہیں گئے لیکن اگر ان کا امتیازی رنگ دریافت کرنے کی ضرورت ادبی دلچسپی کے اعتبار سے مسلّم ہو تو ہم صرف ان دونوں اُستادوں کا ایک ایک شعر لکھنے پر اکتفا کریں گے جس سے اندازہ ہوگا کہ ایک ہی خیال کو ایک ہی پیرائے میں دونوں اپنی اپنی جگہ کس طرز پر ادا کرتے ہیں ؎

امیر ؎		کبھی سمجھا نہ آگے کیا ہم اُس خود سر کو سمجھاتے
سمجھ جاتا اگر اتنا کسی تصویر کو سمجھاتے

داغ سے نہ سمجھا عمر گذری اُس بُتِ خودسر کو سمجھاتے
پگھل کر موم ہو جاتا اگر پتھر کو سمجھاتے

مندرجۂ بالا سطور سے ناظرین اندازہ کریں گے کہ داغ کی طبیعت کس قدر مستقیم اور اُنکا رنگ کتنا پختہ ہے۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ اُنکا شعر سنکر بے اختیار سامع کو داغ کے انداز بیان اور لطف خیال کا احساس ہو جاتا ہے۔ یہ صفت صرف اُس شخص کے کلام میں پائی جاتی ہے جو "بہ فطرت سے ایک خداداد طبیعت لیکر آیا ہو"۔ داغ کا کلام ہندوستان کے ہر طبقہ میں اس قدر ہر دل عزیز ہے کہ اُسکا نمونہ پیش کرنے کی کچھ زیادہ ضرورت نہیں۔ اُنکی غزلیات کا ایک حصہ اوپر گذر چکا ہے اور کچھ جستہ جستہ اشعار یہاں درج کیے جاتے ہیں جن سے اُنکی زبان اور بیان کے ساتھ قوتِ تخیلہ کی سحر کاریوں کا اندازہ ہو جائے گا۔ طوالت کا خیال نہ ہوتا تو اس بارے میں کسی قدر تفصیل سے کام لیا جاتا۔

خاطر سے یا لحاظ سے میں مان تو گیا ۔۔۔ جھوٹی قسم سے آپ کا ایمان تو گیا
دیکھا ہے بتکدہ میں جو اے شیخ کچھ نہ پوچھ ۔۔۔ ایمان کی تو یہ ہے کہ ایمان تو گیا

شکر کرتا ہوں کہ شکوہ نہیں لب پر آیا ۔۔۔ دیکھ تو کون وہ اے داورِ محشر آیا

اِن شوخ حسینوں پہ جو مائل نہیں ہوتا ۔۔۔ کچھ اور بلا ہوتی ہے وہ دل نہیں ہوتا
دل کا کوئی حامی دمِ بسمل نہیں ہوتا ۔۔۔ کمبخت کلیجہ بھی تو شامل نہیں ہوتا

اس قدر ناز ہے کیوں آپ کو یکتائی کا ۔۔۔ دوسرا نام ہے یہ بھی مری تنہائی کا

مرے ہی واسطے بیٹھا ہے پاسبان در پر ۔۔۔ ملے جو راہ میں کہتے ہیں آئیے گھر پر

نالے کرنے دلِ ناکام بُرے ہوتے ہیں ۔۔۔ کہ بُرے کاموں کے انجام بُرے ہوتے ہیں
ذبح کیجے نہ مجھے میں تو یوں ہی مرتا ہوں ۔۔۔ آپ کیوں لیجیے یہ الزام بُرے ہوتے ہیں

باغ میں گل کھِلے جاتے ہیں کہ وہ آتے ہیں ۔۔۔ اُنگلیاں سرو اُٹھاتے ہیں کہ وہ آتے ہیں
نہیں منظور جو بچنا تو دمِ چارہ گری ۔۔۔ ہم مسیحا کو ڈراتے ہیں کہ وہ آتے ہیں

چاک ہو پردۂ وحشت مجھے منظور نہیں ۔۔۔ ورنہ یہ ہاتھ گریباں سے تو کچھ دور نہیں
رات دن نامہ و پیغام کہاں تک ہوں گے ۔۔۔ صاف کہہ دیجیے ملنا ہمیں منظور نہیں

پوشیدہ جب ہو راز کہ مُنہ میں زباں نہ ہو ۔۔۔ ہم بات بھی کریں تو بغیر از فغاں نہ ہو

میرے پہلو سے وہ اُٹھے غیر کی تعظیم کو ۔۔۔ بندگی کو بندگی تسلیم ہے تسلیم کو

مقتضائے وقت کا پابند ہر حالت میں ہوں ۔۔۔ میں زمیں پستی میں ہوں تو آسماں رفعت میں ہوں

جہاں ہوں جس جگہ ہوں ہمدم اپنا کامل ہوں ۔۔۔ نظر آنکھوں میں ہوں مُنہ میں زباں ہوں سینہ میں دل ہوں

خدا نے خیر کر دی بچ گئی دربان سے عزت ۔۔۔ یہی کہنا پڑا کچھ مانگنے آیا ہوں سائل ہوں

اک ادا مستانہ سر سے پاؤں تک چھائی ہوئی ۔۔۔ اُف تری کافر جوانی جوش پر آئی ہوئی
میرا یہ دعوے سوا تیرے کوئی دل میں نہیں ۔۔۔ اُسکا یہ الزام اچھی قیدِ تنہائی ہوئی

کچھ بھی الفت نے تری دل میں نہ چھوڑا باقی ۔۔۔ رہ گئی ایک تمنا ہی تمنا باقی

مرے یاد کرنے سے یہ مدعا تھا ۔۔۔ نکل جائے دم ہچکیاں آتے آتے

موجود ہر جگہ ہے نہیں بے نشاں کہیں ۔۔۔ وہ ہر کہیں ہے ڈھونڈھیے اُسکو جہاں کہیں
میں غیر کی نگاہ میں تم میرے دل میں ہو ۔۔۔ میرا مکاں کہیں ہے تمھارا مکاں کہیں

طور بے طور ہوئے جاتے ہیں ۔۔۔ وہ تو کچھ اور ہوئے جاتے ہیں
اب تو بیمارِ محبت تیرے ۔۔۔ قابلِ غور ہوئے جاتے ہیں
کچھ خبر بھی ہے محبت میں **داغ** ۔۔۔ کیا ترے طور ہوئے جاتے ہیں

فرشتے کو پکڑ رکھیں ترے دربان ایسے ہیں ۔۔۔ خدا سے بھی نہیں ڈرتے یہ بے ایمان ایسے ہیں
اگر تو بھی نکالے گا نہ نکلیں گے نہ نکلیں گے ۔۔۔ مرے ارمان اتنے ہیں مرے ارمان ایسے ہیں
رقیبوں کو محبت کا ہے دعوے اے تری قدرت ۔۔۔ یقیں ہے تمکو وہ بھی خدا کی شان ایسے ہیں
یہ سر کے ساتھ جائیں گے یہ دم کے ساتھ جائیں گے ۔۔۔ ہمارے سر پہ **آصفجاہ** کے احسان ایسے ہیں

رگِ جاں سے نزدیک ہے میری جاں تو ۔۔۔ مگر پھر جو دیکھا کہاں میں کہاں تو
حقیقت میں ہے ماسوا چیز ہی کیا ۔۔۔ اِدھر تو اُدھر تو یہاں تو وہاں تو

حیا و شرم سے چُپ چاپ کب وہ آکے چلے ۔۔۔ اگر چلے تو مجھے سیدھیاں سُنا کے چلے
خبر نہیں کہ کوئی تاک میں بھی بیٹھا ہے ۔۔۔ یہ جھُٹ پٹے میں کہاں آپ مُنہ چھپا کے چلے

کر چکے آہِ سحر بھی نالۂ شبگیر بھی ۔۔۔ ہمنے دیکھا جو کہتے یہ تیر بھی وہ تیر بھی
جو دکھانے کی نہ ہوں چیزیں دکھائیں کسطرح ۔۔۔ اُسنے چہرے ہی کی کھنچوائی فقط تصویر بھی

ہمیں کیا غم قیامت میں جو پُرسش ہونیوالی ہے ۔۔۔ کہ جب وہ فتنہ گر آیا تو پھر میدان خالی ہے

کدورت دل سے جو فریاد کرنے میں نکالی ہے　　وہ کہتے ہیں محبت پر ہماری خاک ڈالی ہے

ہُوا ہے چار سجدوں پر یہ دعویٰ زاہدو تم کو　　خدا نے کیا تمھارے ہاتھ جنت بیچ ڈالی ہے

بچا تھا برق و صرصر سے یہ مشکل آشیاں اپنا　　نظر صیاد کی اب پتے پتے ڈالی ڈالی ہے

تاک کر دل کو وہ فرماتے ہیں ہاں اچھا ہے　　یہ خدا کی قسم انداز سوال اچھا ہے

یہ تری چشمِ فسوں گر میں کمال اچھا ہے　　ایک کا حال بُرا ایک کا حال اچھا ہے

وہ عیادت کو مری آئے ہیں لو اور سُنو　　آج ہی خوبیٔ تقدیر سے حال اچھا ہے

آپ پچھتائیں نہیں جور سے توبہ نہ کریں
آپ گھبرائیں نہیں داغ کا حال اچھا ہے

داغ ایک فطرتی شاعر تھے اور اُنکا رنگ خداداد تھا۔ ان کی غزل، قصیدہ، رباعی، قطعے، سب ایک ہی شانِ تخیل کے مُظہر ہیں۔ قصیدہ کی بابت ہمیں کچھ زیادہ لکھنا نہیں کیونکہ ہماری عاجزرائے ہیں میر کی طرح اُنکی شہرتِ کمال کا ذریعہ اُنکی غزلیں ہیں اور میدانِ تغزل ہی اُنکا مارا ہوا ہے۔ قصیدے اُنھوں نے متعدد لکھے اور اُن میں سے اکثر ایسے ہیں جو قصیدہ نگاری کے معیار پر بھی پورے اُترتے ہیں لیکن حق یہ ہے کہ اس صنف خاص میں ان کے ہمعصر منشی امیر احمد مرحوم امیر مینائی اُن سے کئی منزل آگے ہیں۔ بیشک قصیدوں میں داغ کی خصوصیات کلام، باحسن الوجوہ موجود ہیں اور تشبیب و تمہید و مدح کی دشوار گزار گھاٹیاں اُنھوں نے بہت خوبی سے طے کی ہیں۔ اُنکا اندازِ بیان اور تاثیرِ کلام غزلوں کی طرح قصائد میں بھی نمایاں طور پر موجود ہے۔ مثلاً تمہید ؎

کہاں وہ عقدۂ لاحل کہاں وہ سخت دشواری　　ہوئی یا بند آزادی سے اب میری گرفتاری

شگفتہ دل مرا اتنا کہ جتنا تنگ دل غنچہ　　مجھے وہ خوابِ راحت جس قدر نرگس کو بیداری

طبیعت میں مری ایسی نزاکت ہے لطافت ہے　　کہ مضمونِ میانِ یار بھی زنجیر ہے بھاری

مدحیہ اشعار :- ؎

تری بزمِ طرب انگیز و عشرت خیز ایسی ہے　　تماشا جسکی کرتے ہیں پری رویانِ فرخاری

یہ وہ درگاہ والا جاہ ہے جسکی سلامی میں　　حجازی و عراقی رومی و چینی و تاتاری

سخن فہم و سخن گستر سخن دان و سخن پرور　　تجھی سے حسن کو رونق تجھی سے حسنِ تتاری

اس بات کے شاہد ہیں کہ غزل کا رنگ قصیدہ میں بھی قائم رکھا ہے گھوڑے کی تیز روی کی تعریف کرتے ہیں تو عاشق کی آہِ رسا سے تشبیہ دیتے ہیں ؎

ترے اسپِ پری پیکر کی چالاکی کا کیا کہنا　　نہیں آتی تصور میں بھی جس کی تیز رفتاری

وہ پہنچے اس طرح اک جست میں مشرق سے مغرب تک　　کہ جیسے آہِ عاشق ہو رسا تا چرخِ زنگاری

غرض ہماری رائے ناقص میں داغ کے قصائد بجائے خود اصولی اور قابلِ تعریف ہیں۔ ہاں شکوہِ الفاظ اور شوکت مضمون کا طلسم اُنھوں نے نہیں تیار کیا اور اسی لیے معیار مقررہ کے مطابق سودا، انشا، اور ذوق کے قصیدوں سے اُنکا مقابلہ نہیں ہو سکتا۔ امیر مینائی بھی اس معرکہ میں اُن سے سربرآ ہو گئے ہیں۔ لیکن ان اساتذہ سے قطع نظر کرکے دیکھا جائے تو داغ اس فن میں بھی بیسیوں سے اچھے ہیں۔ یہ بات اور ہے کہ جو کیفیت اُنکی غزلوں کی ہے وہ شان قصیدوں کی نہیں۔

رباعیات بھی داغ نے اپنے رنگ میں خوب کہی ہیں۔ ہم مثالاً چند رباعیاں نقل کرتے ہیں ؎

بیگانہ یہاں ہر اک یگانہ دیکھا　　اپنے مطلب کا سب زمانہ دیکھا

جس کو دیکھا غرض غرض کا اپنی　　دنیا کا عجیب کارخانہ دیکھا

دنیا میں کب انسان کی حاجت نکلی　　حسرت ہی رہی نہ کوئی حسرت نکلی

جیتے تھے قیامت کی توقع پر ہم　　خود وقت کی محتاج قیامت نکلی

کہتے تھے نہ عشقِ بتِ خودکام کرو　　پہلے ہی سے اندیشۂ انجام کرو

بیتابیٔ دل کی ہے شکایت ناحق　　اے داغ بس اب قبر میں آرام کرو

کیا جانے کوئی زاہدوں کی گھاتوں کو　　تمیز ذرا چاہیے ان باتوں کو

دن کیوں نہ بڑھتے نہ رات کیوں کر کم ہو   روزوں کے عوض کھاتے ہیں یہ راتوں کو

اخلاقی مضامین کے عوض زیادہ تر عشقیہ باتوں کی کھپت رباعیوں میں کی گئی ہے۔ اگر شقِ اول کی طرف توجہ کرتے تو عملی طور پر ان سے وہی فائدہ مترتب ہوتا جو رباعیاتِ حالی سے ہوتا ہے اور یقیناً اُردو زبان میں یہ ایک قابل قدر اضافہ ہوتا۔

داغ کی زندگی میں اُن کے تین دیوان شائع ہو چکے تھے گلزار داغ، آفتاب داغ، مہتاب داغ۔ پہلا اُن کے اولین کلام کا مجموعہ ہے اور یہ اُس وقت شائع ہُوا ہے جب وہ رامپور میں تھے۔ آفتاب داغ میں کچھ غزلیں رامپور کے زمانہ کی ہیں کچھ اُسکے بعد کی۔ مہتاب داغ حیدرآباد سے نکلا۔ اُنکی وفات کے بعد غیر مطبوعہ کلام کا ایک اور مجموعہ یادگار داغ کے نام سے اور چھاپا گیا ہے جس کا ضمیمہ حال میں لالہ سری رام صاحب ایم اے دہلوی نے نکالا ہے۔ اس میں وہ غزلیں اور متفرق اشعار ہیں جو اوپر کے چاروں دیوان میں چھپنے سے رہ گئی تھیں۔ غرض کہ داغ کی ساری زندگی کی یہی کمائی ہے اور اس میں شک نہیں کہ یہ اولادِ معنوی قیامت تک اُن کا نام قائم رکھنے کی پوری صلاحیت رکھتی ہیں۔ اِن چیزوں کے علاوہ ایک مختصر مثنوی فریادِ داغ بھی ہے جس میں اُنھوں نے اپنی ایک سرگذشت قلمبند کی ہے۔ اصل واقعہ کی نوعیت اور اُسکے حُسن و قبح پر غور کرنا فرائضِ تنقید کی حدود سے باہر ہے، دیکھنا صرف یہ ہے کہ اصولاً فریادِ داغ کس پایہ کی ہے۔

تمام کتاب جو ۷۵ صفحوں پر ختم ہوئی ہے سرسری نگاہ ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ علمی نقطۂ خیال سے وہ بدر منیر وغیرہ کے پہلو میں جگہ نہیں پا سکتی نہ اُس سے کسی خاص وقت کی سوسائٹی کی کیفیت ظاہر ہوتی ہے نہ کوئی دلکش منظر ایسا ہے جو نیچرل کہا جا سکے۔ معنوی اعتبار سے بھی مثنوی کچھ نتیجہ خیز نہیں۔ البتہ چند امور جو قابل توجہ ہو سکتے ہیں وہ یہ ہیں کہ واقعات کے ثبوت میں کسی مافوق العادت قوت سے کام نہیں لیا گیا۔ زبان نہایت سلیس اور فصیح ہے۔ بیان کا تسلسل قابل تعریف ہے۔ فارسی ترکیبوں اور ثقیل الفاظ مطلق نہیں بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی سے بیٹھے باتیں کر رہے ہیں۔ مثلاً نواب رامپور کی مدح میں یہ اشعار کس قدر سادہ اور فصیح ہیں ؎

مدحِ نوابِ نامدار کروں   جان قربان دل نثار کروں
حاجی و زائر و خدا آگاہ   شاہ درویش خوے ظل اللہ
وہ دلاور رئیس اخترِ ہند   وہ مخاطب مشیرِ قیصرِ ہند
اس سخی کا ہے کام دینے کا   اسکے دینے سے نام دینے کا
کیا خزانہ بھرا پُرا پایا   دل خزانہ سے بھی بڑا پایا
سو مزے ایک بات میں دیکھے   سو ہنر ایک ذات میں دیکھے
مسند آرا رامپور رہیں   تا قیامت مرے حضور رہیں
ہے عجب شہر مصطفٰے آباد   اسکو رکھا مرے خدا آباد
سب اسے رامپور کہتے ہیں   ہم تو آرامپور کہتے ہیں
خیر نواب کی سناتے ہیں
جسکا کھاتے ہیں اُسکا گاتے ہیں

اسی طرح کلکتہ سے واپسی کا تذکرہ قابل دید ہے ؎

میری رخصت کے دن تمام ہوئے   عیش و عشرت کے دن تمام ہوئے
جلد حاضر ہو یہ پیام آیا   اور سر پر مِرے صیام آیا
پھر تو میں ایک دم ٹھہر نہ سکا   دل کی صورت قدم ٹھہر نہ سکا
اس طرح کس طرح ٹھہر جاتے   ہوے باوّن برس نمک کھاتے
گر نمک خوار حیلہ گر نکلے   تو نمک پھوٹ پھوٹ کر نکلے

واپسی کے بعد اندوہِ فرقت کی کیفیت کسی قدر سادہ مگر موثر پیرایہ میں دکھائی ہے ؎

مرضِ غم سے کب افاقہ تھا   دن کو روزہ تو شب کو فاقہ تھا
سحری اک زمانہ کھاتا تھا   رمضان مجھکو کھائے جاتا تھا
صدمۂ ہجر و کاوشِ غم سے   عید بدتر ہوئی محرم سے

شادیانے کا شور ہیم ہے میں سمجھتا ہوں میرا ماتم ہے

× × × × × × × × × × × ×

کھانے پینے سے مجکو نفرت ہے عید کو روزہ کیا قیامت ہے

ہائے جب زہر بھی نپائیں ہم کیا کلیجہ بڑوں کا کھائیں ہم

غرض فریادِ داغ میں سلاستِ زبان اور روانیِ کلام کی وہی حدیں کھنچی ہوئی ہیں جو داغ کی ما بہ الامتیاز خصوصیت ہے۔ اسکے باوجود کہنا پڑتا ہے کہ غالباً داغ نے بھی اسے پبلک کے لیے مرتب نہیں کیا بلکہ ایک ذاتی سرگذشت کو نظم کا جامہ پہنانے سے یہ مقصود رہا ہوگا کہ دل کا بخار نکل جائے۔

اس مضمون کے آخر میں داغ کے ملکۂ تاریخ گوئی کا سرسری تذکرہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔ اگرچہ کسی شاعر کے لیے یہ لابدی نہیں کہ وہ تاریخ گو بھی ہو لیکن اس میں شک نہیں کہ یہ بھی ایک کمال ہے۔ ناسخ و ذوق وغیرہ کے اکثر تاریخی مادّے جو خاص مواقع پر فی البدیہہ کہے گئے بہت مشہور ہیں۔ مہتاب داغ میں داغ کے متعدد تاریخی قطعات درج ہیں اُن پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں اُنھیں مہارتِ تامہ حاصل تھی۔ سب سے بڑی خوبی اُن کے تاریخی جملوں میں یہ ہے کہ اُن سے اُس واقعہ کا لفظاً اظہار ہوتا ہے جس سے وہ متعلق ہوتے ہیں۔ مثلاً حضور نظام کی بارگاہ میں رسائی حاصل کرنے اور باریابی پانے کی تاریخ کہی تھی

یہ کہدو ملے داغ سلطان سے
۱۳۰۵ھ

ایسے ہی جب اُن کے آقائے ولی نعمت نے اُنھیں ایک گھڑی انعام میں دی تو اُسکی تاریخ یہ کہی

مرصع منور گھڑی شاہ نے دی
۱۳۱۱ھ

سونے کا توڑا ملا تو اُسکی یہ تاریخ ہوئی

یہ سونے کا توڑا عنایت ہوا
۱۳۱۲ھ

حضور غفراں مکان نے تلواریں مرحمت کیں تو یہ تاریخی فقرہ موضوع ہوا

لکھدوائے داغ عنایت ہوئیں تلواریں آج
۱۳۱۲ھ

تاریخی مادّوں کے علاوہ دو ایک سہرے بھی داغ کی تصنیف سے بہت اچھے ہیں غرض داغ ایک مکمل شاعر تھے۔ ایسے جامعِ خصوصیات اہلِ کمال مُلک کی عام قدردانی کے حق دار ہیں اور ضرورت ہے کہ اِن مشاہیر کی مستقل یادگار قائم کرنے کی صورت پیدا کی جائے

سید محمد فاروق

کلامِ شادؔ

بحرِ فنا شمار نہ اہلِ حیات را
آئینۂ وجود بداں کائنات را

واللہ ہیچ نیست بجز ذاتِ کبریا
جائے کہ جمع کرد بہ اسما صفات را

نقشیست بستہ صورتِ امواجِ بحرہا
ساحل مجوے قلزمِ رنگِ ثبات را

یک دو نفس بس است اگر زندگی خوش است
خواہم نہ از خضر گہے آبِ حیات را

ہر چند اختلافِ صورِ نقشِ کثرت است
لیکن بہ یک وجود ببیں ممکنات را

دریائے ذاتِ اوست کہ بیدا کنار نیست
دانم حبابِ ہستیِ ایں کائنات را

بیدار نیست و خواب و گہے ہیچ نیست شادؔ
ایں دو صفت بداں تو حیات و ممات را

حیات النذیر

مولنا مولوی حافظ ڈاکٹر نذیر احمد صاحب مرحوم کی ذات والا صفات عجیب اعجیب خوبیوں کا مجموعہ تھی۔ ہندوستان کے اُن تمام مشاہیر میں جنکی خدمات علمی و ادبی نمایاں اعزاز کا استحقاق رکھتی ہیں مرحوم کا درجہ نہایت بلند اور بہ غایت ارفع تھا۔ آپ کے قومی کارنامے اگر ایک طرف آپ کو ملک و قوم کا حقیقی بہی خواہ ثابت کرتے ہیں تو دوسری طرف آپ کی قلمی خدمات اور دماغی کارگزاریاں آپ کو ادب اُردو کا ایک بے لوث، بےغرض، اور بے لاگ سرپرست ظاہر کر رہی ہیں۔ اُردو لٹریچر کی آج سے دس بیس برس پہلے کیا بساط تھی۔ فسانۂ عجائب اور اسی قماش کی چند کتابیں ہمارے خزانۂ ادب کی گویا بیش بہا پونجی سمجھی جاتی تھیں۔ لیکن دعا دینا چاہیے اُن بابرکت نفوس کو جنھوں نے اُردو کو اپنی مساعی جمیلہ سے اس قابل کیا کہ آج وہ بھی معاصر السنہ سے آنکھ ملانے کا دعوے رکھتی ہے اور بجا رکھتی ہے۔ مولوی نذیر احمد مرحوم کا شمار اُسی مقدس طبقہ میں ہوتا ہے جس کے افراد نے اُردو کو قعر ذلت سے نکال کر اوجِ رفعت پر چڑھانے کا سامان بہم پہنچایا ہے۔ اس بابرکت جماعت میں لحاظ اپنے کام کے وہ بہت سوں سے آگے ہیں لیکن پیچھے کسی سے نہیں۔ اُنھوں نے اُردو کی دست گیری اس حالت میں کی کہ اُسکی کوئی بات بھی نہ پوچھتا تھا۔ نونہال اُردو کے پروان چڑھانے کی کوشش آج خواہ کسی صورت میں ہو رہی ہو اور اسکے اطمینان بخش نتائج آگے چلکر خواہ کچھ ہی کیوں نہ نکلیں لیکن اس نونہال کی پرورش جس زمانہ شناس اور علم دوست پارٹی نے ابتداءً کی اُسکا احسان کوئی بھول نہیں سکتا اور بلاشبہہ علمی حیثیت سے مولنا نذیر احمد کو اس پارٹی میں غیر معمولی نام و نمود حاصل تھی۔ ان تمام وجوہ سے اُردو زبان سب سے زیادہ بد قسمت اور اُردو کے موجودالوقت اہل قلم محسن کُش سمجھے جانے کے مستحق تھے اگر مولنا کی سوانح عمری خود اسی زبان میں مدون نہ ہوتی جس کی فلاح و اصلاح کی دُھن میں اُنکی ساری زندگی بسر ہوئی تھی۔ یہ مسرت کا مقام ہے کہ مولوی سید افتخار عالم صاحب نے اُردو کو اس بدنصیبی سے اور اہل قلم طبقہ کو اس الزام سے "حیات النذیر" تالیف کرکے صاف بچا لیا ہے۔

حیات النذیر، جیسا کہ نام سے آشکارا ہے، مولنا نذیر احمد مرحوم کی مفصل، مدلل، اور مشرح لائف ہے جسکی تدوین کا امتیازی فخر سید افتخار عالم صاحب کو حاصل ہوا ہے۔ اسکا ملال ضرور ہے کہ باوجودیکہ اسکی ترتیب کا آغاز صاحب سوانح کے حین حیات ہو چکا تھا لیکن بعض موانع اُنکی زندگی میں اسکی اشاعت میں حارج رہے۔ اور مولنا کے انتقال کے تقریباً بارہ مہینے بعد یہ شائع ہوئی ہے۔ اس تعویق کے لیے حضرت مولف خود متاسف و عذر خواہ ہیں اور اُن مجبوریوں کو پیش نظر رکھتے ہوے جو معمولی سی معمولی کتاب کی تیاری میں بھی بالعموم پیش آیا کرتی ہیں سید افتخار عالم صاحب پر کوئی الزام عائد نہیں ہو سکتا، جنھوں نے "حیات النذیر" ایسی ضخیم و مطول تالیف کی گراں قدر ذمہ داری اپنے سر لی تھی۔ قدر دانان علم و فن کو خوش ہونا چاہیے کہ اُن کے حلاوت اندوز ہونے کا سامان سید صاحب نے نہایت محنت و جاں کاہی سے فراہم کیا ہے اور سید صاحب مستحق مبارکباد ہیں کہ اُنھوں نے اپنی غیر معمولی تلاش و جستجو سے وہ کام لیا ہے جس کی انجام وہی ہر ایک کے احاطۂ امکان سے قطعی خارج ہے جس دلچسپی سے اُنھوں نے یہ فرض ادا کیا ہے اُسکا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ خود مولنا مرحوم سید صاحب کی اس کوشش کو غیر مستحسن سمجھتے تھے اور آپ نے کسی قسم کی بھی امداد دینے سے قطعی انکار کر دیا تھا لیکن سید صاحب دُھن کے پکے اور خیال کے پورے تھے۔ تمام مشکلات کا سامنا جواں مردی سے کیا۔ گل چینی میں کانٹوں کی خلش بخوشی گوارا کی

اور بالآخر "حیات النذیر" کی شکل میں منتشر و پراگندہ پھولوں کو جمع کر کے ایک ایسا گلدستہ تیار کر دیا جسکی دلکشی و دلفریبی دیکھنے والوں کو اپنی طرف کھینچ لینے کی صلاحیت بخوبی رکھتی ہے۔

اس مقام پر حیات النذیر کی تقسیم و ترتیب کا اجمالی تذکرہ غالباً خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ شروع میں، فہرست مضامین کے بعد، جناب حاجی محمد حمید اللہ خاں صاحب بہادر، اے۔ ڈی۔ سی، فرزند اصغر علیا جناب بیگم صاحبۂ بھوپال کی شبیہ ہے جن کے نام نامی پر اس کتاب کو معنون ہونے کا فخر حاصل ہوا ہے۔ پھر اُس زبردست ہیرو کا عکسی فوٹو ہے جس کے زبردست کارنامے اس ضخیم و حجیم سوانح عمری میں قلم بند کیے گئے ہیں۔ مضامین کے اعتبار سے سب سے اول مولوی عبدالحق صاحب بی۔ اے کا لکھا ہوا مقدمہ ہے، اور اُسکے دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ موصوف کو مقدمہ نگاری کا فی الواقع ایک خاص ملکہ حاصل ہے۔ اسکے بعد مولنا شبلی، خواجہ حالی، اور مفتی انوار الحق وغیرہم کے وہ ریویو شامل کر دیے گئے ہیں جو اِن فضلاء نے اس کتاب کے مطالعہ کے بعد تحریر کیے تھے۔ پھر مصنف کا خاص دیباچہ ہے اور پھر اصل کتاب کے مطالب شروع ہو گئے ہیں جن کی تقسیم باعتبار مدارجِ حالات و ترتیب واقعات سات حصوں پر اس طرح کی گئی ہے کہ

حصۂ اول میں پیدائش سے لیکر قبل ملازمت کے واقعات ہیں

حصۂ دوم میں ابتدائے ملازمت سے اُس زمانہ تک کے واقعات ہیں کہ مولنا حیدرآباد نہیں گئے تھے

حصۂ سوم میں حیدرآباد کی ملازمت اور تعلقات کا تذکرہ ہے

حصۂ چہارم میں مولنا کا حلیہ، اخلاق و عادات، طرز معاشرت وغیرہ پر روشنی ڈالی گئی ہے

حصۂ پنجم میں اُنکی تصانیف و تالیفات و تراجم پر ایک مبسوط تبصرہ ہے

حصۂ ششم میں اُنکے مذہبی اعتقادات و تلقینات کا پہلو دکھایا گیا ہے

حصۂ ہفتم میں چند ضمیمے شامل کیے گئے ہیں۔ ان میں سے کئی اس قابل تھے کہ اُنھیں اصل متن میں جگہ دیجاتی تو انسب تھا۔

سطور بالا سے سرسری طور پر اندازہ ہو سکتا ہے کہ لائق سوانح نگار نے اپنی تصنیف کو مکمل بنانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ نہ کوئی پہلو جس سے مولنا نذیر احمد کی لائف پر روشنی پڑ سکتی ہو نظر انداز ہونے پایا ہے اور سچ یہ ہے کہ ایسے زبردست شخص کے حالات اسی کے مستحق تھے کہ اسی تفصیل و تکمیل کے ساتھ لکھے جاتے جس کی حدیں "حیات النذیر" کے صفحات میں کھینچی ہوئی نظر آتی ہیں۔

مولنا نذیر احمدؒ غیر معمولی شخصیت کے بزرگ گزرے ہیں اور اُن کے اوصاف کی گونا گونی اُنھیں اقران و اماثل میں ممتاز درجہ دلانے کی شدومد سے سفارش کرتی ہے۔ اسی کے ساتھ اُن کے واقعات زندگی خصوصیت سے دلچسپ و سبق آموز ہیں۔ مولنا کا شمار بجا طور پر دنیا کے اُن مشاہیر میں ہونا چاہیے جنھوں نے نہایت چھوٹی ابتدا سے بالآخر کامیابی کے مدارج طے کیے ہیں اور اس امر خاص میں وہ کسی غیر کے نہیں بلکہ اپنی ہی سعی و جاں فشانی کے رہین منت ہو سکتے ہیں۔ فرینکلن کا مقولہ ہے کہ "اولوالعزم آدمی، خواہ اُسکی حالت بظاہر کتنی ہی پست کیوں نہ ہو، تاہم وہ اپنی منزل مقصود پر پہنچنے کا راستہ خود اپنی طبیعت سے نکال لیتا ہے۔" مولنا نذیر احمدؒ کے متعلق اگرچہ فی نفسہ اس قول کی تطبیق صحیح نہ ہو، پھر بھی اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ وہ ایک خود ساختہ کامیاب شخص گزرے ہیں۔ اور اُنکے حالات اور طور و طریق کا غائر مطالعہ کرنے کے بعد ہر ایک آدمی، جو اس دنیا میں رہ کر شہرت و عظمت کے مراتب طے کرنا چاہتا ہے، کچھ نہ کچھ سیکھ سکتا ہے۔

"کامیاب زندگی" سے یہی مراد نہیں ہے کہ انسان فکر معاش سے مستغنی ہو یا اُسکے پاس گنج وافر موجود ہو۔ کیوں کہ عقلاً "کامیابی" کی یہ صورت ہے تو ضرور، لیکن بالکل ادنیٰ اور ابتدائی۔ ہاں وہ شخص البتہ

"کامیاب" کہلانے کا بوجہ احسن مستحق ہے جسکا وقت، جسکا مال، جسکا دل، جسکا دماغ اُس کے بھائیوں، یا دوسرے الفاظ میں، بنی نوع انسان کے فائدہ میں کام آئے۔ ثانی الذکر شق سے قطع نظر، اور ہر ایک پہلو سے مولنا نذیر احمد مرحوم کے کارنامے گویا اس بات کا ثبوت ہیں کہ اُنکی ذات ملک و اہل ملک کے حق میں سرچشمۂ فیض و برکت تھی۔ سب سے زیادہ قابل ذکر اُنکی وہ علمی کوششیں تھیں جنھوں نے اُردو کے جسد بے روح میں سنے الواقع جان ڈالی۔ اگر مولنا مرحوم کے علمی کارناموں پر مختلف حیثیت سے نظر ڈالی جائے اور پھر یہ بھی دیکھا جائے کہ ان سے کیا کیا بیش قیمت اور دیرپا نتائج حاصل ہوئے اُسوقت اُنکی قدر و منزلت کا اندازہ ہوتا ہے۔

آج کل تعلیم نسواں کی جو ہڑبونگ مچی ہے وہ بلا شبہ ایک طوفان بے تمیزی کی صورت پکڑتی جاتی ہے۔ حامیان تعلیم نسواں، جن میں سے اکثر خالص جوش ہمدردی کی بنا پر صنف نازک کی بہتری و فلاح کے وسائل سوچنے پر آمادہ ہوے ہیں، اپنی اپنی جگہ کیا کچھ نہیں کر رہے۔ نابل اسکول کھولنے کی فکریں ہو رہی ہیں، اعلی تعلیم نسواں کے سامان بہم پہنچائے جا رہے ہیں، رسالے جاری کیے جاتے ہیں، نمایشیں ہوتی ہیں اور زنانہ کانفرنس کا خواب بھی دیکھا جاتا ہے۔ یہ سب کچھ ہو رہا ہے لیکن انصاف سے دیکھیے تو جو کام چپ چپاتے مولنا نذیر احمد کر گئے ہیں وہ اپنے علمی نتایج کے اعتبار سے ان تمام نقش بر آب کوششوں سے کہیں افضل و اعلی ہے۔ اور لطف یہ ہے کہ تعلیم نسواں کے متعلق مرحوم نے جو کچھ کیا اُسوقت کیا جس وقت کوئی اسکی اہمیت پر غور کرنے والا بھی نہ تھا، یار و مددگار ملنا تو دوسری بات ہے۔

مولوی نذیر احمد مرحوم پُرانی روشنی کے بزرگ تھے۔ تعلیم بھی اُنکی پُرانے طرز پر ہوئی تھی اور وضع قطع اور اکثر امور میں وہ قدامت پسند تھے۔ لیکن کیا عجیب بات ہے کہ "مرأة العروس" جسکو آپ کی مستقل اولیں تصنیف ہونے کا فخر حاصل ہے، نہ صرف پُرانے خیال کے لوگوں میں مطبوع و دل پسند ہے بلکہ نئی روشنی والوں کی زبان بھی اسکی تعریف میں ہمیشہ خشک دیکھی گئی ہے۔ اور اس میں شک نہیں کہ اس میں اور نیز اسی قماش کی دوسری کتابوں میں انشاپردازی وغیرہ کی خوبیوں کے علاوہ ہندوستانی طرز معاشرت کا وہ دلآویز اور صحیح فوٹو کھینچا گیا ہے کہ باید و شاید۔ مولوی عبد الحق صاحب مرأة العروس کی بابت لکھتے ہیں اور سچ لکھتے ہیں

> مرحوم اگر مرأة العروس کے سوا کوئی دوسری کتاب نہ لکھتے تو بھی وہ اردو کے باکمال انشاپردازمانے جاتے اور ان کی حیات جاودانی کے لیے صرف یہی ایک کتاب کافی ہوتی۔

اسی طرح غور کیجیے تو اُنکی تمام تصانیف و تراجم میں بہت سی مشترک و غیر مشترک خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ خصوصاً کتب قانونی کے ترجمہ میں اصطلاحات جس نفاست سے چسپاں کی گئی ہیں اُنکی داد نہیں دیجا سکتی۔ ایسے ہی علم ہیئت کی اصطلاحات جس عمدگی سے وضع اور استعمال ہوئی ہیں وہ مولنا نذیر احمد ہی کا حق سمجھا جا سکتا ہے۔ ترجمۂ قرآن مجید اپنی لسانی خوبیوں کے لحاظ سے نہ صرف قابل تعریف ہے بلکہ آپ کا ترجمہ دیگر تمام تراجم پر حق فوقیت رکھتا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ مولنا شاہ عبد القادر دہلویؒ کا ترجمہ اسوقت بھی کئی خصوصیات میں ممتاز سمجھا جاتا ہے، لیکن جمہور میں اب جس قدر رواج مولوی نذیر احمد کے ترجمہ کا ہے وہ کسی دوسرے کا نہیں۔

اس مقام پر مولوی صاحب مرحوم کے تمام علمی کارناموں کا تذکرہ غیر ممکن ہے لیکن خوشی کی بات ہے کہ سید افتخار عالم صاحب نے حیات النذیر کے قابل تتمہ ہیرو کی زندگی کے جہاں اور تمام واقعات پر کافی روشنی ڈالی ہے وہاں اُنکے علمی کارناموں پر بھی ایک مبسوط و مدلل تبصرہ لکھا ہے۔ یہ قرین قیاس ہے کہ مصنف کی اکثر آرا سے ہر شخص کو اتفاق نہ ہو لیکن اصولاً اُنھوں نے اپنی کوشش

کی تکمیل میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔

ایک بات جو "حیات النذیر" کے مطالعہ کرنے والوں کی نگاہ میں کھٹکتی ہے وہ یہ ہے کہ سید صاحب نے اکثر مقامات پر اظہار آراء میں مفرط حسنِ عقیدت سے کام لیا ہے۔ ایک نکتہ سنج دوست کا خیال ہے کہ اُنھیں اپنے ہیرو کے عادات وخصائل پر رائے زنی کرتے ہوے کسی قدر زیادہ آزادی سے کام لینا چاہیے تھا۔ برخلاف اسکے اُنھوں نے اکثر قابل اعتراض امور کی توجیہ کچھ اس طرح کی ہے جو مذاق سلیم کو ناگوار ہوتی ہے۔ اکثر اس قماش کی تاویلیں، جو قبولیت کا درجہ نہیں پا سکتیں، نہ صرف فضول اور غیر موثر ہوتی ہیں بلکہ اس سے مصنف کی آزادانہ رائے زنی کی قدر بھی گھٹ جاتی ہے۔ حیدرآباد کے اکثر واقعات دوسری روشنی میں دکھائے گئے ہیں اور اس بات کا کہیں تذکرہ نہیں کیا گیا کہ مولنا اور نواب محسن الملک کے تعلقات وہاں ابتداءً کیسے تھے اور بالآخر ان دونوں بزرگوں کے درمیان کشیدگی پیدا ہو جانے کے اسباب کیا ہوے۔ وہاں کے اکثر حالات اس انداز سے قلم بند کیے گئے ہیں گویا سید افتخار عالم صاحب نے حیدرآباد میں بیٹھکر اُنھیں دیکھا یا سُنا تھا۔ لیکن غالباً ایسا نہیں ہُوا کیونکہ حیدرآبادی پبلک کے مختلف طبقے مولنا نذیر احمدؒ کے متعلق مختلف خیال ظاہر کرتے ہیں۔

اجتماع دولت اور مہمان نوازی کے عنوان سے مصنف نے جو کچھ پیش پا اُفتادہ تاویلیں کی ہیں اُن میں سے اول الذکر بحث پر مولوی عبدالحق صاحب نے جو کچھ لکھدیا ہے وہ کافی ہے۔ اگر مولنا نذیر احمدؒ چاہتے تو اپنی دولت کے بہت سے صحیح مصرف سوچ سکتے تھے۔ بقول مولوی عبدالحق صاحب مولنا کرامت حسین کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ ثانی الذکر عنوان پر جو کچھ لکھا گیا ہے اُسے کم ازکم اسلامی تعلیم اور اسلامی روایات کے منافی ضرور سمجھا جا سکتا ہے۔

"اُمہات الامۃ" کی بابت ضرور افسوس کیا جا سکتا ہے کہ "مولویوں" نے اُسکے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا لیکن جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ خود سید افتخار عالم صاحب اُسکی طرز ادا پر گستاخی کا الزام لگاتے ہیں اور مولنا مرحوم پیرانہ سالی اور تجربہ کاری کے باوجود اپنی تیز زبانی کے مقر نظر آتے ہیں تو پھر "مولویوں" کو کیوں خالی خطا وار ٹھہرایا جائے۔ یہ ضرور ہے کہ اس زمانۂ آزادی میں کسی کتاب کا جلا ڈالنا حد درجہ قابل اعتراض بلکہ لائق نفرین سمجھا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ وہ کون سے وجوہ تھے جن کے باعث مولوی نذیر احمد مرحوم اس کتاب کے سارے نسخوں کو حوالۂ نار کر دینے و تباہ کر دیے جانے پر راضی ہو گئے۔

ایک کمی "حیات النذیر" میں اور محسوس ہوتی ہے اور وہ یہ ہے کہ مولنا کی شاعری پر شرح وبسط سے کوئی بحث نہیں کی گئی۔ لیکن ایسا عمداً کیا گیا ہے۔ سید افتخار عالم صاحب نے مولنا کی نظموں کا ایک جداگانہ مجموعہ "نظمِ بے نظیر" کے عنوان سے شائع کیا ہے، جسکو ادبِ اُردو کی ایک بڑی خدمت کہنا چاہیے۔ اِسکے لیے شیدائیانِ لٹریچر کو سید صاحب کی سعی جمیلہ کی داد دینا چاہیے۔

آخر میں "حیات النذیر" کی ایک خوبی قابل تذکرہ ہے۔ یعنے سید افتخار عالم صاحب نے اِس ضخیم و مطول کتاب میں جس انداز اور طرز بیان سے کام لیا ہے وہ نہایت شگفتہ اور سُلجھا ہُوا ہے اور بقول مولنا شبلی اس پر مولنا نذیر احمدؒ کے لٹریچر ہونے کا گمان ہوتا ہے۔ خدا کرے سید صاحب کی یہ کوشش عند اللہ ماجور اور عند الناس مشکور ہو اور اُن کے رشحاتِ قلم سے اہلِ ملک کو آیندہ بھی مستفید ہونے کا موقع ملتا رہے۔

"حیات النذیر" کی قیمت تین روپے محاسن ظاہری و باطنی کے اعتبار سے گویا کچھ نہیں۔ شایقین کو دست طلب بڑھانا چاہیے۔

مولوی بشیر الدین احمد صاحب، اول تعلقدار رائچور دکن، یا دفتر رسالۂ العصر لکھنؤ سے یہ کتاب دستیاب ہو سکتی ہے۔

"سید القلم"

عصریات

ہندوستان میں چھاپہ خانے

ہندوستان میں چھاپہ خانوں کی تعداد سنہ ۱۹۰۳ میں ۲۱۵۶ تھی اور سنہ ۱۲-۱۹۱۱ میں اس تعداد میں ۶۲۵ کا اضافہ ہوگیا۔ سنہ ۰۷-۱۹۰۶ میں اخبارات کے چھاپہ خانوں کی تعداد ۷۵۳ تھی۔ گذشتہ سال میں موقت الشیوع جرائد ۶۵۹ تھے۔ سنہ ۱۱-۱۹۱۰ میں بمبئی میں ۱۴۱ اخبارات شائع ہوتے تھے صوبجات متحدہ آگرہ و اودھ میں ۱۰۸، مدراس میں ۱۰۴، اور بنگالہ میں ۹۶۔ مگر اب صوبجات متحدہ سے ۱۴۱، بمبئی سے ۱۳۹، بنگال سے ۱۱۵، اور مدراس سے ۸۰ اخبارات نکلتے ہیں۔ موقت الشیوع پرچوں کی تعداد میں مدراس کا نمبر اول ہے۔ تھوڑا ہی عرصہ ہوا کہ انگریزی اور دیگر یورپین زبانوں میں جو کتابیں شائع ہوئیں اُنکی تعداد ۱۵،۹۶ تھی اور ہندوستان کی زبانوں میں چھپنے والی کتابوں کی تعداد ۹۹،۸۸ تھی۔

اخباراتِ ماضی وحال

اخبار نویسوں کی سالانہ کانفرنس میں جو نیویارک میں منعقد ہوئی تھی، صدر جلسہ مسٹر رابرٹ ڈونلڈ نے اپنی نہایت دلچسپ تقریر کے دوران میں اُن تمام تغیرات اور انقلابات پر ریویو کیا جو گذشتہ بیس سال کے اندر اخباری دُنیا میں ظہور پذیر ہوے ہیں۔ اُنھوں نے پیشین گوئی کے طریق سے یہ بھی بتایا کہ آیندہ اخبارات کس قسم کے ہوں گے۔ اِن تغیرات کی ایک نہایت اہم خصوصیت بقول مسٹر ڈونلڈ "اخبارات کا قوی بنایا جانا" ہوگی۔ یہی اخبارات کے موجودہ انقلاب کا اصلی سبب ہے۔ آج کل اخبارات بالکل تجارت کے اصول پر ڈھل گئے ہیں۔ شخصی ملکیت کا رواج اُٹھتا جاتا ہے اور اس کے بجاے لوگ متحد ہوکر اخبار چلاتے ہیں۔ خواہ یہ اتحاد نج کا ہو یا سرکاری۔ اب متحدہ ملکیت کی صورت میں چونکہ حصہ دار صرف روپیہ لگاتے ہیں اور اخبار نویس نہیں ہوتے اس لیے ان کی نظر منافع پر لگی رہتی ہے خواہ اس عمل میں اصول کو کتنا ہی صدمہ کیوں نہ پہنچے مگر اخبار بیں جمہور کے نقطۂ خیال سے جدید طرز اخبار نویسی قدیم کے مقابلہ میں قابل ترجیح ہے۔ روزانہ اخبارات میں بحیثیت مجموعی ایک عام ترقی ہے۔ ہر جماعت کے اخبارات پہلے سے بہتر لکھے جاتے ہیں، زیادہ پڑھے جاتے ہیں، اور زیادہ دلچسپ ہوتے ہیں۔ اخباروں کے مستقبل کے متعلق مسٹر ڈونلڈ کی رائے بہت امید افزا ہے۔ "اشاعت بہ کثرت ہوگی اور کمزور اخبارات بند ہو جائیں گے۔ بہت دُور کے مقامات کے لیے ہوائی جہاز استعمال کیے جائیں گے۔ خاص سڑک پر چلنے والی برقی ریل گاڑیاں اور موٹر پلینز استعمال کی جائیں گی۔ اخبارات برقی اور ہوائی نلکیوں کے ذریعہ سے تقسیم ہُوا کریں گے۔ وقائع نگار سفری ٹیلیفون لیے پھریں گے جن کو آسانی سے ایک جگہ سے دوسری جگہ لیجا سکیں"۔

ایجاد کا علمی پہلو

کئی سال ہوئے پروفیسر میکرل نے برقی چنگاریون کے اعمال و عادات کے متعلق مختلف تجربے کئے تھے۔ انہون نے دیکھا کہ ان چنگاریون سے ایسی شعاعین نکلتی ہین جو گرمی یا روشنی کی شعاعون سے بالکل مختلف ہین اسکے بعد کئی طریقون سے شعاعون کی تحقیقات جاری رہی جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ ایکس شعاعین اور تین اور قسم کی شعاعین دریافت ہوئین مسٹر ہیری کاکس جنکی تمام عمر ایکس شعاعون کا تجربہ کرنے اور اسکے متعلق کتابین لکھنے مین بسر ہوئی کہا کرتے تھے کہ مین ایک دن ایسی شعاعین دریافت کرونگا جو جنگی جہازون کو اڑا دینگی بعد مین بہت سائنس دانون نے اسکے متعلق تجربے بھی کئے مگر کامیابی بیٹیر الیوی ہی کی قسمت میں تھی

ہندوستان کی ترقی

مسٹر مانٹیگو کی شاندار تقریر نے جو اُنھوں نے بجٹ کے موقع پر کی ہے تنقید کا بہت کافی موقع دیا ہے۔ اُن کے بیان پر انگلستان کے بہت سے اخباروں نے رائے زنی کی ہے۔ ذیل میں ڈیلی ٹیلیگراف سے اعداد نقل

کیے جاتے ہیں جن میں زیر نظروہ سالہ مدت کے اول اور آخر سال کا مقابلہ ہے
ان اعداد سے معلوم ہوگا کہ ہندوستان نے اِن دس سال میں کتنی ترقی کی ہے۔

تفصیل	دہاکہ کا پہلا سال	دہاکہ کا آخری سال
درآمد	۷۴۱۳۲۱۰۲ پونڈ	۱۳۱۶۱۴۹۰ پونڈ
برآمد	۹۲۷۰۲۸۳۴ پونڈ	۱۵۸۹۰۸۰۹۱ پونڈ
تقسیم شدہ خطوط اور پوسٹ کارڈ	۴۹۵۶۲۲۹۳۱	۸۵۰۸۸۹۵۲۷
سونگ بنک میں جمع	۲۹۷۵۸۳۵ پونڈ	۵۸۵۷۹۷۵ پونڈ
برقی پیغامات	۶۴۷۵۵۴۵	۱۴۵۷۱۸۱۹
مسافتِ ریل	۲۵۳۷۳ میل	۸۲۲۸۳۹ میل
مسافر سوار ہونیوالے	۱۹۶۴۴۸۰۰۰	۴۳۱۲۱۲۰۰۰
کُل کمائی	۲۲۲۶۱۸۰۰۰ پونڈ	۴۰۸۳۳۰۰۰ پونڈ
زراعتی نہریں لمبائی میں	۳۱۳۷۶ میل	۴۰۴۵۵ میل
طلباء درج رجسٹر	۴۵۲۹۴۹۱	۶۷۹۱۰۵۵
تعلیم کے اخراجات	۲۶۸۱۶۷۰ پونڈ	۵۲۵۶۲۲۳ پونڈ

چاولوں میں غذائیت

لینسٹ کلینک (Lancet Clinic) اپنے
ایک تازہ اڈیٹوریل میں چاول کے عضلات بنانے کی خاصیت پر بحث کرتے ہوئے
لکھتا ہے کہ جب روس جاپان سے ہار گیا تو تمام عالم کی توجہ جاپانیوں کی قوتِ
برداشت اور استقلال کی طرف منعطف ہوئی اور اس بات سے حیرت ہوئی
کہ ایک چاول کھانے والی قوم نے اس قدر زبردست جسمانی قوت حاصل کرلی۔
ریاستہائے متحدہ امریکہ و انگلستان میں چاول کو اسکی ترکیب میں نشاستہ کے
افراط کے سبب سے عموماً ایک ادنیٰ قسم کی غذا سمجھا جاتا رہا ہے اور جس حالت
میں چاول ہمیں ملتا ہے اسکے لحاظ سے یہ خیال صحیح بھی ہے۔ یہ نقص چاول
میں اسکے مغذی جزو کے علٰحدہ ہوجانے سے واقع ہوتا ہے۔ چاول کو منڈی
کے قابل بنانے اور صاف کرنے میں نہ صرف بھوسی ہی الگ کردی جاتی ہے
بلکہ وہ باریک خول بھی جس میں چاول رہتا ہے جھڑ جاتا ہے۔ اس خول کو
انگریزی میں رآئس میل (Rice Meal) کہتے ہیں۔
اسکا دیکھنے میں بُرا سا بھورا رنگ ہوتا ہے۔ انگلستان میں جس چیز کو
آئل کیک (Oil-Cake) کہتے ہیں وہ اسی کی بنتی ہے۔ اس
سے مویشی موٹے کیے جاتے ہیں۔ یہ باریک بھورے رنگ کا خول جسے کتا
کہتے ہیں بہت مغذی ہوتا ہے کیونکہ یہ البیومن (Albumen.)
سے بنتا ہے۔ اسکا کیمیائی تجزیہ ظاہر کرتا ہے کہ اِس میں ½ ۲ فی صدی
البیومن کے مرکبات ہوتے ہیں اور ½ ۴ فی صدی فاسفورس کا تیزاب
ہوتا ہے۔ اول الذکر انسان کو بہت جلد ہضم ہوتا ہے۔ چونکہ جاپانی اور
بعض اور چاول کھانے والی قومیں چاول کو چِلا نہیں دیتیں اِس لیے
غذائیت اور ذائقہ کافی مقدار میں رہتا ہے جو اہل امریکہ اور اہل یورپ
کے حصہ میں نہیں آتا۔

کیمیکل سُوسائٹی کے ایک جدید جرنل میں بھی اس مضمون پر دلچسپ
معلومات جمع کی گئی ہیں۔ اس میں اوریزنین (Oryzanin)
(یعنی وہ مادہ جو چاول کے چھلکے میں پایا جاتا ہے) کی اہمیت تحقیقات کی بنا
پر ثابت کی گئی ہے۔ تحقیقات سے ظاہر ہُوا ہے کہ جن مرغیوں، فاختاؤں،
چوہیوں، اور کُتّوں کو کھانے کے لیے صرف صاف کردہ چاول دیے گئے
وہ بیمار ہوگئے اور آخرکار مر گئے۔ سبب مرگ غذائیت کی کمی بیان کیا
جاتا ہے۔ اوریزنین نہ ملنے کی وجہ سے جو عمدہ پرورش کے لیے لازمی ہے
انکا وزن کم ہوتا گیا۔ چربی اور نمک وغیرہ کی ناقص خوراک اوریزنین ملانے
سے بالکل کامل بن گئی۔ کتوں کی حالت میں دیکھا گیا ہے جو اس مادہ
کے خوراک میں نہ شامل ہونے کی وجہ سے گھلتے چلے جاتے تھے کہ صرف
تین گرین اوریزنین شامل کرنے سے بہت جلد تندرست ہوگئے۔ کہا جاتا ہے
کہ اوریزنین مختلف ماکولات میں کافی مقدار میں پائی جاتی ہے۔

بمبئی میں ادبی تحریک

گورنمنٹ گزٹ بمبئی کی ایک حال کی اشاعت میں احاطۂ بمبئی کے ادبی نتائج کے متعلق بعض دلچسپ واقعات مذکور ہیں۔ اس میں سال رواں کی پہلی سہ ماہی کے اعداد دیے گئے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ کُل کتب کی تعداد جو قریباً ایک درجن زبانوں میں شائع ہوئی ہیں ۴۶۵ ہے۔ اِن میں سے ۱۳۶ کتابیں مرہٹی میں، ۶۷ سندھی میں، اور تعجب ہے کہ صرف ۱۳ گجراتی میں چھپی ہیں۔ دیسی تصانیف کے لحاظ سے بمبئی بنگالہ سے دوسرے درجے پر ہے۔ گجراتی اور مرہٹی دونوں زبانوں میں نظم، ڈراما، اور افسانے بہت بڑی مقدار میں ہیں مگر عام ادبیات اور فلسفہ میں ترجمے قدرتی طور پر نمایاں جگہ رکھتے ہیں جو انگریزی اور ہندوستان کی قدیم زبانوں سے کیے گئے ہیں۔ آخر میں یہ بھی بتایا ہے کہ احاطۂ مذکور میں ایک سوسائٹی ریشنلسٹ پریس ایسوسی ایشن (Rationalist Press Association) کے اصول پر قائم کی گئی ہے جس کا مقصد اعلیٰ قسم کے لٹریچر کو ارزاں بنانا ہے کہ وہ آسانی سے عوام کی دست رس میں آسکے۔

تصنیفات پنجاب میں

پنجاب ٹکسٹ بک کمیٹی نے جو رپورٹ حال میں شایع کی ہے اُس میں موجودہ اور گذشتہ سال کے کام کا مقابلہ کرکے دکھایا ہے کہ جن کتابوں پر غور کیا گیا، اُنکی تعداد ۱۸۵ سے ۱۴۶ ہو گئی ہے اور ایسے مصنفوں کی تعداد جنھوں نے اپنی کتابیں اس غرض سے بھیجیں کہ لٹریچر فنڈ سے انکی سرپرستی کی جائے ۱۴۱ سے ۴۹ ہو گئی ہے۔ نیز ایسی کتابوں کی تعداد جن پر فنڈ کی طرف سے غور کیا گیا، ۷۷ سے ۱۰۴ ہو گئی ہے۔ جو رقم اسکولوں کو دی جانے والی کتابوں اور آلات کے خریدنے پر صرف ہوئی اُسکی مقدار ۱۴۲۵ روپے ۶ آنہ ۵ پائی سے ۶۶۸۲ روپے ۴ آنہ ۳ پائی تک پہنچ گئی ہے۔ بلاشبہ لٹریچر فنڈ کی سرپرستی دیسی زبانوں کی ترقی میں مدد دینے کے لیے قائم کی گئی تھی۔ ایسے مصنفوں میں سے جنھوں نے غور کے لیے اپنی کتابیں بھیجی ہیں ۲۴ نے اُردو میں لکھی ہیں، دس نے ہندی میں اور ۱۵ نے پنجابی میں۔ اِن میں سے ۱۹ کو انعام ملا۔ سات کامیاب اُردو مصنفوں کو ۱۵۰۰ روپے، چھ کامیاب ہندی مصنفوں کو ۱۲۰۰ روپے اور پانچ پنجابی مصنفوں کو ۸۰۰ روپے بطور انعام دیے گئے۔

اگرچہ انعامات میں مقابلہ کرنیوالے مصنفوں کی تعداد قابلِ یادگار ہے مگر تصانیف خوبی کے لحاظ سے کمیٹی کی رائے میں متبذل ہیں۔ خاص تجاویز عمل میں لائی گئی ہیں جن سے اعلیٰ درجے کے مصنفوں کو لکھنے اور تصانیف کو غور کے لیے ارسال کرنے کی ترغیب دی جائے گی۔

قدیم ہندوستان میں جراحی

حال میں سہیتہ سوا کلکتہ میں مسٹر کوی راج گنا ناتھ سین ایم اے ایل ایم ایس نے ایک بہت دلچسپ مضمون پڑھا جس میں اُنھوں نے قدیم سنسکرت اشلوک نقل کرکے یہ دکھایا ہے کہ جراحی سے نہ صرف قدیم ہندو واقف ہی تھے بلکہ اُنھوں نے اُسے ایسے درجۂ کمال تک پہنچایا تھا کہ آج کل کی جراحی اُن لوگوں کو جنھوں نے اسکا عمیق مطالعہ کیا ہے، قدیم ہندوستان کی جراحی کی جسکو دو ہزار برس گزرے محض ایک نقل نظر آتی ہے گی۔ صرف اسی قدر نہیں بلکہ قدیم اشلوکوں کی امداد سے یہ بھی دکھایا گیا کہ قدیم ہندو نہ صرف جراحی کے اکثر آلات واسلحہ سے کامل واقفیت رکھتے تھے بلکہ وہ ایسے ہی نفیس، تیز، مجلّا، اور کارآمد آلات بنا سکتے تھے جیسے آجکل بنتے ہیں۔ ہمنے سنا ہے کہ مسٹر سین اِس موضوع پر ایک مستقل کتاب لکھ رہے ہیں جو تیار ہونے پر اس اہم معاملہ پر بہت کافی روشنی ڈالے گی اور اہلِ مغرب کے اِس دعوے کی صحت و عدم صحت کا کہ موجودہ جراحی خالص مغرب کی ایجاد کردہ ہے، ہمیشہ کے لیے فیصلہ کردے گی۔

برقی نیند

ڈاکٹر نیگلشمٹ (Dr. Nagelschimidt) کے اکتشافات کی رُو سے وہ وقت دُور نہیں ہے کہ مرض بے خوابی کے

تمام خطرات دفع ہو جائیں اور صرف ایک بٹن کے دبانے سے کامل آرام
حاصل ہو سکے۔ ڈاکٹر موصوف کتوں اور خرگوشوں پر بغیر کسی قسم کے مضر
نتائج پیدا کیے برقی نیند طاری کر چکے ہیں۔ وہ کوئی وجہ نہیں پاتے کہ بچوں
اور سن حضرات پر بھی کیوں بلا خوف یہ عمل نہ کیا جائے۔ ان کے اکتشافات
کا ایک نئی طرح کی برقی رو پر انحصار ہے جو کھوپڑی میں دماغ کی زیریں
سطح کے قریب لگانے سے خواب اور اثرات پیدا کرتی ہے۔ جب تک برقی
رو علٰحدہ نہ کیجائے خواب کی حالت جاری رہتی ہے اور اسکے علٰحدہ کرتے
ہی ایک منٹ میں مریض بالکل ہوشیار اور بیدار ہو جاتا ہے۔ طب میں
بجلی روز بروز اپنا دائرہ وسیع کر رہی ہے۔ انگلستان کے بعض سرجن
اس طریقہ کی آزمائش کے بہت مشتاق ہیں مگر وہ ایسے مسلّم الثبوت
اصولوں کے منتظر ہیں جن سے انکا پورا اطمینان ہو جائے کہ مریض کو
کسی طرح کا نقصان نہیں پہنچ سکتا۔

انڈوں کے متعلق ڈاکٹروں کے جدید اکتشافات

بعض چیزوں کے خول میں سے جراثیم نہیں گزر سکتے مگر انڈے کا چھلکا
اس قسم کا نہیں ہے۔ امریکن میڈیکل ایسوسی ایشن کے جرنل میں ایک محقق
لکھتا ہے، کس قدر کثرت سے، کہاں اور کس طرح انڈوں میں جراثیم داخل ہوتے
ہیں۔ یہ سوال نہایت ضروری ہے کیونکہ انھیں کے جاننے پر انڈوں کو غذا
کے لیے جراثیم سے محفوظ رکھنے کی تدبیر اور کامیابی کا انحصار ہے۔ اگر
جراثیم اسوقت انڈوں میں داخل ہوتے ہیں جس وقت وہ مرغی کی اُووی
ڈکٹ (Oviduct) میں سے نیچے کی طرف آتا ہے، تو
ہمارے پاس اسکا کوئی براہ راست تدارک نہیں ہے۔ البتہ اگر جراثیم
اس وقت داخل ہوتے ہیں جس وقت کہ مرغی انڈا دیتی ہے یا اُسکے بعد،
تو اُسکی روک تھام کے موثر طریقے وضع ہو سکتے ہیں۔ کئی سال گزرے
لیڈی ڈاکٹر پیننگٹن (Pennington) نے جو
ریاستہائے متحدہ کے محکمۂ زراعت سے تعلق رکھتی ہے، تازہ انڈوں کے وسیع
مطالعہ کی رپورٹ شائع کی تھی۔ ان انڈوں کی تمام روداد اُسے معلوم تھی جنکا
امتحان اُس نے علم جراثیم کے رو سے کیا۔ اُسکی تحقیقات بتاتی ہے کہ جراثیم
انڈے کی سفیدی اور زردی دونوں میں پائے جاتے ہیں۔ جس قدر انڈوں
کی اُس نے جانچ کی اُن میں صرف ۱۲ فی صدی جراثیم سے پاک ملے۔ زیادہ
اہم بات یہ ہے کہ تنسو انڈوں میں دیکھا گیا تو ۲۰ قسم کے جراثیم برآمد ہوے۔

مگر کوسووز (Kossowiz) کی رائے میں تحقیقات
کے اثنا میں یعنی انڈوں کو چھوتے وقت ہاتھ اور ہوا میں سے جراثیم اُن میں
داخل ہو جاتے ہیں۔ اُس نے خود تحقیق کی ہے کہ تازہ انڈے عموماً جراثیم
سے پاک ہوتے ہیں مگر ان پر نہایت خراب قسم کے خوردبینی کیڑے تھوڑے
وقفے میں حملہ آور ہو جاتے ہیں۔ کوسووز کی رائے میں پرانے انڈوں میں
جراثیم کا دخل بہ نسبت تازہ انڈوں کے زیادہ آسانی کے ساتھ ہوتا ہے۔ انڈوں
کو محفوظ رکھنے کے لیے سردی پہنچانے کا طریقہ بہترین ہے۔ چھونے وغیرہ
میں بھی احتیاط لازم ہے۔ جب سردی پہنچانے کا عمل نہ ہو سکے تو سوڈیم
سلیکٹ وغیرہ کو استعمال میں لانا چاہیے۔

بعض جرمنی کے سائنس داں اعلان کر رہے ہیں کہ انڈے کے چھلکے
کی خوراک سے آدمی صد سالہ عمر حاصل کر سکتا ہے۔ فرانس میں انڈوں میں
ایک اور خوبی دریافت ہوئی ہے۔ ڈاکٹر آمٹ (Dr. Amat)
کے مضمون کے رو سے جو ڈاکٹر مذکور نے تھیراپیوٹک سوسائٹی
(Soeiete Therapentique) کے
سامنے پڑھا ہے، تازہ انڈے کی جھلی انسان کی جلد کے لیے
نہایت عمدہ محرک ہے۔ جب کوئی مریض بہت خراب زخم لیے ہوے اُسکے
پاس آتا ہے، تو وہ اُسکو دھو کر انڈے کی جھلی کی بہت باریک تہوں سے اُسے
ڈھانپ اور اُسپر پٹی باندھ دیتا ہے، ۴ یا ۵ دن میں زخم اچھا ہو جاتا ہے اور
نئی کھال آ جاتی ہے۔ فرانس میں ایک اور شخص جو دوا فروش ہے بچوں
کو کونین اور دیگر دوائیں کھلاتا ہے اور اُن کے انڈوں کو ۵ فرینک فی درجن

یا اس سے زائد پر پہنچا ہے۔

مَوت اور زندگی کے متعلق ایک نیا نظریہ

پروفیسر میکس رَبنر (Prof. Max Rubner) جو فزیالوجیکل انسٹیٹیوٹ برلن کے ڈائرکٹر اور بہت سی عالمانہ کتابوں کے مصنف ہیں، جسم کے انحطاط اور ممات کو ایک نئی طرح سے سمجھاتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ انحطاط اور موت کا سبب یہ امر واقع ہے کہ جسم میں قوت (Energy) پیدا کرنے کی قابلیت باقی نہیں رہتی۔ ہر جاندار کو جس میں انسان بھی شامل ہے قدرت نے قوت کی ایک مقررہ مقدار پیدا کرنے کی قابلیت دی ہے۔ اور جب یہ قوت ایک بار پیدا اور ختم ہو چکتی ہے تو اور سلز (Cells یعنی وہ خردبینی کوٹھریاں جو ذیحیات جسم کی اِکائی مانی گئی ہیں) پیدا نہیں کر سکتے اور مَوت اسکا نتیجہ ہوتی ہے۔

انسان کو مستثنیٰ کر کے نیز اختلافِ اوزان کا لحاظ رکھکر قوت پیدا کرنے کی قابلیت بہ تناسب وزن بڑے جانوروں میں تقریباً یکساں ہے۔ گھوڑا ۱۶۳۰۰۰ کیلری (Calory حرارت کی اِکائی یعنی حرارت کی وہ مقدار جو ایک کیلوگرام پانی کو صِفر درجہ حرارت سے ایک درجہ حرارت سنٹیگریڈ تک پہنچانے کے لیے ضروری ہو) قوت اپنے وزن کے فی کیلوگرام کے حساب سے پیدا کرتا ہے۔ اسکا عرصۂ زندگی حادثات سے قطع نظر کر کے اُس کے اِس قوت کے پیدا اور استعمال کرنے کی رفتار پر منحصر ہے۔ ایک بیل کی حیات معمولاً ۱۴۱۰۰۰ کیلری فی کیلوگرام کے حساب سے پیدا اور خرچ کرنے پر مشتمل ہے۔ ایک کُتّے کی حیات ۱۶۴۰۰۰ اور ایک بلّی کی ۲۲۳۰۰۰ کیلری پر۔ اِن اعداد میں وہ قوت شامل نہیں ہے جو کامل نشو و نما سے قبل پیدا کی جا سکتی ہے۔

انسان کے ساتھ رعایت کی گئی ہے۔ اس میں فی کیلوگرام ۷۲۵۰۰۰ کیلری پیدا اور خرچ کرنے کی قابلیت ہوتی ہے۔ اِس حساب میں وہ قوت نظرانداز کر دی گئی ہے جو ایام نمو میں پیدا ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ حیاتِ انسانی کے زیادہ طویل المدت ہونے کا سبب یہی ہے کہ انسان میں اور حیوانوں کی نسبت قوت پیدا کرنے کی قابلیت چار پانچ گُنی زیادہ ہے۔

ہر قسم کی بے اعتدالی زندگی کو کم کرتی ہے کیوں کہ اس سے قوتِ ممکنہ کے مجموعہ کا غیر معمولی تیز رفتاری سے اسراف ہوتا ہے۔ بیماریوں، جسم کی دیگر بے ترتیبیوں، اور زندگی کی مضرِ صحت حالتوں کا بھی یہی اثر ہوتا ہے۔ افعالِ حیات کے لیے قوت کا ایک مخصوص قلیل ترین صرف لازمی ہے۔ لیکن معاشرت میں عاقلانہ تدابیر پر عمل کرنے سے یہ ممکن ہے کہ نسبتاً مخصوص وقت میں صرف ہونے والی مقدارِ قوت کو کم کیا جا سکے۔

امریکہ کے گریجویٹ کیا کرتے ہیں؟

یونائیٹڈ اسٹیٹس کے تعلیمی صیغہ نے امریکہ کے کالجوں کے گریجوٹیوں کے پیشوں کے متعلق ۱۶۴۲ء سے لیکر ۱۹۰۰ء تک کے اعداد پبلک کے سامنے پیش کیے ہیں۔ یہ اعداد ۳۷ کالجوں اور یونیورسٹیوں نے فراہم کیے ہیں۔ ہر صدی میں سے چار سال کا اوسط حسب ذیل ہے:—

پیشہ	۱۷۰۰-۱۶۹۶	۱۸۰۰-۱۷۹۶	۱۹۰۰-۱۸۹۶
مذہبی خدمت	۶۵٫۶	۲۱٫۴	۵٫۹
قانون	۱٫۶	۳۰٫۵	۱۶٫۵
طب	۳٫۱	۸٫۴	۹٫۶
تعلیم	۴٫۷	۵٫۷	۲۶٫۷
کاروبار	۱٫۶	۵٫۶	۱۸٫۸
سرکاری ملازمت	۹٫۴	۱٫۱	۱٫۰

اٹھارویں صدی کے اختتام پر مذہبی خدمت کو سب پیشوں سے بہتر خیال کیا جاتا تھا اور قریباً دو تہائی گریجویٹ اسی پیشہ کو انتخاب کرتے تھے۔ ایک صدی کے بعد کُل تعداد کا ⅕ حصہ اس میں داخل ہوتا تھا۔ بیسویں صدی کے آخر میں صرف ۶ فی صدی اِسے اختیار کرنے لگے۔ تعلیم نے جسکو ۱۸۲۵ء تک مقابلتاً گریجویٹ کی بہت کم تعداد اختیار کرتی تھی نہایت

تیز رفتاری سے ترقی کی ہے۔ اب یہ پیشہ تمام پیشوں سے بڑھا ہوا ہے اور ایک چوتھائی سے زیادہ گریجویٹ اس میں داخل ہوتے ہیں۔ قانون اٹھارویں صدی کے آخر میں قریباً ½ گریجویٹ کا پیشہ تھا اور تمام پیشوں سے بڑھا ہوا تھا اس وقت سے نسبتاً اسکی اہمیت کم ہوگئی ہے اگرچہ اس پیشہ میں داخل ہونے والوں کی اصلی تعداد زیادہ ہوگئی ہے۔ کاروبار میں گریجویٹوں کی تعداد ترقی کر رہی ہے اس وقت تک کل تعداد کا ⅛ حصہ حقیقی کاروباری زندگی اختیار کرتا ہے۔ ان ۲۷ کالجوں کے گریجوایٹوں میں سے ایک فی صدی سے بھی کم زراعت میں داخل ہوتے ہیں۔ ایک صدی پہلے یہ نسبت تین چار گنی زیادہ تھی۔

ہندوستان میں کوئلہ کی پیداوار

ذیل کے اعداد سے ظاہر ہوتا ہے کہ ۱۲-۱۹۱۱ء میں ہندوستان میں معدنیات کے چیف انسپکٹر کی سالانہ رپورٹ کی رُو سے کس قدر کوئلہ پیدا ہوا ہے:۔

نام صوبہ	وزن (ٹن)
بنگال	۴۳۰۶۱۲۹
بہار اُڑیسہ	۹۱۲۳۴۳۷
پنجاب	۳۸۴۰۹
آسام	۲۹۶۶۱۵
بلوچستان	۴۵۷۳۲
صوبجات متوسطہ	۲۳۳۹۹۶
صوبجات متحدہ	۵۰
میزان	۱۴۰۴۴۳۶۸

پیرس میں ہندوستانی صنعت

آیندہ نمائش کے لیے پیرس میں ہندوستان کے صنائع کو بھی خاص طور پر مدعو کیا گیا ہے۔ پیرس کی سی جگہ کی نمائش میں ہندوستان کی صنعت کا مدعو کیا جانا لازمی طور پر ایک امتیازی نشان اور اہل ملک کے لیے مسرت کا موقع ہے۔ اُمید ہو کہ اس ہمت افزائی سے بہتر اور مستقل فائدہ اُٹھانے کی کوشش کی جائے گی۔

جرائم کے متعلق فلسفیانہ تحقیقات

ڈاکٹر متفق ہیں کہ جرم کرنے کا میلان صحیح و تندرست دماغ میں نہیں ہوتا کوئی شخص جس کا دماغ درست حالت میں ہو ہرگز خودکشی نہیں کر سکتا نہ دوسرے کو قتل کر سکتا ہے۔ جرم اُسی حالت میں ہوتا ہے جب کہ مریض کی عقل میں فتور آگیا ہو یعنی دماغ کے صحیح نہ رہنے اور عادت خراب ہونے سے جرم کا چسکا پڑ جاتا ہے۔ اس لیے بعض فلاسفروں کی رائے ہے کہ جیل خانے موقوف کر دیے جائیں اور بجائے ان کے شفاخانے بڑھائے جائیں اور بذریعہ دماغی اپریشن کے مجرموں کے دماغ کے اُن مرکزوں کو درست کر دیا جائے جن سے جرم کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔

ہر انسان ویسا ہی ہوتا ہے جیسے اُس کے دماغ میں مختلف صفات کے خانے ہوتے ہیں۔ جس طرح کسی کے دماغ میں علم موسیقی یا علم ریاضی حاصل کرنے کے مرکز زیادہ نمایاں ہوتے ہیں اُسی طرح خاص جرائم کے مرکز بھی بعض اشخاص کے دماغ میں بن جاتے ہیں۔ وہ اپریشن سے دُور کیے جا سکتے ہیں اور ایک دس نمبر کا بدمعاش اچھا خاصا بھلا مانس بنایا جا سکتا ہے۔ پس جرم ایک مرض ہے اور مریض کو بجائے تکلیف دینے کے اُس کا علاج کرنا چاہیے۔

معلوم نہیں فلاسفروں کی اس تھیوری پر کتنے دنوں بعد عمل شروع ہوگا لیکن عام طور پر یورپ کی عدالتوں کا رجحان نرمی سزا کی طرف ہے۔

شرارِ حسن

ظہورِ عالم آرائی تھا اُنکی خودنمائی میں نیاز آموزیاں مخفی تھیں نازِ کبریائی میں
بلا میں پڑ گئیں جانیں مگر قالوا بلیٰ کہکر اُنھیں بھی کچھ مزا آیا ہے اس فتنہ آزمائی میں
شرارِ حسن جاناں نے دکھائیں گرمیاں اپنی گدازِ عشق بھی شامل ہوا حیرت فزائی میں

مرا دل ہے کہ گویا اک تماشا گاہِ حیرت ہے عجائب خانۂ قدرت ہے اک سارہی خدائی میں
بلا کا اضطراب آفت کی سوزش قہر کی گرمی قیامت کے اثر دیکھے ہیں حسنِ دلربائی میں

کشادِ مشکلاتِ عاشقاں اُنکی اسیری تھی مدد کی دل نے قیدی بنکے اس مشکل کشائی میں
کشودِ کار کا عقدہ کھلا اور آشنا ہو کر عجب اندازِ پنہاں تھا مری بے دست و پائی میں

کسی کے حسن عاشق آفریں پر مرنیوالا ہوں
ہر اک جلوے پہ محفل میں میں محوِ تماشا ہوں

مجھے کیوں دیا عشق ابد نے اضطراب اپنا؟ بنایا تھمسوا حسن نے کیوں ہمرکاب اپنا؟
کھلی رہتی ہے کیوں ہر دم مری چشمِ تماشائی کسی کی بزمِ ناز اٹھے کیوں بند نقاب اپنا؟
تڑپتا لوٹتا رہتا ہے دل کیوں میرے پہلو میں دکھایا کس نے مجھکو روئے زیبا بے حجاب اپنا

جلا ڈالا شرارِ حسنِ عشق انگیز نے دل کو
ملی ہے برقِ خرمن سوز آکر میرے حاصل کو

نگاہوں میں مری ہے وادیِ ایمن جہاں سارا مجھے اس بزمِ ہستی میں دلِ ہشیار نے مارا
جدھر جاتا ہوں میں ہے طورِ سینا میرے پہلو میں میں اپنی چشمِ حیراں ہی سے ذوقِ دید نے مارا
حسینانِ جہاں کیوں عشقِ حسن آرائے غافل ہیں نمودِ حسنِ جاناں ہے کشیدہ از پردہ دلسا را
میں اپنی بیقراری پر کبھی خود محوِ حیرت ہوں مرے دل میں بجائے خون کے جستے بھر دیا پارا

ہر اک انساں یہاں آیا ہے اپنا امتحاں دینے مگر مرتے رہے کس شوق میں اسکندر و دارا
اگر شاہنشہِ عالم بھی ہو اخلاق سے خالی تو وہ سلطاں نہیں ہے بلکہ اک مفلس ہے بیچارا
ضیائے علم ہے اُس حسنِ عشق آموز کی رہبر کہ جسکی حق نمائی کا کرشمہ ہے جہاں سارا
مقامِ عشق میں شاہ و گدا دونوں برابر ہیں کہ "عشق از پردۂ عصمت بروں آرد زلیخا را"

شرارِ حسن ہے پنہاں مری نغمہ سرائی میں
سرورِ خسروی حاصل ہے مجھکو اس گدائی میں

حمید کونلوی

بمبئی کے ایک ساحل کا منظر

ذکر اک شب کا ہے پڑھنے سے جو گھبرایا دل میں ٹہلتا ہوا دریا کے کنارے پہنچا
ساحلِ بحر پہ تھی نورِ قمر کی چادر چادرِ بحر پہ بہتی ہوئی آتی تھی ہوا
ایک سناٹے کا عالم تھا نظر کے آگے گئی جس سمت نظر سب کو سکوں میں پایا
کھیل کر پانی سے پیدا کیں ہوا نے موجیں دامنِ کوہ میں تھی جسکی دل آویز صدا
چھیڑتی تھی جو درختوں کو ہوا رہ رہ کر بانسری کی سی صدائیں تھیں سُریلی پیدا
موج پر موج چلی آتی تھی آہستہ خرام چاند اُس پار تھا پانی کے کنارے نکلا
پرتوِ ماہ کبھی لوٹ گیا پانی پر کروٹیں موج کے پہلو سے کبھی لینے لگا
کمرہ سے چرخ کے تھا نورِ فگن ماہِ کمالیں پردہ پہ پرتوِ تنویر تھا عالم سارا
بیاکِ بے مثل ہلال اور فلک پر تھا ماہ چاند تھا ایک میں ایک فلک پر نکلا
مہر سے ماہ زمیں مہ سے منور تھی تمام رات کے وقت بھی تھا جلوۂ دلکش پیدا
جگمگاتی ہوئی قندیلیں لبِ آبِ خلیج چشمکیں کرتی تھیں قندیلِ فلک پر گویا
ریت کے ذرے کنارہ پہ چمکتے تھے سیپیوں نے مگر اُگلے تھے یہ موتی ہر جا
طالبِ علم کو ہوتی نہیں کچھ فکرِ معاش بار پڑھنے کا بھی تھا سر پہ تو ہلکا ہلکا
ہو گیا تازہ سمندر کی ہوا سے جو دماغ بار جاتا رہا دل سے ہوئی فرحت پیدا
سیل دو میل کنارہ پہ بچھیں تھیں بچھیں نیچرل سین میں یہ حضرتِ انساں کی ادا
وقت انسان کے آنے کا تھا وہ لیکن ایک برخاستہ خاطر تھا وہاں بیٹھا ہوا
دیکھکر مجکو لگا کہنے کہ کیوں اے عابد "تجکو بھی جذبۂ دل یہاں کھینچکے آخر لایا"
دیکھ اس سین کو دلکش بھی ہے خوش کن بھی ہے ساری قدرت کا تماشا ہے یہاں جلوہ نما"
بارہا دیکھکے یہ سین ہوئی ہے تفریح "یہ لبِ آب و شبِ ماہ یہ سبزہ یہ ہوا"
مگر اب دیکھ تو مجکو کہ میں ہوں افسردہ نہ ہوئی دور شدِ خاطر نہ ذرا غم بہلا"

کھل گیا آج کہ جو کچھ ہے ہمیں میں ہے وہ سب
دل جو خوش ہو تو مناظر بھی ہیں دلکش بخدا

سچ ہے دل شاد اگر ہے تو ہے دنیا خوش کن
دل مکدر ہو تو عالم ہے کدورت سے بھرا

دل ہو غمگین تو ہو غم سے مبدل یہ سماں
دلفریبی کے عوض سیر بھی ہو غم افزا

چاندنی دیدۂ غمگین میں نظر آئے کفن
شورِ موجوں کا بھی معلوم ہو رونے کی صدا

خامشی کام جو تسکیں کا دیا کرتی ہے
کھینچ دیتی ہے وہ آنکھوں میں سماں حسرت کا

موج بڑھ بڑھ کے بڑھائیگی کسی کے دلکو
پیچھے ہٹ ہٹ کے کسی دل کو کریگی سیپا

تھا میں خوش میرے لیے تھا وہ نظارۂ خوشکن
دیر تک بیٹھ کے قدرت کا تماشا دیکھا

چاند ہونے لگا پوشیدہ جو ہیں زیرِ زمیں
کالی چادر میں لگی چھپنے یہ زالِ دنیا

چاند نے مجکو اشارہ یہ کیا وقتِ غروب
"سو رہو رات بہت تھوڑی ہے قصہ ہے بڑا"

زین العابدین عابد

دل کی حالت

اے دل افسوس یہ کیا ہو گئی حالت تیری
نہ رہی آہ وہ صورت نہ وہ سیرت تیری

روشِ دہر میں ہوتی گئی ہر دم تغییر
اور اسی طرح بدلتی گئی عادت تیری

قیدِ ہستی یہ ہوا تجھ میں فراغت کا گماں
یعنی موقوف ہوئی رنج پہ راحت تیری

کچھ نہیں نفس کی تحریک سے گو تجکو حذر
ہاں مگر خلق سے مخصوص ہے نفرت تیری

جی دکھاتی ہے وہ اب لوثِ ریا سے کیسر
ہائے دلکش تھی جو پاکیزہ محبت تیری

تجکو تو خیر ہوس پہ ہے فقط وہمِ غنا
مائۂ حرص و ہوا ہے ہے قناعت تیری

مل گیا حسنِ صنم بہرِ پرستش تجکو
پھر گئی حسنِ حقیقی سے طبیعت تیری

عمرِ دو روزہ کو سمجھا ہے حیاتِ خضری
بیخبر موت سے رکھیگی غفلت تیری

تھی جو بالیدگیِ جسم ہوئی قاطعِ روح
تیرے بڑھنے سے گھٹی اور بھی قوت تیری

انس کا خلق کا تجھ میں نہ رہا نام و نشاں
آہ کس طرح ہوا انساں سے نسبت تیری

دی نکوکاری پہ بدکاری کو تو نے ترجیح
یوں مٹا کر تجھے اب مٹ گئی دولت تیری

یاد آغاز ہے اب کچھ نہ خیالِ انجام
باعثِ کفر ہوئی حیف رعونت تیری

پھر بھی جرأت یہ نہیں مائلِ اصلاح ہو تو
گرچہ پوشیدہ نہیں تجھ پہ خباثت تیری

وائے بر عقل کہ ہو علم ترا لا علمی!
حیف برحال کہ اتنی ہو جہالت تیری!

یاد ایام کہ اک بھولی سی تھی شکل تری
یاد ایام کہ تھی سادگی زینت تیری

ہائے وہ وقت کہ دلجوتھے ترے طور طریق
ہائے وہ وقت کہ خوش کن تھی رفاقت تیری

کیسے میٹھے تھے کبھی تیرے وہ تھوڑے الفاظ
کتنی پیاری تھی کسی وقت شرارت تیری

کیا ہوے وہ تری بے فکری کے ایام قدیم
کیا ہوئی ہائے وہ دیرینہ بشاشت تیری

ہائے وہ دن کہ تھا بیگانہ سے بھی انس تجھے
ہائے وہ دن کہ تا حدّ وو تھی رغبت تیری

اب کہاں ہائے وہ یک گونہ تری نفرت کذب
اب کہاں ہائے وہ بے لوث صداقت تیری

نہ رہے تجھ میں اب اندازِ وفا کے آثار
نہ رہی اب وہ دلِ خلق میں الفت تیری

دور سب تجھ سے ہوئیں نیک روی کی باتیں
تجھ سے رخصت ہوئی افسوس شرافت تیری

ضعفِ ادراک سے حیواں بنا ہو کے بشر
نفسِ غالب نے بدل دی یہ جبلت تیری

شرم کی بات ہے اس طرح اگر خوار ہو تو
جائے افسوس ہے گر یوں ہو مذمت تیری

سچ تو یہ ہے کہ ہے بے فائدہ جینا تیرا
حامیِ قوم نہ گر ہو سکی خدمت تیری

یاد رکھ یہ کہ ہیں اعمال ہی بس تیرے رفیق
اور سب چیزوں سے ملزوم ہے فرقت تیری

دشمنِ نفس سے لڑ! تجھمیں اگر ہمت ہے!
بھول اسے ہاں یہ ہے آپس کی عداوت تیری

کام وہ کر جو ہو ہر طرح سے شایانِ بشر
جس سے شرمندہ نہ ہو عقل و فراست تیری

پہلے گر اپنے ہی ہاتھوں سے تو عزت اپنی
ہو گی پھر خود نظرِ دہر میں وقعت تیری

ہمکو اے دل ترے باطن کی ہے عظمت مقصود
ہمکو منظور نہیں ظاہری حشمت تیری

سحر اتنی تو ہو کوشش کہ پسِ روزِ ممات
پھر بھی ہو قالبِ انساں میں ودیعت تیری

اقبال ورما سحر

تحریکِ اخلاق

طلسمِ عالمِ سفلی کا کیونکر راز افشا ہو
اگر اک پردہ اٹھ جائے تو ظاہر اور پردا ہو

محیطِ دہر میں جب آشنا کا نام عنقا ہو
تو کافی ڈوبنے والے کو تنکے کا سہارا ہو

کوئی چشمِ حقیقت میں اگر محوِ تماشا ہو
حجاب اٹھنے لگیں سارے نہاں سب آشکارا ہو

سراسر غیر ممکن ہے لباسِ روح میلا ہو
لباسِ جسمِ ظاہر سو طرح گو پارا پارا ہو

خلش گر سے دلِ اہلِ صفا کو رنج کیا پہنچے
گلِ خوش رنگ کو کانٹوں کی صحبت سے ضرر کیا ہو

نہیں مانگے سے ملتا ہاتھ پھیلانے سے کیا حاصل
قناعت چاہیے اُس پر میسر جس کو جتنا ہو

غنیمت ہے وہی جو کام اپنے سے نکل جائے — کسیکو کیا خبر اسکی خدا جانے کل کیا ہو
بدل جاتا ہے رنگِ ہستیِ موہوم اکدم میں — کہیں دریا نے قطرہ کہیں قطرہ دریا ہو
جو سیدھی چال چلتے ہیں استقلال رکھتے ہیں — کہ خط ہندسی کا جس طرح انجام نقطہ ہو
اثر افعالِ خوب و زشت دونوں بہت کچھ ہے — جو بویا جائے اک دانہ تو کتنا تخم پیدا ہو
جو باتیں نقش ہو جاتی ہیں کب دل سے نکلتی ہیں — وہی مہریں کھلا کرتی ہیں جنکا نقش گہرا ہو
بجھا ہے دل مگر یوں شاملِ یارانِ محفل ہوں — ہرے پتوں میں جیسے خشک کوئی زرد پتا ہو
اُسے عبرت پکڑنی چاہیے نیرنگ عالم سے — جو اس عمرِ دو روزہ پر کوئی نادان بھولا ہو
غضب ہے ملنے والوں کو ہمیں نقصان پہنچائیں — اُسی کے عیب ہم ڈھونڈیں ہمارا جو شناسا ہو
تمنا دور کرنے کی رہیں باقی تمنائیں — دل وحشت زدہ کب ہمدمِ اہلِ تمنا ہو
جو کچھ ہو کہنا سننا سامنے طے کر لیا جائے — نہ پھر اچھی بری نکلے شکایت ہو نہ شکوا ہو
لگاؤں اپنی آنکھوں میں ارادت سے عقیدت سے — میسر اہلِ باطن کی اگر خاکِ کفِ پا ہو
دلِ مشفق ہمارا مہر کرتا ہے یونہی ہمپر — جھگڑ نیوالوں میں جس طرح جھگڑا کوئی برپا ہو
عجب کیا طاقتیں یوں ناتوانی سے بدل جائیں — مسافر راہ کا ہارا تھکا جس طرح سوتا ہو
خیالاتِ دلی کس طرح دل سے یک بیک نکلیں — نہیں ممکن جدا اک تحت ہر خار کفِ پا ہو
نہیں مشکل سے مشکل بات کی تحصیل بھی مشکل — مگر کچھ شوق ہو دل میں کچھ اُن باتوں کا لپکا ہو
معانی خیز ہو مہمل نہو جو کچھ کہا جائے — کہ جیسے شکل اقلیدس کے آخر میں نتیجہ ہو
نہ ایسے امر میں کچھ رائے دینی چاہیے ہرگز — کیا ہو غور ہی جس پر نہ کچھ سوچا نہ سمجھا ہو
رہائی موت کے پنجے سے پا سکتا نہیں ہرگز — کوئی ہو طفل نابالغ جواں ہو یا کہ بڈھا ہو

برس جائیں جو نیسانِ کرم سے گوہر مضموں
روانی اشک کے خامہ میں مثلِ موجِ دریا ہو
اشک بلند شہری

قطعہ

زمزمہ سنج تھی یوں کنجِ قفس میں بلبل — ہمصفیرانِ چمن کیا مجھے گلزار نہ تھا
کیا مجھے باغ میں کل رخصتِ پرواز بھی — کیا مجھے انجمنِ گل میں کبھی بار نہ تھا
کیا کبھی بادِ بہاری سے نہ تھی عشق اللہ — کیا گلِ تر سے مری دید نہ تھی پیار نہ تھا
آشیاں میرا نہ تھا سایۂ گل میں ہرگز — کیا چمن میرے لیے رہنے کو زنہار نہ تھا
کیا نہ تھی شاخِ نشیمن مری پھولوں سے لدی — کیا مرے پیشِ نظر غنچوں کا انبار نہ تھا
کیا یہ باور نہیں تم کو کہ بلا منتِ غیر — شاہدِ گل کا میسر مجھے دیدار نہ تھا
کبھی اِس گل پہ میں بیٹھی کبھی اُس غنچہ پر — اُڑنا اس شاخ سے اُس شاخ پہ دشوار نہ تھا
کون سا غنچہ تھا جو منہ نہ لگایا میں نے — کون سا گل تھا کہ پروردۂ منقار نہ تھا
شاخِ گل بادِ صبا سے جو لچک جاتی تھی — تازیانہ مری تہدید کا کیا خار نہ تھا
خار کھائے ہوئے قمری مری جانب سے رہی — اُسکو کچھ اور سوا سرو کے درکار نہ تھا
بادِ صرصر کی چلی اور نہ گل چینوں کی — غنچہ و گل کا سوا میرے کوئی یار نہ تھا
دام ہر روز یہ صیاد بچھاتا لا کر — باغباں تاک میں کیا درپئے آزار نہ تھا
حق تو یہ ہے کہ رہا فضلِ الٰہی جب تک — بال بھر بھی مجھے اندیشۂ اغیار نہ تھا
آب و دانہ کی کشش یا مرے اعمال کہو — یا یہ سمجھو کہ نصیبا مرا بیدار نہ تھا
دامِ صیاد میں خود پھنس گئی نادان بنکر — کوئی تقدیر کے لکھے سے خبردار نہ تھا
کون تھا ہائے جوانانِ چمن میں ایسا — جو مرے واسطے سر دینے کو تیار نہ تھا
پر مقدر کا نوشتہ نہیں ٹلتا ہرگز — جو ہوا خوب ہوا اس سے تو انکار نہ تھا
ہے مجھے اہلِ گلستاں سے شکایت اتنی — کیا کوئی بلبلِ ناشاد کا غمخوار نہ تھا
دوستدارانِ چمن سب تھے چمن کے ساتھی — دامِ صیاد میں دیکھا تو کوئی یار نہ تھا
نغمہ سنجانِ محبت مجھے کیا بھول گئے — یاد بھولے سے بھی کر لیتے تو دشوار نہ تھا

داستاں بلبلِ بیکس کی جو چھیڑی اختر
کیا تغزل کو کوئی یار طرحدار نہ تھا
اختر علوی

تصویر جاناں

کس کی تصویر ہے تو اے تصویر — رشک کھاتا ہے تجھپہ ماہِ منیر
تو ہے پیاری ادا تری پیاری — ہے تنا بھی تیری کیا پیاری
بولتی کیوں نہیں! بھلا تصویر — نہیں رکھتی زبان کیا تصویر
روٹھنا تجھ کو گر پسند آیا — میں نے منت میں بھی مزہ پایا
ہنس کے تو بجلیاں گرا مجھ پر — ہاں رُلا مجھ کو آج ہنس ہنسکر
میرے قابو میں اور یہ بیداد — نقشِ دیوار اور ستم ایجاد

ہاں خدا کے لیے زباں تو کھول　　میرے سر کی قسم تجھے کچھ بول

میں ہوں پروانۂ جمال ترا　　میں ہوں آشفتۂ خیال ترا

ہائے یہ خوشنما تری زلفیں　　ہائے یہ دل رُبا تری زلفیں

نرگسیں چشم پہ نثار غزال　　ابروؤں پہ فدا ہزار ہلال

میری باتوں کا کچھ جواب تو دے　　اس خموشی کا ماجرا تو کُھلے

بے زبانی میں تیری سو باتیں　　خامشی میں ہزار ہا گھاتیں

آہ یہ تمکنت تری ! تصویر　　دستِ قدرت سے کیا کھنچی تصویر

ظلم و شوخی ہر اک ادا جس کی

بات ہے اک تقاضا جس کی　　آغا رفیق بلندشہری

آتشِ روشن

کیوں نہو اے آتشِ روشن جہاں کے کام کی　　ایک ہی ہو فی الحقیقت تو بھی اپنے نام کی

فائدہ بخش جہاں تو ہے مفیدِ روزگار　　تیرے دم سے ہیں نکلتے کارہائے بیشمار

ہاں کھلاتی ہے پکا کر تو غذائیں خوب خوب　　پوری کرتی ہے ہماری اشتہائیں خوب خوب

موسمِ سرما میں تو ہی روح پرور جاں نواز　　روز و شب رہتا ہے انسانوں سے تیرا ساز باز

تیرے دم سے ہیں سفر میں ہم کو کیا آسانیاں　　ریلوے انجن ہزاروں اور موٹر گاڑیاں

کشتی چلتی ہے سمندر پر دخانی بھی تری　　ہاں حکومت کرتا ہے تسلیم پانی بھی تری

اہلِ جرمن کو بھی تجھ پر کیسے کیسے ناز ہیں　　کر دیے انسان کے پیدا پر پرواز ہیں

تیرے دم سے رات کو روشن ہے ظلمت کدہ　　زینتِ بزمِ طرب ہے رونقِ عشرت کدہ

کام آئی خلقتِ عالم میں تیری ذات بھی　　تجھ سے خالق نے بنایا عالمِ جنّات بھی

ملتی جلتی ہے ستم گر تو رُخِ دلدار سے　　شعلہ رو کہتے ہیں ہم تجھکو بہت ہی پیار سے

ہوں بیاں اے نار کیا الطاف گوناگوں ترے　　اہلِ ہستی جان و دل سے ہیں غرض مفتوں ترے

درحقیقت تو بھی اک معشوقِ شوخ و شنگ ہے　　دیکھکر چہرہ ترا بھبوکا سا زمانہ دنگ ہے

دلربائی دل ستانی کی غضب کی آن ہے　　تجھ میں سرتاپا صنم محبوبیت کی شان ہے

خود ہے شوخ چشم و سرکش خود سر ہے تو　　قہر ہے آفت بلا ہے فتنۂ محشر ہے تو

تیری الفت جاکے پوچھے تیرے مستوں سے کوئی

لطفِ سوز و ساز اُن آتش پرستوں سے کوئی

لیک گر حسنِ جہاں آرا یہ اٹھلاتی ہے تو　　اہلِ ہستی پر قیامت کا ستم ڈھاتی ہے تو

آج کیا منظر دکھائے تجھسے آتش باز نے　　پھونک ہی کر رکھدیا تیرے ادا و ناز نے

ایک ہمسائے کے گھر میں کیا شگوفہ چھوڑ کر　　لی خبر جا دوسرے کی بھیڑ دہیں منہ موڑ کر

سرکشی تیری نہ بھولیگی کبھی اے تند خو　　آسماں سے گویا باتیں کر رہی تھی ہو بہو

وہ جھجک کر اس طرف سے اُس طرف جانا ترا　　وہ ہوا میں آتشیں چادر سا لہرانا ترا

ہائے وہ دود سیہ کے گیسوئے مشکیں ترے　　ہائے وہ شعلہ سا رُخ وہ عارضِ رنگیں ترے

یہ نکلتے تھے شرر اُس دودِ تیرہ تار سے　　جھڑ رہی تھی یا کہ افشاں زلفِ عنبر بار سے

وہ ترا غیض و غضب وہ خود نمائی الاماں　　ایک عالم تھا کھڑا انگشت حیرت در دہاں

کیسا عبرت زا تھا منظر حیرت افزا شان کا　　سامنے گویا تھا اک آتش کدہ ایران کا

گاہ ہوتا تھا گماں آتش فشانی کوہ کا　　ایک طوفاں تھا بپا دل میں غم و اندوہ کا

آتشیں منظر جہنم کی دلاتا یاد تھا　　جس سے ہر اچھا برا اپنی جگہ ناشاد تھا

ہاں تری برقِ تبسم نے دیا خرمن جلا　　دستِ شوق آگے بڑھایا تھا کہ بس تن من جلا

گھر کا گھر تو نے جلا کر کر دیا ہے خاک بھی　　تھی غریبوں کی جو پونجی ہو گئی وہ پاک بھی

جل گئے ہیں ساتھ ہی اسکے بہت جاندار بھی　　خاک ہو کر رہ گئے سارے در و دیوار بھی

حیف وہ گھر جو بلا شک تھا نگارستانِ چیں　　نقشِ ویرانی ہوا ہے اُسکا سب کے دلنشیں

توبہ توبہ صاحبِ خانہ کی حسرت کیا کہوں　　حیف میں اُس سوختہ ساماں کی حالت کیا کہوں

گاہ سکتہ میں تھا گہ یوں کرتا تھا فریاد بھی　　"مجھ سا یارب ہو نہ کوئی خانماں برباد بھی"

لوگ سمجھا کر اسے لے آئے آخر ہوش میں　　ورنہ بڑھکر خاک ہو جاتا ترے آغوش میں

تھے مددگار ان صادق بیشتر احباب بھی　　شیخ کا ہمدرد نکلا جان و دل سے شاب بھی

برہمن کو ذات کا اُس دم نہ آیا تھا خیال　　تھا رواجِ دنیوی اُس وقت سارا پائمال

ہاں وہی شے دیکھیے مہرِ خدا ہے کیا کہوں

دم میں باسط پھر وہی قہرِ خدا ہے کیا کہوں　　باسط بسوانی

تقویم پارسیہ

فارسیوں کی تقویم کی وجہ تسمیہ بلحاظ اپنے سال اور مہینوں اور دنوں کے اور اُن عیدوں اور جشنوں کے جو وقتاً فوقتاً منائے جاتے ہیں یا منائے جاتے تھے ایسی عجیب اور دلچسپ ہے کہ شاید ہی کسی اور قوم کی تقویم ایسی ہو۔ اِس تقویم سے فارسی قوم کے مذہبی عقائد اور ریت رسم اور توہمات پر ایک حد تک روشنی پڑتی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اہل فارس دوزخ بہشت۔ سزا جزا۔ بد اور نیک اعمال کی میزان فرشتوں کی ہستی اور کام وغیرہ پر اعتقاد رکھتے تھے۔ وہ سورج کی پوجا کیا کرتے تھے۔ اور ماسوائے اسکے اورمزد اور آہرمن نیک اور بد دو بڑی روحوں کو مانتے تھے جو ایک دوسرے کی باہم مخالف ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ ان امور کے علاوہ اور باتیں بھی اس تقویم سے ظاہر ہوتی ہیں جن کا یہاں ذکر کرنا ضروری معلوم نہیں ہوتا۔

فارسی نظام شمسی کا سنہ نہایت ہی قدیم زمانہ میں شروع ہوا ہے۔ فارسی مورخین اور منجمین عموماً بتاتے ہیں کہ اسکا آغاز شاہ جم یا جمشید کے وقت سے ہوا ہے جو ۸۰۰ برس قبل مسیح سے بھی پہلے موجود تھا۔ فارسی سال میں تیس تیس دن کے بارہ مہینے ہیں۔ جن سے سال میں ۳۶۰ دن ہوتے ہیں۔ مگر ۳۶۵ کی تعداد پوری کرنے کے لیے ایک خاص مہینہ میں ۵ دن ایزاد کر دیتے ہیں۔ کچھ عرصہ تک تو ان کے درمیان لوند کا سال نہوا کرتا تھا جسکی وجہ سے انکا نوروز موسم بہار میں آ کر پڑا کرتا تھا جبکہ آفتاب برج حوت میں داخل ہوتا ہے۔ اسی سبب سے ہر ۱۲۰ سال کے بعد لوند کا ایک مہینہ بڑھا کر سال کے تیرہ مہینے کر دیے جاتے تھے۔ اور اُسوقت تمام فارسی قلمرو میں بڑے شادیانے اور جشن منائے جاتے تھے۔ یہ مہینہ عرصۂ اول کے اختتام پر ماہِ فروردین (مارچ) کے پہلے ہُوا کرتا تھا۔ عرصۂ دوم میں اردی بہشت (اپریل) کے بعد ہوتا تھا۔ اور عرصۂ سوم میں خرداد (مئی) کے بعد ہوا کرتا تھا۔ اور وہ پانچ فالتو دن اِسی مہینہ میں شامل ہُوا کرتے تھے۔ یہی سلسلہ سنہ ۶۳۶ء تک جاری رہا جبکہ ساسانی خاندان کے آخری بادشاہ یزدگرد کو عربوں نے شکست دیکر تخت سے اُتار دیا تھا۔ اور تب فارس خلفاء کی سلطنت کا ایک صوبہ بنگیا تھا۔ اس وقت سے نظام شمسی کے سال کے ان فالتو دنوں کی جانب سے بے پروائی ہوتی گئی اور محمدی قمری شمار تمام مذہبی اور ملکی معاملات میں داخل ہو گیا۔ یہی حال سنہ ۱۰۷۹ء تک رہا جس وقت فارس کے سلجوقی سلطان ملک شاہ جلال الدین نے جو خلفاء متقدی کا امیر الامرا تھا اس جنتری

کی اصلاح کی تب سے یہ جنتری اُسی کے نام نامی سے مشہور ہو گئی - اور نوروز برج حوت کے پندرہ درجے سے ہٹا کر برج آذری کے پہلے درجے میں لایا گیا اور نوروز کا دن ہر چوتھے سال بڑھایا جانے لگا - اسی سبب سے اِس چوتھے سال کو کبیسہ یا لیپ کا سال کہتے ہیں - مگر منجم اپنے زائچوں میں وہ فالتو دن اپنے آخری مہینے اسفندارمز (فروری) میں بڑھاتے ہیں - لیکن عام طور پر یہ ایام ماہ آبان (اکتوبر) میں بڑھائے جاتے تھے - کیونکہ یہ دن یزدگرد بادشاہ کی شکست کے موقع پر لیپ کے سال میں اُس مہینے کے بعد آئے تھے -

یہ امر بھی قابل توجہ ہے کہ قدیم فارسی مہینہ ہفتوں میں منقسم نہیں ہوا کرتا تھا - اس لیے کہ ہر ایک دن اُسی فرشتہ کے نام سے موسوم ہوا کرتا تھا جو اُس دن پر مامور متصور ہوتا ہے اور ایسا ہی ہر ایک مہینہ بھی اُسی فرشتہ کے نام پر ہوا کرتا ہے جو اُس مہینہ پر مامور متصور ہوتا ہے - یہ فرشتہ اُن تمام عرصوں کے افعال پر اپنا حکم اور اثر رکھتا ہے جن کو (یعنی عرصوں کو) خدے عالم الغیب نے اپنے زیر حکومت رکھدیا ہے - اسی طرح ہر ایک دن کا فرشتہ اُن تمام افعال پر اپنا قابو اور اثر رکھتا ہے جس پر کہ وہ مامور اور مقرر ہے - یہ فرشتے دو انواع پر منقسم ہیں - جو فرشتے مہینوں پر مامور ہیں وہ اُن فرشتوں کے افسر سمجھے جاتے ہیں جو دنوں پر متعین ہیں - اور دنوں پر مامور فرشتے مہینوں پر مامور فرشتوں کے کارکنان کہلاتے ہیں - ہر بڑے فرشتے کے لیے اُسکے اپنے مہینے میں ایک خاص دن مقرر ہوتا ہے جسکا وہ خاص لحاظ رکھتا ہے اور اُسکی خاص توجہ کا مرجع ہوتا ہے - ہر فرشتہ کے لیے خاص خاص دعا مقرر ہے جسکو زمزمہ کہتے ہیں - اور ایک فرشتہ کی زمزمہ خوانی دوسرے فرشتہ کی زمزمہ خوانی سے بہت ہی معزز اور قابل احترام سمجھی جاتی ہے - فارس کے بادشاہ اس بات پر بھروسہ کرتے ہوئے ہر روز نیا طلسم استعمال کیا کرتے تھے اور ہر ایک طلسم پر اُس دن کے فرشتہ کی بابت کچھ نہ کچھ کندہ ہوا کرتا تھا - اسی اعتقاد کے مطابق اُنکے دسترخوانوں پر بھی ہر روز نئی نئی قابیں آیا کرتی تھیں اور وہ ہر روز نئی پوشاک زیب تن کیا کرتے تھے - ہر امر میں ان فرشتوں کی رضامندی لازمی سمجھی جاتی تھی -

اور اسی لیے میلے اور عیدیں مقرر ہوئی تھیں - ان میلوں اور عیدوں میں مذہبی اور پولیٹیکل ہر دو عمل کی یادگاری ہوا کرتی تھی - جو دن مہینے کے فرشتوں کی زیر حفاظت سمجھے جاتے تھے وہ عام طور پر نہایت ہی خصوصیت کے ساتھ قابل تعظیم سمجھے جاتے تھے - قدیم زمانہ سے فارسی سال کا پہلا مہینہ بہاری نقطۂ مساوات لیل و نہار (Equinox) سے شروع ہوا کرتا تھا جیسا کہ مذکور ہوا اور ابتدا میں اسکو آذر یا آذر کہتے تھے - جسکے معنی ہیں آگ یا وہ فرشتہ جو آگ پر مقرر ہے - ان مہینوں کے نام اور اُنکے فرشتوں کے حال اور عیدوں وغیرہ کا پورا بیان حسب ذیل ہے :-

پہلا مہینا **فروردین** (مارچ) ہے - اور یہی اِس مہینے کے فرشتے کا نام بھی ہے - کہتے ہیں کہ یہ فرشتہ فردوس کا خازن ہے اور فردوس کی مینو والی روحوں کی خاص حفاظت اور نگرانی اُسی کو تفویض ہے - اس مہینے کے روز اول پر جسکو نوروز کہتے ہیں ایک خاص میلا ہوا کرتا تھا جو چھ دن تک رہتا تھا اِس جشن کے پہلے دن بادشاہ عوام الناس کی خوشنودی اور بہبودی پر خاص توجہ دیا کرتا تھا - دوسرے دن عالموں اور فال گیروں کو دعوت دیا کرتا تھا - تیسرے دن دین کے ہادیوں اور پجاریوں اور ملک کے مشیروں کی دعوت ہوا کرتی تھی - چوتھے دن شہزادے اور امرا مہمان ہوتے تھے - پانچویں دن شاہی بچوں کی ضیافت ہوا کرتی تھی اور چھٹے دن جو بادشاہ کا خاص دن کہلاتا تھا اس میں تمام رعایا اپنی اپنی لیاقت اور مرتبہ کے موافق بادشاہ کے حضور میں نذریں پیش کرتی تھی - نوروز سے پہلے کی شام کو ایک نہایت ہی خوش قطع اور وجیہ اور پاکیزہ نوجوان جو نوروز مجسم و مشخص متصور ہوا کرتا تھا شاہی خوابگاہ کے دروازہ پر متعین کیا جاتا تھا - یہ نوجوان عین اُس وقت بادشاہ کی خوابگاہ میں داخل ہوا کرتا تھا جبکہ آفتاب اپنے افق سے اُوپر آجاتا تھا اور بادشاہ فوراً اُس سے مخاطب ہو کر کہتا تھا : "تو کیا ہے ؟ تو کہاں سے آتا ہے ؟ تو کہاں کو جاتا ہے ؟ تیرا کیا نام ہے ؟ تو یہاں کیوں آیا ہے ؟ اور تو کیا لایا ہے ؟" وہ شخص ان سوالوں کا جواب اِس نہج سے

دیا کرتا تھا "میں خوش قسمتی اور مبارک ہوں۔ خدا نے مجھے یہاں بھیجا ہے اور اپنے ساتھ نوروز کو لایا ہوں"۔ جب وہ یہ کہ کر بیٹھ جاتا تو ایک اور شخص اپنے ہاتھ میں نقرئی قاب لیے ہوئے ظاہر ہوتا تھا۔ اُس قاب میں گیہوں۔ جَو۔ مٹر۔ ماش۔ تل۔ اور چاول رکھے ہوئے ہوتے تھے۔ یعنی ان میں سے ہر ایک اناج کے سات سات خوشے اور نو نو دانے۔ شکر کی یا مصری کی ایک ڈلی۔ اور دو عدد نئے مسکوک سکّے۔ یہ سب اُس قاب میں رکھے ہوئے بادشاہ کو بطور تحفہ یا ہدیے پیش کیے جاتے تھے۔ اسکے بعد وزیر اعظم۔ سپہ سالار۔ خزانچی۔ اور محکمۂ جنگ کا سپرنٹنڈنٹ کمرہ میں داخل ہوتے۔ پھر شہر کے شرفاء حسب مراتب کمرہ میں تشریف لاتے تھے۔ تب مذکورۂ بالا اناج کی بنائی ہوئی ایک بڑی سی روٹی بادشاہ کے سامنے پیش کیجاتی تھی۔ بادشاہ تھوڑا سا اُس میں سے لیکر کھا لیتا اور باقی حاضرین کے درمیان تقسیم کر دیا کرتا تھا اور کہتا تھا کہ "او۔ یہ نئے زمانے کے نئے سال کے نئے مہینے کا نیا دن ہے۔ تمام چیزیں جو زمانہ میں شامل ہیں نئی بنائی جائیں"۔ اسکے بعد بادشاہ اپنے اُمرا اور درباریوں کو قیمتی لباسوں سے ملبس کرتا اور برکت دیکر وہ تحفے اُنکے درمیان تقسیم کر دیا کرتا تھا جو وہاں لائے جاتے تھے۔ کہتے ہیں کہ یہ رسم جمشید بادشاہ نے شروع کی تھی جو اُسوقت اِستخر (یعنی شہر پرسیپولس) میں پہلی ہی مرتبہ علانیہ طور پر داخل ہوا تھا۔ اور جس شہر کی تعمیر جمشید نے حال ہی میں کرائی تھی۔ علاوہ دیگر احکام کے ایک حکم اُسنے یہ بھی نافذ کیا تھا کہ فارسی سنہ بھی اُسی روز سے شروع ہونا چاہیے۔ اسی قسم اور اسی موقع کی اور بہت سی متفرق رسمیں آبان اور اسپندارمذ مہینوں کے بیان میں مذکور ہونگی۔ اِس دن کے علاوہ اُنیسویں دن بھی ایک خاص فرشتے کی عید ہُوا کرتی تھی اور وہ بھی اسی طرح ضیافتوں اور میلوں سے منائی جاتی تھی۔ لوگ اس عید میں بھی نئے لباسوں سے آراستہ ہُوا کرتے تھے اور تمام سلطنت میں کے جھنڈوں اور ریوڑوں اور گلوں کے حالات کا معائنہ ہُوا کرتا تھا۔

دوسرا مہینا اُردی بہشت (اپریل) کا ہے اور یہی اِس مہینے کے فرشتہ کا نام بھی ہے۔ خیال کیا جاتا تھا کہ اس فرشتے کے ہاتھ میں بہشت کی کنجیاں ہیں اور وہ بہاڑوں اور آگ کا سپرنٹنڈنٹ ہے۔ تیسری تاریخ پر جو اس فرشتے کا دن ہے جنگ کرنا۔ آتش خانہ میں جانا۔ اور بادشاہ کے حضور میں درخواستیں گذراننا اچھا سمجھا جاتا تھا کیونکہ اس دن کو ان کاموں کے لیے سعد سمجھتے تھے۔

تیسرا مہینا خورداد (مئی) کا ہے۔ اس فرشتے کا اختیار تمام سمندروں دریاؤں اور ہر قسم کے پانیوں پر اور ساتھ ہی ہر قسم کے نباتات اور درختوں پر خیال کیا جاتا ہے۔ اس ماہ کی ۶ تاریخ پر جو اس فرشتے کا دن ہے شادی کرنا اور خدا اور فرشتوں سے دعائیں کرنا تاکہ وہ اُنکو ہر قسم کی آفات سے محفوظ رکھیں اور انکی تمام ضروریات مہیا کریں سعد اور باعث کامیابی تصور کیا جاتا تھا اور خوش قسمتی کا ایک سبب سمجھا جاتا تھا۔ اور ۲۰ تاریخ پر اس لیے خوشی منائی جاتی تھی کہ اُس روز فارس کی سلطنت نے غاصب ضحاک پر فتح حاصل کی تھی۔

چوتھا مہینا تیر (جون) ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ فرشتہ خورداد فرشتہ کے ماتحت ہے اور اُس سے کم درجہ پر ہے اور مویشیوں کی حکمرانی اور انکی حفاظت اسکی تفویض میں ہے۔ اس ماہ کی ۱۳ تاریخ پر آبریزگان نامے ایک عید منائی جاتی ہے۔ جسکی تقریب پر ہر نوع کے اشخاص ایک دوسرے پر پانی چھڑکتے ہیں مگر امراء اور ذی مرتبت لوگ پانی کے عوض گلاب یا نرگس کے پھول کا عرق یا اور کوئی خوشبودار عرق استعمال کیا کرتے ہیں۔ اس عید کی بنا بھی ایک خاص تاریخی واقعہ ہے۔ یعنی اس دن فریدوں کے پوتے منوچہر اور تاتاری بادشاہ حملہ آور افراسیاب کے درمیان ایک عہدنامہ ہُوا تھا جسکی رو سے ہر دو سلطنتوں کی حد بندی کے بارے میں یہ امر قرار پایا تھی کہ مشہور و معروف فارسی تیرانداز آرش نامی تیر چلائے اور جہاں اُسکا تیر گرے وہیں دونوں سلطنتوں کی حد قائم ہو جائے۔ چنانچہ اس قرارداد کے مطابق اُسنے تیر چلایا اور وہ تیر دریائے آکسس کے دوسرے پار جا پڑا۔ پس وہی اُسوقت سے اِن دونوں حکومتوں کی حدود چلی آتی ہیں۔ آب ریزی کی یہ رسم اسی عید کے لیے مخصوص نہیں تھی بلکہ اور عیدوں میں بھی یہ رسم ادا کیجاتی ہے۔ مثلاً نوروز اور مہرجان کی عید میں

اور نیز ماہ خورداد اور ماہ بہمن کی ۳۰ تاریخ پر بھی یہ رسم خصوصاً اصفہان میں ادا کی جاتی ہے۔

پانچواں مہینا **مُرداد** (جولائی)۔ یہ فرشتہ درختوں اور دیگر نباتات اور پھلوں اور بیجوں کے مشہور و معروف فرشتوں میں سے ہے۔ اِس فرشتے کے دن (۷ تاریخ) پر جشن نیلوفر نامی ایک جشن ہُوا کرتا ہے۔ کیونکہ اس رسم میں نیلوفر کے پودے مستعمل ہوتے ہیں۔ اس موقع پر جس قدر عرضیاں بادشاہ یا عظام حکومت کی خدمت میں پیش ہوتی تھیں وہ عموماً منظور ہو جایا کرتی تھیں اور عرضی دہندگان کی مرادیں بر آیا کرتی تھیں۔ لفظ "مرداد" کے معنی ہے "موت دینا" اس لیے وہ موت کا فرشتہ خیال کیا جاتا تھا اور اکثر فرشتۂ مرگ کے لقب سے ملقب ہُوا کرتا تھا۔

چھٹا مہینا **شہریور** (اگست) کا ہے۔ اس فرشتے کے حوالہ تمام فلزات اور معدنیات تھیں۔ اسکا دن ۴ تاریخ پر پڑتا ہے۔ مگر نہ تو اس دن پر اور نہ دوسرے ہی دن یعنی ۸ تاریخ پر کوئی رسم منائی جاتی تھی۔ یہ موخر الذکر تاریخ موسم خزاں میں آکر پڑا کرتی تھی اور اسکو خزان کہا کرتے تھے۔

ساتواں مہینا **مِہر** (ستمبر) کا ہے۔ یہ فرشتہ تیز فہم مخبر ہوا کرتا۔ آفتاب کا نظم و نسق اُسکے ذمے متصور ہوتا تھا اور محبت و دوستی پہ مامور سمجھا جاتا تھا۔ یہی خیال کیا جاتا تھا کہ روز محشر پر لوگوں کو شمار کرنا اور اُنکو جزا و سزا دینا اِسی کا کام تھا۔ لوگوں کا گمان تھا کہ قیامت کے دن یہ فرشتہ ایک پل پر بیٹھے گا اور جب سروش نامی فرشتہ لوگوں کے اعمال میزان میں وزن کر چکے گا تو اِس پل پر سے اُن تمام روحوں کا گزر ہوگا۔ اگر کسی کے نیک اعمال اُس ترازو میں بال بھر بھی وزن میں زیادہ ہونگے تو بس اُنکے خیال کے مطابق اُس صاحبِ اعمال کے لیے فردوس کا دروازہ کھل جاتا ورنہ اسفل میں اُسکا حصہ مقرر ہو جاتا ہے جہاں پر اُنکے خیال کے مطابق اُنکو فردوس کی خوشیوں کے سات مدارج کے مقابل میں سات مختلف دُکھ بھگتنے پڑتے ہیں۔ ۱۶ تاریخ سے جو اُس فرشتے کا دن ہے اُنکی سب سے بڑی عیدوں میں سے ایک عید کا آغاز ہُوا کرتا ہے جسکو مہرگان کہتے ہیں۔ یہ عید چھ دن تک ہوتی رہتی ہے۔ اسکی بابت بہت سی روایتیں مشہور ہیں مگر ایک روایت سے یہ گمان غالب ہوتا ہے کہ یہ عید موسم خزان کے نقطۂ مساواتِ لیل و نہار کے وقت کی یادگار اور اُن سے سورج دیوتا کی شان میں ہوتی تھی اور ایسا ہی نوروز کے دن پر بھی جبکہ سورج برجِ آذری میں داخل ہوتا ہے سولھویں تاریخ پر خصوصیت کے ساتھ عید ہُوا کرتی تھی۔ اور روپے پیسے والے آدمی اُسوقت روغن بان لگاتے اور اپنے اوپر عرقِ گلاب چھڑکتے اور مختلف قسم کے پھل کھایا کرتے تھے۔ اُنکا خیال تھا کہ اگر ہم اِن رسمیات کو عمل میں لائیں گے تو اُن بلیات سے محفوظ اور مامون رہیں گے جو آیندہ سال بھر آتی رہینگی۔ اس عید کے پہلے دن بادشاہ روغن بان سے اپنے آپ کو مسح کرکے اور مختلف الالوان لباسِ فاخرہ زیبِ تن کرکے اور ایک ایسا تاج پہن کر جسکی چوٹی پر ایک عظیم الشان مورت سورج دیوتا کی بنی ہوئی ہوتی تھی آراستہ اور ملبس ہوکر اپنے سریر سلطنت پر رونق افروز ہُوا کرتا ہے۔ اُس وقت اُنکا بڑا پجاری ایک نفیس نقرئی طباق لیے ہوے جس میں مصری۔ شفتالو۔ بہی۔ سیب۔ لیموں۔ انار۔ عناب۔ سفید انگوروں کا ایک خوشہ اور سات گونہ بیری قرینہ سے چنی ہوئی ہوتیں اور اُسپر کچھ پڑھتے ہوے بادشاہ کے حضور میں پیش کیا کرتا تھا۔ بادشاہ اس قاب میں سے کچھ کھا لیا کرتا تھا اور اُسکے بعد اُسکے تمام اُمراء اور حکام اپنے اپنے مدارج اور مناصب کے مطابق اُٹھ اُٹھ کر بادشاہ کے حضور میں جاتے اور اُس قاب میں سے لے لیکر تناول کر لیا کرتے تھے۔ من بعد بادشاہ کے توشہ خانہ سے نفیس پوشاکیں اور دیگر قیمتی اور عمدہ اشیا لاکر اُنکے درمیان تقسیم کر دی جاتی تھیں۔ اِسدن لوگ اپنے بچوں کا نام رکھنا یا اُنکا دودھ چھڑانا سعد سمجھا کرتے تھے، اور یہ بھی دستور تھا کہ اگر آج کے دن بادشاہ کے ہاں لڑکا پیدا ہوتا تو فوراً وہ سورج دیوتا کا پجاری بنائے جانے کے لیے بڑے جشن کے ساتھ مخصوص کر دیا جاتا تھا۔

آٹھواں مہینا **آبان** (اکتوبر) ہے۔ خیال کیا جاتا تھا کہ یہ فرشتہ

خورداد کے ماتحت اور اوسپر مامور ہے۔ اسکا دسواں دن اس فرشتے کے نام پر
موسوم اور مخصوص ہوتا تھا اور اُس روز اس ایک خاص تواریخی واقعہ کی
یادگار میں سالانہ عید منائی جاتی تھی کہ آج ہی کے دن تاتاریا توران کا
بادشاہ افراسیاب جسنے فارسیوں کو بارہ برس تک اپنے قبضہ میں رکھ چھوڑا
تھا فارس کے ملک اور سلطنت سے بدر کر دیا گیا تھا۔ اسکے علاوہ اُس بارش
کی یادگار بھی ہوا کرتی تھی جو اُنکی روایت کے موافق سات سال کی خشک سالی
اور قحط کے بعد ہوئی تھی۔ چونکہ قدیم زمانہ میں یہ سال کا آخری مہینا ہوتا تھا
اس لیے اس میں پانچ فالتو یوم ایزاد کیے جاتے تھے۔ اِس موقع پر گیارہ
دن تک لگاتار عید منائی جایا کرتی تھی۔ جسکا آغاز ۲۶ تاریخ سے اور انجام
اگلے مہینے آذر کی یکم پر ہوا کرتا تھا۔ اِس عید میں ماسوائے دیگر رسوم کے ایک
یہ رسم بھی ادا کیجاتی تھی کہ ہوسی اونچے اونچے میناروں کی چوٹیوں پر مختلف قسم
کے کھانے رکھدیا کرتے تھے تاکہ (جیسا کہ اُنکا اعتقاد ہے) پریاں اور فوت شدگا
کی ارواح آکر وہ کھانا کھا جائیں اور اُن سے حظ اُٹھائیں۔ جب تک کہ یہ
ضیافت اُنکے مفروضہ مہمان تناول کرتے رہتے تب تک پجاری باجوں اور
گیتوں اور ناچ سے (جو ہاتھ میں ہاتھ ملا کر کیا کرتے تھے اور جسکو دست بندیا نجیہ
کہتے تھے) اُنکو خوش کرتے رہتے تھے۔ ہر درجہ اور مرتبہ کے لوگ اِس جلسہ
کی تقریب پر نہایت ہی بے لگام خوشیاں منایا کرتے تھے۔ عمدہ عمدہ لباس پہنا
کرتے اور ایک دوسرے کو بے باکانہ دعوتیں دیا کرتے تھے۔ اہل دولت و ثروت
سے غریب غربا کو چھوٹے چھوٹے ہدیے جو دَاشتن کے نام سے موسوم ہوتے دیے
جایا کرتے تھے۔ صرف یہی نہیں بلکہ بادشاہ بھی مع اپنے امراء و شرفاء کے پھولو
کے ہاروں (جنکو سباک کہتے تھے) اور ایک قسم کے گلوبندوں سے (جنکو ریگر کہتے
تھے) آراستہ ہو کر عوام الناس کی خوشی میں شریک ہو کر اُنکو مشرف و ممتاز
کیا کرتے تھے۔ علی الصبح جلوس سب سے پہلے آتش گاہ میں جاتا اور جب وہاں
عبادت ہو چکتی تو لوگ بڑے جوش سے قسم قسم کے باجے بجانے اور خوش الحانی
سے گانے اور خوب ناچنے لگ جاتے تھے۔ یہ راگ رنگ اکثر ٹولیاں ٹولیاں ہو کر
رچایا کرتے تھے اور ہنسانے والی طرح طرح کی نقلیں ہُوا کرتی تھیں جسکے لیے نقالو
اور گانیوالوں کو بڑی بڑی اجرتیں دی جاتی تھیں۔ اس مزدوری کو پایمچ
یعنی پانوئں کی مزدوری کہا کرتے تھے۔

نواں مہینا **آذر** (نومبر) کا ہے۔ یہ فرشتہ آتش پر مامور تھا اور اس
کا نواں دن اسکے نام سے کہلاتا تھا۔ اِس روز تمام فارسی سلطنت میں آگ
کے انبار روشن کیے جاتے تھے اور زردشت کے حکم کے بموجب ملک کے
تمام آتش گاہوں کا معائنہ کیا کرتے تھے۔ اس موقع پر تمام آتش گاہیں
بڑی عمدگی اور تزک و احتشام سے آراستہ کیجاتی تھیں اور سب لوگ ناخن کٹاتے
اور اپنے تمام بدن کے بال مُنڈاتے تھے اور یہ خیال کرتے تھے کہ ہم ایسا کرنے
سے اپنے سال بھر کے تمام گناہ اور قصور اُتار کر پھینک دیتے ہیں۔

دسواں مہینا **دی** (دسمبر) کا ہے۔ یہ فرشتہ نہ صرف اسی مہینے پر
مامور تھا بلکہ اُن تمام دنوں پر بھی اختیار رکھتا تھا جو دی سے شروع ہوتے
ہیں۔ مثلاً دی بہ آذر۔ دی بہ مہر۔ گیارہویں تاریخ پر (جو اس فرشتے کا دن ہوتا
ہے) تمام پارسی سلطنت میں آگ کی شان میں ایک بڑا میلا ہوا کرتا تھا۔ اس
میلے کے آغاز کی بابت بہت سی مختلف روایتیں ہم تک پہنچی ہیں۔ ان میں
سے ایک بڑی ہی عجیب وغریب ہے کہتے ہیں کہ اس سالانہ موقع پر موسم
سرمانے ایک دفعہ دوزخ سے نکل آنے کا ارادہ کیا کیونکہ وہاں اُسکو بہت
ہی گرمی لگتی تھی۔ فارسیوں کے آباو اجداد نے یہ دیکھکر فوراً بڑے بڑے
آتشی انبار لگا دیے اور اس سے اُسکو اس بات کا یقین دلایا کہ وہ تو اَوَ
زیادہ اسفل میں آ گیا ہے۔ یہ دیکھ کر وہ پھر زمین سے روانہ ہو کر تاریکی کے
سایوں میں چلا گیا۔ اس موقع پر شب کی درخشندگی کے عام نظارہ کو دوبالا
کرنے کے لیے بادشاہ اور اُسکے اہل دربار جھاڑیوں اور درختوں کی چھوٹی
چھوٹی اور ہلکی ہلکی شاخیں کاٹ کر اور انکو ہوا کے پرندوں اور جنگل کے جانورو
اور درندوں کے جسموں کے ساتھ ترکیب سے باندھکر روشن کر کے اُن کو
چھوڑ دیا کرتے تھے۔ یہ پرندے تو آسمان میں اُڑتے اور جانور جنگلوں میں بھاگتے

جس سے آس پاس کے جنگل جل اُٹھتے تھے۔ اور یوں رات کے وقت روشنی کا شاندار نظارہ نظر آیا کرتا تھا۔ بعض قدیم مشرقی اور یورپ کے محققین اس قسم کی رسومات کا پتہ آج سے چار ہزار برس پیشتر تک لگاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ رسم اُسوقت شروع ہوئی تھی جبکہ فارسیوں کے پہلے بادشاہ کیومرث کے یکصد بیٹوں اور بیٹیوں کی شادی ہوئی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ وہی فارسی بادشاہ ہے جسکو بائبل میں عیلام کا بادشاہ کہا گیا ہے بعض خیال کرتے ہیں کہ یہ عید اُسوقت کی یادگار منائی جاتی تھی جبکہ ہیبت ناک اژدھے کو اُسکے پوتے ہوشنگ نے ہلاک کر دیا تھا۔ مگر عام رائے یہ ہے کہ خوشی اس موقع پر کیجاتی تھی کہ اُسوقت آفتاب خط جدی پر داخل ہوتا ہے اور یہی وقت سے دن بڑے اور گرمی زیادہ ہونے لگتی ہے۔ چونکہ اس سخت موسم میں آگ بڑی پیاری معلوم ہوتی ہے اس لیے اس خوشی کا اظہار طبعی طور پر آگ کے تودے اور انبار لگا کر اور اُنکے سامنے بیٹھکر خوشیاں منانے کے سوا کسی اور طرح نہیں ہو سکتا کیونکہ اس حالت اور نظارہ سے وہ تمام خیالات اور احساس رفع ہو جاتے ہیں جو تاریکی اور سخت سردی سے پیدا ہوے تھے۔

اسی زمانہ میں اسی قسم کی رسم انگلستان میں بھی ہوا کرتی تھی جس سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہوتا تھا کہ اب ہم موسم سرما کو الوداع کہتے ہیں اور موسم بہار کے خیر مقدم کے لیے تیار ہو گئے ہیں۔ اس مہینے کی پندرھویں تاریخ ایک مشہور و معروف رسم کے لیے معین اور مخصوص تھی۔ یعنی اُسوقت آٹے یا مٹی کی بہت سی مورتیں اُن فوت شدہ بزرگوں کی بنایا کرتے تھے جو اُنکے خیال میں معزز تھے. اور اُن مورتوں کو عام گزرگاہوں میں رکھا کرتے تھے بالخصوص چوراہوں اور چوکوں پر۔ اور انکی بڑی بھاری تعظیم اور تکریم کرنے کے بعد اُنکو جلا دیا کرتے تھے۔ اس موقع پر علی الصبح کچھ بولنے سے پہلے ایک سیب کھالینا۔ اور ڈھاک کی جڑ کی دُھونی لینا بہت اچھا سمجھا جاتا تھا کہ ایسا کرنے سے آیندہ بارہ مہینوں تک کی زندگی بڑے امن سے گزرا کرتی ہے۔ محتاجی اور بھوک رفع ہو جاتی ہے۔ ۲۴ تاریخ پر لہسن کی عید ہُوا کرتی تھی۔ لوگ لہسن کو گوشت اور سبزی کے ساتھ خاص طور پر پکایا کرتے اور سمجھا کرتے تھے کہ اس طلسم سے ہم دیوں کے حملوں سے بچے رہتے ہیں اور خاص خاص منتروں کے ذریعہ سے ہم دیوؤں کو اُن مقامات سے نکال دیا کرتے ہیں جہاں اُن دیوؤں کا باس ہُوا کرتا ہے۔ اور یہ خیال کرتے تھے کہ اگر یہ طلسم اس تاریخ پر بنایا جائے تو بہت موثر اور مفید ہوا کرتا ہے۔

گیارہواں مہینا **بہمن** (جنوری) ہے۔ یہ فرشتہ تمام دیگر فرشتوں سے نور اور تجلی میں افضل ہے۔ سمجھا جاتا تھا کہ یہ فرشتہ تمام مخلوقات پر حکمران ہے مگر انسان اُسکی حکومت سے باہر ہے۔ کیونکہ انسان اورمزد کی خاص نگرانی میں ہے۔ اورمزد کے معنی ہے عالم کُل۔ وہ تمام غیظ و غضب کا منتفی کرنیوالا اور تمام جھگڑوں کا ثالث متصور ہوتا ہے۔ ۲ تاریخ پر جو اس فرشتہ کا دن ہے اناج یا گوشت کی عید مناتے تھے اور اُس اناج اور گوشت کو سفید یا سرخ بہمن کے ساتھ اُبالا کرتے تھے اور جب رکابی تیار ہو جاتی تو اُسپر سرخ بہمن اور مصری کوٹ کر اور ملا کر ڈال دیا کرتے تھے۔ وہ لوگ سفید بہمن کو دودھ میں پیس کر مقوی دماغ کے طور پر نوش کیا کرتے تھے۔ اس دن پر گھر کی بنیاد رکھنا، نئے کپڑے کاٹنا یا بنانا یا سینا، ناخن کاٹنا اور بال منڈانا، طبی جڑی بوٹی تلاش کرنا نحس سمجھتے تھے اور انکا عرق یا تیل نکال لیا کرتے تھے۔

بارہواں مہینا **سپندارمذ** (فروری) ہے۔ اس فرشتہ کے سپرد کرۂ زمین ہے اور نیک مستورات کا بھی وہی محافظ و نگران متصور ہوا کرتا تھا اس سبب سے پانچویں تاریخ جو اسکا دن تھا بیاہ شادی کے لیے نہایت موزوں اور مشبھ سمجھی جاتی تھی۔ اِس دن کے ناموں میں سے ایک نام مردگیران (یعنی مردوں پر حکومت کرنا یا آدمی لینا) تھا۔ اس عقیدہ کی بنا ایک قدیم رسم پر تھی جسکے ذریعہ سے اس دن پر مستورات کو خاص حکومتانہ اختیارات دیے جاتے تھے۔ اور خاوند اپنی بیویوں کے نہایت ہی زبردست احکام کی تعمیل کیا کرتے تھے۔ اور کنواریاں اس امر کی مجاز ہوتی تھیں کہ اپنے حسب منشا خاوند چُن لیا کریں۔

مہینوں کی جو ترتیب اس جگہ دیگئی ہے وہ وہی ہے جو فارس میں سلطان جلال الدین کی اصلاح کے وقت سے جاری ہے جسنے نہایت قدیم طریق کو جسے دراصل جمشید نے مرتب کیا تھا بحال کر دیا ہے۔

بی۔ کے۔ ایس

مسئلۂ انتشارِ قوت اور عالم کی بربادی

مسئلۂ انتشار قوت (Dissipation of Energy) طبعیات میں ایک نہایت عجیب غریب اور نہایت مشہور مسئلہ ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ اجسام کی قوت عمل طبعی سے رفتہ رفتہ خارج ہو رہی ہے، اور آخرکار وہ اخراجِ قوت سے مُردہ اور بے کار ہو جائیں گے یہ عالم گیر عمل ہے۔

لارڈ کیلون کی رائے لارڈ کیلون اسکے مخترع تھے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ "عالمِ محسوسات کے اندر عام طور پر یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ قوتِ کیمنکہ اجسام کے اندر سے نکل نکل کر خارج ہو رہی ہے۔ جو بے جان مادی عمل جاری ہیں انکے وسیلہ سے اس اخراجِ قوت کی تلافی نہیں ہوتی۔ ذرّوں کے اجتماع اور ارتباط سے بھی (قوت ضائع ہونے کا) یہ خسارہ پورا نہیں ہوتا۔ چاہے یہ عملِ اجتماع نباتی زندگی سے بہرہ یاب ہو یا کسی جان دار کی مرضی کے تابع ہو۔" جس کے معنی یہ ہیں کہ خواہ نباتات کے اندر قدرتی عمل جاری ہو یا خوراک وغیرہ کے وسیلہ سے ہم کام کرنے کی قوت اپنے اندر پیدا کریں مگر عمل انتشار سے جو قوت برباد ہو جاتی ہے وہ پوری نہیں ہو سکتی۔ آخرکار ہم مر جاتے ہیں۔ انجن رات دن چلتا رہتا ہے اور کچھ مدت کے بعد اتنا فرسودہ اور بے کار ہو جاتا ہے کہ مرمت سے بھی کام نہیں دیتا۔ نباتات بھی کچھ عرصہ کے بعد مرجھا جاتی اور سوکھ جاتی ہیں۔

"ایک وہ زمانہ تھا کہ کرۂ ارض انسان کے رہنے کے قابل نہ تھی۔ ایک زمانہ آیندہ ایسا آئیگا کہ وہ جان داروں کی بود و باش کے قابل نہ رہیگی تاوقتیکہ انسان کا موجودہ ڈھچر اور قوائے جسمانی، دماغی، اور روحانی بدل نہ جائیں یا قوانین میں تغیر عظیم واقع نہ ہو۔ جو اس وقت عالم کے اندر موجود ہیں۔"

ہربرٹ اسپنسر کی رائے عالم کی آخری حالت کی بابت ہربرٹ اسپنسر کہتا ہے "جو عمل ہر جگہ ہو رہے ہیں انکا یہ انجام ہوگا کہ ہر جگہ شہر خموشاں کی سی خاموشی چھا جائے گی۔ سب کام معطل ہو جائیں گے۔ ہم سب ہلاکت کے اس گڑھے میں جا گریں گے جو منھ کھولے ہڑپ کرنے کو تیار ہے۔" (فرسٹ پرنسپلز صفحہ ۵۰۴)

مشہور عالم فلکیات رچرڈ پراکٹر لکھتا ہے "سورج سے دس لاکھ کا لیاں حرارت خارج ہوتی ہے جس کا صرف ۲۲۷ واں حصّہ سیاروں کے حصہ میں آتا ہے باقی خلا میں جاکر غائب ہو جاتا ہے۔"

سر آلیور لاج کی رائے آپ طبعیات کے نہایت ہی مشہور عالم، مانچسٹر یونیورسٹی کے پرنسپل، کئی کتابوں کے مصنف، خدا کے قائل، دین دار اور نیک آدمی ہیں۔ آپ کو ڈاکٹر والس کی طرح روحانیات سے دلچسپی ہے۔ آپ کی رائے ناطق سمجھی جاتی ہے۔ آپ انتشار قوت کی بابت لکھتے ہیں "وہ قوت جسے قابو کرکے ہم ایک جسم سے دوسرے جسم میں نتقل کر سکتے ہیں اور اس سے خاص کام لے سکتے ہیں، وہ کار آمد قوت کہلاتی ہے کیونکہ اس سے اپنے حسب منشا کام لیا جا سکتا ہے، گو انتقال سے قوت کی مقدار کم نہیں ہوتی مگر بار بار منتقل ہونے سے اسکے کار آمد ہونے میں فرق واقع ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اس عمل میں اسکا کچھ حصہ زائل ہو جاتا ہے۔ اور ذراتی حرکت (حرارت) بنجاتی ہے اور اس طرح وہ ہمارے قبضۂ اختیار سے باہر ہو جانے سے کار آمد ثابت نہیں ہو سکتی۔ یہ بظاہر ناگزیر عمل ہے جو آپ سے آپ ہوا کرتا ہے۔ اسی کا نام انتشار قوت ہے۔ تمام بے جان عملوں سے انتشار لاحق ہو جاتا ہے اور یہ عمل سب جگہ اور چیزوں میں کم و بیش پایا جاتا ہے۔ جان دار ہستیاں اسکے عمل کی ہدایت کر سکتی ہیں۔"

پروفیسر صاحبان ٹیٹ و اسٹوارٹ کی رائے مشہور و معروف عالمان طبیعیات پروفیسر جی پی ٹیٹ اور بالفور اسٹوارٹ نے اپنی مشہور کتاب "دی ان سین یونیورس" (THE UNSEEN UNIVERSE) میں حرارت کے اخراج سے عالموں کی بربادی کی بابت حسب ذیل تحریر کیا ہے "حرارت کا میلانِ عام مساوات ہے۔ سچ پوچھو تو حرارت اس عالم کے اندر مساوات

کا درجہ قائم کرنے والی اور عدم مساوات کی دشمن ہے۔ اس سے اس عالم کا بلاشبہہ خاتمہ ہو جائیگا۔ اس عالم کو ایک عظیم الشان انجن ہاؤس سے تشبیہ دی جاسکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جابجا ہمنے انجنوں کی مثالوں سے کام لیا ہے۔
ہماری دنیا بلکہ تمام نظام شمسی کی حرارت کا سرچشمہ آفتاب ہے جس طرح آسمان کے دیگر ستارے دیگر نظامہائے شمسی کی گرمی کا مصدر ہیں۔ جو قوت ہماری ہستی کے لیے لازمی ولابدی ہے وہ اُس حرارت سے حاصل ہوتی ہے جو سورج سے خارج ہوکر آتی ہے۔ اور وہ قوت اس گرمی کا ایک نہایت ادنیٰ جزو ہے۔ گو سورج ہمیں قوت بہم پہنچاتا ہے مگر وہ خود سرد ہوتا جاتا ہے۔ آخرکار ایک ایسا وقت آئے گا جب کہ اخراجِ حرارت سے جو خلا میں ہوتی رہتی ہے سورج زندگی کو سہارا دینے والی اُس قوت سے محروم ہو جائے گا جو اس وقت اُسکے پاس موجود ہے۔
یہ بھی خیال کرنا چاہیے کہ سورج کے سرد ہونے کے ساتھ ایتھر کی رگڑ سے ہمارا کرۂ ارض اور دیگر سیارے گھومتے گھومتے آفتاب کی طرف کھنچ جائینگے اور آخرکار اُسکی سطح پہ جاکر برباد ہو جائیں گے۔ اس سے قدرۃً ایک قسم کا تصادم ہوگا جس سے حرارت اور قوت پیدا ہوگی اور کچھ عرصہ کے لیے سورج کی قوت بحال ہو جائے گی مگر بالآخر یہ بھی ختم ہو جائے گی اور آفتاب حرارت و روشنی سے بالکل محروم ہو جائے گا۔ تاوقتیکہ اپنے کسی ہمسایہ سے ایتھر کی رگڑ سے ٹکرا کر اسکی ہستی تحس نحس نہ ہو جائے۔

اس بحث پہ زیادہ بحث کرنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ مگر زندگی جہاں تک اس کا تعلق طبعی حالات اور قوا سے ہے قوت کی تنسیخ اور نئی صورتیں اختیار کرنے پر موقوف ہے۔ یہ امر بھی یقینی ہے کہ رفتہ رفتہ زمانہ اس قسم کے تغیرات کا امکان کم ہوتا جاتا ہے اور جو کچھ ہمیں عالم کے قوانین اور قوا کے عمل کی کیفیت معلوم ہے اسکی بنا پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ عالم کی آخری صورت یہ ہوگی کہ قوتِ بارز کے زائل ہونے اور قوت مخفی کے علاً بیکار ہو جانے سے تمام مادہ ایک ہولناک انبار بن جائیگا اور اس مجموعہ کا درجۂ حرارت و برودت مساوی ہوگا۔

مگر نظامِ شمسی کی قوت مخفی اتنی وسیع ہے جسے ہم اپنی لاچاری کی وجہ سے غیر متناہی قرار دیتے ہیں کہ وہ بے انتہا صدیوں تک زندگی کی طبعی ضروریات کو پورا کرتی رہے گی۔ اگر سیرئیس (Sirius) اور آفتاب آپس میں ٹکرا جائیں تو اس سے تیس گنا زیادہ حرارت پیدا ہوگی اگر قوانین قدرت موجودہ صورت میں جاری رہے تو بے شمار زمانوں کے بعد مردہ آفتابوں کے ہمارے آفتاب سے ٹکرانے کا سخت احتمال ہے ان کے جسموں کا بڑا حصہ باریک خاک میں تبدیل ہو جائے گا اور اسکے وسیلہ سے بڑے بڑے سیارے اور آفتاب نئے سرے سے بنیں گے۔ الغرض موجودہ نظامِ شمسی سے زیادہ شاندار اور وسیع نظامِ شمسی قائم ہو جائے گا۔ مگر شمار میں ارکین شمسی کم ہوں گے۔ اس طرح کچھ مدت کے بعد قوت ختم ہو جائے گی۔ اسکے ساتھ حرکت بھی بند ہو جائیگی اور عالم کے چاروں طرف دائمی سکون اور خاموشی ہوگی۔ جیسے سیاروں کی آیندہ حالت ہوگی ویسے ہی وہ کچھ زمانہ پیشتر بھی تھے۔ انکا ہیولیٰ سفید خاک ایسا تھا جو گردش کر رہا تھا مگر اسکے اندر قوت مخفی تھی۔ خلا میں مادہ سفید بادلوں کی طرح گردش کر رہا تھا آخرکار اُس میں انقلاب پیدا ہوا اور سرد ہوکر کرے اور سیارے بنتے گئے۔ موجودہ عالم کی ابتدا ہوئی تھی تو انتہا بھی ہوگی اسے ہمیشگی اور استمرار نصیب نہیں۔ اسے فنا سے بالا سمجھنا غلطی ہے جے۔ آر۔ ر ا

سادگی

مجھے بارہا اس خیال سے سخت تعجب ہوا ہے کہ "سادگی" کا حاصل کرنا اور اسکی صحیح تعریف کرنا کتنا مشکل ہے۔ بادی النظر میں اسکے دو سبب ہیں۔ پہلا یہ کہ جو معنی ہم لفظ "سادہ" کے لیتے ہیں وہ محدود ہیں۔ کیونکہ یہ زیادہ تر ایک ایسے اثبات کے لیے استعمال ہوتا ہے جو نفی کے معنی دیتا ہے۔ گویہ بات تعجب انگیز

معلوم ہو مگر ہمارے قبول کردہ استعمال میں ایسا ہی ہے۔ ہم عام طور پر "سادہ طریقہ" اور "ایک سیدھی سادی بات" کے الفاظ کا استعمال کیا کرتے ہیں اور ان الفاظ سے ہمارا یہ مفہوم ہوتا ہے ایک ایسا "طریقہ" یا "بات" جس کے کرنے کے لیے ہمکو زیادہ ہوشیاری اور تیز فہمی سے کام نہ لینا پڑے۔ پھر ہم کہا کرتے ہیں "سیدھا سادہ آدمی" جس کا مطلب ایک ایسے شخص سے ہوتا ہے جو چالاک اور ہوشیار نہ ہو۔ بعض اوقات ہم اس سے بھی بڑھکر کہا کرتے ہیں کہ "اوہ! یہ تو مجسم سادگی ہے" جسکا مطلب اُس سے بہت زیادہ ہوتا ہے جس قدر سمجھا جاتا ہے۔ اسکے اصلی معنی سے نہ کہنے والا آگاہ ہوتا ہے نہ سُننے والا یہ لوگ قابل افسوس ہیں۔ استعمال اور عادت نے خیال کی حدبندی کر دی ہے سادگی کے معنی میں ذیل کی باتیں شامل کر لینا مناسب ہوگا :۔

(۱) لطافتِ مزاج بے ریاکاری۔

(۲) فطرت کامل جو تبدیلی اور شکست سے مبرا ہو۔

(۳) آزاد معصومیت جو سب کے ساتھ یکساں ہو۔

(۴) عادات کی صفائی جو اندرونہ کا سچا انعکاس ہو نہ کہ رسوم کی مصنوعی نمو

یہ خیال کہ "یہ باتیں خیال ہی خیال ہیں" قابلِ اعتراض ہے۔ "سادگی" کی تعریف کیوں کرتے ہو؟ درخت سے گھاس کیوں مُراد نہیں لیتے حالانکہ اُسکے بھی تنہ اور پتے ہوتے ہیں؟

پس یہ محدود نفی کا پہلو ہے جو ایک اثباتی لفظ کے کہنے اور سُننے والے کو پیش آتا ہے۔ "جو کچھ ہے" یہ "جو کچھ نہیں ہے" کے بعد آتا ہے۔ علاوہ ازیں ایک دوسرا پہلو ہے جو اسکے اثباتی معنوں کی اہمیت سے انکار کرتا ہے اور یہی ہمارا انتہائی اہم اور دوسرا سبب ہے۔

ہماری سویلیزیشن (تہذیب) خاص طور پر ہمکو ہر صاف اور سادہ چیز کے لیے اندھا بنا دینے کی ذمہ دار ہے۔ سادگی خیر پر حکومت کرتی ہے اور تکلف (Complexity) شر پر۔

دن، رات، بہار، موسم گرما، خزاں اور موسم سرما ایک دوسرے کے بعد واقع ہوتے ہیں صرف زمین کی ایک سادہ حرکت سے۔ انسان کا عجیب و غریب ڈھانچ قائم ہے صرف سادہ طور پر سانس لینے اور نکالنے سے۔ بیشک "سادگی" نہایت تحیر انگیز ہے! اس سرزمین کی ہر چیز کو آزماؤ مگر کوئی بھی سادگی کے احاطہ سے باہر نہ پائی جائیگی۔

اب تھوڑی دیر کے لیے اس "خالق اصغر" یعنی انسانِ عظیم کا خیال کرو اسکا سب سے بڑا کام سویلیزیشن ہے۔ اسپر کون حکومت کرتا ہے؟ مذہب، فلسفہ، علم، سیاست، سائنس، جنگ، صلح، صناعی، تجارت، زر، آزادی، دستکاری، انصاف اور سخاوت وغیرہ وغیرہ۔ جو الفاظ ملتے جائیں سب ان کے ساتھ ملاتے جاؤ یہاں تک کہ کوئی نام باقی نہ رہے۔ لیکن "اس پر کون حکومت کرتا ہے؟" یہ سوال پھر بھی حل طلب رہ جاتا ہے جب تک ہم یہ نہ کہیں "انسان سویلیزیشن پر حکومت کرتا ہے اور سویلیزیشن انسان پر"۔ اسکا ایک دوسرا پہلو بھی ہے۔ ہر نسل اور ہر صدی اپنے "مہذب ترین" ہونے کا دعوی کرتی ہے اور اپنے سے کچھ ہی پہلے زمانہ کو "زمانۂ تاریک" (Dark Age) کا خطاب عطا فرماتی ہے۔ سنہ عیسوی کی ابتدا ہوئی اور اس سے پہلے زمانہ کو مایوسی کے ساتھ "تاریک" کہا گیا۔ تہذیب نے ایک دوسرا نام وضع کیا اور گذشتہ چودھویں صدی کو "زمانۂ وسطیٰ" کہکر پکارا گیا۔ ہم بیسویں صدی کے اشخاص بھی ان روایتی خطابات میں حصہ لیں گے اور تیسویں یا چالیسویں صدی کے لوگ ہماری پہچان کے لیے کوئی نیا نشان ایجاد کریں گے۔ چھوٹے چھوٹے زمانوں پر "اولڈ فیشن" کا لیبل لگایا جاتا ہے یہاں تک کہ وہ بڑھتے بڑھتے ایک تازہ نام حاصل کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔ "انسانِ عظیم" درحقیقت انسانِ عظیم ہے!

یہ ہے انسان کی ساختہ سویلیزیشن کا خاکہ۔ اگر ہم تھوڑی دیر کے لیے اسکی پیدائش کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو ہمکو معلوم ہو جائیگا کہ کس طرح زمانہ کی ترقی کے ساتھ ساتھ "سادگی" سے نظر پوشی کی گئی ہے۔ بے شک تمثیل پر بھی کچھ الزام دکھا جاتا ہے مگر نتیجۂ کوشش عام طور پر قبول شدہ ہے۔ ہر شخص کو قریب قریب معلوم ہے کہ انسان پیشتر کس طرح پھلوں، گوشت اور چشموں کے پانی پر گذارا

کیا کرتا تھا۔ حضرت انسان غاروں یا درختوں کے سایہ میں رہا کرتے تھے۔ ہر طرف نیچر کی حکومت تھی۔ یہ میدانی زندگی صحت بخش، طاقت ور، اور بے لوث تھی۔ فکر، رنج، گناہ اور خجالت کا کہیں نام و نشان نہ تھا۔ نہ بیماریاں ہوتی تھیں، نہ قحط پڑتے تھے، نہ بغاوتیں ہوتی تھیں نہ آزادی کے لیے کوششیں۔ صرف آزادی اور سادگی ہر طرف بے کھٹکے اور بے پوچھے گچھے حکومت کرتی تھیں۔ خیالات سادہ تھے مگر وسیع اور متفق۔ خیالات نہ تو ہزاروں جانب منقسم تھے اور نہ فضولیات میں اُلجھے ہوئے۔ اس کے بعد آگ نے رواج پایا جس نے ہمارے تعلقات کو نیچر سے کامل طور پر جُدا کر دیا۔ اُس چور کو جس نے آسمان سے آگ چُرائی تھی، دیوتاؤں نے کافی سزا دی۔ یہ سزا انسان کو دی گئی اور نظیر سابقہ قائم ہو گئی۔ ہم اب بھی دیوتاؤں کے انصاف کو بُرا کہتے ہیں۔ اسی آگ کے معلوم ہونے کے دن سے سویلزیشن کی تاریخ شروع ہوتی ہے۔ کیونکہ اسی وقت سے ضروریات کا دائرہ وسیع ہوتا چلا گیا اور ان کے پورا کرنے کے ذرائع بہت کم دستیاب ہوتے گئے۔ گھڑی نے تختہ ساعت نما کو شکست دی اور تب ہی سے زمانہ موجودہ ماڈرن ازم (Modernism) کا آغاز ہوتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ضروریات بے حد بڑھ گئیں اور برکاتِ اولیں غائب ہو گئیں۔ مجوسیوں کا یہ کہنا بجا تھا کہ "شیطان سویلزیشن کا باپ ہے۔ اس نے خوشی، صفائی اور معصومیت یا بالفاظ دیگر "سادگی" کے چلے جانے کے بعد اچھائی اور برائی دونوں نازل کیں"۔

"انسان مظہرِ خالق ہے" یہ اب ہماری پیدائش اور خلقت کا ایک متروک الاستعمال مقولہ رہ گیا ہے۔ جو مقولہ موجودہ "مہذب" صدیوں پر صادق آتا ہے وہ یہ ہے کہ "انسان اچھائی اور برائی کا غیر منفک مجموعہ ہے"۔ شیطان کے الہام کا کیا ہی عمدہ نتیجہ ہے! اسی سے تمام شکست کا حال معلوم ہو سکتا ہے۔ ہماری تمام خلقت مخلوط (Complex) ہو گئی ہے۔ ہمارا دماغ ایک گہرے اخلاط میں کام کرتا ہے اور کبھی کبھی اس خلط کو اور بھی زیادہ مخلوط کر دیتا ہے۔ ہم اخلاق کے قواعد بناتے ہیں یہ فرض کر کے کہ علم الاخلاق ایک نہایت پیچیدہ چیز ہے ورنہ قواعد کی کیا ضرورت لیکن ہم خود نہیں جانتے کہ جس کا ہم اعلان کرتے ہیں وہ یہی اصل چیز ہے۔ "جان کے بدلے جان" ہم کہا کرتے ہیں لیکن کبھی ان الفاظ کا میدانِ جنگ میں بھی خیال رکھا جاتا ہے؟ اگر فاتح اعقل شاہنشاہ کے ساتھ "قتل قتل قتل قتل۔ قتل قتل کی ہم نوائی کرو تو یقیناً اخبارات میں تمھاری بے حد تعریف کی جائے گی۔ تمھارا قاتلانہ اور لعنتی فن سپاہ گری تاریخوں میں تحریر کیا جائے گا اور اسکے معاوضہ میں تمھارے نام کے ساتھ چند الفاظ بڑھا دیئے جائیں گے۔ "ہر ایک سے محبت کرو یہاں تک کہ اپنے دشمنوں سے بھی" یہ ہمارے کرہ کی ایک سادہ ترین آواز نے اعلان کیا تھا۔ "بے شک لیکن بلحاظ تفریق رنگ کے" اسپر سیاسی یا اخلاقی شخص ایزاد کرتا ہے اور پھر بھی ہزاروں جبر، وعدوں اور دروغ گوئیوں سے واسطہ پڑتا ہے۔

اسی طرح تمام انسانی شاخوں میں کوئی ایسا قاعدہ کبھی نہیں بنایا گیا جسکے ساتھ اُسکا "باطل ساز" استثنا نہ لگا ہو۔

ہم نے اپنے واسطے ایک نئی بادشاہت قائم کی ہے جسکا اصول فرمانروائی سادگی نہیں بلکہ تکلف ہے۔ اچھائی، سادگی، اور صفائی سے یکساں جدائی ہمارا کام رہ گیا ہے۔ ہمارے مقاصد بھی ایسے ہی ہیں یعنی کسی چیز کو جس حالت میں پائیں اُسے اُسکے برخلاف بنا دیں۔ بعض اوقات میں گھنٹوں اس بات پر غور کیا کرتا ہوں کہ کیا دنیا میں کوئی انسان کی ایجاد کردہ ایسی سائنس بھی ہے جسکی بنیاد سادگی پر رکھی گئی ہو؟

میں پہلے مذہب کو لیتا ہوں، جو دنیا میں ہمارا مقصد خاص ہے۔ اسکی بنیاد خلاقِ عالم کے سادہ ایمان پر ہے۔ لیکن بعض آدمی ہمکو بے حد پیچیدہ مباحث میں ڈالتے ہیں جن سے ہماری عقل گم ہو جاتی ہے اور ہم تعجب کرنے لگتے ہیں کہ آیا ہم زیادہ عقل مند ہیں یا زیادہ بے وقوف۔ بعض آدمی ریاضت کی تعلیم دیتے ہیں جسکو عقل سلیم قبول نہیں کرتی۔ تمسیر اگر وہ تارک الدنیا ہونے کی

صلاح دیتا ہے۔ دوسرے یہ بتاتے ہیں کہ "جو یہاں ہے سو وہاں ہے" ایک گروہ کہتا ہے کہ جب تم دنیا میں تناسخ کے پھیر سے نکل جاؤ گے تو کچھ حاصل ہوگا۔ اور جب اس "کچھ" کی تشریح پوچھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ "یہ کچھ نہیں" سے بھی بدتر ہے۔ اسی کے ساتھ عظیم الشان مہذب ورنیٹک پرستش No-ism کی ہے۔ یہ لوگ ہر چیز سے انکار کرتے ہیں۔ انسان ان رسومات، عقائد، رواجات، اقوال اور انکارات وغیرہ کے اخلاط کے سامنے حواس باختہ ہوجاتا ہے۔ "سادہ غیبی آواز" پر لوگ کم توجہ کرتے ہیں۔ خداوند تعالیٰ مثل ایک شفیق باپ کے اپنے بچوں سے کہتا ہے "میری طرف آؤ" لیکن جب ہم اسکی طرف جاتے ہیں تو اس طرح جاتے ہیں جیسے کوئی سراغ رساں کسی کے اسرار دریافت کرنے جاتا ہے یا جس طرح کوئی ترجمان جو اپنے کو بہ نسبت اُس شخص کے جسکی وہ ترجمانی کرتا ہے، زیادہ ظاہر کیا کرتا ہے۔ اسکے بعد ہم ان اسرار کو امتحانی نلی میں ڈالتے ہیں۔ گرمی پہنچاتے ہیں، رنگ دیکھتے ہیں، نتیجہ نکالتے ہیں اور آخر کار اپنی حماقت کا اظہار کرتے ہیں۔

غریب "مہذب آدمی" اپنے ایک انچ بھر کے دماغ سے ہر چیز کا امتحان کرنا چاہتا ہے جسکے لیے وہ ہرگز قابل نہیں ہے۔

اب میں اپنے مشاغل تفریح کو لیتا ہوں۔ یہ بھی قابلِ اطمینان نہیں۔ ہر بچہ روتا اور چلاتا ہوا پیدا ہوتا ہے۔ بس یہی کافی ہے۔ اسکے بعد ہم رونے سے نفرت کرنے لگتے ہیں۔ زندگی بھر ہمارا یہی مشغلہ رہتا ہے کہ کوئی ایسی چیز ایجاد کریں جو کبھی کسی نے نہ بنائی ہو۔ ہماری پیدائش کے ساتھ ہی ہنسنا اور مسکرانا بھی آتا ہے جو ہمارے قلبی انبساط کا بیرونی انعکاس ہوتا ہے۔ نیچر نے یہی چیزیں ہماری تفریح کے لیے دی ہیں۔ اسکی اشکال مختلف ہوتی ہیں لیکن اسکا رجحان یکساں رہتا ہے۔ زمانۂ خوشی پانچ سال تک رہتا ہے۔ اسکے بعد ہر چیز اچھی معلوم ہونے لگتی ہے۔ خاک، گھاس، درخت، پتے، پھول اور عالم کا ہر نظارہ اور آواز ایسی معلوم ہوتی ہے گویا یہ چیزیں خاص ہمارے ہی لیے بنائی گئی ہیں۔ ہم ایسا کہنے میں انکے ساتھ کافی انصاف کرتے ہیں۔ تم نے اکثر بچوں کو سڑک کے کنارے خاک میں لوٹتے ہوئے دیکھا ہوگا۔ وہ اس میں بہت زیادہ خوش ہوتے ہیں۔ اتنا زیادہ جتنا کہ تم اپنے تازہ خرید ریشمی لباس میں بھی نہیں ہوئے۔ تمھاری تہذیب انھیں "گندہ" کہتی ہے مگر ابھی یہ فیصلہ باقی رہتا ہے کہ آیا تم زیادہ ناپاک ہو یا وہ۔ جوں جوں وقت گزرتا جاتا ہے بچہ انسانی تہذیب میں گرفتار ہوتا جاتا ہے یہاں تک کہ وہ اپنے گذشتہ مشاغل تفریح کو طفل مزاجی پر محمول کرنے لگتا ہے۔ صاف اور سادہ خوشی جو ہمارے ارد گرد کی چیزوں سے دل میں پیدا ہوتی تھی کم ہونے لگتی ہے اور مثل تھیٹر، راگ، رقص، دعوت، دوڑ، شطرنج اور دوسرے تہذیبی ناقابل بیان تکلفانہ مشاغل تفریح میں خوشی پانے لگتے ہیں۔ جب تک ہماری رگوں میں سرخ خون دوڑتا رہتا ہے ہم ایک لمحہ کے لیے بھی انکا پیچھا کرنے سے باز نہیں رہتے۔ ضعیفی آجاتی ہے، گرمی نکل جاتی ہے اور ہم تمام عمر کے گناہوں کا کفّارہ چند مختصر دعاؤں سے کرکے گوشۂ تنہائی میں جا بیٹھتے ہیں اس امید میں کہ ہمیں دوسرے عالم میں بھی ویسی خوشیاں نصیب ہوں جیسی ہم نے یہاں دیکھی ہیں۔

سب کے سب اندھے راحت طلب ہیں! کیا ہم کبھی اپنی بنائی ہوئی چیزوں کے انجام پر بھی نظر ڈالتے ہیں جو صرف اس وجہ سے دل خوش کن ہیں کہ وہ ہمارے جسم کی بعض حس کو گدگداتی ہیں۔ یہ لوگ چندھیانے لگتے ہیں، متعجب ہوتے ہیں، گھبرا جاتے ہیں، پژمردہ ہو جاتے ہیں، اُکتا جاتے ہیں، مگر انھیں کبھی سچا اطمینان نصیب نہیں ہوتا۔ نہ کبھی انکی سچی خوشی کی رگ حرکت میں آتی ہے نہ وہ ہم کو بچا سکتے ہیں نہ ہمارے اخلاق درست کر سکتے ہیں۔

"اُٹھتی ہوئی لہروں کی طرف بڑھنا کبھی آرام دہ نہیں ہوسکتا۔" دماغ پر خواہ مخواہ اثر پڑتا ہے۔ کیونکہ یہ اُن تمام قدرتی مناظر کے لیے بیکار ہوجاتا ہے جو درحقیقت خوبصورت ہیں، سادہ ہیں، اور خصوصًا ہمارے خوش کرنے کے لیے بنائے گئے ہیں۔ کس نے ہماری آنکھیں صبح، طلوع آفتاب، دوپہر کی خاموشی، خاموش دریا کے کناروں، میدانوں، درختوں اور اُنکے کیفیوں، بادِ نسیم، شفق، اور شب ماہ کے نظاروں کی طرف سے بند کردی ہیں؟ ہوس پرستی نے

اور اُسکے موجد نے۔ یہ جواب ہے۔ ہم ان بڑے نظاروں کے وقت سوتے رہتے ہیں اور باقی کو "غیر دلچسپ" کہہ کر چھوڑ دیتے ہیں۔ ہمارا ہندوستان کبھی ورڈسورتھ کی قدر و منزلت نہیں جان سکتا۔ باوجود اس امر کے کہ ہمارے پاس خوبصورت سے خوبصورت سینریوں اور عمدہ سے عمدہ مناظر کی کمی نہیں، پھر بھی ہمارے خیالات شاذونادر اپنی اندرونی جگہ کو چھوڑ کر ان قدرتی مناظر کے دیکھنے کی تکلیف گوارا کرتے ہیں۔ وہ لوگ جو گاڑیاں اور گھوڑے رکھتے ہیں نشست گاہوں اور پارکوں میں جا کر اپنی ضرورت فیشن پوری کر لیتے ہیں۔ اس سے اُنکا یہ مطلب ہوتا ہے کہ خود عورتوں اور مردوں کو دیکھیں اور دکھائیں۔ اُنکے پاس درختوں یا گھاس کے پیچھے غروب ہوتے ہوئے آفتاب کا دل فریب نظارہ دیکھنے کے لیے بہت تھوڑا وقت ہوتا ہے۔ اُنکو جو قسمت یا محنت کے ذرا ہیٹے ہیں، خوشی کا دروازہ بالکل بند ہوتا ہے۔ انکے پاس ایسی چیزوں کا خیال کرنے کے لیے وقت کم اور قابلیت معدوم ہوتی ہے۔ انکے لیے آفتاب کا طلوع ہونا گویا فوراً کام کے لیے بلاوا ہے اور شام دن بھر کی مزدوری کے بعد آرام کرنے کے لیے۔ اگر کچھ وقت ملتا بھی ہے تو وہ حقہ وغیرہ پینے اور فضول گفتگو میں ضائع کر دیتے ہیں۔ بعض وقت میں خیال کیا کرتا ہوں کہ آیا ان لوگوں کے دماغ بھی ہے۔ اوقاتِ فرصت بھی ان لوگوں کے لیے راحت و انبساط ہیں جو ذرا سا بھی دماغ رکھتے ہیں۔ اب طالب علموں کو لو۔ ان پر کم از کم نیچر کے کچھ حقوق ہیں کیونکہ وہ اس کی بابت انگریزی کتب کا مطالعہ کرتے وقت کچھ سنتے اور پڑھتے رہتے ہیں۔ لیکن یہ طلبا نیچر سے عجیب بے پروائی اور بے خبری کا اظہار کرتے ہیں۔ ایک انٹرنس کے طالب علم سے پوچھو کہ "قدرتی سینری سے کیا مطلب ہے؟" اُسنے سینری یا سین کا نام تو نیو الفریڈ کمپنی یا کسی اور تھیٹر میں سنا ہو گا مگر "قدرتی سینری" اُسکے لیے ایک بالکل عجیب بات ہے۔ لفظی معنی تو وہ جانتا ہے لیکن ہزار طالب علموں میں سے ایک بھی اُسکو مانک نہیں کرتا۔ اُس سے حظ اُٹھانا تو ایک بڑی بات ہے۔ یہی حالت اُن لوگوں کی ہوتی ہے جو ورڈسورتھ، کولرج، شیلی، کیٹس، براؤننگ اور ٹینی سن کی کتب کا سرسری مطالعہ کرتے ہیں۔ مطلب سمجھ لیا جاتا ہے اور اسکی ایک تصویر دماغ میں اُتار لی جاتی ہے مگر اسکی اصلی تعریف کرنا ایک ہندوستانی طالب علم کے لیے ناممکن ہوتا ہے۔ آنکھیں ہیں لیکن دیکھتی نہیں، کان ہیں مگر سنتے نہیں۔ اُنکی ذہانت عجب طور سے اغلاط کے چکر میں گردش کرتی رہتی ہے۔ مثال کے لیے میں اپنے ایک ہم جماعت کا قصہ بیان کرتا ہوں۔ کالرج کی کتاب پڑھتے وقت جب ہم اُن چند اشعار پر پہنچے جو سر پیٹرک اسپنس (Sir Patrick Spens) کی زبان سے بیان کیے گئے ہیں:۔

"کل میں نے نئے چاند کو دیکھا جو پرانے چاند کے ساتھ ہم آغوش تھا"

تو اسکا مطلب میرے دوست کی سمجھ میں نہیں آیا۔ میرے لیے ہر چاند کی پہلی تاریخ کو یہ ایک عام نظارہ تھا۔ میرے دوست نے جب پروفیسر سے اسکا مطلب دریافت کیا تو اُس نے جواب دیا "یہ کسی شام کو دیکھ لینا"۔ ایسی ایسی عام چیزوں کے مشاہدہ کی کمی ہندوستانی طلبا میں عام ہے۔ وہ اپنے مطالعہ، کھیل اور ہنسی مذاق میں اتنے مستغرق رہتے ہیں کہ انکو اس قسم کی "بیہودگیوں" کے لیے وقت بھی نہیں ملتا۔ سادہ اور عمدہ ترین قسم کی خوشیاں اُن میں معدوم ہیں۔ تنہائی سے وہ نفرت کرتے ہیں۔ میدان اور دوسرے غیر آباد مقام اُنکے لیے ناقابل برداشت اور بالکل غیر دلخوش کن ہیں۔ ان میں سے ایک بھی گنجان درختوں کے نقاب میں سے طلوع ہوتے ہوئے رخِ آفتاب کا نظارہ کرنے کی زحمت گوارا نہیں کرتا، اور نہ کوئی غروب آفتاب کی خوش نظارگی کا مشاہدہ کرتا ہے۔ پارک درحقیقت نصف النہار اور چاندنی رات میں نصف شب کے وقت نہایت خوش نما معلوم ہوتے ہیں۔ شہر کے بکثرت آباد حصص بھی رات میں دو تین بجے کے وقت جبکہ ماہتاب کی روشنی پھیکی پڑنی شروع ہو جاتی ہے، قابل دید ہوتے ہیں۔ ایک مرتبہ میرے بیان کرنے پر کہ مختلف پرندوں کے پروں کے نشانات ایک علیحدہ رہ کر بے حد خوش نما نظر آتے ہیں، احباب نے تحقیر آمیز قہقہہ لگایا تھا۔ ایک دوسری مرتبہ میرے دوست مجھ پر افسوس کرنے لگے جب میں نے بیان کیا کہ رات کو میں

اراداً میدان میں اس لیے ٹھہر گیا تھا کہ اپنے چاروں طرف گیدڑوں کا شور وغل سنوں۔ تنہا ایک وسیع تاریک میدان میں جانا جس پر ماہ ستمبر کی لانبی لانبی گھاس بچھی ہو، اور وہاں شکار کی تلاش میں کسی درندہ کا دہاڑنا جس سے تمام میدان گونج اُٹھے، اسکے بعد ایک گہری خاموشی کا ہر طرف چھا جانا اور کسی ایسی ہی مہیب آواز کے خوف سے گھر کو واپس چلا آنا، ایک طلسمی راحت وانبساط رکھتا ہے۔ دن کے وقت بھی ایسے مقامات میں جانے سے مجکو خوف ہے کہ لوگ نظر حقارت سے دیکھیں گے، لیکن میرے نزدیک یہ خطرات اور ہیبت ناک آوازیں بہ نسبت کسی قومی رفارمر کی آوازوں، یا کسی نئی راہ کے لیے پولٹیکل چیخ پکار کرنے والوں سے زیادہ بے لوث اور پاک و صاف ہیں۔

اسی طرح اور روزانہ امور میں بھی سادگی صرف اپنے فقدان کی وجہ سے سرفراز ہے۔ ہر امر پر جداگانہ بالتفصیل بحث کرنا طول اور مشکل ہے۔ اس لیے یہ بہتر ہے کہ ان سب پر ایک سرسری نظر ڈالی جائے۔

لباس میں جتنے زیادہ اور پُر تکلف کپڑے، تم استعمال کرو اُتنے ہی زیادہ اپ ٹو ڈیٹ خیال کیے جاؤ گے۔ محض فیشن تمھارے واسطے کافی نہیں یعنی بغیر تکلف اور فیشن کے مجموعہ کے کام نہیں چل سکتا۔

کھانے کا طریقہ اتنا قدیم، صنعتی اور تکلفانہ ہے کہ لفظ صفت "سادہ" اس کے کسی حصہ کے لیے استعمال کیا جانا موجب شرمندگی ہے۔ ہمنے کھانا پکانے کی ایک خود نما فلاسفی بنالی ہے۔

گفتگو کرنا زمانۂ موجودہ کا ایک مشکل ترین ہنر ہے۔ اگر تم کم گفتگو کرو، تو ڈرپوک، عجیب اور نا قابل شمار کیے جاتے ہو۔ اگر زیادہ گفتگو کرتے ہو تو "باتوں کی مشین" "بے لطف"، اور "کتابی" کے خطابات کی عزت حاصل کرتے ہو۔ سادہ گفتگو معیوب سمجھی جاتی ہے۔ جتنا زیادہ تم تخیل کی مدد سے اپنی گفتگو میں نمک مرچ ملا سکو اور جتنے دروغ آمیز فقرے تم شامل کر سکو، اُتنے ہی زیادہ پختہ کار اور خوش مزاج مانے جاؤ گے۔

سادے اور سیدھے راستے اب پُر خطر ہیں۔ اس طرح رہو کہ ہر آدمی تمھاری نسبت بہی ایک رائے قائم کر سکے لیکن ان میں ایک بھی درست نہو اسی طرح اگر ہماری عادات سادہ ہیں تو وہ محض مخلوط سمجھے جانیکے قابل ہیں۔

ہمنے "سادگی" کو اپنے پاس سے اتنا دُور پھینکدیا ہے جتنا ممکن تھا۔ لیکن ہمیں یہاں بھی اطمینان نہیں۔ بعض اوقات ہم اس سے بڑے معنی نکالتے ہیں۔ چنانچہ سب لوگ جانتے ہیں کہ "سادہ لوح" کے کیا معنی ہیں۔

سویلزیشن نے سادگی کو یہ جگہ دی ہے۔ میں اس بحث میں پڑنا نہیں چاہتا کہ یہ کیونکر واقع ہوا۔ جوں جوں دنیا یا انسان ترقی کرتا جاتا ہے سادگی تکلف میں مخلوط ہوتی جاتی ہے۔ کچھ بھی ہو مگر میں تو یہی کہوں گا کہ یہ ناروا اور نادرست ہے۔ ہمارے دماغوں کی کشادگی مفقود ہوگئی ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ روزمرہ کی باتیں دماغ پر اپنا اثر نہیں چھوڑتیں۔ میں آج کل کے آدمیوں کو خیال کرتا ہوں گویا وہ دو بڑے پیمانوں کے سامنے کھڑے ہیں اور محنت سے بنائی ہوئی مہذب ضروریاتِ زندگی کا پلہ برابر کرنا چاہتے ہیں جس کا برابر اور کم کرنا اُن کی طاقت سے باہر ہے۔ وہ اوزان جانتے ہیں جن کو کبھی اِدھر کبھی اُدھر رکھتے ہیں، ڈنڈی کو دیکھتے ہیں، مگر اطمینان نہیں ہوتا۔ بے فائدہ چاروں طرف نظر ڈالتے ہیں، خود کو ترازو کے پلڑے میں ڈال دیتے ہیں، پھر بھی وزن برابر نہیں ہوتا۔ اگر میں کسی ایسے کام پر مقرر کیا جاتا تو میں بجائے بٹوں کے پودے، گھاس، پتے، پانی اور دوسری بہت سی سادہ چیزیں ڈالتا اور مثل مشہور شہنشاہِ روم کے ایک باغ کی ناچیز پیداوار کو بادشاہی پر ترجیح دیتا۔

دنیا میں تم سادگی کے ساتھ رہو تو آدھی دنیا پر غالب آ جاؤ گے۔ سادہ عادات، سادہ خیالات، سادہ مشاغل تفریح، سادہ تلذذات سادہ ضروریات، سادہ عقائد رکھو۔ دنیا مع اپنے زریں تکلف کے تم پر کچھ اثر نہ ڈال سکے گی۔ ایک مرتبہ اور یاد رکھو کہ "سادگی نیچر پر حکومت کرتی ہے اور تکلف ترقی پر"۔ اب اس بات کا فیصلہ تمھارے اوپر ہے کہ تم کس کے مقلد بننا پسند کرتے ہو۔ مترجمہ محمد ابراہیم خاں تجلی

ارتقاء انسانی

ڈارون کے فلسفہ کی بنا پر اس مسئلہ کے تسلیم کرنے والے بہت سے اشخاص پیدا ہوگئے ہیں کہ انسان نے نسلِ حیوانی سے متغیر ہوکر موجودہ صورت اختیار کی ہے۔ اسی طرح جانور بھی ایک دوسرے کے تغیرات سے نت نئی شکلیں اختیار کرتے ہیں۔ تعجب ہے کہ ڈارون کے فلسفہ کی پوچ اور بے حقیقت دلیلوں پر عقل و دانش کے ہوتے ہوئے ذی فہم انسان کس طرح ایمان لے آتا ہے اور اپنی اصلیت اور خلقت کے راز کو کیسے اندھے پن سے معلوم کرکے بے عقل جانوروں کی طرح خوشی محسوس کرتا ہے۔ درحقیقت ایسے لوگ ضرور فطرتاً حیوانیت سے حصہ پائے ہوئے ہیں اور انکی عقلیں بیجا تقلید اور جدت طرازی کی دُھن میں نہایت گہری تاریکی کے بوجھ میں دبی ہوئی ہیں۔

ڈارون وغیرہ نے جو نظریہ قائم کیا ہے اور اُسپر جس قدر دلیلیں لکھی ہیں تاریخی و مذہبی و عقلی اعتبار سے نہایت ہی ہیچ و پوچ ہیں۔ دراصل وہ ایک واہمہ ہے جسکو محض اپنے ذہنی دلائل سے ڈارون نے متشکل کر دیا ہے ورنہ اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ بناوٹی صورتیں پرچھائیں کے برابر بھی پائدار نہیں۔

سب سے پہلے تو یہ امر غور کرنے کے قابل ہے کہ جب دنیا میں انسان حیوان دو لفظ موجود ہیں اور اُنکا استعمال ہوتا چلا آیا ہے تو لازمی و ضروری ہے کہ دنیا میں یہ دونوں جنسیں ابتدا سے موجود تھیں جن کے مسمّٰی کے لیے یہ الفاظ ایجاد ہوئے۔ بلکہ بدیہی طور پر یہ دلیل قائم ہوتی ہے کہ دنیا کے آغاز پر جب نسلِ انسانی و حیوانی کا وجود ہوا ہے تو خود حضرتِ انسان نے اپنی عقل و دانش اور علم و عمل کے ذریعہ سے اپنی اور حیوان کی ذات کے لیے دو جدا جدا لفظ ایجاد کیے جس سے ثابت ہے کہ خود انسان ہی ابتدا میں موجود تھا۔ اور وہ حیوانوں کو خود سے جُدا دوسری مخلوق جانتا تھا۔ اگر وہ ابتدا ہی سے حیوان ہوتا اور ارتقاء کے ذریعہ سے یہ چولا بدل لیتا تو ضرور تھا کہ اُسکی زبان میں وہی ارشادات موجود ہوتے جو پہلی خلقت میں تھے اور وہ کبھی خود کو نسلِ سابقہ سے جدا کرکے نئی صورت نیا مسمّٰی نہ اختیار کرتا۔

یہ خیال کتنا لغو ہے کہ انسان نے بندر کی شکل سے ارتقا حاصل کرکے انسانیت کا جامہ پہنا ہے۔ اگر قدرت یا مادّہ کا یہی فعل ہے کہ وہ ارتقا کے ذریعہ سے نوعِ اول کو نوعِ جدید میں تبدیل کرے تو کون امر مانع ہے کہ اور بندر اس وقت تک انسان ہوجانے سے محروم رہ گئے۔ حالانکہ اس کلیہ کی بنا پر ہر سال یا ہر صدی میں یا ہزار سالہ دَور میں تو ضرور بالضرور بندر سے انسان ہوجاتا۔ لیکن یہ آج تک نہ معلوم ہوا کہ کوئی بندر ارتقا حاصل کرکے انسان بن گیا۔ اور اس طرح بندروں کی نسل کم اور انسان کی نسل زیادہ ہوگئی۔

بڑا تعجب تو یہ ہے کہ اِن نظریہ قائم کرنے والے مادّیین نے اس وقت تک یہ بھی ظاہر نہیں کیا کہ ابتداءً کون سا بندر انسان بن گیا تھا اور کیوں کر اُسکی نسل انسانی نے ترقی کی؟ یہ بھی ظاہر نہیں ہُوا کہ صرف نر نے انسانی صورت اختیار کی تھی یا مادہ نے یا دونوں نے۔ یا نر انسان و مادہ بندر سے نسلِ انسانی کا وجود ہُوا ہے یا مادہ انسان و نر بندر سے۔ صرف ظاہر کردینا بھی قابلِ قبول نہیں ہوسکتا تھا تاوقتیکہ نہایت کافی طور پر اسکا ثبوت نہ ہو لیکن ثبوت تو کہاں اس امر کے ظاہر کرنے کی نوبت ہی نہیں پہنچی لیکن واہ رے انسانی طبائع اور واہ ری حمیت و غیرت کہ بغیر کسی واقعی اور مضبوط دلیل کے خود انسان حیوانیت کے چولا کو قبول کرنے اور خود کو بندر کی اولاد ماننے کے لیے تیار ہوگیا ہے۔

افسوس ہے کہ ڈارون یا دوسرے نظریہ قائم کرنے والے مادّیین نے باوجود اتنی بڑی تحقیقات اور دعوے کے جو ارتقاء کا کلیہ قائم کرنے پر مبنی ہے کسی بندر کے انسان ہوجانے پر خصوصیتِ خاصّہ کا انحصار کیا ہے جس سے

ظاہر ہے کہ وہ نامعلوم انسان جو بندر سے آدمی ہو گیا تھا صرف ایک ہی تھا اور پھر اسکے بعد کوئی دوسرا بندر یا جانور ارتقا کے ذریعہ سے انسان نہیں بن سکا۔ نہ یہ وجہ بتائی ہے کہ آخر وہ کون سی خصوصیت ہے جس سے پہلے انسان میں انسانی ارتقا کا مادہ حلول کر گیا تھا اور اُسکے بعد کون سے امور مانع آئے کہ پھر کسی بندر یا دوسرے جانور نے پیکر انسانی اختیار نہیں کیا؟ آخر اس سلب مادہ یا پیدائش کی بھی تو کوئی وجہ ہوگی۔

اس سلسلہ میں جس قدر مضامین شائع ہوے ہیں کسی ایک میں بھی اِن امور کا پتہ نہیں ہے تاہم مضامین نگار صاحبان کا یہ منشا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایسے ناقص اور لغو فلسفہ کے ذریعہ سے موجودہ اور آیندہ نسلوں کے ذہن میں اس زہریلے و فاسد مادہ کا اثر قائم کرکے دائرۂ معلومات کو وسعت دینا چاہتے ہیں۔ حالانکہ اُس میں سر سے پیر تک ابہام ہی ابہام ہے اگر یہ نظریہ مفید اور واقعی ہوتا تو بے شک اسکی اشاعت لازمی تھی لیکن جبکہ وہ محض ہذیان اور بے سر و پا ہے تو اُسکی اشاعت بجائے مفید ہونے کے سخت مضر ہوگی۔

ڈارون نے جو نظریہ قائم کیا ہے وہ محض ذہنی ہے بدیہیات سے اُسکو کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ یا اُسکے ہم خیال ابھی تک کوئی ایسا کلیہ قائم نہیں کر سکے جس سے ارتقا کا دور ہمیشہ جاری ہونے کا ثبوت مل جاتا۔

اگر ڈارون یہ نظریہ قائم کرنے سے پہلے تاریخ سے مدد لیتا یا یہ کہ خود ہی کوئی فرضی تاریخ تصنیف کرکے اس بات کا ثبوت پیش کر دیتا کہ فلاں ملک میں بندر نے ارتقا کے ذریعہ سے نوع انسانی حاصل کی تب بھی اس زمانہ کے انسانوں کو اسکی تھیوری کے سمجھنے میں کچھ مدد مل سکتی تھی لیکن تاریخ بالکل خاموش ہے۔ اُس سے ہرگز پتہ نہیں چلتا کہ ارتقا کا دور کس وقت میں ہُوا تھا۔

جن لوگوں کو خدا نے عقل سلیم دی ہے وہ ہرگز اس کلیہ کے ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ چنانچہ پروفیسر وِرکو جرمنی نہایت ممتاز نوع انسانی اپنے لکچر واُستاد برلن کی انجمن تحقیقات میں اس امر پر خاص روشنی ڈالتے ہوے کہتا ہے کہ "ڈارون کے مقلد اسے ثابت کرنے میں کامیاب نہیں ہوئے" پس جس حالت میں کہ ڈارون اور اُسکے مقلد آج تک بھی ثابت نہیں کر سکے کہ سب سے پہلا انسان کب اور کہاں نمایاں ہوا تھا تو یہ بات کیسے ماننے کے قابل ہو سکتی ہے کہ محض ارتقا کی بدولت انسان نے بندر کے قالب سے نکل کر یہ ہیئت کذائی اختیار کی ہے۔ یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ اگر بندر نے ارتقا حاصل کرکے جامۂ انسانی پہن لیا تو اُس نے اپنے حیوانی دماغ میں عقل اور زبان میں نطقِ انسانی کس طرح پیدا کر لی؟

ڈارون کا نظریہ محض اس بنا پر ہے کہ اُس نے بندر کو انسان سے بہت مشابہ پایا ہے اور وہ آفریقہ کے بندروں کو انسان سے بہت قریب خیال کرتا ہے۔ حالانکہ اگر ڈارون تاریخی، مذہبی معلومات و روایات کی طرف متوجہ ہوتا تو اُسے معلوم ہو جاتا کہ دراصل بندر سے انسان ہو گیا ہے یا انسان سے بندر بن گئے۔

مسلمانوں کی مقدس کتاب قرآن شریف میں یہ تذکرہ موجود ہے کہ بنی اسرائیل اپنی نافرمانی کی وجہ سے بندر بنا دیے گئے۔ اس مقدس شہادت سے یہ امر بھی پایۂ ثبوت کو پہنچتا ہے کہ بندر کی جنس پہلے سے موجود تھی کیونکہ انسان کو مسخ کرکے بندر کر دیا گیا۔ اور یہ بھی نتیجہ نکلتا ہے کہ وہی بندر آفریقہ کے جنگلوں میں رہتے ہوں یا اُنکی نسل میں افریقہ کے بندر ہوں اور اس لیے اُن بندروں میں انسانی عادات پائے جاتے ہوں جس سے ڈارون کو دھوکا ہوا کہ بندروں میں خلقتاً و فطرتاً انسانی خصائل موجود ہیں اور اسی لیے وہی ارتقا کے ذریعہ سے انسان بن گئے ہیں۔

ڈارون نے تو اپنی جدت طرازی کی دُھن میں تاریخِ عالم پر نظر ڈالنے کی تکلیف گوارا نہیں کی۔ البتہ جنگلوں کی خاک چھان کر بندروں کی تحقیقات میں انہماک رکھا۔ اور سب سے زیادہ استدلال ارتقاء انسانی ساختِ دماغ

کو قرار دیا۔ حالانکہ جب افریقہ کے بندر مسخ شدہ انسانوں کی نسل سے خیال کیے جائیں تو اُن کے دماغ ضرور مثل انسانوں کے ہوں گے۔ لیکن مقلدینِ ڈاروِن کو کیا ہُوا جنھوں نے تاریخی حالات معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی اور آنکھ بند کرکے ڈاروِن کے نظریہ پر ایمان لے آئے؟

اس سے زیادہ ارتقا کی دوسری سیڑھی تغیر قرار دی گئی ہے اور نتیجہ یہ نکالا گیا ہے کہ جو جانور پہلے قوی الجثہ یا دوسری صورت کے ہوتے تھے ویسے اب نہیں ہوتے۔ لہذا ارتقا کے ذریعہ سے جانوروں نے دوسری صورتیں اختیار کی ہیں۔ یہ استدلال بھی عجیب و غریب ہے۔ کیا اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ باعتبار سلسلۂ توالد و تناسل پچھلی خلقت بہ نسبت اگلوں کے ہر طرح کمی کا درجہ پاتی ہے اس لیے اُن میں ضرور تدریجاً خفت ہونا چاہیئے۔ ہاں اگر یہ ہو جاتا کہ ہاتھی اونٹ اور اونٹ گھوڑا بنجایا کرتا تو کہا جاسکتا تھا کہ جانور نے تغیر کے ذریعہ سے دوسرا قالب اختیار کرلیا۔ مگر محض اس سے کہ اگلے زمانہ کے ہاتھی نہایت قدآور، جسیم و قوی الجثہ ہوتے تھے اور اب بہت ہی چھوٹے اور کم زور ہیں یا یں وجہ متغیر ہو کر ہاتھی نہیں رہے بہت ہی بے معنی دلیل ہے۔ یا یہ کہنا کہ پہلے جو جانور پیدا ہوتے تھے اب وہ نہیں رہے ہیں لہذا اُن جانوروں نے ارتقا کے مادّہ سے دوسرا ہی پیکر اختیار کرلیا ہے؛ صحیح نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ اس سے یہ صاف نتیجہ نکلتا ہے کہ قدرت یا مادّہ نے اُن جانوروں کو معدوم کرکے دوسری قسم کے جدید جانور بنا دیے۔ اگرچہ عامتہً یہ کلیہ کُل جانوروں پر صادق نہیں آتا۔ کیونکہ گائے، بھینس، گھوڑا، ہاتھی وغیرہ بہت سے ایسے جانور ہیں جو لا معلوم زمانہ سے اسی ہیئت پر چلے آتے ہیں۔ اس لیے جس قدر دلائل ڈاروِن اور اُنکے مقلدین نے قائم کیے ہیں ہرگز قابل تسلیم نہیں ہوسکتے۔ بلکہ مشاہدہ، عقل، تاریخ اور مذہب ان باتوں کو پورے طور پر رد کرکے خالقِ مطلق کی حکمت بالغہ کا اظہار کرتے ہیں کہ انسان و حیوان اور کُل مخلوقات کا پیدا کرنے والا وہی ایک حکیم مطلق ہے۔ کسی میں یہ طاقت نہیں ہے کہ وہ دوسری صورت اختیار کرے۔

محمد عبد الرحیم

کلامِ شاد

از ہز ایکسلنسی راجۂ راجایان مہاراجہ کشن پرشاد یمین السلطنت بہادر جی سی آئی ای

پھرے ہر سو مگر اجمیر کے دربار میں آئے	تھے جس سرکار کے بندے اسی سرکار میں آئے
بظاہر ہو ولی لیکن حقیقت میں خدا جانے	تمہاری مدحتِ والا کہاں گفتار میں آئے
اگر دربار میں خواجہؒ کے اکبی بار جائیں گے	کہینگے ہم یہی اے دل کہ کوے یار میں آئے
اُسی یوسف کے ہاتھوں ہمکو بس منظور بکنا تھا	اسی امید پر ہم چشت کے بازار میں آئے
زمانہ چھان ڈالا عمر گزری جستجو کرتے	بحمد اللہ آخر کو جیتے لدار میں آئے
مے توحید ملتی ہے اسی میخانہ میں ہشتو	مزا آتا ہے جب ہے چشت کے بازار میں آئے

تمنائیں ہماری شاد ہو جائیں گی سب پوری
معین الدین اجمیریؒ کے ہم دربار میں آئے

راجہ آرن

ایشیائی سلطنت میں جب سرزمین ہند کی عنانِ حکومت راجہاں مہاراجو کے قبضۂ اختیار میں تھی، راجہ آرن ایک بڑا مشہور، منصف مزاج، عالی دماغ خدا پرست، اور اپنے مذہب کا سچا حامی ہو گزرا ہے۔ تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ اس کے عہدِ حکومت میں لوگ اسکی بڑی قدر و منزلت کرتے تھے اور اسکی حکومت کو خدا کی رحمت خیال کرتے تھے۔ یہ راجہ اپنے مذہب کی پابندی کے باعث راجگانِ جلیل القدر میں بہت ہی معزز، موقر، اور ہر دل عزیز تھا بلکہ اُن راجگانِ ہند میں جن کی حکومت اس سے بدرجہا افضل تھی، یہ ہمیشہ ممتاز اور سر بلند سمجھا گیا۔ چونکہ وہ دینی اور دنیاوی دونوں امور میں یکساں دلچسپی لیتا تھا، اس لیے اُس کی محبت اور وفاداری کا اثر ملک کے ہر طبقہ میں یکساں تھا۔

اُس کے زہد و تقوٰے اور خدا ترسی کی مثال باوجود سلطنت او رحکومت کے تاریخی دنیا میں بہت کم ملے گی۔ رات کو گشت کرنا، یتیموں اور مصیبت زدوں کی مدد کرنا، فقیروں مسکینوں کی دل جوئی کرنا، رہزنوں اور بدمعاشوں کی تنبیہ اور سرکوبی کرنا، اُسکے اوقات منضبطہ کا پہلا جزو تھا۔ وہ اکثر بھیس بدل کر فقیرانہ لباس میں اِن کاموں کو انجام دیتا، اور چونکہ وہ ان کاموں کو فرضِ عین سمجھتا تھا، اس لیے اسکے حسب خواہش انجام پانے سے اُسے روحانی خوشی حاصل ہوتی۔ وہ رات کے وقت اپنے محل کے ایک کونے میں بڑے عجز و انکسار کے ساتھ خدا سے اپنی غفلت اور بھول چوک کی معافی مانگتا، اور اپنے فرائض سے ہوشیار اور سبکبار ہونے پر تہِ دل سے خدا کا شکریہ ادا کرتا۔ اس کی عادت تھی کہ رات کو صرف دو گھڑی آرام کر کے علی الصباح اُٹھتا، غسل کر کے خلوصِ نیت سے پوجا پاٹ میں مصروف ہو جاتا، آٹھ بجے دن تک اسی طرح اپنے خالق کی پرستش کا حق ادا کیا کرتا، اس اثنا میں کسی دوسرے کام کی طرف (خواہ وہ کتنا ہی عظیم الشان کیوں نہو) ہرگز متوجہ نہ ہوتا تھا۔ اس نیک نہاد راجہ کو اپنے ملک کے مدارس و معابد کی طرف خاص توجہ تھی۔ ارباب علم و فضل کی تعظیم، علوم و فنون کے موجدوں اور علم کی ترقی چاہنے والوں کی قدر دانی اُسکی فطرت میں داخل تھی۔ ذی علم برہمنوں کی بڑی عزت کرتا، اور ہمیشہ اُنکی خدمت گزاری کو فخر سمجھتا۔ وہ خود بھی ایسا عقیل و فہیم تھا کہ بڑے بڑے راجہ مہاراجہ اُسکی ترکیبوں اور اصولوں کو اپنا دستور العمل بناتے اور اُسکے اخلاقی اور تمدنی خیالات سے سبق لیتے تھے۔

یہ وہی زمانہ تھا جسکی نسبت مشہور ہے کہ اُس وقت ہندوستان میں ایسی خوش حالی اور فارغ البالی تھی کہ اگر شارع عام پر کسی کا ایک رومال (خواہ اور کوئی شے) گرجاتا تو وہ مدتوں پڑا رہتا۔ کوئی شخص اُسکی طرف آنکھ اُٹھا کر نہ دیکھتا۔ اس راجہ کے ملک میں اخلاقی جرم کی سزا خصوصیت کے ساتھ سخت رکھی گئی تھی۔ اسکی رعیت پروری، انصاف پسندی، اور جود و سخا نے خاص و عام کے دل پر اُسکی بڑائی کا سکہ بٹھا دیا تھا۔ اور دُور دُور تک اسکی شہرت پھیل گئی تھی۔

اس نیک بخت راجہ کے گھر میں مدت دراز تک کوئی اولاد نہ ہوئی۔ وہ جب اس بات کو خیال کرتا تو دل مسوس کر رہ جاتا۔ او وہ خدا کی مرضی پر صابر و شاکر تھا، اس لیے اُس نے کبھی اس رنج سے بے چین ہو کر ہائے وائے نہیں کی۔ نہ کبھی اپنی تقدیر کی شکایت زبان پر لایا۔ البتہ اپنے ایشور کو یاد کرتا، اور اُسی سے اپنی حالت عرض کرتا۔ وہ اولاد سے محروم رہنے کو اپنے کسی گناہ کی سزا سمجھتا، اس لیے وہ اُن پنڈتوں اور خدا پرستوں کو جو اسکے راج کے وظیفہ خوار تھے، اکثر بلا کر اُن سے دعائے نیک کا طالب ہوتا اور دعائے عفو تقصیر کی التجا کرتا تھا۔ اسکی تمام رعایا اسکے لیے تہِ دل سے دعا کرتی تھی کہ اسکے گھر اولاد ہو۔ اکثر لوگ اس مطلب

کے لیے اپنے اپنے مکانوں میں چلہ کشی کیا کرتے تھے۔ بالآخر خدا کی مہربانی نے اُسکی امید پوری کی، اُسکی آرزو کا پودا ہرا بھرا ہوا، یعنی اُسکے گھر میں ایک جیتا جاگتا، خوب صورت بیٹا پیدا ہوا۔ اس لڑکے کا نام ستیہ برت رکھا گیا۔

ہم اُسکی پیدایش کی خوشی، دھوم دھام، اور شاہانہ رسوم کے متعلق یہاں کچھ لکھنا نہیں چاہتے، اور نہ ستیہ برت کی پرورش پرداخت اور تعلیم و تربیت کی بابت مضمون کو طوالت دینا مناسب خیال کرتے ہیں۔ صرف اسی قدر عرض کردینا کافی ہے کہ راجہ ارُن کی ذاتی قابلیت اور بلند خیالی نے اسے اٹھارہ برس میں سال ضروری علوم و فنون کے زیور سے آراستہ و پیراستہ کردیا۔ اسکے بعد تین سال تک اور بھی اپنی خاص نگرانی میں رکھکر سلطنت کے متعلق خاص خاص باتیں بتائیں۔ پھر اُسے ایک صوبہ کی گورنری پر ممتاز کیا۔ اِس شہزادہ کو ریاست اور حکومت کے باب میں ایک قدرتی ملکہ حاصل تھا۔ تھوڑے ہی دنوں میں اُس صوبہ کی حالت کچھ سے کچھ ہوگئی، خوش حالی کا پایہ آسمان پر پہنچ گیا، ہر جانب غیرمعمولی رونق پیدا ہوگئی۔

راجہ ارُن کے دل کی مسرت کا حال نہ پوچھیے! اس ہونہار لخت جگر کی روز افزوں ترقی دیکھ کر پھولا نہ سماتا تھا۔ مگر صد آفریں اسکی متانت اور عالی ظرفی پر کہ اس نے ستیہ برت کے عمدہ خصائل اور پسندیدہ اطوار کو کبھی اپنی تعلیم و تربیت پر محمول نہ کیا، بلکہ صرف خدا ہی کی طرف اسکی نسبت کی۔ واہ رے عارفانہ خیال!

(اب تصویر کا دوسرا رُخ بھی ملاحظہ ہو)

راجہ ارُن نے اُسکو پورے سات سال تک منصب گورنری پر بحال رکھکر ولی عہدی کے خلعت سے سرفراز کیا۔ مگر یہ وہ زمانہ تھا کہ شباب کی اُمنگیں جوش پہ تھیں۔ رقص و سرود کی صحبتیں (رباب سے مخفی) ہونے لگیں۔ اسکے مزاج میں خودی اور آزادی آگئی۔ چند ناعاقبت اندیش دوستوں نے اُسکے خیالات اس طرح بگاڑے کہ وہ باپ کی جانب سے بے خوف ہی نہیں ہوا بلکہ سخت ناراض اور آزردہ خاطر بھی ہوگیا۔ اُف ری صحبتِ بد تیرا بُرا ہو!

غرض کچھ ایسی کایا پلٹ ہوئی کہ وہی لڑکا جسکی خوبیوں کا ذکر ابھی آپ سُن چکے ہیں! ایک عیاش مزاج اور آوارہ ترین شمار ہونے لگا۔ راجہ کو اسکا جو کچھ صدمہ ہوا، وہ ناقابل بیان ہے۔ اُسکی ساری آرزوؤں کا خون ہوگیا۔ اُسکی ساری امیدیں خاک میں مل گئیں، بیٹے کی خبریں سُن سُن کر اُسے روحانی صدمہ ہونے لگا۔ اور اسی صدمۂ روح فرسا سے وہ لحظہ بلحظہ نحیف و نزار ہونے لگا۔ رعایا کو جیسی خوشی اور آزادی حاصل تھی، اب اُسکے برعکس اپنی آبرو، عزت بچانے کی فکر پڑ گئی، طوائف الملوکی کے آثار نمایاں ہوے۔ بدعملی چاروں طرف پھیل گئی۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ولی عہد کی ایک ناگفتہ بہ خبر ایک معزز اور شریف گھرانے کی لڑکی کے متعلق مشہور ہوئی۔ اور یہ خبر تحقیق کے ساتھ راجہ کے حضور میں پہنچائی گئی۔ اُس منصف مزاج راجہ نے اپنے اصول و آئین کے مطابق ولی عہد کو جلاوطنی کی سزا دے دی۔ اور حکم ناطق مشتہر کردیا کہ "ستیہ برت ہرگز شرفا کے ساتھ آبادی میں رہنے نہ دیا جائے"۔ ایسی سزا کو سنسکرت زبان میں "پاگنت" کہتے ہیں، اور اُس عہد میں ایسے جرم کی یہی سزا مقرر تھی۔

ستیہ برت ایک مدت تک صحرا نوردی کرتا رہا۔ چونکہ چند روز کے بعد اسکا نشۂ غفلت اُتر چکا تھا، اس لیے وہ اپنے ہم صحبت احباب کے اغوا پہ اشک ندامت بہاتا اور دل ہی دل میں نہ جانے کیا کیا باتیں سوچ کر ٹھنڈی آہیں بھرا کرتا۔ بعض وقت وہ اپنے دل میں مرجانے کی ٹھان لیتا اور اسے اپنے ظلم و طغیانی کی سزا تصور کرتا۔ مگر پھر کچھ سوچ سمجھ کر اِس ارادۂ فاسد سے باز رہ جاتا۔ جس مصیبت میں اُسکی دردناک زندگی گزر رہی تھی، وہ اُسکی اگلی پچھلی باتیں یاد دلانے کے لیے کافی تھی۔ وہ اپنے پچھلے کارناموں پر غم کے نوحے کرتا، اور خدا سے اپنے قصوروں کی معافی مانگتا، اور رات دن اپنے معبود کی پرستش میں مصروف رہتا تھا۔

ایک مدت کے بعد رفتہ رفتہ اسکی خبر راجہ ارُن کو ہوئی۔ اُس نے اپنے دربار کے امیروں وزیروں سے صلاح لے کر ستیہ برت کو اپنے پاس بلا لیا اور پچھلی خطاؤں کی معافی دی۔ راج گدی اسکے حوالہ کی اور آپ گوشہ نشین ہوگیا۔ جس وقت راجہ ارُن نے اپنے پیارے اکلوتے بیٹے کو راج گدی سپرد کی یہ چند نصیحتیں اُسکو کیں جو فی الحقیقت صلاح و فلاحِ دارین کے لیے کافی ہیں :-

(۱) لے بیٹے! ہمیشہ اپنے علم اور عقل کو اپنے کاموں کا رہبر بنانا۔

(۲) ہر کسی پر اعتماد نہ کرنا۔

(۳) دوست اور دشمن کی پوری جانچ کرنا۔

(۴) ذی علم لوگوں کو اپنا مشیر کار بنانا۔

(۵) خدا کے پہچاننے والوں کی عزت کرنا۔

(۶) وید پڑھنے والے باعمل برہمنوں کی تعظیم فرض جاننا اور خبردار! اُنھیں ناراض نہ کرنا۔

(۷) کسی سائل کا سوال رد نہ کرنا مگر جاہل گداگروں کو زیادہ مت دینا۔

(۸) کبھی دھرم کی حد سے باہر قدم نہ رکھنا۔

(۹) لالچ اور بُری خواہشوں سے دھرم کو ناپاک نہ کرنا۔

(۱۰) گھر دم بستر خواب سے اُٹھنا ضروریات سے فارغ ہو کر ایشور کی پرستش کرنا۔

(۱۱) خدا سے ہمیشہ ڈرنا۔

(۱۲) ہمیشہ بموجب دھرم شاستر کے معاملات کا فیصلہ کرنا۔

(۱۳) کسی معاملہ میں بے پروائی یا جانبداری یا نامناسب رعایت کو دخل نہ دینا۔

(۱۴) انصاف کو ہر حالت میں پیش نظر رکھنا۔

(۱۵) رعایا کی حفاظت مستعدی سے کرنا اور ان سے مناسب مالگزاری لینا۔

(۱۶) بدمعاشوں، چوروں، اور رہزنوں کی بیخ کنی میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرنا۔

(۱۷) معقول اور معتبر ذرائع سے حالات و واقعات ملکی سے خبردار ہوتے رہنا۔

(۱۸) ہمیشہ فضول گوئی سے نفرت رکھنا۔

(۱۹) صحبت بد کو زہر قاتل سمجھنا۔

(۲۰) شراب خواری سے پرہیز کرنا اور اپنی رعایا کو بھی شراب خواری سے بچانا۔

(۲۱) خزانہ بہ حفاظت اکٹھا کرنا مگر خلاف حق ایک پیسہ بھی رعایا سے لے کر خزانہ میں نہ رکھنا۔

(۲۲) غریبوں، یتیموں، بیکسوں، اور غریب الوطنوں کی مدد کرنا۔

(۲۳) رعایا کو اپنی اولاد کے برابر جاننا۔

فی الحقیقت یہ وہ نصیحتیں ہیں جن سے ہمارے ہندوستان کے راجاؤں مہاراجوں کے اصول اور خیالات کا پتہ چلتا ہے اور یہ انھیں خیالات کا کرشمہ تھا کہ سیکڑوں بلکہ ہزاروں صدی بعد تک ہندوستانی بادشاہتیں ایسی عزت اور وقعت کے ساتھ قائم رہیں۔ راجہ ارُن کی ایک ایک نصیحت فوائد سے پُر ہے اور یہ وہ باتیں ہیں جنھیں طلائی حرفوں سے لکھا جائے تو زیبا ہے۔ اخلاق، تمدن، تہذیب، بلکہ مذہب کے کُل فلسفے انھیں چند نصائح کے اندر موجود ہیں۔

الغرض راجہ ارُن، ہندوستان میں ایک غیر معمولی صفات کا راجہ ہُوا ہے۔ جس کے واقعات زندگی میں بادشاہت اور صوفیت دونوں رنگ نہایت خوشنمائی کے ساتھ ملے جُلے نظر آتے ہیں۔

اقرار (عظیم آبادی)

بی ممتازی خانم

حضرت محمد واجد علی شاہ بہادر کے زمانہ میں لکھنؤ پرستان بنا ہوا تھا۔ ان دنوں رات ہُن برستا تھا۔ جو لوگ لکھوں سے خالی ہاتھ آتے، لکھنؤ سے بھرے پُرے جاتے تھے۔ بی حیدری خانم زنانی ڈیوڑھی کی چٹھی نویسنی تھیں۔ سارا عملہ انکے اختیار میں تھا۔ انّا، دوا، ماماؤں کی تنخواہیں انھیں کے ہاتھ سے تقسیم ہوتی تھیں۔ کچھ دنوں بعد محل کی نوکری چھوڑ کر گھر میں بیٹھ رہیں۔ نواب مخدرہ عالیہ نواب خاص محل کو بہت رنج ہُوا کہ ایسی دیانت دار پابند صوم وصلوٰۃ، نیک طینت، پڑھی لکھی عورت اب ملنا مشکل ہے۔ دست قلم عورتوں کا تو ہندوستان میں کال ہے۔ مگر بی حیدری خانم مجبور تھیں اسلیے کہ ان کے شوہر بہت بیمار تھے اور مرض روز بروز زیادہ ہوتے جاتے تھے۔ میاں بیوی میں بہت محبت تھی۔ کاظم علیخاں ان کے شوہر بہت نیک مزاج اور پُرانی وضع کے آدمی تھے۔ باپ دادا کی جائداد تلف کر چکے تھے۔ آپ عدالت دیوانی کے منشیوں میں ملازم تھے۔ بیس روپے ماہوار تنخواہ ملتی تھی لیکن شاہی کا زمانہ تھا۔ تنخواہ سے دس گُنا مل رہتا تھا۔ کاظمین کے قریب عالی شان مکان تھا اور دولت مندوں میں انکا شمار تھا۔ بیوی نے بھی کچھ کم روپیہ نہ کمایا تھا۔ اب انکو نوکری کی پروا نہ تھی۔ خود گھر میں نوکر چاکر موجود تھے۔

ایک میاں اور ایک بیوی صرف دو دم اور اس قدر دولت! بیوی نے دل کھول کر علاج کیا اور شہر کے نامی حکیموں کو بلوایا۔ آخر حکیم مرزا محمد علی مرتعش کا علاج راس آیا اور انھیں کی دوا سے خدا نے صحت دی۔ اسی مدت میں خدا کی قدرت سے بیوی کو پیٹ ہو گیا گویا سوکھے دھانوں پانی پڑا اور نو مہینے کے بعد لڑکی پیدا ہوئی جس کا نام ممتازی خانم رکھا گیا۔ ماں باپ دونوں کو بہت خوشی ہوئی اور لڑکی کی پرورش بہت اچھی طرح ہونے لگی۔ جب لڑکی سات برس کی ہوئی تو باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ خاں صاحب کچھ ایسے بیمار نہ تھے جس سے گمان ہوتا کہ اتنے جلد مر جائیں گے ابھی ایک مہلک مرض سے اچھے ہو چکے تھے اور بہت توانا و تندرست تھے دفعتہً بخار آنے لگا۔ اسکے بعد سرسامی حالت ہو گئی۔ بہت کچھ حکیموں نے ہاتھ پاؤں مارے لیکن قابو نہ چلا اور جمعہ کے دن صبح کو انتقال کیا۔ حیدری خانم نے انکا مرنا بہت دل کھول کے کیا۔ اور چہلم میں خاں صاحب کی ساری چیزیں کپڑے، رومال، دوشالے، اچھا خاصہ جہیز، کئی ہزار کا اسباب انکے نام مسجد کے مُلّا کو خیرات میں دے دیا۔ سال بھر تک برابر رونا پیٹنا رہا آخر صبر کر کے بیٹھ رہیں۔

ممتازی خانم سات برس کے سن سے ہمیشہ پڑھنے لکھنے میں رہتی تھی اور سینے پرونے کا ایسا شوق تھا کہ گیارہ برس کے سن میں بہت مشاق ہو گئی۔ قطع برید میں ہاتھ بہت رواں تھا۔ بیونتنے کی راہ خوب جانتی تھی زنانے مردانے کپڑے، گوکھرو، بنت، چٹکی، گوٹ، مغزی، کارچوبی، کلابتونی کام، چکن، کام دانی سب جانتی تھی۔ سب طرح کے کھانے پکانا آتے تھے عمدہ عمدہ مربے، تحفہ تحفہ اچار بنا لیتی تھی۔ خوش نویسی میں ماں سے کم نہ تھی۔ صورت بھی اچھی تھی اور بات چیت بھی عقل مندی کے ساتھ تھی ملنسار ایسی تھی کہ ہر بی بی کو اسکی باتوں میں مزا ملتا تھا۔ چال ڈھال چھب تختی ہزاروں میں ایک تھی۔ کم سن لڑکیاں ہر وقت جمع رہتی تھیں۔ ہمجولیوں کو کہانیاں سنایا کرتی تھی لیکن کہانیوں میں بھی نصیحت کی باتیں ہوا کرتی تھیں۔ کھانا پکانے کی کتاب "خوان نعمت" کھولی اور بہت سی باتیں اُسکی غلط بتائیں۔ نئی نئی ترکیبیں کھانوں کی ایجاد کیں۔ دسوں اُنگلیاں دسوں چراغ تھیں۔ ماں کا دل ہر وقت باغ باغ رہتا تھا۔ ماں نے بھی اُسکو اردو کی کتابیں گھول کر پلا دی تھیں۔ قرآن شریف فر فر پڑھتی تھی۔ بعض عربی جملوں کا ترجمہ بھی کر لیتی تھی۔ فارسی کی ابتدائی کتابیں

بخوبی پڑھا سکتی تھی۔ جاہل عورتوں کی طرح بد مزاجی، خود ستائی کی ان میں بو بھی نہ آئی تھی۔ عموماً لڑکیاں کم سنی سے پان کھانا شروع کرتی ہیں مگر ممتازی کو اس سے کچھ نفرت سی تھی۔

اب ماں کو یہ فکر تھی کہ کہیں اچھے خاندان سے بات چیت آئے جو دال روٹی سے خوش ہوں اور نیک اطوار پڑھے لکھے ہوں تو اس کے دو بول کر دوں۔ رات دن یہی دعا تھی کہ ممتازی خانم کی خانہ آبادی ہو۔ سہرے کے پھول کہیں جلد کھلیں۔ ہم بھی اپنی زندگی میں انکو خوش حال دیکھ لیں اور جو خدا نخواستہ ہم نہ ہوے تو انکی بڑی خرابی ہو جائیگی۔ آج کل کے عزیز یزید سے بدتر ہیں۔ آنکھ بند ہوتے ہی گھر گرستی کھسکا دینگے اور دائی بندی کو گھر سے نکال دینگے۔

تمام شہر میں ممتازی کی ہنرمندی اور سلیقہ شعاری مشہور تھی۔ دُور دُور سے پیام سلام آنے لگے۔ روز ایک نئی مشاطہ آتی تھی۔ اونچے اونچے گھروں سے نسبت کے رقعے آنے لگے۔ حیدری خانم حیران تھی کہ کیا کروں کوئی مرد گھر میں نہیں ہے جو بات چیت کرے لڑکے کا چال چلن دریافت کرے۔ ذات پات پوچھے۔ صورت شکل دیکھے۔ حسب نسب کا پتہ لگاؤں میں عورت ذات کیا کر سکتی ہوں۔ اسوقت میں کوئی عزیز ایسا نہیں جو اپنے کام آئے۔ اپنے طور پر اس نے بہت چھان بین کی مگر عورت ذات تھی مشاطہ کی چال کو نہ سمجھی۔ یہ قوم زمین آسمان کے قلابے ملانے میں مشہور ہے ایک پردہ دار عورت کو دم جھانسے میں لانا کتنا بڑا کام تھا۔ مردوں کے تو کان کاٹتی ہیں۔ جہاں سے انکو چار پیسے زیادہ ملنے کی امید ہوتی ہے اُسی کی سب سے زیادہ تعریف کرتی ہیں۔ آخر ایک نسبت بی حیدری خانم کو پسند آئی۔ دولھا والوں کی طرف سے جلدی ہونے لگی۔ نکاح کی تاریخ ٹھہر گئی۔ برات آئی۔ جب دولھن گھر سے رخصت ہونے لگی تو ماں کی روتے روتے حالت غیر ہو گئی۔ سب بیبیاں آبدیدہ ہوئیں۔ جتنی ہمجولیاں تھیں اُنکی روتے روتے ہچکی بندھ گئی۔ ڈومنیاں بداگی (وداعی) گا رہی تھیں۔

نگوڑی ماں کی ایک ہی بیٹی تھی۔ خوب جی کھول کر حوصلہ نکالا۔ اپنے مقدور سے زیادہ دیا۔ کھانے جوڑے کے پانسو روپے دیے۔ چاندی کا پلنگ، کارچوبی پلنگ پوش، اوقچہ، تکیہ، چادر، لحاف، سیج بند، جوڑے بھاری بھاری پُرزر، سر سے پاؤں تک سونے کا زیور، پاندان، پچوگھڑ، اُگالدان، جوڑ چاندی کے حُسن دان، خاص دان، گڑگڑی، اگال دان، چھپرکھٹ چاندی کا، مسند تکیہ، دوشالہ، چاندی کے ساز سمیت گھوڑا۔ سلامی پانسو روپے، سمدھن کو نفیس جوڑا۔ تانبے اور چینی کے برتنوں کی تو انتہا نہ تھی۔

جب لڑکی رخصت ہونے لگی تو ساس نے داماد سے رو کر کہا "واری میرے پاس کچھ دھن دولت نہیں ہے۔ میری کمائی یہی بچی ہے۔ یہی میری زندگی کا سہارا ہے۔ تم سے ہاتھ جوڑ کر کہتی ہوں میری بچی بہت نازوں کی پالی ہے اس کا دل نہ توڑنا۔ میں واری جاؤں یہ کبھی تمھارے خلاف نہ کرے گی۔ بد مزاجی سے اسکو معاف رکھنا۔ ماشاءاللہ پڑھی لکھی ہے تم کو اسکے ساتھ آدمیت سے پیش آنا چاہیے۔ میری عزت تمھارے ہاتھ۔ مُنہ دُھلانے کو لونڈی دیتی ہوں"۔ دولھا ساس کے آگے ہاتھ باندھ کر کہنے لگا "میری مالک ہیں اور مختار ہیں۔ میں ان کا ہمیشہ تابعدار رہوں گا اگر میری کھال کی جوتیاں بنوائیں گی تو بھی مجکو عذر نہ ہوگا"۔

ساس نے خوش ہو کر چٹ چٹ بلائیں لیں اور کہا بیٹا میں نثار میں واری یہ سہاگ ہمیشہ ہمیشہ قائم رہے۔ تم سے بیاہ کر اسکے بھاگ جاگ گئے۔ الٰہی! تمھاری سیکڑوں برس کی عمر ہو۔ جیتا بنا نصیب۔ دشمنوں کا بال بیکا نہ ہو۔

جب سلامی ہو چکی دُلھن سکھپال میں سوار ہوئی زار و قطار رو رہی تھی۔ پہلے جہیز نکلا۔ بہوڑے کا کھانا ساتھ ساتھ تھا۔ جب دُلھن دولھا گھر پر آئے ساس کو سب نے مبارکباد دی۔ ساس نے پہلے بلائیں لیکر بہو بیٹے کو دعائیں دیں۔ دونوں پر سے وار کر پانی پیا۔ چوتھی چالوں

سے فرصت ہوئی تو گھر گرہستی دیکھنے کی نوبت آئی۔ دلھن نے آنکھ کھول کر دیکھا تو سسرال بالکل مفلس ہے۔ ایک ٹوٹا پھوٹا مکان ہے جسکی دیوار چاروں طرف سے گری ہوئی ہے۔ چھتوں کی دھنیاں کمان ہو رہی ہیں۔ برسات میں انگنائی اور دالان ایک ہو جاتا ہے۔ چھانپ کے بدلے چٹائیاں چھت میں پڑی ہیں۔ ایک دالان ہے اسی میں باورچی خانہ ہے اسی میں آبدار خانہ ہے اسی میں غسل خانہ ہے اسے میں بڑی بی کے رہنے کا ٹھکانا ہے۔ بغل میں ایک صحنچی ہے جس میں ممتازی خانم کا چھپر کھٹ لگایا گیا ہے۔ ساس ایک سیدھے مزاج کی عورت اُسکو کچھ بُرے بھلے سے مطلب نہیں۔

سرفراز علیخاں شوہر نشہ باز افیونی اور مدکیا ہے نہ کچھ پڑھا نہ لکھا نرا جاہل۔ اچھے لوگوں کی صحبت سے نفرت کاہلی اور جاہلی نے پلنگ پر پڑے پڑے روٹی کھانے کا خوگر بنا دیا تھا۔ محنت سے پیسہ کمانے کی فکر مطلق نہ تھی۔ کسی وقت میں پڑدادا کے زمانہ کی گلی گھر جن تھی وہ گھر میں بیٹھے بیٹھے کھا چکے تھے۔ اب جہیز پر دار و مدار تھا۔ گھوڑا تو گھر پہ بندھنا نصیب نہ ہوا اوپر اوپر بک گیا۔ جہیز بھی آہستہ آہستہ کھسکنے لگا۔ کچھ چنڈو باز افیونی آتے تھے وہی پیسے کی چیز دمڑی کو بیچ لاتے تھے۔ ممتازی خانم کو اس بات کا بہت ملال تھا لیکن کیا کر سکتی تھی۔ کچھ بولتی ہے تو عمر بھر کا ساتھ چھوٹتا ہے۔ اسی غم میں گھلی جاتی تھی مگر دانشمند ایسی تھی کہ ذرا بھی چہرے پہ میل نہ آنے دیا۔ خاوند سے بہت خندہ پیشانی سے بولتی بات کرتی اور اُسکا دل ہر وقت ہاتھ میں لیے رہتی۔

اُس نے فیصلہ کر لیا کہ جو کچھ ہماری قسمت میں لکھا تھا وہی ہوا اب واویلا کرنے سے دونوں کی رسوائی اور تکا فضیحتی ہے۔ جوتیوں میں دال بٹی تو کیا فائدہ ہوا؟ بندھا ہوا خوب مار کھاتا ہے۔ رونے پیٹنے سے خاوند جاہل سے عالم نہیں بن سکتا۔ بلکہ اور دلوں میں نزاع پیدا ہو جاے گی۔ ابھی تک تو ہر طرح زندگی ہنسی خوشی سے کٹتی ہے عقلمندی اسی میں ہے کہ دنیا میں رسوائی نہ ہو اور چار آدمی الزام نہ دیں۔ اماں بیچاری کا بھی کوئی قصور نہیں۔ اُس غریب نے تو خوب چھان پھٹک کی مگر ان کمبخت کٹنیوں کے جال فریب میں اچھے اچھے مرد آ جاتے ہیں وہ تو عورت ذات تھیں۔ بظاہر سب طرح ٹھونک بجا لیا تھا ہم کو بھی معلوم تھا کہ ہم اچھے خاصے شریف رئیس عالی خاندان کے گھر جاتے ہیں۔ جو کچھ ہونا تھا ہو چکا اب تو زندگی بھر پاپڑ بیلنا پڑے۔ اگر اماں سن پائیں کہ میں اس مصیبت میں ہوں تو جیتے جی مر جائیں۔

کوئی بات ہو چھپی نہیں رہتی۔ ممتازی خانم نے قسم کھانے کو ایک حرف تک نہیں کہا لیکن شدہ شدہ سارا کچا چٹھا اہل محلہ نے بی حیدری خانم کے گوش گذار کیا۔ سنتے ہی چراغ پا ہو گئیں۔ اُسی وقت ڈولی میں سوار ہو کر سمدھیانے آ کودی۔ گھر کا وہی نقشہ تھا جیسا لوگوں نے بیان کیا تھا۔ غصہ سے تھر تھر سارے بدن سے کانپ رہی تھی۔ آخر نہ رہا گیا۔ کلیجہ سے شعلے اُٹھنے لگے اور برافروختہ ہو کر کہنے لگی۔ لوگو! یہی گھر تھا جس میں میری زندگی بھر کی کمائی دھن دولت موس لی گئی۔ ہے ہے! کیسے میری بچی کے کرم پھوٹ گئے تھے۔ اے بی سمدھن دیکھنے کی تو تم بھولی بھالی ہو مگر ٹھگنے کے فن تم کو خوب یاد ہیں۔ خوب کٹنیوں کو پڑھا پڑھا کر میرے گھر بھیجا۔ سال بھر تک دہلیز کی خاک لے ڈالی۔ نوج ایسا بیاہ ہوتا اس بے حیائی کو آگ لگے کوئی ایسا مکر کرتا ہے دیکھو تو اس جعل سازی کی میں کیسی سزا تم لوگوں کو دیتی ہوں۔ عدالت میں ٹنڈیاں نہ کسوائی ہوں تو سہی۔ اشراف زادوں کے یہی لچھن ہوتے ہیں۔ یہ بیل کیا منڈھے چڑھے گی۔ سارا جہیز ملیا میل کر دیا ایک ایک چیز ٹھکانے سے لگا دی۔ جوتی بھو سی کھا کر مجھ دکھیا نے ایک ایک کوڑی جمع کی۔ میری بچی نے خود سوئی مار کر آٹھ پہر آنکھیں پھوڑ کر مال جمع کیا۔ ساری پونجی یہی جہیز تھا۔ وہ اس طرح خاک سیاہ کیا جاتا ہے کیا یہ رونے کا مقام نہیں ہے کہ سارا جہیز افیون اور مدک میں برباد ہو رہا ہے؟ پانوؤں میں چھاگل تک نہیں رہی اے لو چاندی کی کوئی چیز باقی نہیں ہے۔ کس غضب کا شہد پن ہے۔ مردوے

کو شرم نہ آئی بی بی کے پائجامے دوپٹے نخاس میں بیچے۔ اور کوئی ہوتی تو میاں کو مزا چکھا دیتی میری بچی تو بالکل نوہی ہے۔ ہائے ہائے! بیچ والوں نے جُل دیا۔ اسی سے موئی کٹنیوں نے گھر گھیرا تھا۔ مجھ کمبخت ماری کو اس گھڑی کی خبر نہ تھی۔ میرا ستیاناس کر دیا۔ اگر عدالت نے میری فریاد سُن لی تو شہر میں رہنا مشکل ہو جائیگا۔ موئی کٹنی پر تو قیامت ٹوٹے گی۔ ناک چوٹی کاٹی جائے گی۔ کورے استرے سے سر مونڈا جائے گا۔ گدھے پر سوار کرکے شہر میں ہنڈوائی جائے گی۔ یہ کسی اور کا زمانہ نہیں ہے مرزا واجد علیشاہ بہادر کا عہد سلطنت ہے۔ سب کو چھٹی کا دودھ یاد آجائے گا۔ نام کو شادی ہوئی لیکن در اصل خانہ بربادی ہوئی۔ نوشہ بنے کے بھی سب ڈھنگ معلوم ہو گئے دن رات پینک میں پڑے رہتے ہیں۔ نوکری چاکری کیسی چارپائی کے بان توڑا کرتے ہیں۔ نہ پڑھے نہ لکھے جاہل لٹھ۔ محنت مزدوری سے شرماتے ہیں بات کرنے کا شعور نہیں۔ صحبت میں ردوے خدوے رزالے کمینے جمع رہتے ہیں سلامتی سے جو ادا ہے نرالی ہے۔ پوری بات تو کر نہیں آتی نوکری اور مزدوری کیسی۔ ایسوں سے تو کوئی بیچانے میں لوٹا بھی نہ رکھوائے۔

سمدھن نے جو یہ تقریر سنی مُنھ فق ہو گیا۔ شرم سے گردن جھکالی۔ پسینے میں ڈوب گئی۔ ہوش حواس جاتے رہے۔ بوٹی بوٹی کانپنے لگی۔

ممتازی خانم یہ حال دیکھ کر دل میں کہنے لگی لو غضب ہو گیا اماں کو تی رتی خبر ہو گئی۔ بھلا اُن کو ضبط کہاں۔ یہ ہمیں تھے جو کلیجہ مسوسے دکھ جھیل رہے تھے۔ مگر اب ان باتوں سے کیا فائدہ جو کچھ ہونا تھا ہو چکا۔ صحن چی سے اُٹھکر آئی اور کہنے لگی۔ بی اماں! آج تم کو کیا ہو گیا ہے جو اس قدر برہم ہو رہی ہو کسی کو الزام دینے سے کیا فائدہ؟ میری قسمت میں لکھا تھا۔ جو ہونا تھا ہو چکا اب چاہتی ہو کہ سارے شہر میں رسوائی ہو۔ نا بی اپنی بدنامی مجھے منظور نہیں ہے۔ اب ان باتوں میں کیا دھرا ہے۔ تم نے تو اپنے نزدیک کوئی بات اُٹھا نہیں رکھی میں بھی تمھاری بیٹی ہوں جس طرح ہو گا مصیبت جھیلوں گی۔ میں یہ ضرور کہتی ہوں کہ تم کو کٹنیوں نے دھوکا دیا اور زمین آسمان کے قلابے ملائے۔ اب اِن کے آگے کوئی ایسی بات نہ چلے۔ مجکو تو انھیں سے کام ہے۔ بُرے ہوں یا بھلے۔ سنگ آمد سخت آمد آدمی کو ہر مشکل کا مقابلہ کرنا چاہیے۔ یہ میں جانتی ہوں کہ اِن کو اتنا مقدور نہیں ہے کہ روٹی کپڑا دے سکیں مگر اسکے ساتھ ایک بات شکر کی ہے کہ بد مزاج نہیں ہیں۔ ہر طرح میرے تابعدار ہیں۔ میں اکثر جان جان کر اِن کے آزمانے کو بگڑ بگڑ کر لڑتی ہوں مگر وہ بندۂ خدا کبھی میرے آگے ہونٹ نہیں کھولتا اور کوئی بات بڑھ کر نہیں کہتا۔ جس کی برائی کہنا چاہیے اُس کی اچھائی بھی ضرور بیان کرنا چاہیے۔ تم انھیں باتوں کو غنیمت سمجھو اور خدا کا شکر بھیجو۔ تم کیوں بیتاب ہو کر چلی آئیں۔ نگوڑا مال اسباب صدقے کیا تھا ہماری تقدیر میں عیش ہے تو وہی عیش بھی کرائیں گے وہ کما کر لائیں گے اور ہم بیٹھے بیٹھے کھائیں گے۔ اور محنت مزدوری کو میں کیا کم ہوں۔ میں تو کہتی ہوں وہ خوش مزاجی سے رہیں تو اُنکو روٹی کپڑا میں بیٹھے بیٹھے دے سکتی ہوں۔ مال کیا چیز ہے۔ آدمی کی زندگی عیش و آرام سے گزرنا چاہیے۔ میل ملاپ سے رہیں ہنسی خوشی سے دن کٹیں یہی لاکھوں روپے ہیں۔

بی حیدری خانم بیٹی کی باتیں سنکر باغ باغ ہو گئیں اور کہنے لگیں اب میری خاطر نشان ہو گئی۔ خدا کرے تم دونوں ہمیشہ شاد آباد رہو۔ رنج و ملال اور نکا فضیحتی کے ساتھ اگر عیش بھی ہُوا تو کس کام کا۔ اتفاق اور ملنساری کے ساتھ دُکھ بھی کٹ جاتا ہے۔ کسی کا درد دُکھ کوئی ٹال نہیں سکتا۔ روٹی دینے والا تو اللہ ہی ہے۔

ساس نے جب بہو کی گفتگو سُنی تو سمدھن کے سامنے اُسکی چٹ چٹ بلائیں لینے لگی۔ ہاتھ جوڑ کر کہنے لگی میں واری تم اپنا دل بھاری نہ کرو۔ مجکو اپنے بیٹے سے تم سوا ہو۔ جو کچھ دال دلیا میسر ہو گا پہلے تم کو کھلا لونگی پھر میں کھاؤں گی میں یہ نہیں کہتی کہ میرا لڑکا اچھا ہے لیکن شریف زادہ ہے۔ باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ کوئی سرپرست نہ رہا جسکے دباؤ میں رہتا اور تعلیم پاتا۔ بُری صحبتوں میں بیٹھ کر نشہ پانی میں پھنس گیا۔ میرے پاس جو کچھ تھا یہی ایک لڑکا ہے سب بیچ بیچ کر کھلا دیا۔ اب ایسی بات کرو جس میں گھر بدنام نہ ہو۔ میں تو اب تمھاری

زندگی بھر کی لونڈی ہوں اور وہ بھی اگر شریف ہے تو تمھاری تابعداری سے باہر نہ ہوگا۔

بی حیدری خانم تو اپنے گھر چلی آئیں۔ شام کو سرفراز علیخان اپنے گھر آئے۔ ان کو سب خبر باہر مل چکی تھی۔ بہت اُداس تھے۔ چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں سارا نشہ کرکرا ہوگیا تھا۔ بھوک پیاس کہاں تھی اسی غم کے مارے کھانا بھی نہیں کھایا اور منہ لپیٹ کر پڑ رہے۔

ممتازی خانم نے مُسکرا کر مزاج پوچھا اور کہا معلوم ہوتا ہے آج کچھ نشہ پانی نہیں ہُوا۔ اب میں سمجھی تم کو کچھ روپے کی فکر ہے۔ بھلا اسکا چھپانا کیا تھا آخر یہ سب زیور کس کا ہے؟ بجلیاں اور کنگن اُتار کر سامنے رکھ دیے اور کہا لو شوق سے اپنا کام نکالو۔ تمھارے دشمن تشویش کریں۔ تم گھبراؤ نہیں میں زندہ ہوں تو روٹی پانی اور نشہ کی فکر تم کو نہ ہونے دونگی۔ خاں صاحب نے کہا سچ تو یہ ہے کہ میں تم سے بہت شرمندہ ہوں اور درحقیقت تمھارے احسان اس قدر ہیں کہ جن کو میں زندگی بھر نہیں بھول سکتا۔ ایسی نیک بیوی کسکو ملتی ہو۔ تم نے میری بہت خاطر کی۔ آج تک گھر کا خرچ تمھارے سر رہا۔ میں نے ایک کوڑی بھی نہیں کمائی لیکن تم کو اسپر بھی خوش پایا۔ کمبخت افیون نے مجھکو کسی کام کا نہ رکھا۔ ایسی بے غیرتی کی زندگی کس کام کی۔ جی چاہتا ہے اب لکھنؤ چھوڑ کر کسی ایسے شہر میں جاؤں جہاں کوئی جان پہچان نہ ہو پہلے تو افیون کی عادت رفتہ رفتہ ترک کروں پھر مصیبت جھیل کر محنت مزدوری کرکے چار پیسے کماؤں۔

بی بی نے کہا اسکے لیے لکھنؤ چھوڑنے کی کیا ضرورت ہے۔ تم آج سے گھر میں بیٹھے رہو اور باہر جانا یک قلم ترک کر دو۔ کسی سے نہ ملو۔ افیون بھی اپنی معتاد سے کم مقدار میں کھاؤ۔ ایک ہفتے میں یہ عادت کم ہو جائے گی اور چھ مہینے میں بالکل چھوٹ جائے گی۔ رہا نوکری کا ماشاء اللہ تم کچھ شُدبُد پڑھ لیتے ہو۔ لکھنے میں ہاتھ ذرا کچا ہے۔ وہ گھر میں مشق کروگے تو میں بھی کچھ بتا دوں گی اور تمھاری وجہ سے میرا خط پختہ ہو جائے گا۔ پھر درِ دولت پر جانا دربار میں عرضی دینا کم سے کم کتب خانہ کے منشیوں میں نوکر ہو جاؤ گے تو دس پندرہ روپے مہینہ مقرر ہو جائے گا۔ آدمی ترقی کرنا چاہے تو اُسکے لیے ذرا مستقل محنت کی ضرورت ہے۔ تم اگر میرے کہنے پر چلو تو چند روز میں گھر کی حیثیت درست ہو جائے۔

سرفراز علیخاں کو بیوی کی رائے بہت پسند آئی اور اُس نے کہا بے شک تم نے دانش مندی کی بات کہی ہے۔ آج سے میں تمھاری مرضی پر چلوں گا۔ دو پیسے روز کی افیون تھی ایک ہی مہینے میں کم کرتے کرتے ایک پیسے کی رہ گئی۔ گھر میں بیٹھا ہوا دن رات لکھا کرتا۔ رات کو کھانے پینے کا سودا خرید لاتا جو کچھ گھر میں دال دلیا پکتا کھا کر خدا کا شکر بجا لاتا۔ دوست احباب افیونی بھائی جس قدر ملنے آتے انکو صاف جواب دیدیا جاتا۔ آخر چھ مہینے میں افیون کے عذاب سے غریب سرفراز علی خاں نے نجات پائی اور مشق کرکے اپنا ہاتھ بھی کچھ صاف کرلیا۔ پھر حافظ نور اللہ سے جلی کی اصلاح لینا شروع کی اور چند روز میں قطعات کی مشق کرکے اچھا خاصہ خوش نویس ہوگیا۔

خواجہ آفتاب الدولہ قلق کے ذریعہ سے بادشاہ کو عرضی دی۔ عدالت دیوانی کے منشیوں میں دس روپے ماہوار مقرر ہوگیا۔ ایک دن اِنکا خط بادشاہ نے بغور ملاحظہ فرمایا۔ شیرینیِ خط بہت پسند آئی اور اپنے کتب خانہ کے منشیوں کا افسر بنا دیا۔ پچیس روپے مقرر ہوے۔ پھر خواجہ قلق کے ساتھ دربار میں کبھی کبھی جاتے تھے اور نہایت بذلہ سنجی سے کلام کرتے تھے۔ بادشاہ کو ان سے بہت دلچسپی ہوتی تھی۔

اس وقت ثابت الدولہ وتاج الدولہ مقربان خاص کسی نواب ناظر کی مخالفت سے عتاب میں آئے اور موقوف ہوے۔ وظیفۂ مقررہ ملتوی ہوگیا۔ سرفراز علیخاں یاوری قسمت سے اُنکی جگہ پر مقربان خاص میں شامل کرلیے گئے۔ سرفراز علیخاں نے بادشاہ کے مزاج میں یہاں تک رسوخ پیدا کیا کہ پنج ہزاری میں شامل ہو گئے۔ انتہا ہوگئی کہ (چند ساعت خواب راحت کے سوا) بادشاہ کو مفارقت انکی گوارا نہ تھی۔

بی ممتازی خانم کا اب کیا پوچھنا ہے۔ پہلے تو غریب نے چھاتی پر صبر کی سِل رکھ کے ٹھنڈے پیٹوں کاہل میاں کو سارا جہیز اونے پونے بیچ کر کھلا دیا۔ یہاں تک کہ زیور کی قسم سے ایک پوت کا چھلا بھی نہ رہا۔ پھر آپ مزدوری پر اُتارو ہوئی دن بھر سوئی مار کے جو چار پیسے جمع کرتی پہلے خاں صاحب کے آگے پکا کے رکھتی پھر ساس کو کھلاتی پھر آپ بچا کھچا کھا کر خدا کا شکر بجا لاتی۔ پانچوں وقت نماز خود بھی پڑھتی تھی اور میاں بھی اور ساس بھی۔ رفتہ رفتہ ایک چھوٹا مدرسہ قائم کیا جس میں محلے کی غریب غربا کی لڑکیاں لکھنے پڑھنے اور کتر بیونت سِلائی کڑھائی سیکھنے آتی تھیں۔ تمام شہر سے نفیس اور عمدہ کام ممتازی خانم کے کارخانے میں تیار ہوتا تھا۔ درزی اپنے کان پکڑتے تھے نواب خاص محل نے ان کے مکتب کی تعریف سُن کر چھ سو روپیہ سال بمد اعانت مقرر کر دیا تھا اور وہی انکی تنخواہ تھی۔ لڑکیوں کی محنت سے جو روپیہ آتا وہ ماہ بماہ ان پر تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ پڑھنا لکھنا محض معمولی تھا جتنا شریف بیبیوں کے لیے موزوں ہے۔ چھوٹی چھوٹی اُردو مسائل کی چند کتابیں اور اُردو خوشنویسی برائے نام فارسی۔ باقی ترکاری سالن کھانا پکانے کی ترکیبیں۔ اگرچہ پچاس روپیہ ان کے لیے کافی تھا مگر اس عقل مند عورت نے شوہر کو ناصحانہ پیرائے میں سمجھا سمجھا کر پڑھنے لکھنے کی طرف مائل کیا اور کچھ دنوں تک تو آپ پڑھایا اسکے بعد مولوی کی خدمت میں بھیج کر تعلیم دلوائی۔ یہاں تک کہ رفتہ رفتہ سرفراز علیخاں بھی اس اعلیٰ مرتبہ پر پہنچ گیا اور پانچ ہزار روپیہ مہینا کمانے لگا۔ یہ سب بی ممتازی خانم کی جوتیوں کا صدقہ ہے جو میاں کو خاک سے پاک کر دیا۔

چاہیے تو یہ تھا کہ سرفراز علیخاں بی بی کے پانوں دھو دھو کر پیتے اور بہت قدر کرتے مگر روپیہ پا کر آدمی کی آنکھ بدل جاتی ہے۔ بیوی کے ساتھ انکا وہ طرز نہ رہا تاہم یہ دل میں بیوی کا احسان مانتے تھے اور اب بھی سامنے چار آنکھ نہ کر سکتے تھے۔ روپیہ پا کر ممتازی خانم کے حُسن انتظام کا کیا پوچھنا۔ سرفراز باغ سرفراز گنج انھیں کے حسن انتظام سے آج تک لکھنؤ میں مشہور ہیں۔ ٹکیت راے کے تالاب کے قریب اسکی عالیشان کوٹھی عالیشان مسجد اسکے نام کی عمدہ یادگار ہے۔ یہ سب کارنامے پُکار پُکار کر کہہ رہے ہیں کہ خوش مزاج نیک عورت وہ شمع ہے جس سے گھر بھر روشن ہو جاتا ہے اور علم و ہنر وہ دولت ہے جو ایک نہ ایک وقت ریاست اور امارت کے زینہ پر پہنچا دیتی ہے۔ خدا کی شان ہے وہی ممتازی خانم جو ایک افیونی کاہل آدمی کے ساتھ مصیبت اور تکلیف جھیلنے کے لیے آئی تھی، اور جس نے اپنا تمام جہیز کوڑیوں کے مول بکتے ہوے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور منہ سے اُف نہ کی۔ ٹوٹے پھوٹے کچے مکان میں تکلیف اُٹھائی اور خدا کا شکر بجا لائی۔ نیک مزاجی اور عقل مندی نے اُسکو اس بات پر آمادہ کیا کہ مزدوری کر کے خاوند کی پرورش کرے۔ خدا کو یہ بات اُسکی پسند آگئی۔ سُن لی اور ایسی سُن لی کہ آج تک بی ممتازی خانم اپنے محل میں دس نوکروں سے براج رہی ہیں اور زمانہ نے کچھ ایسا ساتھ دیا ہے کہ ہر ایک چھوٹا بڑا انکا معرف ہے

سرفراز علیخاں عجب صاحب اقبال آدمی تھے۔ بیوی ایسی نیک بی بی تھی جسکا جواب نہ تھا۔ اُسی کے صدقے میں اتنا عروج حاصل ہوا دینی ایسے کہ امرا میں آج تک کوئی ایسا پابند صوم و صلوٰۃ دیکھنے میں نہیں آیا۔ مزاج میں خیرات بھی تھی۔ ایک غریب خانہ بنوایا تھا جس میں اندھے لولے لنگڑے پرورش پاتے تھے۔ غدر کے بعد سے اگرچہ انکو شاہی کی طرح آمدنی تو نہیں رہی ہے لیکن مزاج میں ایثار نفسی سوا ہو گئی ہے۔ پائین باغ میں آ بیٹھتے ہیں دوست احباب جمع ہوتے ہیں اور ہر قسم کی علمی باتوں کا چرچا رہتا ہے۔ اکثر لوگوں کی دستگیری کرنے کو اپنا فخر سمجھتے ہیں۔ مسجد کے مسافروں کی ہفتے میں ایک مرتبہ ضرور دعوت کرتے ہیں لوگوں میں انکا وقار بہت ہے۔ اب اگلے لوگوں میں ایک انھیں کا دم ہے۔ لیکن سچ تو یہ ہے کہ سرفراز علیخاں کو سرفراز علیخاں بی ممتازی خانم کے حسن عمل نے بنا دیا اسی سے معلوم ہوا کہ لڑکیوں کے لیے تعلیم اور تربیت ضروری چیز ہے۔

عشرت لکھنوی

قیود وتقلید، تجدید وتنقید

کیا یہ خیال صحیح ہے کہ قیود شاعری وتقلید فصحا فطری جذبات ودلکش خیالات کے سدِ راہ ہیں؟ کیا ایشیائی مذاق غایت السبلد ہو آتو اسکے حدود کیا. دیواریں بھی دلی کی عمارتوں اور لکھنؤ کے محلوں کی طرح ٹوٹی پھوٹی رہے؟ کیا ردیف وقوافی کا پابند قیود، آزاد روش والے نومشقوں سے باوصف کہنہ مشقی اچھی نظمیں نہیں لکھ سکتا؟ کیا قافیوں کی دلچسپ نشست، ردیفوں کے خوش نما پہلو اپنے موقع ومحل پر دلیل حُسن سخن نہیں بن سکتے؟ کیا مثنوی سے بڑھ کر آزادی کسی اور صنف نظم میں ہے؟ پھر حُسن سخن کا پیدا ہونا اس صنف میں بھی کیوں مشکل ہے؟ کیا سبب ہے کہ گلزار نسیم ومیر حسن کے سوا اور مثنویاں شہرت وقبولیت سے ممتاز نہ ہو سکیں؟ میر انیس چند مخصوص بحروں میں مرثیہ گوئی کرتے رہے اور مسدس کے دائرے سے نہ نکل سکے مگر فردوسی سے پہلوانِ

سخن آور فن سے مرد میدان کا مقابلہ کس نے کیا؟

تلوار کا حق ہے مگر ہاتھ چاہیے

نئی شاعری کے نیچرل شاعر خواجہ حالی کا مسدس سب نظموں سے زیادہ کیوں مشہور ومقبول ہے؟ کیا وہی مسلسل مضامین بلا قید مسدس مختلف بحروں اور متعدد زمینوں میں ہوتے تو انکا پایۂ سخن اپنی جگہ پر اتنا بلند رہتا؟

غزل کے مضامین سرے سے نئے نہیں ہوتے وہی گل وبلبل وہی شمع وپروانہ، وہی نازوانداز معشوقانہ، وہی سوزوگداز عاشقانہ مگر ردیفوں کے چسپاں، قافیوں کے دست وگریباں ہونے ہی سے ان میں تازگی آجاتی ہے۔

متروکات یعنی الفاظ واجب الترک ومستحسن الترک کی قیود زبان کی فصاحت قائم رکھنے کے لیے ہیں۔ جو الفاظ زبانوں پر گراں گزرتے ہیں اور فصحا کے روزمرہ سے خارج ہو گئے ہیں ہمیں اُنھیں اپنے اشعار میں داخل کرنے کا کیا حق حاصل ہے؟ جتنے الفاظ ومحاورات قدیمہ متروک فصحا ہو کر زبانوں پر بار اور فصاحت کے لیے ناگوار ہو گئے ہیں ہمیں اُن کے اختیار کا کیا اختیار ہے؟ متروک زبان کی تقلید سے کیا ہم مقلد کے بدلے مجدد کہے جا سکتے ہیں؟

اگلے زمانے میں قیود شاعری سے بڑی قید یہ تھی کہ عربی فارسی کی کافی استعداد، عروض وقوافی، معانی وبیان، لغات ومحاورات کے بغیر معلومات کوئی قلم اُٹھاتا ہی نہ تھا اب یہ قید متروک مرفوع القلم ہو گئی ہے۔ کیا ایسی آزادی قابل تحسین ہے؟ کیا ایسی کم سوادی وکم علمی معراج کمال پر پہنچا سکتی ہے؟ کیا الفاظ کے خزانے پاس نہ ہوں تو قافیے مل سکتے ہیں؟ اور مل بھی جائیں تو فنِ قوافی سے ناآشنا رہ کر کیا اپنے محل پر مستعمل ہو سکتے ہیں؟ کیا بغیر علم معانی وبیان اچھے استعارات، پاکیزہ تشبیہات کی خوبیاں ذہن نشیں ہو سکتی ہیں؟ کیا زبان ومحاورات سے نابلد رہ کر قدم قدم پر لغزشوں سے سنبھلنے کا کوئی سہارا مل سکتا ہے؟

اردو کا کوئی جامع وبسیط لغت موجود نہیں ہے جو تحقیق وتلاش سے مستغنی کر کے بڑے ہمتا کا کام دے۔ قید شاگردی کو ننگ وعار سمجھنے والے یہ سمجھ لیں کہ اہل زبان کی اصلاح وتربیت سے مستفید ہوئے بغیر کام نہیں چل سکتا۔

شاعری سے زیادہ تمام علوم وفنون کا جامع کوئی فن نہیں ہے موسیقی کی لَے اسکے ترانوں میں، مصوری کا مرقع بھی اسکے نگارخانوں میں، سحر سامری اسکی تاثیر سے مات، اعجاز عیسوی اسکا قائل کرامات ہے۔ نیزہ وشمشیر سے زیادہ شاعر کی نوک قلم، تیغ دودم سے بڑھ کر اسکا مصرع تیز دم ہوتا ہے۔ ایسے فن سے زیادہ کس فن کے لیے استعداد علم کی ضرورت اور استاد شفیق کی حاجت ہو سکتی ہے۔ آج ہی دیکھ لیجیے پروفیسر اقبال، لسان العصر اکبر، مولنا شوق قدوائی، نظم طباطبائی یا اور چند بزرگ جنھیں انکی ہم نوائی کا فخر حاصل ہے سب کی شہرت وقبولیت کا راز قابلیت میں مضمر ہے۔ جلیل القدر جلیل ہوں یا حضرت ریاض کوئی بھی بغیر استفاضہ واستفادہ معراج کمال پر نہیں پہنچا ہے۔ پھر یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ مروجہ قیود شاعری سے آزاد، قید

تحصیلِ علم و فن سے آزاد، قیدِ شاگردی سے آزاد ہو کر کوئی آزاد خیال کس طرح شاعرِ نازک خیال و سخنورِ بے مثال ہو سکتا ہے؟

حضرت قبلہ امیر مینائی کو داغ دہلوی پر ترجیح دینے والے، حضرت داغ کو امیر مینائی سے بڑھانے والے دونوں بالاتفاق ہم زبان ہیں کہ یہ آفتاب و ماہتابِ شاعری میں اپنا مثل نہیں چھوڑ گئے۔ فی زمانہ شعرا کے معدودے چند افراد بھی جو اپنی جامعیت و قابلیت میں فرد ہیں اگر اپنا مثل نہیں چھوڑ گئے تو قیودِ شاعری کیا معنی شاعری ہی سے اردو زبان آزاد ہو جائے گی۔ ہم افسوس کے ساتھ دیکھ رہے ہیں کہ تحقیقِ فن، جامعیتِ سخن، فراہمی سرمایہ لغات و محاورات، مشقِ شاعری کے بدلے صرف دو مادے زوروں پر ہیں۔ ایک تجدید، دوسرے تنقید۔

تجدید والوں کا زور ہے کہ اگلوں کی تقلید چھوڑ دو، پرانی لکیر کے فقیر نہ ہو۔ شعر و سخن کو صرف معنی ہی نہیں بلکہ صورت کے اعتبار سے بھی بدل دو کسی کے نقشِ قدم پر نہ چلو، اپنی راہ الگ نکالو۔ سب قیدیں توڑ کر آزاد ہو جاؤ، وہ کر دکھاؤ کہ اگلوں سے اُسکا عشرِ عشیر نہ ہو سکا ہو۔ مگر؎ کہنا آسان کر دکھانا مشکل۔ بے تقلید میں کامیاب ہوئے تجدید میں کامل کوئی نہ ہوا، یورپ والے مسلمانوں کے علوم و فنون کے پہلے پکّے مقلد بن گئے پھر مجدّد ہوئے۔

تنقید والوں کا شور ہے کہ کھوٹے سے کھرے کو الگ کر دکھاؤ، نکتہ چینی و خردہ گیری میں کسی کے حفظِ مراتب کا خیال بھی ذہن میں نہ لاؤ۔ ہزار ہنر میں ایک عیب بھی کسی کا ڈھونڈھ کر ضرور نکالو، تہذیب کے پردے میں پردہ دری نہ بن پڑے تو دو چار آوازے کسو۔ تنقید اتنا بڑا ہنر ہے جسکا ہر عیب ہنر میں داخل ہے، اب زمانہ دوسرا ہے دور ہی اور ہے۔ آزادی چھوٹے سے چھوٹے کو بڑے سے بڑے کی عیب جوئی پر آمادہ کر دیتی ہے۔ جہاں کسی کی تنقیص کا خیال آیا تنقیدی عنوان قائم ہوا اور قلم و زبان نے ایک ہی حرف کے پھیر میں حرف گیری کا حق ادا کر دیا۔ کاش تنقیدی آزادی کے پاؤں میں بھی ہلکی ہلکی بیڑیاں ڈال دی جاتیں کہ چل تو سکتی مگر حد سے باہر نہ نکل سکتی۔ تنقید معیارِ سخن بنکر کھوٹا کھرا پرکھتی ہے اُسکا بھی کوئی معیار ہونا چاہیے۔ قیودِ شاعری کی طرح تنقیدی اصول و ضوابط بھی منضبط ہو جاتے تو خوب ہوتا۔

میرے ایک معزز ہموطن اپنے عنایت نامے میں تحریر فرماتے ہیں: "پورب والوں نے خواہ مخواہ پچھم والوں کی تقلید کا پٹا گلے میں ڈال لیا ہے۔ اجتہاد کے درجہ پر ایسوں کا پہنچنا مشکل ہے۔" تقلید کا پٹا گلے میں موتیوں کے ہار سے قیمتی ہوتا اگر پچھم والوں کی ہمزبانی و ہمنوائی کا فخر حاصل ہو جاتا۔ پورب کے درجۂ اجتہاد پر پہنچنے والا خواب فراموش ایک مطلع یاد دلاتا ہے: ؎

دعوے زباں کا لکھنؤ والوں کے سامنے
اظہار بوئے مشک غزالوں کے سامنے

اتنی ہمت ایسی سعی و محنت والے سو میں ایک دو بھی نظر نہیں آتے جو پورب میں رہ کر باکمال شاعر یا زباندان ہونے کا خاص امتیاز حاصل کریں۔ وہ زمانہ گیا جب ہندیوں نے زبانِ فارس میں اتنی مہارت بہم پہنچائی تھی کہ تیغِ اصفہاں بھی اُنکا لوہا مان گئی تھی۔ پورب میں بھی جب اُردو کے خسرو و فیضی پیدا ہوں تو پچھم والوں کے مقابلے میں شاید دعوائے اجتہاد کا موقع ملے اور یوں کہنے کو تو ایک قصیدے کی مضمونِ تعلّی میں حسبِ دستورِ شاعرانہ راقمِ سطور نے بھی لاف و گزاف کا حق ادا کیا ہے ؎

وہ عرفی ہوں کہیں سب فیضیِ ہندوستاں جسکو
وہ خاقانی ہوں سب جسکو کہیں اُردو کا قاآنی

یہ چند سطروں کا معمولی مضمون ختم ہی ہو جائے تو اچھا ہے مگر یہ بھی سن لیجیے کہ لکھا کیوں گیا۔ ایک مہربان نے مجھ سے حسبِ ذیل سوالات کیے

(۱) اردو شاعری ردیف و قوافی، متروکات، تقلیدِ اہلِ زبان، شاگردی وغیرہ اتنے قیود سے کیوں محدود ہو گئی کہ حسنِ سخن کی راہ، وسعتِ بیان کے راستے سب مسدود ہو گئے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

(۲) کیا سبکا زادبوم پورب ہو وہ باوصف کہنہ مشقی ماہرِ فن اور کاملِ فن ہونے کے اس قابل نہیں ہو سکتا کہ اُس سے استفادہ جائز ہو؟ آپ سے

میرے ایک دوست نے اصلاح چاہی تو پوربی ہونے کا عذر کیوں کیا گیا کیا آپ شاعر نہیں ہیں ؟

(۳) میرؔ و مصحفیؔ یا امیرؔ و داغؔ کا ہم پایہ کوئی شاعر اب موجود ہی یا نہیں۔ اگر نہیں ہی تو پھر مستند قابلِ اتباع کس کا کلام ہے ؟

پہلے سوال کے جواب میں تحریر مذکورۂ بالا کافی ہے۔ دوسرے تیسرے سوال کا جواب مجھ سے نثر میں نہین بن پڑتا اس لیے ایک قطعہ درج ذیل ہی جو کسی ایسے ہی موقع پر لکھا گیا تھا :-

قطعہ

لکھتے ہیں مجکو خط میں مرے ایک مہرباں　کیا آپ نکتہ سنج نہیں نکتہ داں نہیں ؟
کیا آشنا مذاقِ سخن سے نہیں زباں　کیا آپ ذوقِ نظم سے رطب اللساں نہیں ؟
مینائے میرؔ و غالبؔ میکش کے جام کی　دو گھونٹ بھی نصیب بے ارغواں نہیں ؟
چلتا نہیں ہی بزم میں کیا دورِ مصحفیؔ　کیا اب وہ سلسلہ نہیں یا خاندان نہیں ؟
کوئی تو ہوگا بلبلِ خوش لہجۂ سخن　مانا کہ داغؔ بلبلِ ہندوستاں نہیں
زندہ کرے امیرؔ خدائے سخن کا نام　ایسا اب ایک شاعرِ جادو بیاں نہیں
میں نے کہا جگہ ہے یہ عجز و نیاز کی　بندہ نواز! ناز کا موقع یہاں نہیں
کہتے ہیں شعر کس کو سخن کسکا نام ہی　یہ امتیاز بھی مجھے اے مہرباں نہیں
جوہر شناس جسکو جواہر سے تول لیں　اب وہ متاعِ نظم کا پلّہ گراں نہیں
ہیں وہ خم و قدح، نہ وہ پیمانہ و سبو　وہ پیرِ مے فروش کی اونچی دکاں نہیں
اسیرؔ یہ لطف ہے کہ سخنور ہیں سیکڑوں　ایسا بھی کوئی شہر ہے شاعر جہاں نہیں
خالی نہیں ہیں نقص سے پورب کے باکمال　دامن پہ ہی یہ داغ کہ اہلِ زباں نہیں
پچھم کے شاعروں کی تو کیا بات ہی مگر　سب اک طرح کے فاضل و کامل یہاں نہیں
المختصر جو ماہرِ فن ہو کہیں کا ہو　کچھ اُسکے اتباعِ سخن میں زیاں نہیں
کالج کی ڈگریوں پہ کرے ناز کیا شفقؔ
شاعر کے پاس جب سندِ امتحاں نہیں

شفقؔ عمادپوری

انجامِ ستم

(تاریخِ ایران کا ایک پُرانا ورق)

(۱)

ہائے ظالم نے کیا صورت پائی ہے! میں اُسے اپنی جانب کس قدر متوجہ کرنا چاہتا ہوں مگر وہ ہے کہ میری سُنتی ہی نہیں!

سُنتا ہی نہیں وہ بتِ گمراہ کسی کی
ایسا نہو سُن لے کہیں اللہ کسی کی

مگر میرے دل کی بے تابیاں ہیں کہ سان ہی میں نہیں آتیں اور حد سے گزری جاتی ہیں! واللہ اب مجھ سے ضبط نہیں ہو سکتا!

لو! وہ ظالمہ، قتالۂ عالم! آرہی ہے! ہائے اسکی رفتار محشر خیز سے دل پسا جاتا ہے! (آنے والی سے مخاطب ہوکر) آہ! تم کب تک، مجکو اور میرے دل کو ستاتی رہوگی! - آخر تمھارے اس ظلم و ستم کی کچھ انتہا بھی ہے! تمھاری قسم! اب مجھ سے صبر نہ ہوگا - میں جان دونگا یا لونگا! - ہاں دونوں میں سے ایک بات ضرور ہوگی! تمھارے عشق ......"

عورت - شرم! غباد شرم! کیا تم ہوش میں ہو! تمھارے حواس تمھیں دھوکا تو نہیں دے رہے! کیا تم مجکو، اور اپنے آپ کو پہچانتے ہو! - کہیں کچے گھڑے کی تو نہیں چڑھا آئے! آخر اس طرح جامہ انسانیت سے عاری ہونا کچھ معنی ضرور رکھتا ہے -

غباد - جب کوچۂ الفت میں قدم رکھا تو کس کی شرم! اور کیسی حیا! کہاں کا ہوش اور کیسا جامۂ انسانیت! بس اب - پ .. .. مجھے زیادہ

نہ ستاؤ! واللہ! اب دل کو تاب ضبط نہیں!

عورت - غباد ہوش کی دوا کرو! دشمنوں کو جنون تو نہیں ہوگیا! میرے بھتیجے اور اپنے میرے درمیانی، مقدس رشتہ کا احترام کرو! اور مرحوم پرویز کی روح کو صدمہ نہ پہنچاؤ!

غباد - بے شک محبت بھی ایک قسم کا جنون ہے - اس سے کون انکار کرسکتا ہے! میں تمھارے رتبہ کو بھی خوب پہچانتا ہوں! اور تمھاری تقدیس کو بھی! میں تو درحقیقت دل ہی دل میں تمھاری پرستش کرتا ہوں! اب تمھیں بتاؤ کہ اس سے زیادہ تمھارا احترام اور کیا ہوسکتا ہے!

عورت (جل کر) کیا تم بالکل ہی جامۂ ہوش و خرد سے عاری ہوگئے ہو! کیا تم نے بالکل ہی شرم و حیا کی چادر چاک کر دی ہے! - کیا میں تمھاری ..... نہیں ہوں؟

غباد - کیا مضائقہ! کیا تم کو خداوند زرتشت کا قول یاد نہیں رہا کہ دنیا کی تمام عورتیں، اور مال و دولت میں ہر شخص برابر کا حصہ دار ہے!

عورت (غصہ سے) خدا غارت کرے اُس موذی دشمن عقل و اخلاق زرتشت کو - جس کی خطرناک اور شرمناک تعلیم سے، ایرانیوں کے ننگ و ناموس اور عزت و عصمت، معرضِ خطر میں ہیں! ہاں! یہ اُسی کی حیا سوز تعلیم کا نتیجہ ہے کہ آج تمام ایران پر بداخلاقیوں کے بادل چھائے ہوئے ہیں - اخلاقِ حسنہ کا کہیں نام تک نہیں سُنا جاتا - شرم و حیا کے جذبات رفتہ رفتہ ایرانی قوم سے معدوم ہوتے جاتے ہیں اور ......

غباد - تم یہ کیا کفر بک رہی ہو! اپنے مُنہ کو بند کرو! ورنہ تم پر خدا کا قہر نازل ہوگا -

عورت - اب اس سے زیادہ خدا کا قہر اور کیا ہوسکتا ہے -

غباد - اچھا بس ... تم میرے سوال کا کیا جواب دیتی ہو! کیا مجھے یوں ہی ستائے جاؤ گی!

عورت (دل میں کوئی نیا منصوبہ سوچ کر) اچھا میں کل تمھاری بات کا جواب دوں گی جس سے تم خوش ہو جاؤ گے! مگر دیکھو! اس سے پہلے مجھے ہرگز نہ ستانا ورنہ تمھارا مقصد پورا نہ ہوگا! اور تمھیں افسوس کرنا پڑیگا!

غباد - یہ منظور! اور سر آنکھوں سے منظور! (دل میں) بس اب کام بن گیا - اب پو بارہ ہیں! پانچوں گھی میں اور سر کڑھائی میں!

خادمہ آتی ہے:

دو حضور بیگم صاحبہ! خاصہ تیار ہے! تشریف لے چلیے!!!

دونوں عورتیں چلی جاتی ہیں -

(۲)

ایران کے مشہور و معروف، اور پُر جبروت، حکمران ساسانی، خاندان کا تیر اقبال انتہائی نقطۂ عروج پر پہنچکر اب ڈھلنا شروع ہوگیا ہے - بقاعدۂ ہر کمالے را زوالے -

اس خاندان کے چشم و چراغ اور خلف الرشید حکمران نوشیروان، کی آنکھیں (جو اپنی نصفت شعاری کی وجہ سے تمام دنیا سے نہیں تو کم از کم مشرقی ممالک سے خراج تحسین و آفریں، تا قیام عالم وصول کرتا رہیگا) بند ہو چکی ہیں -

نوشیرواں کے عہد عدالت مہد میں فتوحات کا جو سلسلہ قائم ہوا تھا وہ اُسکے بیٹے اور جانشین ہرمز، کے عہد میں نہ صرف منقطع ہوگیا بلکہ اُس کے غیر مآل اندیشانہ طرز عمل کی بدولت بہت سا مقبوضہ و مفتوحہ علاقہ بھی سلطنت کے قبضۂ اقتدار سے نکل گیا - ہرمز، کا طرز حکومت، اگرچہ تخت نشینی کے بعد کچھ عرصہ تک دانشمندانہ رہا اور وہ اپنے باپ کے زمانہ کے جہاں دیدہ، اور کار آزمودہ، امرا، وزرا کا احترام، اور عام رعایا کے ساتھ تالیفِ قلوب کا سلوک اور عدل و انصاف کرتا رہا لیکن بالآخر اسکا مزاج و دماغ بدل گیا نظر پھر گئی - اور وہ بعض اشرار، دشمنِ ملک و سلطنت اشخاص کی ریشہ دوانیوں، افترا پردازیوں، اور منصوبہ بازیوں کے جال میں پھنس کر بلاوجہ امرائے ایران کی جان کا خواہاں اور خون کا پیاسا بن گیا - چنانچہ اُن میں سے

کبر کو تلوار کے گھاٹ اُتار کر دم لیا۔

ہرمز کے اس طرز عمل سے بقیۃ السیف اُمرا اس سے متنفر اور سرکش ہو گئے سلطنت کے ہر حصہ سے بغاوت کے شعلے بلند ہو ہو کر خرمنِ امن اماں کو خاک سیاہ کرنے لگے! زبردستوں، جابروں، اور ظالموں نے زیردستوں اور کمزوروں کو سُرمے کی طرح پیس کر رکھ دیا۔ فوج بھی تمرّد دکھانے لگی۔ بدامنی کی وجہ سے رعایا کے جان و مال خطرے میں پڑ گئے۔ داستان بدنظمی و ظلم و ستم اندرون ملک سے نکل کر ہم عصر، حریف، اور رقیب دول کے کانوں تک پہنچی۔ وہ تو گویا اُدھار کھائے بیٹھے تھے! فوراً منہ میں پانی بھر آیا! انھیں بڑا خار تھا کہ ایران کا آفتاب اقبال اس قدر بلندی پر کیوں چمکتا ہے! چنانچہ ایک جانب سے رومیوں نے اسّی ہزار فوج سے ایران پر لشکر کشی کی بایں مطالبہ کہ نوشیرواں کا فتح کیا ہوا رومی علاقہ واگذار کر کے ان کو واپس دیا جائے اور خطِ سرحد حسب سابق کھینچا جائے!

دوسری جانب سے ارامنہ نے سر نکالا اور ایران میں تاخت و تاراج شروع کر دیا۔ علاوہ ازیں دو عرب سردار عباس احول اور عمر ارزق اپنی خانہ بدوش، قواعد جنگ سے ناواقف، مگر شجاع اور بے جگر، جمعیت لیکر دریائے فرات کے کنارے تک آ پہنچے۔ مزید براں یہ کہ خود امیر ترکستان نے جو رشتہ میں ہرمز کا ماموں تھا، سپاہ کثیر کی جمعیت میں اپنے ملک سے حرکت کی ایران کا رُخ کیا۔ اور دریائے آمویہ کو عبور کر کے اپنے قلمرو میں خیمہ انداز ہوا۔ چنانچہ اس نے باد خیز (ہرات) میں چھاؤنی ڈال کر شاہِ ایران کے پاس پیغام بھیجا کہ "ہم روم کا عزم رکھتے ہیں! آپ درمیانی دریاؤں کے پل تیار کرا دیجیے! تاکہ ہم ایرانی علاقہ سے جلد گزر جائیں!

اب دشمنوں کے نرغے میں پھنس کر ہرمز کی آنکھیں کھلیں! اور اسوقت امرائے ایران کو ہاتھ سے دینے کی غلطی محسوس کی۔ اب بھی خیر گزری کہ اسنے بقیۃ السیف سرداروں کو دربار میں طلب کر کے اُن سے معافی مانگی اور اپنی غلطی کا اعتراف کیا اور اُن سے صلاح طلب کی کہ اب کیا کرنا چاہیے!

اگرچہ اس وقت میں سلطنت کا ڈھیر گر چکا تھا تاہم ان جہاں دیدہ اور آزمودہ کار سرداروں نے کچھ ایسے جوڑ توڑ کیے۔ اور ایسی ناخن بندی کی اور کچھ ایسی پولیٹیکل چالیں چلیں کہ تمام دشمن اپنا سا منہ لے کر نو دو گیارہ ہو گئے! حتیٰ کہ ایرانی سپہ سالار بہرام چوبین نے ترکوں کو شکست فاش دی۔ اُن کا سردار میدان جنگ میں کام آیا۔ شہزادہ ولی عہد ایرانی سپاہیوں کے ہاتھوں گرفتار ہوا۔ الغرض تمام بیرونی آئی ہوئی بلائیں آسانی سے ٹل گئیں! مگر ایک اندرونی فتنہ اُٹھا۔ یعنی خود بہرام چوبین، جس نے اس وقت غیر معمولی قوت حاصل کر لی تھی اپنی سلطنت سے برگشتہ ہو گیا اور علانیہ خم ٹھونک کر شاہی فوج کے مقابل آ کھڑا ہوا۔ اور اگرچہ اُسے ہزیمت کھا کر فرار ہونا پڑا تاہم اس میں شک نہیں کہ اسی وقت سے ایرانی خانہ جنگی کی تاریخ شروع ہو گئی۔

ہرمز کے بعد خسرو پرویز وارثِ تخت و تاج ہوا مگر یہ اپنے ساتھ کچھ اور ہی طبیعت اور دماغ لایا تھا۔ عشق و محبت گویا اُسکی گھٹی میں پڑے تھے۔ وہ بندۂ عشق تھا یا بندۂ عیش اور بس! چنانچہ خسرو پرویز اور اُسکی نازآفریں محبوبہ یا بیوی شیریں کے عشق و حُسن کے افسانے زیبِ داستانہائے مشرق ہیں۔

خسرو کی عیش پسندی کا یہ انجام ہُوا کہ سرداران ایران نے اُسے بعد چندے معزول کر کے نظربند کر دیا۔ اور اُسکے بیٹے قباد کو تخت نشین کیا! مگر اس شرط پر کہ وہ اپنے باپ کا کام تمام کر دے!

قباد اول اول تو ٹالتا رہا۔ لیکن آخر کار، ایک ایرانی سردار، پسر مردان شاہ کو جسکے باپ (مردان شاہ) کو خسرو پرویز نے قتل کرایا تھا قتل پرویز پر آمادہ کیا۔ چنانچہ وہ ایک تاریک رات دیکھ کر شاہی بندیخانہ میں پہنچا اور پہرے داروں کو غافل پا کر اندر داخل ہو گیا۔

پرویز، قابل رحم پرویز، بدنصیب پرویز! اس وقت بیدار تھا۔ وہ آنے والے شخص کی صورت دیکھتے ہی سمجھ گیا کہ وہ یہاں کس غرض سے آیا ہے! چنانچہ اُس نے معاً کہا "آ! اور میرا کام تمام کر! کیونکہ جو شخص اپنے باپ کا انتقام نہ لے وہ گویا اپنے باپ کے نطفہ سے نہیں!"

الغرض خسرو قتل کیا گیا اور اُسکا قاتل اپنی کارگزاری جتانے کے واسطے سیدھا غباد کے محل میں پہنچا اور تمام واقعہ اور گفت وشنید من وعن بیان کردی!

اس بیان نے خسرو کے دل پر ایک خاص قسم کا اثر کیا جس کا پسر مردان شاہ کو وہم وگمان بھی نہ تھا!

غباد کا ہاتھ قبضہ پر گیا۔ شمشیر چمکی۔ پسرِ مردان شاہ کا بھٹا سا سر کئی گز کے فاصلہ پر جا پڑا۔ اور غباد کے مُنہ سے بے اختیار حسب ذیل جملے نکلے "واقعی میرے والد نے سچ فرمایا تھا کہ جو فرزند اپنے باپ کے قاتل سے انتقام نہ لے وہ اپنے باپ کے صُلب سے نہیں ہوسکتا!

یہ ہے اُس زمانہ کے پولیٹیکل حالات کی جھلک جس سے ہمارے اس فسانہ کو تعلق ہے۔ چنانچہ اس وقت غباد تختِ ایران پر متمکن ہے۔ جس نے گویا عشق ومحبت اپنے باپ خسرو سے ورثہ میں پائے ہیں!

(۳)

"بے شبہ! اُس موذی کے ہاتھ سے 'عزت' کا بچنا محال ہے! کمبخت 'زرتشت' کی تعلیم نے ایرانی نوجوانوں کے جذبات پر، گویا مٹی کے تیل کا چھینٹا دیدیا ہے! اسی لیے یہ بالکل اندھے ہوگئے ہیں! آہ! آخر، اس بدبخت غباد سے کس طرح عزت بچائی جائے؟

ہاں! بس اسکی ایک ہی تدبیر قیاس میں آتی ہے! یہ کہ میں اپنے آپ کو جوہر کرلوں۔ مگر! کیا اسکے علاوہ اور کوئی طریقِ نجات نہیں!

بے شک نہیں! وہ خوں خوار، بے حیا، وحشی، کسی طرح اپنے شیطانی منصوبوں سے باز آنے والا نہیں! اور اب میری زندگی ہی کی کیا ضرورت ہے؟ جب پرویز اس دنیا میں نہیں! تو میں یہاں کیوں رہوں! خصوصاً ایسی حالت میں جب کہ غباد جیسے درندہ خصلت انسان یہاں موجود ہوں!

(اپنی انگلی سے انگشتری، اور اُسکے اوپر سے ہیرے کا نگینہ اُتار کر) اے سفید اور شفاف ہیرے! تو میری مدد کر! مجھے ظالم کے چنگل سے بچا! اور شاہد رہ! کہ میں محض اپنی عزت، اور عصمت وعفت، بچانے کے لیے، اپنے ہاتھ سے شربتِ اجل نوش کرتی ہوں! مگر نہایت مسرت، اطمینان، اور نہایت فخر کے ساتھ! سقراط کو اُسکے دشمنوں نے، ہاں صداقت اور خدا کے دشمنوں نے جامِ زہر پلایا تھا۔ اور اُس نے مسرت کے ساتھ پیا تھا۔ کیوں کہ وہ بندۂ صداقت تھا لیکن اے زمین وآسمان! گواہ رہو! کہ میں خود اپنی تجویز سے، اپنی مرضی سے، اور اپنے ہاتھ سے یہ جام نوش کرتی ہوں!

یہ دنیاوی عیش وعشرت، چندروزہ! یہ زندگی مستعار! اور بخت وتخت سلطنت فانی ہیں!

غباد! ظالم غباد! یاد رکھ، بے گناہوں کا خون، ہاں شاہی خون! رنگ لائے بغیر نہیں رہے گا! مظلوموں کی آہ بے کار نہ جائے گی!

بترس از آہِ مظلوماں کہ ہنگامِ دعا کردن

اجابت از درِ حق بہرِ استقبال می آید

بلکہ تجھ پر آسمان ٹوٹے گا۔ خدا کے قہر کی بجلی گرے گی! اور دم کے دم میں تجھے اور تیری سلطنت کو خاکِ سیاہ کردے گی!

غباد! تو اپنی دھوکا دینے والی طاقت پر نہ بھول! اور اس فانی سلطنت پر نہ پھول! یہ آنے جانے والی چیزیں ہیں! آج سب کچھ نظر آتا ہے۔ کل کی کسی کو خبر نہیں کہ کیا ہو! ہاں یاد رکھ! تیرے سر پر خدائی لاٹھی پڑنے والی ہے! وہ لاٹھی جس میں آواز نہیں ہوتی!

دنیا! اے ناپاک دنیا! گناہوں کی سنڈاس دنیا رخصت! ہاں ہمیشہ کے لیے رخصت! الوداع الوداع!

(۴)

اس وقت غباد کو تختِ ایران پر حکومت کرتے، کامل بیس سال گزر چکے ہیں! ملک کی عام حالت یہ ہے کہ دیکھنے والے کو یقین ہی نہیں آتا کہ یہ وہی ایران ہے جس پر نوشیروانِ عادل حکومت کرتا تھا! اور کہ غباد اُسی کا جانشین ہے؟ لشکر میں بدنظمی پھیلی ہوئی ہے! فوج کو کئی

ماہ سے تنخواہ نہیں ملی! اس لیے فوجی لوگ غریب کاشت کاروں، اور سول آبادی کو لوٹ کھسوٹ کر اپنا پیٹ پال رہے ہیں! اور آبادی اور کھیتوں کو آگ لگاتے پھرتے ہیں! ایک طرف، ظالم، چور، ڈاکو، لٹیرے، وہاں کی کم زور اور نہتّی رعایا کو ستا رہے ہیں!

کسی غیر کی کیا شکایت! خود غباد۔ گنتی کے پندرہ بیس سالانی شاہزادوں یعنی اپنے بھائیوں (؟) کو تلوار کے گھاٹ اتار کر عدم آباد روانہ کر چکا ہے! جن میں سے ہر ایک نہایت وجیہ و حسین اور ذہانت و دانشمندی کا پُتلا تھا!

اِن شاہزادوں کو کس لیے جامۂ ہستی سے عاری کیا گیا؟ صرف اس لیے کہ غباد بے خوف و خطر اور بلا غل و غش، مدت العمر، عیش سلطنت اُڑائے! یہی وجہ ہے کہ آج تمام ایرانی رعایا کے طبائع مشتعل ہو رہی ہیں۔ خصوصاً شاہی نسل کے ممبروں کی! عام اس سے کہ وہ مرد ہوں یا عورت، کیوں کہ وہ اپنے آپ کو معرضِ خطر میں پاتے اور اپنی جان کو سولی پہ دیکھ رہے ہیں!

آفتابِ عالمتاب، اپنے لمبے لمبے شعاعی نیزے لیے ہوئے اپنا فرض ادا کر رہا ہے! کوئی دس بجے ہونگے۔ دربارِ ایران ہر طرح آراستہ و پیراستہ ہے! شہنشاہ غباد یادگارِ نوشیروان، جگمگاتے ہوئے تختِ شاہی پہ جلوہ فرما ہے! امرا، وزرا، اور سردارانِ فوج قرینہ اور ادب سے اپنے اپنے مقام پہ ایستادہ ہیں! بالکل سناٹے کا عالم ہے! ایسا کہ اگر سوئی بھی گرے تو اُسکی آواز صاف سُنائی دے۔ تاھم کبھی کبھی چاؤشوں اور نقیبوں کی آوازِ "دورباش، نظر روبرو" ذرا کی ذرا اس عالمِ سکوت کو توڑ دیتی ہے!

اس اثنا میں ایک غیر معمولی واقعہ پیش آیا۔ دفعتہً ایک ہلڑ سا مچ گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے! ایک ہنگامۂ محشر بپا ہو گیا!

دو جوان عورتیں! جن کے چہروں سے غیر معمولی رعب و داب اور شاہی جاہ و جلال ٹپکا پڑتا تھا دندانہ دربار میں گھس آئیں اور تختِ شاہی کے روبرو کھڑی ہو گئیں!

دربان، چوب دار، پہرے دار، چاؤش، اور فوج سب ہی کچھ موجود تھا

اِن آنے والیوں میں کوئی ایسی غیر معمولی طاقت تھی کہ انکا قدم آگے بڑھنے سے نہ رُکا! جب تک کہ وہ تخت کے سامنے نہیں پہنچ گئیں! اور اس سے بھی زیادہ عجیب تر یہ کہ اہلِ دربار میں سے کسی کو بھی اتنی جرأت نہ ہوئی کہ اِن عورتوں کو آنے سے روکے اور اُن کا سدِّراہ ہو کر اُنکی مزاحمت کرے!

دونوں عورتوں کی آنکھیں خونِ کبوتر ہو رہی تھیں اور اُن سے خوفناک شعلے نکل رہے تھے! دونوں کا عالمِ شباب تھا۔ چنانچہ ایک کا سن پچیس سال کے قریب اور دوسری کا کوئی بیس سال ہوگا!

دونوں، فرطِ غیظ و غضب سے کانپ رہی تھیں! تیور بگڑے ہوئے تھے! اُنکی آنکھیں، غباد کے چہرہ پہ گڑی ہوئی تھیں اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انکے تیرِ نظر غباد کے دل و جگر کی تواضع کر رہے ہیں!

گویا یہ دو شیرنیاں تھیں! جو کسی ظالم انسان سے خونی انتقام لینے آئیں تھیں!

دو منٹ کے بعد سین بدلا، قفلِ سکوت ٹوٹا! زیادہ عمر والی عورت نے جسکا نام پوران دخت تھا اور جو غباد کی ہمشیرہ تھی نہایت کرخت اور جگر شگاف لہجے میں، غباد کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا: "غباد! ظالم غباد! کیا ابھی کچھ ظلم و ستم باقی ہے جس کی انجام دہی کے لیے تو اب بھی زندہ ہے!

تو! گنتی کے بیس شاہزادوں کا خون پی چکا! وہ قیمتی اور پاک خون! جس کے ایک قطرے پر رعایا، اپنی جان قربان کر دیا کرتی ہے!

ظالم! تو اپنے باپ کو شہید کرا چکا! ماں کی جان لے چکا! بس کیا وہ وقت ابھی نہیں آیا کہ تیری ظلم شعاری کی بازپرس کی جائے! اور تجھ سے انتقام لیا جائے! غباد! تو خیال کرتا ہے کہ اپنے بزرگ ماں باپ اور بھائیوں کو قتل کر کے امن و اطمینان سے حکومت کے مزے اُڑائے گا! ایں خیال ست و محال ست و جنوں!

کیا تو نہیں جانتا کہ ظلم و ستم کے ہوتے ہوئے، کوئی سلطنت قائم اور کوئی حکمراں زندہ (؟) رہ سکتا ہے؟

بے شک ! ظالم کو ایک گھڑی بھی دنیا میں رہنے کا حق حاصل نہیں " دوسری نوجوان عورت آذر میدخت نے اپنے تیر نظر غباد کے چہرے پر گڑو کر کہا۔ " آہ ! کمبخت ناشدنی ! تو ننگ خاندان ہے ! بلکہ ننگ جہان ! تیرا ! ہاں تیرا ! اس دنیا میں ایک لمحہ رہنا بھی بیکار بلکہ ناجائز ہے۔ تو نے نوشیرواں کی اُس وسیع سلطنت کو جس پر شاہان عالم رشک کھاتے تھے، خاک میں ملا دیا۔ اُسکی نیک نامی کو بٹہ لگا دیا، اُسکے آوازۂ عدل و داد کو آہ پر سوز سے بدل دیا۔ خیر اب ہم دیکھنا چاہتے ہیں کہ تو کے دن اور اس تخت پر حکومت کرتا ہے !

دربار میں بالکل سناٹا تھا ! وزراء، اُمراء، اور فوجی جرنل، اب بھی جوں کے توں، کمربستہ، شمشیر بکف حاضر تھے ! مگر کسی کی مجال نہ تھی کہ چوں کرے ! یا بڑھ کر ان دریدہ دہن عورتوں کو گرفتار کرلے ! ' صداقت ' نے ہاں صداقت کی زنجیر نے ان سب کو باندھ لیا تھا ! اور یہ بالکل ہلنے جلنے کے بھی قابل نہ رہے تھے !

ایک دھماکے کی آواز سنائی دی۔ غباد تخت سے گر کر فرش پر آ رہا ! اور اُسکے منہ سے بے اختیاری میں نکلا " ہائے میں نے خود اپنے اوپر ہی ظلم کیا ! " بس اس سے زیادہ اور کچھ نہ کہہ سکا ! کیونکہ غش کھا کر بیہوش ہو گیا !

غباد انسان تھا اور بہرحال انسان ! اُسکے سینہ میں دل تھا اور اُس میں ضمیر ! اُس نے بھی اور انسانوں کے مانند کچے دودھ سے پرورش پائی تھی ! آخر اُسکے ضمیر سے دو عورتوں کے اس طرح سر دربار ملامت کرنے کی ذلت نہ برداشت ہو سکی ! اسکے دل و جگر پر چرکا لگا ! اور کاری لگا ! مظلوم مقتولین کی روحوں نے انتقام انتقام ! کہتے ہوے اُسپر حملہ کیا جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ خود اُس نے اپنا تاج اُتار کر پھینک دیا اور بالآخر غش کھا کر زمین پر گر پڑا اور چند لمحے کے بعد عدم آباد و سدھارا۔

اس واقعہ یا حادثہ کے بعد ساسانیوں کی سلطنت زیادہ عرصہ تک قائم نہیں رہی، اگرچہ مذکورۂ بالا دونوں شہزادیاں اور چار شہزادے یکے بعد دیگرے سریر آرائے سلطنت ہوے، لیکن ان میں سے کوئی بھی چند ماہ سے زیادہ حکومت نہ کر سکا ! اور ساسانیوں کا آفتاب اقبال گہن میں آگیا !

ادھر عربوں کا نیر اقبال و اجلال، فاران کی چوٹیوں پر اپنی آلاویز ضو ڈال رہا تھا۔ مسلمان فاتح اندرون ملک میں دھنستے چلے جاتے تھے انجام یہ ہوا کہ بیس سال کے اندر ہی اندر اہل عرب، ایران جیسے سرسبز و شاداب ملک پر قابض ہو گئے ! اور ساسانی خاندان کی آخری یادگار شہزادہ یزدگرد، کو ایک ایرانی دہقان نے محض اُسکے زیور و لباس کی طمع میں تہ تیغ کر دیا !

ہائے انقلاب زمانہ ! یادگار نوشیرواں کی یہ قسمت ! ! آہ ! آہ ! ۔

تا سحر وہ بھی نہ چھوڑی تو نے اے باد صبا !
یادگار رونق محفل تھی پروانہ کی خاک !

یاد رکھو ! کہ ظلم و ستم، کسی سلطنت یا قوم کو جس تیز رفتاری سے، تباہی کے غار کی جانب لے جایا کرتے ہیں شاید اور کوئی چیز نہیں لے جاتی،

حاملان سلطنت کے دل میں ظلم پسندی کا خیال پیدا ہو جانا اور رعایا کو اس کا محسوس کرنا، بس یہی زوال حکومت کا پیش خیمہ ہے !

مکن تا توانی دل خلق ریش
وگر میکنی۔ میکنی بیخ خویش (سعدیؒ)

اظہر دہلوی

قطعہ شاکر

فروغ شمع اخوت اب انجمن میں نہیں | نشان اہل وفا نام کو وطن میں نہیں
اُڑا کے باد خزاں لیگئی کہاں ہیہات | کہ گل تو کیا، کوئی کانٹا بھی اب چمن میں نہیں

تنقیدِ کتب

سیاحتِ سلطانی شروع ۱۹۱۱ء میں علیا حضرت بیگم صاحبہ بھوپال مع خدم و حشم یورپ وغیرہ کی سیاحت کی غرض سے تشریف لے گئی تھیں اور لندن۔ پیرس۔ اور قسطنطنیہ کے علاوہ جنیوا، بڈاپسٹ۔ وینس۔ فلارنس اور قاہرہ ایسے مشہور و تاریخی مقامات کی سیر فرمائی تھی۔ جناب شاہ بانو صاحبہ، جنکو حضور بیگم صاحبہ کی گرامی قدر بہو اور صاحبزادہ کپتان حاجی محمد حمید اللہ خانصاحب بہادر، ایل۔ ڈی سی، کی حرم محترم ہونے کا فخر حاصل ہے، ہمراہی میں تھیں انھیں کی سعی موفور سے سیاحتِ سلطانی کی من وعن داستان ترتیب و تکمیل پاکر بحسن و زیبایش شایع ہوئی ہے۔ اس وقت تک اُردو میں کئی ایک سفرنامے مقبولیت عام اور شہرت حاصل کرچکے ہیں لیکن دلچسپی و نوعیت کے اعتبار سے "سیاحتِ سلطانی" کسی سے کم نہیں بلکہ اکثر خصوصیات میں کئی ایک سے بہتر ہے۔ قابل مولفہ "شکریہ" کے تحت میں لکھتی ہیں :-

> قدر دان فیض رسان علیا حضرت نواب سلطان جہان بیگم صاحبہ تاج اہند، جی سی ایس آئی، جی سی آئی ای، فرماں روائے بھوپال دام اقبالہا و ظلہا کا شکریہ ادا کرتی ہوں کہ حضور ممدوحہ نے مجکو نہ صرف سفرنامہ لکھنے کی ترغیب دلائی بلکہ ہر قسم کی پوری پوری امداد مرحمت کی جن چیزوں کو حضور ممدوحہ نے ملاحظہ کیا، جہاں جہاں تشریف لے گئیں، جو نئی نئی باتیں معلوم ہوئیں، اُن سب کے متعلق کامل ہدایتیں لکھوادیں۔ اور اُن یادداشتوں کو لکھواتے ہوے ہر ایک بات میرے ذہن نشیں بھی کردی .... جب سفر ختم کرنے کے بعد میں نے سفرنامہ کا مسودہ تیار کیا تو حضور ممدوحہ نے امور ریاست میں شب و روز مشغول رہنے کے باوجود بھی نہایت توجہ کے ساتھ اصلاح فرمائی۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ "سیاحتِ سلطانی" کی تکمیل کے لیے جناب شاہ بانو صاحبہ کو جو کریڈٹ ملنا چاہیے اُس میں بحصۂ غالب جناب بیگم صاحبہ دام اقبالہا بھی شریک ہونے کا حق رکھتی ہیں۔ یہ قابل اطمینان امر ہے کہ اس سفرنامے کو حضور ممدوحہ کی نظرثانی کا شرف حاصل ہوچکا ہے اور اس وجہ سے اس کے مستند ہونے میں کوئی شبہہ نہیں رہ جاتا۔

"سیاحتِ سلطانی" کے مطالعہ کرنے کے بعد دو چار امتیازی خصوصیات اس میں نہایت نمایاں نظر آتی ہیں۔ مثلاً

۱۔ تسلسلِ واقعات

۲۔ انداز بیان

۳۔ سلاست زبان

۴۔ اختصار

تسلسل واقعات کا یہ عالم ہے کہ روانگی سے واپسی تک کے حالات قلم بند کیے گئے ہیں لیکن انکی ترتیب اس خوبی سے رکھی گئی ہے کہ پڑھنے والے کو ہیز اُلجھن نہیں ہوتی۔ اگر سیاق کلام یا کسی اور ضرورت سے درمیان میں کسی غیر متعلق واقعہ کا ذکر آگیا ہے تو اُسکا جوڑ اس نفاست کے ساتھ لگایا گیا ہے کہ معمولی طور پر کسی کو اُسکا خیال بھی نہیں آتا۔ غالباً یہ جتانے کی ضرورت نہیں کہ بیگم صاحبہ لندن میں بزمانہ جشن تاج پوشیِ ملک معظم موجود تھیں۔ جس فراخ حوصلگی اور تزک و احتشام سے یہ جشن منایا گیا ہے اُسکے مفصل حالات اس سفرنامہ میں درج ہیں اور اُنکی صحت و صداقت کے لیے اسی قدر ثبوت کافی ہوگا کہ حضور ممدوحہ نے اُنھیں بچشم خود ملاحظہ فرمایا ہے اور شاہ بانو بیگم صاحبہ نے نہایت سلیقے سے جمع کرکے سفرنامے کی زینت بڑھائی ہے۔

طرز بیان اتنا پیارا اور سُلجھا ہوا ہے کہ معمولی قابلیت کا آدمی بھی سفرنامہ کے سارے مضامین پر بآسانی عبور کرسکتا ہے۔ جہاں کوئی تشریح طلب بات آگئی ہے وہاں اُسے سمجھا بھی دیا گیا ہے۔ درمیان میں حسب ضرورت تاریخی، جغرافیائی، یا معاشرتی معلومات بافراط موجود ہیں۔ کوئی تاریخی مقام نظر سے گزرا ہے تو اُسکے ساتھ اُسکی قدیم تاریخ بھی باختصار دُہرادی گئی ہے۔ بعض مقامات پر باشندوں کی طرز زندگی پر نہایت دلچسپی کے ساتھ روشنی

ڈالی ہے۔ کہیں کہیں تجارتی اور زراعتی نقطۂ خیال سے ہندوستان کی حالت کو پیش نظر رکھ کر بحث کی گئی ہے اور اس قسم کے مباحث اگرچہ کم ہیں لیکن جو کچھ ہیں اُن کے مفید و سبق آموز ہونے میں شک نہیں۔ ان تمام خوبیوں کے ساتھ بعض مقامات پر عبارت میں انشا پردازی کا رنگ جہاں کہیں موجود ہے وہ حالات خاص طور پر دلفریب پائے جاتے ہیں۔ اس موقع پر سفرنامہ کے بعض اقتباسات سے اگر ناظرین کو حلاوت اندوز ہونے کا سامان فراہم کیا جائے تو غالباً غیر موزوں نہ ہوگا۔

نہر سوئز کے متعلق شاہ بانو صاحبہ نے حسب ذیل خیال ظاہر فرمایا ہے:

یہ نہر درحقیقت مسلمانوں کے عہد عروج کی یادگار ہے۔ جب عمرؓ ابن عاص مصر کے گورنر تھے اُسوقت اُنھوں نے اس راستہ کو نکالا تھا تاکہ رسد رسانی کی کشتیاں جلد رسد پہنچا سکیں۔ لیکن جب مسلمانوں کی حکومت پر زوال آیا تو یہ نہر بھی پامال ہوگئی۔ کیونکہ یہ پہاڑ جو حائل ہے، ریگ کا ہے۔ اور اگر ہمیشہ اسکی خبر گیری نہ ہو تو پُر ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد ۱۸۵۹ء میں سعید پاشا خدیو مصر کے زمانہ میں فرانس کے ایک نامور انجینیر ایم۔ ڈی۔ لیسپ نے اس نہر کو نکالا۔ وہ پہاڑ کاٹنے کے ساتھ ہی ساتھ دونوں جانب پختہ دیوار یعنی پشتہ بھی تیار کرتا جاتا تھا۔ چنانچہ اس نہر کے دونوں جانب بہت مضبوط بند بنے ہوے ہیں۔ یہ نہر ڈیڑھ سو فیٹ چوڑی، ۲۰ فیٹ گہری، اور ۸۰ میل لمبی ہے۔ اسکی تیاری پر ۱۰ کروڑ روپیہ صرف ہوا ہے۔ یہ روپیہ کئی سلطنتوں کا ہے۔ انگریزی سلطنت کا سب سے زیادہ حصہ ہے۔ سابق خدیو مصر، سعید پاشا، نے اپنے حصے بھی فروخت کر دیے تھے انگریزی وزیر اعظم نے بکمال دور اندیشی فوراً خرید لیے۔

فرانس کے کھیتوں کا نقشہ اس طرح کھینچا گیا ہے:۔

جب صبح ۵ بجے آنکھ کھلی تو سرزمین فرانس کی سرسبز و شاداب کھیتیاں لہلہاتی نظر آئیں ..... یہاں بڑے بڑے کھیت ہندوستان کی طرح نہیں ہیں۔ اندازاً چھوٹا کھیت سو فیٹ عریض اور ۵۰۰ فیٹ طویل ہوگا۔ ہل گھوڑوں سے چلتا ہے۔ زمین اونچی نیچی ہے اور پہاڑیوں پر بھی قابل زراعت زمین بنائی گئی ہے۔ جسکو بڑے بڑے کھیتوں سے گلستان بنا رکھا ہے۔ یہ زمین ایسی ہے جیسے کوہی مقامات میں ہوتی ہے۔ اکثر پہاڑیاں سرو کے درختوں سے بھری ہوئی ہیں۔ تمام جھاڑیاں ایسی ہیں جیسے ہندوستان میں کون یا کھاکر یعنی ڈھاک کی ہوتی ہیں۔ لیکن چونکہ خوبصورت درخت قرینہ سے لگائے گئے ہیں اس لیے بہت ہی خوش نمائی پیدا ہوگئی ہے۔

ترکی عورتوں کی معاشرت اور بود و باش کا مختصر خاکہ یہ ہے:۔

ترکی عورتیں انگریزی لباس پہنتی ہیں اور معاشرت یورپین طریق پر ہے۔ مذہب سے ہنوز اُنکا دلی تعلق باقی ہے۔ لیکن آزادی کی موج روز بروز بڑھتی جاتی ہے۔ رسم پردہ کم ہوتی جاتی ہے اگر یہی رفتار رہی تو غالباً مصر کی سی حالت ہو جائے گی۔ تعلیم میں وہ ترقی نہیں جو سُنی جاتی ہے تاہم ترقی کے آثار نمایاں ہیں۔

جناب بیگم صاحبہ بھوپال مسلمانوں کی قومی فلاح و بہبود میں جو دلچسپی لیتی ہیں اُس سے ہندوستان کا بچہ بچہ واقف ہے اور اس لیے آپ نے بزمانہ قیام قسطنطنیہ وہاں کے "مسلمانوں کی عام حالت" کے متعلق جو رائے قائم فرمائی ہے اُسکے صحیح ہونے میں شک نہیں ہو سکتا۔ حضرت مولفہ سفرنامے میں تحریر فرماتی ہیں:۔

سرکار عالیہ فرماتی تھیں کہ یورپ کی ترقیاں اور حوصلے دیکھتے ہوے ترکوں کی حالت دیکھکر یہی نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ انکو ابھی بہت کچھ سیکھنا اور بہت کچھ کرنا ہے۔ وہ ہر حیثیت سے یورپ کی ترقی یافتہ حالت کے مقابلہ میں بہت پیچھے ہیں۔

یہ بھی فرمایا کہ اسلامی اخلاق و مہمان نوازی ضرور ہے جو مذہبی تعلیم کا نتیجہ ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ معاملات مذہب میں ضعف ہے۔ اگرچہ سب میں نہیں لیکن بہت سوں میں ہندوستان کے مسلمانوں سے بھی زیادہ مذہب کے کاموں میں تساہل ہے۔

غرضکہ مضامین کی رنگ برنگی اور درمیانی مباحث و واقعات نے سیاحت سُلطانی کو اُسی شوخ رنگ میں رنگ دیا ہے جسکی بہتات صرف تزک جہانگیری کے مرقع میں پائی جاتی ہے، اور جسکی تشریح کے لیے مولنا شبلی کے موشگاف قلم کی ضرورت ہے۔ اسکے باوجود اختصار سے قابل تعریف کام لیا گیا ہے کوئی بیان ضرورت سے زیادہ مطول نہیں، کوئی بات ایسی نہیں جسے غیر ضروری اور معمولی کہہ سکیں۔ شاید کچھ نکتہ چیں طبائع محسوس کریں کہ بعض

کم ضروری اور معمولی الفاظ وغیرہ کی تشریح تعلیم یافتہ گروہ کے لیے فضول تھی لیکن "سیاحتِ سلطانی" کی لائق مولفہ کو زیادہ تر خیال اپنی ملکی بہنوں کے فائدے کا تھا اور ظاہر ہے کہ اُن میں تعلیم کا چرچا کچھ زیادہ نہیں ہوا - اور اُنھیں اکثر معمولی اجنبی الفاظ کے معانی سمجھانے کی ضرورت ہوتی ہے۔

بہرکیف مستحق مبارکباد ہیں جناب شاہ بانو صاحبہ، جن کی کاوش و کوشش سے علیا حضرت بیگم صاحبہ کے کوائف سفر اس خوبی اور سلیقے سے مرتب ہوے ہیں - کتاب کی لکھائی، چھپائی، کاغذ اور جلد بندی میں خاصہ اہتمام کیا گیا ہے اور کسی شائق علم و ادب کی لائبریری اس کے نسخہ سے خالی نہ رہنا چاہیے -

کتاب کی قیمت درج نہیں ہے - قابل مولفہ نے چونکہ ازراہ ہمدردی قومی اس کا حق تالیف مع مصارف وغیرہ "محمڈن گرلز سکول علیگڑھ" کو دیدیا ہے اس لیے غالباً ڈیوٹی شاپ علیگڑھ سے اسکے لیے فرمایش کرنا چاہیے -

ادب در فن حضرت محمود صاحب طرزی، جن کی روشن خیالی کی ایک ادنیٰ دلیل یہ ہے کہ آپ نے افغانستان ایسے ملک سے جہاں مذاق جدید سے روشناس ہونے کا سامان بہت دیر میں ہوا کرتا ہے، سراج الاخبار کا اجرا کیا ہے اور ایک عرصہ سے اخبار مذکور کی ادارت کی ذمہ داریاں بخوش اسلوبی انجام دے رہے ہیں، ایک نغز گو فارسی شاعر اور جیّد ناثر کا درجہ رکھتے ہیں۔

آغاز اجراے سراج الاخبار سے آپ کا یہ دستور ہے کہ ہر سال آپ اپنے ناظرین کو کوئی علمی تحفہ کسی مفید کتاب کی شکل میں دیا کرتے ہیں - چنانچہ اس سال "ادب در فن" نام کا رسالہ اسی سلسلہ میں شائع کیا ہے - کہنے کو تو یہ رسالہ غزلیات فارسی کا ایک مجموعہ ہے لیکن معنوی حیثیت کو دیکھیے تو اسکے حد درجہ مفید و کارآمد ہونے میں شک نہیں رہتا - آپ نے اُسکا دوسرا نام "محمود نامہ" بھی رکھا ہے جسکی موزونیت اس وجہ سے بھی لطافت خیز ہے کہ پُرانے "محمود نامہ" کی طرح جو ہندوستان میں بھی قدیم نصاب تعلیم میں شریک ہے، جدید محمود نامہ میں بھی ردیف وار غزلیں موجود ہیں - لیکن مضامین کی نوعیت قطعی جداگانہ ہے - اوّل الذکر میں حُسن و عشق کی ایک داستان ہے جسے غائر نظر سے دیکھا جائے تو مبتدیوں کے کانوں تک پہنچانا ہی خلاف اصول ہے - اسکے برخلاف حضرت محمود صاحب طرزی نے اپنے نتائج افکار کا موضوع نہایت بلند رکھا ہے - آپ نے چاہِ زنخداں، مار گیسو، گوہر دنداں یا گلِ رخسار کی بعید از خیال باتوں کو نہیں بَرایا بلکہ مفید اور کارآمد عنوان تلاش کیے ہیں اور اُن پر طبع آزمائی کی ہے مثال کے طور پر دو ایک "ہیڈنگ" لکھے جاتے ہیں :-

حُسن ابتدا - یورپ - مکتب اُناث - اتحاد - ہلال سرخ - دروغ - ریل - غرب و شرق - قلم - خلق - حُسن - وغیرہم

بعض غزلیات اخلاقی نکات سے مملو ہیں - لیکن سب سے زیادہ دلچسپ اس رسالہ کا وہ حصہ ہے جہاں زمانۂ جدید کی ضروریات و ترقیات قلم بند کی گئی ہیں - خوبی کی بات یہ ہے کہ اظہار خیالات میں تعصب، کوتاہ نظری، یا جنبہ داری کو مطلق دخل نہیں دیا گیا - مثلاً "یورپ" کے متعلق لکھتے ہیں ؎

گرچہ در ہر پنج قطعہ کوچکِ آں شد یورپ
لیک آنہا چوں سُہا شد، نیرِ اعظم یورپ

مکتب اناث (مدارس نسوان) کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اُس سے صاف مترشح ہوتا ہے کہ آپ عورات کی ضرورت شناسی باندازہ وافر رکھتے ہیں - لکھتے ہیں ؎

باشد ضرور بہر دمن مکتبِ اناث — زیرا ذکور نیم و دگر نیم شد اناث
پس ہر زنے کہ علم ادب دارد و کمال — با شیر علم را بہ ولدمی دہد اناث
تعلیم علم بہر زناں فرض تر بود — زیرا کہ ہست مادرِ نوعِ بشر اناث

اسی طرح ریل - ایلکٹرک، وغیرہ کے عنوان سے جو غزلیں درج ہیں وہ مفید معلومات اور تشویق کا خاص ذریعہ ثابت ہوسکتی ہیں - یہ ضرور ہے کہ بعض مقامات پر "یوروپین ترقی" کے تاریک رُخ کو بھی نمایاں کردیا ہے اور اسے شاید محتاط طبایع اس لیے پسند نہ کریں کہ بچوں کے جذبات کو ابتدا ہی سے مخالفت کے رنگ میں رنگنا مناسب نہیں - لیکن حضرت محمود طرزی نے تو جو کچھ تعلیم دینا چاہی ہے وہ "خذ ما صفا ودع ما کدر" کے عاقلانہ اصول پر مبنی ہے - اس لیے

تصویر کے دونوں پہلو دکھانے کا اُن پر کوئی اعتراض وارد نہیں ہوسکتا۔

بہرکیف "ادب درفن" نہایت مفید رسالہ ہے۔ اگر اردو میں اسی لائن پر کوئی مختصر سی کتاب لکھکر ابتدائی نصاب تعلیم میں شامل کردی جائے تو زہے نصیب۔ ہندوستان میں غالباً حضرت شوق قدوائی اس کام کے لیے زیادہ موزونیت رکھتے ہیں اور امید کرنا چاہیے کہ وہ ان سطور کے دیکھنے کے بعد اس ضرورت کی تکمیل پر متوجہ ہوں گے۔

"ادب درفن" نہایت عمدہ دبیز کاغذ پر خوشنما ٹائپ کے حرفوں میں چھاپا گیا ہے۔ کاش ایسے اہتمام سے ہندوستان کی درسی کتابیں بھی شایع ہوا کریں۔ رسالہ پر قیمت وغیرہ درج نہیں۔ غالباً ڈاک خانہ افغانستان پشاور کی معرفت یہ رسالہ دستیاب ہوسکتا ہے۔

بحر الحکمت (ہر دو حصہ) | اس نام کے دو رسالے، جو مولوی میر صغر علیصاحب تعلقدار سمستانات ساتولی واللہ درگ علاقہ دکن کی حُسن سعی سے معرض وجود میں آئے ہیں بغرض اظہار رائے موصول ہوئے ہیں۔ مولف نے نہایت جاں فشانی سے اخلاق وحکمت کے بیش بہا خزف ریزوں کو جمع کر کے "بحر الحکمت" کے نام سے ملک کے سامنے پیش کیا ہے۔ حصہ اول کے آغاز میں مولنا شبلی، مولوی علی حیدر طباطبائی، مولوی سید احمد دہلوی، لسان العصر حضرت اکبر الہ آبادی، خان بہادر سلطان احمد ایسے مشہور اہل الرائے واہل قلم بزرگوں کی تقریظیں شامل کی گئی ہیں جن کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ ان حضرات کے نزدیک میر صغر علیصاحب کی یہ کوشش علمی مستحق ستایش وتحسین اور انکی یہ تالیف کارآمد ومفید ہے۔

اصل کتاب پر سرسری نگاہ ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ مولف نے مطالب کی تکمیل میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ البتہ اگر اقوال کے ساتھ قائلین کے نام بھی لکھ دیے جاتے تو اور بھی اچھا ہوتا۔ ان کتابوں کا مطالعہ ہر شخص کے لیے سبق آموز ہوسکتا ہے کیونکہ "بحر الحکمت" فی الواقع ایک دریا ہے جسکی تہ میں نہ صرف اخلاقی وادبی بلکہ روحانی، سیاسی، معاشرتی، اور علمی نکات کے آبدار موتی بھی موجود ہیں اور اگر نوعمر لڑکوں اور نوجوانوں کو سبقاً سبقاً اسکو پڑھایا جائے تو یقیناً نفع بخش ثابت ہوگا۔ محکمہ تعلیمات سرکار نظام اسکو نصاب تعلیم میں شریک کرکے مولف کی قدردانی اور حوصلہ افزائی کرسکتا ہے۔

قابل مؤلف سے ایک شکایت ضرور ہے کہ اُنھوں نے اپنی اس تالیف میں قدیم رنگ بہت چوکھا رکھا ہے جو ممکن ہے کہ خود اُنھیں کا طبعی رنگ ہو۔ ضرورت تھی کہ زمانۂ جدید کے مشاہیر کے اقوال کے لیے بھی "بحر الحکمت" میں جگہ نکالی جاتی۔ آج کل زمانہ کے ساتھ طبائع میں بھی تغیرات پیدا ہوگئے ہیں۔ اور اس صورت میں کہ تمام دنیا میں عورت ذات کی حقوق شناسی کی برقی رَو چل رہی ہے غیر ممکن ہے کہ اُن دقیانوسی خیالات کی رتی برابر بھی قدر کی جائے جنکا عکس مندرجۂ ذیل سطور میں پایا جاتا ہے

عورت کیا ہے؟ مرد کی فکر۔ بیان سے باہر بُرائی۔ ہم نوالہ وہم پیالہ درندہ ۔۔۔۔۔
جنگ بے صلح۔ سونے والی اور تم کو بیدار رکھنے والی۔ دائمی رنج و مصیبت۔
کم عقل کی ہلاکت۔۔ (۲۳۳)

یہ باتیں جو صنفِ نازک کے لیے قدرتاً مزیل حیثیت عرفی ہیں، آج سے دس بیس سال اُس طرف شاید کچھ دلچسپ ثابت ہوسکتی تھیں لیکن آج کل انکی وقعت محال وبعید از خیال ہے۔ میر صغر علیصاحب اگر چاہتے تو اپنے مذہب کے اکثر نامور عُلماء وفضلاء کے ایسے اقوال دستیاب ہوسکتے تھے جو مستورات کی پوزیشن کی کافی وضاحت کرتے ہیں۔

اس قسم کی دو ایک معمولی فروگذاشتوں کے ماسوا "بحر الحکمت" کے صفحات کارآمد ہدایات اور اخلاق وادب کے مفید نکات سے لبریز ہیں جن میں بیشتر ایسے ہیں جو علمی کام کرنے والوں کے لیے "موٹو" کا کام دے سکتے ہیں۔ اُمید کرنا چاہیے کہ قابل مولف کو اپنی سعی جمیلہ کا صلہ پبلک کی جانب سے قدردانی کی صورت میں ملیگا۔ بحر الحکمت حصۂ اول کی قیمت عمر اور حصہ دوم کی ۸ر ہے اور ہر دو حصص منشی سید محفوظ علی جعفری خلف

حضرت مولف (حیدر آباد دکن، افضل گنج، محلہ عثمان شاہی صفر منزل) سے مل سکتے ہیں۔

ذیابطیس | زبدۃ الحکما حکیم ڈاکٹر غلام نبی صاحب پنجاب کے نامور اطبا میں خاص فضیلت رکھتے ہیں۔ آپ کی طبی کتب کا ایک سلسلہ جس میں نمبروار مختلف امراض جسمانی کی تحقیق کی گئی ہے خاص و عام میں مقبولیت حاصل کر چکا ہے۔ اسی سلسلہ "لطف زندگانی" کی ۴۲ ویں کڑی یہ رسالہ ہے جو مندرجہ عنوان نام کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ ذیابطیس ایک ہولناک بیماری ہے اور یہ امر کسی قدر افسوس ناک ہے کہ اسکا زور ہندوستان میں بڑھتا جا رہا ہے۔ یہ موذی مرض زیادہ تر دماغی و ذہنی مشاغل رکھنے والے طبقے میں زیادہ نمودار ہوتا ہے اور حال ہی میں گورنمنٹ عالیہ نے اسکے متعلق ایک تحقیقاتی کمیشن کے تقرر کا ارادہ ظاہر فرمایا ہے جسکی تحقیقات کی ابتدا غالباً پنجاب سے ہوگی۔ ملک کو حکیم صاحب کا ممنون ہونا چاہیے کہ آپ نے اس مختصر رسالہ میں نہایت جامعیت کے ساتھ مرض ذیابطیس کے ماہیت و اسباب پیدائش و طریق علاج کو قلمبند کیا ہے۔ اس سے پہلے بیرسٹر حامد علیخاں صاحب (لکھنؤ) ایک مشرح رسالہ اسی مرض پر لکھ چکے ہیں لیکن چونکہ وہ انگریزی زبان میں تھا اس وجہ سے غالباً اسکا فائدہ محدود تھا۔ اب حکیم صاحب کی بدولت اُردو خواں پبلک کے لیے بھی کافی سامان واقفیت پیدا ہو گیا ہے۔ وہ لوگ جنھیں علمی مشاغل میں اپنے اوقات فرصت گذارنے پڑتے ہیں اس رسالہ کو ضرور مطالعہ کریں۔ قیمت عہ رفی جلد کسی قدر زیادہ ہے لیکن اسکی منفعت کے لحاظ سے، جو اسکے مطالعہ سے متصور ہو سکتی ہی کم ہے۔ ملنے کا پتہ یہ ہے:- حکیم ڈاکٹر غلام نبی صاحب (زبدۃ الحکما) موچی دروازہ لاہور۔

کوکین نامہ | ہندوستان میں "کوکین" کا رواج اس کثرت سے ہوتا جا رہا ہے کہ خوف ہوتا ہے کہیں یہ بلا ہندوستانیوں کے سر اسی طرح نہ آپڑے جس طرح افیون چینیوں کے ساتھ مختص سمجھی جاتی ہے۔ لیکن سچ پوچھیے تو "چین" اور "افیون" کا اختصاص شل پیشتر کے اب باقی نہیں رہا۔ اور ادھر ہندوستانی ہیں کہ مفت کی بلا اپنے سر لے رہے ہیں۔ ضرورت اسکی ہے کہ تقریر و تحریر اور قول و فعل کے ذریعہ سے اسکے استعمال کی کثرت روکی جائے۔ اس سے نہ صرف اخلاقی و جسمانی فوائد حاصل ہو سکتے ہیں بلکہ جرائم میں بھی قابل امتیاز کمی ہو سکتی ہے۔ مقام مسرت ہے کہ حضرت خلیق دہلوی نے "کوکین نامہ" لکھ کر بہت بڑی حد تک اپنے اہل ملک کے لیے سامان سبق آموزی فراہم کر دیا ہے۔ حضرت خلیق دہلی کے ایک نامور اور نکتہ سنج شاعر ہیں۔ ان کے رشحات قلم کے دلفریب نمونے صفحات العصر کے اندر معقول تعداد میں مل سکتے ہیں۔ لیکن "کوکین نامہ" کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ جا بجا ظرافت کا چھینٹا بھی موجود ہے اور اکثر سین اس بیساختگی سے لکھے گئے ہیں کہ بے ساختہ تعریف کرنا پڑتی ہے۔ مثلاً یہ بند ؎

کوکین خواریوں کو نہیں چھوٹتے میاں　گھر میں ذلیل و خوار ہیں کھاتے ہیں جوتیاں
اینٹھن ہے نفس و عضو میں آتی ہیں ہچکیاں　کوکین نوش کرتے ہیں لے کر جمائیاں
کوکین نوشیوں نے نکما بنا دیا
ان گرم جوشیوں نے نکما بنا دیا

اسی طرح مندرجہ ذیل دو ایک بند شاعرانہ خوبیوں کے ساتھ واقعیت و صداقت کا گویا مرقع ہیں ؎

کیوں روگ لگ رہا ہے یہ عہد شباب میں　لذت ہے ایسی کونسی اسکے لعاب میں
خاموش ہو کے کہتے ہیں کچھ کچھ جواب میں　یہ کیف بھنگ میں ہے نہ شغل شراب میں
جوتے لگائے یا کوئی گالی ہزار دے
"یہ وہ نشہ نہیں جسے ترشی اُتار دے"

جو اسکو بیچتے ہیں وہ سب مالدار ہیں　ہے انقلاب دہر پیادے سوار ہیں
بل غل کے کام کرتے ہیں یا روزگار ہیں　پٹی لگا کے بیٹھتے ہیں ساہوکار ہیں
چیزے نماند نقد گراں دام دام رفت
"آں حلال بود بجائے حرام رفت"

اس مسدس کے علاوہ، کئی غزلیں بھی اسی موضوع پر ہیں جو دلچسپی سے خالی نہیں۔ قیمت ۱ر ہے منشی عبدالخالق صاحب خلیق، گلی چابک سواران لال چاہ، دہلی سے یہ رسالہ مل سکتا ہے۔

صحیفۂ نامی | یہ رسالہ جسکا دوسرا نام "خلاصہ شرح معمائے جامیؒ" ہے حافظ محمد یوسف خاں صاحب افسوں بنارسی کی تالیف سے ہے۔ فنِ معما پر شاید یہ پہلی کتاب ہے جو اُردو میں لکھی گئی ہے۔ قابل مؤلف نے نہایت جاں فشانی سے اسکی ترتیب و تکمیل کی منزلیں طے کی ہیں۔ شروع میں اس فن کے اقسام و اصول مشرح طور پر درج کیے ہیں اور پھر امثال و نظائر کے ذریعہ سے اسکے مختلف طریقوں پر روشنی ڈالی ہے۔ "معمے کی حقیقت کا بیان" جو کچھ لکھا گیا ہے اُس سے کافی اندازہ ہو سکتا ہے کہ متقدمین نے "معما" کی تعریف کن الفاظ میں کی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ معما گوئی انسانی ذہانت اور دماغی کمال کا ایک بہترین نمونہ کہا جا سکتا ہے۔ فارسی میں حضرت جامیؒ اس فن کے افضل ترین ماہر سمجھے جاتے ہیں۔ اُردو میں شاید اسوقت تک اس فن کے متعلق کوئی عملی کوشش نہیں کی گئی۔ اس لحاظ سے حضرت افسوں مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے کم از کم ایک مختصر سی بنیاد قائم کر دی ہے جس پر مشترکہ مساعی کے ذریعہ سے بشرط ضرورت بڑی سے بڑی عمارت کھڑی کی جا سکتی ہے۔

کتاب پر قیمت کچھ نہیں لکھی اور غالباً مطبع منشی نول کشور لکھنؤ کے پتہ سے دستیاب ہو سکتی ہے۔

"سید القلم"

کلام الحمید

اُٹھا کے ساغر جو رندِ رسوا بذوقِ شربِ مدام نکلا
نہ زہدِ زاہد ہوا موثر نہ پندِ واعظ سے کام نکلا

صلائے مہر و وفا کی خاطر جو دستِ قدرت نے فال کھولی
تو سب سے پہلے کتابِ الفت میں دردمندوں کا نام نکلا

سنائیں ہم کیا حقیقتِ دل بلا ہی نیرنگِ بزمِ ہستی
کہ جسکو جانا تھا ہمنے پختہ بغور دیکھا تو خام نکلا

بڑی قیامت کی دلربا ہی یہ مزرعہ کشت زارِ دنیا
کہ دانہ جس جس جگہ پہ پایا وہیں پہ دیکھا تو دام نکلا

اٹھی نظر جب بسوئے معنی تو مٹ گئے سب طلسمِ صوری
وہی صنم دلربائے عالم پسندِ ہر خاص و عام نکلا

عجیب مشرب ہی عاشقی کا عجب ہی دیکھی کتاب اُس کی
حلال سمجھے ہوئے تھے جسکو وہ اس میں آکر حرام نکلا

ہمیں تو مذہب نے عشق ہی کے کیا ہی ہوش و خرد سے واقف
وگرنہ کچھ کچھ ہر ایک مذہب کی گفتگو میں کلام نکلا

بڑے مقدس سمجھ کے واعظ کیا تھا ہمنے سلام تجھکو
مگر جو دیکھیں تری ادائیں تو۔ تو ہوس کا غلام نکلا

عجب ہے پیر مغاں کی مجلس کہ جسکا عالم ہے کچھ نرالا
وہاں پہ شیخِ حرم نشیں بھی فدائے مینا و جام نکلا

یہ رعبِ حسنِ کمال دیکھو کہ دیکھکر اُنکو رہ گئے ہم
دلِ پریشاں سے حرفِ مطلب تہ زباں تلک نا تمام نکلا

حمید اُنکی گلی میں آکر رہے ہو تم بھی خراب و رسوا
مگر یہ بیت الصنم تمہارا عجیب بیت الحرام نکلا

عصریات

انسانی دماغ کا وزن

ہاتھی اور ویل کے سوا انسان کا دماغ تمام جانوروں سے زیادہ وزنی ہے۔ دماغ کا اوسط وزن مرد کا ½۴۹ اونس اور عورت کا ۴۴ اونس ہوتا ہے۔ دونوں کا اوسط فرق ۵ اور ۶ اونس کے درمیان رہتا ہے۔ مگر عام طور پر مرد کے دماغ کا وزن ۴۶ سے ۵۳ اونس تک اور عورت کا ۴۱ سے ۴۷ اونس تک ہوتا ہے۔ مردوں کے ۲۷۸ دماغوں میں سب سے وزنی دماغ ۵۶ اونس اور سب سے ہلکا ۳۱ اونس پایا گیا۔ لوشکا (Luschka) کی رائے میں مرد کے دماغ کا اوسط وزن ۱۴۲۴ گرام (قریباً ۵۰ اونس) اور عورت کے دماغ کا اوسط وزن ۱۲۷۲ گرام (قریباً ۴۱ اونس) ہے۔ کراز (Crause) کا اوسط اس سے زیادہ ہے۔ اس کی رائے میں مردوں میں ۱۵۰۷ گرام (قریباً ½۴۸ اونس) اور عورتوں میں ۱۳۵۰ گرام (قریباً ۴۳ اونس) اوسط وزن ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ دماغ کا وزن عمر کے ساتویں سال تک بہت تیزی سے ترقی کرتا ہے۔ اور ۱۶ یا ۲۰ سال کی عمر تک آہستہ آہستہ بڑھتا رہتا ہے اور اسکے بعد تیس چالیس سال کی عمر تک اسکی رفتار ترقی بہت ہی سست رہتی ہے اور یہیں ختم ہو جاتی ہے۔ چالیس سال کے بعد جوں جوں عمر بڑھتی اور دماغی قوائے انحطاط پذیر ہوتے جاتے ہیں، دماغ کا وزن بھی آہستہ آہستہ کم ہوتا جاتا ہے اور فی دہا سال ایک اونس گھٹتا رہتا ہے۔ یہ عمل مرد و عورت دونوں میں یکساں ہوتا ہے۔ پہلے دماغ کی جسامت اور دماغ کی قابلیت میں بھی ایک عام تعلق خیال کیا جاتا تھا۔ کوویر (Cuvier) کا دماغ ۶۴ اونس سے زیادہ وزنی تھا اور ڈاکٹر ایبر کرامبی (Abercrombie) کے دماغ کا وزن ۶۳ اونس، اور ڈوپیٹرن (Dupuytren) کے دماغ کا وزن ½۶۲ اونس تھا۔ اسکے برعکس ایک ہوتنق یا پیدائشی فاترالعقل کے دماغ کا وزن شاذ ہی ۲۳ اونس سے زیادہ ہوتا ہے۔ مگر جدید تحقیقات کی رو سے ان واقعات سے انقطاعی نتائج اخذ نہیں کیے جا سکتے کیوں کہ یہ امر معروف ہے کہ اسقدر وزن بعض ایسے اشخاص کے دماغوں کا بھی معلوم ہوا ہے جن سے کسی دماغی قابلیت کا اظہار نہیں ہوا۔ چنانچہ ہیلڈی نین آف سن سینٹی Heldennan of Cincinnati نے ایک ملٹو کا حال درج کیا ہے جسکی عمر ۴۵ سال تھی اور جسکے دماغ کا وزن ½۶۸ اونس تھا۔ وہ تمام عمر غلام رہا اور کبھی خصوصیت کے ساتھ سمجھدار اور تیز فہم خیال نہیں کیا گیا۔ وہ ناخواندہ تھا مگر کہا جاتا ہے کہ بہت سنجیدہ، غور پسند اور کفایت شعار تھا۔ انسیر صاحب (Ensor) (رپورٹ الزبتھ کے ڈسٹرکٹ میڈیکل افسیر) مظہر ہیں کہ کیری (Carey) مشہور آئرش ریفارمر کے دماغ کا وزن ۷۱ اونس تھا۔ ایم نکیفوروف (M. Nikiforoff) نے اوزان دماغ پر ایک مضمون شائع کیا ہے جس میں بتایا ہے کہ دماغ کے وزن کا دماغی قابلیت سے کچھ تعلق نہیں ہے۔

دماغ کے وزن کے لحاظ سے "کالجین" مظہر ہے کہ حسب ذیل ۱۲ نام اول ہیں، وزن گرام میں درج ہے۔ (۱) ایون ٹورجنیف روسی ناول نویس ۲۰۱۲؛ (۲) جوزف یونی فرانسیسی ماہر قانون ۱۹۳۵؛ (۳) جارج کاویہ فرانسیسی و جرمنی عالم حقائق الاشیا ۱۸۳۰؛ (۴) ای۔ ایچ۔ ناٹ امریکہ کا ماہر علم جر ثقیل ۱۸۱۴؛ (۵) فرانس کس کراس، جرمنی کا عالم دینیات ۱۸۰۰؛ (۶) جان ایبر کرامبی اسکاٹ لینڈ کا طبیب ۱۷۸۶؛ (۷) بنجمن ایف بٹلر امریکہ کا مدبر ۱۷۵۸؛ (۸) ایڈورڈ اولنی امریکہ کا عالم ریاضی ۱۷۰۱، (۹) ہرمن لیوی جرمنی انشا پرداز ۱۶۹۰؛ (۱۰) لے، وفشیل امریکہ کا عالم ارضیات ۱۶۶۶؛ (۱۱) ولیم ایم۔ تھیکری انگلستان کا ناول نویس ۱۶۵۸؛ (۱۲) روڈلف لینز جرمنی کا انشا پرداز ۱۶۳۶۔

پروفیسر بوس تیس سال پہلے

پودوں میں اعصابی تحریک کی سرایت کے مضمون کے متعلق جسکو رائل سوسائٹی نے حال میں شائع کیا ہے (دیکھو "عصریات" العصر اکتوبر نمبر) ڈاکٹر جے۔ سی بوس کا ذکر کرتے ہوے پروفیسر ہومرشیم کاکس Prof. Homersham Cox نے لکھا ہے:-

"اس بات کو تیس برس ہوے کہ میں نے ڈاکٹر بوس کو وہ خیالات ظاہر کرتے ہوے سُنا تھا جو اب انھوں نے عملی تجربوں سے ثابت کیے ہیں۔ مجکو اچھی طرح یاد ہے کہ اُسوقت مجھپر اُنکی قابلیت اور ملنسار طبیعت کا اثر ہُوا تھا۔"

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اعلی اکتشافات ایک دن میں نہیں ہوتے۔ جب عالمانہ تخیل کی مدد سے ایک طباع شخص قریباً الہام کے طور پر یہ خیال کرتا ہے کہ ایک خاص واقعہ ضرور صحیح ہے اسکے بعد بھی اُسکو برسوں سخت ناکامیوں سے مقابلہ کرنا پڑتا ہے اور جس بات کا وہ یقین رکھتا ہے اسکی صحت کو متواتر کامیاب تجربوں سے ثابت کرنا پڑتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ ذکاوت (Genius) کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ "وہ محنت کرنے کی غیر محدود قابلیت کا نام ہے"۔

بہروں اور گونگوں کی کانگرس

سارہون میں تمام دنیا کے بہرے گونگے، اپنی تیسری کانگرس کے اجلاس کے لیے جمع ہوے تھے۔ انگلستان سے ۳۰ اور اسکاٹ لینڈ سے ۱۰ نمایندہ شامل تھے۔ ریاست ہاے متحدۂ امریکہ سے بیس بہرے گونگے آئے۔ نمائندوں میں جرمنی آسٹریا۔ بلجیم۔ ناروے۔ سوئیڈن۔ اسپین۔ پرتگال۔ سوئزرلینڈ۔ جاپان ہر جگہ کے لوگ تھے۔ کانگرس نے ابی ڈی ایل ایپی (Abbe de L'Epee) کی جو گونگوں اور بہروں کی تعلیم کے فرانسیسی قاعدہ کا بانی تھا دوصد سالہ یادگار منائی۔ تمام نمایندوں نے اپنی رپورٹ اشارات کی زبان میں پیش کی۔ ایک ترکی گونگے کی حرکات جسمانی کی غیر معمولی صحت اور برجستگی نے اس فن کی فتح اور کامیابی ثابت کر دی۔ پروگرام میں گونگوں کے تھیٹر کا تماشہ اور سینٹ راک کے گرجا میں جہاں ایبی ڈی ایل ایپی دفن ہے بھجن گانا بھی شامل تھا۔

انسانی جسمانی ترقی زندگی کے پہلے ۷ سال میں

بچہ پیدا ہوتے ہی وزن میں تقریباً سات پونڈ ہوتا ہے اور اسکی لمبائی تقریباً اُنیس انچ ہوتی ہے۔ پہلے دو تین دن چار اور سات اونس کے درمیان وزن کم ہوتا ہے۔ اسکے بعد وزن میں اضافہ ہونے لگتا ہے۔ اول چھ ماہ تک ہر ہفتے ۴ اور ۶ اونس کے درمیان وزن میں بیشی ہوتی ہے۔ پہلی ششماہی کے اختتام سے پہلے وزن دُونا ہو جاتا ہے۔ اور پہلے سال کے ختم سے قبل تین گُنا ہو جاتا ہے۔ دل کی حرکت قریباً ۱۳۰ اور تنفس ۳۴ مرتبہ فی منٹ کے حساب سے ہوتا ہے۔ اور حرارت جسمانی بڑے آدمیوں کی نسبت ایک درجہ کم ہوتی ہے۔ ساتویں سال کے تمام ہونے سے پہلے وزن تقریباً ۴۴ پونڈ ہو جاتا ہے۔ یعنی پہلے سال کے ختم پر جو وزن ہوتا ہے عمر کے ساتویں سال کے قریب وہ دُونا ہو جاتا ہے اور اس وقت قد تقریباً ۴۴ انچ ہوتا ہے۔

ہونہار بچوں کی پیدایش کا وقت

تمام مہذب ممالک میں روزانہ اموات اور پیدایش کے درج رجسٹر ہونے کا قاعدہ ہے اس سے بہت سے نتائج اخذ کیے جاتے ہیں۔ مثلاً عمر کا اوسط معلوم ہوتا ہے۔ یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اموات اور پیدایش میں کیا نسبت رہتی ہے۔ لڑکے زیادہ پیدا ہوتے ہیں یا لڑکیاں؟ کس مرض میں اموات زیادہ ہوتی ہیں؟ اس طرح سے اور بھی بہت سی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ مگر اہل امریکہ نے پیدایش کی رپورٹ سے یہ معلوم کیا ہے کہ بڑے بڑے عقلمند، باکمال اور قابل و با اثر لوگ سال کے کس حصہ میں پیدا ہوے ہیں یہ جاننے کے لیے انھوں نے سال کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ دونوں ششماہی کی تفصیل حسب ذیل ہے:-

نام پیشہ یا کام	اول ششماہی	دوم ششماہی
شاعر	۲۵	۱۵

واعظ	۲۷	۲۸
سائنس داں	۳۰	۲۴
فلاسفر	۲۵	۱۵
ماہر جنگ	۲۲	۱۳
مدبر	۲۵	۲۰
ماہر علم موسیقی	۸	۴
مصور و سنگ تراش	۸	۶
مورخ اور اخبار نویس	۲۶	۲۵

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ لائق افراد کی پیدائش جنوری سے جون تک زیادہ ہوئی ہے۔ یہ علمی پہلو سے کوئی معمّا نہیں ہے کیوں کہ اسکے صرف یہ معنی ہیں کہ سال کا مخصوص حصہ جنین کے دماغ کی ساخت کیلیے موسمی اثرات دوسرے حصہ سے بہتر رکھتا ہے اور موسمی اثرات کے دماغ سے، تعلق رکھنے سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا۔

ذیابیطس پر سرکاری توجہ

ذیابیطس کا مرض دماغی کام کرنے والوں کا سب سے بڑا دشمن ہے۔ ہندوستان میں اسکی ترقی روزافزوں ہے۔ جوں جوں تعلیم، علمی مشاغل اور دوسرے دماغی کام اس ملک میں ترقی کرتے جاتے ہیں۔ یہ مرض بھی اپنے دائرۂ ہلاکت کو وسیع کرتا جاتا ہے۔ گورنمنٹ آف انڈیا نے اسکی تیز رفتار ترقی پر ملک کی بہبودی کے لیے توجہ مبذول فرمائی ہے اور وہ عنقریب ایک قابل اور تجربکار ڈاکٹر کو اس مرض کی تحقیقات پر مامور کرے گی کہ وہ اس مرض پر مقامی حیثیت سے غور کرے۔ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ تحقیقات کا سلسلہ غالبًا اول پنجاب سے شروع ہوگا۔ اسکے اسباب و علاج کے متعلق بعض کا خیال ہے کہ دیسی طبیبوں اور ویدوں کی بھی رائے اور مدد حاصل کیجائے گی۔

موتی تابوت کی حیثیت سے

اصلی موتی محض ایک کیڑے کا مزار ہے جسکو سیپ اپنے اندرونی کیڑے کو آزاررسانی سے بچنے کے لیے بناتی ہے۔ یہ کیڑا اپنے میزبان کو تکلیف دیتا ہے جو اپنے بچاؤ کے لیے ایک چونے کا مادہ اپنے جسم سے نکالتا اور اس کیڑے کے گرد لپیٹتا ہے۔ اس بات سے کہ یہ مادہ بہت چمکدار اور خوب صورت ہوتا ہے اسکے قدرتی قدر و فائدہ میں تو کچھ فرق نہیں ہوتا مگر انسان کی نگاہ میں اسکی قیمت بہت بڑھ جاتی ہے۔ گویا سیپ اس کوشش میں کہ اپنے موذی مہمان سے نجات پائے اپنے آپ کو اس سے زیادہ ہوشیار اور طاقت ور دشمن کا شکار بنا لیتی ہے۔ موتی نہ صرف کیڑے ہی کی خراش کا نتیجہ ہوتے ہیں بلکہ اور بھی ایسی چیزیں ہیں جو سیپ کے اندرونی غلاف میں خراش پیدا کرکے یہی نتیجہ پیدا کرتی ہیں اگرچہ یہ نتیجہ اُس درجے اور منزلت کا نہیں ہوتا۔ ریت کے ریزے نیز اور قسم کی چھوٹی چیزیں اگر اس مطلب کے لیے سیپ میں داخل کردی جائیں تو وہ بھی ایک قسم کا موتی بنکر نکلیں گی البتہ وہ موتی آب و تاب میں ایسا نہ ہوگا جیسا اصل کیڑے کا تابوت ہوتا ہے۔ ڈاکٹر ولہیم برنٹ (Dr. Wilhelm Berndt) نے ایک مضمون کے دوران میں لکھا ہے:۔

موتی کیا چیز ہے؟ فی نفسہ بہت حقیر ہے! صرف کاربنیٹ آف لائم (چونے کا ایک مرکب) کی ڈلی ہے جسمیں جان دار مادہ کا جزو بھی شامل ہے۔ اور اسکے بیرونی غلافوں کی ساخت کی وجہ سے اسکا رنگ خوب صورت نظر آتا ہے جو روشنی کی مداخلت کا نتیجہ ہے۔ بعض گھونگھوں میں بھی جو گویا موتی کی ماں ہیں اس قسم کا رنگ ہوتا ہے۔ گہر اور مادہ گہر بالکل ایک ہیں۔ کیمیائی لحاظ سے بھی دونوں یکساں ہیں۔ صرف شکل میں اختلاف ہے۔ موتیوں کی اصلیت مختلف ہوتی ہے۔ کچھ زمانہ ہوا عام خیال یہ تھا کہ بعض اجرام غیر (Foreign Bodies) مثلاً ریت کے ریزے، اسفنج کے ریشے، سیپی میں داخل ہوجاتے اور اُن پر چونے کے ہم مرکز غلاف چڑھتے رہتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اس قسم کے موتی بھی جو غیر اجرام سے بنتے ہیں فطرت میں اپنا وجود ضرور رکھتے ہیں۔ باشندگان چین جو مظاہر قدرت کا مشاہدہ خوب کرتے ہیں بدھ کی ننھی ننھی تصویریں سیپی میں رکھ دیتے ہیں جن پر موتی کے مادہ کی تہ چڑھ جاتی ہے۔ لیکن اصلی موتیوں کی بناوٹ مختلف اور زیادہ دقیق ہے جیسا کہ میبوس فلیپائی، ڈبوبوئس، ہیڈرمین، وغیرہ سائنس دانوں کی تحقیق سے ظاہر ہوتا ہے۔

سمندر کی سیپیوں میں جیسا کہ اب معلوم ہوا ہے موتی کی پیدائش تقریباً ہمیشہ ایک خاص قسم کے کیڑے کی موجودگی پر منحصر ہے جو ٹریمیٹوڈ (Tremetode) یا سسٹوڈ (Cestode) قسم کے کیڑوں کے قبیلہ سے تعلق رکھتا ہے۔ ڈیو بوئس کہتا ہے کہ "سب خوبصورت موتی محض ایک کیڑے کا تابوت ہے اور دنیا کے بہت سے حسینوں کو سخت تعجب ہوگا جب اُن کو یہ معلوم ہوگا کہ وہ اپنی گردن میں حشرات الارض کے ہزاروں ڈالرز کے قیمتی تابوت پہنے ہیں"۔

موتی کئی لحاظ سے جان داروں کے مشابہ ہیں۔ وہ بیمار ہو سکتے اور مر سکتے ہیں۔ بیمار ہو تو ان کی چمک دمک ماند پڑ جاتی ہے۔ اور وہ کچھ داغدار اور بھدے نظر آنے لگتے ہیں۔ بے احتیاطی سے ہاتھ لگانے سے موتی علیل ہو جاتے ہیں۔ اور پہننے والے کی بیماری سے بھی (اگر اُسکے جسم میں تیزابی خاصیت پیدا ہو گئی ہے) اثر پذیر ہوں گے۔ کہا جاتا ہے کہ موتیوں کو بہت عرصہ تک اُتار کر نہ رکھنا چاہیے کیوں کہ جلد سے جو چکنا مادہ خارج ہوتا رہتا ہے وہ انکو محفوظ رکھنے میں مُدد دیتا ہے۔

ہندوستان کی ضروریات

صنعت و حرفت میں بہت پیچھے ہونے کے سبب سے ہندوستان اپنی ضروریات کے لیے غیر ملکوں کا محتاج ہے۔ ذیل کے اعداد سے معلوم ہوگا کہ ہندوستان غیر ملکوں سے اپنی ضروریات کس قدر قیمت پر فراہم کرتا ہے۔ اور بہت سی اشیاء کی حالت میں یہ ظاہر ہے کہ اُنکے لیے خام مال پیسہ کے مول یہاں سے جاتا ہے اور پھر وہی روپیہ کے مول ہمیں ملتا ہے۔ یہ اعداد ۱۹۱۱-۱۲ء کے ہیں:-

نام اشیا	قیمت روپیہ
ملبوسات	۳۵۵۷۸۱۹۱
سوتی کپڑا	۵۱۷۱۹۳۲۷۸
اُونی کپڑا	۳۵۰۱۹۵۷۳
شراب	۱۹۴۶۴۳۲۹
کاغذ	۱۲۴۵۰۰۲۳
سامان خورد و نوش	۳۱۹۰۵۹۶۱
متفرقات	۹۹۲۵۸۸۸۴
میزان	۷۵۰۸۷۰۲۳۹

ہندوستان کی تجارت

۱۹۱۱-۱۲ء میں ہندوستان کی تجارت درآمد و برآمد جو غیر ملکوں سے ہوئی ہے اسکے سرکاری اعداد و شمار سے معلوم ہوتا ہے کہ سال زیر نظر میں برطانیہ کلاں و آئرلینڈ سے ۹۱۷۵۷۵۷۷۹ روپے کا مال ہندوستان میں آیا اور اس کے مقابلہ میں ہندوستان سے ۶۰۱۱۷۲۴۹۰ روپے کا مال گیا۔ اسکے معنی یہ ہیں کہ ہندوستان کو ۳۱۶۴۰۳۲۸۹ روپے کا نقصان رہا۔ رُوس سے بھی ہندوستان کو تجارت میں نقصان ہوا کیوں کہ رُوس سے ۱۱۴۷۹۱۷ روپے کا مال آیا اور اسکے مقابلہ میں رُوس نے ہندوستان سے کچھ نہیں خریدا۔ گویا اس قدر روپے کا ہندوستان کو خسارہ ہُوا۔ ماریشس (افریقہ) سے بھی ہندوستان کو ۲۲۲۳۱۰۰۴ روپے کا نقصان رہا۔ ان ملکوں کے علاوہ باقی تمام ملکوں سے جن سے ہندوستان کا لین دین ہے نفع رہا۔ چین سے پندرہ کروڑ نواسی لاکھ کا، جاپان سے تیرہ کروڑ ستائیس لاکھ کا، جرمنی سے تیرہ کروڑ چونسٹھ لاکھ کا اور ریاستہائے متحدہ امریکہ سے دس کروڑ سینتیس لاکھ کا ہندوستان کو فائدہ ہوا نیز آسٹریلیا، ہنگری، بلجیم، فرانس، اٹلی، عرب و ایران، لنکا، اسٹریٹس سٹلمنٹس آسٹریا، مصر، جنوبی امریکہ، اور عدن ہر ایک سے جداگانہ ایک کروڑ سے زائد منافع رہا۔ ان میں سے اٹلی سے پانچ کروڑ اور لنکا سے سات کروڑ وصول ہوے۔ ان کے علاوہ دیگر ممالک غیر سے ۱۵۰۹۱۹۳۴۳ روپے کا مال ہندوستان نے خریدا اور ہندوستان سے اُن ممالک کو ۲۰۲۳۸۰۵۹۵ روپے کا مال گیا لہذا ہندوستان کا ۱۵۱۴۶۱۲۵۲ روپیہ فاضل رہا۔

مندرجہ بالا اعداد و شمار سے ظاہر ہے کہ انگلستان، روس اور ماریشس کے علاوہ ہندوستان کو تمام ممالک سے تجارت میں نفع ہوا ہے کیونکہ یہی ملک ایسے ہیں جنکا مال ہندوستان میں زیادہ آیا ہے اور ہندوستان سے اُن میں کم گیا۔ کم ازکم برطانیہ کا ہندوستان پر ہمیشہ تجارتی قرضہ رہتا ہے۔ تمام اعداد و شمار کا مجموعی نتیجہ یہ ہے کہ ممالک غیر نے ہندوستان کی تجارت درآمد سے ایک ارب چوالیس کروڑ پانچ لاکھ چونتیس ہزار تین سو تراسی روپیہ کمایا۔ اور ہندوستان

نے اپنی پیداوار سے تجارتِ برآمد کے ذریعہ سے دو ارب ستاسی کروڑ اٹھانوے لاکھ بیاسی ہزار تین سو چھبیس روپیہ وصول کیا۔ اس طرح ۱۹۱۲ء میں ہندوستان کی دولت میں تراسی کروڑ ترانوے لاکھ ستائیس ہزار نو سو بیالیس روپے کی بیشی ہوئی جو واقعی طمانیت بخش ہے۔

ہندوستانی طالب علم اور صنعتی تعلیم

وکٹوریا جوبلی ٹکنیکل (صنعتی) انسٹیٹیوٹ بائیکلا بمبئی کے امتحان منعقدہ اپریل ۱۹۱۳ء کے نتائج معلوم ہو گئے ہیں:۔ ۳۲ طالب علم روئی کاتنے کے امتحان میں شریک ہوئے، ان میں سے ۲۷ پاس ہوئے؛ ۲۳ طالب علم روئی بننے کے امتحان میں بیٹھے جن میں سے ۱۶ کامیاب ہوئے؛ پانچ طالب علموں نے روئی رنگنے کا امتحان دیا اور سب کامیاب ہوئے۔ ۴۵ برقی انجنیری کے امتحان میں داخل ہوئے ان میں سے ۳۰ کو کامیابی ہوئی۔ ۱۲ امیدواروں نے موٹرکار انجنیری کا امتحان دیا ان میں سے ۴ کو سند کامیابی ملی۔ اس تعلیم گاہ کے امتحانات کا تعلق لندن سے ہے اس لیے امتحان لینے میں کسی قدر دقت اور دیر ہونا اغلب ہے۔ خصوصاً یہ خیال کرتے ہوئے کہ ایسے امتحانات کا زیادہ حصہ عملی ہوتا ہے۔ بہرکیف نتائج کو دیکھتے ہوئے اس تعلیم گاہ کے پرنسپل ہر طرح قابل مبارکباد ہیں۔ مگر ضرورت ہے کہ ملک میں اس قسم کی تعلیم گاہیں بکثرت ہوں۔

خاموش کہر بگل

اس وقت تک جہازوں میں یہ ترکیب رکھی گئی تھی کہ جب موسم بہت کہر دار اور دھندلا ہو کہ سامنے کی چیز دکھائی نہ دے سکے تو ایک گھنٹی یا بگل کے ذریعہ سے پیش آنیوالے تصادم کی خبر ہو جاتی تھی۔ یہ گھنٹی یا بگل ہر وقت سامنے کی طرف کی ہوا کی لہریں اس طرح حاصل کرتے تھے کہ جب تک ہوا کی لہریں سامنے کی جانب سے کسی آنیوالے جہاز یا ساحل یا چٹان کے حائل ہو جانے سے منقطع نہ ہو جائیں یہ گھنٹی یا بگل بجتے رہتے تھے۔ انکی خاموشی خطرہ کی علامت سمجھی جاتی تھی۔

اب سر ہائرم میکسیم (Sir Hiram Maxim) نے ایک نیا آلہ تصادم کی پیش بینی کے لیے ایجاد کیا ہے۔ اس میں سائرن Siren (ہوائی لہروں کی آواز کا آلہ) بھی شامل ہے جو تیز درجے کی بھاپ کے ذریعہ سے زبردست ہوائی لہریں پیدا کرے گا جنکا تواتر فی سکنڈ ۱۴ یا ۱۵ اٹک ہوگا امید کی جاتی ہے کہ یہ لہریں اگرچہ اس قدر دھیمی ہونگی کہ سنائی نہیں دے سکتیں مگر ان میں آگے کی طرف دور تک جانے کی زبردست طاقت ہوگی۔ اگر ان لہروں کے راستہ میں کوئی چیز مثلاً جہاز یا چٹان یا کوئی تودۂ برف حائل ہوگا تو یہ لہریں واپس آئیں گی اور دوسرے آلہ پر آواز بازگشت پیدا کرینگی پھر یہ آلہ بازگشت ایک دوسرا یا عقل آلہ سے متعلق ہے جو واپس لوٹ آنے والی لہروں کی طاقت درج کرنے کے لیے ہے۔ اس طرح اُس چیز کا فاصلہ بلکہ نوعیت بھی معلوم کرنا ممکن ہے جس نے آواز کی لہروں کو روکا ہے سائرن کو ڈک پر لگانا مقصود ہے تاکہ رات کے وقت یا کہر میں اگر کسی دوسرے جہاز یا تودۂ برف کی موجودگی کا شبہہ ہو تو اُسکا رُخ ہر سمت میں پھیرا جا سکے اور سمندر کی حالت دور تک معلوم ہو سکے۔

ہندوستان میں باغبانی کا انحطاط

پونا کی زراعتی کانفرنس میں مسٹر جی بی۔ پٹاوارڈن قائم مقام اسسٹنٹ پروفیسر نباتات زراعتی کالج پونا نے مغربی ہند میں پھلوں اور پھولوں کی باغبانی کے امکانات کے متعلق ایک دلچسپ مضمون پیش کیا پروفیسر موصوف نے پھل اور پھول دونوں میں اعلیٰ کامیابی حاصل ہو سکنے کی بابت از روے سائنس مدلل بحث کی۔ انھوں نے فرمایا کہ

یہ بات غور کرنے کے قابل ہے کہ اس شعبہ میں یہاں کے رہنے والوں نے کس قدر کم کام کیا ہے۔ اس ملک کا خاص پھل مثلاً آم اپنی ترقی کے لیے پرتگالیوں کا ممنون ہے جیسا کہ اسکی مختلف اقسام کے نام سے ظاہر ہوتا ہے۔ یہ غفلت اور بھی زیادہ قابل لحاظ اس وجہ سے ہے کہ ہمارے سلف فن باغبانی سے نہایت درجہ دلچسپی رکھتے تھے اور قسم قسم کے پھول اور طرح طرح کے خوبصورت باغیچے لگاتے تھے جیسا کہ سنسکر...

میں ان کے متعلق نہایت عمدہ خیالات کے بے شمار حوالوں سے ثابت ہے۔ بعد کی نسلوں میں یہ مذاق مفقود ہوتا گیا یہاں تک کہ فن باغبانی کا مذاق اب ہم میں صرف چنبیلی، گلاب اور تلسی کے اُگانے تک محدود ہے۔

دل کتنا کام کرتا ہے؟

والر (Waller) نے حساب لگایا ہے کہ دل ہر حرکت پر جس قدر طاقت خرچ کرتا ہے، یا بالفاظ دیگر جس قدر کام کرتا ہے وہ ۲۴۰۰ گرام میٹر کے برابر ہے اور کل کام ۲۴ گھنٹے کا ۔۔۔۔ ۲ کیلوگرام میٹر کے برابر ہے۔ اسکے یہ معنی ہیں کہ ایک مزدور دن بھر میں جتنا کام کرتا ہے انسان کا دل اسکا ایک چوتھائی حصّہ کام کرتا ہے۔

جراثیم کا گھر

جراثیم خردبین کے انکشاف کا نتیجہ ہیں۔ جراثیم کا وجود معلوم ہونے کے بعد یہ دریافت کرنا بھی دلچسپ ہے کہ جراثیم کہاں کہاں پائے جاتے ہیں۔ عالم میں یہ بہت کثرت سے پھیلے ہوے ہیں۔ انکی موجودگی ہوا میں مختلف حالتوں میں مختلف ہوتی ہے۔ وہ سرکوہ اور وسط بحر کی ہوا میں موجود نہیں ہوتے۔ شہروں میں اور خصوصاً گھروں میں یہ بکثرت ہوتے ہیں۔ کرۂ ہوائی میں خاک اور نم کے ذرّوں سے لپٹے ہوے بھی پائے جاتے ہیں۔ مرطوب موسم کی نسبت خشک موسم میں زیادہ ہوتے ہیں اور گھروں کی نسبت کھلی ہوا میں کم ہوتے ہیں۔ یہ بھی دریافت ہوا ہے کہ مدرسہ کے کمروں میں جب طالب علم خاموش اپنی اپنی جگہ بیٹھے ہوں تو جراثیم اُس حالت کی نسبت کہ طلبا کو چلنے پھرنے کی اجازت دے دیجائے بہت قلیل ہوتے ہیں۔ جو ہوا ہماری سانس سے خارج ہوتی ہے وہ بھی خردبینی کیڑوں سے پاک ہوتی ہے مگر جب ہم بولتے اور کھانستے ہیں تو ہمارے منہ سے جو ہوا نکلتی ہے وہ جراثیم سے مبرا نہیں ہوتی۔ پانی میں بھی جراثیم مختلف تعداد میں ہوتے ہیں۔ پانی کو جوش دینے سے یہ کیڑے مرجاتے ہیں۔ انسان کی جلد میں تو انکا کچھ شمار ہی نہیں۔ ہمارے مُنھ، معدے اور آنتوں میں بھی جراثیم ہوتے ہیں۔ خون اور جسم کے اور اجزا بحالتِ صحت جراثیم سے بری ہوتے ہیں مگر معدے سے اکثر جراثیم خون میں داخل ہوتے رہتے ہیں لیکن اگر انسان طاقت ور ہے تو یہ جانور خون میں داخل ہونے کے بعد ہلاک ہوجاتے ہیں کیوں کہ خون میں اُن کے ہلاک کرنے کے لیے مخصوص ذرات پائے جاتے ہیں مگر بیماری اور کم زوری کی حالت میں جراثیم کو بڑھنے کا موقع مل جاتا ہے اس لیے کہ خون میں وہ ذرّات جو جراثیم کو ہلاک کرتے ہیں کم ہو جاتے ہیں۔ جب جراثیم خون میں غلبہ پا لیتے ہیں تو انکی وجہ سے اور بیماریاں نمودار ہوتی ہیں۔ بھوک کی حالت میں بھی جراثیم کو ہلاک کرنے کی طاقت خون میں کم ہو جاتی ہے۔ اس لیے نہار مُنہ ایسی جگہ جہاں یہ کیڑے بکثرت موجود ہوں بیماری کا اندیشہ ہوتا ہے۔ جانوروں کے دودھ میں بھی جراثیم ہوتے ہیں۔

"انڈین جرنل آف میڈیکل ریسرچ"

اس نام کا ایک سہ ماہی رسالہ جاری ہُوا ہے۔ جسکا پہلا نمبر حال ہی میں شائع ہوا ہے۔ اس رسالہ کو ڈائرکٹر جنرل انڈین میڈیکل سروس اور سینیٹری کمشنر گورنمنٹ آف انڈیا بندرہ دیگر ڈاکٹری پیشہ اصحاب کی مدد سے اڈٹ کرتے ہیں۔ یہ رسالہ انڈین ریسرچ فنڈ ایسوسی ایشن (انجمن سرمایۂ تحقیقات ہندوستان) کا سرکاری آرگن ہوگا۔ سر ہارکورٹ بٹلر نے بطور مقدمہ کے حسب ذیل الفاظ لکھے ہیں: "انڈین ریسرچ فنڈ کے لیے وہ وقت آگیا ہے کہ وہ اپنا ایک سرکاری ارگن رکھے۔ ہندوستان میں علم صحت کی ترقی کے لیے اس اصطلاح کے وسیع معنی میں جو کچھ کیا جارہا ہے انڈین جرنل آف میڈیکل ریسرچ اسکا ایک عمدہ ریکارڈ ہوگا۔ اسکے صفحات سرکاری اور غیرسرکاری لوگوں اور ہر قسم کے مضامین کے لیے کھلے ہے ہیں جن کا میڈیکل اور سنیٹری (علم حفظانِ صحت) علم سے براہ راست یا بالواسطہ کوئی تعلق ہو۔ یہ "پالوڈزم" (Paludism) اور "سائنٹفک میمائرز" (SCIENTIFIC MEMOI) کی جگہ لے گا۔ علمی تحقیقات کا کام ہندوستان میں بہت تیزی سے ترقی کر رہا ہے۔ میں اُن لوگوں

سے سنجیدگی کے ساتھ استدعا کرتا ہوں جن کو اس سے دلچسپی ہے کہ وہ اس رسالہ کی اعانت کریں اور اسکو اس قابل بنائیں کہ وہ دنیا کے اور طبی علمی رسالوں میں ممتاز جگہ حاصل کرے"۔

اس رسالہ کی سالانہ قیمت ۶ روپے ہے۔ اِسکو مسرز ٹھیکر اسپنک اینڈ کمپنی کلکتہ نے نہایت آب و تاب سے تیار کیا ہے۔ پہلے نمبر میں ۱۶ مضمون ہیں جو نہایت دلچسپ ہیں۔ ہیضہ۔ پیچش۔ مخفی ملیریا وغیرہ مضامین خصوصین (Speciniiats) کے قلم کے لکھے ہوے ہیں۔ اشکال اور فوٹو بھی جا بجا بہت نفیس اور خوب صورت شامل کیے گئے ہیں۔

کاغذ کی بوتلیں

ولایت میں کاغذ کی بوتلیں ایجاد ہوئی ہیں جن میں دودھ، شراب اور دیگر اشیا بھری جا سکتی ہیں۔ یہ بوتلیں بہت ہلکی ہوتی ہیں کانچ کی بوتلوں سے ان میں تقریبًا نصف وزن ہوتا ہے۔ اسکے باوجود بیان کیا جاتا ہے کہ یہ اس قدر مضبوط ہیں کہ دو ڈھائی من بوجھ کی متحمل ہو سکتی ہیں۔ قیمت میں بھی یہ بہت سستی ہیں۔ انکے بنانے میں ایک بوتل پر ایک پیسہ لاگت آتی ہے۔ چوں کہ یہ وزن، قیمت اور مضبوطی تینوں باتوں میں کانچ کی بوتلوں پر قابل ترجیح ہیں اس لیے اگر ان میں کوئی اور نقص ظاہر نہ ہوا تو کچھ مدت بعد کاغذ کی بوتلوں کا عام رواج ہو جانا یقینی ہے۔

مسٹر رابندر ناتھ ٹیگور اور نوبل پرائز

مسٹر رابندر ناتھ ٹیگور کو اعلیٰ کمالات شاعری کے صلہ میں ایک لاکھ بیس ہزار روپے کا گراں قدر انعام ملا جو نوبل پرائز کے نام سے موسوم ہے۔ مسٹر رابندر ناتھ ٹیگور کو نوبل پرائز عطا ہونے کے یہ معنی ہیں جیسا کہ سر آستوش مکرجی نے صحیح طور پر کہا ہے کہ "اِس معروف شاعر کے کلام نے عالمگیر مقبولیت حاصل کر لی ہے اور اسکے تخیل کے نہایت نازک اور نفیس نتائج حُسن، وطن پرستی، اور روحانیت کے عنصر سے مالا مال ہیں اور وہ قومی اور مقامی علائق سے آزاد ہیں"۔ مسٹر ٹیگور کا بعض کلام شاعرانہ تخیل کے بالاترین مقامات سے ہم آغوش ہے۔ اُن کی ابتدائی نظمیں اُسوقت سے شائع ہونی شروع ہوئی تھیں جبکہ انکی عمر مشکل سے بیس سال کی ہوگی۔ اس طرح اس وقت تک انکی شاعری کے تین دَور ہوتے ہیں۔ پہلا دور عاشقانہ نظموں کا تھا۔ دوسرے دَور میں وطن پرستی کے جذبات ہیں اور تیسرے دور میں ہم اُنکے روحانی جذبات دیکھتے ہیں۔ اُنکے کلام کا بہت سا حصہ انگریزی میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ اور نقادانِ سخن نے اُنکی شاعری کا لوہا مانا ہے۔ اُنکو نوبل پرائز ملنے پر نہ صرف تمام ملک بلکہ تمام مشرق بجا فخر کر سکتا ہے۔ حضور ویسرائے لارڈ ہارڈنگ اور نائب وزیر ہند مسٹر مانٹیگو نے بھی مسٹر ٹیگور کو نوبل پرائز پانے پر مبارکباد دی ہے۔ ہم یہ معلوم کر کے اور بھی خوش ہیں کہ کلکتہ یونیورسٹی نے جناب ممدوح کو ۲۶ دسمبر ۱۹۱۳ء کو ڈاکٹر آف لٹریچر کی اعزازی ڈگری نذر کی ہے۔ اس موقع پر خود نوبل پرائز کے متعلق چند کلمات کہنا ضرور دلچسپ ہوگا۔ اس انعام کے لیے ایک بہت عظیم الشان سرمایہ ہے جسکی تقسیم کے لیے معتمدان کی ایک جماعت ہے جو ہر سال ایسے افراد کو یہ انعام دیتی ہے جنھوں نے عام بہبود میں سب سے بڑا حصہ لیا ہو۔ اس سرمایہ کے پانچ حصے ہیں جو حسب ذیل شعبوں میں کام کرنے کے لیے وقف ہیں۔ (۱) طبعیات (۲) کیمیا (۳) طب یا علم افعال الاعضا (۴) ادب (۵) حفظ امن۔ اس سرمایہ کا قائم کرنیوالا مُلک سوئیڈن کا مشہور سائنس داں الفرڈ نوبل ڈائنامیٹ کا موجد تھا۔ اُسی کے نام پر اس انعام کا نام رکھا گیا ہے۔ الفرڈ نوبل کا انتقال ۱۰ دسمبر ۱۸۹۶ء کو ہوا اور اُسنے قریبًا ۱/۲ ۷ لاکھ پونڈ کی دولت چھوڑی جس سے متذکرۂ بالا پانچ شعبوں میں کام کرنیوالوں کو یہ انعام عطا ہوتا ہے۔ اولین انعامات نوبل کی پانچویں برسی کے موقع پر ۱۰ دسمبر ۱۹۰۱ء کو تقسیم کیے گئے۔ انعام دینے کا اختیار سوئیڈن کی چند علمی جماعتوں کے سپرد ہے اور سرمایہ کے انتظام کے لیے ڈائرکٹروں کی ایک کمیٹی ہے جسکا پریسیڈنٹ سوئیڈن کی گورنمنٹ مقرر کرتی ہے۔

فریبِ عشق

کسی کے حسن کا چرچا جو نمایاں نہ ہوا فریبِ عشق دلوں کے لیے فسانہ ہوا
کسی نے پردہ نشین بنکے جب غرور کیا "سمندِ ناز پہ اک اور تازیانہ ہوا"

ملک تو تھے ہی مگر آدمی بلا نکلا گرا کے سجدہ اُدھر سے اِدھر روانہ ہوا
گناہ کرکے کیا جب قصور کو محسوس یہ کام فطرتِ آدم سے عاقلانہ ہوا
اسی میں گنج سعادت تھے آدمی کیلیے یہی وہ کام تھا شیطان سے جو دانہ ہوا

سُنی جو روز ازل میں صدائے عہدِ الست متاعِ درد کو لیکر یہ دل روانہ ہوا
فریبِ عشق میں لذت یہ آدمی کو ملی
کہ اُس نے دیکھ لیا جلوۂ خفی و جلی
اگرچہ عالم اصغر ہے آدمی کا وجود ہے کائنات کی لیکن اسی جہان سے نمود
وہ روحِ پاک کہ روح القدس ہے جس سے مراد کیا ہے حضرت انسان ہی پہ اُسنے ورود
بشر ہے سارے زمانہ میں قابلِ اعزاز تمام گنجِ سعادت اسی میں ہے موجود
مئے حقیقت و عرفاں کا خم اسی کو ملا یہی تھا عالمِ اسفل کی بزم میں مسعود
جو خود کو پا نہ سکیں اُنکی اپنی ہے یہ خطا خدا نے سب کو بنایا ہے نغمۂ ذی ورود
شناخت اپنی خدا کی شناخت ہے گویا بشر کے نفس میں روشن ہے ایک شمعِ وجود
جھکیں جو آب کو آتش کو اپنا کام نہیں
سوا خدا کے کسی کا بشر غلام نہیں
جمالِ یار نے دھوکے دیے مگر کیا کیا فریبِ عشق میں بھٹکی رہی نظر کیا کیا
کیے ہیں شعلۂ آتش کو لاکھ بار سجود رہے ہیں قبلۂ تسلیم بحر و بر کیا کیا
ستائشوں میں ستاروں کی کاٹ دیں راتیں بنا رہا درِ مقصد رُخِ قمر کیا کیا
صنم کدہ میں بتوں کو جھکائے سر ہمنے کسی کی دھن میں پھرے ہائے دربدر کیا کیا
کہیں کنشت و کلیسا کہیں یہ دیر و حرم وصالِ دوست کی خاطر بنائے گھر کیا کیا
کہاں کہاں پہ جھکانا پڑا ہے سر ہمکو ہوئے ہیں شوق میں پُرخون دل و جگر کیا کیا
کہیں گرے کہیں تڑپے کہیں غش بھی ہوئے خیالِ یار نے ہمپر کیے اثر کیا کیا
کسی کے حسن کی بجلی نظر فریب رہی ہمارے خرمنِ جاں پر گرے شرر کیا کیا
غرضکہ حسنِ ازل کی تجلیوں کا فروغ ہوا فریبِ محبت سے کارگر کیا کیا
کہیں پہ خلد و جہنم کہیں پہ حور و قصور ملی ہے سود و ضرر کی ہمیں خبر کیا کیا
کھلی جو آنکھ تو پائی ہر ایک شئی ملیں
جمالِ حسن تھا آباد کاخ کہگل میں
سُنی ہے کل یہ درِ میکدہ سے مینے صدا بڑی عجیب تھی اُس نغمۂ مغاں کی ادا
خمارِ بادۂ دانش کی دھن میں اک مدہوش یہ کہہ رہا تھا بصد نغمہ ہائے ہوشربا

بیا بحلقۂ رندانِ بزمِ عشق بیا کہ جرعۂ ز شرابِ بقا دہند ترا
باین مبیں کہ تو خاکی و خاک تیرہ بود باین نگر کہ توئی مظہرِ ہما سما
بکوش تاکہ ز چشمت غبار برخیزد کہ تا معائنہ سازی ظہورِ نورِ خدا

یہ سوز و ساز تھا ایسا کہ سُنکے دل میرا رہا نہ ذوقِ محبت سے پائے بند جفا
ملا جو پیرِ کہن واقفِ حرم مجکو سرور و امن میں ہو کر یہ پیر دل نے کہا
منم کہ شہرۂ شہرم بہ عشق ورزیدن
مگر کہ دیدہ نیالودہ ام بہ بد دیدن
لگا ہے تیر جگر دوز اب قرار کہاں کروں میں وعدۂ فردا کا انتظار کہاں
بہشت نقد ہے حاصل یہاں بھی اے واعظ رہوں میں تیری جناں کا امیدوار کہاں

نہیں سکھائی تھی رہبانیت نبیؐ نے کہیں گروہ نغمہ کہاں اور تری ستار کہاں
اگر ہے ذوقِ حقیقت تو آنکھ کھولکے دیکھ کہ جا رہے ہیں یہ حوروں کے بیقرار کہاں
دلوں میں دولتِ احساس ہوش کی ہے کمی خدا پرستوں کا لیکن یہ حال زار کہاں

فریبِ عشق کا دونوں طرف ہے دور عجیب مگر جو راز کو سمجھیں وہ ہوشیار کہاں

تصوف اور تمدن ولائے مہر و وفا — یہ سارے ایک ہیں لیکن ہیں ازدواج کہاں

غلام ہمتِ آن رندِ عافیت سوزم
کہ در گدا صفتی کیمیا گری داند — حمید کوٹلوی

عرض ماتم

لائے گا رنگ نیا کیا کوئی بختِ ناکام — ایک پہلو پہ مجھے، پھر نہیں ملتا آرام
پھر شرر ریز ہے کچھ آج مرا سوز دروں — پھر مری سوختہ سامانی کے پلٹے ایام
پھر ہوا آبلہ ساماں، نفسِ گرم مرا — پھر میسر ہوئے ہونٹوں کو مرے آتشیں جام
آپ ہی آپ کلیجہ سا گھرا جاتا ہے کوئی — قلب میں میرے گزرتے ہیں ہزاروں اوہام
آشنا پھر تن و سر بالش و بستر سے نہیں — رات بھر کیوں نظر آتے ہیں پریشاں احلام

یہی اُلجھن تھی کہ ناگاہ کسی جانب سے
آئی کانوں میں مرے یہ خبرِ نافرجام

اس قدر جلد ترا قطع جوانی ہے ہے — کیسی ناوقت ہوئی اس صبحِ دل افروز کی شام
کیا اسی واسطے گردش میں تھا اے چرخِ اثیر (ق) کیا اسی واسطے تیار رہتے تھے، تیرے اجرام
کہ جدا کر دے وہی پھول تو گلدستہ کا — نازشِ بزم تھی، اُف، جسکی جبینِ بسام
مٹ گئی ہائے، تری ہستیِ تکرار طلب — صورتِ حرفِ غلط مٹ نہ گیا میرا نام
رو میں الفت کو تری یا تری دلداری کو — یا کریں یاد ترا خُلقِ حسن، صدقِ کلام
اب کہاں وہ تری تجدیدِ محبت پیہم — اب کہاں وہ ترے پیمانِ وفا کا ابرام
جنکے بس چل ہی پڑے کچھ نہ بتایا ہمکو — کیا اہم ایسا دیا پیکِ قضا نے پیغام
اوڑھکر چادرِ بادِ وفتہ جاتے ہو کہاں — ہے کدھر عزم سفر بندھ گیا کیسا احرام
پیشتر و بزم کے تھے ہمنے یہ مانا، لیکن — اس میں لازم نہ تھا ایسا تمہیں کرنا اقدام
کچھ نہ سوچے کہ اس اندازِ تغافل پہ ہمیں — دینگے احبابِ وطن ترکِ وفا کا الزام
کچھ نہیں کھلتا کہ ہے قفلِ خموشی کیسا — اپنے اسلام میں تو روزۂ مریم ہے حرام
لوگ کیسے ہیں وہاں رنگِ مجالس کیا ہے — دیس کیسا ہے جہاں تمنے کیا ہے بسرام
گرم کیا ایسی چلی تیرہ سموم دنیا — نخلِ تابوت کے سایہ میں جو ڈھونڈا آرام

یادِ احباب بھی ہوتی رہے گاہے گاہے

یہ نہ بھول ہی جاؤ ہیں ای خلد مقام — نیاز فتح پوری

حمدِ باری تعالیٰ

عیاں کی اپنی قدرت سے یہ بزمِ کن فکاں تونے — وجودِ مہر و مہ روشن کیا مثلِ شمع ساں تونے
فلک کی سقف میں انجم کے تونے قمقمے ٹانکے — سجایا اپنی قدرت سے یہ سب کون و مکاں تونے
تجھی سے امہاتِ سفلی و آبائے علوی ہیں — زمیں تونے بنائی اور بنائے آسماں تونے
کرشمہ تیری ہی قدرت کا ہے نیرنگِ عالم میں — مگر کنہ حقیقت کو رکھا پھر بھی نہاں تونے
کہیں تو نحن اقرب ہے تو ہی ست گردن — کہیں ملنے کو فرمایا براوجِ لامکاں تونے
تجلی طورِ سینا پر کبھی تیری نظر آئی — اگرچہ ذرہ ذرہ سے کیا جلوہ عیاں تونے
نشانِ معرفت تیرا ہر اک شے سے ہویدا ہے — اور اس پر بھی رکھا ہے آپکو پھر بے نشاں تونے
دہانِ صنع سے تونے گلِ آتش میں جاں پھونکی — یدِ قدرت سے گوندھا ہے خمیرِ انس و جاں تونے
دیے انسانکو تونے حواسِ ظاہر و باطن — کیے اسکو عطا شک و یقین وہم و گماں تونے
وہ آدم جسکی ہستی وجہ آشوبِ ملائک تھی — سماعت کی نہ غلط اسکے نہ عرضِ قدسیاں تونے
وہ آدم جو کہ مسجودِ ملک تھا صحنِ جنت میں — بہشتِ خلد سے پھینکا اُسے سوئے جہاں تونے
کیا پھر اشرف المخلوق اور اپنی خلافت دی — عطا کیسا کیا اسکو عروجِ عز و شاں تونے
ہوا جلوہ نما دیر و حرم دونوں میں پھر تو ہی — کیا ہنگامہ برپا شورِ ناقوس و اذاں تونے
کہیں یہ جلوہ آرا تو ہے شانِ بے نیازی میں — رکھا یوسف کو بھی ہمصحبتِ زندانیاں تونے
دہکتی آگ میں پہلے تو پھینکا ابنِ آذر کو — بنایا آتشِ نمرود کو پھر گلستاں تونے
کرم کرنے پہ جب آیا تو کیا کیا کر دیا آخر — عزیزِ مصر یوسف کو بنایا ناگہاں تونے
شفا ایوب کو یونس کو تونے پھر رہائی دی — کلیم اللہ کو اپنا بنایا میہماں تونے
غرض کیا کیا دکھائے جلوے شانِ دلربائی کے — دکھائے مختصر کیا کیا نہ حسنِ دلستاں تونے
کسیکو دلربائی سے کو حیرت میں جا ڈالا — کسیکو محوِ حسنِ حور رکھا ہے جاوداں تونے
لگائی آگ پروانوں کے جسم اور جانمیں تونے — نکالا شمع کے دل سے بھی ہونکا دھواں تونے
رکھا ہے بلبلوں کو گرچہ وقفِ نالۂ و شیون — گلوں کو بھی رکھا چاکِ گریباں خزاں تونے
زمیں پر ہی بنائے کوہ و صحرا اور یم و دریا — زمیں پر ہی بنائے مرغزار و بوستاں تونے
صدف میں ڈالکر پانی کے قطرہ کو کیا موتی — بنایا پھر اُسے آرائشِ تاجِ شہاں تونے

کہیں قطرہ سے انساں کو بنایا اور کیا ناطق ۔۔۔ کیا پھر نطق کو اپنی ثنا میں دُر فشاں تونے
کہیں پانی سے تونے دختِ رز کو کر دیا پیدا ۔۔۔ کہیں پتھر سے پیدا کر دیا لعلِ یماں تونے
بنایا مشک تونے خونِ نافِ آہوئے چیں کو ۔۔۔ اسیرِ زلفِ مشکیں کر دیا قلبِ تپاں تونے
کہیں خارا کو تونے کر دیا آئینہ سا روشن ۔۔۔ کہیں سنگیں کیا خارا سے دلہائے بتاں تونے
کہیں پانی میں رکھا شعلۂ زارِ برقِ درخشاں کو ۔۔۔ سمندر کا کہیں آتش میں رکھا خانماں تونے
خراماں ہے نسیمِ شام اور بادِ صبا تجھ سے ۔۔۔ کیا ابرِ بہاری کو بھی تو قطرہ زناں تونے
حوادث گردشِ گردوں میں مکنون تونے رکھے ہیں ۔۔۔ رکھی سیرِ کواکب میں بھی تاثیرِ زیاں تونے
شعاعِ مہر و مہ میں خاصیت تونے نہاں رکھی ۔۔۔ اثر انگیز رکھے ہیں سُہیل و فرقداں تونے
کیا بے باپ کے پیدا جنابِ ابنِ مریم کو ۔۔۔ کیا اُس بے زباں بچہ کو پھر معجز بیاں تونے
کیا ہی ناقۂ صالح کو پیدا سنگِ خارا سے ۔۔۔ نکالا گلشنِ آتش سے بھی آبِ رواں تونے
کیا اژدر عصا کو اُسپہ موسیٰ کو دیا قابو ۔۔۔ ہوا پر کیا سلیماںؑ کو کیا ہی حکمراں تونے
کبھی تو یاد رکھے پردہ میں سیلابِ جن بھیجا ۔۔۔ کبھی کی آب میں مضمر فنائے دشمناں تونے
رکھا ہی قہر اپنا دشمنوں کی قہرمانی پر ۔۔۔ رکھا ہی عاجزوں پر لطف اپنا بیکراں تونے
رکھا امیدوارِ مرحمت ہر ایک عاصی کو ۔۔۔ کیا ہی اپنے بندوں پر کرم بھی جاوداں تونے
اسیرِ نفس و شہوت ہوں چھڑا لے انکے ہاتھوں سے ۔۔۔ سُنی ہی بارہا مجھ سے یہ غم کی داستاں تونے
ترا احساں یہ کیا کم ہی کہ با این ظلم و نادانی ۔۔۔ کیا ہی مجھکو اپنی حمد میں رطب اللساں تونے
ترا احساں یہ کیا کم ہی کہ اپنی عین رحمت سے ۔۔۔ رکھا ہی مجھکو اب تک جبہہ سائے آستاں تونے

سخن گستر ہوا ہی لاابالی تیرے ایما سے
عطا کی تونے گویائی زباں تونے دہاں تونے ۔۔۔ **فضل ستار**

شوقِ مہجور

شکر خدا کے کار ساز چھٹی تو آج مل گئی ۔۔۔ دل کی کلی جو بند تھی فرطِ طرب سے کھل گئی
آفتیں لاکھوں جھیل کر آج یہ دن ہوا نصیب ۔۔۔ دو سو ادو برس کے بعد آج کہیں کھلا نصیب
بچھڑوں سے ملنے جلنے کا آج زمانہ آگیا ۔۔۔ دل سے سحابِ غم ہٹا ابرِ نشاط چھا گیا
میرے سمندِ شک فام تجکو خدا ہی کی قسم ۔۔۔ راہ میں چوکیوں پہ تو بھول کے بھی نہ لینا دم
دل میں فورِ شوق سے صبر کی تاب ہی نہیں ۔۔۔ وقت کسی طرح کٹے جلدی سے پہنچوں گھر کہیں

اپنی روانگی کا تار بھیج تو دیا میں ضرور ۔۔۔ آمدنا گہاں مگر ہوگی بہت ہی پُر سرور
ہوگا بہت نظر فریب منظرِ دیدہ لربا ۔۔۔ خندۂ زیرِ لب اُدھر شوق ادھر بڑھا ہوا
ہوگی ادائے سادگی بڑھکے ہر اک سنگار سے ۔۔۔ میری طرف وہ تشنہ حور دیکھیگی جبکہ پیار سے
فرطِ خوشی و شوق سے شرم و حیا دبائیگی ۔۔۔ رازِ دلی کو ظاہر اینچی نظر چھپائیگی
سوچیں گی وہ کہ "یا خدا آگئے یہ یہاں کہاں" ۔۔۔ شرم و خوشی و شوق کی ہونگی علامتیں عیاں
چاہینگی وہ بہت کہ میں حالتِ دل نجان لوں ۔۔۔ ہونگی بھی ایسی کامیاب یہ میں کیسے مان لوں
ہونٹ چبائے جائینگے تاکہ ہنسی آنے پائے ۔۔۔ سر نہ اُٹھایا جائیگا تاکہ یہ بھید کھل نجائے
میرے سوالوں کے جواب دینگی وہ سوچ سوچکر ۔۔۔ باتوں سے تاکہ تاڑلوں میں نہ کہیں دلی اثر
انکی وہ فطرتی حیا لاکھ اُنھیں دبائیگی ۔۔۔ ہونٹوں پہ کھیلتی ہوئی انکی ہنسی نجائیگی
پھر انھیں کچھ سنگار کا اپنے خیال آئیگا ۔۔۔ دیکھکے اپنی سادگی دل میں ملال آئیگا
دل میں کہیں گی شرم سے سامنے مجھکو دیکھکر ۔۔۔ اُنسے یکایک آئینگے تھی یہ کہاں مجھے خبر
ننگے پڑے ہیں ناک کان بالو میں تیل تک نہیں ۔۔۔ سر پہ دوپٹہ میلا سا، کرتے میں بیٹ تک نہیں
مہندی تو کب سے رکھی تھی میں نے اکاہی چھوٹ لی ۔۔۔ سر کیلیے بھی کل ہی میں نے بھگو نہ دی کھلی
دل میں یہ کہتے ہونگے کیا اب مجھے دیکھ دیکھکر ۔۔۔ میلی کچیلی میں بھی ہوں بال بھی ہیں یا تر بتر
آکے غرورِ حُسن پھر دور کرے گا یہ خیال ۔۔۔ مُڑکے ذرا ہٹائینگی چہرہ سے اپنے سر کے بال
چہرہ وہ اُنکا چاند سا ہوگا اب اور دلفریب ۔۔۔ ہوگی ادا بھی صبر سوز عشوہ بھی رہزنِ شکیب
دیکھکے ان اداؤں کو مجھسے رہا نہ جائیگا ۔۔۔ دل میں بھی ہوگا اختلاج شوق بھی گدگدائیگا
پیچھے ہٹینگے اُنکے پاؤں آگے بڑھینگے میرے ہاتھ ۔۔۔ ہوگا زیادہ میرا شوق اُنکی جھجک کے ساتھ ساتھ
میں بھی بڑھے جاؤنگا گو وہ بن بن جائینگی ۔۔۔ دل [illegible]
پھر تو وہ تیلی سی کمر ہوگی اور میرا ہاتھ ۔۔۔ [illegible]

ایلو وہ ریل رک گئی آگیا وہ پلیٹ فام
تختہ پہ ہے لکھا ہوا صاف مرے وطن کا نام ۔۔۔ **سعید بریلوی**

آہِ سیمابؔ

تپشِ ہجر سے رہتا ہے دگرگوں ترا حال ۔۔۔ جیسے بیتاب ہو وارفتۂ تاثیرِ جمال
فلسفیت یہ ترے قلب کی ہے بالاجمال ۔۔۔ صادق آتا ہی مری رائے میں تجھپر یہ مقال

ایک جا رہتے نہیں عاشقِ بدنام کہیں
دن کہیں رات کہیں صبح کہیں شام کہیں

دائرہ تیری پریشانی کا کب ہے محدود   مرکزِ صبر پہ ہوتا ہے یونہیں تیرا ورود
نیستی تیری ہے آسایشِ عاشق کی نمود   گرمیِ حسن سے اک آن میں بجھتا ہے وجود
دلِ پرسوز کو کھینچا کیا آہیں بنکر
رہنمائی میں ہا شوق کی راہیں بنکر

جس طرح تجکو نہیں ہے کسی پہلو پہ قرار   کروٹیں یونہیں بدلتا ہے کسی کا بیمار
تو ہے بالکل مری آشفتہ سری کا نقشا   موت ہی پر ہے تری زیست کا بس دار و مدار
سوزِ فرقت سے جو تو جلکے فنا ہوتا ہے
مرکے بیمارِ محبت کی دوا ہوتا ہے

عقل ہوتی ہے پریشاں کہ تجھے کیا کہیے   سرِ شوریدہ کہ عاشق کا کلیجا کہیے
ہر دل بستگیِ حسن تماشا کہیے   یا نظر بازوں کی ہمت کا نمونا کہیے
طبعِ صد رنگ ہے تو یا دلِ بیتاب ہے تو
کوئی بجلی کا کھلونا ہے کہ سیماب ہے تو

کسی کروٹ کسی پہلو بھی سکوں تجکو نہیں   جیسے بیمار ہو بے چین دمِ بازپسیں
یا پُر افشاں ہو عروسِ شبِ عشرت کی جبیں   یا کسی شوخ کی ہو صبح تلوّن آگیں
برق رفتار ہے تو شوخ نگاہی کی طرح
بے قراری ہے تجھے جگنو کی تتلی کی طرح

یوں تو سیماب نقطہ گنے کو اک بات ہے تو   عاشقوں میں سببِ کشفِ مہمات ہے تو
ظاہرا منظرِ پامالیِ جذبات ہے تو   اور بباطن دلِ عاشق کی کرامات ہے تو
اب بتا دلولۂ عاشقِ جانباز کہوں
یا میں بیتابیِ دل کا تجھے آغاز کہوں

تجھ سے ہو جاتے ہیں سب عقدۂ خود بینی حل   جلوہ آرا ہے پسِ آئینہ بنکر صیقل
بے تہ رہتا ہے بیکار ہوس کا عمل   جیسے اک نثرِ پُر الفاظ کا مطلب مہمل
قائم اتنا رہو تو ہو تو عجب ہے تاثیر
خاک ہو جائے تو کہتا ہے زمانہ اکسیر

کچھ عجب معجزۂ حسنِ خود آرا دیکھا   تیرا اے پارے ترقی پہ ستارا دیکھا
چشمِ اشہر نے مگر ماجرا سارا دیکھا   بعد مرنے کے یہ اعجاز دوبارا دیکھا
طالبِ زر کی نظر تجھ پہ جما جاتی ہے
کشتہ ہونے پہ تری خاک بھی کام آتی ہے

اشہر لکھنوی

مسٹر رابندر ناتھ ٹیگور کو مبارکباد

آج کسکے نام پہ ہندوستاں کو فخر ہے   کسکی مضموں آفرینی پر جہاں کو فخر ہے
موجِ دریا بنگئی طبعِ رواں کو فخر ہے   شاعری کو ناز۔ بنگالی زباں کو فخر ہے
ایشیا تو ایشیا۔ ہے آجکل یورپ میں شور
مستحق نوبل پرائز کے ہوے مسٹر ٹیگور

ہوگئی مشہورِ دوراں خوش مقالی آپکی   خوش مقالی بنگئی ہے خوش جمالی آپکی
نیچرل مضمون۔ پاکیزہ خیالی آپکی   اہلِ مغرب مانتے ہیں باکمالی آپ کی
بانکپن میں سادگی ہے سادگی میں بانکپن
آفریں صد آفریں کہتے ہیں سب اہلِ سخن

کیا نرالے ہیں مضامیں کیا اچھوتا ہے کلام   بزم کی آرائشیں ہیں رزم کے ہیں اہتمام
اہلِ عرفاں پی رہے ہیں بادۂ وحدت کے جام   پریمیوں کو پریم کا رس آرہا ہے صبح و شام
باغ سمجھے ہیں عنادل گر رہے ہیں ٹوٹکر
نیچری کہتے ہیں نیچر بھر دیا ہے کوٹ کر

ہر زمینِ شعر بول اٹھتی ہے میں گلزار ہوں   مصرعہ مصرعہ کہہ رہا ہے ابرِ گوہر بار ہوں
لعل و گوہر جڑ رہے ہیں جوہری بازار ہوں   ہنس کے رہتا ہوں سنہ میں تیونکا ہار ہوں
روزمرہ ہے سراسر شعر خوانی آپکی
ہے تصنع سے بری معجز بیانی آپ کی

آپ کے دیوان کا ہر شعر ہے رشکِ چمن   ناز کرتی پھر رہی ہے بلغ میں بے سخن
اور پروانے ہیں شاعر تم ہو شمعِ انجمن   فخر کرتی ہے تمھاری ذات پر بزمِ سخن
عشق بازوں کے لیے ہیں عشق کی جانبازیاں

طفلِ مکتب کو سکھائی ہیں ادب مونیاں

واقعی علمِ ادب میں بوستاں کا باب ہے   مجلسی مضمون میں اخلاق ہے آداب ہے
غیرتِ کانِ جواہر، گوہرِ نایاب ہے   دوستوں کی دل لگی ہے محفلِ ارباب ہے

بادۂ وحدت سے صوفی جھومتے ہیں کیف میں
شعر پڑھ پڑھکر تھاتے گھومتے ہیں وجد میں

دیش بھگتی کے لیے نازک بیانی ہے کہیں   بُردباری انکساری خاکساری ہے کہیں
اور ہندوستاں کی پاسداری ہے کہیں   جاں نثارانِ وطن کی جاں نثاری ہے کہیں

بھر دیا جذبِ محبت نظم میں تاثیر ہے
سمن جو کھینچا ہے جیتی جاگتی تصویر ہے

اہلِ مغرب چونک اُٹھے قدر دانی دیکھکر   مستحق انعام کا ہندوستانی دیکھکر
ہوگئے قائل طبیعت کی روانی دیکھکر   آفریں کہنے لگے معجز بیانی دیکھکر

معدنِ علم و ہنر کے بے بہا الماس ہو
ہند میں تم شیکسپیر اور کالی داس ہو

قدر افزائی سے ہمت بڑھگئی ہے آپکی   علم کی دنیا میں عزت بڑھگئی ہے آپ کی
نیکنامی اور شہرت بڑھگئی ہے آپکی   ساتھ دولت کے طبیعت بڑھگئی ہے آپکی

فخر ایسی ذات پر کرتا ہے کُل ہندستاں
دو مبارکباد تم بھی اے خلیقِ شادماں   **خلیق** دہلوی

الاجل مسمّی

معنیٔ اللہ باقی سے جو ہیں ناآشنا   گوشِ دل سے کیا سنیں وہ کُلُّ مَنْ عَلَیْہَا فَانٍ کی صدا
بے ثباتیٔ بہارِ باغِ دنیا دیکھ لو   پھول جو کھلتے ہیں اُنسے آتی ہے بوئے فنا
رات بھر کی زندگی رکھتی ہے شمعِ انجمن   صبح کو وہ اور لاکھوں حسرتیں عبرت فزا
دیکھتے ہی جلوۂ صبحِ قیامت خیز کو   شبنمِ رخسارِ گل سے اُڑگئی بوئے وفا
ہے حبابِ بحر سے بھی کم ہماری زندگی   دامنِ آبِ رواں سے کچھ تو ہے وہ آشنا
اپنی حالت قابلِ صد حسرت و افسوس ہے   جسکو اک دم کا سہارا بھی نہیں اے حسرتا
اور پھر لاکھوں بلائیں اُسپہ دامنگیر ہیں   دشمنِ جانِ حزیں بغض و حسد حرص و ہوا
یہ تغافل ہے کہ سامانِ سفر کرتے نہیں   روز ہمکو کانوں میں آتی رہتی ہے بانگِ درا
آرہی ہے یہ منادی کی صدا ۔ اے غافلو   جانتے ہو منزلِ فانی کو کیوں دار البقا
قصرِ عالیشان بنواؤ مگر اے منعمو!   گوشۂ تاریکِ مرقد کو نہ بھولو اک ذرا
کون اسکو جان سکتا ہے بجز ربِّ علیم   جام کسکی چند روزہ زندگی کا بھرگیا
بادۂ غفلت کا نشہ روز و شب اچھا نہیں   چاہیے دو ہی شئے دَعْ مَا کَدُرْ خُذْ مَا صَفَا

زندگی کیا ہے؟ خدا کی یاد میں رہنا مدام
موت کیا ہے؟ اپنی وجہِ آفرینش بھولنا   قدسی بانسی

وقتِ اجل

(سرور مرحوم کی ایک غیر مطبوعہ نظم)

ہمکو ہے معلوم، آئیگی چمن میں کب خزاں   پھول مرجھائینگے کب اور کب جھڑینگی پتیاں
ہیں فضائے عرش پہ تارے سحر تک میہماں   اے اجل! لیکن ہے سربستہ ترا رازِ نہاں

کاہشیں دن بھر جو رہتی ہیں دل ناکام کو   لطفِ صحبت دوستوں میں ہیں اُٹھاتے شام کو
لیٹتے ہیں بستر پہ شب کو خوابِ راحت کیلئے   کچھ ادائے فرضِ طاعت، کچھ عبادت کے مزے
پر نہیں پابندیٔ صبح و مسا تیرے لئے   کوئی ساعت ہو برابر ہے قضا! تیرے لیے

ہمکو ہے معلوم، ہوگا بدرِ کامل کب ہلال   آئینگے سوئے چمن کب طائرانِ خوش مقال
اور یہ بھی جانتے ہیں اک مقرر وقت پر   سبز کھیتوں کو بنائیگی خزاں ملبوسِ زرد

تیرے آنے کا کریں لیکن، اجل کب انتظار
کوئی موسم ہو، کوئی دن ہو، کہاں تجھکو قرار

کیا وہ موسم تیری آمد کا ہے، مرگِ ناگہاں!   کرتی ہے بادِ صبا پھولوں سے جب سرگوشیاں
یا وہ دن ہیں ڈھلکر جب گلستاں میں گلاب   زرد پڑجاتا ہے مانندِ شعاعِ آفتاب

تیرا سکہ ہے رواں قلزم میں بھی اے فتنہ کوش!   تو وہاں بھی ہے جہاں موجیں ہیں سرگرمِ خروش

ہوتیں بھی صدائے نغمۂ شیریں یہاں ہیں ۔ اک دلِ جانستاں ظالم! تری تمکیں ہیں ہیں
تیری جولاں گاہ ہی کاشانۂ امن و اماں ۔ لے اجل تو ساتھ ہے ہم تو وہ جاتے ہیں جہاں

تیرا قبضہ ہو وہاں بھی آہ اے بیدادگر! ۔ بیٹھکر دو دوست ملتے ہیں جہاں زیرِ شجر
شعلہ افگن تیغ تھی تیری صفوفِ جنگ میں
اے اجل! تیری تجلی ہے غرض ہر رنگ میں

رباعیاتِ شاکر

ان آنکھوں سے واللہ خدائی دیکھی ۔ ہر شے میں تری جلوہ نمائی دیکھی
ہر رنگ میں ہر نقش میں، ہر پیکر میں ۔ تصویر تری، او ہرجائی! دیکھی

وہ ذات منزہ ہے جو آب و گل سے ۔ خلوت سے الگ ہے نہ الگ محفل سے
نام آتا ہے پردہ سے زبان پر شاکر ۔ رہتا ہے کہاں؟ پوچھ یہ پیکر دل سے

آنکھوں سے خمارِ ذوقِ مستی اُترا ۔ خاطر سے غبارِ اوج و پستی اُترا
پہنا جو کفن تو سرگرانی نہ رہی ۔ ہلکے ہوئے ہم کہ رختِ ہستی اُترا

ہو تجھ سے نباہ، عمرِ رفتہ کب تک ۔ دیکھیں تری راہ، عمرِ رفتہ کب تک
رستے کا نشان، نہ نقشِ پا کا ہے سراغ ۔ ڈھونڈیں تجھے آہ! عمرِ رفتہ کب تک

دُنیا سے سفرِ عدم کا کرنا ہے تجھے ۔ ہستی کے منازل سے گزرنا ہے تجھے
ہے مشتِ غبار جسمِ خاکی تیرا ۔ اس خاک سے منھ لحد کا بھرنا ہے تجھے

دنیائے دنی سے طمعِ خام نہ رکھ ۔ اُمیدِ وفا، او دلِ ناکام! نہ رکھ
یہ دارِ حوادث ہے، نہیں دارِ نشاط ۔ اس بزم سے نادان! ہوسِ جام نہ رکھ

دل بجھ گیا۔ دل کے داغ اب تک نہ بجھے ۔ سوزِ الم و فراغ اب تک نہ بجھے
تھی سینے میں جو ہوس، دھواں بنکے اڑی ۔ محفل کے مگر چراغ اب تک نہ بجھے

دکھلا کے یہ سبز باغ بجھ جائیں گے ۔ سینے کے لحد میں۔ داغ بجھ جائیں گے
ہو جائیگا نظروں میں زمانہ تاریک ۔ آنکھوں کے جو یہ چراغ بجھ جائیں گے

دنیا کی بلا سر سے ہٹی جاتی ہے ۔ میعادِ اسیری کی گھٹی جاتی ہے
ہونے کو ہے قطع سلسلہ ہستی کا ۔ جو پاؤں کی بیڑی ہے کٹی جاتی ہے

سانسیں کبھی سینے میں اُلٹ جائیں گی ۔ دندان کی صفیں صاف پلٹ جائیں گی
کیوں قیدِ حیات کا ہے غم اے شاکر ۔ اک روز یہ بیڑیاں بھی کٹ جائیں گی

ہستی سے برنگِ رنگ اُڑا جاتا ہوں ۔ میں خاک تھا، خاک میں ملا جاتا ہوں
آ اے دمِ مرگ ابھی، ابھی جاتے ہو ۔ بیٹھو کہ میں دنیا سے اُٹھا جاتا ہوں

وہ لیل و نہار، وہ زمانہ نہ رہا ۔ وہ مہر و محبت کا ترانہ نہ رہا
اپنا نہیں کوئی وقتِ بد میں شاکر ۔ بیگانے ہیں سب، کوئی یگانہ نہ رہا

قطعہ

(از منشی نادر علی خان صاحب نادر کاکوروی مرحوم)

جہاں اب دن دہاڑے رات کا چھایا ہے سناٹا ۔ وہاں اک شور و غل تھا، اک میلا تھا، تماشا تھا
یہ میدان حسین دواک پڑ سوکھے دیکھتے ہو تم ۔ یہی کچھ دن ہوئے اک باغِ جنت کا نمونہ تھا
نہ وہ حالت رہی باقی، نہ ان کو دیکھنے والے ۔ مگر اتنا کہ گویا خواب سا اک ہم نے دیکھا تھا
وہ اندھے ہیں جو سب پوچھتے ہیں "آگے کیا ہوگا"؟
بصر دیکھتے ہیں آج کیا ہے اور کل کیا تھا!

کیا زمین کی حرکت سُست ہو رہی ہی؟

جدید علمی تحقیقات کے حیرت انگیز انکشافات مین سے ایک وہ ہی جس سے ہمارے عنوان کے سوال کا جواب اثبات مین ملتا ہی۔ علمی دُنیا مین یہ بات عام طور پر مانی جاتی ہی کہ ہمارے دن رات آہستہ آہستہ لیکن متواتر لمبے ہوتے ہین یا بالفاظ دیگر یون کہیے کہ آج کا دن گذشتہ دن سے کسی قدر زیادہ لمبا ہی اور آئندہ سے کسی قدر کم۔ اسکا امکان اُسی وقت ہو سکتا ہی جب کہ زمین کی محوری حرکت جس کے باعث ذرات کی گردش ہوتی ہی سُست ہو رہی ہو اور ایک گردش کی تکمیل مین دن بدن زیادہ وقفہ درکار ہوتا ہو۔ ایک شبانہ روز کی لمبائی کلیۃً زمین کی محوری حرکت پر منحصر ہی اور جہان تک سائنس نے آج تک ترقی کی ہی زمین کی محوری حرکت کا اسکی سالانہ حرکت کے ساتھ کوئی تعلق نہین ہی سال مین ایک دفعہ کرۂ زمین سورج کے گرد پورا چکر کاٹتا ہی اور یہی سالانہ گردش موسمون کی تبدیلی وغیرہ کی ذمہ وار ہی۔ سردست ہمارا شمسی سال تین سو پینسٹھ دن سے کچھ زیادہ بڑا ہوتا ہی لیکن جب تک زمین اور سورج کے بُعد اور ان دونون کی علیحدہ علیحدہ مقدار مادہ مین کسی قسم کی تبدیلی واقع نہ ہو سال کی میعاد ایک معین میعاد ہی جسے دن رات کی لمبائی سے براہ راست کچھ تعلق نہین۔ اگر ہماری زمین اپنے محور کے گرد ۱۲ گھنٹہ مین ایک چکر کاٹتی تو ہمارا سال ہمارے جدید دن رات کی میعاد کے مطابق سات سو ساڑھے تیس دن سے کچھ زیادہ بڑا ہوتا۔ لہذا زمین کی محوری حرکت کے سُست ہونے کے دو نتائج ہین۔ ایک طرف تو دن رات بڑے ہو رہے ہین اور دوسری طرف سال چھوٹا ہو رہا ہی۔ سال کے چھوٹا ہونے سے مراد یہ ہی کہ آئندہ سال مین موجودہ سال کی نسبت سورج کا طلوع و غروب کم دفعہ ہوگا۔ وگرنہ فی الاصل جیسا ہم ابھی ذکر کر چکے ہین سال کی اصلی میعاد کا زمین کی محوری حرکت سے کوئی تعلق نہین۔ اور اس لیے جس وقفہ کا نام بہ نظر سہولت ہم نے ایک سال رکھا ہی اس مین بذاتہ کوئی کمی بیشی نہ ہوگی۔ فرق صرف تناسب مین ہوگا۔ اگر اکائی بڑھ جائے تو باقی اعداد اسی تناسب سے گھٹ جائینگے۔ جو فاصلہ انچون مین ۳۶ عدد کہلاتا ہی وہی فاصلہ فٹون مین ۳ کہلاتا ہی۔ فاصلہ تو وہی ہی لیکن اکائی یا یونٹ (Unit) کی تبدیلی سے اس کے معیار مین تبدیلی ہوتی ہی۔ اسطرح

موجودہ حالات میں ہم موجودہ دن رات کے وقفہ کو اکائی مان کر سال کے وقفہ کو ایک خاص عدد سے تعبیر کرتے ہیں گویا اس خاص عدد اور موجودہ دن رات کے وقفہ کا حاصل ضرب سال کا وقفہ ہے۔ اب اگر حاصل ضرب میں کمی بیشی نہ ہو اور ضرب شدہ اعداد میں سے ایک بڑھ جائے تو دوسرا لامحالہ کم ہوگا۔ لہذا ماننا پڑے گا کہ اگر دن رات کا وقفہ بڑھ رہا ہے تو سال کے وقفہ کا معیار (دن رات کے بڑھتے ہوئے وقفہ کو اکائی مانکر) گھٹ رہا ہے۔

اس امر کا ثبوت کہ زمین کی حرکت فی الواقع سُست ہو رہی ہے تین مختلف طریقوں سے دیا جا سکتا ہے جن میں سے ہر ثبوت اس بات کا مستحق ہے کہ اس پر شرح و بسط کے ساتھ بحث کی جائے۔ دلائل کی پختگی اور استدلال کی نفاست کے لحاظ سے یہ بحث ہمیں بہت سے مفید مطلب سبق سکھا سکتی ہے۔ ہم بہ نظر اختصار ان تینوں ثبوتوں کو موجودہ مضمون میں محدود کرنیکی کوشش کریں گے۔

زمین ایک گول کرہ ہے جو فضائے بسیط میں معلق ہے اور اپنے محور کے گرد تقریباً ۲۴ گھنٹہ میں ایک دفعہ گھومتی ہے۔ زمین کا محور زمین کے مرکز میں سے ہو کر گذرتا ہے۔ اس کے انتہائی سروں کو قطبین یعنی قطب شمالی اور قطب جنوبی کہتے ہیں۔ محور محض ایک سمت کا نام ہے۔ جب یہ کہا جاتا ہے کہ زمین اپنے محور کے گرد گھومتی ہے تو محور سے مراد کوئی ٹھوس مضبوط سلاخ نہیں ہوتی بلکہ اُس خط مستقیم کی طرف اشارہ ہوتا ہے جو زمین کے مرکز سے گذرتا ہوا شمالی جنوبی سمت میں واقع ہے۔ آپنے بازاروں میں شعبدہ بازوں کو دیکھا ہوگا جو ایک تھالی کو چھڑی کے اوپر تول کر زور کی گردش کے بعد ہوا میں اُچھال دیتے ہیں جہاں تھوڑی دیر کے لیے ہوا میں معلق رہکر تھالی ایک محور کے گرد گھومتی رہتی ہے جس کی سمت حرکت دہندہ چھڑی کی لمبائی ہوتی ہے۔ اسیطرح افریقہ کے حبشی چابک کی ضربوں سے گول لٹو ہوا میں گھماتے ہیں جتنی دیر اتھو کی حرکت کافی تیز رہتی ہے لٹو ایک محور کے گرد ہوا میں گھومتا رہتا ہے۔ کرۂ زمین کی محوری حرکت کی مثال ایک اور[۱] طریقہ سے بھی دیجا سکتی ہے۔ کمہار کا بھاری چاک جب وہ اُسے لکڑی کے ساتھ تیز حرکت دینے کے بعد چھوڑ دیتا ہے ایک حد تک زمین کے مشابہ ہوتا ہے۔ دونوں کی حرکت میں فرق صرف یہ ہے کہ چاک ہوا کی مزاحمت کی وجہ سے تھوڑی دیر گھومنے کے بعد ساکن ہو جاتا ہے لیکن زمین کے ارد گرد ہوا کے بجائے ایک ایسا رقیق جسم (ایتھر) ہے کہ قرنوں میں بھی اسکی رگڑ اور مزاحمت کا اثر محسوس نہیں ہوتا۔ زیادہ تر فرق شکل میں ہے۔ اگر ہم چاک کے بجائے ایک مدور کرہ فرض کریں جسے پہیہ کی طرح گھما کر چھوڑ دیا جائے تو وہ بجنسہ زمین کے مشابہ ہوگا لیکن زمین کی حرکت اس کے مقابلے میں نہایت سُست ہو گی اس لیے کہ دونوں کے حجم میں بہت بڑا فرق ہے۔ زمین کا قطر تقریباً آٹھ ہزار میل ہے حالانکہ ہمارے مثالی کرہ کا حجم گز بھر سے زیادہ نہیں ہوتا۔ اب اگر آپ نے یہ فرق صحیح طور پر سمجھ لیا ہے تو زمین کی حرکت کے کم ہونے کا پہلا ثبوت بآسانی ذہن نشین ہو سکتا ہے۔ فرض کیجئے کہ کمہار چاک کو یکسان طاقت کے ساتھ گھما رہا ہے یعنی ہوا کی مزاحمت سے چاک کی رفتار میں جو کمی[۱] تعویق پیدا ہوتی ہے اس کی تلافی کرتا جاتا ہے یہ بھی فرض کر لیجیے کہ کمہار اپنی طاقت اس یکسان تناسب کے ساتھ دیر تک صرف کر سکتا ہے۔ اب اگر آپ چاک کے اوپر آہستہ آہستہ خاک پھینکتے جائیں تو اُس کو چونکہ اپنی گردش میں مادہ کی زیادہ مقدار اُٹھانا پڑتی ہے اس کی رفتار سُست ہو جائے گی تاوقتیکہ کمہار جوں جوں چاک پر مادہ کی مقدار زیادہ ہوتی جاتی ہے زیادہ طاقت نہ صرف کرے۔ بعینہ یہی حالت کرۂ زمین کی گردش کی ہے۔ آسمانی خاک اور ٹوٹنے والے ستاروں کے ریزے ہر لحظہ زمین کی سطح پر گر رہے ہیں

---

[۱] زمین کی حرکت کے متعلق مفصل معلومات ہمنے اپنے سابقہ مضمون "حرکت کا پہلا قانون" میں حرکت کے پہلے قانون کی تشریح کرتے ہوئے بہم پہنچائے ہیں۔ ان اصطلاحات اور مطلب کی تفہیم کے لیے اس مضمون کا مطالعہ لابدی ہے۔

اور جون جون زمین اپنی سالانہ گردش کرتی ہوئی نئے نئے مقامات پر سے گذرتی ہو آسمانی خاک کی نہ ختم ہونیوالی بارش اس کے حجم اور وزن کو بڑہاتی رہتی ہو۔ اندازہ لگایا گیا ہو کہ ہر سال باہر سے زمین پر ایک کروڑ ٹن یعنی تقریبًا ۲۴ کروڑ من خاک گر پڑتی ہو۔ گویا ہر سال زمین کا وزن ۲۴ کروڑ من بڑہ رہا ہے جیسا ہم نے اوپر ذکر کیا اگر ہم چاہتے ہین کہ ہمارے مثالی چاک کی رفتار یکسان رہے تو جون جون اسکا وزن زیادہ ہو کمہار کو زیادہ طاقت لگانی چاہیئے۔ لیکن اگر کمہار صرف ہوا کی مزاحمت اور محور کی رگڑ وغیرہ کی تلافی پورا کرنے کے لیے کافی طاقت صرف کرے تو لحظہ بہ لحظہ چکر کی رفتار سست ہوتی جائیگی۔ زمین کی حالت مین کوئی بیرونی طاقت اسکی حرکت کے قیام کے لیے درکار نہین ہو لیکن جو زائد مادہ اس کے بوجھ مین اضافہ کر رہا ہو اسکی وجہ سے حرکت مین جو کمی واقع ہو رہی ہو اسکی تلافی بھی کوئی طاقت نہین کر رہی۔ نتیجہ یہ ہو کہ زمین کی حرکت سست ہو رہی ہو یہان اس امر کا ذکر کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہو کہ چونکہ زمین کا مجموعی وزن اربہا کروڑ من لہ ہو اور اس عظیم الشان بوجھ کے مقابلے مین ۲۴ کروڑ من کی زیادتی بالکل ہیچ ہو لہذا کسی قلیل عرصہ مین محض اسی سبب سے زمین کی گردش مین بہت تھوڑی کمی واقع ہونے کا امکان ہو۔ اتنی تھوڑی کمی کہ اس کا اندازہ لگانا بھی انسانی طاقت سے باہر ہو۔ لیکن اس مقام پر ایک نہایت غور طلب مسئلہ یہ ہو کہ اگر یہی حالت مدت دراز تک رہے تو فی سال ۲۴ کروڑ من کا اضافہ آخر الامر اپنا اثر دکھائے بغیر نہین رہیگا۔ اُس وقت تک زمین کی حرکت مین ضرور ایک نمایان تبدیلی ہو گئی ہو گی۔

دوسرا سبب ایسا ہو کہ اس کا اثر پہلے سبب کے اثر سے کہین زیادہ ہو اور ان دونون اسباب کے مجموعی اثر کی نظری بحث کے بعد ہم تیسرے ثبوت کا یعنی حرکت کی کمی کی عملی تصدیق کا ذکر کرینگے جس سے یہ امر بوضاحت ثابت ہو جاتا ہو کہ پہلے دو اسباب مین جو دلائل اور طریقہ استدلال اختیار کیا گیا ہو وہ بالکل صحیح اور درست ہو۔

چاند کی کشش سے سمندر کا پانی مدوجزر کی شکل مین کھینچا جاتا ہو۔ پانی کا مدوجزر جو سطح زمین کے اوپر ہوتا ہو زمین کی محوری حرکت کو روکتا ہو۔ یون سمجھیے کہ جس طرف چلتی گاڑی کو بریک باندھنے سے روک کیا جاتا ہو اسی طرف جوار بھاٹا کا عمل زمین کی محوری حرکت کے لیے ایک کمزور بریک کا حکم رکھتا ہو جس کا تدریجی قلیل اثر اگر سالون مین نہین تو ہزارہا صدیون مین ضرور نمایان طور پر ظاہر ہو جاتا ہو۔ اس اجمال کی تفصیل ہم کسی دوسرے مضمون کے لیے اُٹھا رکھتے ہین۔ یہان مختصرًا مدوجزر کے متعلق چند ایک اُمور بطور اشارات تحریر کرتے ہین۔

سب سے پہلے اس امر کو ثابت کرنے کی ضرورت ہو کہ مدوجزر کا چاند کے ساتھ کیا تعلق ہو اور یہ تعلق کیسے دریافت ہوا جن لوگون کو ساحل سمندر پر جانے یا بحری سفر کا اتفاق نہین ہوا ان کے لیے مدوجزر ایک نئی چیز ہوگی لیکن سمندر کے قریب رہنے والون کے لیے مدوجزر ویسی ہی معمولی چیز ہو جیسے خشکی پر رہنے والون کے لیے چاند کا گھٹنا بڑھنا۔ غالبًا سب سے پہلے یہ امر مشاہدہ مین آیا ہو گا کہ نئے چاند اور بدر کے موقع پر مدوجزر نہایت شدت کے ساتھ ہوتا ہے اور پہلے ربع اور تیسرے ربع کے موقع پر نہایت کمزور ہوتا ہو لیکن اس سے زیادہ مضبوط تعلق یہ معلوم ہوا ہو گا کہ ایک شبانہ روز کے دو متواتر جوار بھاٹون کا درمیانی وقفہ بجائے ۲۴ گھنٹہ کے ایک شمسی دن رات ہونے کے ۲۴ گھنٹہ اکاون منٹ کا ایک قمری دن ہوتا ہو۔ چاند بوجہ اپنی ماہواری گردش کے ایک دن رات مین سورج

لہ ہم نے اپنے ایک سابقہ مضمون "کرہ ہوائی کے متعلق دلچسپ معلومات" مین کرہ ہوائی کا مجموعی وزن دریافت کرنے کے لیے زمین کا وزن مختصرًا یون دریافت کیا تھا۔ زمین کا نصف قطر تقریبًا ۴۰۰۰ میل ہو لہذا اسکا حجم $\frac{4}{3} \times \frac{22}{7} \times (4000)^3$ مکعب میل ہو چونکہ زمین کی کثافت اضافی بمقابلہ پانی کے ۵½ ہو اس لیے زمین کا وزن [illegible] مکعب میل پانی کے وزن کے برابر ہو ایک مکعب فٹ پانی کا وزن [illegible] اسیر ہو اس لیے زمین کا کل وزن = [illegible] من ہو۔

سے اکاون منٹ پیچھے رہ جاتا ہی اور مدوجزر بھی اسی مقدار وقت کے ساتھ لگاتار شمسی دن سے پیچھے ہٹتا جاتا ہی۔ سمندر کے پانی مین مدوجزر کے متعلق ایک دلچسپ لیکن شروع مین پریشان کرنیوالی بات یہ بھی ہی کہ ہر بندرگاہ مین ایک قمری دن مین ایک دفعہ پانی اُترنے چڑھنے کے بجائے دو دفعہ اُترتا چڑھتا ہی گویا ۲۴ گھنٹہ اکاون منٹ مین دو دفعہ سمندر مین پانی کی سطح معمول سے زیادہ اونچی اور دو دفعہ معمول سے زیادہ نیچی ہوتی ہی۔ اگر ہم سہولت کے خیال سے یہ مان لین کہ تمام کرۂ زمین کے گرد یکسان گہرائی کی پانی کی ایک تہ ہی تو یہ بات بادی النظر مین زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتی ہی کہ اگر چاند کی کشش سے (دیکھو شکل نمبر ۱) سمندر کے اس حصۂ ل ح کا پانی جو چاند کے قریب ہی چاند کی طرف کھنچا جاتا ہی تو دوسرے حصۂ ک ف مین چاہیے کہ پانی کم رہجانے کی وجہ سے پانی کا غیر معمولی اُتار ہوتا اور اسطرح سے ہر قمری دن مین صرف ایک دفعہ کسی مقام پر پانی کا چڑھاؤ ہوتا اور ایک دفعہ اُتار۔ لیکن جیسا کہ شکل اول مین دکھایا گیا ہی حالات واقعی اس نقطۂ خیال سے ایک معمہ کی سی صورت پیش کرتے ہین۔ اگر بامعان نظر غور کی جائے تو چاند کے نیچے سطح زمین پر دو بالمقابل مقامات پر پانی کا چڑھاؤ ہوتا اور چاند کی سمت سے زاویہ قائمہ بناتے ہوئے دو مقامات پر پانی کا اُتار ہونا فوراً ایک معقول پیرایہ سے سمجھا جا سکتا ہی۔ جسطرح سمندر کے حصۂ ل ح کا پانی زمین کی نسبت چاند سے زیادہ قریب ہونے کی بدولت زمین سے زیادہ چاند کی طرف کھنچ جاتا ہی اور وہان چڑھاؤ کی حالت ہوتی ہے اسی طرح زمین کا قریب حصہ ب ج بعید حصہ د ن کی نسبت چاند سے آٹھ ہزار میل کے قرب کی وجہ سے سمندر کے پانی ک ف سے پرے ہٹ جاتا ہی اور وہان بھی پانی کا چڑھاؤ ہوتا ہی اور اس لیے سمندر کے ان دو حصون مین جو ع غ کی جگہ ہین اُتار کی حالت ہوتی ہی۔ اس تشریح سے ہر قمری دن مین دو دفعہ اُتار چڑھاؤ ہونا بآسانی سمجھ مین آسکتا ہی۔ اب صرف یہ امر محتاج تشریح ہی کہ کیون نئے چاند اور بدر کی حالت مین اُتار چڑھاؤ معمول سے زیادہ ہوتا ہی اور کیون پہلے اور تیسرے ربع پر معمول سے کم۔ جیسا کہ ہم کسی دوسری جگہ زمین کی سالانہ گردش کا ذکر کرتے ہوئے بیان کرآئے ہین؛ زمین سورج سے بہت چھوٹی ہی اور اسی وجہ سے سورج کی کشش اس پر غالب ہی کہ یہ سورج کے گرد گھومتی ہی۔ لیکن گو سورج بہت بڑا ہی تاہم بوجہ اپنے بُعد کے اس کی جوار بھاٹا پیدا کرنے کی طاقت چاند کی نسبت نصف سے بھی کم ہے۔

شکل اول کی تشریح کو مدنظر رکھکر شکل دوم اور سوم سے بخوبی واضح ہوتا ہی کہ کیون نئے اور پورے چاند کی تاریخون پر اُتار چڑھاؤ معمول سے زیادہ ہوتا ہی۔ ان دونون حالتون مین چاند اور سورج کی کشش مل کر کام کرتی ہی اور نتیجہ اسی تناسب سے بڑا ہوتا ہی۔ پہلے اور تیسرے ربع کی حالت شکل چہارم سے واضح ہوتی ہی۔ اس حالت مین سورج کی کشش چاند کی کشش کے خلاف عمل کرتی ہی۔ جن مقامات پر چاند کی کشش محض سے اُتار ہونا چاہیئے وہان سورج کی کشش سے چڑھاؤ ہوتا ہی۔ اور برعکس اس کے جہان چاند کی کشش سے چڑھاؤ ہوتا ہی وہان سورج کی کشش سے اُتار ہوتا ہی۔ نتیجہ یہ ہوتا ہی کہ اُتار چڑھاؤ معمول سے کم ہوتے ہین اس لیئے کہ سورج کی کشش چاند کے اثر کو نصف سے کچھ کم زائل کر دیتی ہی۔

ہم یہان مدوجزر کے وسیع نظریہ کے متعلق کچھ نہین لکھنا چاہتے۔ ہمین یہان صرف یہ دکھانا مقصود ہی کہ پانی کے اُتار چڑھاؤ کا اثر زمین کی حرکت کو کم کرتا ہی بعینہ اُسی طرح جس طرح کہ ایک کمزور بریک کسی تیزی سے حرکت کرنے والے جسم کی حرکت کو کم کرتی ہی۔ اوّل چار شکلون سے یہ غلط نتیجہ نکالا جا سکتا ہی کہ ہر مقام پر پانی کا زیادہ سے زیادہ چڑھاؤ دن مین ایک دفعہ اُسوقت ہوتا ہی جب کہ چاند اس مقام کے اوپر سب سے زیادہ بلندی پر ہو اور دوسری دفعہ اس سے بارہ گھنٹہ اور ۲۵ منٹ بعد لیکن واقعی مشاہدات اس سادہ حالت کے بالکل خلاف ہین۔ مختلف بندرگاہون مین پانی کے چڑھاؤ کا وقت چاند کے سب سے زیادہ

نوٹ۔ ان اشکال مین زمین سورج اور چاند کے حجم اور فاصلہ کا اصلی تناسب نہین دکھایا گیا
چاند
چاند کی کشش
زمین
سمندر
سمندر
شکل اول
شکل دوم
اُتار
سورج
زمین
چڑھاؤ
چڑھاؤ
سورج اور چاند کی متحدہ کشش
اتار
شکل سوم
اُتار
سورج
سورج کی کشش
زمین
چڑھاؤ
چڑھاؤ
چاند کی کشش
اُتار
شکل چہارم
اُتار
زمین
چڑھاؤ
چڑھاؤ
چاند کی کشش
چاند
اتار
سورج کی کشش
سورج
چاند
زمین
شکل پنجم

بلندی پر ہونے کے وقت کے بعد (مختلف وقفون کے بعد) ہوتا ہی بعض
مین ایک گھنٹہ کا فرق ہی بعض مین پانچ گھنٹہ کا وغیرہ۔ نتیجہ یہ ہوتا ہی کہ
چاند کے پیچھے پیچھے سمندر کا پانی دوڑتا پھرتا ہی اور چونکہ پانی کی یہ حرکت زمین
کی محوری حرکت کے خلاف ہوتی ہی اس لیے چاند کی کشش سے زمین کی
حرکت ضائع ہوتی رہتی ہی۔

سمندر کے پانی کا چاند کی کشش کی سمت سے پیچھے رہنے کا باعث زمین
کے خلاف پانی کی رگڑ ہے اور کچھ حد تک پانی کی اندرونی رگڑ بھی۔ ہم اس
نتیجہ کو شکل پنجم کی مدد سے بآسانی سمجھ سکتے ہین۔ اگر کسی قسم کی رگڑ نہ ہوتی
تو چاند کی کشش کا اثر زمین کے مرکز ب کی سمت مین ظاہر ہوتا۔ لیکن رگڑ
کی وجہ سے کشش کا اثر اس کے بجائے سمت ج ن مین ہوتا ہی جو زمین
کے مرکز مین سے نہین گذرتی۔ سمت ج ن مین عمل کرنے والی طاقت دو
سمتون مین منقسم کیجا سکتی ہی۔ ایک جز عمودی سمت مین اور ایک اُفقی
مین۔ ان مین سے ایک جز زمین کی حرکت کم کرتا ہی اور دوسرا چونکہ
زمین کے مرکز مین سے گذرتا ہی لہذا اس کا اثر زمین کی حرکت پر کچھ
نہین ہوتا۔

طوالت کے خوف سے ہم اس دلچسپ بحث کو نہین چھوڑ دیتے ہین
لیکن اس بات کا ایک عملی ثبوت کہ مد و جزر کی رگڑ فی الواقع کسی جسم
کی حرکت روکنے لے لیئے کافی ہو سکتی ہے، ہمین چاند کی حالت مین ملتا
ہی چونکہ زمین چاند سے بہت بڑی ہی اس لیئے جب چاند زمانہ سابقہ
مین سیال حالت مین تھا تو زمین کی کشش سے چاند کی سطح پر نہایت شدت
کے ساتھ اُتار چڑھاؤ ہوتا تھا۔ آپ نے بارہا سُنا ہوگا کہ چاند ہمیشہ اپنا ایک
ہی رُخ زمین کو دکھاتا ہی۔ کسی انسانی آنکھ نے چاند کا دوسرا رُخ نہین
دیکھا۔ صرف کبھی کبھی اس رُخ کے چھوٹے سے حصہ کی ایک جھلک نظر
آتی ہی۔ دوسرے لفظون مین نتیجہ یہ نکلتا ہی کہ چاند اپنے محور کے گرد اسی
عرصہ مین ایک کامل گردش پوری کرتا ہی جتنے عرصے مین وہ زمین
کے گرد ایک دفعہ گھومتا ہی۔ گویا چاند کا دن اور مہینہ ایک برابر ہین۔ یہ کیون
ہین؟ محض اس لئے کہ زمین کی کشش سے چاند کی سطح پر جو مد و جزر ہوتے
تھے اِن کی بدولت چاند کی محوری حرکت بمقابلہ زمین کے بند ہو گئی۔
یہی حالت زمین کی حرکت کی آج سے بہت عرصے کے بعد ہو گی تب ہمارا
دن اور قمری مہینے برابر ہونگے اور چاند والے زمین کا صرف ایک ہی رُخ
دیکھ سکین گے۔

ہم نے اس مضمون کے شروع مین کہا تھا کہ علاوہ ان دو نظری دلائل
کے جو ہم ابھی ختم کر چکے ہین زمین کی رفتار کے کم ہونے کی ایک عملی تصدیق
بھی موجود ہی۔ زمانۂ حال اور ماضی کے مشاہدات فلکی کا موازنہ کرنے سے
ہم دن رات کی لمبائی معلوم کر سکتے ہین۔ لارڈ کیلون نے اس حصۂ
مضمون کو نہایت عمدگی کے ساتھ ادا کیا ہی۔ ہم یہان اس کی مثال پر
اکتفا کرین گے۔ ۱۹۔ مارچ ۷۲۱ء قبل از مسیح یعنی آج سے ۲۶۳۴ سال
پہلے قدیم بابل (Babylon) مین چاند گرہن ہوا تھا۔ بابل کا ایک
ہیئت دان اپنی تحریر چھوڑ مرا ہی کہ اس نے "گرہن کو شروع ہوتے پہلی
دفعہ جس وقت دیکھا اس وقت چاند کے طلوع کے بعد کامل ایک گھنٹہ
گذر چکا تھا" ہم شکل سوم اور چہارم کے متعلق ایک نوٹ مین جتا چکے ہین
کہ چاند گرہن ہمیشہ بدر کی حالت مین ہوتا ہی۔ علاوہ ازین چاند اور سورج
کے طلوع و غروب کا وقت زمین کی محوری گردش پر منحصر ہی۔

چاند گرہن کے متعلق یہ ایک دلچسپ معلومات ہی کہ ہر ۱۹ سال اور
۱۱ دن (۶۵۸۵ دن) یا زیادہ صحیح طور پر ہر ۶۵۸۵ دن اور ۸ گھنٹہ کے وقفہ
کے بعد چاند گرہنون کا ایک جدید دور شروع ہوتا ہی۔ مثلاً اگر آج سے
۱۹ سال اور ۱۱ دن تک کے تمام چاند گرہنون کا وقت اور کیفیت
درج کر لیجائے تو آج سے پہلے اور بعد کے کل چاند گرہن اُسی وقت اور
کیفیت کے مطابق ہونگے۔ اسی قاعدہ کی مدد سے قدیم ہیئت دان
پہلے سے چاند گرہن کے اوقات دُنیا کے سامنے شائع کر دیتے تھے حالانکہ اُنھ

زمانہ مین چاند کی حرکت کا مطالعہ کامل طور پر نہین کیا گیا تھا۔ اب ہم اگر یہ مان لین کہ زمین اس تمام عرصہ مین یکسان رفتار کے ساتھ حرکت کرتی رہی ہی تو ہم اس بات کا اندازہ لگا سکتے ہین کہ بابل مین چاند گرہن ۱۹ مارچ کو ۲۷ صدی پہلے کس وقت شروع ہوا ہوگا۔ اس اندازہ سے معلوم ہوتا ہی کہ چاند گرہن کے شروع ہونے مین تقریباً ۵ گھنٹہ کی غلطی ہی یعنی اگر زمین کی رفتار کو یکسان مانا جائے تو ہیئت دان کی تحریر مین پانچ گھنٹہ کی غلطی پائی جائیگی کیونکہ حسابی اندازہ سے چاند گرہن ۵ گھنٹہ پہلے شروع ہونا چاہیئے۔ اس لیے زمین ان ۲۶۳۴ برس مین مجموعی طور پر ۵ گھنٹے پیچھے ہوگئی ہی اور بیسوین صدی عیسوی مین زمین کی حرکت اتنی سست ہوگئی ہی کہ آٹھوین صدی قبل از مسیح کی نسبت ۳۶۵ یومیہ گردشین کرنے مین یہ ۳۱ ثانیہ زائد دیر کرتی ہی گویا آجکل ہر ایک دن عہد بابل کے دنون سے ایک ثانیہ کا اٹھائیسوان حصہ زیادہ بڑا ہی اور ہمارا سال عہد بابل کے سال سے ۳۱ ثانیہ بڑا ہوتا ہی۔

اس قسم کی اور بہت سی مثالون سے اندازہ لگایا گیا ہی کہ زمین کی رفتار ہر صدی مین نصف ثانیہ فی سال کم ہو رہی ہی یعنی ۱۹۱۳ء مین ۳۶۵ محوری گردشون کے لیے ۱۸۱۳ء کی نسبت نصف ثانیہ زیادہ درکار ہی۔ یہان اس امر کی توضیح کردینا مناسب معلوم ہوتا ہی کہ زمین کی رفتار کی تبدیلی زمانہ ماضی اور زمانہ حال کے وقت کے مجموعی فرق سے بالکل جدا ہی۔ فی سال زمین کی رفتار $\frac{1}{200}$ ثانیہ سست ہوتی ہی اسطرح ہر ایک دن گزشتہ دن کی نسبت ثانیہ کا سات ہزاروان حصہ لمبا ہوتا ہی اور آنے والے دن سے اتنا ہی چھوٹا ہوتا ہی۔ فی صدی زمین کی رفتار $\frac{1}{2}$ ثانیہ سست ہوتی ہی اسطرح ساٹھ صدیون کے بعد دن رات حال سے نصف منٹ لمبا ہو جائیگا۔ یہ اعداد بالکل خفیف اور بے بضاعت معلوم ہوتے ہین لیکن جس وقت ہم قرنہائے دراز مین اپنی نظر کو وسعت دیتے ہین اور زمین کی پوری تاریخ ابتدا سے انتہا تک معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہین تو حرکت محوری مین یہ قلیل کمی عالیشان نتائج کا پیش خیمہ بن جاتی ہی۔ ہم اس موضوع پر آئندہ ایک جُداگانہ مضمون مین (بعنوان زمین کی محوری حرکت کے بعض اہم نتائج) بحث کرینگے اور دکھائینگے کہ کس طرح ہم زمانہ ماضی مین دوربین نظر کے ساتھ چاند کو زمین سے علیحدہ ہوتے ہوئے دیکھ سکتے ہین۔

بہت سے صاحب شاید اس امر کو آسانی سے نہ سمجھ سکین کہ اگر زمین کی رفتار فی صدی نصف ثانیہ کی قلیل مقدار سے کم ہو رہی ہی تو کس طرح ۲۶۳۴ سال کے عرصے مین زمین نے تقریباً ۵ گھنٹے ضائع کردیئے ہین جیسا کہ ہم نے بابل والے چاند گرہن کی مثال مین ذکر کیا ہی۔ اس بات کو آسانی سے ذہن نشین کرنے کے لیے فرض کیجیئے کہ آج سے ۲۶۳۴ سال پہلے بابل مین ایک صحیح گھڑی قائم کی گئی تھی جو آج تک بالکل صحیح طور پر چل رہی ہی۔ سوال صرف یہ ہی کہ بمقابلہ اس صحیح گھڑی کی زمین کتنے گھنٹے پیچھے رہ گئی ہی۔ ہماری مثال کے مطابق اگر وہ قدیم گھڑی عین نصف النہار کے وقت چلائی گئی تھی یعنی شروع مین دوپہر کے وقت اس گھڑی مین ٹھیک بارہ بجے تھے تو موجودہ صدی مین دوپہر کے وقت اُس صحیح گھڑی مین بجائے ۱۲ کے سہ پہر کے ۵ بجے ہونگے اگر ہم مشاہدہ کے بجائے گذشتہ ۲۶۳۴ سال کے ہر ایک سال کی کمی جمع کرتے جائین تو اسی نتیجہ پر پہنچین گے۔ مثلاً پہلی صدی کے پہلے سال مین زمین نے $\frac{1}{200}$ ثانیہ کھوئے دوسرے سال مین $\frac{2}{200}$ ثانیہ .... پچاس سال مین $\frac{50}{200}$ ثانیہ اور سوین سال مین $\frac{100}{200}$ ثانیہ۔ ان اعداد کے جمع[ل] کرنے سے معلوم

ل جمع کرنے کا ایک آسان قاعدہ یون حاصل ہو سکتا ہی۔ پہلے ۴ عدد کی جمع ۱۰ برابر ہی $\frac{1}{2}\times 4\times(4+1)=\frac{1}{2}\times 4\times 5$ پہلے پانچ اعداد کی جمع ۱۵ ہی یعنی $\frac{1}{2}(5\times(5+1))=\frac{1}{2}\times 5\times 6=15$ کے برابر ہی۔ عام قاعدہ جس کا آسان الجبری ثبوت دیا جا سکتا ہی یہ ہی کہ جتنے اعداد اکائی کے بعد جمع کیئے جائین۔ ان کی تعداد مین ایک بڑھا کر دو سے تقسیم کرو اور حاصل تقسیم کو آخری عدد سے ضرب دیدو۔ پہلی صدی مین وقت کا مجموعی نقصان اس قاعدہ سے $\frac{100\times 101\times\frac{1}{2}}{200}$ یعنی $\frac{101}{4}=25\frac{1}{4}$ ثانیہ ہوتا ہی اسطرح دو صدیون کا مجموعی نقصان $\frac{200\times 201\times\frac{1}{2}}{200}=100\frac{1}{2}$ ثانیہ ہی اور ۲۷ صدیون کا مجموعی نقصان ۲۷۰۱ کو ضرب تقسیم کی سہولت کے لیے ۲۷۰۰ یعنی ۱۰۰ × ۲۷ مان لیا جائے تو $\frac{2700\times 2700\times\frac{1}{2}}{200}=27\times 27\times 25$ ثانیہ ہوتا ہی۔

ہوتا ہی کہ پہلی صدی مین زمین گھڑی سے ۲۵ ثانیہ پیچھے رہ گئی اسطرح دوسری صدی کے پہلے سال مین زمین نے نصف ثانیہ کھویا۔ دوسر سال مین ۱ ۱/۲ ثانیہ اور سوین سال مین پورا ایک ثانیہ۔ گویا صرف دوسری صدی مین گھڑی سے ۵۰ ثانیہ پیچھے رہ گئی اور اسطرح دوسری صدی کے اختتام پر زمین گھڑی سے ۱۰۰ ثانیہ پیچھے ہوگئی۔ اس طرح ہر صدی مین زمین گھڑی سے زیادہ زیادہ پیچھے ہوتی گئی۔ ستائیسوین صدی کے شروع سال مین زمین نے ۱۳ ثانیہ ضائع کئے۔ دوسرے سال مین ۱/۲ ۱۳ ثانیہ علی ہٰذالقیاس۔ ساری صدی مین ۱۳۲۵ ثانیہ ضائع گئے۔ اب اگر ہر صدی کے نقصان کو جمع کرین تو مجموعی نقصان کا پتہ چل جائیگا یعنی یہ معلوم ہوگا کہ آج زمین گھڑی سے کسقدر پیچھے ہوگئی ہی۔ حاصل جمع یون ملے گی:-

(۲۵+۷۵+۱۲۵+۱۷۵+ ۔ ۔ ۔ ۔ ۱۳۲۵) ثانیہ

=۲۵ (۱+۳+۵+۷+ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۵۳) ثانیہ

=۲۵+۵۴+ ۲۷/۲ = ۲۵+۲۷+۲۷ ثانیہ = ۵ گھنٹہ ۳ منٹ ۴۵ ثانیہ =

فیروز الدین مراد

تاریخی تصوّرات کا انقلاب

اُنیسوین صدی کی علمی کوششون اور ترقیون نے جہان ہمارے اور خیالات پر گہرا اثر ڈالا اور ہمارے تخیل کا رُخ بدل دیا ہی وہان ہمارے تاریخی تصورات مین بھی اہم انقلاب واقع ہوا ہی۔ اٹھارھوین صدی کی دُنیا بہت محدود تھی اور کرۂ ارض دوشیزہ معلوم ہوتی تھی۔ تاریخی زمانے بالکل کم سن بچّے تھے، لیکن جب ان پر اُنیسوین صدی کے اکتشافات کی روشنی مین نگاہ ڈالی جاتی ہے تو وہ نوعمر نہین بلکہ ضعیفُ العمر اور سفید ریش نظر آتے ہین۔ تاریخی زمانہ صغیر سن بچہ نہین بلکہ پختہ جوان اور نشۂ شباب مین سرشار نظر آتا ہے۔

دُنیا کی چھ ہزار سال عمر کا خیال

دُنیا کو چھ ہزار سال سے قائم سمجھنا ایک معمولی بات تھی اور لوگ لکیر کے فقیر اور بزرگون کی آرا کے ایسے پابند تھے کہ چون وچرا کرنا گناہ سمجھا جاتا تھا۔ یورپ جو تمام علمی ترقیون کا مصدر و مسکن ہی دُنیا کو چند ہزار برس سے سمجھتا تھا۔ اسکی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ سترھوین صدی مین آئرلینڈ کے آرچ بشپ صاحب اشر نے بائبل مین جن بزرگون کا ذکر آیا ہی انکی نسلون کو جمع کر کے انکی ولادت اور موجودگی کا ایک زمانہ قرار دیا اور مسیحی دین کے بانی کی پیدائش سے چار ہزار سال قبل دُنیا کا وجود پذیر ہونا ٹھہرایا۔ یہ تاریخ بعض بائبلون کے حاشیہ پر مطبوع ہو کر مروج رہی۔ اس طرح سے دُنیا کی عمر چھ سات ہزار سال شمار ہونے لگی۔ لیکن اُنیسوین صدی سائنس کی تحقیقات، عالمانہ تنقید اور محققانہ طریقۂ استدلال کے لیے اپنی سابقہ بہنون پر ہمیشہ ممتاز رہیگی۔ مخالفون کے ایک گروہ نے بشپ اشر کے تخمینہ کو تہ و بالا کر کے بالکل ناقابل اعتبار قرار دیا۔

سائنسی اکتشافات سے ہمارے خیالات پر بہت گہرا اثر ہوا ہی اور پُرانے تصورات بالکل بدل گئے ہین۔ اسکے کئی وجوہ ہین اور سب سے بڑی وجہ علوم طبیعی کی غیر معمولی ترقی ہی۔ اس سے ہماری مراد ارضیات طبعیات، کیمسٹری، فلکیات، اور اثریات (آرکیالوجی) سے ہی۔ علم مذاہب، علم نوع انسان، اور علم السنہ کی ترقیون نے بھی اس انقلاب مین بڑا بھاری حصّہ لیا ہی۔ مگر تاریخی تصورات کی تبدیلی کا سہرا سب سے پہلے اثریات پھر ارضیات، اور اخیر مین علم المعاشرت (سوشیالوجی) کے دو شعبون علم نوع انسان اور علم مذہب کے سر بندھا، اور تاریخی زمانہ کی توسیع کی نیکنامی کا طرہ اثریات کے محققون اور عالمون کی دستار فضیلت

مین لگنا چاہیے۔ انسان کی قدامت اور دُنیا کی عمر کے باب مین جو قوی شہادت بہم پہنچی ہی وہ اثریات سے نہین بلکہ ارضیات اور (Palæntology) پیلیئین ٹالوجی یعنی علم متحجرات حیوانی اور (Anthropology) انتھروپولاجی یعنی علم الانسان اور ایتھنالوجی (Ethnology) یعنی علم الاقوام کے اکتشافات سے ہاتھ لگی ہی۔ لیکن حقیقت یہ ہی کہ اثریات نہایت وسیع معنی مین انسان کی نہایت پُرانی تاریخ کے ہر شعبہ پر حاوی ہی جو تقدمات (Antiquities) سے متعلق ہی چاہے وہ بحیرہ بالٹک کے کنارے کے یادگاری پشتے ہون یا فرانس کی متحجر کھوپڑیان اور منقش ہڈیان، یا چقماق کے اوزار، مٹی کے برتن، مصر کی مومیات، عراق عرب کی خشتی لوحین اور اُبھرے کام کی اشیا، یونان اور روم کے سکے اور سنگ تراشی کے نمونے ہون، یا کتبے، یا لاکھ کی لوحین، چرمی تحریرین، یا پٹیلیہ گھاس پر لکھے ہوئے نسخے، الغرض زمانہ مقدم التاریخ کی بابت جو خیالات ہم قائم کرتے ہین وہ پُرانے زمانے کے پشتون، غارون، روضون، مقبرون جھیل کے اندر مکانون کے آثارون، نہایت قدیم زمانے کے برنجی یا سنگین اوزارون، انسان کی کھوپڑیون اور پنجرون سے جو معدوم جانورون کے پہلو بہ پہلو پائی گئی ہین، ابتدائی انسان کے اوضاع واطوار اور اس کے تمدن پر معقول روشنی پڑتی ہی اور ہم نہایت قدیم زمانہ کے آدمیون کی طرز زیست کا اندازہ لگا سکتے ہین۔

زمین اور انسان کی قدامت

زمین کی عمر کے باب مین جو تغیر ہمارے خیال مین واقع ہوا ہی اسکی وجہ ارضیات اور پیلیئن ٹالوجی کے محققون کی کوششون کا نتیجہ ہی جسے اثریات سے بالواسطہ تحریک اور مدد پہنچی ہی۔ ایک انگریز عالم جیمز ہٹن نے اٹھارھوین صدی کے آخری ایام مین یہ اصلاح شروع کی ولیم اسمتھ نے انگلستان مین اور کویر نے فرانس مین اسے بہت ترقی دی لیکن زمین کو بہت پُرانی قرار دینے والا سر چارلس لائل انگلستان کا ماہر ارضیات تھا جسنے اپنی معرکۃ الآرا کتاب "اُصول ارضیات" مین اپنے خیالات کو خوب واضح کیا تھا۔ یہ کتاب ملکہ وکٹوریہ کے تخت نشین ہونے سے چند سال قبل شائع کی گئی تھی۔ اسمین اسنے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ قرون ارضی کی داستان اُسی وقت بخوبی سمجھ مین آسکتی ہی جب طبقات الارض کی ترکیب وساخت کے لیے وسیع زمانے قرار دیے جائین۔ اس پُرانے خیال کے حامیون اور سر چارلس لائل وغیرہ کے طرفدارون مین ایک عرصہ تک حیص بیص جاری رہی۔ آخر کار اُنیسوین صدی کے وسط مین نیا خیال غالب آیا، مگر اسکے ساتھ بالواسطہ یہ سوال پیدا ہوگیا کہ انسان کی قدامت بھی بہت وسیع سمجھی جائے۔ لائل نے اس کام کو بھی اپنے ذمہ لیا اور سنہ ۱۸۶۳ء مین "قدامت انسان" کے نام سے اپنی دوسری زمانہ خیز کتاب شائع کی۔ انسان کی قدامت کے متعلق جرمن محقق اینھروپالوجی شمرلنگ (Schmrling) اور بوشر دے پرتس (Boucher de Parthes) اور کئی دیگر علماء نے بھی بہت کام کیا تھا۔ اُنھون نے انسانی ساخت کے وہ اوزار نکالے جو معدوم جانورون کی ہڈیون کے پہلو بہ پہلو غارون اور کھوہون مین پائے گئے۔ اور اسی قسم کی دیگر پُرانی چیزین دریاؤن کے دہانون اور تہ نشین خاک کے نیچے سے نکالی گئین۔ اُن کے اوپر جو ریت کی تہ چڑھ گئی تھی، اسکی موٹائی سے اگلے زمانے کا تخمینہ کیا گیا۔ الغرض اثریات مقدم التاریخ کی اشیا بہم پہنچا کر محققون نے بڑی احتیاط اور ہوشیاری سے انسان کی عمر کا اندازہ لگایا۔ اسکے متعلق بھی بہت سی رد وکد ہوئی لیکن آخر کار علماء کے خیالات غالب آئے اور انسان کی قدامت مسلمہ ٹھہری۔

بابل اور مصر کے پُرانے کتبے

اگر کوئی پوچھے کہ سنہ ۱۸۴۰ء سے پیشتر عالمون اور مورخون کو نہایت قدیم مصر، مسوپوٹیمیا (عراق عرب) اور ایشیائے کوچک کی تاریخ کا کیا علم تھا؟ تو جواب مین یہ کہنا پڑتا ہی کہ اس وقت اِن ممالک کے نہایت

پُرانے حالات سے ہم ناواقف تھے ۔ مصر قدیم کے تاریخی اسرار کی کُنجی علمأ کو معلوم تھی جسکی شاباش ٹامس ینگ اور موسیو شون پالیون کو ملنا چاہیئے ۔ مصر سے جو کتبے برآمد ہوئے تھے اِن کے پڑھنے کا طریقہ معلوم ہوگیا تھا مگر اسمین ترقی بہت تھوڑی ہوئی تھی اور اس زمانے کی تاریخ کا کچھ ضمنی ذکر بائبل کے اوراق مین اور کچھ یونانی مورخ ہردوطس (Herodotus) اور دیودرس (Diodorus) کی تصانیف مین تھا ۔ اگر اُس وقت کوئی عالم یہ کہتا کہ عنقریب پُرانے زمانے کی ایسی چیزین برآمد ہونگی جنکی بدولت قدیم زمانہ کی تاریخ پر نہایت زبردست روشنی پڑے گی اور عجیب و غریب حالات معلوم ہونگے تو اُسے چنڈو خانے کی گپ سے زیادہ وقعت ہرگز نہ دی جاتی ۔ مگر بعد کے واقعات سے جو کچھ عیان ہوا وہ حیرت مین ڈالنے والا ہی خشتی کتابون اور کتبون اور مصوری کے نمونون سے ایک نئی دُنیا وجود مین آئی ۔

جن قومون اور ملکون کا یونانی مورخون نے بڑے ادب و احترام سے ذکر کرکے انھین تمدن کے مخترع قرار دیا تھا انکی تمدنی ترقیون کے ثبوت دستیاب ہوگئے اور اس سے تاریخ قدیم کے نامعلوم مگر نہایت شاندار دور کا آغاز ہوا ۔ قیاسات اور روایات شاندار تاریخی واقعات اور معتبر حالات مین تبدیل ہو گئے ۔ ملک معظم ایڈورڈ ہفتم مرحوم ابھی عنوغان کرنے کے قابل بھی نہین ہوئے تھے کہ فرانس کے دل چلے محقق، بوٹہ (Botta) نے نینوہ کے پُرانے محل وقوع پر جا کر کھنڈرون کو تہ و بالا کرنا شروع کردیا اور اِس تاریخی کام مین سر ہنری لیرڈ نے بھی اسکا ہاتھ بٹایا ۔ محققون کی محنت ٹھکانے لگی ۔ بہت جلد بیسیون قسم کی پُرانی چیزین نکل آئین جس سے یہ امر ثابت ہوگیا کہ آسوریہ کے دار الحکومت کی شان و شوکت قیاسی نہین بلکہ حقیقی تھی اور اِسکا تمدن بہت اعلیٰ درجے پر پہنچا ہوا تھا ۔ سنگتراشی کے رنگین اور سادہ نمونے اور کھُدائی کی چیزین دستیاب ہوئین جس سے یہ ظاہر ہوا کہ اہل اسوریہ نے اِس فن مین بڑی ترقی کی تھی ۔ نہ صرف یہی بلکہ خشتی کتابون کے تودے کے تودے برآمد ہوئے ۔ چوڑی چپٹی لمبی گول اینٹون پر عجیب قسم کے حروف کندہ پائے گئے ۔ یہ اینٹین آوے کے اندر پکائی گئی تھین ۔ اِن حرفون کو کوئی نہ سمجھ سکتا تھا مگر عالم اسے ایک قسم کا رسم الخط سمجھتے تھے ۔ اِن اینٹون کے انبار سے کتب خانے ظاہر ہوئے ۔ بہتون نے خیال کیا کہ جو کچھ اینٹون پر لکھا ہی وہ ہمیشہ اسرار بستہ رہیگا ۔ اور بات بھی یہی ہی کہ اس زبان کے بولنے والے اور لکھنے والے دو ہزار سال قبل صفحۂ ہستی سے نیست و نابود ہو چکے تھے اور اسکا پتہ لگانا معجزہ سے کم نہ تھا ۔ لیکن عالمون کی دماغ سوزی کامیاب ہوئی ۔ اِن حرفون کے پڑھنے کی داستان بڑی دلچسپ ہی ۔ اسے کسی اور موقع کیلئے اُٹھا رکھتا ہون لیکن یہان پر اتنا ہی کہنا کافی ہی کہ اسوری حروف کو قدیم ایرانیون نے بھی اختیار کر لیا تھا یہ "خط میخی" کے نام سے مشہور ہی اور ایران مین کئی جگہ اِن حرفون کے کتبے پائے گئے جنھین جرمنی کے نامی ماہر السنہ گروٹے فنڈ (Grotefend) نے عجیب و غریب دانائی کے ساتھ پڑھکر غیرفانی شہرت حاصل کی ۔ بہستون مین ایک کتبہ ایک چٹان پر کندہ تھا، جسے بعض دارا اور بعض ملکہ سیمی رامس (بیگم نینوہ) سے منسوب کرتے تھے ۔ یہ کتبہ تین زبانون مین تھا ۔ ایک اسوری، دوسری ساسانی، تیسری پہلوی، اور کتبہ دارا کا تھا ۔ اور یہ بھی خیال کیا گیا تھا کہ تینون کی زبان ایک ہی ہی ۔ سر ہنری رالنسن نے بعد ازان معلوم کیا کہ ایرانی زبان کے کتبے مین اسمائے معرفہ بہت ہین ۔ ایک نام بار بار حروف میخی مین آتا تھا جب ایک لفظ پڑھا گیا تو رفتہ رفتہ باقی حروف بھی پہچان لئے گئے ۔ اسطرح کتبہ پڑھ لیا اور حروف میخی اختراع ہوئے پھر اسوری کتبے اور خشتی کتابین پڑھنے مین کوئی رُکاوٹ پیش نہ آئی ۔ ۱۸۵۷ء مین سر جان کارنوال لوس اور فرانس کے نامی مورخ موسیو ارنسٹ رینان نے یہ دعویٰ کیا کہ اسوری زبان اور علم محض یارون کی تراش ہی ۔ مگر رالنسن، ہنکس، اوپرٹ، اور فوکس ٹالبٹ نے ایک اسوری عبارت کا ترجمہ ایک دوسرے سے الگ الگ

رکھ گیا اور نمونے رایل ایشیاٹک سوسائٹی کے پاس بھیجے گئے جسکا صدر
جارج گروٹ ایسا فاضل تھا اسنے ترجمے دیکھکر یہ قرار دیا کہ حروف میخی بناوٹی
نہین بلکہ اصل زبان ہی اور یہ اسوری کتبے پڑھنے مین سچ مچ کامیابی
حاصل ہوئی ہی۔ وہان سے اسیریالوجی (Assyriology)
یعنی علم آثار قدیمہ اسوریہ کی بنیاد پڑی۔
نینوہ کے کھنڈر خوب کھودے گئے۔ بابل مین تحقیقات ہوئی اور کئی پرانے
مقامات کی دیکھ بھال ہوئی۔ سیکڑون کتابین اور بیسیون کتبے برآمد ہوئے
اور وہ پڑھ لئے گئے بعض کتابون اور تحریرون پر تاریخ ہی اور تاریخی حالات
قلمبند ہین۔ ان خشتی تحریرون سے اب پرانی تاریخ بہت واضح ہو گئی ہی
جن بادشاہون کا وجود محض خیالی سمجھا گیا تھا وہ اب تاریخی اور حقیقی
آدمی ظاہر ہوتے ہین اور ان کے کارنامون کی داستانین ان کے کتبون
مین موجود ہین۔

عراق عرب کا تمدن

اسمین کچھ شک نہین کہ قدیم زمانے کی تاریخ کے زمانون اور واقعات
کے سلسلے کی تمام کڑیان نہین ملتی ہین۔ خالدیہ (Chaldea) کے
قدیم زمانے کے حالات بہت معتبر نہین ہین۔ مگر سارگون (شاہ اسوریہ)
تخمیناً ۳۸۰۰ ق م مین تھا۔ گو اس سے وہ پہلے قیاسی شخص سمجھا گیا تھا عجائب خانہ
برطانیہ مین بعض لوحین ایسی ہین، جن کے اوپر سنہ ۴۵۰۰ ق م نقش ہی۔ امریکہ کی
نامی یونیورسٹی پنسلونیہ تحقیقاتی مہم بابل کو بھیجی تھی اسنے پرانے کھنڈرون
کے ڈھیر کے نیچے سے ایسی چیزین نکالی ہین جنکی بنا پر یہ کہا جا سکتا ہی کہ
عراق عرب مین نو ہزار سال پیشتر تمدن عروج پر تھا۔

مصری آثار قدیمہ اور ان کی شہادت

عالمون کا ایک گروہ مصر کے کھنڈرون کی غور و پرداخت مین
مصروف تھا۔ اُنھون نے اُس خط تصویر کو پڑھا جو مصر قدیم مین مروج
تھا۔ ینگ اور رشون پالیون کے کام کو جرمن محقق لپ سیس اور برگش
دروتزا، لنارمن، برچ، ماریوت، ماسپرو اور ارمن نے تکمیل پر پہنچایا۔
ان کے ساتھ اور کئی مشہور محققون مثلاً گارڈنر ول کنس، پروفیسر فلنڈرس
پٹری نے مختلف کھنڈرون کے نیچے سے بہت سی چیزین نکالین جو
تاریخی اعتبار سے نہایت قابل قدر اور قیمتی ہین۔ طالمی بادشاہون
کے راج پروہت منتو (Manetho) نے مصر قدیم کی ایک
تاریخ لکھی تھی۔ اسنے جو فہرست بادشاہون کی لکھی تھی وہ مدت تک
بالکل بناوٹی شمار ہوتی رہی لیکن پروفیسر پیٹری کی کوشش سے
کئی تحریرین ایسی برآمد ہوئی ہین جن سے منتو کے بیان کی تائید
و تصدیق ہو گئی ہی۔ اسکی کتاب ضائع ہو گئی تھی مگر یونانی مورخون نے
اس کا ذکر کیا ہی اور کئی اقتباس بھی دیے ہین۔ مصر کی پرانی تاریخ کے
واقعات ایسی صحت اور درستی سے واقع نہین ہوتے جیسے بابل اور
اسوریہ کے ہو سکتے ہین۔ تاہم پروفیسر فلنڈرس پٹری کی تحقیقات
سے پانچ چھ ہزار سال قبل مسیح کے واقعات کا کچھ کچھ پتہ چلتا ہی۔ بابل
اسوریہ اور مصر کی پرانی تحریرون اور آثار قدیمہ سے یہ امر بخوبی ظاہر
ہو گیا ہی کہ وہان پر تمدن کئی ہزار سال سے رائج ہی۔

تاریخ جدید کا ابتدائی باب

اس سے ظاہر ہو گیا ہو گا کہ مذکورہ ممالک کے آثار قدیم سے ہمارے
تاریخی خیالات نے کیسا پلٹا کھایا ہی۔ اثریات کے اکتشافات کے ساتھ
ایک ایسی دنیا وجود مین آ گئی ہی جسکی ہستی کے نشانات مدتون تک
پرانے شہرون کے کھنڈرون کے نیچے مدفون رہے اور صرف چند سال
سے انکا پتہ لگا ہی۔ انکی بنا پر ہمین اپنے تاریخی تصورات قطع و برید کرنیکی
اشد ضرورت لاحق ہوئی ہی۔ اگر آٹھ نو ہزار سال تمدن کا سورج نصف النہار
پر تھا تو ہم زمانہ تاریخ کے طلوع کو کہان ڈھونڈھنے جائین۔ اگر اس معیار
سے دیکھا جائے تو اہل روم ہمارے ہم عصر اور یونان کا "ست جگ"
صرف کل کی بات ٹھہرتا ہی اور صرف اہرام مصری (Pyramids)

کے بنانے والے قدرے دور افتادہ زمانہ کے معلوم ہوتے ہین۔ فرض کرو جن لوگون نے سنہ ۹۰۰۰ ق م مین نیپور (متصل بابل) مین بیل دیوتا کا مندر بنایا تھا وہ خود کو تمدن اور شائستگی کے اوج پر سمجھتے ہونگے۔ پروفیسر ماہفی کا خیال یہ ہو کہ اہرام مصری کی تعمیر کا زمانہ تمدن کی خزان سمجھنا چاہیئے۔ لیکن سوال پیدا ہوتا ہو کہ تمدن کا موسم بہار کونسا زمانہ ہو؟ اسکا جواب علم اثریات مقدم التاریخ بہم پہنچا سکتا ہو جسے اُن روضون اور قدیمی یادگارون سے حاصل کرنا چاہیئے جو مفصل نیپور اور نینوہ سے برآمد ہوئے ہین اور انکی بنا پر صرف دس ہزار سال کا زمانہ تمدن قرار دیا گیا ہو جس کو تاریخ جدید کے ابتدائی باب مین شامل کیا جاتا ہو۔

مصری تمدنی زمانہ کی ابتدا

اگرچہ اِس مسئلہ پر وضاحت و صراحت سے لکھنا دشوار ہو مگر محققون کے خیالات کا اجمالی ذکر مناسب ہے۔ مصر کے پُرانے کھنڈرون سے جو کتبے اور سکّے، مصوری اور سنگتراشی کے نمونے، اور دیگر اشیا برآمد ہوئی ہین انکی بنا پر وہان کی تمدنی حالت اور تمدن کی ابتدا کا تخمینہ کیا گیا ہو۔ چنانچہ پروفیسر فلنڈرس پیٹری جو مصر کے آثار قدیمہ کے ماہر ہین کہتے ہین:-

تاریخی تحریرون اور قبرستانون کو دیکھنے کے بعد رائے قائم کی گئی ہو کہ مصر کے مسلسل تمدن کی ابتدا دس ہزار برس پیشتر یعنی سنہ ۸۰۰۰ ق م مین ہوئی تھی سوال یہ ہو کہ اُسوقت کی حالت اور موجودہ حالت مین کتنی مشابہت ہو؟ اگر جغرافیائی حیثیت سے ملک کی آج کی حالت بالکل بدلی ہوئی ہو کیونکہ نیل کے سیلابون کے سبب سے اسکے اردگرد جو مٹی جمتی رہتی ہو اس سے بہت فرق واقع ہو گیا ہو۔ اسکی بابت علماء کا اندازہ ہو کہ بالاوسط پانچ انچہ زمین ایک صدی مین بنتی ہو اور اسکی گہرائی ۲۶ فٹ اور بعض جگہ ۶۲ فٹ پائی گئی ہو۔ اس کے نیچے گارے کے بجائے ریت نکلتی ہو جسکی وجہ سے اوسط عمق زمین ۲۹ فٹ بہت زیادہ ہو اسے ۲۵ فٹ قرار دینا اچھا ہو۔ اب مٹی کی اتنی موٹی تہ جمنے کے لیے پانچ انچ فی صدی کے حساب سے چھ ہزار سال کا عرصہ چاہیئے لیکن اس اندازہ مین ایک قباحت بھی ہو۔ ہو سکتا ہو کہ مٹی جمنے کا عمل آہستہ آہستہ ہوا ہو اور ممکن ہو کہ جلد ہوا ہو۔ پاتال توڑ مشینون کے ذریعہ سے نیل کے کنارے مختلف مقامات پر اسکا اندازہ کیا گیا ہو۔ اسکے لیے سات اور پندرہ ہزار سال کا عرصہ درکار رہا ہوگا۔ ہو سکتا ہو کہ اسکے کنارے کے طبقات ایک لاکھ سال سے شروع ہوئے ہون۔ اِس سے یہ نتیجہ نکل سکتا ہو کہ جب زمین قابل کاشت ہوئی تو اسکے ساتھ مصر مین تمدنی طرز معاشرت کی بھی ابتدا ہوئی۔ نیل کی طغیانیون سے پیشتر بارش کے ذریعے سے روئیدگی قائم رہتی ہوگی۔

آثار سے مصر کی تہذیب سنہ ۸۰۰۰ ق م سے مسلسل چلی آتی ہو۔ اس ملک کی تحریری تاریخ اول شاہی خاندان کا پتہ دیتی ہو جو سنہ ۵۵۰۰ ق م مین حکمران تھا۔ اور اس سے پیشتر کا زمانہ مقدم التاریخ کتنا تھا؟ اسکی بابت یقین اور صحت کے ساتھ بیان کرنا دشوار ہو مگر اُس زمانے کی قبرین تاریخی زمانے کے برابر پائی گئی ہین اسلیئے اسے دو تین ہزار برس قرار دینا چاہیئے۔[۵۱]

ایک ہزار قسم کے ظروف چینی و روغنی مصر سے برآمد ہوئے ہین جو اسکے تمدن کے مختلف قرنون مین بنے تھے۔ سنگ پرمو کے نام سے ایک کتبہ مشہور ہو جو چند سال ہوئے مصر سے نکلا تھا۔ اسمین سنہ ۴۷۵۰ ق م کے سالانہ واقعات کا ذکر ہو۔ ایک قطار مین دریائے نیل کے چڑھاؤ، اور دوسرے مین جہازون کا عرض و طول اور شمار دیا ہو۔ لکھا ہو:-

ایک جہاز ایک سو ستر فٹ لمبا اور ساٹھ جہاز سو سو فٹ لمبے لمبے بنائے گئے تھے حبشی مغلوب ہوئے۔ ان کے چار ہزار مرد، تین ہزار مستورات، اور دو لاکھ مویشی بطور مال غنیمت ہاتھ لگے۔ بادشاہ سنفیرو (Snefrue) کے محل کے اردگرد ایک بڑی دیوار بنائی گئی۔ اسوریہ سے صنوبر کی لکڑی جہازون کے واسطے لائی گئی۔ ۳۵ مکانات شکارگاہون مین اور ۱۲۲ تالاب مویشیون کے لیے بنائے تھے اور ساتوین مویشی شماری ہوئی۔

بادشاہون کے حجرون سے آبنوس اور ہاتھی دانت کی لوحون پر لکھے

---

[۵۱] از ہارمس ورتھ ہسٹری آف ورلڈ، جلد اول صفحہ ۲۳۲۔

ہوئے سالانہ واقعات کے کتبے برآمد ہوئے ہین اور انمین سب سے پُرانا سنہ ۵۵۰۰ ق م کا بادشاہ مینا (Mena) کے عہد کا ہی۔ جس زمانے مین اہرام بنتے تھے اسوقت مصری تمدن عالم شباب مین تھا اور سب سے پہلا مخروطی مینار خوفو (Khufu) یا چیوپس (Cheops) کا ہی۔ سقارہ کا ہرم سنہ ۴۹۰۰ ق م مین بادشاہ نیطرخت (Neterkhet) نے بنوایا تھا جو تیسرے خاندان شاہی سے متعلق تھا۔

مصر کے کتبون اور پٹیلیہ گھاس کی تحریرون وتصویرون سے جو تحریر کے نمونے اور اظہار مافی الضمیر کے اشارات برآمد ہوئے ہین وہ سنوکے قریب ہین۔ اور یہ مصر کے تمدن کے مختلف زمانون مین مروج تھے۔ اور عبرانی فنکی یونانی حروف آہنی نشانات سے ماخوذ ہوئے ہین اور اس لحاظ سے یورپ کے حروف تہجی کا مبدا مصری اشارات تحریر ہین مشابہت کے اعتبار سے ان کی ترتیب دی گئی ہی۔ ۴۱۔ اشارات مین سے ۱۹ سنہ ۱۲۰۰ ق م اور سنہ ۱۴۰۰ ق م کے مابین، ۲۳ سنہ ۳۰۰۰ ق م اور ۲۷ سنہ ۵۵۰۰ ق م مین اور ۳۱ سنہ ۶۰۰۰ ق م مین رائج تھے۔

بابل کا تمدن

پروفیسر پیٹری کی رائے مین بابل کا تمدن اتنا پُرانا نہین ہی جتنا مصر کا ہی۔ منتو کے بیانات کی تصدیق اور تحریرون سے ہوگئی ہی مگر بیل دیوتا کے پجاری براسوس (Berasus) کے بیانات سے صرف چھ ہزار سال قبل مسیح کا پتہ چلتا ہی۔ مگر وہ بھی ایسی صحت اور درستی کے ساتھ نہین جیسے مصر کے بادشاہون کا حال معلوم ہوتا ہی۔ ملک بابل مین شروع مین ایک پہاڑی قوم آباد تھی جو اکاد (Akkad) کے نام سے مشہور رہی۔ اسکے ظروف اور دستکاریون کے نمونے ظاہر کرتے ہین کہ اسکا تمدن بہت پُرانا ہی۔ اور کہ بابل نے اسی سے تمدن حاصل کیا تھا۔ اس کے ساتھ سمیری قوم کا تمدن بھی شامل ہے۔ یہ قوم بابلیون سے پیشتر گذری ہی۔ اسکے لٹریچر کے نمونے موجود ہین سمیری زبان مسیح سے چار ہزار سال پہلے رائج تھی۔ پھر جب سامیون نے اسپر حملہ کیا تو اُسوقت بھی سمیری زبان کچھ عرصے تک مروج رہی اور اسکا لٹریچر اہل شام نے اپنی زبان مین ترجمہ کیا اور مفتوح قوم کی بہت سی شائستہ باتین اختیار کرلین۔ سرکاری کاغذات دینی صحائف سمیری اور سامی زبانون مین پہلو بہ پہلو لکھے جاتے تھے۔ سنہ ۱۶۰۰ ق م مین سمیری زبان بالکل معدوم ہوگئی۔ سمیری رسم الخط تصویردار تھا۔ مگر ہوتے ہوتے وہ خط میخی مین تبدیل ہوگیا۔ سوزا سے صناعی کا ایک نمونہ دستیاب ہوا ہی جو بہت ہی عمدہ ہی وہ سنہ ۳۰۵۰ ق م کا ہی۔ اسمین بادشاہ نارام سین (Naramsin) کی ایک فتح کا منظر دکھایا گیا ہی۔ یہ اس زمانے پر دال ہی جب سامی اور سمیری صناعی آپسمین خلط ملط ہو رہی تھی عناظم سے ایک کارچوبی صنعت کا نمونہ برآمد ہوا ہی جو سنہ ۴۴۰۰ ق م کا ہی۔ اسمین بابلیون کے آلات حرب دکھائے گئے ہین بھالا سات فٹ لمبا، ڈھال گردن سے پانون تک، خود کلغی دار تھا جس سے گردن بھی ڈھک جاتی تھی۔ چہرہ کے لیے خود الگ تھا۔

بابل والون کے لٹریچر (جو بابل اور نینوہ وغیرہ پرانے کھنڈرون کے نیچے سے برآمد ہوا ہی) کے حال کا پورا پورا بیان دشوار ہی۔ مگر مختصر یہ ہی کہ خشتی کتابین حسب ذیل علوم پر پائی گئی ہین:—

(۱) الہیات۔ اور جادو ٹونہ (۲) تاریخ (۳) خط وکتابت اور مراسلات (۴) زبان اور ترجمہ (۵) ریاضیات (۶) فلکیات (۷) علم جغرافیہ اور تاریخ طبعی (۸) طب۔ قصے کہانیان۔ اور نظم اس ذخیرہ سے معدوم ہی برعکس اسکے مصر مین ایسی کتابین بکثرت پائی گئی ہین

دس ہزار سال پیشتر کے واقعات

یہان پر مناسب ہی کہ دس ہزار[1] سال پیشتر کی متمدن قومون کی ملکی اور تمدنی تاریخ مین جو واقعات گذرے اور جنکا کچھ حال کتبون سے ملتا ہی مختصر ذکر کیا جائے:—

سنہ ۰۰۰ ق م مصر کے زمانۂ مقدم التاریخ کے تمدن کا باقاعدہ سلسلہ

---

[1] ماخوذ از ہارمس ورتھ ہسٹری آف دی ورلڈ۔ جلد اول۔

شروع ہوتا ہے۔ اس ملک کے آثار قدیمہ سے اسکا کھوج ہو سکتا ہے ہرام سے پیشتر کی حالت۔

سنہ ۶۰۰۰ ق م مصر کے اوپر مغربی ایشیا کی قومون نے حملہ کیا۔

سنہ ۵۰۰۰ ق م اس قوم نے حملہ کیا جسنے مصر کے شاہی خاندانون کی بنیاد ڈالی۔

سنہ ۴۵۰۰ ق م مینا تمام مصر کو فتح کر کے اسکا مطلق العنان بادشاہ بنجاتا ہے۔

سنہ ۴۰۰۰ ق م خوفو بادشاہ ہرم اعظم کی تعمیر شروع کرتا ہے۔

سنہ ۳۴۰۰ ق م شمال کی طرف سے مصر پر حملہ ہوتا ہے۔

سنہ ۲۴۰۰ ق م وسطی بادشاہت قائم ہوتی اور بارھوان خاندان برسر حکومت آتا ہے۔

سنہ ۲۵۰۰ ق م بدو سامی یعنی ہکساس لوگ مصر پر حملہ کرتے اور پندرھوین شاہی خاندان کی بنیاد پڑتی ہے۔

سنہ ۲۲۵۰ ق م ہکساس لوگون کی دوسری حرکت یعنی مصر کے وسیع حصہ پر انکی حکومت پھیل جاتی ہے۔

سنہ ۱۴۰۰ ق م طل الامرنہ خطوط لکھے گئے جواب ویسے کے ویسے ہی برآمد ہوگئے ہین۔

بابل کی تاریخ کے واقعات

سنہ ۶۰۰۰ ق م شہر سوزا (Susa) کی بنیاد قائم ہوئی۔

سنہ ۵۰۰۰ ق م بادشاہ ایا (Ea) اریدو کی بنیاد ڈالتا اور اس ملک کو مہذب بنانے کی کوشش کرتا ہے۔

سنہ ۴۰۰۰ ق م بادشاہون کی قدیم ترین یادگارین جو حال مین معلوم ہوئی ہین انکی بنیاد اسوقت پڑتی تھی۔

سنہ ۴۵۰۰ ق م اُرینا۔

سنہ ۳۸۰۰ ق م سامی بادشاہ سارگون اور نارام سین کا عہد سامی حکومت قائم ہوتی ہے۔

سنہ ۲۳۵۰ ق م گدیہ کی حکومت بابل مین قائم ہوتی ہے۔

سنہ ۲۲۸۰ ق م علامی لوگ بابل کو فتح کرتے ہین

سنہ ۲۱۲۹ ق م (امرفل) حمورابی برسر حکومت آتا اور اپنا قانون نافذ کرتا ہے۔

سنہ ۱۷۶۲ ق م خاندان کاسیہ حکمرانی کرتا ہے۔

سنہ ۱۳۰۰ ق م برنابریاش کی حکومت شروع ہوتی ہے۔

سنہ ۷۰۹ ق م کسنے چرب کے عہد کا آغاز ہوتا ہے۔

سنہ ۶۰۴-۵۶۱ ق م بنوناد کا زمانہ اور بابل کا زوال شروع ہوتا ہے۔

ہندوستان قدیم
کے تمدن کی بابت عالمون کی رائے[۵۱]

بابل اور مصر کے آثار قدیمہ اور انکی بنا پر محققون نے جو آرا قائم کی ہین انکی بحث کے بعد یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کے پرانے تمدن اور اسکے نشانات کی بنا پر اسکی قدامت کا بھی مختصر ذکر کیا جائے ہم نے شروع مین کہا تھا کہ سنسکرت لٹریچر کے ذریعے سے ہمارے تاریخی تصورات کے انقلاب کو زبردست تحریک پہنچی ہے۔

جرمنی کا مشہور محقق میکس ڈونکر "تاریخ تقدمات" کی جلد چہارم مین لکھتا ہے:۔

سپ تبس (جو شائد دیانی سیوس [Deonyisius] کا دوسرا نام ہے) نے سنہ ۶۷۷۶ ق م مین اپنی سلطنت شروع کی تھی سمت یدھشٹری کی بابت کہا جاتا ہے کہ وہ بکرمی سمت سے ۳۰۴۴ برس پہلے شروع ہوا تھا اور اس اعتبار سے یدھشٹری سمت کا آغاز سنہ ۳۱۰۱ ق م مین ہوا تھا۔

ناروے کا محقق رئیس کاؤنٹ بارن جرنا (Byornstjerna) "تھیاگنی آف دی ہندوز" مین لکھتا ہے:۔

میگستھنیز جو سکندر اعظم کی طرف سے دربار چندر گپت مین ایلچی مقرر تھا اسنے پاٹلی پتر (پٹنہ) مین جو اسکا دار السلطنت تھا ۱۵۳ راجاؤن کی فہرست پائی جنھون نے سپ تبس سے لیکر چندر گپت کے زمانے تک حکمرانی کی تھی اسمین

[۵۱] مضمون کا یہ حصہ ہندو سپر یارٹی کے ایک باب سے ماخوذ ہے۔

ہر ایک کا نام اور عہد حکومت کی میعاد دی گئی ہے جو ۶۴۵۱ برس ہوتی ہے۔ اس سے سپ تبس کی حکم رانی کا زمانہ سنہ ق م مین شروع ہوتا ہے۔ اِس اعتبار سے وہ مصر کے سب سے پہلے بادشاہ سے جسکا ذکر منتو نے کیا ہے، ایک ہزار برس پیشتر گدی پر جو سنہ ۵۰۰۶ ق م مین تخت پر بیٹھا تھا اور مصر کے حکمران سوفی سے دو ہزار برس پہلے جسنے ہرم غزہ کی بنیاد ڈالی تھی۔

پھر ایک اور جگہ وہی عالم لکھتا ہے:-

ہندوؤن کے تمدن کی قدامت کے اور بھی زبردست ثبوت موجود ہین اور وہ الی فنٹہ ایورہ اور دیگر مقامات کے سنگلاخ مندر ہین جن پر عجیب و غریب ہندی ہنر اور دانائی صرف ہوئی ہے وہ مصر کے اہرام سے فن تعمیر کے اعتبار سے بڑھ چڑھ کر ہین۔

جرمن عالم پروفیسر ہیرن (Hern) کہتا ہے:-

سپ تبس اور چندرگپت کے درمیان ۶۰۴۲ سال کا فاصلہ ہے۔

رومہ کا مشہور عالم پلینی کہتا ہے:-

بکس (Bacchus) سے لیکر سکندر مقدونی کے زمانے تک ہندوستان مین ۱۵۴ بادشاہ حکم ران ہوے۔ اور ان کا زمانہ ۶۴۵۱ سال ہوتا ہے۔

ایک باختری نسخہ دبستان کے نام سے مشہور ہے جو کشمیر سے برآمد ہوا تھا۔ اُسے سر ولیم جونز یورپ لے گئے تھے۔ اسمین ان بادشاہون کا ذکر ہے جو باختر مین حکم ران تھے اور مہابدری کہلاتے تھے۔ اِس سلسلے کے پہلے بادشاہ نے سکندر اعظم کے حملۂ ہند سے ۵۶۰۰ برس پہلے حکومت کی تھی اور یہ بادشاہ ہندو تھے جسکو ٹل نے بھی اپنی تاریخ ہند کی دوسری جلد مین تسلیم کیا ہے۔ دبستان سے ظاہر ہے کہ سنہ ۶۰۰۰ ق م مین ہندوستان کا تمدن عروج پر تھا۔ ہندوستان کے مختلف مقامات سے جو سکّے پُرانے زمانے کے نکلے ہین انسے بھی ہندو تمدن پر روشنی پڑتی ہے اور وہ بہت پُرانا ٹھہرتا ہے۔ الفنسٹن نے اسکا کھلے الفاظ مین اعتراف کیا ہے۔

لیکن جس قوم کے ہان برہم دن اور برہم راتری کے سلسلے اور اسکے مختلف زمانے یگون چتر یگون، مہا یگون، منونترون اور کلپون مین بٹے ہوئے ہون، اور پھر ہر ایک زمانہ کئی کئی لاکھ برس قرار دیا گیا اسکے لیے دس پانچ ہزار سال محض ایسے ہین جیسے بڑے گھڑے مین پانی کا ایک چمچہ۔

نتیجہ

اِس ساری بحث کا لُب لباب یہ ہے کہ زمانۂ حال کے اثری اکتشافات اور علمی تحقیقات نے ہمارے تمام خیالات کو اُلٹ پلٹ کر دیا ہے اور تاریخی زمانہ جو پہلے محدود تھا اب بہت وسیع ہو گیا ہے۔ پُرانی چیزونکی بنا پر آٹھ دس ہزار سال کے تمدن کا پتہ لگتا ہے جس سے یہ نتیجہ نکل سکتا ہے کہ ابتدائی وحشیانہ حالت سے رہائی حاصل کرنے مین انسان کو ضرور کچھ عرصہ درکار ہوا ہوگا اور چونکہ ابتدائی ترقی بہت آہستہ آہستہ ہوا کرتی ہے اسوجہ سے دو چار ہزار سال اسکے لیے بھی مخصوص ہونے چاہئین۔

جے آر۔ رائے جرنلسٹ لاہور

این چنین گردنِ دعوی نہ فراز د چکند
بمبئی گر ہمہ برخویش نیاز د چکند

غیر ازین ہیچ متاعے نبود عاشق را
در قمارِ تو دل ازنیسز نہ باز د چکند

عاشق از بسکہ بہ پیشِ تو ز تو محروم است
دست اگر سوی تو گستاخ نہ یاز د چکند

بسکہ درد من از اندازۂ درمان بگذشت
چارہ گر با من بیچارہ چہ ساز د چکند

شبلی دل زدہ، در وادیِ غم دیر رسید
گرم اگر در رہِ عشق تو نہ تاز د چکند

شبلی نعمانی

اجودھیا

صفحہ ہستی پر بہت سے ایسے خطے ہیں جن کی قسمت میں نیچر نے اپنے فیاض ہاتھوں سے ہمیشگی کی سرسبزی و شادابی لکھدی ہے اور اس دلآویزی کے ساتھ ساتھ اہل دنیا کی ندیدی آنکھیں کچھ ایسی پڑتی رہتی ہیں کہ وہ کبھی اپنے سے انکو جدا نہیں ہونے دیتی۔ گو زمانہ کے انقلابات اپنا اثر ڈال ہی چھوڑتے ہیں لیکن ہر نئے روپ میں دلگیری اور دل فریبی دو چار درجہ اور ہی بڑھجاتی ہے۔ اور زمانہ زرین کے بھولے بھالے بسنے والوں نے مذہبی پہلو کی شق کچھ ایسی دانائی سے ان شہروں کے ساتھ لگادی ہے جس سے ان کی آبادانی کو اور بھی اچھا موقع ملتا رہتا ہے۔ دنیا نے بہت سے پلٹے کھائے متعدد قالب بدلے لیکن مذہب اہل مذہب ایسے شہزور ہوتے ہیں کہ ہر آنیوالی مصیبت کا مقابلہ دلیرانہ کرکے موقع پاتے ہی اپنے متبرک مقامات کو اسی زیب و زینت سے آراستہ کردیتے ہیں۔

ان گنتی کے چند مقدس و خوش نصیب خطوں میں سے اودھ کا مشرقی حصہ ہے جسکو شاہی میں اودھ اور اس زمانہ میں اجودھیا کے نام سے پکارتے ہیں۔ اسکی شکل ایک جزیرہ نما کی سی واقع ہوئی ہے۔ ہر سہ طرف دریائے گھاگرہ جسکو سرجو بھی کہتے ہیں اپنے نہ تھمنے والے بہاؤ کے ساتھ خدا کی یاد میں رہنے والوں کے دلوں کو دنیاوی کدورتوں سے صاف کیا کرتا ہے۔

نیچر نے قدرتی صناعیوں اور دلفریب منظروں سے اسکو مالامال کردیا ہے۔ آب و ہوا کے لحاظ سے بھی یہ مقام نہایت اچھا ہے۔ قدرتی ٹیلے جو کسی زمانہ میں قلعوں یا گڑھیوں کا کام دیا کرتے تھے اور جن پر خودرَو درخت کثرت سے اُگ آئے ہیں جو چھوٹی چھوٹی پہاڑی سلسلوں کا لطف دے جاتے ہیں دریا کے کنارے و نیز وسط شہر میں ہزارہا مندر و معبد خانے ذی حوصلہ مہاراجگان ہند کی مذہبی قدردانی کی داد زبان حال سے کھڑے دے رہے ہیں۔ اجودھیا اپنی قدامت کے لحاظ سے دنیا کے تمام شہروں سے گوئے سبقت لیگیا ہے۔ اسی مقام میں مذہب برہمن کو کمال ترقی ہوئی ہے۔ اسی گھدیشہ میں برہمنی مذہب ایک سادہ مذہب سے شاندار مذہب بنگیا۔ اسی جگہ ایک سادہ اور سیدھے مذہب میں وہ شاندار رسومات اور تقریبات شامل ہوئی ہیں جن پر آج ہند کو فخر و مباہات اس درجہ ہے۔ اسی مقام پر مذہب برہمنی حد درجہ کو پہنچکر دوسرے آنے والے مذہب کے روبرو کچھ دنوں کے واسطے گمنامی کی چادر میں لپٹ گیا تھا۔ ایک معمولی پنچایتی طریقہ حکومت سے عظیم الشان اور باسطوت حکومت کی بنیاد اسی جگہ پڑی، جسکے جانباز سپاہیوں اور دلیر سرداروں نے جنوبی ہند کو اپنے قدموں سے پامال کرڈالا تھا اور ہمیشہ سے سنسکرت بولنے والی قوم کا یہ مرجع رہا ہے۔

تاریخی حیثیت سے اجودھیا پر نگاہ ڈالنے سے ہمکو ہندو مائتھالوجی کے پرلطف قصص و روایات جو غیر معمولی الفاظ سے بیان کیے گئے ہیں دیکھنے میں آتے ہیں۔ ایک قصہ مشہور ہے کہ بینی یا وینی پسر آنگہ حاکم اجودھیا پر برہمنوں کا عتاب نازل ہوا جس سے بینی بغیر اولاد مرگیا لیکن اُسکی چتا سے دو لڑکے پیدا ہوے۔ اول نکھد جو اُسکے پیروں سے نکلا اور وحشی اقوام کا مورث اعلے بنا اور دوسرا پرتھو جو بینی کے بازوؤں سے نکلا جسکو اجودھیا کے اول سورج بنسی راجہ ہونے کا افتخار حاصل ہوا اور اس سے تمام آبادی کی بنیاد پڑی جسکا پتہ منو اور مہابھارت سے چلتا ہے۔

لیکن ایک دوسری جگہ ایک دوسرے پرتھو کا نام آتا ہے اور ایک دیگر شخص بنام اِستواکو کی بابت گمان غالب ہے کہ وہی پہلا بادشاہ سورج بنسی خاندان کا گذرا ہے اور اجودھیا کی حکومت کا تاج اول اول اسی کے سر پر رکھا گیا۔ اِستواکو کو حضرت ابراہیم خلیل اللہ کا ہمعصر بتاتے ہیں۔ اسکے بعد راجہ سراوست کا نام آتا ہے لیکن اس خاندان میں حکومت معمولی طریقہ سے رہی اور کوئی پولیٹیکل تقریبات و ملکی امور قابل ذکر پیش نہیں آئے۔ اس خاندان کے لوگ

تقریباً سب کے سب مذہبی زندگی بسر کرتے رہے اور علائق دنیاوی سے بہت کم واسطہ رکھتے تھے لیکن زمانہ گذرنے پر ایسے بھی لوگ پیدا ہونے لگے جو اپنی جواں مردی و دلیری کے لیے شہرۂ آفاق ہوے یا کسی مہتم بالشان مہم کے سر کرنے یا ملکی پیچیدگی کی گتھی سلجھانے کے لیے تاریخی حیثیت سے قابلِ ذکر ہوے ہیں - راجہ رامچندر کے خاندان میں اس قسم کے لوگ زیادہ پائے جاتے ہیں جنھوں نے کمزور خاندان والوں کو زیر کر کے اپنی سطوت کے ڈنکے بجا دیے اور سلطنت کے دائرہ کو وسیع کر کے ہند کے بڑے حصہ پر قابض ہو گئے - ایک جگہ پر درگھابو اور رگھیو کا جو کمزور شاخ سے متعلق ہی ذکر ہی جو رامچندر کے خاندان والوں سے شکست کھا کر جلا وطن ہو گئے -

لیکن اکشواکو اور دوسروں کو ویسا ہی روایتی رہنے دو جیسے وہ مذہبی تھے اور درگھابو اور رگھیو کو روما کے رومولس و ہیلن شمار کرو - راجہ رامچندر کے تذکرہ مین راجہ جسرت قابل ذکر کیرکٹر ہیں اور رام تو بلا شک دنیا کے غیر معمولی اشخاص مین مشمول ہونے کے قابل ہیں جس نے اپنی خداداد قوتوں اور فطرتی بہادری سے اجودھیا کو اس قابل بنایا کہ اسکا ذکر تاریخ عالم مین جلی قلم سے کیا جائے - اس راجہ کے زمانہ میں سورج بنسیوں کے ہتھیار شمالی ہند میں پہنچ گئے اور سمندر پار لنکا میں اجودھیا کے جانبازوں نے اپنی تلواروں کو میانون مین کیا - مذہبی حیثیت سے بھی یہ ایک غیر معمولی شخص تھا جو مذہبی کتب سے متعلق ہی - لیکن راجہ رامچندر کے زمانۂ حکومت کی آب و تاب صرف ڈوبتے ہوے آفتاب کی آخری جھلک کے مشابہ ہی کیونکہ انکے مرنے کے بعد سلطنت کا چراغ لب بام ہو گیا - گو ساکیہ منی (جسکو بدھ گوتم کے نام سے منسوب کرتے ہیں) کے وقت تک عنان حکومت رامچندر ہی کے خاندان میں رہی لیکن پہلی سی بات نہ قائم رہ سکی اور سورج بنسی سورما سید ھین سرداروں کے حملون کی تاب نہ لا سکے اور تھوڑے ہی عرصہ میں رام کے خاندان والوں کو شیشانگ خاندان والوں کے لیے جگہ خالی کرنا پڑی - اسوقت سے مگدھ میں تاریخ اجودھیا شامل ہو گئی جس سلطنت کا کہ وہ جزو بن گئی - اس زمانہ میں

بقول لوکل (مقامی) روایات کے اجودھیا ایک جنگل بن گیا تھا - زاں بعد راجہ وکرما دیتہ کا نام تاریخ کے صفحوں پر نظر آتا ہی جس نے برہمنی مذہب کو دوبارا زندہ کر کے ہند کا قومی مذہب قرار دیا اور اسکے پیدائشی مقام یعنے اجودھا کو دوبارا آباد کرایا - اور اس متبرک مقام کو جو ملحدوں کے قیام سے خراب ہو گیا تھا پاک صاف کر کے تاریخی مذہبی مقامات کو از سر نو تعمیر کرایا خلاصہ یہ کہ شہر اجودھیا روایتاً دوبارا درست کیا گیا اور برہمنوں کے طریقہ پر بسایا گیا - لیکن اب سے اسکو صرف مذہبی شہر ہونے کا اعزاز حاصل رہا یعنے پولیٹیکل دار الحکومت ہونے کی نوبت کبھی نہ آئی کیونکہ اسوقت سے اسکا کپیلہ کی سلطنت کو سالا سے الحاق کر دیا گیا -

اب ہم یکایک اور تقریباً انجانے ایک نئے نظارہ پر نظر ڈالتے ہیں - سوشل جیالوجی (تمدنی طبقۃ الارض) کے ایک بالکل نرالے اور انوکھے قطعہ پر نظر نے سنبھالا لیا ہی جو خود بخود سطح سطح کے اوپر بر آمد ہو گیا ہی - اس طبقہ میں جس میں کہ اب ہم اپنے کو لیے جاتے ہیں - مسلمان بقول مبصرانِ طبقۃ الارض اُبھرنے والے مادہ کے مشابہ ہیں کیونکہ رسول عربی کی الوہی قوتوں اور غیر معمولی تلقینی لکچروں نے مغربی حصہ ایشیا میں ایک کھلبلی مچا دی تھی، جس سے گندھکی مادہ اس سرعت سے نیچے نیچے پھیلتا چلا جاتا تھا کہ دیکھنے والوں اور عمیق بینوں نے پہلے ہی سے ہند کو سنبھل جانے کی منادی دی تھی لیکن اس آتشیں مادہ کو روکنا ذرا کا رے دارد تھا - ہوقت اجودھیا بھی کو سالا سے نکلکر قنوج کے تحت کا ماتحت بن گیا تھا کیونکہ تاریخ چندردیو کو فاتح اجودھیا بتاتی ہی - مسلمانوں کے ہتوڑے کی ہند میں پہلی چوٹ محمود غزنوی کے زمانہ میں لگی -

لیکن اجودھا کی کامل فتح شہاب الدین کے ہاتھوں ہوئی - قنوج و بنارس کی حکومتیں دونوں سنہ ۹۴-۱۱۹۳ میں زیر فرمان شہابی ہو گئیں - اجودھیا میں اب بھی شاہ جوران غوری کا مزار موجود ہی جو شہاب الدین کا ایک لفٹنٹ تھا - یہاں کا حاکم شمس الدین التمش کا بڑا لڑکا نصیر الدین

جو بقول مسلمان مورخوں کے ایک غیر معمولی قابلیت و لیاقت کا آدمی تھا، ۱۲۲۶ء میں مقرر ہوا۔ اس شہزادہ سے اہل اودھا کی بہت کچھ امیدیں وابستہ تھیں لیکن بے وقت کی موت نے سب پر خاک ڈالدی۔ اسکے مرنے کے بعد چند سال تک اس صوبہ کا حاکم اس کا ہمنام نصیر الدین طیا شی معزّی رہا۔ یہ صوبہ دار نہایت ہی وفادار اور خوش سلیقہ آدمی تھا اور اپنی حاکمہ سلطانہ رضیہ کی کمک کے لیے ایک جرّار لشکر روانۂ دلّی کیا تھا لیکن بیچارہ اثنائے سفر میں خود ہی قید کر لیا گیا اور جیل میں باقیماندہ زندگی گذارنا پڑی۔ تاریخ کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہی کہ نصیر الدین کے بعد قمر الدین کو یہاں کی گورنری عطا ہوئی تھی جسنے بلبن کو شاہنشاہ کے خلاف ہتھیار اٹھانے کو بہت کچھ اکسایا تھا۔ گو مصنف طبقات ناصری اور منہاج السراج نے اس گورنر کی بہت کچھ تعریف کی ہی لیکن کوئی غیر معمولی کام اسنے اپنے زمانہ حکومت میں نہیں کر دکھائے۔ بعد ازاں تغلق خان کا نام آتا ہی جو ملکۂ آں جہانی کا شوہر تھا۔ اسنے بھی مثل دوسروں کے با اختیار ہونیکی کوشش کی تھی لیکن شروع ہی میں گردن مروڑ دی گئی۔ بعد کو ارسلا خاں، امیر غیاث خاں و دیگر صوبہ داران اودھ میں آتے رہے لیکن سب کے سب تہِ تیغ ہوتے رہے۔

اب تاریخ اجودھیا ایک نیا سین پیش کرتی ہی۔ بغرا خاں و کیقباد کے لشکری سپاہی دریائے سرجو کے دونوں کناروں پر خیمہ ڈالے نظر آتے ہیں باپ بیٹے میں اَن بن ہو گئی ہی۔ بغرا خاں اپنے بیٹے کی تادیب پر تُلا ہوا ہی اور بیٹا معز الدین درباریوں کے بھڑکانے پر اپنے باپ کے خون کا پیاسا بنگیا ہی۔ ملک داری کی خواہش نے اسکی آنکھوں پر لالچ و عصبیت کی چادر ڈال دی ہی اور وہ اپنے پیارے باپ کے محبت و وقار کو خیرباد کہکر میدان جنگ میں صف آرا ہو گیا ہی۔ لیکن چند ہی روز گذرنے پائے تھے کہ نشۂ جہانبانی و ملک گیری کافور ہو گیا اور کیقباد اپنی سمجھ میں آگیا محبت پدری کی رگ جوش میں آئی اور بے اختیار ندامت سے چور پیارے باپ کے قدموں پر گر پڑا اور عنان حکومت و تاج شاہی اپنے باپ کو سپرد کر دینے پر آمادہ ہو گیا۔ بغرا خاں بیٹے کی حالت زار دیکھکر آٹھ آٹھ آنسو رونے لگا اور بیٹے کی خطا معاف کر کے دلّی کی سلطنت اسکو بخش دی اور خود بنگال کی گورنری پر واپس گیا۔

دلّی پہنچکر کیقباد نے امیر خسرو کو اجودھیا کی گورنری پر مامور کر کے روانہ سوے اودھ کیا لیکن امیر خسرو چونکہ درباری آدمی تھے اس لیے دو ہی برس کے بعد پھر طلب کر لیے گئے اور انکی جگہ امیر علی گورنر اودھ نامزد ہوا۔ لیکن جب خلجیوں کا دور دورہ دلی میں ہوا تو علاء الدین کو جنت نشان اودھ کی حکومت عطا ہوئی لیکن فوراً ہی علاء الدین کو دیوگڑھ کی طرف رخ کرنا پڑا اور اپنی جگہ علاء الملک کو عارضی طور پر کام کرنے کے لیے چھوڑ گیا جو ۱۲۹۶ء میں مستقل طور پر حاکم صوبۂ اودھ و کڑہ علاء الدین کے سریر آرائے سلطنت ہونے پر مقرر ہو گیا۔ اسکے بعد اب پھر تاریخ خاموش ہی۔ البتہ محمود تغلق کے عہد میں آئین الملک کا نام اجودھیا کے ذکر میں آتا ہی جو غالباً یہاں گورنر تھا۔ یہ شخص نہایت ہی خیر خواہ تخت و ہمدرد رعایا تھا اور ایک قابل جنرل و تجربہ کار گورنر ثابت ہوا۔

لیکن جیسا کہ اندنوں عام قاعدہ تھا آئین الملک کچھ ہی دنوں حکومت کرنے پایا تھا کہ درباری بھیدیوں نے اسکو گورنری چھوڑ کر پائے تخت حاضر ہونے پر مجبور کیا صرف اس الزام پر کہ اسنے غلطی سے دو چار درباری مفروریں کو اپنے صوبہ میں پناہ دے دی تھی۔ لیکن تھا سمجھدار اور چلتا ہوا دلّی سے تو حیلہ کر کے چلا آیا اور اجودھیا پہنچکر اپنی فوج کو مسلح کر کے شاہی فوج کے مقابلہ پر آمادہ ہو گیا۔ لیکن شاہی جرار لشکر کا مقابلہ کرنا سہل نہ تھا خوب جی توڑ کے لڑا اور اس جنگ میں اسکے کئی بھائی کام آئے بالآخر اطاعت قبول ہی کرنی پڑی اور اپنی معافی کا ملتجی ہوا۔ بعد اسکے اودھ کی گورنری حسام الملک کو ملی۔ لیکن اسکے بعد دلّی ہی کی سلطنت کا شیرازہ بکھر گیا اور سارا ہندوستان مختلف خودمختار سلطنتوں میں منقسم ہو گیا۔ اور

اودھ شرقی خاندان جونپوری کے پالے پڑا۔ اجودھیا بھی ایک صدی تک انھیں حکمرانوں کے تحت میں رہا۔ اور گمان غالب ہے کہ دو ایک بادشاہوں نے اپنی عمریں سرجو کے کنارے گذاریں جس کے ثبوت میں صرف ایک بادشاہ کا مقبرہ باقی رہگیا ہے لیکن وہ بھی گر گرا کر زمین کا پیوند ہو گیا ہے اور کتبہ تک کا پتہ نہیں ہے۔

سلطان بہلول کی تقسیم سلطنت کے تذکرہ میں لکھنؤ، کٹرہ وغیرہ کا ذکر ہے لیکن اودھ اپنی غیر موجودگی کی وجہ سے ممتاز ہے اسکی وجہ صرف یہی معلوم ہوتی ہے کہ اجودھیا کے بجائے پایۂ تخت ٹانڈہ کو ہٹا دیا تھا جیسے علاءالدین کے زمانہ میں جونپور میں مشمول ہو گیا تھا۔

لیکن اب ہند سے کئی صدی کے لیے طوائف الملوکی رخصت ہونیوالی تھی اور مغل قبضہ (تلوار) کی ہیبت اودھ میں بھی ظاہر ہونیوالی تھی چنانچہ بابر نے بذات خود اودھ کا رخ کیا اور نانا مؤ کے گھاٹ پر گنگا پار کرکے کوچ بر کوچ کرتا ۱۵۲۸ء میں اجودھیا کے دروازوں پر گھوڑے کی باگ روکی۔ بابر کے ہمرکاب فتح و نصرت تو تھی ہی پہنچتے ہی چند افغانیوں کو جو اسوقت اجودھیا کو لوٹ رہے تھے بھگا دیا اور باقاعدہ حکومت قائم کی۔ چونکہ ایک عرصہ سے کسی حاکم کے نہ ہونے سے بدنظمی غایت درجہ پھیلی ہوئی تھی اسلیے انتظامی مشین کو باقاعدہ طور پر درست بنانے کے لیے بابر نے چند روز اجودھیا ہی میں قیام کیا لیکن افسوس کہ اس نے اپنی کمزوری اور بیجا تعصب کو رام بھون میں مسجد بنوا کر ہمیشہ کے لیے اپنے نام کے ساتھ جگہ دیدی یہ ایک ایسا دھبہ بابر کے کیرکٹر پر لگ گیا ہے جو احکام شرعی اور پولیٹیکل و سیاسی عقلمندی کے بالکل خلاف تھا اور ایک عرصۂ دراز تک اُسکے پاک دامن پر دُور سے نظر آتا رہیگا۔ ہمایوں شیر شاہ کی وجہ سے اجودھیا کو اپنے قدموں سے سرفراز نہ کرسکا لیکن اکبر نے اس سرزمین کو ضرور ممنت بخشی جبکہ وہ سکندر خاں کے مقابل لشکر آرا ہوا تھا۔ اس ممتاز بادشاہ کی آمد کی یادگار میں کئی قصبے آباد کیے گئے تھے اور اکبر نے بھی مثل بابر کے اپنی تشریف کی یادگار میں ایک مسجد تعمیر کرائی لیکن اس میں اُس تعصب کا نام تک نہ تھا جو بابر نے ظاہر کیا تھا۔ ایک علحدہ جگہ پر چھوٹی سی مسجد اپنے ہم مذہبوں کے لیے بنوادی تھی اور ہندوؤں کے کسی معبد میں دست برد نہ کی۔

سلطنت مغلیہ کے زمانہ میں امن و امان کے باعث لوگوں کو سفر کرنے اور جگہ بہ جگہ آنے جانے کا خیال پیدا ہو چلا تھا اور لوگ کثرت سے اجودھیا میں آباد ہوتے جاتے تھے۔ مغربی بہادر کے ہمراہ مغربی تمدن اور مغربی علوم و فنون بھی ہند کے سب سے پرانے شہر میں بکثرت پھیلتے جاتے تھے۔ چنانچہ نئی ساخت کی عمارات، بڑے بڑے میناروں اور بیضاوی گنبدوں والی مسجدیں سرعت کے ساتھ اس شہر میں بنتی چلی جاتی تھیں لیکن اس لحاظ سے کہ ہنود کے دل نہ دُکھیں مسجد و مقابر وغیرہ بیرون شہر عموماً تعمیر ہوتے تھے جنھوں نے رفتہ رفتہ ایک نئے اور دوسرے شہر کی صورت قبول کر لی۔

سعادت خاں کی آمد نے نئے سرے سے ایک دوسرے ہی شہر کی بنیاد ڈال دی جو زیادہ تر اسلامی عمارات سے مزین ہوتا گیا اور اجودھیا صوبہ کی دار الحکومت کی حیثیت سے تبدیل ہو کر صرف ایک ہندوؤں کا تیرتھ گاہ رہگیا اور یہ عزت اسکو اسوقت تک حاصل ہے۔ آخری دور میں مغربی تمدن نے بھی اس کی بہت کچھ یاری کی اور مرحوم راجہ سر پرتاب نرائن سنگھ بہادر نے اس کو رشک فردوس بنانے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ ہماری بھی دعا ہے کہ خدا اسکو راجہ رامچندر جیسی عظمت مغربی پیرایہ میں عطا کرے

عزیز

در عشق چو باب توبہ بستم بستم رندم ز مے نگار مستم مستم
آزردہ مکن دلم تو اے واعظ شہر بگذار و برو کہ ہرچہ ہستم ہستم

حمید کوٹلوی

اصولِ زندگی

دنیا میں اُس قوم سے بڑھکر قابل الزام کوئی قوم نہیں جو زندگی کے اصول گم کردے، یا ضروریاتِ حیات کی طرف سے ایسی غلط فہمیوں کا شکار ہو جائے جس سے نحوست و نکبت، نفاق و نفرت، تنزل و افلاس، اور تعصب و جہالت اُسے چاروں طرف سے آکر گھیر لیں۔

تاریخ ہمیں جہاں تک مدد دے سکتی ہے اُس سے یہ بات صاف طور پر معلوم ہوتی ہے کہ نوع انسان کے جس گروہ نے جس وقت زندگی کے شایستہ اصول اور اُسکی لازمی ضرورتوں سے بے نیازی شروع کر دی اُسی وقت سے نامعلوم طور پر اُس میں زوال اور نکبت کے اسباب پیدا ہو گئے حتی کہ وہ مٹتے مٹتے چند گمنام اور بیکار افراد کا مجموعہ رہگیا اور پھر اُسنے اُبھرنا بھی چاہا تو اُبھر نہ سکا۔

کتابِ عالم کے بیان ہستی کا سیاق و سباق ہمیں ہندوستان میں بھی اپنے افراد ملک و قوم کا یہی خلاصہ پیش کرتا ہے اور ہم اپنی مجموعی حالت کو معیار زندگی سے بہت کچھ گرا ہوا اور علمی، عملی، اخلاقی اور تمدنی خصوصیتوں سے بالکل معرا پاتے ہیں۔ بہر کیف اس وقت ہندوستان کے وسیع برِ اعظم میں برٹش حکومت کے زیر اثر ہم تمام ہندو اور مسلمان جس آزادی اور آسایش و راحت سے بسر کر رہے ہیں اسکا اعتراف نہ کرنا ایک قسم کا کفران نعمت ہے لیکن اگر ہم سے یہ سوال کیا جائے کہ ہمنے اس پُر امن زمانہ میں کیا کیا یا اپنی زندگی کو کامیاب بنانے میں کون سے اصول جدید قائم کیے تو جواب یہ ہوگا کہ ہمنے قدیم اصول بھی کھو دیے۔ واے ہے ہم! افسوس!! صد افسوس!!! قدیم و جدید کی بحث یہاں بے محل ہوگی۔ ہر سمجھدار شخص تھوڑے سے غور کے ساتھ اپنی زندگی کی لازمی ضرورتوں اور اُسکی علمی، عملی، جسمانی، یا تمدنی اہمیتوں کو سمجھ سکتا ہے۔ لیکن بیحد افسوس ہے کہ ہمنے جس قدر اُنھیں سمجھنے کی کوششیں کیں ہمارا ہر قدم پیچھے کو پڑا ہے۔ جس ترقی کو ہم ترقی کہتے ہیں در اصل وہ ترقی معکوس ہے۔ کیونکہ اخلاق و اعمال کی درستی کے بغیر کسی قوم کا نظام قومیت اور آئین معاشرت درست و پائدار نہیں ہو سکتا، اور جب تک کسی مُلک کے افراد میں بلا اختلاف عقائد و خیال یکجہتی اور ہم آہنگی کے ساتھ اتفاق و محبت کا مبارک عنصر پیدا نہ ہو، اور نیز یہ کہ وہ حقِ مساوات کو ملحوظ رکھکر زندگی کے چند مختصر مگر مستقل اصول کے پابند نہ ہوں، زندگی کی سچی برکات ہرگز حاصل نہیں کر سکتے۔

اختلاف عقائد و خیال کوئی تعجب انگیز امر نہیں۔ انسانی قلوب و طبائع کا تخالف ایک قدرتی بات ہے اور یہ ہر ملک میں پایا جاتا ہے۔ لیکن جس قسم کا اختلاف بدقسمتی سے ہم اپنے ملک و وطن میں پاتے ہیں وہ نہایت حیرت انگیز بلکہ قابل افسوس ہے، کہ ہم اُسکے باعث اپنی گراں مایہ زندگی کی کسی برکت و سعادت کا مُنہ نہیں دیکھ سکتے۔ بعض اوقات یہ اختلاف ایسی افسوسناک صورتیں اختیار کر لیتا ہے کہ ہم ایک دوسرے سے ملنے کی عوض ہٹتے ہٹتے بُعد المشرقین پر جا گرتے ہیں۔ الغرض ہمکو اب تک اسی طفلانہ روش کے اندازنے کسی سمت راس پر چلا کر منزل مقصود تک پہنچنے نہیں دیا، مگر ہم ہیں کہ ہمیں اُسکا احساس تک نہیں!

اس امر کا ٹھیک پتہ لگانا دقت طلب ہوگا کہ حضرت انسان نے اس پُر شوکت کائنات میں کب سے آکر آنکھیں کھولی ہیں اور اُسکی زندگی کی رفتار کس وقت یا کس زمانہ سے شروع ہوئی ہے۔ لیکن اس میں کچھ شک نہیں کہ آنکھیں کھولتے ہی اُسے ایک ایسا عالم نظر آیا جس میں اُسکے محسوسات اور مدرکات کے لیے غیر محدود وسعت تھی۔ وہ ایک چیز کی جنبش کے سبب کا پتہ لگاتے ہوے اسباب کے عظیم الشان سلسلہ تک پہنچا اور اسی طرح رفتہ رفتہ اُسکے دل میں سب سے پہلے جس چیز کا احساس زیادہ اثر انداز ہوا وہ اُس ہستی کا احساس تھا جسے جاننے کی اب تک بڑی رفیع الشان کوششیں ہو چکی ہیں لیکن وہ ابھی تک بہت کچھ نامعلوم ہے ؏

درد عشق نشد ہیچ کسے محرم راز
ہر کسے بر حسب فہم گمانے دارد

مگر اُس مقدس ہستی برتر کے دانش آموز خیال نے مختلف ممالک کے مختلف الخیال انسانوں میں مختلف اسماو آثار سے جلوہ گری کی ہی۔ انکار کسی کو نہیں۔ مذہب کا یہ ہیولائے مقدس کچھ ایسے اندازوں سے اُٹھا جسکے لیے اُسکی صوری تراش خراش میں انسان کو متخیلہ نے بہت کام دیا اور اپنی سمجھ کے مطابق ابتدائی صدیوں میں شجر و حجر اور برق و باد کے سامنے سرنگوں ہوتا رہا۔

لیکن انسان کی زندگی ایسی چیز نہ تھی جو دوسرے حیوانات کی طرح محض کھانے پینے، چلنے پھرنے، اور سونے جاگنے، تک محدود رہتی کیونکہ انسانی نفس ناطقہ کی پروازیں اُس خالق اکبر نے اپنی بالغہ حکمتوں سے بڑے وسیع پیمانہ پر ارفع اور بلند رکھی تھیں، چنانچہ انسان زندگی کے مختلف مراحل طے کرتے ہوئے حسیات سے گزر کر آخر آج علم کے اس درجہ پر پہنچے ہیں کہ دنیا کی تمام مخلوقات سے ہمیں اپنا استحقاق شرافت بداہتاً فائق و بالا معلوم ہو رہا ہی، اور علم کے اس مبارک انکشاف پر ہم تمام مقدس بزرگوں اور رہنماؤں کے صدق دل سے مشکور ہیں جنھوں نے ہمارے اسلاف کی دستگیریاں کی ہیں اور ہم بھی اُنکے نام لیوا ہیں۔

لیکن چونکہ انتظام قدرت کچھ ایسا اعلی اور بالا ہی کہ اُس میں کوئی چیز مہمل یا بیوقت ظاہر نہیں ہوتی لہذا علم کا یہ ہوش افزا مکاشفہ بھی حضرت انسان پر زندگی کی بے انتہا کوششوں اور ان تھک موشگافیوں کے بعد ٹھیک اُس وقت ہوا جبکہ وہ آثار علوم و تمدن اور انوار تہذیب اخلاق سے بہرور ہونے کے لیے قدرتاً اہل ہو چکا تھا۔

خیالات کی اس تجدید نے انسان کے سابقہ توہمات اور قدیم مفروضات کی بہت کچھ اصلاح کی اور اُسے موجودات کی غلامیوں سے خود بخود ایک قسم کی ندامت محسوس ہونے لگی حتی کہ وہ انسانی غلامی کی قید سے بھی آزاد ہو گیا۔ انسان کی اسی فطری حریت نے نظام حکومت کو شخصیت سے بدلکر جمہوریت پر لا ٹھیرایا اور اُس نے اپنی زندگی کے اصولوں کو جانچا، مذہب کو زیادہ گہری نگاہوں سے دیکھا، اور اُسکی ضروریات یا اصلیت کو بھی سمجھا۔ جس کا تمام لب لباب اور ماحصل سچائی اور صداقت، معاملات کی درستی ایفاے عہد، ایثار نفس، ایک دوسرے کی ہمدردی، اور کردار و اعمال کی اصلاح پر ٹھہرتا ہی۔ ان چیزوں کو اگر آج بھی ہم اپنی زندگی سے علٰحدہ کر دیں تو ہماری تمام جمعیت جانوروں کا گلہ اور ہماری زندگی محض وحشیانہ اور ابلہانہ ہو جائیگی۔

یہ موٹی موٹی چند باتیں ہمیں ہر مذہب سکھاتا ہی۔ یہ چند اصول ہمیں ہر آسمانی کتاب سے ملتے ہیں۔ اور زندگی میں ہمیں امن و امان یا سلامتی کے ساتھ جینے کے لیے انکی سخت ضرورت ہی۔ اگر یہ باتیں عقائد و خیال سے اُٹھا دی جائیں تو کون کہ سکتا ہی کہ ہماری شب بیداریاں، ریاضتیں، مجاہدے، اور تمام اقسام کی عبادتیں کچھ کام آسکیں گی۔ ہرگز نہیں، کسی بزرگ نے خوب کہا ہی ؎

مباش در پے آزار ہرچہ خواہی کن　　کہ در طریقت ما بیچ ازیں گناہے نیست

لیکن تمام مقدس کتابوں اور آسمانی نوشتوں میں روحانیات کے مبحث کی بعض پیچیدگیوں نے انسان کو محنت شاقہ یا محض روحانیات کی جن اُلجھنوں میں اُلجھایا وہ تار و پود نہایت عجیب شان سے صدیوں بنی نوع انسان پر تنا رہا بلکہ ہم اہل ایشیا پر اب تک تنا ہوا ہی۔ حالانکہ روحانیات کے تمام مکاشفات کا اصل مقصود اصلاح اخلاق و عمل پر مبنی تھا نہ کہ شعبدوں اور کرامتوں پر۔ کیونکہ خرق عادات کے تمام مظاہر ضروریات حیات سے خارج اور زندگی کے لازمی اصولوں سے بالکل جداگانہ چیز ہیں۔ علامہ غزالی اسی لیے اپنے ملفوظات میں لکھتے ہیں کہ ”ایک شخص اگر آسمان پر اُڑ کر تبلا دے یا فضا میں تیرتا پھرے لیکن اُسکے اخلاق اچھے نہ ہوں تو سمجھو کہ ایک تنکا ہی جو ہوا میں اُڑ رہا ہی“۔ انھیں خصائص حیات کو سمجھ کر کسی دانا نے یہ کہا ہی ؎

تو کارِ زمیں را نکو ساختی — کہ با آسماں نیز پرداختی

آج یورپ میں جابجا ہوائی جہازوں کا زور ہے۔ لیکن اُنھیں بھی یہ خیال ریل، اسٹیمر، موٹرکار، اور بائسکلیں بنا لینے کے بعد پیدا ہوا۔ مگر حیرت ہے ہم لوگوں پر کہ ہم دفعتاً زمین چھوڑ کر عرش اعظم پر پہنچنا چاہتے ہیں اور اپنی زندگی کو کسی مفید اصول کی پابندی کے بغیر محض اوہام اور بعض مفروضات عجیبہ کی پیروی میں گذار دینے کے عادی ہو رہے ہیں۔

بیشک انسان کا شرف و کمال انسان ہونے میں ہے نہ فرشتہ ہونے میں۔ یہی وجہ تھی جس کے باعث خداوند نے فرشتوں کو آفرینش آدم کے وقت شانِ جلالی کے ساتھ ڈانٹ کر فرمادیا کہ چپ ہو! آفرینش آدم کے معاملہ میں جو کچھ میں جانتا ہوں وہ تم نہیں جانتے۔ بات بھی سچی تھی کیونکہ فرشتوں کو روحانیت کے اعتبارات سے خواہ کیسا ہی اعلیٰ درجوں پر سمجھ لیا جائے مگر وہ اپنی فطرت کی خاص نوعیت کے باعث انسانی آفرینش کی اہمیت یا اُسکی اغراض کو سمجھنے سے معذور تھے۔ چنانچہ علّم آدم الاسماء کلہا کے بعد یہ اشارہ ثم عرضھم علی الملائکۃ اس امر کی صاف شہادت ہے کہ انسان خداوند کی نظر میں فرشتوں سے بڑھ کر عزیز اور محبوب تھا اور اس شرف و قبول کی وجہ صرف کمال روحانیت نہیں بلکہ اکتساب علوم و فنون اور محاسن اعمال و اخلاق کے ساتھ زندگی میں امتحانات حیات کی وہ غیر محدود کشمکش تھی جس میں رہ کر حضرت انسان نے اپنا کمال و شرف علمی، اخلاقی، تمدنی، عقلی، اور عملی صورتوں سے ثابت کیا ہے اور یہ وہ بات ہے جو فرشتوں کو نصیب نہیں ہوئی۔

مگر قطع ازیں اس ملکوتی روحانیت کا خیال بوجوہ چند در چند تمام ساسانی، کیانی، کلدانی، عبرانی، اور آرین نسلوں میں راسخ رہ چکا ہے بلکہ اب تک ہم اسے موجود پاتے ہیں۔ ایشیا کا ہر عالم اور نکتہ رس خصوصیت سے ہی بال کی کھال کھینچتا رہا جس پر فرشتے ناز کرکے خجل ہو چکے تھے۔ لیکن ہمارے یہاں تو ہوتے ہوتے اُس بال کی کھال بھی یہاں تک کھینچی ہے کہ بال بھی باقی نہیں بچا۔ یعنی یہی روحانیت بھی ہمارے پاس نہ رہی ع

ہمہ حیرتم کہ دہقاں بچہ کار کشت مارا

تمام مذاہب بلاشبہ واجب التعظیم اور تمام آسمانی صحائف یقیناً واجب الاحترام ہیں۔ خداوند کے جلال کا کوئی بیان اور اُس انیک روپی پرم آتما کی عظمت کا کوئی حرف جس کاغذ پر لکھا ہوا ہو اُسے چوم کر آنکھوں سے لگانا ہماری زندگی کا دستور العمل ہونا چاہیے۔ ہم ہندوستانیوں کا یہ فخر ہے کہ ہم لوگ سچائی، صداقت، گرگیان اور ست پر جان دیتے ہیں۔ لیکن باوجودیکہ زندگی کے بے انتہا ربانی انعامات علوم و فنون کی مختلف صورتوں میں ہمارے سامنے پڑے ہیں ہم تا حال روحانیت کے جس گورکھ دھندے میں آنکھیں بند کیے پھنسے ہیں اُس سے نکلنا یا خداوند کی پر شوکت کائنات کو نگاہ بصیرت سے دیکھ کر نمایاں طور پر اپنے فرائض حیات کو سمجھنا ہمارے امکان سے باہر ہو رہا ہے اور ہم اُس عالم روحانیت کو اس عالم جسمانیت سے بالکل علیحدہ سمجھتے ہیں حالانکہ ؎

جہانِ صورت کا ذرہ ذرہ جمال معنی کا آئینہ ہے
مگر اُنھیں کو جو دیکھتے ہیں جو جانتے ہیں نگاہ کرنا

ناظرین معاف فرمائیں۔ ان الفاظ سے ہمارا مقصد خدانخواستہ ہرگز نہیں ہے کہ روحانیت بے کار چیز ہے۔ یورپ کی ترقی کو ہم خود ناقص سمجھتے ہیں کیونکہ اُن میں بے انتہا مادیت کا زور ہوتا جاتا ہے۔ یورپ کے ایوان اخلاق کا ستون بھی مدت ہوئی کہ مرکز ثقل سے ہٹ چکا ہے۔ لیکن اس میں کچھ شک نہیں کہ روحانیت کے مسائل کو ہم لوگوں نے اپنی مخصوص خوش فہمیوں اور عقیدت مندیوں سے جس نوعیت سے سمجھکر بیکاری اور خیالی دینداری کے سہارے میں چپ سادھ لی ہے وہ نہایت افسوس انگیز ہے۔

دنیا میں انسانی زندگی کو اصول و نظام کا پابند کرکے ٹھیک طریقہ سے درست رفتار کے ساتھ چلانا مذہب کا کام ہے اور مذہب جب حشو و زوائد سے پاک و درست حالت میں رہتا ہے وہ اپنی غرض کی تکمیل میں کبھی قاصر نہیں رہتا۔ لیکن جب اس میں مرور ایام کے باعث بعض عجائب پسند انسانوں

اور اندھے عقیدت مندوں کی عقیدت کا ہیولیٰ مختلف آمیزشیں کر دیتا ہے تو مذہب کی صورت بھی بگڑ جاتی ہے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لوگ زندگی کے اہم مقاصد کو گم کر کے نظام قومیت اور اصولِ حیات سے علٰحدہ ہو کر اوہام کے غاروں میں بھٹکتے پھرتے ہیں۔ کرنے کے ضروری اور مفید یا افادہ کاموں کو چھوڑ کر عنقا و ہُما کا شکار کرنا کمال انسانی سمجھنے لگتے ہیں حالانکہ لکھنے والے عاقل نکتہ رسوں نے یہ بھی کہہ دیا کہ ؎

عنقا شکار کس نہ شود دام باز چیں
کاینجا ہمیشہ باد بدست دام را

اے عزیزانِ وطن! اگر ہماری ضروریات حیات کسی دوسرے شخص کی جسمانی، علمی، اور تمدنی، محنتوں سے پوری ہوتی ہیں، اگر ہم اوروں کے ٹیے سلیے پر گذر اوقات کر کے روحانی فضائل کے نغمے سناتے ہیں، تو ہمارے تمام مجاہدے، اور یوگ کے سارے آسن یا نشستیں بالکل بیکار ہیں۔

اے برادران قوم! اگر ہم خداوند کی بے انتہا نعمتوں، دولتوں، اور برکتوں سے جو ہر وقت ہمارے تمھارے آس پاس وسعت سے پھیلی ہوئی ہیں فائدہ اُٹھا کر مشکلات حیات کو حل نہیں کر سکتے تو ہماری دینداری محض افسانہ ہے۔ اے محترم بزرگو! اگر ہمنے اپنی گراں مایہ زندگی کے فرائض کو محض چند گھنٹوں کی وظیفہ خوانی تک محدود سمجھ رکھا ہے تو ہم بیش از بیش ممکن ہے فرشتہ ہو جائیں مگر ہمارے لیے انسان ہونا زیادہ باعث فخر ہوگا۔ انسانیت بہت بڑی چیز ہے۔

زمانہ کبھی نہیں بدلتا۔ اُسے جس نہج پر قدرت نے رکھا ہے چل رہا ہے۔ مگر ہاں انسانی ضرورتیں اُسکے علم و عقل، ادراک و خیال، کی رفعت و پستی کے زیر اثر ہمیشہ بدل جاتی ہیں۔ آج دنیا میں امن و عزت کی زندگی گذارنے کے لیے جن وسائل و اسباب کی ضرورت ہے اُن سے چشم پوشی کر کے اگر ہم محض اپنے اسلاف ہی کے کارناموں کے قصہ خوان بنے رہے تو ہماری تمام آوازیں بیکار ہونگی اور ہمارے سب رشتے ٹوٹ جائیں گے۔ تاج و تخت کی قیمت اگرچہ جوتی ہے، لیکن اگر جوتی بھی پاؤں میں نہ رہی تو سخت مشکل ہے۔ تخت و تاج نہ سہی مگر کم ازکم دنیا میں اگر ہم وجود رکھتے ہیں تو ہمیں اُن لوازم کی سخت ضرورت ہے، جنکا مہیا کرنا جسمانی اور روحانی ضرورتوں کے واسطے نہایت ضروری ہے۔ لیکن ہم ان اسباب کو جمع کرنے کے لیے اُس وقت تک ہرگز قابل نہیں بن سکتے جب تک ہم اپنی زندگی کو چند ایسے اصولوں کا پابند نہ بنا لیں جنکی پابندی کا یقینی نتیجہ سعادت اور برکت مانا جاتا ہے۔ اگرچہ ہماری مقدس کتابیں اِن ہدایات سے بھری پڑی ہیں لیکن میں اپنے خیال ناقص کے مطابق چند باتیں عرض کرتا ہوں۔ منوانا میرا کام نہیں ہر اہل بصیرت خود نتیجہ پر پہنچ سکتا ہے۔

(۱) ہم ہر انسان کو انسان ہونے کے لحاظ سے دیکھیں اور ملیں نہ کہ باعتبار مذہب۔ کیونکہ مذہب کی کوئی خصوصیت کسی کی پیشانی پر لکھی ہوئی نہیں۔ سب انسان انسان ہیں اور سب لوگ اخلاق و عمل تمدن و تہذیب کی ضرورتوں میں مساوی ہیں۔

(۲) ہر شخص کی شرافت عزت اور فضیلت کا معیار اخلاق و تہذیب اور علم و عقل کے مقدس نور کی جلوہ گری پر قائم ہونا چاہیے نہ کہ دولت، امارت یا خاندانی وجاہت پر۔

(۳) شِوالوں، گردواروں، مندروں، سماجوں، مسجدوں، اور کلیساؤں کو ہم احترام و ادب کے ایک درجہ پر لائیں کیونکہ ان سب میں بالواسطہ یا بلاواسطہ اُسی خداوند برتر کی ستایشیں اور پرستشیں ہوتی ہیں جو ہر متنفس کا خالق اور ہم سب کا مالک ہے۔

(۴) تعلیم کو نہایت اچھے اسلوب کے ساتھ لڑکیوں اور لڑکوں کے لیے لازمی قرار دیا جائے اور اُنکے نصاب تعلیم کو ہر دو سال کے بعد معلومات جدید سے زیادہ بہتر بناتے رہنے کی کوشش جاری رکھی جائے کیونکہ تمام کائنات قدرتاً اصول ارتقا کے ماتحت ہے۔

(۵) کسی پیشہ اور حرفت کے شخص کو ذلیل نہ سمجھا جائے بلکہ اہل علم

سفید علمی معلومات سے اُنکی مدد کریں۔ الذّات نجس یا ذلیل کوئی نہیں،
تمام ذلتوں اور نجاستوں کی جڑ جہالت ہے اور وہ دور ہو سکتی ہے۔

(۶) گروہ اناث کا ہر جگہ بلا اختلاف عقائد و ملّت احترام کیا جائے۔
۶۰ سالہ ضعیفہ اور پانچ سالہ لڑکی دونوں یکساں عزت کی مستحق ہیں کیونکہ
ہماری موجودہ بچیاں آیندہ نسلوں کی مائیں ہیں۔ عورت کو خداوند نے
بقائے نسل کی وہ اہلیت اور خدمت عطا کی ہے جسے مرد ہرگز انجام نہیں دے سکتا
اور اسی لیے وہ قابل احترام ہے نہ کہ لائق حقارت و صعوبت۔

(۷) زانی اور فاسق و فاجر اگرچہ قانونی گرفت سے آزاد ہیں مگر ضرورت
ہے کہ ہم اپنا اخلاقی قانون زندہ کریں اور ایسے اشخاص کو جن پر زانی ہونے
کا گمان ہو انھیں سوسائٹی میں یہاں تک ذلیل و حقیر سمجھا جائے کہ وہ اپنی
ذلت کو محسوس کریں اور اصلاح حال کے لیے تیار ہوں۔

(۸) معاملات میں راستی، صداقت، دیانت، باہمی محبت و الفت کے ساتھ
معذور الحالوں کی امداد، اور ایک دوسرے کی جائز ہمدردی کو ہم ہر جگہ اپنا
ایک انسانی فرض قرار دیں۔ گر پیشہ ور گداؤں، بھک منگوں، اور مفت خوروں
کی طرف التفات نہ کریں۔

(۹) شادی اور نکاح کے لیے سختی سے لڑکیوں اور لڑکوں کی بلوغت،
اہلیت، قابلیت، اور صحت کا خیال رکھا جائے۔ نابالغی کی شادیاں، یا
شتر گربہ جوڑ ہرگز مستحسن نہ سمجھے جائیں۔ والدین کو اس امر کا خیال اپنا
فرض سمجھنا چاہیے۔

(۱۰) زانیہ یا فاسقہ مستورات کو سختی سے ناقابل التفات سمجھا جائے
اور اسکے لیے مردوں کو اپنے اخلاق و عمل کی اصلاح کرنے کی سخت ضرورت
ہے کیونکہ عورت مرد ہی کے خیالات سے متاثر ہونیوالی ہستی ہے۔ عورتوں کے
بگاڑ کا الزام بہت کچھ مردوں کے سر ہے۔

پیارے عزیزان وطن! تم ان باتوں کو جس نقطۂ نگاہ سے دیکھو تمھیں
اختیار ہے۔ لیکن جہاں تک انسان ہونے کی حیثیت سے ضمیر ہدایت کر سکتا ہے
یہ تمام مذکور الصدر باتیں ایسی دشوار العمل ہرگز نہیں کہ ان پر ہم عمل پیرا نہیں
ہو سکتے اور اگر ایسا ہی ہے تو یہ سمجھنا چاہیے کہ ہم کچھ بھی کر نہیں سکتے اور نہ
ہمسے آیندہ کچھ ہوگا۔

اے عزیزو! اگر ہمیں سچے دل سے خداوند کو پیار کرنے کی تعلیم دی گئی ہے
اور اُسے ہم ہر انسانی وجود میں جلوہ افروز مانتے ہیں تو ضرورت ہے کہ ہم
ہر آدمی سے با خلاق و محبت پیش آئیں۔ اور اس محبت کا ثبوت ہر شخص
کے طرز عمل یا اندازِ معاشرت اور لوگوں کے ساتھ روزانہ زندگی کے معاملات
سے ظاہر ہو سکتا ہے۔

فی الحقیقت جو شخص خداوند کی نظر آنیوالی مخلوق انسانی سے پیار و محبت
نہیں کرتا وہ اُس نظر نہ آنیوالی ہستی سے جسے خدا کہتے ہیں کیا محبت کر سکتا
ہے۔ آہ! جس کا ظاہری انداز اور حال یہ ہو کہ وہ بندگان الٰہی سے نفرت
و کدورت برتے اُسکے باطن کی کیفیتوں کو سمجھنے کے لیے کسی زیادہ کوشش
کی ضرورت نہیں۔

اے پیارے عزیزان ملک و قوم! اس وقت ہماری زندگی بالکل بے نظام
ہو کر علمی، عملی، تمدنی، روحانی اور جسمانی حیثیتوں سے معرض خطر میں آئی
ہوئی ہے۔ اقوام مغرب نے علوم و فنون یا باہمی اتحاد و محبت کی مقدس شمع
جلا کر اپنے مقامات کو جس روشنی سے روشن کیا ہے یہ کوئی انوکھی بات نہیں
یہ ہمارے ہی گھروں کی دبی بجھی آگ تھی جس نے ایک دنیا کو آج گرما دیا
ہے مگر افسوس کہ ہم سرد ہو کر حیرت کے ساتھ آج اُن آتش افروزوں کا
مُنھ تکتے ہیں۔ پیارے عزیزو! آج وہ وقت نہیں کہ محض لنکا اور دُوارکا کی
تعریفیں ہمارے کام آسکیں۔ وہ زمانہ نہیں کہ "پدرم سلطان بود" کی
منطق سے کچھ عقدہ کشائی ہو سکے۔ آج بمقتضائے وقت اس امر کی سخت
ضرورت آپڑی ہے کہ ہم میں سے ہر شخص اپنی زندگی کو عملی، اخلاقی، علمی،
تمدنی، اور روحانی اعتبارات سے ذاتی کوششوں کے ساتھ منفرد طور
پر ثابت کر کے دکھلائے کہ ہم زندہ ہیں مردہ نہیں۔

آئے دن کے مذہبی جھگڑے اور مقدس پیکاریں بپا رہیں - خدا کا شکر ہی کہ اس گئے گزرے حال پر بھی ہمارے دلوں میں ست کی عزت، سچائی کا احساس، گیان کی جستجو، دانش کی تلاش، اور رفعت و کمال کا ذوق موجود ہی اور بیشک ہم اہل ہند کا یہ فخر ہی کہ ہم ست پر جان دیتے ہیں -

مگر کیا ست پندرہ یا بیس ہو سکتے ہیں؟ کیا سچائی جھگڑا پیدا کراتی ہی؟ کیا سچ کو پا کر انسان کے دل میں بغض و عناد غصہ و غرور یا دوسروں کی حقارت و نفرت کا مواد فاسد باقی رہ سکتا ہی؟ اگر اسکا جواب ہر ذی ہوش نفی میں دیتا ہی تو پھر کس قدر قابل الزام و حیرت ہیں ہم کہ یہ تمام باتیں ہم میں موجود ہیں اور سخت رنج کا مقام ہی کہ ہم آئے دن ہندو اور مسلمان عزیزان وطن کی دلخراش الجھنوں کے قصے سنتے رہتے ہیں - اے بھائی جبکہ

رام ہو جاتے ہیں وحشی بھی یہاں اخلاق سے ہمکو اپنے دل ملانے کس طرح دشوار ہیں؟

اے بھارت ماتا کے سپوت بیٹو! کیا تمہارے دلوں سے ایثار نفس کی وہ تمام شانیں گم ہو چکی ہیں؟ جو کبھی تمہارے لیے نشان امتیاز تھیں - اور اے اسلام کے محترم نام لیوا افراد! کیا آپ نے اُن تمام اخلاقی محاسن اور علمی فضائل کو بھلا دیا ہی جو تمہارے اسلاف کو کبھی باعث صد نازش تھے؟ آہ! اگر ایسا ہی تو ہماری حالت لایق افسوس و مذمت ہی نہیں بلکہ قابل ملامت بھی ہی - مگر ہم اس واقعہ کو کیوں کر بھول سکتے ہیں جبکہ سری رام چندر جی نے باوجود مستحق تخت و تاج ہونے کے منتھرا کی تحریک اور اپنی چچی کیکئی کے کہنے سے اپنے چچازاد بھائی بھرت کے لیے خندہ پیشانی کے ساتھ حکومت سے ہاتھ اُٹھا کر بن باس اختیار کر کے جنگل کو چل دیے تھے!

اور کس قدر متاثر کرنیوالا ہی یہ منظر کہ اسلامی حکومت کے عہد میں قرطبہ کا ایک مسلمان امیر (صمعان ابن جریر) رات کو اپنے مکان کے صحن میں بیٹھا ہی - دفعۃً کیا دیکھتا ہی کہ ایک شخص دیوار پھاند کر صحن میں کودا ہی اور گرتے ہی اُس نے کہا کہ خدا کے لیے مجھے پناہ دو - میرے پیچھے ڈھونڈھنے والے پھر رہے ہیں کیونکہ مجھ سے ایک خون ہو گیا ہی - یہ بات سن کر امیر چونک اُٹھتا ہی کہ قتل تو گناہ عظیم ہی لیکن اچھا جب تک تمہاری زندگی ہی تم بلاشبہ جیو گے اور میں تمہارے راز کو فاش نہ کروں گا - کھانا کھاتے وقت یہ مسلمان امیر اُس قاتل کو اپنے ساتھ شریک کرتا ہی کہ محبت راسخ ہو جائے لیکن تھوڑی ہی دیر کے بعد اُس امیر کو خبر ملتی ہی کہ تمہارا لایق اور جوان بیٹا کسی مفتری کے ہاتھوں بازار میں مارا گیا ہی - لاش پڑی ہی - یہ سُن کر اُس قاتل کے پیروں تلے سے زمین نکلجاتی ہی اور امیر پر ایک سکتہ کا عالم طاری رہتا ہی - لیکن امیر فوراً ہی سنبھل جاتا ہی اور اِنّا للہ و اِنّا الیہ راجعون پڑھ کر اُس شخص کو کہتا ہی کہ اے شخص تم کچھ ہراس نکرو - میں تمسے جو عہد کر چکا ہوں وہ نہ توڑونگا - مگر بہتر ہی کہ تم اب یہاں سے چلے جاؤ ورنہ ممکن ہی کہ میرے دل میں بتقاضائے بشریت جوش انتقام پیدا ہو جائے - یہ کہکر وہ امیر اُٹھتا ہی اور اُس قاتل مہمان کو ایک جوڑا اور چند اشرفیاں اور ایک تیز رو گھوڑا دیتا ہی کہ اس پر بیٹھ کر تمھیں یہاں سے نکلجانے میں آسانی ہوگی - قاتل سخت ندامت و خفت کے ساتھ معذرت طلب کرتا ہی - آخر امیر نے رخصت ہوتے وقت کسی خاص ربانی خیال سے متاثر ہو کر اُسے کہا کہ ٹھیرو میں تمہاری پیشانی تو چوم لوں کیونکہ تم میرے مہمان تھے اور پھر خدا حافظ کہہ کر اُسے رخصت کرتا ہی - بیٹے کی تجہیز و تکفین بعد میں کیجاتی ہی - اللہ اللہ! کیا لوگ تھے -

بہر کیف یہ باتیں فوق الفطرت نہیں - ہم انسان ہیں، اگر ہمارے شریف محسوسات آج بھی زندہ ہو جائیں تو ہم سب سے ایسے ایثار اور اسی قسم کی محبت و ہمدردی کا ظہور ہونے لگ جائے - ہمیں خداوند نے وہ اعزاز بخشا ہی جو فرشتوں کو بھی نصیب نہ ہوا - لیکن اس اعزاز کو زبانی طور پر نہیں بلکہ عملی و اخلاقی طور سے دنیا پر آشکارا کرنے کی ضرورت ہی اگر ہم عملاً مذہب کے اُس نور مقدس کو جو روحانی اور جسمانی طور پر حسنِ اعمال اور باہمی الفت و اتحاد کے ناگزیر تعلقات سے وابستہ ہی ظاہر نہیں کر سکتے تو نہیں معلوم کہ ہم لوگ اپنے اپنے خیال میں کون سے سرگ، بیکنٹھ اور فردوس و خلا کے خواب دیکھتے ہیں - آہ! ہمیں کون سمجھائے کہ یہ زندگی نہایت گراں قدر دولت اور خداوند کی بے نظیر نعمت ہی - اسے خواہ مخواہ کی جنگ و پیکار میں صرف جور و ستم کرنا ہمیں منزلِ مقصود پر ہرگز نہ پہنچائیگا - مبارک ہیں وہ نفوس جنھوں نے تعلیم کی اصلی غایت زندگی کے حقیقی مقصد، اور اپنی ہستی کے متم بالشان اغراض کو سمجھکر بغض و عداوت اور

کدورت و نفرت کے عنصر کو اپنے دل سے نکال دیا ہی۔ وہ یقیناً نجات پائیں گے۔ اُن کے واسطے ہر جگہ نور ہی نور پھیلا ہی۔ وہ قدرت کے ہر منظر اور دنیا کے ہر مشاہدہ سے لازوال سرور حاصل کر سکتے ہیں اور اُنھیں کی زندگی زندگی ہی۔ کیوں کہ وہ اُن پائدار اصولوں کے پابند ہیں جن میں لیل و نہار کی کوئی گردش کسی قسم کی تبدیلی پیدا نہیں کر سکتی۔ اُنکا ہر کام علم و عقل کے ضابطوں کے ماتحت انجام پاتا ہی اسلیے کہ اُنھوں نے گیان اور دانش کو سمجھ کر اپنا دل روشن کیا ہی۔ ایسے لوگ مر کر زندہ رہتے ہیں بلکہ زیادہ نام پاتے ہیں، اگرچہ اُن کی زندگی کا اصول شہرت یا ناموری کے خیالوں سے بالکل الگ ہوتا ہی۔ کاش ایسی سچی سادہ اور خوش انجام زندگی ہم سب کو نصیب ہو، ورنہ اس زندگی اور بے اصول زندگی سے موت بہتر ہی تا کہ ہم کسی کی دل آزاری نہ کر سکیں۔

چو بکعبہ سر نہادم ز درون ندا بر آمد
تو برونِ در چہ کردی کہ درونِ خانہ آئی

ق۔ ح۔ ا

دولابۂ راستی کش

لندن کے ایک فیشن ایبل حصہ میں چند نوجوان جمع ہیں۔ بعض کھیتی ہرا ہیں جو زمانہ بھر کی سیر و تفریح اور لندن و پیرس کے عشرت خانوں اور تماشہ گاہوں سے سیر ہو کر یہاں آئے ہیں، کچھ بحری اور بری فوج کے افسر ہیں، چند منچلے ممبر پارلیمنٹ بھی ہیں، اور ایک دو وزیران سلطنت کی صورتیں بھی نظر آتی ہیں ڈیوک آف ڈورچیسٹر، صدر انجمن نے حاضرین جلسہ کو مخاطب کر کے بیان کیا:-

مائی لارڈز اینڈ جنٹلمین! آج تک ہمارے کلب کے کسی ممبر نے شہرت پسندی کی نازیبا اور مکروہ عادت اختیار نہیں کی ہی۔ اور نہ ہم کسی ممبر کو شہرت طلبی کا ملزم قرار دے سکتے ہیں۔ ایسی حالت میں اخبار ڈیلی ٹلگرام میں ہماری نسبت مضمون آنا خالی از اندیشہ نہیں۔

چاروں طرف سے "شرم شرم" کی آوازیں آئیں اور مضمون پڑھنے کا تقاضہ ہوا۔ صدر انجمن نے فرمایا۔

کل کے اخبار میں مندرجۂ ذیل مضمون ایڈیٹوریل کالم میں شایع ہوا ہی:-

گذشتہ بارہ ماہ میں اسکاٹ لینڈ یارڈ کی پولیس نے ایک نئی وضع کے ملزم کا سراغ لگایا ہی۔ یعنی ایسا نقب زن جو دوسرے ہی دن مال مسروقہ مالک کو واپس کر دیتا ہی۔ علمی حلقوں میں اسکی توضیح یوں کی گئی ہی کہ آج کل کی تہذیب و تعلیم نے جرائم پیشہ لوگوں کی ہیئت کذائی بالکل بدل دی ہی۔ پہلے زمانہ میں مدۃ العمر ارتکاب جرائم کرنے کے بعد نقب زن شاذ و نادر بڑھاپے میں اپنے افعال قبیحہ پر نادم ہوا کرتے تھے، لیکن اب صرف چوبیس گھنٹہ میں کانشنس (نور ایمان) کی چٹکیاں مجرم کے دل کو موم کر دیتی ہیں اور وہ اپنی حرکت پر نادم و پشیمان ہو کر لوٹ کا مال واپس بھیج دیتا ہی۔ لیکن اسکاٹ لینڈ یارڈ کے مبصر، ماہران سائنس کی اس تشخیص پر مسکراتے ہیں، ان کے نزدیک اس پردۂ زنگاری میں کوئی دوسری ہی صورت پوشیدہ ہی۔ وہ کہتے ہیں کہ جدید نقب زن اونچی سوسائٹی کے لوگ ہیں جو اجر منفعت کے خیال سے نہیں بلکہ محض تفنن طبع کی غرض سے نقب زنی کرتے ہیں اور پیشہ ور نقب زن کی طرح تمام خطروں کو برداشت کر کے لطف اُٹھاتے ہیں۔ اگرچہ بعض آدمی اسے انگریزی قوم کے تنزل و انحطاط کی علامت بتلاتے ہیں لیکن ہم اس رائے کے خلاف ہیں اور اس جدت کو فال نیک سمجھتے ہیں۔ کھیلوں اور تفریح کے معاملات میں پیشہ ور کھلاڑیوں کی زیادتی پر کون انگریز ہی جو افسوس نہیں کرتا۔ ایسی صورت میں ہم صدق دل سے اس اولوالعزم گروہ کا پیشہ نقب زنی میں خیر مقدم کرتے ہیں جس طرح پیشہ ور کھلاڑیوں نے ہمارے قومی کھیلوں کو کم وقعت کر دیا اسی طرح ہمیں امید ہی کہ یہ آزاد منش نقب زن پیشہ ور مجرموں کی اصلاح میں ممد و معاون ہونگے۔ جو نقب زن چوری کا مال چوبیس گھنٹہ میں واپس کر دے، اس قابل ہی کہ اُسکی

حوصلہ افزائی کیجائے۔ کیونکہ ہمیں امید ہے کہ جو شال آزاد نقب زن قائم کرتے ہیں اسکی تقلید جرائم پیشہ چور آج نہیں تو کل ضرور کریں گے۔

جنٹلمین! خوش قسمتی سے ہم اب تک پولیس کی زد سے بچے رہے ہیں، لیکن اخبار ڈیلی تکلر کے حوصلہ افزا مضمون کی وجہ سے ہمیں پھونک پھونک کر قدم رکھنا لازم ہے۔ میں جملہ ممبران کو حد درجہ کی احتیاط اور دوراندیشی برتنے کی نصیحت کرتا ہوں۔ نہ صرف پولیس بلکہ اخبار نویس بھی ہمارے طریقہ کارروائی اور ہمارے درجہ سے ایک حد تک واقفیت رکھتے ہیں۔ ممکن ہے کہ پولیس ممبران کلب کے نام سے بھی آگاہ ہو۔

چاروں طرف سے صدائیں بلند ہوئیں کہ کل ہی سے ہم اس اخبار کا چندہ بند کر دیں گے۔ ڈیوک نے اس گرم جوشی کا شکریہ ادا کرکے کہا کہ مجھے آپکی اس تائید سے بڑی تقویت ہوئی۔ اب میں جلسہ کے ایجنڈا کی طرف متوجہ ہوتا ہوں۔ اگرچہ ظاہر میں معلوم نہیں ہوتا مگر ہم آج کل سائنس اور علم کے زمانہ میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ ہمارے کلب نے اب تک سائنس کی طرف چنداں توجہ نہیں کی ہے، اگر کبھی توجہ کی بھی تو ایسی مادی چیزوں کے لیے جیسے ریڈیم یا ایروپلین (ہوائی جہاز)۔ سائیکالوجی (علم روحانیات) سے تو سوائے نام کے ہمیں کچھ بھی واقفیت نہیں ہے۔

کپتان کا نمبر ولا "میں تو اسکے ہجے بھی نہیں کرسکتا"۔

ڈیوک نے قطع کلام پر کچھ دھیان نہ کیا۔ "مجھے خیال ہوا کہ اپنے کلب کی اعلے خصوصیت قائم رکھتے ہوئے زمانۂ حال کے جدید ترین اختراع سے کچھ نفع بھی حاصل کریں۔ خوش قسمتی سے ہمیں موقع حاصل ہے۔ ڈیلی تکلر کی اسی اشاعت میں تحریر ہے کہ جرمنی ڈاکٹر بام برجز پروفیسر یونیورسٹی برلن نے ایک ایسا آلہ ایجاد کیا ہے جس سے انسانی دِل کے تمام پوشیدہ راز آئینہ کی طرح معلوم ہو جاتے ہیں اسکا نام گلوانک سائی کلومیٹر یا دولایۂ راستی کش ہے۔ اسکا موجد آج کل لندن میں مقیم ہے۔ اور یہ بات بڑی دل خوش کن ہے کہ اس آلہ کا تمام سامان اس قدر مختصر ہے کہ بآسانی ایک چھوٹے سے دستی بیگ میں سما جاتا ہے۔ آج لارڈ ریسی نے میجر کننگھم کی تائید سے ارل آف ڈنٹن کا نام کلب کی ممبری کے لیے تجویز کیا ہے۔ دولایۂ راستی کش سے ایک پنتھ دو کاج کا کام لیا جائیگا۔ اوّل تو اُسے چُرا کر ارل ڈنٹن بطور فیس داخلہ ممبری پیش کر سکیں گے دوّم اسکی مدد سے ہم عالم ذہنیات وسائنس کے خرمن کی خوشہ چینی کر سکیں گے جس کی ہمیں بہت ضرورت ہے۔ میں یہ بھی تجویز کرتا ہوں کہ دولایۂ راستی کش حاصل ہو جانے کے بعد ہم میں سے ایک ممبر امتحان کے لیے چھٹی ڈالکر جس کسی کا نام نکلے تجویز کیا جائے اور آلہ لگا کر اُسکے دلی خیالات اور پوشیدہ راز جنھیں وہ اپنے ساتھ قبر میں چھپانے کا خواہشمند ہو معلوم کیے جائیں۔ اے حضرات! یہ خیالات نہ صرف ہماری دلچسپی اور خوش طبعی کا باعث ہونگے بلکہ شاید ہم سب کے لیے اخلاقی سبق کا کام دینگے۔

پریسیڈنٹ کچھ اور کہنا چاہتا تھا مگر ہنسی کے قہقہوں اور تالیوں کے شور نے خاموش کر دیا۔

ڈاکٹر بام برجز پروفیسر برلن یونیورسٹی قد و قامت کے لحاظ سے غیر معمولی آدمی تھا۔ اُنچائی میں چھ فٹ چھ انچ سے کم نہ تھا اور اسی تناسب سے جسامت کا خیال کرلینا چاہیے۔ جسمانی عرض طول کے ساتھ اُسکی دماغی قوت بھی ارفع و اعلیٰ تھی جس کی تصدیق یونیورسٹی کی بیشمار ڈگریوں سے ہوتی تھی۔ وہ ریاضی کے بیابان میں فیل ہیبت کا درجہ رکھنے کے ساتھ عالم ایجادات و اختراعات میں ممتاز تھا۔ چنانچہ تارکول سے ارغوانی رنگ جسکی تلاش میں کیمیاگر پندرہ سو برس سے سرگرداں تھے اسی یگانۂ روزگار نے نکالا ہے۔ حال میں اس نے دولایۂ راستی کش ایجاد کیا ہے جس کے ذریعہ سے انسان کے پوشیدہ راز آنِ واحد میں معلوم ہو جاتے ہیں۔ ڈاکٹر موصوف لندن میں رائل سوسائٹی اور افسران محکمۂ فوجداری کے روبرو اس دولایۂ راستی کش کی حیرت انگیز قوتوں کی تشریح کرنے کی غرض سے مقیم بھی ہے۔ ڈاکٹر بام برجز کی ذہانت یہیں تک محدود نہیں، خود اُسکی روحانی قوت اس درجہ ترقی یافتہ ہے کہ بلا کسی آلہ کی مدد کے بھی اُسے ایسی بیشمار باتیں معلوم ہو جاتی ہیں جو دوسروں سے پوشیدہ

رہتی ہیں - اُس نے انتشاع نور کا ایک نظام مقرر کیا تھا - اسکے نزدیک
ہر انسان کی شخصیت سے اُسکی دلی خیالات میں رنگی ہوئی شعاع خارج
ہوتی رہتی ہے - اگر آدمی کے خیالات خراب ہیں تو شعاع بھورے رنگ کی
نکلیگی - خیالات زیادہ فاسد ہیں تو اسی نسبت سے بھورا رنگ مائل بسیاہی
ہوتا جائیگا - اگر کسی آدمی کا دل روحانیات کی جانب مائل ہے تو اُس کی
شعاعیں آسمانی رنگ کی ہونگی - سبز شعاع بغض و حسد کی شہادت دیتی ہیں
اور زرد رنگ سے نفاست مزاج ظاہر ہوتی ہے - غرضکہ اسی طرح مختلف رنگوں
سے مختلف خیالات کا پتہ چلتا ہے - اور تو اور وہ انسان کی شعاع بلا مدد آلہ
کے بھی دیکھکر دلی خیالات معلوم کر لیتا تھا - شاید یہی وجہ تھی کہ لوگ اُسکی
صحبت سے احتراز کرتے تھے - خود اُسکی شعاعیں ایسی واقع ہوئی تھیں کہ
وہ اپنے خلاف لوگوں کے خیالات فوراً محسوس کر لیتا تھا -

یہ حالات معلوم کرنے کے بعد ہم بآسانی سمجھ سکتے ہیں کہ ایک رات ڈاکٹر
بام برجز کے فلسفیانہ خواب کے سلسلہ میں عجیب ہیجانی کے آثار ظاہر ہوئے! اہل
جرمنی کی کفایت شعاری کی عادت ڈاکٹر موصوف میں بدرجۂ غایت موجود تھی
اور وہ اپنی نیند کا بھی ایک لمحہ ضائع نہ کرتا تھا - جبکہ اُسکا جسم خاکی نیند کے
آغوش میں استراحت و سکون کرتا تھا، اُسکی دماغی قوت جسم خاکی کے گراں بار
تعلقات سے علحدہ ہو کر برابر کام کرتی رہتی تھی - صرف یہی نہیں کہ معمولی آدمیوں
کی طرح اُسکی روح بے ٹھور ٹھکانے اور پریشان خواب دیکھا کرتی ہو بلکہ اُسنے بڑی محنت
اور دانشمندی کے ساتھ نیند کی حالت میں بھی اپنی روحانی قوت کو کسی خاص
مسئلہ کے حل کرنے میں مصروف رکھنے کی طاقت حاصل کر لی تھی - سونے سے
پہلے روح کے لیے ایک دقیق مسئلہ تجویز کیا جاتا اور تمام شب اُسکی روح فضائے عالم میں
مسائل عظیمہ کے حل و عقد میں مصروف رہتی اور جب صبح کو پروفیسر بستر استراحت
سے تروتازہ ہو کر اُٹھتا تو اُسکی روح اپنی شب باشی اور محنت کے نتائج کی رپورٹ
کیا کرتی - حسب معمول آج کی رات علم حرکت اجسام کا ایک دقیق مسئلہ سونے
سے پہلے روح کے حوالہ کیا گیا جس کے لیے حرکت جبریہ کا ایک مساوات کا حل
لازمی تھا - اس خفتہ کے دماغ کے سامنے اس وقت ایک ہیبت ناک قطار
آثار عجیبہ کی پیش تھی کہ یکایک اس مساوات میں شورش کا ایک عنصر شامل ہوا -
اُسے محسوس ہوا کہ اُسکی لیبرٹری واقع بیرلن یونیورسٹی معرض خطر میں ہے - دریائے
رائن سے ایک جہاز نکلا اور لیبرٹری سے ٹکرا گیا! اہل جرمن کی قومی قوت میں
زوال آگیا! غرضکہ ان خیالات نے اُسکی شعاع کی امداد سے اُسے بیدار ہونے
پر مائل کیا - آخر کار دو بجے کے قریب ڈاکٹر موصوف نیند سے چونک پڑا - ایسے
ضابطہ آدمی کے لیے یہ بیداری بالکل غیر معمولی تھی -

بستر پر بیٹھکر سوچنے لگا کہ کیا اسرار ہے - سامنے کھڑکی سے ہو کر چاندنی کی روشنی
کمرہ میں آرہی تھی مگر کہیں سے کوئی آواز نہ سنائی دیتی تھی! پھر اس شورش
کی کیا وجہ؟ اُسکی شخصیت کی شعاع بیچینی سے تھرتھرانے لگی - شاید کسی دوست
مصیبت نے اثر کیا ہے - یا کسی قریبی آفت کا سامنا ہے - اُسے اپنے ملازمین کی طرف
سے بالکل اطمینان تھا کیونکہ سب نوکر اپنے ساتھ لایا تھا اور ہر ایک کی شعاع اعلےٰ
قسم کی تھی - ڈاکٹر بام برجز اُٹھ کھڑا ہوا اور ایک فرغل جسم پر ڈال لیا اور دروازہ
کھولا اور ہر چہار طرف دیکھنے لگا -

بالکل سکوت تھا اور کوئی آواز کان تک نہ پہنچی - لیکن ڈاکٹر موصوف کے
دل کو اطمینان نہ ہوا - آہستہ آہستہ زینہ سے اُترا - سامنے کے کمرہ میں جہاں وہ
علمی تجربات کیا کرتا تھا کچھ روشنی کی جھلک معلوم ہوئی - دروازہ کھولتے ہی
حیران ہو گیا -

کمرہ میں ایک آدمی تھا - پستہ قد، خوش رُو، ڈاڑھی ڈاکٹر کی ڈاڑھی سے
ایک چوتھائی ہوگی - وہ مختلف چھوٹی چھوٹی چیزیں ایک دستی بیگ میں بمصروفیت
تمام بھر رہا تھا -

ڈاکٹر (چلاکر) "ڈونر ویٹر! تم کیا کرتے ہو - آلہ کو تباہ کر دوگے"
اُس نے گلوانگ لیمپ کو چور کے ہاتھ سے چھین لیا اور غضبناک ہو کر میز پر رکھدیا
پھر دونوں آدمی ایک دوسرے کو خونخوار جانور کی طرح گھورنے لگے - چاہیے تو
یہ تھا کہ ایسی حالت میں یہ دونوں لڑنے لگتے - پستول چلاتے یا کم از کم الفاظ

ہی کے ذریعہ سے ڈراتے دھمکاتے مگر ڈاکٹر چور کی طرف اس قدر حیرت زدگی کے
ساتھ دیکھ رہا تھا کہ چور گھبرا اُٹھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ڈاکٹر کی نگاہ اُسکے
جسم کے پار کسی چیز پر جمی ہوئی ہے۔ اُس نے گھوم کر دیکھا مگر کچھ نظر نہ آیا۔ آخرکار
ڈاکٹر چلایا " آہا! کیسی چت کبری شعاع ہے! میں نے ایسی شعاع پہلے
کبھی نہیں دیکھی۔ تم نہایت دلچسپ آدمی ہو"

نقب زن نے جھک کر فرشی سلام ادا کیا۔

ڈاکٹر (مزا لیکر) "نیلا اور پیلا! سبز اور ارغوانی! سب رنگ ایک ساتھ
نظر آتے ہیں۔ بھورے رنگ کا بھی ایک ٹکڑا ہے مگر اس قدر بڑا نہیں جتنا ایک چور
کی شعاع میں ہونا چاہیے۔ تم تو بالکل قوس قزح ہو! تم جیسا آدمی میں نے
کبھی نہیں دیکھا۔ تمہارے متعلق میں مزید حالات معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ وہاں
بیٹھ جاؤ" ایک بڑی آرام کرسی کی طرف اشارہ کرکے کہا اور جلدی جلدی بیگ
سے چیزیں نکالنا شروع کیں۔

چور۔ "کس لیے بیٹھ جاؤں"

ڈاکٹر۔ "میں اپنے دو لاپۂ راستی کش کے ذریعہ سے تمہاری شخصیت کا
معائنہ کرنا چاہتا ہوں۔ تم بڑے دلچسپ آدمی ہو۔ اور اپنی جدید فہرست تجربات
میں تمہارا حال پورے ایک صفحہ پر درج کروں گا"

چور۔ "معائنہ کرنے کے بعد کیا کروگے"

ڈاکٹر۔ "اے۔ میں تو بھول ہی گیا تھا کہ تم چور ہو معائنہ کرنے کے بعد
میں تمہیں پولیس کے حوالہ کروں گا۔ پولیس بڑی خوشی سے تمہیں حراست میں لیگی"

چور (لجاجت سے) "اگر میں آپ کو اپنا معائنہ کرنے دوں اور اس
طرح آپ کی فہرست کی تیاری میں مدد ہوں۔ کیا آپ خیال نہیں کرتے کہ ایسی
حالت میں پولیس کے حوالہ کرنا سراسر ناشکر گذاری ہوگی"

ڈاکٹر (ہاتھ مل کر) "آہا! یہ نیلا رنگ بول رہا ہے! خیر۔ نہیں۔ میں
تمہیں پولیس کے سپرد نہ کرونگا۔ مجھے پولیس یا اُسکی کارروائیوں سے
بالکل نسبت نہیں ہے۔ بس اب بیٹھ جاؤ" اُس نے زبردستی چور کو کرسی پر
بٹھا دیا اور اپنا دو لاپہ ٹھیک جانا شروع کیا اور گنگناکر کہنے لگا۔ "آہا! کیا
عجیب روشنی ہے! ایسی رنگ برنگی شعاع میں نے کبھی نہیں دیکھی۔ میں چاہتا
ہوں کہ شعاعوں کی تبدیلیاں دیکھنے کے لیے تمہیں ہر وقت اپنے ساتھ رکھوں
دیکھو۔ میں تمہارا چور ہونا دل سے بھلا دونگا۔ تمہاری بھوری شعاع چنداں
بین نہیں ہے۔ اور تمہیں ملازم رکھ لونگا۔ میں تمہیں دس روپیہ فی ہفتہ علاوہ
خوراک اور مکان کے دیا کرونگا اور ہاں! بڑی نفیس وردی بھی بنوا دونگا"

چور نے سر ہلایا۔

ڈاکٹر (جوش میں آکر) "اچھا دس نہیں تو پندرہ سہی۔ یعنی پندرہ فی
باون، کُل سات سو اسی روپیہ سالانہ ہوئے۔ پاک کمائی سے۔ اور وردی
اور خوراک علاوہ۔ سب مل کر، روپیہ ماہوار کے قریب ہوگا۔ موجودہ
حالت میں تو تمہیں ستر روپیہ سال بھر میں بھی نقب زنی سے نہ ملتے ہونگے"

چور نے فوراً جواب دیا "نہیں میری آمدنی اس سے زیادہ ہے"

ڈاکٹر (تحیر سے) "مجھے تمہاری بات کا بالکل یقین نہیں۔ میں ایک منٹ
میں یہ ثابت کر سکتا ہوں۔ تمام دنیا میں صرف میں ہی ایک شخص ہوں جسے
تم دھوکا نہیں دے سکتے۔ اچھا آؤ آزمائش کریں۔ برقی قوت کا سلسلہ قائم
کرنا چاہیے۔ اب ذرا اپنا ہاتھ اس جست کے ٹکڑے پر رکھو۔ یوں۔ دوسرا
ہاتھ کاربن پر۔ اس طرح۔ اب برقی سلسلہ ٹھیک ہو گیا ہے۔ اب میں اپنے لیمپ
کو اس طرح رکھتا ہوں کہ اُسکی روشنی اُس پردے پر پڑے جو تمہارے پیچھے ہے
اور اُس پر ناپنے کے لیے نشان بنے ہیں۔ دیکھو اس پردے پر پوئنٹ کے جاننے
کے نشان بنے ہیں۔ اچھا دوست! اب میں تمہاری آمدنی معلوم کرونگا
ستر روپیہ ماہوار کا لینا آسان نہیں ہے۔ اب میں تمہیں متحیر کروں گا۔ سُنو۔
میں سوال کرتا جاؤنگا۔ تم کچھ جواب نہ دینا بلکہ لیمپ کی لَو پردے پر بتا دیگی
تمہاری شخصیت کے ذریعہ سے یہ لَو کام کریگی۔ سچ بات معلوم ہو جائیگی۔ اب
تم ڈاکٹر بام بر جز پروفیسر برٹش یونیورسٹی سے کچھ نہ چھپا سکوگے"

"آہا۔ اب میں اپنے قرص کو گھمانا شروع کرتا ہوں۔ اور دو لاپے

سوال کرتا ہوں کہ پچھلے سال چوری کے علاوہ تمہاری آمدنی کتنی تھی؟"

قرص نے آہستہ آہستہ گھومنا شروع کیا اور چراغ کی لَو جوں جوں ہندسے سامنے آتے گئے اُچھلنے لگی۔ اکائی کے بعد دہائیاں ختم ہوئیں پھر سیکڑے بھی۔ ہزاروں کے ہندسے آنے لگے مگر قرص برابر گھومتا رہا۔

اب تو ڈاکٹر بیتاب ہو کر چلّایا "ہائے ہائے!! سلسلۂ برقی میں کچھ خرابی معلوم ہوتی ہے" اُسنے چور کے پاس جاکر دیکھا تو دونوں ہاتھ پلیٹوں پر رکھے تھے۔ پھر تاروں کا بغور معائنہ کیا مگر وہاں بھی کوئی خرابی نہ پائی سب چیزیں ٹھیک تھیں۔ پھر قرص کی طرف دیکھا تو تیس ہزار کے بعد بتیس ہزار کی رقم گذری۔ مگر قرص برابر گھوم رہا تھا۔۔۔۔ اب لَو زیادہ متحرک ہونے لگی۔ چالیس ہزار، پینتالیس ہزار، پچاس ہزار۔ لَو آٹھ انچ تک اُچھلی اور قرص کا گھومنا بند ہوگیا۔

ڈاکٹر (حیرت میں آکر) "پچاس ہزار پونڈ! ایک کمائی سے! اے خدا! لیکن یہ ناممکن ہے۔ کہیں میرا دولابۂ راستی کشش تو نہیں بگڑ گیا؟ آج سے پہلے کبھی اس نے جھوٹ نہیں بتلایا!"

ڈاکٹر بڑی پریشانی کے ساتھ کمرہ میں ٹہلنے لگا۔ کبھی ڈاڑھی کھینچی کبھی سر کے بال نوچنے لگا۔ "ہائے! میں تو جمعہ کے دن رائل سوسائٹی کے سامنے اپنے آلہ کے کمالات دکھانیوالا ہوں۔ میری شہرت خاک میں ملجائیگی اے خدا کیا کروں!"

ڈاکٹر کی مایوسی اور بے چینی کا اثر چور پر بھی ہوا اور وہ کہنے لگا "جناب والا۔ آپ کو اپنے دولابہ کی صحت پر شبہہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ اسکا بیان بالکل درست ہے۔ مجھے خود حیرت ہے۔ ہر ایک انکم ٹکس کے دفتر میں تشخیص ٹکس کے لیے یہ آلہ رہنا چاہیے۔ پچھلے سال میری آمدنی کی ٹھیک یہی مقدار تھی!"

ڈاکٹر (طنز کے ساتھ) "کیا خوب! تو میں شاید شاہزادۂ مانٹ کرسٹو سے باتیں کرنے کی عزت حاصل کر رہا ہوں!"

چور (بے تکلفی سے) "نہیں۔ آپ پھر اپنے آلہ سے مدد لیجیے اور میرا رتبہ معلوم کیجیے۔ آپ کے لیے یہ بالکل آسان ہے!"

ڈاکٹر "ہاں ٹھیک کہتے ہو۔ میں ایک مرتبہ اور اپنے دولابۂ راستی کشش کا تجربہ کروں گا۔ اگر یہ اُسکا آخری جواب حیرت میں ڈالنے والا تھا تو میں اپنے دولابہ کا اعتبار کرنا نہ چھوڑونگا۔ صاف معلوم ہوجائیگا۔ ایک مرتبہ غلطی کرنا ممکن ہے۔ بار بار نہیں ہوسکتی!"

"پیشہ معلوم کرنے کی قرص کہاں ہے؟"

ڈاکٹر نے پہلی قرص نکال کر اس قرص کو اُسکی جگہ جمایا۔ اسپر سَو سے زیادہ پیشوں کے نام بادشاہ سے لیکر حلال خور تک لکھے ہوے تھے۔

ڈاکٹر (منھ بسور کر) "اچھا اب برقی سلسلہ پھر قائم کرلو۔ سُنو۔ میں سوال کرتا ہوں کہ "تمہارا پیشہ جس کے ذریعہ سے تم ستر روپیہ سے زیادہ کماتے ہو۔ کیا ہے؟ بتلاؤ"

قرص آہستہ آہستہ گھومنے لگا اور چراغ کی لَو ٹمٹمانے لگی۔ حلال خور کا نشان گذر گیا اور لَو نہ اُٹھی۔ جہاز رانی پر لَو تین انچ اونچی اُٹھی کیونکہ کسی زمانہ میں چور بحری فوج میں ملازم رہ چکا تھا۔ اسکے بعد قرص بدستور گھومتا رہا جب امراء کا طبقہ نزدیک آیا تو ڈاکٹر چلّایا "اے غضب" ہائے میں کس طرح رائل سوسائٹی کو منھ دکھا سکوں گا۔ میرا دولابۂ راستی کشش بڑا دھوکہ باز اور جھوٹا نکلا۔ ہائے ہائے۔ ارے باپ رے" جس وقت امیرزادوں کا نشان سامنے آیا چراغ کی لَو ٹ بھر اونچی اُٹھی اور قرص گھومنا بند ہوگیا۔

ڈاکٹر دھم سے کرسی پر گر پڑا۔ پسینہ کے بڑے بڑے قطرے پیشانی پر نمودار ہوے اور کہنے لگا "بڑے غضب کی بات ہے! رات کے وقت ایک نقب زن میرے گھر میں گھسا ہے لیکن میرا دولابۂ راستی کشش کہتا ہے کہ یہ چور نہیں بلکہ امیرزادہ ہے جسکی سالانہ آمدنی پچاس ہزار پونڈ ہے!"

چور کی طبیعت بڑی ہمدردانہ واقع ہوئی تھی اُسکی شعاع میں لطف وعنایت کے رنگ نے امتیازی درجہ پایا تھا۔ ڈاکٹر کی مایوسی اور پریشانی کو

دیکھکر فوراً تسلی وتشفی کرنے لگا۔

چور۔ "آپ ہرگز اپنے آلہ کی صحت پر شک نہ کیجیے۔ میرے نزدیک تو یہ صحت کا پتلا ہی۔ اس مرتبہ پھر اس نے بالکل صحیح بات بتائی۔ اتفاق سے میں امیر زادہ ہوں"۔

ڈاکٹر نے نظر اٹھا کے دیکھا تو کوئی خاص علامت امارت کی نظر نہ آئی۔ پھر غور سے اُسکی شعاع پر دوبارہ توجہ کی۔ اطمینان نہ ہوا۔ سر ہلا کر کہنے لگا۔ "تم امیر زادے نہیں ہو، کیونکہ اُمراد و بجے رات کو لوگوں کے گھر میں گھس کر چوری نہیں کیا کرتے۔ پچاس ہزار آمدنی اور یہ حرکت! میرے دولابۂ راستی کش نے ضرور غلطی کی ہی"۔

چور۔ "جناب پروفیسر صاحب! آپ کی سمجھ کی خوبی ہی جو آپ آلہ کی صحت پر شک کرتے ہیں۔ شاید آپ کا دماغ مرکز ثقل سے ہٹ گیا ہی"۔

دماغی صحت کا اشارہ پا کر ڈاکٹر نے ایک دفعہ پھر غور سے دیکھا اور یکایک اُسکا چہرہ جگمگا اُٹھا۔ اور جوش کے ساتھ کہنے لگا "اخاہ! میں سمجھا میں نے اسکا تجربہ پہلے کبھی نہین کیا تھا"۔

اپنی جگہ سے اُٹھا اور چور کی پیشانی پر ہاتھ پھیر کے نہایت نرمی سے بولا "کیوں بھئی! سچ کہنا۔ کبھی تمنے یہاں درد محسوس کیا ہی؟"

چور۔ "جی ہاں کبھی کبھی رات بھر گھومنے کے بعد"۔

ڈاکٹر۔ "میرا خیال صحیح ہی۔ بالکل یہی بات ہی۔ تم اس بات کا یقین رکھتے ہو کہ تم امیر زادے ہو اور تمھاری آمدنی پچاس ہزار پونڈ ہی؟ میرا دولابۂ راستی کش بالکل صحیح کہتا ہی!"

چور۔ "مجھے بہت خوشی ہوئی کہ آپ اس نتیجہ پر پہنچ گئے۔ اب اجازت ہو تو میں رخصت ہوں"۔

ڈاکٹر۔ "ہاں۔ بہت اچھا۔ میں تمھیں روکنا نہیں چاہتا۔ لیکن تمھارے ساتھ کسی آدمی کا جانا ضروری ہی جو بحفاظت تمام تمھیں تمھارے محل اور خزانہ کے پاس پہنچا دے۔ کہو کسے بلاؤں؟"

چور۔ "تسلیم۔ بڑی مہربانی۔ میں رستہ جانتا ہوں اور خود بآسانی چلا جاؤں گا"۔

ڈاکٹر۔ "جی ہاں۔ ضرور۔ ضرور۔ میرا بھی یہی خیال ہی۔ مگر آپ جیسے امیر زادہ کا لندن کی گلیوں میں تن تنہا پھرنا خطرہ سے خالی نہیں۔ بہت ضرورت کے لیے کسی کا ساتھ ہونا ضروری ہی۔ کیسی بھیانک اندھیری رات ہے! ایک لمحہ کی اجازت دیجیے"۔

یہ کہکر ڈاکٹر نے جلد جلد ٹیلیفون کی کتاب کی ورق گردانی کی۔ پھر ٹیلیفون میں بات کرنے لگا "پینتیس چھتیس۔ نمبر چھتیس؟ یہاں سر ولیم تو نہیں ہیں..... ہاں اِس وقت نہ ہوں گے.... میں ڈاکٹر بام برجر ہوں جس نے کل اپنے دولابۂ راستی کش کے عجائبات دکھائے تھے۔ ... ہاں۔ اچھا۔ میرے یہاں ایک ناخواندہ مہمان آگیا ہی۔ میں اُسے معمولی چور سمجھتا ہوں مگر وہ اپنے آپ کو امیرزادہ اور پچاس ہزار پونڈ سالانہ کا دولتمند سمجھتا ہی.... سمجھیے اسکا مطلب.... اچھا آپ آکر اُسے اُسکے گھر پہنچا دیجیے.... یہاں اور کوئی نہیں ہی"۔

ڈاکٹر موصوف مکالمۂ برق کی جانب اس قدر مصروف تھے کہ اپنے مہمان چور کا دھیان نہ رہا۔ چور نے اس موقع سے فائدہ اُٹھایا۔ دروازہ بند ہونے کی آواز سے ڈاکٹر اُس طرف متوجہ ہوا۔ فوراً ٹیلیفون ہاتھ سے پھینک کر چور کے پیچھے دوڑا۔ چور کو اتنی مہلت نہ ملی کہ زینہ کی طرف جاتا۔ جلدی سے سامنے کے کمرہ میں گھس کر اندر سے دروازہ بند کر لیا۔ کمرے کے دوسری طرف کھڑکی کھولی تو حسن اتفاق سے پانی کا نل ملا جسے پکڑ کر نہایت پھرتی سے نیچے پھسلنا شروع کیا۔ بحری فوج کی ملازمت کی وجہ سے ایسے کاموں میں بڑا مشاق تھا۔ لیکن چور نے بجائے زمین پر اُترنے کے اپنے آپ کو ڈاکٹر کی گود میں پایا۔ جرمن قوم کی دور اندیشی کے خیال سے وہ پہلے ہی سمجھ گیا تھا کہ چور کھڑکی کے راستہ بھاگنے کی کوشش کریگا اور اس لیے زینہ کے راستہ سے ڈاکٹر وہاں پہلے سے پہنچ گیا تھا۔

ڈاکٹر (بلا اظہار ناراضی) "اس کرسی پر تشریف رکھیے - تھوڑی دیر میں ایک صاحب آئیں گے اور آپ کو بحفاظت تمام گھر پہنچا دینگے۔"

چور (غصہ سے) "مجھے کسی کی خبر گیری کی ضرورت نہیں ہے۔"

ڈاکٹر "بے شک نہیں ہے - اب میں مکالمہ ختم کرلوں - نمبر پینتیس[۳۵] نمبر چھتیس[۳۶] .... کوئی ہے ..... میں ڈاکٹر بم برجز ہوں - .... پانچ منٹ پہلے میں ہی باتیں کر رہا تھا .... بہتر ہے - کیا نام بتایا انسپکٹر مارول .... بہت خوب .... آئیے۔"

چور - (کھڑا ہوکر) "دیکھیے پروفیسر صاحب! آپ نے مجھ سے کیا وعدہ فرمایا تھا؟ پھر پولیس سے باتیں کرنے کے کیا معنی؟ میں آپ کو معزز اور شریف سمجھتا تھا۔"

ڈاکٹر "تم میری شرافت کے متعلق اپنا خیال نہ بدلو - میں تمھیں چور کی حیثیت سے پولیس کے حوالہ نہیں کرتا - صرف یہ چاہتا ہوں کہ پولیس تمہیں بحفاظت گھر پہنچا دے - آدھ گھنٹہ بعد تم اپنے محل میں اپنا خزانہ شمار کرنے لگوگے! جب تک پولیس افسر آئے خاموش بیٹھے رہو۔"

اسوقت ایک موٹر کار آئی اور پروفیسر کے دروازہ پر رکی - ڈاکٹر نے کھڑکی کھول کر پوچھا "کیا انسپکٹر مارول آپہنچے؟"

"جی ہاں - میں حاضر ہوں۔"

ڈاکٹر - افسوس ہے میں اپنے معزز مہمان کو چھوڑ کر کواڑ کھولنے کیلیے خود نیچے نہیں آسکتا - مگر آپ ٹوٹے ہوے شیشہ میں ہاتھ ڈال کے دروازہ کھول لیں اور یہاں آجائیں۔"

تین منٹ کے بعد لندن کا مشہور سُراغ رساں انسپکٹر مارول کمرہ میں آپہنچا۔

ڈاکٹر "انسپکٹر صاحب! میں نے بہت بیوقت آپ کو تکلیف دی میرے یہاں اسوقت ایک عجیب غریب مہمان آیا ہے (چور کی طرف اشارہ کرکے) یہ صاحب اپنے آپ کو امیرزادہ کہتے ہیں اور پچاس ہزار پونڈ آمدنی بتلاتے ہیں۔"

پھر چپکے سے انسپکٹر مارول کے کان میں ڈاکٹر نے یہ بھی کہا کہ "یہ شخص پاگل ہے۔"

انسپکٹر مارول نے ڈاکٹر کی رائے سے اتفاق نہ کیا - چور کے پاس آکر کچھ دیر گھورتا رہا اور کہنے لگا کیا تم نقب زنوں کی کلب کے ممبر ہو۔"

چور "جی نہیں - میں اس عزت کا مستحق نہیں ہوں۔"

انسپکٹر "تو شاید آج رات کی کامیابی پر ممبر بنائے جاتے؟"

چور خاموش ہو رہا کچھ جواب نہ دیا۔

انسپکٹر (فخریہ لہجہ میں) "میرا خیال صحیح نکلا!" (ڈاکٹر سے خطاب کرکے) آپ کے معزز مہمان نقب زنوں کی کلب سے تعلق رکھتے ہیں - کیا آپ نے ان حضرات کا حال اخبار ٹکلر میں نہیں پڑھا؟"

ڈاکٹر "میں ٹکلر نہیں پڑھتا - میں تو صرف علمی اخبارات دیکھتا ہوں - اُن میں ان لوگون کا کچھ تذکرہ نہ تھا۔"

انسپکٹر - بے شک علمی رسالوں میں یہ باتیں کہاں - یہاں بہت سے امیرزادے محض تفنن طبع کی غرض سے چوری اور نقب زنی کرتے ہیں۔"

ڈاکٹر "کیا میرے مہمان کی طرح یہ سب لوگ پاگل ہیں۔"

انسپکٹر "جی نہیں - آپ کی اور میری طرح بالکل باحواس اور صحیح الدماغ - ہم عرصہ سے انکی تلاش میں حیران و سرگردان ہیں - شکر ہے کہ آج آپ کی عنایت کی بدولت یہ امیرزادہ ہمارے ہتھے چڑھا ہے - اب سب راز افشا ہو جائیگا - اگرچہ میں ان صاحب کو نہیں پہچانتا لیکن انکی شناخت بالکل آسان ہے - ڈاکٹر صاحب! میں اپنے تمام محکمہ کی جانب سے آپکا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے اس سنگین جرائم پیشہ حضرات کا غول توڑنے میں ہمیں قیمتی مدد دی ہے (چور سے مخاطب ہوکر) "مائی لارڈ! تشریف لے چلیے۔"

مگر چور اپنی جگہ سے نہ ہلا۔

چور "ڈاکٹر بم برجز! میں آپ کو جنٹلمین سمجھتا ہوں اور آپکے وعدہ پر بھروسہ کرکے اُمید کرتا ہوں کہ آپ مجھے ہرگز پولیس کے حوالہ نہ کریں گے۔

آپ نے صاف الفاظ میں مجھ سے وعدہ کیا ہے۔ اور میں نے دولابُہ راستی کش کے تجربہ میں امداد دیکر آپ کو آپکی عنایت کا مستحق بنا لیا ہے۔"

ڈاکٹر (انسپکٹر مارول سے) "یہ بالکل صحیح ہے۔ بے شک میں نے وعدہ کیا ہے۔ اور بحثیت ایک جرمن جنٹلمین کے ایفائے وعدہ مجھپر فرض ہے۔"

انسپکٹر۔ "آپ نے ایسے بیوقت مجھے اپنے مہمان کی خبر گیری کے لیے بُلایا تھا۔ اور میں اس خدمت کے لیے حاضر ہوں۔ اور آپ کے معزز مہمان کو یہاں سے لیے جاتا ہوں۔" (چور کے شانہ پر ہاتھ رکھکر) "مائی لارڈ! بس اب تامل نہ کیجیے اور میرے ساتھ چلیے۔ موٹر کار حاضر ہے۔"

چور (غصّہ سے) "مَیں تمھارے ساتھ کیوں چلنے لگا۔ خبردار مجھے ہاتھ نہ لگانا۔ کیا تمھارے پاس میری گرفتاری کا کوئی وارنٹ ہے۔ کیا مین نے کوئی جرم کیا ہے۔ کیا کسی کی کوئی چیز چُرائی ہے۔ پھر کیوں چلوں؟ ڈاکٹر صاحب! آپ مجھپر کوئی الزام تو نہیں لگاتے؟"

ڈاکٹر۔ "ہرگز نہیں! میں نے پولیس کو صرف اسلیے بُلایا تھا کہ مَین آپ کو پاگل سمجھا تھا۔ اپنے دولابُہ راستی کش پر شک کرنے کا یہ خوب معاوضہ ملا۔ جناب انسپکٹر صاحب! میں اس جنٹلمین سے وعدہ کر چکا ہوں۔ یہ اگرچہ میرے ہاں اپنی خوشی سے آئے تاہم انھیں مَیں اپنا معزز مہمان سمجھتا ہوں۔"

انسپکٹر (جوش کے ساتھ) "ڈاکٹر بم برجز! آپ اس معاملہ کی سنجیدگی کو نہیں سمجھتے۔ گزشتہ بارہ مہینہ سے ہم اس کلب کے ممبروں کی تلاش میں ہیں۔ آج نہایت عمدہ سُراغ ملا ہے۔ دو مرتبہ ہمنے ان کے ممبر کو پکڑتے پکڑتے چھوڑ دیا۔ ایک بار تو آپ ہی کے ایک ہم وطن کی اسی قسم کی ضد کی بدولت اب اسکا اعادہ نہیں ہو سکتا۔ میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ اس امیرزادے کو آپ ملزم قرار دیکر قانون و امن عامّہ کی امداد فرمائیے۔"

ڈاکٹر۔ "مسٹر انسپکٹر! مجھے افسوس ہے کہ مین آپ کو مرہون منّت نہیں کر سکتا۔ خصوصًا اس وجہ سے کہ آپ قاعدے قانون کے جانبدار ہیں اور یہ امیرزادہ نقض امن کا۔ میری وجہ سے آج جو تکلیف آپ کو برداشت کرنا پڑی اُسکا مجھے سخت افسوس ہے لیکن میں کسی شخص کے ساتھ، خواہ وُہ امیرزادہ نقب زن ہی کیوں نہو، وعدہ خلافی نہین کر سکتا۔ مجھے آج تک کسی ایسے شخص سے سابقہ نہیں پڑا۔ یہ جنس صرف انگلستان ہی میں پائی جاتی ہے۔ میں برلِش یونیورسٹی کے علما سے اسکا تذکرہ کرونگا اور غالبًا وہ اس عجیب و غریب جنس کے حالات کا مطالعہ کرنا سبق آموز خیال کرینگے۔ زمانۂ حال کی ترقی کا یہ عجیب نمونہ ہے۔ اور پروفیسر لمبرسو جو ماہر علم جرائم ہیں اسے معلوم کرکے بہت خوش ہونگے۔ مگر یہ جملہ معترضہ تھا۔ کیا میں آپ کی خدمت میں سگار اور جرمن ساز شراب پیش کر سکتا ہوں۔ ہوسلے اور ہوک ہیم کی بنی ہوئی نہایت خوش رنگ و خوش ذائقہ شرابیں میرے ساتھ ہیں۔"

انسپکٹر مارول مارے غصّہ کے کانپ رہا تھا اور بُرا بھلا کہنا چاہتا تھا مگر پی گیا۔ "ڈاکٹر صاحب آپ بڑے ..... بہت بہتر۔ مَیں صبح کو سر ولیم سے تمام واقعہ بیان کروں گا۔ اب میں آپ کو اور آپ کے مہمان کو خدا حافظ کہتا ہوں۔"

انسپکٹر نے ڈاکٹر کی تواضع کا شکریہ بھی ادا نہ کیا اور کمرے سے باہر چلا گیا۔

چور۔ "مجھے نہایت افسوس ہے کہ آپکو اس قدر تکلیف و زحمت اُٹھانا پڑی۔"

ڈاکٹر (غصّہ سے۔ بات کاٹ کر) "بیشک تمھیں افسوس کرنا چاہیے۔ مَیں تم جیسے انگریزی امیرزادوں کی حرکات بالکل نہیں سمجھ سکتا۔ لیکن انسپکٹر مارول کی بات خوب سمجھتا ہوں۔ تمنے اُسکا آخری فقرہ سُنا؟ مجھے کامل اُمید تھی کہ لندن کی پولیس میرا دولابُہ راستی کش اپنے محکمہ میں جاری کریگی اب سر ولیم خفا ہو جائینگے اور ایسا نہ کرینگے۔ اُمید ہے کہ تم اپنی رات کی کارگذاری پر مطمئن ہو۔ کیا تم اسے تفنّنِ طبع کہتے ہو؟"

ارل ڈینٹی نے نہایت گرمجوشی اور سادگی سے کہا "ڈاکٹر بام برجز! میں آپ کی فیاضی کا بیحد شکر گذار ہوں۔ سر دست میں اسکی معافی چاہتا

تد بیرالدولہ سید مظفر علی خاں "اسیر" لکھنوی

"Alhilal" Press, Calcutta.

ہوں کہ میں نے آپ کو خواب استراحت سے ناحق بیدار کیا۔ ناحق اس وجہ سے کہ مجھے خود کوئی نفع حاصل نہ ہوا۔ لیکن میں اطمینان دلاتا ہوں کہ آپ کو ایک اناڑی نقب زن سے ایفائے وعدہ کرنے سے جس نقصان عظیم کا خطرہ ہو وہ برداشت نہ کرنا پڑیگا۔ ممکن ہو کہ پولیس کسی قانونی بنا پر مجھے گرفتار کرنے کی فکر میں ہو اس لیے میں آپ سے رخصت چاہتا ہوں انسپکٹر ہارول کا شوفر میرے تعاقب کیلیے نیچے موجود ہو۔ میں بجد ممنون ہونگا اگر آپ مجھے چور دروازہ سے نکل جانے دینگے"

ایک گھنٹہ کے بعد انسپکٹر ہارول وارنٹ لیکر لوٹا۔ مگر چور روانہ ہو چکا تھا۔ ارل ڈنیٹی کو فیس داخلہ کے حاصل کرنے میں جو ناکامیابی ہوئی اسکی وجہ سے وہ کلب میں داخل نہ ہو سکے۔

ڈاکٹر بام برجز وطن مالوف کو خوش خرم و کامیاب واپس گیا۔ باوجود انسپکٹر ہارول کی شکایت کے اسکاٹ لینڈ یارڈ اور رائل سوسائٹی نے ڈاکٹر موصوف کی سرپرستی اختیار کرلی اور اُسکے عجیب و غریب آلہ کا نفاذ منظور کرلیا۔ اسکے علاوہ اونچی سوسائٹی کے ایسے طبقوں سے ڈاکٹر کو دعوتیں دی گئیں جن کے ہاں پہنچنے کی اُسے کبھی امید نہ تھی۔ اِن تمام کامیابیوں کو وہ امیرزاد نقب زن کے اثر پر محمول کرتا تھا۔ جب تک لندن میں رہا ہر جگہ اور ہر وقت دوبارہ ملاقات کا آرزومند رہا۔ مگر اُسکی صورت پھر کبھی نظر نہ آئی۔

ڈاکٹر بام برجز نے برلش یونیورسٹی میں واپس جاکر اپنے تجربات اور انگلستان کے اُمراء کے اس عجیب و غریب کلب پر نہایت دلچسپ لیکچر دیا۔ جس کا جرمنی میں مدتوں چرچا رہا اور ڈاکٹر اُسے ہمیشہ یہ الفاظ کہہ کر یاد کیا کرتا ہے :۔

"اُسکی شعاع کیسی جیت کبری تھی"

(مترجمہ) ظفر عمر

تدبیر الدولہ سیّد مظفر علیخاں آسیر لکھنوی

مشہور قصبہ امیٹھی میں جو لکھنؤ سے چند کوس کے فاصلہ پر ہے آسیر کی ولادت ہوئی۔ لیکن بہت ہی صغرسنی میں وہ لکھنؤ چلے آئے اس لیے کہ اُن کے آبا و اجداد کا مسکن و ماویٰ لکھنؤ ہی تھا۔ آسیر کے والد ماجد اور دادا دربار شاہی سے تعلق رکھتے تھے۔ آسیر کے والد میر مدد علی صاحب علامۃ العصر تھے اور دادا بھی، اور وہی فضائل خاندانی آسیر میں موجود تھے آسیر عنفوانِ شباب ہی سے شاہی ملازمت میں داخل ہوے۔ اُنکے لیے شاہی ملازمت کوئی اہم کام نہ تھا اگر ان میں علمی قابلیت اعلیٰ درجہ کی نہ ہوتی تو بھی یہ عمدہ نوکری پا سکتے تھے لیکن چونکہ یہ خود عربی فارسی میں خاص امتیاز و تبحر رکھتے تھے لہذا نہایت اعزاز و وقار سے انکا تعلق دربار سے ہوا۔

آسیر نے اپنے والد میر مدد علی صاحب المتخلص بہ مائل سے اتنی قابلیت حاصل کی کہ خود دوسرے طلباء کو پڑھانے لگے اور انکی استادانہ قابلیت کو لوگ ماننے لگے۔ شاعری میں شاعرانہ شان پیدا ہوئی۔ آسیر نے اپنے والد مغفور کے سوا اپنے چچا میر سید علی صاحب سے بھی متواتر چار سال تک تعلیم حاصل کی۔ میر سیّد علیصاحب صرف و نحو، حکمت منطق، حدیث وغیرہ میں خاص قابلیت رکھتے تھے۔ آسیر نے مولنا مرزا کاظم علی صاحب سے بھی استفادۂ علم کیا، حدیقہ حکیم ثنائی انھیں سے پڑھا۔ مرزا صاحب بڑے متقی عالم تھے۔

جب واجد علیشاہ تخت نشین ہوے تو امین الدولہ وزیر ہوے۔ چونکہ وزیر موصوف اسیر کے خاص عنایت فرماتھے لہذا انکو میر منشی کا عہدہ دیا۔

اتفاقاً ایک روز ایک شاہی خوص آیا اور اسیر کو دیوان خاص میں بلا لیگیا یہاں حضرت واجد علیشاہ رونق بخش سریر تھے۔ اسیر کو نہایت امتیازی حالت سے پاس بٹھایا اور ایک کتاب جو گل انتخاب تھی نظم کے لیے دی جعفر واجد علیشاہ اس نظم کو سنکر بہت محظوظ ہوے اور عزت افزائی کی۔ تدبیر الدولہ مدبر الملک بہادر جنگ کا خطاب عطا ہوا اور اصلاح سخن کا اعزاز بھی مرحمت ہوا حقیقت یہ ہی کہ بادشاہ اسیر پر خاص خسروانہ نوازش فرماتے تھے۔ اسیر کو بھی بادشاہ کے مزاج میں دخل تھا اور مفید مشورہ دیا کرتے تھے۔ اُن کا مزاج صرف مصاحبانہ نتھا اسلیے کہ اکثر مصاحب صرف زرکشی اور ہاں میں ہاں ملانے والے ہوا کرتے ہیں مگر اسیر اپنے علم و فضل اور متقی و متشرع ہونے کے سبب سے حکیمانہ اور مدبرانہ اوصاف رکھتے تھے۔ چنانچہ جب امین الدولہ کی وزارت کو واجد علیشاہ نے تبدیل کیا اور اُنکی جگہ علی نقی خاں وزیر مقرر ہوے تو یہ بات اسیر کو ناگوار ہوئی اور اُنھوں نے کنایتاً اور کسی وقت صریحاً اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اسیر کی ہوشیاری اور مدبری سے علی نقی خاں بھی کھٹکتے تھے اور انکو سابق وزیر کا دوست سمجھکر علی نقی خاں نے اِن سے اچھا برتاؤ نہیں کیا۔ حتیٰ کہ اسیر کچھ روز علی نقی خاں کی عنایت سے قید بھی رہے۔ الغرض علی نقی خاں کی وزارت کا جو انجام ہوا ظاہر ہی جب واجد علیشاہ تخت اودھ سے معزول ہو کر کلکتہ روانہ ہونے لگے تو اسیر ان کے ساتھ کلکتہ اس وجہ سے نہیں گئے کہ بادشاہ نے انکی فہمایش پر عمل نہیں کیا۔ چنانچہ واجد علی شاہ نے اپنی ایک تحریر میں چند فقرات اسیر کے متعلق لکھے ہین جن سے بادشاہ کی آزردگی خاطر اور نیز اُس دلی تعلق کا جو انکو اسیر سے تھا پتہ چلتا ہی:-

تدبیر الدولہ منشی مظفر علیخاں صاحب بہادر جنگ اسیر نوجوانی میں راقم (واجد علی شاہ) کا ہم پیالہ و ہم نوالہ رہا۔ اسکے باپ دادا میرے دربار کے قدیم نمکخوار رہے۔ اسیر میرا مصاحب اور دارو غۂ کل تھا۔ لیکن جب میں لکھنؤ سے کلکتہ چلا تو یہ گھر میں جا چھپا اور مجھے چھوڑ کر نواب رامپور کو اپنا بادشاہ بنالیا....

ناظرین اس تحریر کے رنگ سے بادشاہ کے اندرونی جذبات کا اندازہ فرما سکتے ہیں۔

جس زمانہ مین نواب محمد سعید خاں والیِ رامپور رونق فزاے لکھنؤ ہوے تھے آپ نے اسیر کو اپنے صاحبزادوں کی تعلیم کے واسطے منتخب فرمایا پھر نواب یوسف علی خاں خلد آشیاں کے عہد میں گھر بیٹھے وظیفہ خوار رہے۔ نواب کلب علی خاں بہادر نے جب منتخب روزگار شعرا کو یکجا کیا تو حضرت اسیر کو بھی بیش قرار تنخواہ پر طلب کیا۔

اسیر محض غزل گو شاعر نہ تھے بلکہ ایک جید مصنف اور اصناف سخن پر قادر تھے۔ اُردو کے چھ دیوان علاوہ دیگر مصنفات فارسی و عربی کے ہیں۔ عروض دانی میں اسیر کو خاص دست گاہ حاصل تھی۔ اُردو فارسی کے علاوہ عربی میں بھی شاعری کی قابلیت موجود تھی۔ ان کا فارسی کلام بھی بہت صاف اور بامزہ ہی۔ گلشنِ تعشق (دیوان فارسی) اور ذو لسانین (قصائد مدحیۂ نوابان رامپور) قابل دید و داد ہیں مصحفی کے شاگردوں میں اسیر و آتش خاص شہرت رکھتے ہیں۔

اسیر کی پرگوئی یہاں تک مشہور ہی کہ انھوں نے بہتوں کو صاحب دیوان بنا دیا۔ اصلاح دینے میں جو مہارت انکو تھی وہ بہت کم اساتذہ میں سُنی گئی ہی۔ لیکن اس بات کا ضرور افسوس ہی کہ اسیر کے دیوان مطبوعہ بھی کمیاب ہیں۔ اسکا بڑا سبب یہ معلوم ہوتا ہی کہ متعدد دیوانوں کا چھاپنا اہل مطابع اہم کام جانتے ہیں۔ لیکن تاہم یہ شکایت اسیر کے بعض شاگردوں کو دُور کرنا تھی۔ انکا فرض تھا کہ انکے دیوان مطبوعہ فراہم کریں اور مناسب ہو تو اُنکا منتخب کلام جو ایک دو بڑے سے بڑے دیوانوں کے برابر ہوگا چھپوادیں تاکہ شایقین کلام اسیر کا شوق پورا ہو۔ مین نے بعض شایقین کو اسیر کے دیوانوں کا متلاشی پایا۔

لیکن بازار میں نہ ملنے سے انکو مایوسی ہوئی۔ جن لوگوں نے اسیر کے کلام کو توجہ اور غور سے دیکھا ہے وہ اس بات کو جانتے ہیں کہ اسیر کے یہاں ہر قسم اور ہر رنگ کا کلام موجود ہے۔

اسیر کے شاگرد بہت ہیں اور ان کے بعض تلامذہ خاص اُستادانہ قابلیت رکھتے ہیں۔ امیر مینائی، ناہر لکھنوی، شوق قدوائی، ظہور لکھنوی، یوسف لکھنوی، اہند، ریاض، سرشار، ابر، صفدر، وغیرہ اُستادانہ قابلیت کے لوگ ہیں۔ اسیر کی طبیعت بہت مرنجان مرنج تھی۔ انسے کبھی کسی سے مباحثہ اور معارضہ نہیں ہوا۔ دوسرے اُستادان فن غالب وغیرہ بھی اسیر سے معاصرانہ برتاؤ کرتے تھے۔

بعض خاص مشاعروں میں جب اسیر اپنی غزل پڑھتے تھے تو ان کے دو چار شعر ایسی اُستادانہ قابلیت کے ہوتے تھے کہ اہل مشاعرہ کو ان کے کمال کا معترف ہونا پڑتا تھا۔ بعض مشاعروں میں لوگوں نے اسیر کو فرط جوش و مسرت میں اُٹھا اُٹھا لیا ہے۔

اسیر کی وضع و تہذیب قدیم طرز کے بزرگوں کی تھی۔ مخملی گھیتلا، لمبا کرتہ، گول ٹوپی۔ وہ زیادہ تر فنس ہی پر سوار ہوتے تھے۔

اسیر ۱۲۲۹ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۲۹۹ھ میں انتقال کیا۔ انکی قبر انکے مکان کے قریب خاندانی مقبرہ میں ہے۔

اسیر کی شاعری

جو کم مایہ شاعر سطحی شاعری میں کچھ معمولی شوخیاں پیدا کر لینے کا مذاق و مہارت رکھتے ہیں وہ شاعری کی منتہاے فصاحت و بلاغت اور معنی آفرینی کو ناپسند کرتے ہیں اور نہ یہ کڑی منزل ان سے طے ہو سکتی ہے۔ اسلیے کہ یہ منزل وہی طے کر سکتا ہے جس نے تحصیل علوم کے ساتھ کامل شعرائے فارسی و عربی کے کلام کی سیر کی ہے۔ فاضلانہ قابلیت کے بعد شاعر کی طبیعت ضرور ان مضامین کی جستجو کرتی ہے جو عامیانہ مذاق سے الگ ہوا کرتے ہیں۔ اسیر کے یہاں جہاں ہزاروں صاف و سادہ اشعار ہیں وہاں بکثرت ایسے اشعار بھی ہیں جن سے ان کی محققانہ فکر و تلاش کا پتہ چلتا ہے۔ انھوں نے اُردو میں فارسی شعرا کی نازک خیالیاں لطافت معنوی کے ساتھ دکھائی ہیں۔ درحقیقت اسیر کی شاعری ان کو ملک الشعرا ثابت کرتی ہے۔ انھوں نے ہر صنف شعر پر زور طبیعت دکھایا ہے۔ مشہور اساتذہ کے مشہور و مقبول اشعار کا جواب اس خوبی سے لکھا ہے کہ انکی قادر الکلامی میں شک نہیں رہتا۔ مثلاً شعرا نے اس طرح میں کہ ع "خدا سر دے تو سودا دے تری زلف پریشاں کا" کیسی کیسی نازک خیالیوں سے کام لیا ہے۔ گریبان کے قافیہ کو کن کن خوبیوں سے نظم کیا ہے نقادان سخن کو اساتذہ کے کچھ نہ کچھ شعر اس طرح میں ضرور یاد ہونگے۔ اسیر نے بھی اس طرح میں گریبان کا قافیہ کہا ہے اور جس خوبی سے کہا ہے اسکو ناظرین ملاحظہ فرما کر داد دے سکتے ہیں۔ جنون اور چاک گریبانی کے ازلی تعلق کو کس خوبی سے ثابت کیا ہے۔ اسیر کے اس مطلع کو دوسرے اساتذہ سے معناً ملائیے۔ فرماتے ہیں ؎

ازل سے سلسلہ ہے ہم جنون فتنہ ساماں کا — شگاف خامۂ کُن چاک ہے میرے گریباں کا

خامہ کن کے شگاف کو کسی اُردو شاعر نے اپنے چاک گریباں سے شاید ہی تشبیہ دی ہو۔ چاک گل، چاک سحر وغیرہ سے البتہ چاک گریباں کو نسبت دی ہے جدت اور خیال آفرینی ہی سے کمال شاعری کا اندازہ ہوتا ہے۔ اسیر کا یہ شعر بھی کس پایہ کا ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

نبض بیمار محبت کی مسیحا دیکھی — آج کیا آپ نے جاتی ہوئی دنیا دیکھی

زبان اور لطافت خیال کو دیکھیے کہ کتنا گہرا اثر دل پر پڑتا ہے۔ علی ہذا اسیر کا یہ شعر لاجواب ہے۔ اس مضمون کو حافظ اور تلسی داس بھی اس خوبی سے سے نظم نہ کرتے ؎

خدا جانے یہ دنیا جلوہ گاہ ناز ہے کس کی — ہزاروں اُٹھ گئے رونق وہی باقی ہے مجلس کی

ذیل کے شعر کی آمد و بیساختگی اور مصائب دنیاوی کیحالت کو ملاحظہ فرمائیے ؎

میرے مردہ کو ہے کیوں آج اذیت تہ خاک — آگئی قبر میں کیا عالم امکاں کی ہوا

نیچرل حالت، واقعہ کی صداقت، اور ناصحانہ رنگ کو ذیل کے شعر میں ملاحظہ فرمائیے۔ مصرعہ اولیٰ میں عام کلیہ بیان کر دیا اور دوسرے مصرعہ میں ایک خاص مثال دے کر اپنے قول کو اس طرح ثابت کیا ہے جسکی تکذیب ہو ہی نہیں سکتی

دشمنی پر وہ الفت میں مزا دیتی ہے
خوں پیے طفل ہو مادر کا کلیجا ٹھنڈا

تصویر انقلاب

پہچانتے نہیں ہیں مجھے میرے آشنا کیا انقلاب دہر کی صورت بدل گئی

نازک خیالی

ترک مے کشی کی تنبیہ کو ذیل کے شعر میں ملاحظہ کیجیے۔ صائب کی روح کو پھڑکا نیوالا شعر ہے ؎

ڈرتا ہوں کہیں بادہ کشی ترک نہ ہو جائے
نقشہ ہے لب جام ہلال رمضاں کا

عبرت اور نصیحت

ہے بے ثبات گلشن گریاں ہے چشم شبنم اے گل سمجھ کے ہنسنا موقع نہیں ہنسی کا

ضعف کی حد

ضعف سے پیوند میں ہر جا زمیں کا ہو گیا
مثل نقش پا جہاں بیٹھا وہیں کا ہو گیا

نئی موت

بوسہ ملا جو اُس لب شیریں کا مر گئے دی جان ہمنے چشمۂ آب حیات پر

بہار کی تصویر کس نازک خیالی سے کھینچی۔ بہار کا جھولا کتنا نیا بنایا ہے ؎

لچک ہے شاخوں میں جنبش ہے اسے پھولوں میں بہار جھول رہی ہے خوشی کے جھولوں میں

انقلاب کی نئی مثال

جب تڑپتا ہے دل میں ڈرتا ہوں چرخ پر جا پڑے زمیں نہ کہیں

لطف زبان اور بول چال

بغیر دو دل جو نہیں دیتے ہو بوسہ کیا مال پر لوٹ بھی ہو دم لگاتے بھی نہیں

رندانہ زندگی

شیشہ ہے بغل میں جام شراب لب پہ ساقی یہی مزا ہے دو دن کی زندگی کا

عالم نزع

چھوٹتے ہیں اقربا جاتے ہیں ہم سوئے عدم بیکسی کا وقت ہے چھایا ہے عالم یاس کا

تلوّن

کس سے کہوں تلون ابنائے روزگار دشمن وہ لاکھ بار ہوئے لاکھ بار دوست

نیا نشیمن

نشیمن طائران روح کا ہے تیغ جاناں پر ہزاروں بلبلیں بیٹھی ہیں دیوار گلستاں پر

شوخی اور ادا بندی

دل مجروح کو کیا دیکھنے آئے ہو بے پردہ چھپاؤ چہرہ دیکھو چاندنی پڑتی ہے بسمل پر

سفر عدم کی دقتیں

زنجیر تعلق مرے پاؤں سے تو نکلے ہے فاصلہ دو گام کا ہستی سے عدم تک

شکوۂ حجاب

نہ اُٹھا اُس رخ روشن سے پردہ ہو چکا محشر وہی شوق تماشا رہ گیا اہل تماشا کو

اخلاق

وہ کون ہیں جو دوست سے کرتے ہیں دشمنی مجھکو تو دشمنوں سے محبت پسند ہے

صعوبات سفر

تھک چکے ہیں پاؤں اُسکا آستانہ دور ہے دن ہے کم منزل کڑی ہے اور چلنا دور ہے

غم سے گریز

کیا خوب ہو موت آئے جو سب سے پہلے نازک ہے یہ دل داغ عزیزاں نہ اُٹھیگا

ترغیب محنت

بے مشقت نہیں ہوتی کوئی راحت حاصل غرق دریا ہوا غواص تو گوہر پایا

فقدان سرور

میخانۂ جہاں میں نہ تھا بادۂ نشاط بیجا ہے توبہ تیرے گنہگار توڑ کر

ذیل کے شعر میں صداقت مضمون ملاحظہ ہو ؂

زیست کہتے ہیں جسے ہی اضطراب موت کہتے ہیں جسے آرام ہے

شکوۂ بیرحمی

دل کو پکڑے ہوئے ہم سامنے آئے سو بار تم نے اتنا نہ کہا حال تمھارا کیا ہی

ذیل کا شعر بالکل میر کے رنگ کا ہی ؂

جو عاقل ہی اُٹھا دل سے تعلق دہرِ فانی کا دم آیا یا نہ آیا کیا بھروسا زندگانی کا

رندانہ شوخی

مستی میں اُمنگ آگئی جب ست کوثر کے زاہد کا عمامہ سرِ بازار اُتارا

معشوقانہ عتاب

مارا مرے سر صبحِ شبِ وصل بگڑ کر مرجھائے ہوئے پھولوں کا جب ہار اُتارا

عاشقانہ

اُٹھنا اُنھیں منظور ہے پہلو سے ہمارے حیلہ ہے کہ دیکھی نہیں جاتی تپشِ دل

دھوم محشر میں ہوئی جب تری آمرزش کی بے گنہ مل گئے چھپ چھپ کے گنہگاروں میں

موحدانہ رنگ

نظر آتا ہی ترا چہرۂ زیبا کس کو حُسن بے پردہ ہی یارائے تماشا کس کو

شوخی

ساغر ہمارے ساتھ لبِ آب جو پیو تنہا جو مے پیو تو ہمارا لہو پیو

کوے قاتل کو جو چلتا ہوں تو سایہ ڈر کر پوچھتا ہی لیے جاتے ہو کہاں تم مجھکو

جذبات عشق ومحبت

کچھ تو الفت کی ترے کوچہ سے بو آتی ہی گرد اُٹھکر مرے دامن سے لپٹ جاتی ہی

ذیل کا شعر جس پایہ کا ہی نقادانِ سخن اسکی داد دے سکتے ہیں ؂

آگیا ضعف ہی کچھ کام کہ تربت میں اسیر ہو گئی ختم قیامت مرے اُٹھتے اُٹھتے

متفرق ومنتخب اشعار

صورت تری دکھا کے کہونگا یہ روزِ حشر آنکھوں کا کچھ گناہ نہ دل کا قصور تھا

کیوں ملائیں وہ آنکھ اب ہم سے لے چکے دل نکل گیا مطلب

تہی دستوں کو کیا خوفِ بلائے آسمانی ہی کفِ افسوس مل کر رہ گئی برق اپنے خرمن پر

جب آئی گردش میں چشمِ ساقی اُڑا دیے ہوش میکشوں کے
نکل پڑے میکدہ سے باہر ہزاروں میکش بہک بہک کر

جو میں نے آنکھوں سے پوچھے آنسو اُبل پڑے اور اشک خونین
لہو کی دو بوتلیں بھری تھیں لگا جو ہاتھ آ رہیں ڈھلک کر

میں نے کہا بیکس ہوں میں بولے ہمیں دیتے ہو دم حسرت ہماری ہی ابھی باقی تمھارے دل کے پاس

کڑی ہی اس قدر منزل عدم کی کہ مر مر کر پہنچتے ہیں وہاں تک

کہا جو میں نے کہ رُخ سے ذرا نقاب اُٹھاؤ تو ہنس کے بولے کہ منظور قتلِ عام نہیں

اُنھیں کا مال تھا اچھا کیا دل لیلیا میرا کوئی چھینے نہیں لیتا ہی اُنسے کیوں کرتے ہیں

ملا کر خاک میں بھی ہائے شرم اُنکی نہیں جاتی نگہ نیچی کیے وہ سامنے مدفن کے بیٹھے ہیں

دربار جانتے ہیں مزاروں کو بے خبر مُردوں کو جا کے کرتے ہیں زندے سلام روز

دل میں اپنے ہی تنگہ اس بتِ کافر کی اسیر نالۂ دل ہی کہ ناقوس صنمخانۂ عشق

ضد سے جتنا ہی یہاں کافر و دیندار میں فرق زاہد اتنا تو نہیں سبحہ و زنار میں فرق

کعبہ ہی ایک بتکدہ زاہد گلی گلی بُت لاکھ رنگ میں ہیں خدا ایک رنگ میں

معجزِ لب سے جِلایا تم نے مردہ غیر کا کیا ہماری لاش قابل ایک ٹھوکر کے نہیں

بسر کی ابتدا و انتہائے عمر ماتم میں محرّم میں ہوئے پیدا قضا آئی محرّم میں

نا قبولِ خلق تھا ایسا بنا کافر جو میں جتنے ہندو تھے مری ضد سے مسلماں ہو گئے

عبرت کا ہی مقام زمانہ کا انقلاب تکیہ فقیر کا ہے لحد بادشاہ کی

خاصیتِ سیماب ہی عاشق میں تمھارے کشتہ نہ ہو جب تک اسے آرام کہاں ہی

دل جلا کر رُخِ محبوب کا جلوا دیکھا ہمنے گھر پھونک کے کیا خوب تماشا دیکھا

غریب خانہ میں آئے تو سرفراز کیا خوشا نصیب قدم آپ کے مرے سر پر

جب تک ہی گوشِ ہوش فسانہ سُنیں ترا جبتک لبِ ہے زبان تری گفتگو کریں

دیئے خدا نے عوض ایک ایک کی دس دس کریم بانٹ کے زر صاحب خزانہ ہوا

بت کدہ کی میں سیر کر آیا واں خدا ہی خدا نظر آیا

ہوں وہ بسمل کہ ہو نہیں عاشق جو دل بھر آیا جو زخم بھر آیا

اب کہاں وہ لکھنؤ وہ ساکنانِ لکھنؤ　　رہ گئی باقی زباں پر داستانِ لکھنؤ

پہلو میں وہ عیسیٰ ہے اجل سر پہ کھڑی ہے
کیا جان دمِ نزع کشاکش میں پڑی ہے

اس لیے دامن سے میرے اشک پونچھے یار نے　　تا تمنا میں اسی لذت کے یہ رویا کرے

باقی ابھی ہے ترکِ تمنّا کی آرزو　　کیونکر کہوں کہ کوئی تمنا نہیں مجھے

ا - ز - لکھنوی

تنقید کتب

راج ترنگنی اس نام سے ٹھاکر اچھر چند صاحب شاہپوریہ نے زبان سنسکرت کی ایک "معرکۃ الآرا" کتاب کا ترجمہ دو ضخیم جلدوں میں کیا ہے۔ اس میں بقول ٹھاکر صاحب موصوف کے "قدیم فرمانروایانِ کشمیر کے مفصل حالات، معاصرا تعلقات اور اُن کے عروج و زوال کا نقشہ نہایت موثر الفاظ میں کھینچا گیا ہے۔" باوجودیکہ آج کل کے تخیل و مذاق کے خلاف اس میں بہت سی باتیں پائی جاتی ہیں تاہم اصل مطالب کے دلچسپ و مفید ہونے میں کلام نہیں۔ اس تاریخ کی ترتیب و تدوین "ہندوؤں کے چوٹی کے مورخ" کلھن پنڈت سے منسوب کیجاتی ہے اسی کے ساتھ یہ بھی ملحوظ خاطر رکھنا چاہیے کہ "مصنف نے اسے زیادہ تر ایک نظم" کی حیثیت میں لکھا تھا۔ لیکن چونکہ اس میں قدیم فرمانروایانِ کشمیر کے حالات وواقعات بالاستیعاب قلمبند کیے گئے ہیں اس اعتبار سے اس میں تاریخ کی شان ضرور پیدا ہو گئی ہے۔ ٹھاکر اچھر چند کی یہ اولوالعزمی قابل داد ہے کہ آپ نے بصرف زرِ کثیر، محنت شاقہ برداشت کر کے اس کتاب کا مکمل ترجمہ اپنے اہل وطن کے فائدہ کی غرض سے کر دیا ہے۔ یوں بھی کوئی معقول وجہ نہ تھی کہ جس کتاب کا ترجمہ بعض یورپین زبانوں میں ہو گیا ہو اُس سے اُردو خواں طبقہ محروم رکھا جاتا۔

خواہ راج ترنگنی کو بعض وجوہ سے معتبر و مستند تاریخ کی حیثیت دینے میں احتیاط پسند طبائع متامل ہوں، لیکن یہ ضرور ہے کہ اسکی شہرت بحیثیت مجموعی عرصہ سے قائم ہے اور اکثر کتب میں اسکا حوالہ دیا گیا ہے۔ فی الحقیقت راج ترنگنی بجائے ایک تاریخ کے رزمیہ نظم کہلانے کی زیادہ مستحق ہے اور یہ امر بالکل قرینِ قیاس ہے کہ کلھن پنڈت نے اپنی تصنیف میں تاریخی رنگ کی عوض "شاعری" کا رنگ چوکھا رکھنا پسند کیا ہو۔ اور غالباً یہی سبب ہے کہ اس میں بہت سی باتیں ایسی پائی جاتی ہیں جنھیں ایک "معرکۃ الآرا" تاریخی کتاب میں دیکھکر بیساختہ ہنسی آتی ہے۔ جا بجا ایسے واقعات و کوائف درج کیے گئے ہیں جو مافوق العادت ہونے کی وجہ سے بالکل غیر ضروری کہے جاسکتے ہیں اور جنھیں کوئی بالغ نظر تاریخی پہلو سے وزن دار خیال نہیں کریگا۔ بلکہ اسکے برخلاف، صاحب کتاب کی ضعیف الاعتقادی و سادہ لوحی کا اسکو اقرار کرنا پڑیگا۔ ذاتی طور پر ہم اُن تمام روایات کی عزت، دل سے، کرنے کے لیے تیار ہیں جن کا تذکرہ مذہبی پیرایہ میں کیا گیا ہے لیکن تنقید نگاری کا فرض یہ کہنے پر مجبور کرتا ہے کہ تاریخ میں ان کا جوڑ نہایت بھونڈا نظر آتا ہے۔ اور ان باتوں کی وقعت اس زمانہ میں کلیتہً نہیں ہو سکتی جبکہ اوہام باطلہ اور مفرط حسنِ اعتقادی کے مضرات کا قلع و قمع تعلیم کی بدولت ہوتا جا رہا ہے مثلاً راجہ پرورسین ثانی کے حال میں شہر پرورپور کے آباد کرنے کا واقعہ سرتاپا خلاف فطرت ہے۔ اس میں دکھایا گیا ہے کہ راجہ شہر کے لیے موقع تلاش کرتا ہوا ایک ندی کے کنارے پہنچتا ہے۔ جس کے دوسری طرف اُسے ایک دیو نظر آتا ہے جو راجہ کو دیکھکر قہقہہ لگاتا ہے اور کہتا ہے:-

سوائے بکرماجیت، شودرک، اور آپ کے، جو دلیری میں بہت بڑھے ہوے ہیں، کامل استقلال کی مثال اور کہیں مشکل سے نظر آتی ہے۔ ہے پرتھوی راج! آپ کی خواہش پوری کیجائے گی۔ آپ اس پشتہ پر سے گذر کے میرے پاس آئیے۔

یہ کہکر، دیو اپنا پیر پھیلاتا ہی جس سے سطح آب پر ایک پشتہ تیار ہو جاتا ہی۔ راجہ اپنے خنجر سے اس میں زینہ بناتا ہی اور اس کے ذریعہ سے ندی پار ہو جاتا ہی۔ ندی کے دوسرے کنارے دیو سے گفتگو ہوتی ہی اور وہ یہ کہکر غائب ہو جاتا ہی کہ

"اپنا شہر اس جگہ تیار کروانا جہاں کل تھیں میرا لگایا ہوا نشان نظر آئے گا .... الخ"۔ (جلد اول صفحہ ۲۴۵)

اکثر واقعات اسی قبیل کے ہیں اور بلا شبہہ، تاریخی حیثیت سے انکی وقعت رتی برابر نہیں ہو سکتی۔ یہ ہو سکتا تھا کہ انکو مؤلف راج ترنگنی کی شاعرانہ خیال بندی یا جوش عقیدت فرض کرکے انپر نکتہ چینی نہ ہوتی لیکن غضب تو یہی ہی کہ مترجم صاحب مُصر ہیں کہ ان دور از کار باتوں کو بدیہیات کی طرح تسلیم کرو۔ آپ فرماتے ہیں کہ

جو لوگ اپنی مذہبی کتابوں کے معجزات اور بادی النظر میں خلافِ قیاس واقعات کی درستی کے قائل ہوتے ہیں اُنھیں کسی تاریخی کتاب کی تحریر میں محض اس بنا پر دست اندازی کا کوئی حق حاصل نہیں ہو سکتا کہ اسکے خاص خاص واقعات اُنکی سمجھ میں نہیں آتے یا اس قدر دقیق ہیں کہ ان تک انکی عقل کام نہیں دے سکتی۔

اس مقام پر مترجم نے نرالی منطق سے کام لیا ہی جسکی کُنہ تک پہنچنا عقل سلیم کو محال ہی۔ اگر راج ترنگنی کو رامائن و مہابھارت یا ویدوں کا درجہ آپ نے دیا ہوتا تو بحیثیت مذہبی کتاب ہونے کے اُسپر کسی کو "دست اندازی" کا حق حاصل نہ تھا۔ کیوں کہ عالمِ ارواح کی باتیں دنیا والوں کے لیے واقعی سربستہ راز ہوتی ہیں اور اُنکی تہ تک معمولی نگاہیں نہیں پہنچ سکتیں۔ لیکن مشکل تو یہی ہی کہ آپ اسکو "تاریخ" کی شکل میں پیش کر رہے ہیں جس میں اس قسم کے بعید از خیال واقعات کے اندراج نے اصل کتاب کی عظمت کو بہت گھٹا دیا ہی۔ یہ بھی خوب کہی کہ مافوق الفطرت اور خلافِ قدرت واقعات کی عدم تفہیم کوتاہی عقل پر مبنی ہی۔ گویا اس لحاظ سے، داستان امیر حمزہ، بوستان خیال، اور گلزار نسیم وغیرہ میں جو حیرت انگیز اور خلافِ عقل طلسمات دکھائے گئے ہیں وہ سب کے سب تاریخی ہیں اور اُنکی صداقت مسلّم۔ کیا اچھا کر اچھے جید صاحبان کتابوں کے مصنفوں کو، مورخین عالم کے دربار میں، گبن اور ڈیوڈ ہیوم، یا ابن خلدون اور ابو الفداء کے برابر برابر کرسی دلانے کی کوئی کامیاب کوشش کر سکتے ہیں؟

غور کرنے کی جگہ ہی کہ کلہن پنڈت، جوتی کا "مورخ" بنا کر علمی دنیا میں لایا جاتا ہی اور اُسکی تصنیف کو "معرکۃ الآرا" تاریخ کا خطاب دیا جاتا ہی اور فرمایش یہ کیجاتی ہی کہ اسکو پڑھو لیکن جو کچھ تمھاری سمجھ میں نہ آئے اُسپر حرف گیری کی جرأت نہ کرو بلکہ اسے اپنے فہم کا قصور سمجھکر خاموش بیٹھ رہو۔ گویا راج ترنگنی بھی، قرآن، انجیل یا وید کی طرح کوئی الہامی کتاب ہی۔ کیونکہ اس کے برخلاف تاریخ ہی ایک ایسا فلسفہ ہی جسکے اصول اور جس کی ترتیب تمام و کمال اسباب و علل اور مشاہدے و تجربے پر ہوتی ہی اور اسمیں واقعات اس طرح قلمبند کیے جاتے ہیں کہ صداقت و صحت کا کوئی پہلو کمزور نہ ہونے پائے۔ یہ خوبی راج ترنگنی میں بہت بڑی حد تک مفقود ہی اور غالباً یہ نقص ہندوؤں کی تمام قدیم تاریخوں میں عام طور پر پایا جاتا ہی جسکی بنا پر غیر اقوام کو ہندوؤں پر یہ الزام لگانے کا موقع ملتا ہی کہ انھیں من حیث القوم تاریخ نویسی کا شغف شروع سے نہ تھا۔ بادی النظر میں معلوم بھی یہی ہوتا ہی کہ انھوں نے باوجود تمدن و معاشرت کے مختلف شعبوں میں ترقی کرنے کے، فن تاریخ سے کوئی مستقل دلچسپی نہیں پیدا کی۔ اسی وجہ سے آج ہندوستان قدیم کے مستند حالات کا دستیاب ہونا اسدرجہ دشوار ہو گیا ہی کہ مسٹر رومیش چندر دت آں جہانی کو حسرت آمیز لہجہ میں کہنا پڑا کہ "ہندوستان کے قدیم زمانہ کی مستقل تاریخ لکھے جانے کی اُمید نہیں"

مترجم صاحب راج ترنگنی اس بات کے ثبوت میں کہ ہندوؤں کو تاریخ نگاری کا غیر معمولی ملکہ تھا لکھتے ہیں :-

یہ امر مسلّم ہی کہ قدیم ہندو صنعت و حرفت و دست کاری، معماری سنگ تراشی، شاعری، موسیقی، ڈراما وغیرہ میں معراج کمال کو پہنچ چکے تھے۔ ریاضی و حساب میں انھیں یدطولیٰ حاصل تھا۔ اس حالت میں یہ کیسے

قرین قیاس ہو سکتا ہے کہ وہ تاریخ نگاری کے فن سے نابلد ہوں - بالخصوص اس صورت میں کہ بعض تاریخی کتابیں، جو زمانہ کی دست برد سے بچ رہی ہیں، اب تک دیکھی جا سکتی ہیں -

اور اس کا جواب کہ اگر ہندوؤں نے تاریخیں لکھی تھیں وہ گئیں کہاں یہ دیا گیا ہے کہ

ہندوؤں کا بیان تو یہ ہے کہ قدیم ہندوستان کی تاریخیں لکھی ضرور گئی ہیں لیکن مسلمان حملہ آوروں نے کتبخانۂ اسکندریہ کی طرح انھیں مع دیگر کارآمد کتب کے جلا کر برباد کر دیا -

مترجم صاحب کا ذاتی خیال اس باب میں حسب ذیل ہے -

کسی حق پسند کو اس بات سے انکار نہیں ہو سکتا کہ مسلمان حملہ آوروں نے ہندوستان کے قدیم لٹریچر کو ضرور صدمہ پہنچایا ہے .... الخ

سند رجۂ بالا تینوں شقیں جداگانہ تنقید کی محتاج ہیں۔ مترجم صاحب کے پہلے اصول موضوعہ کے مطابق گویا ایک شخص کا کئی علوم میں دست رس رکھنا اس بات کا مترادف قرار دیا گیا ہے کہ وہ تمام علوم پر حاوی ہے۔ یعنی افلاطون فلسفی ہونے کے ساتھ ایک شاعر او معمار، اور ہومر، شاعر ہونے کے ساتھ ایک اعلیٰ درجہ کا ریاضی داں اور مصور بھی تھا - یہ قاعدہ جس قدر پوچ ہے ظاہر ہے - اسی طرح مسلمان حملہ آوروں پر ہندوستان کی قدیم تاریخوں کے "جلا کر برباد" کر دینے کا الزام اسوقت تک ناقابل اعتماد ہے تا وقتیکہ مستند حوالوں سے یہ نہ ثابت کر دیا جائے کہ اسلامی فتوحات سے پہلے یہاں "تاریخوں" کا کوئی ذخیرہ تھا بھی - لیکن یہ حوالہ جات - راج ترنگنی ایسی شاعرانہ تاریخ سے نہ ہونا چاہییں -

یہ امر بھی غور طلب ہے کہ مسلمانوں کو، ہندوؤں کی تاریخی کتب کے ساتھ کوئی خاص دشمنی تھی - کیونکہ سنسکرت لٹریچر کی وہ بیش قیمت کتابیں جن پر ہندو مذہب کا دارو مدار سمجھا جا سکتا ہے اب تک موجود ہیں حالانکہ قدرتی طور پر سب سے پہلے مسلمانوں کو انھیں کیجانب متوجہ ہونا چاہیے تھا - بہرکیف حضرت مترجم نے بطور دفع دخل مقدر جو کچھ ارشاد فرمایا ہے اسکی وقعت جملۂ معترضہ سے زیادہ نہیں اور حقیقت حال یہ ہے کہ ہندوؤں نے فن تاریخ سے اپنی مناسبت ثابت کرنے کی کوئی یادگاری کوشش نہیں کی - بلاشبہہ انھیں تاریخی واقعات کو نظم و نثر کی صورت میں مدون کرنے کا شوق رہا ہوگا جیسا کہ متعدد رزمیہ نظموں اور بیشمار کتبوں کے مطالعہ سے آشکار ہوتا ہے - لیکن در اصل ان میں مذہبی رنگ اس درجہ غالب تھا کہ تمام چیزوں میں اسکا پتہ چلتا ہے - اسکا اعتراف بابو نند لال دے، نے اپنی کتاب سویلیزیشن ان انشینٹ انڈیا میں ان الفاظ کے ساتھ کیا ہے : -

غرضکہ علم نجوم و ہندسہ و جبر مقابلہ و صرف و نحو و موسیقی و فلسفہ و تعمیرات، جو معراج ترقی کو پہنچ گئے ان سب کا تعلق قدیم ہندوستان کے مذہب سے تھا لیکن علم کے دوسرے شعبے جن کو مذہب سے کوئی تعلق نہ تھا انکی جانب لوگوں نے اسقدر توجہ نہیں کی -

دوسری جگہ بابو صاحب موصوف پھر لکھتے ہیں : -

ہندوؤں کے دلوں پہ مذہبی خیالات نے اس قدر تسلط کر رکھا تھا کہ بلا مبالغہ انکی دنیاوی کتابیں، مذہبی کتابوں کے مقابلہ میں بے انتہا کم تھیں -

یہ انھیں مذہبی خیالات کا پرتو ہے جو راج ترنگنی میں خصوصیت سے پائے جاتے اور جسکی وجہ سے قدیم تاریخ ہند کے تمام واقعات علی العموم، مشکوک و مبہم نظر آتے ہیں -

تاہم اگر ان نقائص سے قطع نظر کر کے دیکھا جائے تو راج ترنگنی میں بعض خوبیاں بھی ہیں - اسکے مطالعہ سے قدیم کشمیر کی طرز معاشرت اور نظام تمدن پر کافی روشنی پڑتی ہے - انداز حکومت اور اصول سلطنت پر کہیں کہیں اچھی بحث کی گئی ہے - اس کتاب کا مصنف شاعر بھی تھا بلکہ کہنا چاہیے کہ شاعر ہی تھا - اس وجہ سے اکثر مقامات پر شاعرانہ تلمیحات و استعارات کے استعمال سے انشا پردازی کی جھلک پیدا ہو گئی ہے - کہیں کہیں مناظر قدرت کا نقشہ نہایت مؤثر الفاظ میں دکھایا گیا ہے کہ بے اختیار تعریف کرنا پڑتی ہے -

مترجم نے بھی کتاب کے مکمل و دلاویز بنانے میں غیر معمولی سعی کی ہے -

کشمیر کا جغرافیہ، فرمانروایانِ کشمیر کے شجراتِ نسب، مصنف راج ترنگنی
کے سوانح عمری، یہ تمام چیزیں ٹھاکر اچھر چند صاحب کی بے لاگ محنت
کی رہینِ منت ہیں۔ تفہیم مطالب میں آسانی پیدا کرنے کے خیال سے ایک ہزار
سے زائد فٹ نوٹ بھی شامل کردیے گئے ہیں جن کی موجودگی یقینی طور پر فائدہ
مند ہے۔ ڈیڑھ سو صفحات کا ایک طویل دیباچہ ان سب پر طرہ ہے جسمیں بحث
ومباحثہ کی بہت گنجایش نکل سکتی ہے۔ افسوس ہے کہ مترجم صاحب کا قلم
رائے زنی کرتے ہوئے اپنی حد سے کہیں کہیں آگے نکل گیا ہے۔ تاہم اس خیال
سے وہ قابل معافی ہیں کہ قومی طرفداری کے جذبات سے متاثر ہوکر اکثر
بڑے بڑے ثقہ و متین مورخ بھی کیک حملوں پر اُتر آتے ہیں۔

کتاب کی چھپائی کا اہتمام بھی کافی طور پر اچھا ہوا ہے۔ اور بلاشک پبلشر
کو اسکے واسطے گرانبار خرچہ برداشت کرنا پڑا ہوگا۔ ہردو جلد، جو جداگانہ
طور پر مجلد ہیں اور جن کی صفحہ بندی بھی علٰحدہ علٰحدہ ہے، ان کی مجموعی قیمت
آٹھ روپیے اور محصول ڈاک عہ ہے جو بہر حال مناسب و موزوں ہے۔ ملنے
کا پتہ یہ ہے:-

ٹھاکر اچھر چند اینڈ کمپنی، کٹڑہ پوربیاں، لاہور

نشاطِ عمر مولوی بشیر الدین احمد دہلوی کا نام نامی معرفی سے
مستغنی ہے۔ آپ مولٰنا نذیر احمد ایسے نامور اور زندۂ جاوید
باپ کی یادگار ہونے کے علاوہ خود بھی مصنف و مؤلف ہونے کا قابل فخر امتیاز
رکھتے ہیں۔ اس وقت تک آپ کے قلم سے جو کتابیں نکلی ہیں، اگرچہ اُنکی تعداد
چنداں زیادہ نہیں لیکن نوعیت و مفاد کے اعتبار سے آپ کی علمی کوششیں
مقبولیت کی سند حاصل کر چکی ہیں۔ "اقبال دُلھن" سے جسکا پیرایۂ تحریر
اور اندازِ بیان مولٰنا نذیر احمد کے طرز کا بہترین نمونہ ہے، اس بات کا ثبوت
ملتا ہے کہ آپ کو اپنے والد بزرگوار کی طرح سوسائٹی کے معائب و محاسن کا
تذکرہ دل آویز و موثر طریقہ پر کرنا بہت اچھی طرح آتا ہے۔ اسی طرح
آپ کی بعض دوسری کتابیں کسی نہ کسی پہلو سے مفید و کارآمد ثابت ہو چکی
ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو ہندوستانی طرز معاشرت کی درستی و اصلاح
کا کافی انہماک ہے اور یقیناً اسی غرض کو مدنظر رکھ کر آپ نے امریکہ کے مشہور مصنف
ڈاکٹر سلونیس سٹال کے سلسلۂ "سلف اینڈ سیکس" کی بعض کتب کا ترجمہ اُردو
میں کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی یہ کتابیں امریکہ و یورپ میں غیر محدود شہرت و
وقعت حاصل کر چکی ہیں اور چونکہ ان میں سلسلہ وار، بچوں سے لیکر بوڑھوں
تک کے واسطے نہایت بیش قیمت معاشرتی تلقینات قلمبند کی گئی ہیں اور
اُن واقعات و معاملات پر، عقلی و نقلی دلائل کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے
جن سے کسی انسان کو چارہ نہیں، اس وجہ سے ان کتابوں کی قدر و قیمت
آج کل وہاں بہت ہے۔ ہندوستان میں پنجاب ریلجس بک سوسائٹی (لاہور)
کی مساعی جمیلہ سے اُردو میں اس سلسلہ کی اوّل تین کتابوں کا ترجمہ ہوگیا ہے
اور وہ بجائے خود قابل تعریف ہیں لیکن اسکے باوجود مولوی بشیر الدین احمد
کی یہ اُولوالعزمانہ علمی خدمت کسی صورت سے فعل عبث نہیں قرار پا سکتی۔ مولوی
صاحب نے ترجمہ تو ضرور کیا ہے لیکن ہندوستانی رسم و رواج اور ضروریات
کو مدِ نظر رکھکر اس میں ضروری اور مفید ترمیم کے لیے بھی گنجایش نکال لی ہے
جو ہر طرح قابل داد ہے۔ گویا آپ نے اُن تمام امور کو، جن پر ڈاکٹر صاحب نے
یورپین سوسائٹی کے نقطۂ خیال سے نگاہ ڈالی ہے ہندوستانی معاشرت کے
سانچے میں ڈھالا ہے۔ اسکے علاوہ آپ نے پیرایۂ تحریر عالمانہ و فاضلانہ رکھا ہے
جا بجا آیات قرآنی اور احادیث نبوی کا جوڑ استناداً اس خوبی سے لگایا گیا ہے
کہ کتاب کی شان دوبالا ہوگئی ہے۔ انکے ماسوا، قابل مترجم نے ثبوت کے طور پر
اپنے ذاتی تجربات و مشاہدات کا تذکرہ کرکے مطالب میں غایت درجہ کی دلچسپی کا
سامان پیدا کردیا ہے۔ پنجاب ریلجس بک سوسائٹی کے تراجم میں یہ تمام خوبیاں
مفقود ہیں۔ اُن میں لفظی ترجمہ کی پابندی کیگئی ہے اور "نشاطِ عمر" اس قسم کی قیود
سے مطلقاً مبرا ہے۔ اصولاً بھی مولوی بشیر الدین کا یہ طرزِ عمل کسی طرح قابل
گرفت نہیں بلکہ اسکے برخلاف کسی غیر زبان کی کتاب کا ترجمہ جب کیا جائے

تو اُس میں ترمیم و اضافہ کی آزادی مترجم کو اخلاقاً حاصل ہونا چاہیے۔ اُردو زبان میں اکثر ترجمے اس خصوصیت سے خالی ہوتے ہیں اور مبصرین کی نظر میں اُنکی کوئی وقعت نہیں ہوتی۔ بعض صورتوں میں تو لفظی ترجمہ کی قید دلآویز و مفید مطالب کا خون کردیتی ہی اور مترجم کی محنت بجائے مشکور ہونے کے موردِ لعن و طعن قرار پاتی ہی۔ اُردو زبان میں مغربی لٹریچر کے بعض گرانمایہ جواہر کا اضافہ بذریعہ ترجمہ ہو رہا ہی اور اس سے دلدادگانِ ادب کو خاص طور پر مطمئن ہونا چاہیے لیکن اسی کے ساتھ اہل قلم گروہ کا فرض ہی کہ وہ اپنی سوشل اور تمدنی خصوصیات کو نظر انداز نہ ہونے دیں تاکہ انکی کوشش اہل ملک کے لیے نفع بخش ثابت ہو۔ مولوی بشیر الدینؔ ان تمام وجوہ سے، مستحق مبارکباد ہیں کہ اُنھوں نے نہ صرف ایک کارآمد سلسلۂ کتب کا اُردو زبان میں ترجمہ کرکے اُردو خوان ناظرین کو اُس سے متمتع ہونے کا موقع دیا ہی بلکہ دوسروں کے لیے راستہ بھی کھول دیا ہی کہ غیروں کے مال و متاع کو، نیک نیتی کے ساتھ اپنے تصرف میں کس طرح لانا چاہیے۔

ڈاکٹر سلیونس سٹال صاحب نے اپنے اس مشہور و معروف سلسلہ میں کئی کتابیں لکھی ہیں۔ پہلی کتاب نوعمر لڑکوں کے متعلق ہی، دوسری نوجوانوں کے لیے، تیسری فلسفۂ ازدواج سے تعلق رکھتی ہی اور علیٰ ہذا القیاس۔ جن مباحث پر ڈاکٹر صاحب کی یہ تصانیف مبنی ہیں ان کی تفصیل تحصیل حاصل ہوگی۔ مختصر یہ سمجھ لینا چاہیے کہ جن امور کا، توالد و تناسل سے تعلق پایا گیا ہی ان سب پر آپ نے رائے زنی فرمائی ہی۔ لڑکوں کے متعلق ڈاکٹر صاحب کی پہلی کتاب جسمیں عاداتِ قبیحہ کے مضر نتائج کو نہایت خوبی سے ذہن نشین کرنے کے علاوہ اور بھی بہت سی بیش قیمت اخلاقی نصیحتیں بیان کیگئی ہیں اُسکا ترجمہ مولوی بشیر الدین احمدؔ اس سے پیشتر "حرزِ طفلاں" کے پُرمعنی و موزوں نام کے ساتھ شائع کرچکے ہیں اور "نشاطِ عمر" دوسری کتاب کا ترجمہ ہی۔ اسکے اندر کس قسم کے مضامین قلمبند کیے گئے ہیں، اسکا جواب مندرجہ ذیل سرخیوں سے ملیگا جو اقتباساً درج ذیل کیجاتی ہیں:۔ سرمایۂ زندگی، تزکیۂ نفس، جسمانی کمزوری، امراض خبیثہ اور انکے ہولناک نتائج، اعضائے توالد و تناسل اور اُن کی غرض، مرد و عورت کے تعلقات، شادی کا مقدس فریضہ، وغیرہم۔

بلاشبہ یہ مسائل جس قدر دقیق اور نازک ہیں اُسیقدر یہ انسانی زندگی پر موثر بھی ہیں۔ بعض باتیں ظاہر بین نگاہوں میں شاید غیر مہذب یا مشتعل کُن دکھائی دیں لیکن اس سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا کہ ان باتوں پر رائے زنی کرنے کا اس سے زیادہ مہذب اور متین انداز نا ممکن ہی۔ خود یورپ میں ایک جماعت ڈاکٹر سلیونس سٹال پر فحش و گندہ لٹریچر کی فراوانی کا سامان بہم پہنچانے کا الزام لگاتی ہی اور ممکن ہی کہ ہمارے بعض ہموطن مولوی بشیر الدین احمدؔ کو بھی اس الزام کا بجصۂ رسدی مستحق سمجھیں۔ تاہم معمولی طور پر بھی اگر غور سے کام لیا جائے تو پتہ چل سکتا ہی کہ ڈاکٹر صاحب اور مولوی صاحب، دونوں کی کوششیں رفاہ عام اور خیرخواہی انام پر مبنی ہیں۔ حقیقت یہ ہی کہ مسئلۂ توالد و تناسل کی طرف ہمارے یہاں کسی کو توجہ کرنے کی ضرورت کبھی محسوس نہیں ہوئی۔ حالانکہ اسی پر قومی زندگانی کا انحصار ہی۔ "نشاطِ عمر" میں جو کچھ اور جیسی کچھ نصائح و ہدایات مندرج ہیں وہ عملی طور پر نوجوانوں کے لیے نہایت کارآمد ہیں اور اسکی ضرورت ہی کہ ملک کے نونہال انھیں آویزۂ گوش بنائیں۔ بقائے نسل کا مسئلہ نہایت درجہ اہم ہی۔ پس جو لوگ اپنی مذموم عادت کی بدولت اپنی نسل کو خراب کرتے ہیں وہ اخلاقی طور پر قوم اور ملک کے گناہگار ہیں اور انھیں گناہگاروں کی ہدایت کیلیے "نشاطِ عمر" ایسی کتاب کی ضرورت تھی۔ خدا کرے اسکی اشاعت ہندوستان میں کافی طور پر ہو تاکہ جس مقصد کو پیش نظر رکھکر مولوی بشیر الدین احمدؔ صاحب نے یہ خدمت انجام دی ہی وہ باحسن الوجوہ تکمیل کو پہنچے۔ اسکی قیمت مع خرچہ وی پی عہ ہی جو تقریباً ۳۰۰ صفحات کی کتاب کیلیے کچھ زیادہ نہیں کہی جاسکتی۔ ملنے کا پتہ:۔ مولوی بشیر الدین احمد صاحب، اول تعلقدار عثمان آباد، (ریاست حیدرآباد دکن)

بزم فرید اُردو لٹریچر کی خوش قسمتی ہو کہ اُس میں ہر پہلو سے نمایاں ترقی کے آثار پیدا ہیں - یہ ضرور ہو کہ کوششیں جو ہو رہی ہیں وہ محدود ہیں حالانکہ ہماری ضرورتیں اس بات کی متقاضی ہیں کہ ان کوششوں کا دائرہ وسیع کیا جائے - تاہم جو کچھ بھی ہو رہا ہو وہ بسا غنیمت ہو - یہ بالکل قرین قیاس ہو کہ جو بنیاد آج پڑ رہی ہو اُس پر کبھی عالیشان عمارتیں کھڑی ہو جائینگی - یعنی اُردو زبان میں تاریخ، فلسفہ، سائنس، ادب، شاعری، وغیرہم مباحث پر جو چھوٹی چھوٹی کتابیں اس زمانہ میں تصنیف یا تالیف یا ترجمہ ہو رہی ہیں وہ گویا ایک شاندار مستقبل کی خبر دیتی ہیں - تصوف کی ایک شاخ رہ گئی تھی لیکن اس کمی کے پورے کرنے کی گرانبار ذمہ داری کارکنان "نظام المشائخ" نے اپنے سر لے لی ہو اور اسوقت تک اُن کی مساعی جمیلہ سے صوفیانہ مشرب کی کئی بیش قیمت کتابیں نکل چکی ہیں، جو اپنے محاسن ظاہری و باطنی کے اعتبار سے قابل تعریف و مستحق داد ہیں - اس باب میں ملا محمد الواحدی کی بے لاگ خدمات خصوصیت سے استحقاق اعتراف رکھتی ہیں، جن کے قلم سے، حال میں "بزم فرید" کے نام سے ایک مفید و دلچسپ کتاب کا ترجمہ شائع ہوا ہو -

"بزم فرید" جیسا کہ اسکے نام سے ظاہر ہو "حضرت بابا فرید شکر گنج قدس اللہ سرہ العزیز کے اعمال و اقوال کا مجموعہ ہو" جسے حضرت سلطان الاولیا محبوب الٰہی (خواجہ نظام الدینؒ) نے زبان فارسی میں راحت القلوب کے نام سے ترتیب دیا تھا اور ملا محمد الواحدی نے اُسکا اُردو میں ترجمہ کیا ہو - حضرت محبوب الٰہیؒ، حضرت بابا فرید شکر گنجؒ کے راسخ الاعتقاد اور حضور رس و حاضر باش پیرو تھے - دوسرے بزرگان دین کی طرح باباصاحبؒ کا دربار بھی تقریباً روزانہ منعقد ہوا کرتا تھا، اور مختلف اذکار ہوا کرتے تھے جن کے اثنا میں سیکڑوں نکتے معرفت و حقیقت کے حل کیے جاتے تھے - انھیں کار آمد باتوں کا مجموعہ "بزم فرید" ہو جو نہ صرف یک گرانپایہ شیخ طریقت کے ملفوظ ہونے کے باعث بلکہ تصوف و اخلاق کے آبدار موتیوں کی ایک سلک ہونے کے لحاظ سے بھی طبقۂ صوفیہ میں جائز طور پر ہر دل عزیزی اور مقبولیت حاصل کرنے کا حق رکھتی ہو اور امید ہو کہ ملا صاحب کا یہ ترجمہ ہندوستان کے متصوفین کے لیے دلچسپی کا نیا سامان پیدا کریگا - آج کل جبکہ اخلاق و آداب کی کساد بازاری ہو رہی ہو اور تصوف کے حقیقی معنوں کے سمجھنے کی قابلیت عام طور پر مفقود ہوتی جا رہی ہو - اس قسم کی کتابیں قدر دانی کی مستحق ہیں - ملا محمد الواحدی صاحب لائق مبارکباد ہیں کہ اُنھوں نے راحت القلوب کا ترجمہ نہایت خوبی سے کیا ہو اور عبارت و انداز بیان کی خوبیاں ہاتھ سے جانے نہیں پائیں بلکہ اسکے برخلاف طرز تحریر میں سلاست و روانی کا اسدرجہ خیال رکھا گیا ہو کہ پڑھنے والے کو اسکا خدشہ بھی نہیں ہوتا کہ یہ کسی غیر زبان کا ترجمہ ہو - زبان کی خوبیوں سے قطع نظر، مطالب کے اعتبار سے بھی "بزم فرید" غایت درجہ سبق آموز ہو - عالم تصوف کے اسرار، اخلاق و حکمت کے نکات حسن معاشرت کے متعلق ہدایتیں، اس کتاب کے صفحات میں کمال عمدگی سے قلمبند کیگئی ہیں اور اس لحاظ سے نہ صرف فرقۂ صوفیہ بلکہ عامۂ مسلمین کے لیے بھی اسکا مطالعہ عبث نہیں قرار دیا جا سکتا - یہ بالکل ممکن ہو کہ ظاہر بین اور دنیا پرست نگاہوں میں بعض باتیں قابل اعتراض ٹھیریں لیکن اس سے اور مفید باتوں کا اثر زائل نہیں ہو سکتا - حقیقت یہ ہو کہ روحانی دنیا کے اسرار عجیب و غریب ہوتے ہیں اور انکا انکشاف دنیاداروں کی عقل سے محال ہو ان پر عبور کرنے کا صرف ایک طریقہ ہو اور وہ یہ ہو کہ "پہلے تم اپنی طبیعت کو اُسی رنگ میں رنگو اور پھر جب تم میں روحانی منازل کے طے کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جائیگی تو اُسوقت یہ تمام مسائل، جو عقدۂ لاینحل اور راز سربستہ نظر آتے ہیں خود بخود حل ہو جائیں گے" - اس قسم کے مضامین، جو ہماری سمجھ میں نہ آئیں، انکے متعلق ہمارا طرز عمل یہ ہونا چاہیے کہ یا تو ہم انھیں اپنے ادراک سے بالا سمجھ کر اُنسے قطع نظر کریں یا بقول خواجہ حسن نظامی صاحب "اُنکی کوئی اچھی تاویل نکال کر دل کو سمجھا لینا چاہیے"۔

مختصر یہ ہی کہ "بزم فرید" گوناگوں دلچسپیوں سے مملو ہی۔ اہل علم حضرات کو اسکی قدر دانی کرنا چاہیے تاکہ مترجم و پبلشر کی حوصلہ افزائی ہو۔ چھپائی کاغذ وغیرہ سب نہایت موزوں ومناسب ہی۔ ضخامت ۱۱۲ صفحے ہی جسکی قیمت مع محصول ڈاک وخرچۂ وی پی ۱۰ ر زیادہ نہیں۔

دفتر نظام المشائخ، فیض بازار دہلی سے طلب فرمائیے۔

عجیب وغریب صدی پنجاب پبلیس بک سوسائٹی (انارکلی۔ لاہور) کیجانب سے جو مساعی جمیلہ اردو علم ادب کے سنوارنے اور نکھارنے میں عمل میں آئی ہیں وہ اسکا حق رکھتی ہیں کہ انکا ذکر فخر ومباہات کے ساتھ کیا جائے۔ آئے دن اس سوسائٹی کی زیر نگرانی اچھی اچھی کتابیں نکلتی رہتی ہیں اور ان میں ایک مشترکہ خوبی یہ ہی کہ یہ ساری کتابیں، خواہ مستقل تصنیف ہوں یا تالیف وترجمہ، مذاق جدید کے عین مطابق ہوتی ہیں جس سے ہماری علمی ضروریات کی تکمیل متصور رہی۔ حال میں اس سوسائٹی کی جانب سے آلفرڈ رسل والس کی دلچسپ وسبق آموز کتاب "دی ونڈرفل سنچری ریڈر" کا ترجمہ مندرجہ عنوان نام کے ساتھ شائع ہوا ہی، جس کے مفید وکارآمد ہونے میں شک کی گنجائش مطلق نہیں ہو سکتی۔

مہذب ومتمدن حصص عالم میں آجکل ترقی وعروج کا دور دورہ ہی۔ مصر، روما، ہندوستان وغیرہ کی سرزمینیں اپنے اپنے وقت پر سرسبز ہوئیں، پھولی پھلیں اور پھر انکی بہار کا زمانہ ختم ہوگیا۔ اب یورپ امریکہ کی باری ہی اور ان ممالک میں آج کل ایجاد وتحقیق کی بدولت جو جو عجائبات عالم ظہور میں آ رہے ہیں وہ بجائے خود حیرت انگیز وہوش ربا ہیں۔ بالخصوص انیسویں صدی عیسوی میں حکمت وسائنس کو جو عروج حاصل ہوا ہی اور اسکی بدولت مادی واقتصادی نتائج مستنبط ہوئے ہیں ان پر عبور حاصل کرنا، اور ان سے واقفیت بہم پہنچانا ہر اس شخص کے لیے لازمی ولابدی ہی جسکو مبدء فیاض سے اپنے دل ودماغ سے کام لینے کا ذوق ودیعت ہوا ہی۔ "عجیب غریب صدی" میں انکا تفصیلی ذکر کیا گیا ہی۔ گویا کتاب کیا ہی، بکھرے ہوئے موتیوں کی ایک لڑی ہی۔ اسکے مطالعہ سے ان تمام اصلاحات وترقیات کا مشرح ومورخانہ حال معلوم ہو سکتا ہی جو "تہذیب یورپ" کی تاریخ میں نمایاں درجہ رکھتی ہیں۔ یہ سب لوگ جانتے ہیں کہ آج کل نت نئی ایجادیں عجیب وغریب انکشافات، اور حیرت انگیز انتظامات ہوتے رہتے ہیں لیکن مشکل ہی کہ کوئی شخص ان کے متعلق صحیح اور مسلسل کیفیت بیان کر سکے۔ "عجیب غریب صدی" اس مشکل کے حل کرنے کا بہترین ذریعہ ہی۔ اصل کتاب میں، جو انگریزی میں ترتیب دی گئی ہی ہر قسم کی معلومات کو ایک جگہ فراہم کر دیا گیا ہی اور جس مسئلہ کو ہاتھ لگایا ہی اس کے تمام مراحل عمدگی وخوش اسلوبی سے طے کیے ہیں۔ "عجیب غریب صدی" ترجمہ ہونے کے لحاظ سے ان تمام محاسن کی حصہ دار ہی جو اصل کتاب میں پائی جاتی ہیں۔ انگریزی میں یہ کتاب بچوں کیلیے لکھی گئی تھی لیکن ہندوستان میں اسکا ترجمہ نہ صرف نوعمر لڑکوں کے لیے کارآمد ہی بلکہ واقف کار اور تعلیم یافتہ نوجوان اور بوڑھے اسکے ذریعہ سے اپنی معلومات میں کافی اضافہ کر سکتے ہیں۔

بعض مضامین اس میں ایسے دقیق ہیں کہ تاوقتیکہ پڑھنے والا علم طبعیات میں مہارت نہ رکھتا ہو ان سے حظ نہیں اٹھا سکتا لیکن اسکے باوجود انکے مفید ودلچسپ ہونے میں شک نہیں۔ وہ مضامین، جن سے انسانی تہذیب وتمدن کے مختلف النوع مدارج پر روشنی پڑتی ہی، ازمنۂ سابقہ وزمانۂ موجودہ کی معاشرتی زندگی کا سبق آموز تقابل پیش کرتے ہیں اور اس قابل ہیں کہ انکا مطالعہ غور وخوض سے کیا جائے۔

اس ترجمہ کے متعلق صرف ایک شکایت ہی اور وہ یہ ہی کہ ترجمہ میں زبان کی خوبیاں بالکل جاتی رہی ہیں جسکی وجہ سے مضامین کی دلچسپی بہت کم ہو گئی ہی۔ کاش نظر ثانی کرکے اسکو بامحاورہ اور رواں کر دیا جاتا تو اسکی شان دوبالا ہو جاتی۔ پنجاب پبلیس بک سوسائٹی کی طرف سے جتنے اور جسقدر بھی نادر الوجود تراجم شائع ہوئے ہیں انکے مفید وکارآمد ہونے میں کلام نہیں لیکن جہاں تک دیکھا گیا ہی ان میں زیادہ تر خرابیاں زبان کی پائی

جاتی ہیں۔ سوسائٹی کے کارناموں کی عزت ہمارے دل میں بہت ہے اور اسی لیے سرسری طور پر ان نقائص کا ذکر کیا گیا ہے کہ کارپردازان سوسائٹی ان کی اصلاح کی طرف متوجہ ہوں۔ کسی کے عیوب کا افشا کرنا نہ فرض میں شامل ہے نہ تنقید نگار کو کسی کی خردہ گیری کرنے سے کوئی ذاتی نفع حاصل ہوتا ہے بلکہ اس سے مقصود محض اصول کی پابندی و اصلاح طلبی ہے۔ اس اعتبار سے امید کرنا چاہیے کہ سوسائٹی اس ناچیز مشورہ کو اپنی عنایت توجہ سے محروم نہ رکھیگی۔

بحالت موجودہ بھی "عجیب و غریب صدی" قدردانی کا استحقاق رکھتی ہے قیمت ۶ر ۲۰۰ صفحے کی ایک جامع کتاب کے لیے بہت کم ہے۔

"سید القلم"

کلام شاد

(از مہاراجہ بہادر سر راجہ کشن پرشاد صاحب بالقابہم جی سی آئی ای)

جو وہ آجائے پہلو میں تو بیشک زندگی ہوگی
وگرنہ خاک میری اور اُس بت کی گلی ہوگی

اُسی کو کر رکھو اپنا تم اُس کے گر نہیں ہوتے
اگر وہ دشمن جاں ہو خدائی مدعی ہوگی

ترے پاؤں کی آہٹ نے بپا محشر کیا ظالم
لحد میں عاشق شیدا کے بھی ہل چل پڑی ہوگی

نہیں جب دوسرا کوئی دوئی کا ذکر پھر کیا ہے
یہ دعویٰ ہی غلط ٹھہرا خدائی دوسری ہوگی

خدا والے نہیں پابند کچھ مسجد کے اے واعظ
وہ بتخانے میں بھی جائیں تو اُسکی بندگی ہوگی

زمانہ سے نہیں مطلب ہے کچھ کام غیروں سے
فلک کیوں دشمن جاں ہو جو اُس سے دوستی ہوگی

ذرا آئینہ بنکر سامنے آجائیے اک دن
تصدق آپ پہ اُس دن ہماری بیخودی ہوگی

طرفداری کریگا کس طرح وہ میری کہئے تو
زبان آشنا کیوں کر زبان مدعی ہوگی

نہ دے زاہد کو لے ساقی پلانے بادہ خواروں کو
مزا وہ مے کا کیا جانے کبھی جس نے نہ پی ہوگی

نہیں چلتا کسی کا بس کریں گو لاکھ تدبیریں
وہی بات آئیگی آگے جو قسمت میں لکھی ہوگی

نشیلی آنکھ دکھلا دے ترے قربان اے ساقی
خودی میں سارا عالم اور اپنی بیخودی ہوگی

مقابل آئینہ بنکر جو آؤگے مزا ہوگا
ہماری آنکھ کی پتلی تماشا دیکھتی ہوگی

ستم کے آپ خوگر ہیں جفا کے آپ عادی ہیں
مگر یہ یاد رکھیے گا خدائی مدعی ہوگی

بجز میرے کہاں ہے غیر کوئی دونوں عالم میں
مری حیرت مگر میرا تماشا دیکھتی ہوگی

دکن میں اب نہ بہلے گی طبیعت شاد کی ہرگز
جو وہ اجمیر کو جائے تو پھر اُسکی خوشی ہوگی

مخمس

جو ندوۃ العلماء کے دار العلوم کی رسم فونڈیشن کے موقع پر ہز آنر سر جان ہیوٹ لفٹننٹ گورنر ممالک متحدہ آگرہ واودھ کی حضور مین پڑھنے کے لیے ایک دوست کی فرمائش سے لکھکر لکھنؤ بھیجا گیا تھا مگر کسی مصلحت سے وہان پڑھا نہین گیا اور اب تک شائع بھی نہین ہوا۔

ڈر حادثاتِ دہر کا پھر اس عمارت کو ہی کیا ... رکھی گئی ہو علم او ر اصلاح پر جسکی بنا
ہون راج اور مزدور جسکے اہل علم و اتقا ... اور مستری جسکا نبی صلعم کا خود فرمانروا
ہیوٹ نے ڈالی تیری نیو اے ندوہ کر شکرِ خدا

اب مشکلین فضلِ خدا سے تیری سب آسان ہوئین ... سر جان ہو تیرا مربی۔ قوم ہے تیری معین
رک رک کے آخر جھک پڑے ہین تیری جانب اہل دین ... اے ندوہ یہ سامان بجز تائیدِ ربانی نہین
پھر ڈر ہے اس بیڑے کو کیا جسکا خدا ہو ناخدا

بے گھر تھا تو اے ندوہ تجھکو گھر دیا سر جان نے ... ویرانہ تھا۔ آباد تجھکو کر دیا سر جان نے
موقع تجھے بہتر سے بہتر دیا سر جان نے ... خاکہ تھا اک تو۔ رنگ اسمین بھر دیا سر جان نے
اب تو قدم آگے بڑھا۔ خواہش ہی گر اس سے سوا

اُس ملک کے اہل ملک پر سمجھو خدا ہے مہربان ... آزاد ہون مذہب جہان آباد ہون معبد جہان
ہو سلطنت اُس قوم کی جو علم کی ہو قدر دان ... جلسون مین پبلک کے شریک آکر ہون حکام زمان
دین تا کہ اپنے خلقِ شاہانہ سے دل سب کے بڑھا

دین علم کی ترغیب اُنھین جو علم سے بیزار ہون ... اُنکو جگائین نیند سے غفلت سے جو سرشار ہون
خیرا دپر اُنکو چڑھائین جو کہ ناہموار ہون ... دین واجبی حق بے دریغ اُنکو کہ جو حقدار ہون
جس قوم کو دیکھین گرا دین دوڑکر اُسکو اُٹھا

ممکن ہی کچھ دل اس حکومت مین ہو نالان و حزین ... بر اس سے تو خالی حکومت کوئی عالم مین نہین
وہ بادشہ قبضے مین جسکے آسمان ہو اور زمین ... اُسکی حکومت مین بھی شادی ہی کہین ماتم کہین
باران رحمت ہے کہین رحمت کہین سیلِ بلا

حق یہ ہی جس ملک مین ہر قوم کی حالت جُدا ... ہر قوم کا مقصد الگ اُس قوم کی حاجت جُدا
رسمین جُدا ہر قوم کی مذہب جُدا ملت جُدا ... نقشہ جُدا رنگت جُدا صورت جُدا سیرت جُدا
ہو انتظام اُس ملک کا بس کام انگلش قوم کا

حالی

دردِ دل

منت کشِ سُرورِ خمارِ نگاہِ ناز ... یعنے دلِ حمید کہ ہے خوگرِ نیاز
سامانِ عیش چھوڑ کے ایذا طلب ہوا ... ہوتا ہی دردِ عشق مین جو کچھ وہ سب ہوا

منت پذیر نالۂ ناقوسِ برہمن ق شرمندۂ نوائے بخلوت در انجمن
شیرازۂ نظامِ نواہائے کائنات ... اِک دردِ دل ہی جنبش گہوارۂ حیات
اقلیمِ عشق و حسن مین جسکی تمیز ہے ... وہ چیز دل مین راحتِ جانِ عزیز ہے

عاشق کی جان صوفیِ صافی کا رازِ دل ... اے دستِ ذوق بندشِ ترکیبِ آب و گل
اے ہمکنارِ لذتِ سامانِ آرزو ... تیری کسک سے موت مین بھی جانِ آرزو
جس دل مین تیرا فیض محیطِ روان رہا
دُنیا کی بزمِ عیش مین وہ سرگران رہا

اے درد تو نہان ہی بیان بزمِ راز مین ... خلوت کدے ترے ہین دلون کے گداز مین
دُنیا فریب خوردۂ ذوقِ مجاز ہے ... تیری حقیقتون سے جہان بے نیاز ہے
ظاہر پرستیون سے مٹی شوکتِ نیاز ... کس کو سنائین بزم مین یہ قصہ دراز
شیخِ حرم نشین ہے صنم سازِ انجمن ... مایا کے جال مین ہے گرفتار انجمن
ہے قحط گرچہ تیرے متاعِ گداز کا ... واقف نہین جہان ہی نواہائے راز کا
فیضِ ازل کا دستِ سخا ہے کھلا ہوا ... پلا ہے اُسکے فضل و کرم کا جھکا ہوا
مستلزمِ ممات بود زہر و قیمتیست
سرچشمۂ حیات بود آب و بے بہاست
افسوس ہی کہ حال دلون کا خراب ہے ... ذوقِ مجاز چشمِ خرد کا حجاب ہے

نظارہ بازِ عالمِ پنہان خموش ہین ق مستِ خمارِ ساغرِ صہبائے دوش ہین
محوِ جمالِ برقِ تجلیِ طورِ جان ... اُن کی نظر مین اور کی گنجائشین کہان
ترکش مین اُن کے آج بھی وہ تیرِ آہ ہے ... جو منزلِ حیات مین سامانِ راہ ہے

اے درد پھر دکھادے اسی سوز و ساز کو
پا جائیں دست شوکت عمر دراز کو

اور بزم کائنات گرفتار حرص و آز — بچنا کہ آنکھ ہے کسی مفسد کی فتنہ باز
کیوں محو ماؤمن ہے حریم نگار میں — ہے شور اتحاد دلوں کی پکار میں
رہنے دے فکر تفرقۂ غیر و خویش کو — کر درد کی دوا سے درست اپنے کیش کو
آنکھوں سے اپنی پردۂ نخوت اٹھا کے دیکھ — سوز و گداز درد کو دل سے لگا کے دیکھ
ہر زیر و بم کے سوز میں نغمہ ہے ساز کا — ہر سوز و ساز حادثہ پردہ ہے راز کا
تہذیب ظاہری نے مٹایا ہے نام درد — لیکن جہان جان میں ہیں سب اہتمام درد

حاصل نہیں ہے کچھ بھی طلسم نمود سے
پی جام درد میکدۂ ہست و بود سے

حمید کوٹلوی

کلام اکبر

غور سے دیکھو زمین و آسمان کو منکرو — چل بھی سکتا بے خدا کے انتظام اخبار
سنتے ہیں اکبر کو ہے عشق دہان تنگ بت — کام اتنا چھوٹا اور حضرت کا نام اتنا بڑا

خدا پرستی کا رخ کہاں ہے یہ فقرہ باتیں ہیں اڑ گیا ہے — نمود ہے اور جنگ باہم گروہ بندی ہے لوہ ہے

مرے عمل سے نہ شیخ خوش ہیں نہ بھائی خوش ہیں نہ باغ خوش ہیں
مگر میں سمجھا ہوں اسکو اچھا۔ دلیل یہ ہے کہ آپ خوش ہیں
جو دیکھا سائنس کا یہ چکر دھرم پکارا کہ اے برادر!
ہمارے دورے میں پن مگن تھے تمھارے دور میں بدنصیب ہیں

چاہا تو بہت دل یہ مرے چوٹ نہ آئے — پر کیا کروں کہ میری طرف دوست نہ آئے

فلک کی گردش سے آج ہم کیا خراب و خستہ پڑے پڑے ہیں
اجڑ گئے ہیں مگر کریں کیا جہاں بسے تھے وہیں پڑے ہیں

نہ پائمالی سے ہو حفاظت نہ حس و حرکت کی ہم میں طاقت
ہوئے ہیں سایہ اگر گرے ہیں بچے ہیں دیوار گر کھڑے ہیں
حرم کی صف میں شریک ہو کر نماز پڑھنے کا شوق رخصت
بتان ترسا کی جلوہ گاہوں میں دست بستہ مگر کھڑے ہیں

صفت عشق

از فصیح الملک بلبل ہندوستان نواب مرزا خان صاحب داغ دہلوی مرحوم

خوبیاں عشق کی بیاں کروں — کچھ طبیعت کا امتحاں کروں
سب نے کی ہیں برائیاں اسکی — میں نے لکھیں بھلائیاں اسکی
دل بنا ہے اسی مزے کے لیئے — ہے بنا یہ لطف جان دے کے لیئے
عشق تاب و توان عاشق ہے — شان عاشق نشان عاشق ہے
عشق ہی آرزوئے عاشق ہے — آرزو آبروئے عاشق ہے
عشق نعمت ہے آدمی کے لیے — عشق جنت ہے آدمی کے لیے
دل اسی سے جوان رہتا ہے — مرتوں کا نشان رہتا ہے
عشق کا داغ غیرت گل ہے — دود فرہاد رشک سنبل ہے
عشق کیا کیا بہار دیتا ہے — یہ دلوں کو ابھار دیتا ہے
بزدلوں کو دلیر کرتا ہے — یہ دلیروں کو شیر کرتا ہے
عشق سے کس کا زور چلتا ہے — اس سے رستم کا دم نکلتا ہے
خاک سے عشق پاک کرتا ہے — زندہ وہ ہے جو اسمیں مرتا ہے
شیوۂ خاص ہے یہ عام نہیں — جو نکمے ہیں ان کا کام نہیں
اس سے گمنام نام پاتے ہیں — اس سے ناکام کام پاتے ہیں
یوں ہو مشہور قیس سا قلاش — یوں ہو مشہور ایک سنگتراش
عشق کے نام پر نثار رہوں میں — اس کے انجام پر نثار رہوں میں
عشق کا درد راحت جان ہے — عشق کا زہر آب حیوان ہے
یہ ہے ٹکسال نقد جان کے لیے — یہ کسوٹی ہے امتحان کے لیے
اس سے دل کا چراغ روشن ہے — آنکھ روشن دماغ روشن ہے

عشق سے رہتی ہے طبیعت گرم   شعلہ رویوں کے ساتھ صحبت گرم
عشق کے کھیل ہم نے کھیلے ہین   سو پریزادہ ہم اکیلے ہین
عشق کے لطف ہم نے پائے ہین   کیا کہین کیا مزے اُڑائے ہین
عشق سے دل گداز ہوتا ہے   ناز مین بھی نیاز ہوتا ہے
سو دوائین ہین اک کسک اسکی   سوادائین ہین اک لٹک اسکی
یہ ہے معشوق نوجوانون کا   یہ ہے محبوب رازدانون کا
عشق سے آدمیت آتی ہے   آدمی کو مروت آتی ہے
عشق سب بل نکال دیتا ہے   عشق سانچے مین ڈھال دیتا ہے
ہے معلم ہزار مجنون کا   سبق آموز ہے فلاطون کا
عشق کا لطف زندگانی ہے   زندگی کا مزا جوانی ہے
عشق عاشق کو بخشواتا ہے   عشق جنت مین لیکے جاتا ہے
عشق ایمان ہے خدا رکھے   یہ مری جان ہے خدا رکھے
عشق باطن ہو عشق ظاہر ہو   اس سے توبہ کرے تو کافر ہو
نالۂ عشق نغمۂ نے ہے   اثر عشق نشۂ مے ہے

اس سے دل کو سُرور ہوتا ہے
اس سے نشہ مین چور ہوتا ہے

آنکھ کا طلسم

دُنیا مین روئے اہل نظر کی ہو شان آنکھ   ہے طفلِ مردمک کا منوّر مکان آنکھ
شرم و مروّت اور غضب کی ہو شان آنکھ   تیغ نگاہِ نازبتان کی ہے سان آنکھ

اظہار اگر الم کا کرے ابرِ تر بنے
کاجل لگی کوٹھری ہو جو عاشق کا گھر بنے

یہ آنکھ دشتِ خوبیِ رُخ کا غزال ہو   یہ آنکھ جامِ بادہ حُسن و جمال ہے
یہ آنکھ نرگس چمن انفعال ہو   شرم و حیا و مہر کی مہر اسکا خال ہے

اعجاز عیسوی سے اگر سین مار دے
امرت کا گھونٹ خلق کے نیچے اُتار دے

یہ آنکھ سنگِ اخگرِ غیظ و غضب کو ہے   یہ آنکھ آئینۂ رُخِ عیش و طرب کو ہے
دن کو یہ آفتاب ہو مہتاب شب کو ہے   مخزن مروّت اور حیا کا یہ سب کو ہے

طوطے کی آنکھ ہو جو وفا سے حذر کرے
دریا چڑھے شراب کا مستی جو گھر کرے

غصّے مین ہو تو کھینچکے خنجر فلک اُٹھے   انگارہ تل ہو کوئے کیصورت دہک اُٹھے
ڈھیلون سے آگ شعلہ نظر سے بھڑک اُٹھے   سورج ہو ایک نیزے پہ بجلی چمک اُٹھے

کھیرے کیطرح کاٹ لے سر کو جو دیکھ لے
قیمہ بناکے چھوڑے جگر کو جو دیکھ لے

موقع خوشی کا ہو تو بنے کشتِ زعفران   خندہ دہان مردمِ دیدہ سے ہو عیان
غمگین ہو گر تو زخم کی صورت ہو خونفشان   ہو ایک بوند پانی سے بحرِ روان رلان

موقع حیا کا ہو تو نہ اُن پر نظر اُٹھائے
پتلی چھپے پلک مین نہ غیرت سے سر اُٹھائے

کرتی ہو عیش و غم کے اثر کو قبول آنکھ   باغِ نشاط غیر سے چنتی ہو پھول آنکھ
ہوتی ہو رنج اہل الم سے ملول آنکھ   بوتی ہو سات پردون مین اپنے ببول آنکھ

القصّہ فرد جذب و اثر مین نگاہ ہے
مسمیرزم ہمارے بیان کا گواہ ہے

اگلے رشی منی جو خدارس گذر گئے   اِس آنکھ سے ہزارون ہی اعجاز کر گئے
مردے کٹی مین آئے تو زندہ وہ کر گئے   دیکھا نگاہ قہر سے جنکو وہ مر گئے

معلوم ہو یہ اچھی طرح خاص و عام کو
پھونکا تھا شیو جی نے انھین آنکھ سے کام کو

غصّہ مین ہو تو عقل کے اوسان کھوئے یہ   سیماب کے کنوئین مین بدنکو ڈبوئے یہ
سارے بدن کا کسل مٹا دے جو سوئے یہ   کل جسم پر اداسی ہو طاری جو روئے یہ

دل سے شریک درد ہو اعضا کے روگ مین
گر ہسر تو نکا خون ہو بیٹھے یہ سوگ مین

سینہ ہو غم سے شق کہ جگر مین شگاف ہو   اقرار دل کو جرم سے یا انحراف ہو

باطن سیاہ ہو کہ مکدر کہ صاف ہو   یہ آنکھ حال جسم کا فوٹو گراف ہو
مانند نبض نقشۂ تقریر کھینچ دے
نظروں میں بات بات کی تصویر کھینچ دے

تاثیر سارے جسم کی اس پر ضرور ہو   غمگین ہو یہ جو درد کا اسمین فتور ہو
پی لے جو مے دہن تو یہ نشہ میں چور ہو   مستی بدن کو پھر اسے پہلے سرور ہو
محو بکا اگر ہو تو فوارہ چھوٹ جائے
دریائے اشک باڑہ پہ ہو بند ٹوٹ جائے

خواب اکثر اسکو غیب کی باتیں بتاتے ہیں   جنکا نہو گمان وہ چیزیں دکھاتے ہیں
خواب اسکے ایک آن میں کعبہ بتاتے ہیں   بے کوڑی پیسے چین کی دیوار اٹھاتے ہیں
کیفیت اچھے خواب کی لکھوں یہ دم نہیں
تفریح طبع کیلئے جھوٹے بھی کم نہیں

سویا جو میٹھی نیند میں محمود کا پدر   دی خواب نے تولد محمود کی خبر
شاہ جہان جو ہند کا تھا شاہ نامور   دکھلائے اسکو مسجد جامع کے سقف و در
دہلی میں ٹھیک خواب کی تعبیر ہو گئی
مسجد اسی نمونہ کی تعمیر ہو گئی

ہر چیز کو بتاتی ہے کھوٹی کھری یہی   حسن و جواہرات کی ہے جوہری یہی
کرتی ہے سب کی مثل خضر رہبری یہی   جنس نفیس و خوب کی ہے مشتری یہی
الفت کا دوسرے پر اثر دیکھنے سے ہو
بچوں کو مہوشوں کو نظر دیکھنے سے ہو

دنیا کا کام کوئی نہو آنکھ اگر نہ ہو   لطف حیات نام کو بھی عمر بھر نہ ہو
ہو م بھر کسی طرح بھی خوشی سے بسر نہ ہو   بیکار آنکھ بھی ہے جو اسمیں نظر نہ ہو
قدر آنکھ کی وہ جانے اسے رو چکا ہو جو
خالق سے آنکھ پاکے نظر کھو چکا ہو جو

لازم ہے سب کو انکی حفاظت کریں مدام   فرمائیں اپنے نور بصارت کی روک تھام
سرمہ لگائیں کام لیں عینک سے صبح و شام   جسمیں نظر پہ زور پڑے وہ کریں نہ کام
آنکھوں کا ضعف شکل نمائے زوال ہے
افسوسناک موت سے بڑھکر خیال ہے

اس آنکھ کا ہے کام کہ دیکھے نہ مال غیر   فرصت جو کچھ ملے کرے علمی کتب کی سیر
کعبے کو جاکے دیکھے کرے جاکے سیر دیر   تیور بدل کے مول نہ لے ہمنظر سے بیر
عورت جو دیکھے غیر کی فی الفور بند ہو
دائم حیا پسند و مروت پسند ہو

آنکھیں ہی ہیں نعمت افق اسمیں شک نہیں   مٹی خراب ہے جو قمر میں چمک نہیں
آنکھوں بغیر حرف غم و رنج حک نہیں   کندن کا لطف خاک نہیں گر دمک نہیں
ہر آنکھ میں الٰہی بصارت کا گھر رہے
جبتک دم میں دم رہے قائم نظر رہے   افق لکھنوی

سیتا کی فریاد

تیرے ترکش میں ابھی تک او کماندار قضا!   تیر باقی تھا کوئی مجھ پر چلانے کے لیے
کم تھی وہ صحرا نوردی؟ کم تھے وہ راون جور؟   آہ! یہ ایام بھی باقی تھے آنے کے لیے
وہ زمان جان گزا جب ہر گل باغ اشوک   شعلۂ نار عقوبت تھا جلانے کے لیے
آہ! تھے اس قید میں سامان جہنم کے تمام   تھی مگر امید دل کو گدگدانے کے لیے
روکنا جاں کو نکلنے سے کہ آئیں گے ضرور   دل سے یوں کہنا کہ ہیں تیار آنے کے لیے
ہائے میں مجبور اب کس سے رکھوں چشم امید
جب ہوئے آمادہ وہ آنکھیں چرانے کے لیے

آنسوؤں کا مینہ کیوں جاری ہے آنکھیں اے تبا   تو تو کہتا تھا چلو گنگا نہانے کے لیے
کاش! گنگا تو ہمیشہ کے لیے لے لے مجھے   یوں اگر بیتاب تھی میرے بلانے کے لیے
آرزو رشیوں کے درشن کی بھی تھی بیشک مجھے   پر نہ تھی تیار اس حالت میں آنے کے لیے
کیا کہونگی؟ کیوں ہوئی آوارۂ دشت بلا   ننگ ہوں اب ہائے انکے آستانے کے لیے
داغ رسوائی جو فرضی دامن سیتا پہ ہے   مٹ ہی جاؤں کاش میں اسکو مٹانے کے لیے
ہائے وہ دل کسطرح مجھ سے مکدر ہو گیا   آئینہ تھا جو دل صافی زمانے کے لیے
جاننے والے ہیں وہ اسرار کے اول تو پھر   آتش سوزاں تھی کافی آزمانے کے لیے

رام کی خاطر زمانے بھر کو چھوڑا تھا۔ مگر — آہ مجھکو رام نے چھوڑا زمانے کے لیے
لب پہ شکوہ رام کا آئے تو کٹ جائے زبان — مجھکو پیدا ہی کیا صدمہ اُٹھانے کے لیے
بدگمان ہو رام مجھ سے یہ تو ممکن ہی نہ تھا — کس طرح آتا جو کچھ تھا پیش آنے کے لیے
مین نہ چھوڑونگی نہ چھوڑونگی خیالِ رام کو
گو مچلتا ہی رہے دامن چھُڑانے کے لیے
آہ اے صحرا کے پھولو! کس لیے ہنستے ہو تم — کسلئے ہنستے ہو تم؟ کسکو ہنسانے کے لیے
تم نہ تھے وہ رہے خندان رام کا تھا ہی گلو! — اب ہنسو گے تم کسی کو خون رُلانے کے لیے
اب نہ وہ سیتا کی آنکھین ہین نہ وہ سیتا کا دل — دل ہی اب جلنے کو آنکھین خون بہانے کے لیے
لطفِ گلگشتِ چمن صحرا مین تھا ہمراہ رام — سبزہ زار و آئی ہون اب خاک اُڑانے کے لیے
آہ اے بادِ صبا اٹھکھیلیون کے دن گئے — اب چلیگی تو کسیکی خاک اُڑانے کے لیے
دل بڑھیگا کسکا اب کالی گھٹا کو دیکھکر
آئیگی تو آئیگی بجلی گرانے کے لیے
دھرتی ماتا کھولدے آغوشِ اُلفت کھولدے — ساری دُنیا اب ہی مجھکو کاٹ کھانے کے لیے
ہین کہان اے آسمان تیرے وہ اندازِ ستم؟ — ٹوٹ پڑ طرزِ جفا کو آزمانے کے لیے
پوچھتی پھرتی ہون تیری گھر کو مرگ ناگہان
مضطرب ہی آہ! جانِ زار جانے کے لیے

تلوک چند محروم

ہاتھ

خالق نے آدمی کو دیئے ہین عجیب ہاتھ — ایسے کہان کسی کو ہوئے ہین نصیب ہاتھ
تسکین مرض کو ہوتی ہی کیا کیا مریض کے — رکھتا ہی جبکہ نبض پر اپنا طبیب ہاتھ
مسند نشین صدر ہی اِک صاحبِ وقار — باندھے کھڑا ہی سامنے کوئی غریب ہاتھ
مشہور ہو رہا ہی کہ بن جائیگا وہ کام — جس کام مین لگائے کوئی بدنصیب ہاتھ
ایجاد و اختراع زمانے مین کر گئے — کیا کیا دکھا گئے ہین ادیب و لبیب ہاتھ
دُنیا مین ہی جہان کہین ہاتھونکا ظہور — ہین کام دور دور مگر ہین قریب ہاتھ
گُل کے فراق مین نہ نکلجائے جان زار — دُنیا سے دھو نہ جابے کہین عندلیب ہاتھ
باتون مین روح پھونک رہا ہی اثر کی یہ — چارونطرف جو پھینک رہا ہی خطیب ہاتھ
رہتی ہی آرزو یہ مصنف کی رات دن — رکھے مری سخن پہ نہ کوئی ادیب ہاتھ
یک بارگی یہ کیون متلاشی پھڑک اٹھا — آئی جو کوئی بات عجیب و غریب ہاتھ
کہتا ہی ایک دوسرے سے کیا عجب ترا — لگ جائیگی زمین مجھے دو جریب ہاتھ
ہاتھ آئے چار۔ ہاتھ لگے دو کبھی کہا — دن بھر مین سچ بتا کہ لگا کیا منیب ہاتھ
گرتی ہین بجلیان سی زمان فراق پر — دیتا ہی جبکہ ہاتھ مین کوئی حبیب ہاتھ
ہی آرزو کسی کی کسی پر نثار ہو — دھن ہی کسی کو آئے ہمارے رقیب ہاتھ
اب تو نکالتے ہین فلک کو بھی راستہ — جلوہ دکھا رہے ہین بعید و قریب ہاتھ
اے اشک پُر ہوئے نہ کبھی دستِ مفلسان
پھیلائے مرگئے یونہین سب بدنصیب ہاتھ

اشک بلندشہری

رُباعیات

حق کے لیے شیخ کو ترستا دیکھا — ویرانۂ دل کبھی نہ بستا دیکھا
تھا رہگذرِ دوست مین دل ہی رہبر — کب خضر تمھارا ہمنے رستا دیکھا

گلشن سے نسیم بو اُڑا لائی ہے — سوئے ہوئے فتنہ کو جگا لائی ہے
یہ سبز پری ہے اور چھلاوا بنکر — گلفام کو کاندھے پہ اُٹھا لائی ہے

کیا کوئی سُنے غم کا فسانہ تیرا — کہہ تو ہی کہان تھا آشیانہ تیرا
نادان سمجھ اپنے کو کہ دانا۔ بلبل — لایا ہی قفس مین آب و دانہ تیرا

ہو طائرِ روح کیا ٹھکانہ تیرا — دنیا ہی سیاہ قید خانہ تیرا
کچھ بھی نہین یان شاخِ مغیلان کے سوا — وان قافِ قدس تھا آشیانہ تیرا

واعظ کا مقولہ ہے کہ عقبیٰ مل جائے — منعم کی تمنا ہے کہ دُنیا مل جائے
دُنیا عقبیٰ یہ دونون چھوڑے ہم نے — ہم تو یہی کہتے ہین کہ مولیٰ مل جائے

حمید میرٹھی

ادب اردو کا ماہوار باتصویر رسالہ

العصر

مرتبہ

پیارے لال شاکر (میرٹھی)

جلد اوّل

مارچ لغایت جولائی سنہ ۱۹۱۳ء

جس مین

ساٹھ سے زائد نامور اہل قلم کے تقریباً پچاسی مضامین

پونے تین سو صفحات مین درج ہین

اور

تیس نایاب و نادر تصاویر شامل ہین

مقام اشاعت دفتر "العصر" لکھنؤ

قیمت فی جلد

فہرست مضامین

نثر

صفحہ

صفحہ

نظم

یہ باتصویر ماہوار رسالہ، جو اُردو علم ادب کی ترقی کا اعلیٰ نمونہ ہی ہر ماہ کے آخر مین لکھنؤ سے شائع ہوتا ہے۔ ملک کے نامور اہل قلم، مُسلّم الثبوت اساتذہ، اور بہترین انشا پردا ز اسے وقیع، دلچسپ، اور مفید بنانے مین سرگرم ہین۔ مضامین کی نوعیت ایسی ہی جو ہر طبقہ کے لیے دلچسپ ہو۔ کوشش کیگئی ہے کہ اس کے مضامین، نثر ہون خواہ نظم، تعلیم یافتہ مستورات کے لیے بھی اُسی قدر دلچسپ، مفید اور خوشگوار ثابت ہون جسقدر تعلیم یافتہ اصحاب اور بالغ نظر حضرات کے لیے۔

اسکی ضخامت ۵۶ صفحات ہوتی ہی اور صفحہ مین دو کالم ہونے کی وجہ سے اسمین معمولی تقطیع کے ایک سو صفحات سے زائد گنجائش رکھی گئی ہی۔ اس کے علاوہ ہر ماہ التزاماً ایک رنگین اور متعدد عکسی تصاویر دی جاتی ہین جنمین مشہور مصورونکی صناعی کے نمونے، مشاہیر حضرات کے فوٹو، تاریخی عمارات کے نقشے، اور دیگر دلچسپ واقعات کے مرقعے ہوتے ہین۔ بعض تصاویر کے متعلق مشہور شاعرونکی نظمین بھی حاصل کی جاتی ہین، جو تصویر کی دلکشی کو دوبالا کر دیتی ہین۔ قدر دانون کی ترقی کے ساتھ ساتھ اسکے حجم اور تصاویر کی تعداد مین اضافہ ہوتا رہیگا۔

تصاویر کے علاوہ اسکی لکھائی چھپائی مین بھی اعلیٰ درجے کا اہتمام کیا جاتا ہی، اور قیمتی کاغذ پر نہایت صفائی کے ساتھ تصاویر چھاپ کر اسمین اضافہ کیجاتی ہین جو اسکی مقررہ ضخامت سے علحدہ ہوتی ہین۔ بہر نوع قدر دانانِ علم ادب کے لیے ایسا پرچہ مہیا کیا گیا ہی جو کمی قیمت کے ساتھ انگریزی میگزینون سے مشابہ ہی۔

اسکی سالانہ قیمت للعہ رمع محصول ہی۔ اِس قیمت مین اِن خصوصیات کے ساتھ کوئی پرچہ نہین مل سکتا، بلکہ اس ارزانی کے ساتھ اسقدر تصاویر بھی کہین دستیاب نہین ہوسکتین۔ نظر برین معزز ناظرینِ رسالہ سے استدعا ہی کہ اگر یہ خدمات قابل قبول ہون تو علاوہ ذاتی قدر دانی کے اسکی توسیع اشاعت مین بھی حتی الامکان امداد فرمائین۔

خریداری کے لیے پیشگی قیمت آنا ضروری ہی۔ نمونہ مفت نہین بھیجا جائے گا بلکہ ۵ر وصول ہونے یا ویلو پے ایبل کی اجازت آنے پر ارسال ہوگا۔ نام اور پتہ صاف اور خوشخط لکھا جائے تاکہ پرچہ پہنچنے مین دقت نہ ہو۔

اِس رسالہ مین مذہبی مباحث اور موجودہ پالٹیکس پر کوئی مضمون نہ چھاپا جائیگا۔ ناتمام مضامین بھی نہین لیے جائینگے۔ جس مضمون کے ساتھ تصویر کی ضرورت ہو اُسکا مضمون نگار حضرات خود بندوبست فرمائین۔

طلبا، اور کم استطاعت اصحاب کے لیے "العصر" کا ایک سستا اڈیشن بھی شائع ہوتا ہی۔ اسمین صرف ایک تصویر ہوتی ہی اور کاغذ ایوری فنش کے بجائے دیسی استعمال کیا جاتا ہی۔ اسکی سالانہ قیمت سے رمع محصول ہے۔

جملہ خط و کتابت پتہ ذیل پر ہونی چاہیے:

پیارے لال شاکر (میرٹھی) مالک و اڈیٹر رسالہ العصر۔ لکھنؤ

زبانِ اُردو کا نادر و نایاب ذخیرۂ کتب

علمی، ادبی، و تاریخی کتابین

علوم طبیعہ کی تاریخ (حصہ اول) علوم طبیعہ کی اُن تمام دریافتون اور ایجادون کی تشریح جو ساتوین صدی قبل مسیح سے لے کر اٹھارھوین صدی تک وقتاً فوقتاً عمل مین آتی رہین۔ سیارون، ستارون، بجلی، کہربا، برق، ہوائی وزن، چٹانون، تشریح نباتات وحیوانات، کیمیائے عضوی، کیمیائی تجربات قطب نما، نظام شمسی، حیوانات ونباتات کی درجہ بندی، فلوجستان، میجک لالٹین، آفتاب کے داغ وغیرہ مسائل کی تحقیقات کے علاوہ بتایا گیا ہے کہ مذکورہ بالا دریافتون مین قدیم وجدید حکما تالیس، فیثاغورث، بطلیموس، ارسطو، جابر بن الحسن، موسے، بیکن، کولمبس، واسکوڈیگاما، سررابرٹ بوئل، جیمس واٹ، فرینکلن، کلاڈنی، لاپلیس، شیلم وغیرہ نے کیا کیا حصہ لیا تھا مفید کتاب ہے (باتصویر) قیمت ۱۲؍

علوم طبیعہ کی تاریخ (حصہ دوم) : دریافت انیسوین صدی۔ اس مفید کتاب مین سیارون، اور ستارون کے حالات، تعرض وتموج انحلال النور، روشنی کا رنگ ورفتار، فوٹوگرافی، حرارت وقوت کے مسائل، بجلی مقناطیس وحرارت کا تعلق ومسائل، آفتاب کے داغ، گیس کے ذرات اور اُن کی تحلیل، تجربہ کہربائیہ، کیمیاوی نسبت، اجزائے مرکبات، تبدیل صورت وتولید، علم حیوانات، مسائل علم الارض وعلم ترکیب جزئیات کے متعلق نہایت تفصیل اور تشریح کے ساتھ بحث کرکے تمام مسائل ذہن نشین کئے گئے ہین۔ علاوہ ازین انیسوین صدی کے تقریباً تمام سائنس دانون مثل سرجان، ہرشل، سرولیم ہرشل، ہمفری ڈیوی، فیراڈے، سٹیبک، ہرشوابی، ہلیری، ڈارون وغیرہ کی مساعی مذکور ہین جن کی حصہ دارانہ کوششون کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ قیمت ... ... ۱۲؍

عجیب وغریب صدی ۔ دی ونڈر فل سنچری ریڈ مصنفہ الفریڈ رسل والس کا اُردو ترجمہ۔ اس کتاب کو عجائبات روزگار کا میوزیم (عجائب گھر) کہنا چاہئے۔ اس مین وہ تمام باتین بڑی خوبی سے بیان کی گئی ہین جو انیسوین صدی مین حکمت نے ایجاد یا تحقیق نے ظاہر کی ہین حرارت روشنی، اور برق نے جو عجیب کام بری اور بحری دنیا مین کئے ہین وہ عالمانہ طور پر اس مین مندرج ہین۔ علاوہ برین آتش فشان پہاڑون، اجرام فلکی، علم الارض، اور مسئلہ ارتقاء کے متعلق بھی کافی معلومات بہم پہنچائے گئے ہین حجم ۲۰۰ صفحات قیمت ۶؍

سورج چاند ستارے ۔ اجرام فلکی کے متعلق ایک نہایت دلچسپ اور مفید کتاب جسمین چاند سورج، ستارون، سیارون، دمدار تارون ٹوٹنے والے تارون کی زمین سے دوری، اُنکی وسعت، جسامت، باہمی تعلقات گردش، کیفیت اثرات، روشنی، حرارت، برودت وغیرہ معمولی کیفیات تحریر کرنے کے علاوہ بعض ایسی باتین بیان کی گئی ہین جو بالکل نئی معلوم ہوتی ہین زمین پر رہکر آسمان کی سیر کرنا منظور ہو تو اس کتاب کو ملاحظہ فرمائین۔ حجم ۲۰۰ صفحات قیمت صرف ۸؍

حیات شمع ۔ جسمین شمع کی لو، روشنی، شمع کے لئے ہوا کی ضرورت، شمع کے جلنے سے کون کون اشیاء پیدا ہوتی ہین، شمع کے جلنے اور عمل تنفس کی مشابہت، کوئلہ، کوئلہ کی گیس، کاربونک ایسڈ ہیڈروجن، نائٹروجن، آکسیجن وغیرہ کے افعال وخواص اور وزن وماہیت وغیرہ کے مفصل حالات درج ہین۔ قیمت ... ... ۶؍

پھولون کی کہانی ۔ جسمین پھول کے اعضا افعال، خواص، بناوٹ، اصطلاحی نام، درجہ بندی تولید، شادی بیاہ کرنے، کھانے پینے، رہنے سہنے وغیرہ کے مفصل اور دلچسپ حالات درج ہین (باتصویر) قیمت ... ... ۵؍

ہوائی کرہ کے عجائبات ۔ اس مین یہ بتایا گیا ہے کہ ہمارے چار و طرف کیا ہو رہا ہے اس کے مطالعہ سے علمی تحقیقات کی خواہش اور شوق پیدا ہوگا۔ قیمت ... ... ۲؍

مشرق کی نابود شدہ تہذیب ۔ کتاب کیا ہے، ایک عبرت کا دفتر ہے! یا یون کہو کہ مشرق کی نابود شدہ تہذیب کا ہو بہو مرقع، جسمین یہان کی نہایت قدیم قومون کے عروج وزوال کی تصویر صاف صاف نظر آتی ہے۔ نہایت قدیم اقوال مثلاً عینکی، حتی، بابلی، خالدی، اسوری، عرب، ایرانی، مصری، یہودی وغیرہ کے وہ تمام دلچسپ اور تاریخی حالات قلمبند کئے گئے ہین جو تہذیب وشائستگی کا پہلا معیار سمجھے جاتے ہین قیمت ۱؍

اصول پالیٹکس ۔ تعریف نام سے ظاہر ہے جو لوگ پالیٹکس سے زیادہ دلچسپی رکھتے ہین، مناسب ہے کہ وہ اس کتاب کو زیر مطالعہ رکھین قیمت ۸؍

گورنمنٹ انگریزی کے اصول و طریق حکومت اس کتاب مین انگلستان کا طرز حکومت، نظم ونسق حقوق وفرائض واختیارات، ہوس آف لارڈز اور ہاؤس آف کامنز، مجلس وزراء اور اُس کے اصول، وزارت، دربار شاہی، پارلیمنٹ مین مجلس وزراء کی جوابدہی، پارلیمنٹ کی حکمرانی وغیرہ کے مفصل حالات درج ہین جن کا جاننا اہل ہند کیلئے

المشتہر:۔ سکرٹری منروا پبلشنگ کمپنی، لکھنؤ (اودھ)

نہایت ضروری ہے۔ قیمت ۸ر

مرقع پارلیمنٹ انگلستان - یہ کتاب مفید اور جدید معلومات کا بے نظیر ذخیرہ ہے جسمین شاہِ انگلستان کے اختیارات و بے اختیاری بادشاہ اور پارلیمنٹ کے حقوق و فرائض شاہی مہر، پارلیمنٹ کی تاریخ و مباحث وغیرہ کے مفصل حالات درج ہین۔ قیمت ۸ر

قدما کی حکمت - لارڈ بیکن کی مشہور و معروف کتاب "وزڈم آف دی انشینٹس" کا ترجمہ نہایت دلچسپ و قابل مطالعہ۔ قیمت ۶ر

قدیم یونانیون کا علم الاصنام - تعریف نام سے ظاہر ہے (باتصویر) قیمت ... ۱۲ر

میرے رہنے کا گھر - جسم انسانی کا حال (باتصویر) قیمت ۲ر

صفائی کی ضرورت - تعریف نام سے ظاہر ہے۔ قیمت ۲ر

الیڈ اور اوڈسے - یونان کے ملک الشعرا ہومر کی مشہور نظمون کا قصہ۔ الیڈ مین ٹرائے (واقع ایشیائے کوچک) کی مشہور جنگ اور اسکی بربادی کے حالات اور اکلیس رستم یونان کے کارنامون کا ذکر ہے۔ اوڈسے مین ایک یونانی بادشاہ یولیسس کے سفر و سیاحت اور مصائب کے حالات ہین جنکو ہمارے بہت سے مشرقی قصون کا رہنما سمجھنا چاہیئے۔ شروع مین ہومر کی مختصر سوانحعمری بھی درج ہے۔ قیمت ۱۲ر

ورجل کی نظم اینیڈ - اس کتاب مین ورجل کی مشہور و معروف تاریخی نظم اینیڈ کا قصہ درج ہے (باتصویر) قیمت ۸ر

مکالمات افلاطون - تعریف نام سے ظاہر ہے۔ نہایت دلچسپ و قابل مطالعہ کتاب ہے۔ قیمت ۹ر

رہنمائے تعلیم - یہ کتاب نولسن صاحب کی نہایت مفید اور بکار آمد کتاب "سینچری اسٹوڈنٹس گائیڈ" سے تیار کی گئی ہے۔ اس مین تعلیم کے اصناف اور بہترین طریقون پر بڑی خوبی اور جدت سے بحث کی گئی ہے۔ معلمین و متعلمین دونون کے کام کی چیز ہے۔ قیمت ۱۲ر

تاریخ مذہب - یہ کتاب مختلف انگریزی کتابون سے تالیف کی گئی ہے۔ اس مین مذہب کی ابتدا اور ترقی کا حال مندرج ہے۔ بڑے بڑے مذاہب مثلاً بابلی، اسوری، مصری، چینی اور دیگر ممالک و اقوام کے مذاہب کی مختصر تاریخ بھی درج ہے۔ قیمت ۸ر

تاریخ مصر قدیم - اس مین زمانہ قدیم کے مصریون کے عروج و زوال کے اسباب، معرکہ آرائیان فتوحات، علوم و فنون، رسم و رواج، علم الاصنام اور دیگر مفید و دلچسپ اور عجیب و غریب حالات درج ہین۔ قیمت ۸ر

تاریخ یونان - اس مین یونانیون کے عروج و زوال کے اسباب، معرکہ آرائیان اور فتوحات کے مفصل حالات درج ہین۔ قیمت ۸ر

تاریخ روم - اس کتاب مین رومتہ الکبریٰ کے عروج و زوال اور طرز حکومت کا مفصل حال درج ہے۔ قیمت ۸ر

ایک چینی سیاح کا سفرنامہ - ساتوین صدی مسیحی مین ایک چینی سیاح ہندوستان آیا تھا۔ اپنے اس سفرنامہ مین اس نے دیگر ممالک کے حالات کے علاوہ ہندوستان کا بھی کچھ حال لکھا ہے۔ قیمت ۱۲ر

مشاہیر عالم - دنیا مین جو مشہور اشخاص گذرے ہین، اس کتاب مین اُنھین کا مختصر تذکرہ درج ہے۔ یہ مجموعہ بہت ہی مفید اور تعلیم بخش ہے۔ اس کے مطالعہ سے نوجوانون مین ہمت اور رفاہ عام کے کامون کی تحریک و تشویق پیدا ہوگی۔ قیمت ۸ر

مشاہیر بہی خواہان بنی آدم - پندرہ ہمدردان بنی نوع انسان کی مختصر سوانح عمریون کا نادر مجموعہ، جس کے مطالعہ سے ہر شخص محبِ انسانی سے بھر جاتا ہے۔ قیمت ۱۰ر

طالبان حق - اس کتاب مین روم کے تین مشہور و معروف فلاسفرون یعنی (۱) سنیکا (۲) ایپک ٹیٹس، اور (۳) مارکس اوریلیس کے حالات زندگی اور نصیحت آمیز اقوال درج ہین۔ نہایت دلچسپ اور سبق آموز کتاب ہے۔ قیمت ۹ر

ناول و افسانے

آنیوالی قوم - ایک دلچسپ اور علمی ناول جسمین زمین دوز دنیا کی ایک قوم کے نہایت دلچسپ مفید اور سبق آموز حالات درج ہین۔ قیمت ۱۲ر

ڈاکٹر جے کِل اور مسٹر ہائڈ - (یا دو جسم والا آدمی) یہ ایک ریاکار شخص کی زندگی کا عجیب و غریب مرقع اور ایک سبق آموز قصہ ہے۔ قیمت ۶ر

زرّین ملک کی تلاش - چند نوجوانون کے انگلستان سے جنوبی امریکہ تک کے سفر و مصائب اور ممالک جنوبی امریکہ کے باشندون اور دیگر عجائبات کے حالات نہایت دلچسپ طور سے ناول کے پیرایہ مین بیان کئے گئے ہین۔ قیمت ۸ر

مونگے کا جزیرہ - دریائی سفر کا نہایت مفید اور دلچسپ بیان۔ قیمت ۸ر

جان ہیلیفکس جنٹلمین - اس ناول مین ایک نوجوان غریب لڑکے کے حالات درج ہین کہ کیونکر وہ ادنیٰ حالت سے محض اپنی ہمت و جوانمردی کے باعث ترقی کرکے دولت مند ہوگیا۔ نوجوانون کے لئے نہایت مفید ہے۔ قیمت جلد اول ۱۲ر جلد دوم ۱۲ر

جولیس کی کشمکش - نہایت دلچسپ اور پُر اثر ناول ہے۔ قیمت ۱۲ر

سید انشاء اللہ خان انشا

SAIYID INSHA ALLAH KHAN, "INSHA."

رسم سالگرہ کی تاریخ

(از ہز اکسیلنسی راجۂ راجایان مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر، یمین السلطنت جی۔سی۔آئی۔ای، بالقابہم)

یہ رسم قدیم زمانہ سے چلی آتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس رسم کی بنیاد آغاز مین مذہبی خیالات پر قائم ہوئی تھی اور اس کا اثر مذہبی حیثیت سے ایک قوم سے دوسری قوم مین منتقل ہوتا رہا۔

سب سے پہلے اس رسم کی ابتدا جم کے عہد مین معلوم ہوتی ہے۔ کہانیون مین اس کے متعلق تین باتین مشہور ہین :-

(۱) اوّل یہ کہ اللہ تعالیٰ نے جس روز دنیا کو پیدا کیا، وہ دن اُن لوگون مین متبرک خیال کیا جاتا تھا، اور اُس روز وہ عید منایا کرتے تھے۔ شادیانے بجاتے اور طرح طرح کی خوشیان کرتے تھے۔

(۲) دوسری یہ کہ جس دن حضرت آدم مخلوق ہوئے، اُس دن کو بھی وہ لوگ متبرک جانتے اور عید منایا کرتے تھے۔

(۳) تیسری یہ بات مشہور ہے کہ جم دنیا کی سیر کو اپنے تخت گاہ سے نکلا۔ جب آذربایجان مین پہنچا تو زرین تاج سر پر رکھکر ایک میدان مین مرصع تخت پر بیٹھا۔ آفتاب قریب غروب تھا۔ اُسکی شعاعین اُسکے تاج پر پڑین، تو معلوم ہوا کہ ایک اور آفتاب نکل آیا۔ چونکہ زبانِ پہلوی مین کرن کو شید کہتے ہین، اس لئے یہ لفظ اُس کے نام پر بڑھا دیا گیا۔ اُسوقت سے جم "جمشید" ہو گیا، اور اسکی تعظیم ہونے لگی۔

اہلِ فنیشیا مین یہ رسم قدیم الایام سے چلی آتی معلوم ہوتی ہے۔ کہتے ہین کہ ایکال بادشاہ صور کے عہد مین یہ رسم جاری تھی۔ یہ بادشاہ ڈیڑھ ہزار برس قبل از حضرت مسیح گزرا ہے، اور حضرت داؤد کا ہمعصر تھا۔ ملکہ ڈائیڈو اپنے بھائی پگمیلین کے ہاتھون صور سے بھاگ کر افریقہ چلی گئی، اور اُس نے وہان سلطنتِ کارتھیج کی بنیاد ڈالی۔ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ رسم ملکہ موصوفہ کے ساتھ صور سے افریقہ مین منتقل ہوئی ہوگی؛ اور چونکہ یونانیون نے اہل فنیشیا سے اوّل اوّل کسبِ کمالات کیا تھا، اور اُن کے مذہب پر بھی فنیشیا کا اثر پڑا تھا،

اس لئے یقین ہے کہ یونانیون نے بھی رسم سالگرہ مین انھین کا اتباع کیا ہوگا۔

اہل فنیشیا بعض دیوتاؤن کی یاد مین سالانہ جلسہ کیا کرتے تھے اور عید منایا کرتے تھے۔ یونانیون نے نئے دیوتاؤن کی پرستش شروع کی، مگر سالانہ جلسے اور جشن کی ترتیب وہی رکھی جو فنیشیا مین تھی۔

ایرین قوم مین اس رسم نے ایسا پختہ مذہبی رنگ پکڑا تھا کہ رفتہ رفتہ ہرمنی وزیشی کی سالگرہ گویا مذہبی لوازم مین داخل ہوگئی۔ ممکن ہے کہ انہون نے اپنے ایرانی بھائیون سے اس رسم کو اخذ کیا ہو۔ مگر اسکی کوئی صریح دلیل معلوم نہین ہوتی۔

رومانیون مین اس رسم کا یونان کی طرف سے آنا پایا جاتا ہے جولین، شہنشاہ روم، کے عہد مین یہ رسم نہایت دھوم دھام سے ہوتی تھی۔ لوگ عمدہ پوشاک پہنتے، جلوس نکالتے، آپس مین ملتے، ایک دوسرے کو تحفے دیتے تھے۔ اور تمام ممالک محروسہ مین اس خوشی کی تعطیل ہوتی تھی۔

عیسائیون مین بھی یہ رسم مذہبی حیثیت سے شروع ہوئی ہے پچیسوین دسمبر کو جو حضرت مسیح کی پیدائش کا دن ہے، خوشی مناتے ہین۔ اس رسم کو پوپ ٹیلس فورس نے سنہ ۱۳۸ء مین جاری کیا تھا۔

عربون مین اس رسم کا اثر معلوم نہین ہوتا۔ بنی اُمیہ و بنی عباس دونون حکومتون مین، اس رسم کا پتہ نہین چلتا۔ قیاس کیا جاتا ہے کہ ہجرت کی ساتوین صدی مین جنگِ صلیبی کے وقت ارضِ مقدس پر عیسائیون سے جو دو صدیون تک میل جول رہا ہے، اُس سے مسلمانون نے یہ رسم اختیار کی ہو تو کوئی تعجب نہین ہے۔ مگر مذہبی حیثیت سے جہان تک خیال کیا جاتا ہے مسلمانون مین یہ رسم زمانۂ دراز سے جاری ہے۔ مجلس مین میلاد شریف کے جلسے اور اولیاء اللہ و اکابر اسلام کے روز پیدائش کی تعظیم اگلے وقت سے چلی آتی ہے۔

مغلون نے اس رسم کو تاتاری ترکون سے لیا، اور خاندان چغتائیہ پر ہندوؤن کا بہت اثر پڑا۔ اُس خاندان مین یہ رسم ادا کرنے کی اسقدر دھوم ہوتی تھی کہ غیر ممالک کے سیاح اور سفرا کی آنکھین خیرہ ہوجاتی تھین۔ امراے دربار اپنی نشست کی جگہ کو نہایت اہتمام سے آراستہ کرتے اور خود بادشاہ سلامت دربار مین جلوہ افروز ہوتے تھے۔ ہرطرح کا سامان عیش فراہم کیا جاتا تھا۔ دور دور سے رجواڑے اور صوبہ دار اس جلسے مین شریک ہونے کو حاضر دربار ہوتے تھے اور نذر گذران کر بادشاہ کی خوشنودی حاصل کرتے تھے۔ شاہی مکانات کی دیوارین اطلس سے منڈھی جاتی تھین۔ تجار مالامال ہوجاتے تھے۔

اس جلسہ مین "تُلادان" کی رسم بھی ادا کی جاتی تھی۔ بادشاہ اور بڑے بڑے امرا ترازو مین بیٹھتے، اور سونا چاندی جواہرات سے تولے جاتے، اور وہ سارا مال فقرا و مساکین پر صدقہ کیا جاتا۔

امرا کی عورتین محل مین دوکانین لگاتین اور شاہزادیان خریدنے کو آیا کرتی تھین۔ سب سے بڑی بات اس خرید و فروخت مین یہ ہوتی تھی کہ قیمت طے کرنے مین ایک ایک پیسہ کے لئے جھگڑا ہوتا تھا۔ آوازے کسے جاتے تھے۔ کوئی دوکان والی کہتی "کہین اور جاکر خرید لیجئے۔ آپ اِن چیزون کی قدر کیا جانین! معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی عمر ترکاری خریدنے مین صرف ہوئی ہے!" دوسری جواب دیتی ہے کہ "یہ بیگم تو بڑی گران فروش ہین، اور کسی دوکان پر چلو، جہان سستے دامون چیز مل سکے!" مگر جب قیمت طے ہوجاتی تھی تو روپیون کی جگہ اشرفیان دی جاتی تھین۔

اس رسم کا اختتام ہاتھیون کی لڑائی پر ہوتا تھا۔ دو مست ہاتھی آپس مین لڑائے جاتے تھے، اور اس تماشے کے لئے بڑا اہتمام کیا جاتا تھا۔ اب وہ رسمین تو باقی رہ گئین جنمین مذہبی اثر تھا، مگر خوشی کے وہ

سب جلسے زوالِ دولت کے ساتھ ہی گویا ہندوستان سے مفقود ہو گئے۔ رسم سالگرہ اب پھر یورپ کی طرف سے یورپین لباس میں آئی ہے۔ یورپ میں اس رسم کا ایسا رواج ہے کہ سلاطین ہی پر منحصر نہیں، ہر نامور آدمی کی چاہے وہ کسی صیغہ کا ہو سالگرہ ہوا کرتی ہے۔ اور اس سے بڑھکر یہ کہ ہر مبارک اور مفید کام کی سالگرہ ہونے کا دستور ہو گیا ہے۔ رفاہ عام کے جلسے اور بڑے بڑے فتوحات کی سالگرہ ہوتی اور خوشی منائی جاتی ہے۔

باسی روٹی اور سائنس

"باسی روٹی اور سائنس" کے مجموعۂ الفاظ پر بادی النظر میں تعجب کیا جا سکتا ہے لیکن جب اس امر پر غور کیا جائے کہ سائنس کا میدان انسانی تجربہ اور علم کے برابر وسیع ہے تو فوراً یہ بات سمجھ میں آجائے گی کہ باسی روٹی تو ایک طرف ادنٰے سے ادنٰے چیز بھی سائنس کی عالمگیر وسعت سے باہر نہیں ہو سکتی ہمیں امید ہے کہ اس مضمون کا مطالعہ نہ صرف اس تعجب کو رفع کرے گا بلکہ ایک بڑی حد تک عوام الناس کے خیالات کی اصلاح کا باعث ہوگا۔

عام قیاس یہ ہے کہ روٹی کے باسی ہو جانے کا اصلی سبب رطوبت کی کمی ہے۔ معمولی طور پر روزمرہ کی گفتگو میں یہی کہا جاتا ہے کہ خشک روٹی باسی ہو جاتی ہے اور باسی روٹی خشک ہوتی ہے۔ غرضیکہ یہ خیال ہر چھوٹے بڑے کے دل میں جاگزین ہے کہ باسی روٹی کی نمی بخارات بن کر اڑ گئی ہوتی ہے اور یہ بات اب غلط العام صحیح کا حکم رکھتی ہے موجودہ مضمون کی علت غائی اس غلطی کا ازالہ کرنا اور اس امر کی طرف توجہ دلانا ہے کہ ہر ایسے قیاس کی تصدیق حتی الامکان مشاہدات اور تجربات سے کرنی چاہئے۔ یعنی محض خیالی آرائے پر بھروسہ نہیں کرنا چاہئے۔

اب یہاں ایک ضروری سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ باسی روٹی کے متعلق جو قیاس ابھی بیان کیا گیا ہے وہ کن وجوہ پر مبنی ہے؟ کیا اس قیاس کی بنا تجربہ ہے یا یہ محض ایک رائے ہے جو سرسری اور سطحی مشاہدات کی بنا پر نسلاً بعد نسلاً ہمارے دلوں میں راسخ ہوتی گئی ہے حتی کہ اب یہ قیاس ایک یقین کی شکل پکڑ گیا ہے؛ اور شاید بہت سے آدمی اس تجربے سے پریشان ہوں کہ باسی روٹی کی رطوبت کی کمی میں کس طرح کوئی شک کر سکتا ہے حالانکہ ہمیشہ سے یہی بات مانی گئی ہے کہ پانی کی قلت روٹی کے باسی ہونے کا اصلی سبب ہے۔

جس سوال کا ذکر ہمنے ابھی کیا ہے فی الاصل اسی کے جواب پر شک کی حقیقت یا استعجاب کی معقولیت منحصر ہے۔ آج سے دو سو برس پہلے حرارت کو ایک مادی چیز سمجھا جاتا تھا اور خیال کیا جاتا تھا کہ ایک جسم گرم ہونے کی حالت میں بہ نسبت سرد ہونے کی حالت کے زیادہ بھاری ہوتا ہے۔ ہوا کی نسبت یہ غلط خیال مشہور تھا کہ اس کا وزن نہیں ہوتا اور کوئی معقول وجہ ان خیالات کے لئے متقدمین کے پاس نہ تھی۔

یہ سب قیاسی باتیں تھیں۔ کسی نے کبھی انکی علمی تصدیق کی ضرورت محسوس نہ کی تھی، کیونکہ ان کے نزدیک یہ بالکل صاف سیدھی باتیں تھیں۔ لیکن جب تجربہ کی بنیاد مضبوطی کے ساتھ قائم ہو گئی اور ایک فرانسیسی محقق لیوائزیر نے ترازو کے صحیح استعمال کی بنیاد ڈالی تو نازک ترازوؤں کے ذریعہ سے یہ بات عملاً دیکھی گئی کہ اگر ایک گرم

جسم مثلاً سرخ لوہے کے گولے کو ترازو کے ایک پلڑے میں رکھ کر دوسرے پلڑے میں اس کے ہموزن باٹ رکھے جائیں حتی کہ ترازو کی ڈنڈی سیدھی ہو جائے تو ٹھنڈا ہونے پر بھی ڈنڈی سیدھی رہیگی۔ کوئی فرق نظر نہیں آئے گا۔ ایک ایسے نازک تجربہ کے لئے معمولی ترازو سے یقین حاصل نہیں ہو سکتا اس لئے کہ وہ تھوڑے سے وزن کے تغیر تبدل کو ظاہر نہیں کر سکتی۔ اس کام کے لئے خاص ترازو جن کو کیمیائی ترازو (کیمیکل بیلنس) کہتے ہیں درکار ہوتے ہیں۔ ان میں رگڑ کو بالکل معدوم کیا ہوتا ہے اور بجائے اس کے کہ ڈنڈی کی کجی یا سیدھے پن کو مشاہدہ کیا جائے ڈنڈی سے عمودوار ایک پتلی نوکدار لمبی سوئی (جسے اصطلاح میں پوائنٹر کہتے ہیں) کی حرکت ایک پیمانہ کے سامنے دیکھی جاتی ہے جب یہ سوئی پیمانہ کے صفر درجہ پر کھڑی ہوتی ہے تو دونوں پلڑوں میں ایک سا وزن ہوتا ہے۔ نیز ایسی ترازو ہاتھ میں لیکر استعمال نہیں کی جاتی کیونکہ ہاتھ کبھی کامل طور پر ساکن نہیں رہ سکتا اور ہاتھ کی جنبش صحیح تولنے کی منافی ہے۔ بلکہ زیادہ صحیح تجربوں کے لئے ایسے نازک ترازو ایک خاص تولنے کے کمرہ میں مٹی پتھر کی سلوں پر جو دیوار میں نصب ہوتی ہیں رکھے جاتے ہیں اور ہرطرح کی ممکن احتیاط کی جاتی ہے کہ اس کمرہ کی سطح چھت یا دیواروں میں کسی طرح کی جنبش پیدا نہو۔ علاوہ ازیں بجائے اس کے کہ ترازو کو کھلی ہوا میں رکھا جائے جہاں ہوا کے جھونکے اسکی ڈنڈی اور سوئی کو ہر وقت ہلاتے ہیں، اس کو شیشہ کے صندوق میں بند کیا جاتا ہے جس کے سامنے کا ڈھکنا حسب ضرورت اوپر اٹھایا جا سکتا ہے مختصراً ایک صحیح اور نازک ترازو کی ضروریات یہ ہیں جو کہ ہم اوپر بیان کر آئے ہیں۔ اور اگر ان ہدایات کے مطابق عمل کرکے کوئی چیز تولی جائے تو اسکا وزن آج کل کی قیمتی ترازوں کے ذریعہ سے رتی کے ہزارویں حصہ تک صحیح طور پر دریافت کیا جا سکتا ہے۔ ہمارے ہندوستانی جوہری بھی جنھیں نہایت قیمتی چیزیں میزان کرنا پڑتی ہیں ان باریکیوں کا خیال نہیں رکھتے اور افسوس کی بات ہے کہ عام طور پر ہمارے ملک کا یہ شیوہ ہے کہ کسی علمی چیز سے عام طور پر روزمرہ کی زندگی میں فائدہ حاصل نہیں کیا جاتا۔

یہ ایک جملہ معترضہ ترازوؤں کی تشریح کے متعلق تھا۔ ایسے صحیح ترازو سے اگر ایک برتن کو تولا جائے تو وزن میں بین فرق نظر آئے گا۔ اسیطرح باسی روٹی کے متعلق جو عام قیاس ہے اگر اسکی تصدیق ترازو کے ذریعہ سے کی جائے تو جو نتیجہ مرتب ہوگا وہ قابل سماعت ہوگا۔ محض ظن سے کوئی فائدہ نہیں حاصل ہوتا۔ مثال کے طور پر ہم یہاں ایک اور معمولی غلطی کا بیان کرنا مناسب سمجھتے ہیں موم بتی جب جلائی جاتی ہے تو اس کے اجزا جل کر ہوا میں ملجاتے ہیں اور عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ بتی کے بعض حصے جل جانے سے وزن میں کمی واقع ہوئی ہے۔ لیکن آج کل سائنس کی ابجد پڑھنے والا بچہ بھی اس امر کا ثبوت دینے کے لئے تیار ہے کہ نہیں بتی جلنے سے وزن میں کوئی کمی نہیں ہوتی بلکہ برعکس اس کے اگر پانی اور کاربانک ایسڈ گیس کو جو جلنے سے پیدا ہوتے ہیں کھلی ہوا میں ضائع نہ ہونے دیا جائے تو وہ بتی کا باقی حصہ اور جلنے کا نتیجہ، پانی اور کاربانک ایسڈ کا مجموعی وزن، اصلی بتی سے زیادہ ہوتا ہے۔ اور ایسا ہونا بھی چاہئے کیونکہ جلنے کے عمل سے بتی کے اجزا کاربن اور ہائیڈروجن کے ساتھ ہوا کا ایک جزو آکسیجن مل گیا ہے۔

سائنس کا دستور العمل یہی ہے کہ اس کے مطالعہ کرنے والے کسی بات کو بغیر کافی شہادت کے محض قیاسی طور پر نہیں مانتے۔ وہ ہر بات کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں اور جہاں تک ممکن ہو اپنے مشاہدات اور تجربہ کی تطبیق کرنے کی کوشش کرتے ہیں جب بہت سے صحیح اور معتبر مشاہدات جمع ہو جاتے ہیں تو بجائے

اس کے کہ ان کو علیحدہ علیحدہ طور پر یاد رکھا جائے اُن سب مشاہدات کو ایک لڑی مین پرو دیا جاتا ہے اور مختصر مگر پُر معنی الفاظ مین ان سب کا احاطہ کر دیا جاتا ہے۔ اس مختصر بیان کا نام اصطلاح مین "سائنس کا قانون" یا "قانونِ قدرت" ہوتا ہے۔ یہ ضروری نہین ہے کہ انسان کے دریافت کردہ قوانینِ قدرت حقیقی قوانین قدرت سے بالکل مطابق ہون۔ انسان جو کچھ کر سکتا ہے وہ صرف یہ ہے کہ محدود تجربہ و مشاہدات کی بنا پر ایک کلیّہ قایم کرتا ہے جسے اصطلاح مین نظریہ یا تھیوری کہا جاتا ہے۔ گویا ہم اپنے محدود مشاہدات و تجربہ کو غیر محدود بنانے کی کوشش اور اپنے علم کی حدود سے تجاوز کرتے ہین۔ علم کی حدود سے باہر جانا ممکن ہے کہ ٹھیک سمت مین ہو لیکن یہ یقینی طور پر نہین کہا جا سکتا کہ ہمارا ہر کلیہ یا نظریہ صحیح ہوگا کیونکہ اسکی صحت اور عدم صحت اسی حد تک جانچی جا سکتی ہے جہان تک ہمارے تجربات یا مشاہدات کام دیتے ہین۔ ہر ایک استقرار مین یہ نقص ضرور ہوتا ہے۔ مثلاً ہم ہمیشہ سے اور ہم سے پہلے ہمارے آباؤ اجداد یہ دیکھتے آئے ہین کہ لوہا اور لکڑی انسانی حواس کے لئے دو جداگانہ چیزین ہین اور ان مین خاص خاص خاصیتین ہین۔ اس جمع شدہ تجربہ کی بنا پر ہم یہ کہتے ہین کہ لوہے اور لکڑی کے یہ یہ خواص ہین اور کبھی شبہ تک نہین کرتے کہ ہمارے اس بیان مین کوئی نقص ہے یا نہین لیکن کون ہے جو دعوے سے یہ کہدے کہ آئندہ زمانہ مین بھی لوہے اور لکڑی کے خواص یہی رہینگے جو آج یا آج سے پہلے رہے ہین۔ سورج ہر روز مشرق سے طلوع کرتا ہے اور ہمارا ظنِ غالب یہ ہے کہ کل بھی اسی طرح مشرق سے طلوع کرے گا۔ لیکن دعوے کے ساتھ نہین کہا جا سکتا کہ ضرور ہی ایسا ہوگا۔ ہان اگر کل بھی مادہ، فضا اور وقت کے قوانین وہی رہین جو آج تک رہے ہین تو امید کی جا سکتی ہے کہ کل بھی ایسا ہی ہوگا جیسا کہ آج تک ہوتا رہا ہے۔

کسی نظریہ کے بنانے کے بعد اس کے کلیہ مین سے استدلال کیا جاتا ہے اور خاص خاص نتایج بطور پیشین گوئی کے بیان کئے جا سکتے ہین از ان بعد اگر تجربتہً ان استدلالات کی تصحیح ثابت ہو جائے تو ہمارا نظریہ اس حد تک اور زیادہ صحیح مانا جائے گا اور اگر استدلال اور تجربہ مین فرق نظر آئے تو پھر وہ نظریہ نظرِ ثانی کا محتاج ہوگا اور اس مین مناسب تبدیلی کی جائے گی۔ چیزون کے زمین کی طرف گرنے چاند کے زمین کی کشش کے تابع ہونے اور اور ایسے ہی مشاہدات کی بنا پر نیوٹن اعظم نے تجاذبِ مادی کا ایک عالمگیر قانون بیان کیا۔ دو حساب دانون نے پیرس اور کیمبرج مین اپنی آرام کرسیون پر بیٹھے بیٹھے اس قانون کی بنا پر یہ اندازہ لگایا کہ نظامِ شمسی مین سورج سب سے زیادہ بعید سیارہ سے بھی پرے ایک اور سیارہ ہونا چاہئے جس کا حجم اتنا ہوگا وزن اتنا ہوگا، اور جس کا بُعد اتنا ہوگا وغیرہ وغیرہ۔ تھوڑے عرصہ بعد علمِ ہیئت دانون نے اپنی زبردست دوربینون کی مدد سے اس حیرت انگیز پیشین گوئی کی تصدیق کی اور حساب کی مدد سے انسانی آنکھون نے سب سے پہلی دفعہ ایک ایسی چیز دیکھی جس کا علم سوائے خدا کے اور کسی کو اُس وقت تک نہین تھا۔ اس تصدیق سے نیوٹن کے قانون تجاذبِ مادی کو مزید تقویت حاصل ہوگئی اور یہ ثابت ہوگیا کہ یہ قانون ایک بڑی حد تک اس حقیقی قانون کے مطابق ہے جو مادی چیزون کی باہمی کشش پر حکمران ہے۔ لیکن ہو سکتا ہے کہ کل ایسے تجربات یا مشاہدات سے ہمین واسطہ پڑے جو اس قانون کے تابع نہ ہو سکتے ہون تو اس حالت مین اس قانون مین تبدیلی کرنا پڑے گی۔ قصہ مختصر یہ کہ انسان کا علم کبھی آخری اور انتہائی منزل تک نہین پہنچ سکتا۔ نت نئے مشاہدات اسکی معلومات مین اضافہ کرتے رہتے ہین اور انسان اپنے زعم مین ظاہرا طور پر تو بہت کچھ جانتا ہے لیکن حقیقی طور پر اُسے بہت کم واقفیت ہے

لیکن پھر بھی دنیا کے کاروبار اسی طرح چل سکتے ہین کہ انسان اپنے حواس کی شہادت پر یقین کرے اور اپنے گردوپیش کے حالات کو اپنے سابقہ علم کی بنا پر تشریح کرنے کی کوشش کرے۔ یہ تشریح ہم پھر کہتے ہین کہ انسان کو کبھی اصلی اور حقیقی معرفت نظام عالم کے متعلق نہین بہم پہنچا سکتی ہے۔ یہ قانون دریافت کرنے کے بعد کہ چیزین کس رفتار سے زمین کی طرف گرتی ہین اور اجرام سماوی کس طرح ایک عالمگیر نظام کے افراد ہین ہم یہ ہرگز نہین بتا سکتے کہ چیزین کیون زمین کی طرف گرتی ہین؟ یا زمین مین کشش کیون ہے؟ ایک دوسری بات یاد رکھنے کے قابل یہ بھی ہے کہ چیزین اس لئے زمین کی طرف نہین گرتین کہ نیوٹن اعظم نے ایک قانون بیان کر دیا ہے کیونکہ نیوٹن کے وقت سے پیشتر بھی جب کہ کسی کو اس قانون سے اطلاع نہ تھی چیزین اسی طرح زمین کی طرف گرتی تھین۔ وقس علی ہذا۔

یہ دوسرا جملۂ معترضہ ارادۃً ہم نے علمی تشریح کے صحیح معانی سمجھانے کی خاطر باسی روٹی کے مضمون مین داخل کر دیا ہے، اور ہم امید کرتے ہین کہ ناظرین اگر اس مضمون کو اخیر تک مطالعہ کرین گے تو یہ دونون جملہاے معترضہ باسی روٹی کے نقطۂ خیال سے بھی لایعنی تضیع اوقات نہ سمجھے جائین گے۔ ہم ذکر کر رہے تھے کہ عام قیاس باسی روٹی کے متعلق رطوبت کی کمی ہے لیکن چونکہ یہ کسی تجربہ کی بنا پر نہین ہے اس لئے اسکی صحت یا عدم صحت کے متعلق اسوقت ہم کچھ نہین کہہ سکتے ہان ہم یہ کہنے کے مجاز ہین کہ یقینی طور پر یہ کہنے کا حق کسی کو حاصل نہین ہے کہ روٹی رطوبت کی کمی کی وجہ سے باسی ہو جاتی ہے۔ اور اگر ایسا کہا جائے تو ایک معمولی تجربہ جو روزمرہ کے مشاہدہ مین آتا ہے اس خیال کی تردید کے لئے کافی ہے۔ اگر باسی روٹی کو ایک خاص درجہ کی گرمی پہنچائی جائے مثلاً ایک تنور مین رکھا جاسے جہان اس کا درجہ حرارت ۸۰ درجہ سنٹی گریڈ ہو جائے تو باسی روٹی عارضی طور پر پھر تازہ ہو جاتی ہے۔ گو یہ پھر بہت جلد باسی ہو جاتی ہے۔ لیکن اگر روٹی کے باسی ہونے کا سبب محض رطوبت کی کمی ہو تو پھر یہ ناممکن معلوم ہوتا ہے کہ دوبارہ گرم کرنے سے باسی روٹی پھر تازہ ہو جائے اس لئے گرم کرنے سے تو اور زیادہ رطوبت کا نقصان ہوگا جس سے بجائے تازہ ہونے کے روٹی کو اور زیادہ باسی ہو جانا چاہئے۔ جو لوگ اس مشکل کو محسوس کرین گے اُن کو واقعی طور پر روٹی کا باسی ہونا اب ایک معمہ سا نظر آئے گا۔ اور فی الحقیقت باوجود اس علمی تشریح کے جو ہم ذیل مین روٹی کے باسی ہونے کے متعلق عام فہم بنانے کی کوشش کرین گے، نرم اور لچکدار خوش مزہ تازہ روٹی کا خشک سخت اور بے مزہ باسی روٹی بن جانا ابھی تک ایک دلچسپ معمۂ لاینحل ہے۔ اگر تازہ روٹی کچھ دیر کے لئے ہوا مین رکھی جائے تو اسکی لچک بالکل جاتی رہتی ہے۔ حتی کہ پُرانی روٹی کا سفوف بنا لینا چندان مشکل نہین ہے۔ برعکس اس کے تازہ روٹی کے ساتھ یہ عمل ناممکن ہے۔ یہی وہ مشاہدات ہین جو معمولی آدمی کو یہ خیال دلاتے ہین کہ باسی روٹی مین نمی کم ہوتی ہے لیکن یہ صحیح نہین ہے ۱۸۵۲ء مین ایک مشہور فرانسیسی زراعتی کیمیا دان نے اس امر کی طرف توجہ دلائی کہ باسی روٹی مین رطوبت کی مقدار تقریباً اتنی ہی ہوتی ہے جتنی کہ تازہ روٹی مین۔ منسلکہ جدول مین اسی محقق کے چند ایک نتائج کا اقتباس درج کیا جاتا ہے۔

اس فہرست سے معلوم ہوتا ہے کہ گرم روٹی جو تنور مین سے ابھی ابھی نکالی گئی ہو ٹھنڈا ہونے پر صرف اپنے مجموعی وزن کا ایک فیصدی حصہ ضائع کرتی ہے اور اس کے بعد پانی کی تبخیر سے وزن مین مزید نقصان بہت کم ہوتا ہے اور بالاخر ایک ہفتہ کے بعد جب روٹی ٹھیک طور پر باسی ہو جاتی ہے رطوبت مین سے صرف دو فیصدی حصہ ضائع ہوتا ہے۔ لیکن یہ امر غور طلب ہے کہ معمولی روٹی مین ۲۵ سے ۴۵ فیصدی پانی ہوتا ہے اور اس مین سے صرف دو فیصدی

پانی کا اتلاف روٹی کے باسی ہونے اور اس زبردست انقلاب کے وقوع پذیر ہونے کے لئے (جو تازی سے باسی روٹی مین آجاتا ہے) کفایت نہین کرسکتا۔

انشاءاللہ العزیز اسی جدول کے سلسلہ مین ہم اگلے مضمون مین اپنے مشاہدات مکمل کرکے مختلف قسم کی روٹیون کے متعلق درج کرینگے۔ جن اصحاب کو اس مضمون سے زیادہ دلچسپی ہو ان کو چاہئے کہ بجائے خود نہ صرف ان مشاہدات کی علمی تصدیق کرین بلکہ اور کئی اقسام کی روٹیون کے متعلق بھی مشاہدات جمع کرین اور ان سے معنی خیز نتائج نکالین۔

فرانسیسی محقق کا جدول باسی روٹی کے متعلق

تاریخ	وقت	روٹی کا درجہ حرارت (سنٹی گریڈ پیمانہ پر)	کمرہ کا درجہ حرارت (سنٹی گریڈ پیمانہ پر)	روٹی کا وزن (کلوگرام مین)
۱۲ جون	۹ بجے صبح	۹۷٫۰	۱۹٫۰	۳٫۷۶۰
	۱۱ "	۶۸٫۰	۱۹٫۱	
	۱ دوپہر	۵۰٫۲	۱۹٫۰	۳٫۷۳۵
	۵ سہ پہر	۳۱٫۶	۱۸٫۷	
	۱۰ رات	۲۳٫۰	۱۸٫۳	
۱۳ جون	۷ بجے صبح	۱۸٫۸	۱۸٫۱	۲٫۷۳۰
	۲ بجے دوپہر	۱۸٫۰	۱۸٫۰	
۱۴ جون	۹ بجے صبح	۱۷٫۰	۱۷٫۴	۳٫۷۲۷
۱۵	"	۱۶٫۱	۱۶٫۵	۳٫۷۱۲
۱۶	"	۱۵٫۸	۱۶٫۳	۳٫۷۰۰
۱۷	"	۱۵٫۸	۱۶٫۳	۳٫۶۹۶
۱۸	"	۱۵٫۸	۱۶٫۳	۳٫۶۹۰

ایک کیلوگرام تقریباً ایک سیر کے برابر ہوتا ہے گویا روٹی کا وزن جس پر یہ تجربہ کیا گیا تھا تقریباً پونے چار سیر تھا۔ اتنی وزنی روٹی مین صرف ایک چھٹانک وزن کی کمی ایک ہفتہ کی تبخیر کے بعد واقع ہوئی اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ ہماری معمولی استعمال کی روٹی جو کہ پون چھٹانک سے ۲ چھٹانک تک وزنی ہوتی ہے اس مین کتنی کمی واقع ہوگی اور اس لئے کسقدر صحیح مشاہدات کی ضرورت ہے۔

فرانسیسی محقق کے مشاہدات کے بعد جب یہ بات قطعی طور پر تسلیم کرلی گئی کہ روٹی کا باسی ہونا نمی کی کمی کی وجہ سے نہین ہوتا تو اس امر کی جستجو پیدا ہوئی کہ حقیقی سبب دریافت ہو۔ یہ ظاہر ہے کہ یہ نمایان تبدیلی روٹی کے طبعی یا کیمیائی ترکیب مین کسی نامعلوم تبدیلی کے پیدا ہونے سے ہوتی ہے لیکن اس سے زیادہ اور کسی بات کا پتہ زمانۂ حال تک نہ چل سکا۔ اب ایک جرمن سائنسدان ڈاکٹر جے این کاٹنر نے ایک جرمن رسالہ "دی اُم شاؤ" مین اپنی علمی تحقیقات باسی روٹی کے متعلق شائع کی ہین جس سے ایک حد تک حقیقت کے چہرہ سے نقاب اُٹھائی گئی ہے۔

ڈاکٹر کاٹنر کی رہنمائی اسی مشاہدہ نے کی ہے جس کا ذکر ہم اوپر کر آئے ہین یعنی اگر باسی روٹی کو کچھ دیر کے لئے[1] سے ۸۰ درجہ سنٹی گریڈ کی حرارت پہنچائی جائے تو ٹھنڈا ہونے پر اس مین اسکی اصلی تازگی عود کر آتی ہے۔ اور اس مین اور تازہ روٹی مین صرف یہ فرق باقی رہ جاتا ہے کہ یہ جلدی سے دوبارہ باسی ہوجاتی ہے[2]

---

[1] ہم نے اپنے ایک دوسرے مضمون "مسئلۃ الحیات والحرارت" مین جو کہ عنقریب جبلپور کے نئے علمی رسالہ "متین" مین شائع ہوگا درجہ حرارت کے مختلف پیمانون پر اور باسی روٹی کے تازہ کرنے کے مختلف وسائل پر ایک مفصل یادداشت لکھی ہے جو موجودہ مضمون کے لئے بھی مفید ہوسکتی ہے۔

[2] اس بات کا بتا دینا یہان ضروری معلوم ہوتا ہے کہ باسی روٹی کو تازہ کرنیکے لئے بہتر ہے کہ ایک [illegible] کے برتن مین گرمی پہنچائی جائے تاکہ نمی خواہ مخواہ ضائع نہو۔

ڈاکٹر کاٹنر کی علمی تشریح اس مشاہدہ کے متعلق یہ ہے کہ تازہ روٹی کا باسی ہونا اور باسی کا تازہ ہونا ایک قسم کی ایلوٹراپک تبدیلی ہے۔ ایلوٹراپک تبدیلی ایک علمی اصطلاح ہے جس سے غالباً بہت سے لوگ واقف ہین گو اس کے نام سے آشنا نہین ہین۔ یہ سب کو معلوم ہے کہ کوئلہ گریفائٹ اور ہیرا (ڈائمنڈ) ایک ہی چیز یعنی کاربن کی تین مختلف حالتون کا نام ہے۔ کاربن ایک مفرد چیز ہے۔ اسی طرح کوئلہ گریفائٹ اور لعل بھی مفرد ہین اور ان مین سوائے کاربن کے اور کوئی چیز نہین ہے۔ کیمیائی ترکیب سب کی ایک ہی ہے صرف طبعی خواص مین فرق ہے۔ اس تبدیلی کا نام جس کی رو سے ایک ہی مفرد یا مرکب چیز ایک سے زیادہ مختلف حالتون مین بغیر کسی دوسری چیز کی آمیزش کے رہ سکتی ہے، ایلوٹراپک تبدیلی ہے۔ پس ہم کہتے ہین کہ کوئلہ گریفائٹ اور ڈائمنڈ کاربن کی مختلف ایلوٹراپک حالتون کا نام ہے۔ اس قسم کی مثالین بے شمار ہین۔ مثلاً فاسفورس دو قسم کی سب کو معلوم ہے، ایک سرخ قسم اور ایک پیلی قسم۔ پیلی کو ہوا مین رکھنے سے خود بخود آگ لگجاتی ہے۔ سرخ فاسفورس اتنی آسانی سے نہین جلتی۔ ایک زہر قاتل ہے۔ دوسری بطور ٹانک (مقوی دوا) استعمال کی جاتی ہے اسی طرح گندھک کی کئی ایک ایلوٹراپک حالتین ہین۔

ڈاکٹر کاٹنر نے مرکری آیوڈائیڈ (پارہ اور آیوڈین کا مرکب) کی مثال لے کر روٹی کی ہر دو ایلوٹراپک حالتون کی تشریح کی ہے۔ ۱۲۷ درجہ سنٹی گریڈ کی حرارت تک اس مرکب کا رنگ چمکدار سرخ ہوتا ہے لیکن اس درجۂ حرارت پر پہنچکر اس کا رنگ لیمون کی طرح پیلا ہوجاتا ہے۔ گویا ۱۲۷ درجہ سے نیچے سرخ قسم اور اس سے اوپر پیلی مرکری آیوڈائیڈ کی مستقل ایلوٹراپک حالت ظاہر کرتی ہے۔ اسی طرح روٹی کے لئے معمولی درجہ حرارت پر باسی حالت روٹی کی مستقل ایلوٹراپک حالت معلوم ہوتی ہے۔ گو یہ کہنا مشکل ہے کہ کس خاص درجہ حرارت پر ایک حالت دوسری حالت مین بدل جاتی ہے۔

ڈاکٹر کاٹنر کی یہ علمی تشریح عام آدمیون کے لئے چندان دلچسپ نہین معلوم ہوتی اور ہمین ڈر ہے کہ ہم بھی اس مختصر مضمون مین اسکی کماحقہ تسلی بخش علمی تشریح نہین کہ سکتے۔ لیکن فزیکل کیمسٹری کے طلبہ کے لئے ڈاکٹر کاٹنر کی تشریح بہت زیادہ قابل قدر اور اہم ہے۔

ہم باسی روٹی کے ضمن مین بہت سی اور مفید باتون کا مثلاً گلوٹن اور نشاستہ کے طبعی اور کیمیائی خواص کا جن کا تعلق روٹی کے باسی ہونے سے ہے ذکر کرنا چاہتے تھے لیکن موجودہ مضمون اپنی مناسب حدود سے زیادہ لمبا ہو گیا ہے اور ابھی ہمارے اردو رسالجات کے پڑھنے والون مین علمی شغف کا وہ درجہ نہین آیا کہ ایک علمی مضمون کو متواتر کئی کئی گھنٹہ مطالعہ کرتے جائین ہمارے لئے فی الحال یہی غنیمت ہو کہ اردو دان اصحاب علمی مضامین سے دلچسپی لینی شروع کرین۔

فیروز الدین مراد

شیخ فیروز الدین مُراد۔ اس نمبر مین آپکی تصویر اس شکرگزاری کے ساتھ شائع کیجاتی ہے جو آپکی قلمی اعانت سے **العصر** پر فرض ہے اور جسمین آپ نے ابتدا ہی سے غیر معمولی دلچسپی ظاہر فرمائی ہے۔ سنہ ۱۸۸۶ء آپکا سال پیدائش ہے۔ اسوقت آپکی عمر تقریباً ۲۵ برس ہے۔ زمانہ طالبعلمی ہی سے آپکو مطالعہ وکتب بینی کا بہت شوق ہے۔ سنہ ۱۹۰۱ء مین آپ پنجاب یونیورسٹی کے امتحان مڈل مین اوّل رہے تھے، اور سنہ ۱۹۰۳ء مین انٹرنس کا امتحان دیا۔ اس مین بھی اول رہے اور اسقدر فیصدی نمبر حاصل کئے تھے کہ آپکے بعد آج تک کسی نے اتنے نمبر نہین پائے۔ ایف اے کے امتحان مین آپ دوسرے تھے اور بی اے کے امتحان مین پانچوین یا چھٹے نمبر پر تھے حالانکہ کیمسٹری کے عملی امتحان مین کسی حاسد نے آپکو زہر دیدیا تھا۔ سنہ ۱۹۰۸ء مین آپ نے علی گڑھ کالج مین علوم طبعیات کی اسسٹنٹ پروفیسری منظور فرمائی۔ سنہ ۱۹۱۰ء مین آپ نے فزکس مین ایم ایس سی (ماسٹر آف سائنس) کی ڈگری حاصل کی۔ اب آپ صیغۂ مذکور مین مزید تجربات حاصل کرنے کی غرض سے جرمن تشریف لے جانیوالے ہین (باقی ملاحظہ ہو صفحہ ۱۰۳)

شیخ فیروز الدین مُراد صاحب ایم ایس سی بی اے

SHEIK FIROZ UD DIN MURAD, B.A., M. Sc.

اثبات واجب الوجود

خدا کی ہستی قدیم الایام سے ہر ملک، ہر صدی، اور ہر قوم مین مسلم چلی آتی ہے۔ مہذب اور غیر مہذب، جاہل اور شائستہ، سب اقوام کم و بیش ایک ایسے وجود کی قائل چلی آتی ہین جو عالم و مافی العالم کا خالق، بانی، اور محرک کہا جاتا ہے۔ جن وحشی قومون کے درمیان ایک سے زائد معبود مانے جاتے ہین وہ بھی ایک دیوتا کو سب سے بڑا اور سب چیزون کا خالق مانتی ہین۔ ہمارا ارادہ ہے کہ اس مضمون مین واجب الوجود کی نسبت خیالات سے بحث کی جائے اور بتایا جائے کہ علمائے مغرب خدا کی ہستی کو کس طرح ثابت کرتے ہین اسکے ساتھ ہی اس امر پر بھی بحث ہوگی کہ یہ غلط فہمی جو پیدا ہوگئی ہے کہ سائنس کی ترقی سے اہل یورپ اور امریکہ خدا سے منکر ہوگئے ہین اس مین کتنی حقیقت اور کتنا مبالغہ ہے۔ بعد ازان ہم یہ دکھائینگے کہ ہندو دھرما تما و دوان اور مسلمان علما خدا کی ہستی کو کس طرح ثابت کرتے ہین۔ ضمناً بعض یونانی حکما کے خیالات اور استدلال کا بھی ذکر ہوگا۔

خدا کی ہستی کی نسبت علمائے مغرب کے دلائل

خدا کی ہستی کو سبھی مانتے ہین بلکہ یون کہنا بجا ہوگا کہ تمام مذاہب (بعض شاذ مستثنیات کے) عالم کے خالق اور موجودات کے مالک کے وجود کو مانتے ہین۔ ہر ایک آستک مذہب کا سب سے مقدم اصول خدا کی ہستی ہے۔ بودھ اور جین مت ہی تمام دنیا مین صرف دو ایسے مذہب ہین جو کھلم کھلا خدا کی ہستی کے منکر ہین۔ خدا کی ہستی کے قائل ہونے کے ساتھ ہی ہر بڑے مذہب کے مقلدون نے اسکی ذات، صفات، حکمت، دانائی کو جو کائنات مین نمایان ہے دیکھکر چند اصول اور مسلمات وضع کئے ہین جو اس مذہب کے الٰہیات کی جان ہین۔ منکر تو ہر ملک اور قوم اور ہر زمانہ مین پیدا ہوتے رہے ہین جو بات بات مین شک لاتے اور مذہب کے مسلمات کو بچون کا کھیل قرار دیکر اس سے صاف انکار کرتے چلے آئے ہین۔ مگر ایسے آدمیون کا شمار بہت قلیل اور بالکل محدود ہوتا ہے۔ تاہم علمائے دین اور اہل مذہب انکی دلائل در بارہ انکار خدا کی تردید اور اپنے معبود اولیٰ کے وجود کو معقول اور قابل تسلیم قرار دینے کے لئے دنیوی علوم سے کام لیتے اور انکی بنا پر استدلال کرتے ہین۔ اسی طرح مغرب کے عالمان دین نے بھی خدا کی ہستی کے ثبوت بہم پہنچائے ہین۔ یہ گذارش کردینا بھی مناسب ہے کہ مغرب کے عالمون مین بھی ایک سے زیادہ فریق ہین سب سے اول تو مسیحی مذہب کے عالم؛ دوسرے گروہ مین وہ لوگ شامل ہین جو مسیحی مذہب کو تمام وکمال تو قبول نہین کرتے مگر خدا اور مذہب کے قائل ہین؛ تیسرا گروہ ایسے عالمون کا ہے جو اوّل الذکر دو گروہون کے عقائد در بارہ خدا کو معقولیات کے پہلو سے ماننے کو تیار نہین ہے جو AGNOSTIC یعنی لا ادری کہلاتا ہے۔ اس گروہ کے لیڈرون مین سب سے اوّل ہربرٹ اسپنسر اور ہکسلے دوسرے درجہ پر آتا ہے۔

خدا کی ہستی کے دلائل

سب سے پہلے ہم مغرب کے عالمان دین کی بڑی بڑی دلائل کا ذکر کرنا چاہتے ہین جو وہ خدا کی ہستی کے ثبوت مین پیش کرتے ہین۔ واضح ہو کہ اثبات واجب الوجود پر بڑے بڑے عالمون نے معرکہ آلارا کتابین تصنیف کی ہین جنکا ذکر اس مختصر مضمون مین قریب قریب ناممکن ہے۔ اس لئے معذرت کے ساتھ اختصار پر اکتفا کرنا پڑتی ہے۔ اگر اہل فکر اور علما کی اس بحث سے تشفی نہو تو وہ

ازراہ نوازش راقم کو معاف فرمائین کیونکہ ایسے رسالہ مین اس سے زیادہ بحث محال ہے.

خدا کی ہستی کے ثبوت مین مغربی عالم اور حامیان دین حسب ذیل دلائل پیش کرتے ہین، جو مذہب فطری کے اصول وارکان ہین (۱) تاریخی دلیل شاید اسے دلیل تواتر کہنا بجا ہوگا۔ روما کے مشہور فلاسفر سسرو اور سنیکا اسے ECONSENSU GENTIUM کے نام سے پکارتے ہین۔ بالفاظ دیگر اس کا یہ مفہوم ہے کہ تمام نبی آدم خدا یا واجب الوجود کے قائل چلے آتے ہین۔ یعنی نبی نوع انسان کے متفقہ ایمان کی دلیل (۲) علت العلل یا علت اولی استدلال (۳) حسن نظام عالم (۴) علت غائی اور تجویز (۵) شعور اخلاقی (۶) حاسہ روحانی اور ذکاوت فطری۔

علاوہ ازین اور بھی کئی دلائل پیش کی جاتی ہین۔ مگر یہ سب سے زیادہ مشہور ہین۔ قدیم اور جدید فلاسفران مین سے کئی کئی دلائل کو خدا کی ہستی ثابت کرنے کے لئے پیش کرتے ہین لیکن ہمارے موجودہ مطلب کے لئے یہی کافی ہین۔ اب مناسب ہے کہ ان دلائل پر قدرے تفصیل سے بحث کی جاے اور ان کا مفہوم واضح کیا جاے۔

(۱) نبی آدم کا ایمان خدا

تمام نبی آدم جہانتک معتبر تاریخ پتہ دیتی ہے، ایک ما فوق العادت اور قادر مطلق ہستی کے قائل چلے آتے ہین۔ کوئی زمانہ کوئی قوم اور کوئی ملک اس عام ایمان سے کبھی بیگانہ اور محروم نہین رہا۔ اس کے متعلق دو باتین ذہن نشین کر لینا مناسب ہے (۱) پرانے زمانہ کے مذاہب کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ایک خدا کے قائل تھے، اور یہ کہ وہ اسے مادی دنیا سے اعلے وبالا سمجھتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی وہ اسے ماورا الدہر اور محیط عالم بھی خیال کرتے تھے خدا کی ذات کا یہ تصور مذہب کا ایک ابتدائی اور بنیادی اصول تھا۔ (۲) موجودہ عقاید اور وحشی اقوام کے دینی خیالات کی جتنی چھان بین کی جائیے اتنا ہی یہ امر زیادہ واضح ہوتا ہے، بلکہ اسے بہت تقویت پہنچتی ہے کہ ایک ما ورا الدہر وجود ہے جس سے تمام موجودات کی خلقت اور صنعت منسوب کی جاتی ہے۔

ویدون کا مذہب بہت پرانا سمجھا جاتا ہے، اور اس سے دوسرے درجہ پر زرتشتی مذہب ہے اور ان دونون کے مطالعہ سے عالمون نے یہ تسلیم کیا ہے کہ ان مین ایک وجود ازلی اور قادر مطلق کی صاف تعلیم دی گئی ہے جو موجودات کا صانع اور کائنات کا خالق ہے۔ عالم وما فی العالم ایک ما فوق العادت الہی وجود کی قدرت اور حکمت سے وجود پذیر مانی جاتی ہین۔ نہ صرف یہی مانا جاتا ہے بلکہ یہ بھی کہ وہ موجودات کا مبداء حقیقی ہے۔ گو عالم کی آفرینش کا خیال ایسا واضح اور صاف نہین ہے تاہم سارے بیان پر غور کرنے کے بعد سب چیزون کو معرض ہستی مین لانیوالا اور مسبب الاسباب خدا ثابت ہوتا ہے۔

زرتشتی مذہب کی روسے اہرمزد موجودات کا خالق بیان کیا گیا ہے وہ رب العالمین سمجھا جاتا ہے، اور اس کے مقابلہ مین اہرمن ہے جو ہر وقت اس سے برسر پرخاش رہتا ہے، اور خداوند ظلمات کے نام سے مشہور ہے۔ لیکن دونون اصولون کے پس پشت ایک قادر مطلق غیر محدود وجود ہے جس کے اشارہ سے اہرمزد اور اہرمن پیدا ہوئے تھے۔

اب ان دونون مذہبون کو چھوڑ کر اگر قدیم مصر، بابل، نینوا وغیرہ کے لوگون کے عقاید اور علم الاصنام پر غور کیا جاے تو گو ہم وہان پر ایک دو نہین درجنون مختلف دیوتاؤن سے دوچار ہوتے ہین جنکی پرستش مین ایک قسم کی زبردست رقابت نظر آتی ہے مگر تو بھی دھندلا سا اشارہ اس مضمون کا ملتا ہے کہ وہ ایک ایسے دیوتا کے قائل تھے جسنے زمین و آسمان کو ہستی بخشی اور وہ کائنات کی سرنوشت

قرار دیا جاسکتا ہے۔

یونان کے لٹریچر سے ظاہر ہے کہ شاعرون نے بہت سے دیوتاؤن کا ذکر کیا ہے۔ بعد کے زمانہ کے شعرانے ایسے وجود فرض کئے جو دیوتاؤن سے کسی طرح کم نہ تھے۔ مگران دیوتاؤن اور وجود کی نوعیت پر غور کرنے کے بعد یہ ظاہر ہے کہ وہ ایک وجود نادیدنی کے قائل تھے جو سب موجودات پر حاوی ہے۔ افلاطون کہتا ہے "آسمان اور زمین اسی کے وسیلہ سے معلق ہین"۔ گوردمیون کے ہان بہت سے دیوی دیوتا مانے جاتے تھے مگر جوپی ٹر سب سے بڑا، حاضر وناظر اور قادر مطلق دیوتا تھا۔ باقی دیوتا اس کے مظاہر اور نشان تھے

قدیم زمانہ کے ملک خالدیہ مین گو سینکڑون دیوی دیوتا تھے مگر النس کہتا ہے کہ تراسب دیوتاؤن کا مصدر اور سرچشمۂ خدائی تھا۔ چین کا بڑا گرو کنفوشس تھا۔ اس کی بابت بیان کیا جاتا ہے کہ اُسنے خدا کی بابت کچھ نہین کہا مگر یہ ظاہر ہے کہ وہ موجودات اور مظاہرات کے پس پشت ایک ناقابل فہم اور غیر مرئی قوت کا قائل تھا اور اسسے دعا کرتا تھا۔ وہ اُسے آسمان یا آکاش کے نام سے پکارا کرتا تھا۔

مگر اس وجود کی اصلیت کی بابت اس کا کوئی خاص خیال نہ تھا۔ بلکہ "شی کنگ" (مجموعہ کلیات) مین وہ ایک صاحب شخصیت اور ذی ارادہ خدا کو مخاطب کرتا ہے۔ چین کا دوسرا گرو تاؤ بھی خدا کا قائل تھا۔ پرانے زمانہ کی کسی مہذب قوم کو لے لو۔ کم وبیش خدا کا خیال اس کے ہان موجود تھا۔ بعض کے ہان صاف خیال تھا، اور بعض کے ہان صرف دھندلا سا۔ آریہ، اور تورانی، اور سامی اقوام کے عقائد خدائے واحد، قادر علے الاطلاق، خالق ارض وسما مالک ہر دوجہان کی ہستی پر شاہد ہین۔

موجودہ جاہل اقوام جو امر پرانے زمانہ کی مہذب اقوام کے عقیدہ پر صادق آتا ہے وہ موجودہ زمانہ کی جاہل اور وحشی قومون پر بھی عاید ہوتا ہے۔ افریقہ، امریکہ، اوشنیا وغیرہ مین جو وحشی اور ابتدائی قومین آباد ہین وہ کم وبیش ایک وجود مطلق کو مانتی ہین۔ گو اُن کا یہ عقیدہ بہت واضح نہین ہے اس لئے کہ عقلی طاقتین ابتدائی مرحلۂ نمو مین ہین علاوہ ازین وہ بہت سے دیوتاؤن کو بھی پوجتی ہین۔ باوجود اس کے وہ ایک سب سے بڑے دیوتا کو مانتی ہین۔

گو سرجان لبک (لارڈ اوبری مرحوم) اور سان ہلیئر فرنچ محقق کا یہ خیال ہے کہ کئی جاہل قبائل خدا کے اعتقاد سے بیگانہ ہین مگر فرانس کا ایک اور بہت ہی مشہور محقق مونسیور کاترفاژ بیان کرتا ہے کہ "میری تحقیقات اور تجسس کا نتیجہ سرجان لبک اور سان ہلیئر کے نتائج کی نقیض ہے۔ تمام بنی آدم کے حالات دریافت کئے اور ایمان خدا کا عدم وجود ادنیٰ ترین اور اعلےٰ ترین قومون کے درمیان تلاش کیا مگر سوائے بعض افراد یا فرقہ کے کہین نہ ملا"۔ یہ شخص خود اگناسٹک یعنی لاادری فرقہ کا ہے۔

(۲) علت العلل

دلیل تواتر پر قدرے طوالت کے ساتھ بحث کرنے کے بعد اب ہم دوسری دلیل کا ذکر کرنا چاہتے ہین جو علت العلل کہلاتی ہے۔ انگریزی اصطلاح مین اس کا نام AETIOLOGICAL ARGUMENT ہے۔ یعنی اسباب ونتائج کے سلسلہ پر غور اور اسکی ابتدا کا کھوج کرتے ہوئے ہم ایک علت آخری سے دوچار ہوتے ہین جو تمام مظاہر وموجودات عالم کا سبب آخری اور مبدا ثابت ہوتی ہے۔ اسباب ونتائج کے سلسلہ کی تمام کڑیان اس پر ختم ہوجاتی ہین یہانتک سمجھنا چاہئے کہ اس سلسلہ کی اول کڑی وہی ہے باقی کڑیان اسکی شاخین ہین۔

تواتر سے غور کرنے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہین کہ ہر زمانہ، ہر قوم، ہر ملک کے مہذب اور غیر مہذب، جاہل اور عالم کا ایمان

ایک ہستی اولی پر زمانہ مقدم التاریخ سے چلا آتا ہے جو عالم وما فی العالم کا خالق اور مبداء اولی ہے۔ تمام چیزین اپنی ہستی کے لئے اسکی قدرت وحکمت کی محتاج ہین وہ اس عالم کا حاکم اور مالک ہے۔

اب اس بات پر غور کرنا چاہئے کہ موجودات کو دیکھنے اور عالم کی کیفیت مشاہدہ کرنے سے اس عقیدہ کی تائید ہوتی ہے یا نہین؟ اسکے متعلق حسب ذیل امور قابل غور ہین۔

عالم کے اندر مادیات کی یکسانیت ویکرنگی زمانہ حال کے سائنسی اکتشافات اور تحقیقات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ عالم مادیات مین فطری اور جبلی یکسانیت اور یکرنگی پائی جاتی ہے۔ جتنی قوین عالم کے اندر کام کرتی معلوم ہوتی ہین وہ سب کی سب ایک قوت اولی (PRIMAL FORCE) کی مختلف شکلین ہین۔ جتنی اشیاء کائنات مین ہین وہ سب کی سب ایک اصل اور ایک مبداء عالم کی گوناگون صورتین ہین۔ مادیات مین اصول تثنیہ (DUALITY) نہین، اور نہ مبداء کی کثرت (PLURALITY) ہے۔ بلکہ وحدت (MONISM) ظاہر ہے۔ گو عالم کے اندر خامیان اور کوتاہیان پائی جاتی ہین، مگر وہ بھی ابتدائی علت غائی کے اجزا ہین۔ اور ایک نامعلوم مقصد پورا کرنے کو روا رکھی گئی ہین۔ مفردات مادہ کو لو، یا حاضر و ناظر قوا کی تبدیل ہیئت کو لو یکسانیت اور وحدت ہر جگہ موجود ہے۔

کرۂ ارض کی ابتدا حقائق الاشیاء اور موجودات سے قطع نظر کرۂ ارض کی ابتدا پر غور کرو۔ سائنس والون کو اسکی ابتدا کا اب بہت معقول علم حاصل ہوگیا ہے۔ اسکی عمر کا تخمینہ بھی ہو گیا ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسے کس نے بنایا؟ کون اسے نیستی سے ہستی مین لایا؟ اسباب و واقعات پر غور کرکے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اسے ضرور کسی ذیعقل اور صاحب قدرت ہستی نے تحریک دی۔ آپ سے آپ پیدا ہونیوالی قوت عالم مین نہین پائی جاتی۔ پروفیسر جینو نکر اپنی شہرۂ آفاق کتاب "پرنسپلز آف سائنس" مین لکھتے ہین "مسئلہ حرارت سے ہم ایک معمہ سے دوچار ہوتے ہین۔ یا تو آفرینش عالم ایک زمانہ مقررہ کے اندر واقع ہوئی یا یہ ماننا پڑے گا کہ ابتدا مین قوانین کے عمل مین کوئی ناقابل تشریح انقلاب واقع ہوا" (صفحہ ۴۳۹)۔ اور بہت سے سائنس دان بھی اس امر پر متفق ہین۔ پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسکی علت فاعلی کیا تھی؟ اگر فلکی نظریہ سحاب کو مان لیا جائے اور یہ بھی باور کرلیا جائے کہ سحاب آسمانی مین فعل ارتقا پیدا ہونے سے عالم وجود مین آئے تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کس نے اسے ابتدا مین حرکت دی؟ زیادہ ادق مسائل کو چھیڑے بغیر ہم یہ مان لیتے ہین کہ کوئی ذی ادراک ہستی تھی جسے قائم بالذات انقلابات سے بالاتر موجودات کا مبداء اولے مانا جاتا ہے۔

زندگی کی ابتدا عالم کا کوئی حصہ زندگی سے خالی نہین عالم نباتات اور اقلیم حیوانات اس سے لبریز ہین۔ مگر زندگی کیا ہے؟ یہ سوال بڑا مشکل ہے۔ زندگی کی مختصر تشریح یہ ہے "اندرونی تعلقات کا خارجی تعلقات سے متواتر ربط ضبط اور موافقت واتحاد رکھنے کے سلسل عمل کا نام ہے" (فرسٹ پرنسپلز صفحہ ۹۱، ۹۳) یہ معمہ اب تک حل نہین ہوا کہ بے جان مادہ کا جان سے کیا تعلق ہے، اور دونون کے درمیان جو مغائرت ہے اُسے کس طرح رفع کیا جائے اور اسکی تشریح کس اصول سے ممکن العمل ہے؟ عالمان افعال الاعضا (PHYSIOLOGY) پروٹوپلازم (PROTOPLASM) کی طرف اشارہ کرتے ہین جو زندگی کا اصول مادی قرار دیا جاتا ہے پروفیسر آل مین نے کچھ عرصہ ہوا برٹش ایسوسی ایشن مین ایڈریس دیتے ہوئے فرمایا تھا کہ "ہر جاندار کی ذی جان ساختون کا جزو لاینفک پروٹوپلازم ہے"

ہکسلے نے انسائکلوپیڈیا برٹانکہ مین "بیالوجی" کے عنوان پر مضمون لکھتے ہوئے کہا تھا "جاندار مادہ کی ابتدا کن اسباب سے ہوئی ہم کچھ نہین جانتے"

ڈاکٹر سر ایڈورڈ شیفر نے ۱۹۱۲ء مین ابرڈین کی برٹش ایسوسی ایشن کے سالانہ جلسہ مین زندگی کی ابتدا سے بحث کی اور اسے کیمیائی طریقہ سے پیدا کرنے کی توقع ظاہر کی تھی۔ مگر یہ انکی شخصی راے ہے۔ اس کے متعلق یورپ اور امریکہ کے اخبارات مین بڑی لے دے ہوئی علماؤن نے اتفاق سے بیان کیا کہ زندگی پیدا کرنا سائنس کے امکان سے بعید ہے۔ مسئلہ ارتقا والے کہین گے کہ بے جان مادہ سے عمل ارتقا کے وسیلہ سے جاندار عنصر پیدا ہوا مگر یہ صرف گمان ہی گمان ہے۔

(۴) **من کی ابتدا** زندگی کی ابتدا کی طرح عقل و ذہانت کی ابتدا کا معمہ بھی لاینحل اور ادق ہے۔ من اور شعور کیسے وجود مین آیا؟ اسکی علت فاعلی کیا ہے؟ اگر ہیکل کی طرح اسے مادہ کی لطیف صورت اور اسکی غیر مرئی حرکات کا نتیجہ تخیل مان لیا جائے تو اس کے یہ معنی ہون گے کہ تمام فلسفہ اور بالخصوص فلسفۂ ذہنی کے جملہ اصول الٹ پلٹ ہوجائین گے اور فلاسفرون کے صدیون کے غور و فکر کے نتائج دریا برد کرنے پڑین گے۔ یہ قرین قیاس نہین ہے کہ محض خیال کے لئے ایک ہستی نے دنیا کو بنا دیا جو خود تخیل کی قوت سے بے بہرہ تھی۔ بقول لوٹس جائے عقلی کی یکسانیت اور اتحاد جس کے بغیر ہم اپنی ذہنی اور معنوی کیفیتون سے واقف نہین ہو سکتے اور نہ شعور ذاتی ذات کے مشاہدہ کا حصہ بن سکتی ہے ہمین مجبور کرتا ہے کہ ایک مافوق الحواس ہستی کے وجود پر ایمان لائین جو مشہودات کا موضوع فطری بنتا ہے۔

قصہ کوتاہ عالم نہ صرف قائم ہے بلکہ قائم رکھا اور سنبھالا جاتا ہے۔ اس کے اجزا کے بے حد پیچیدہ اور الجھے ہوئے تعلقات ایک دوسرے سے اس طور پر متعلق ہین کہ نظام عالم مستقل اور غیر مبدل صورت مین قایم چلا آتا ہے۔ موجودات عالم توازن و مساوات آخری کی طرف مائل رہتی ہین۔ اب اگر کوئی قوت اولی اسکی ترمیم و ہدایت نہ کرے تو چارون طرف حرکت کی جگہ سکون نظر آئے اور یہ بنا بنایا کھیل بگڑ جائے۔

مل اور دیگر حکما کہتے ہین کہ علل فاعلی کا پورا علم ہماری عقلی طاقتون کی بساط سے باہر ہے۔ انکی ماہیت کا صحیح اندازہ ہم اپنے موجودہ علم سے نہین کرسکتے بلکہ ہماری عقل کی پرواز طبعی اسباب ہی تک محدود رہتی ہے۔ فاعلیت (EFFICIENCY) سے قطع نظر ہمین سبب ہی تک محدود رہنا پڑتا ہے۔

ان مسائل پر غور کرنے کے بعد ہمین ایک فاعل حقیقی عالم کے خالق اور موجودات کے مالک کی ہستی کی طرف رجوع ہو کر پروفیسر آل پن کے ساتھ ہمنوا ہونا پڑتا ہے کہ "تخیل اور مادہ کی مظاہر فطرت کے درمیان نہ صرف کوئی مشابہت ہی نہین ہے بلکہ دونون کے درمیان کسی قسم کی بھی نسبت اور مشابہت نہین پائی جاتی"

(۳) حسن نظام عالم

یہ مضمون بڑا ادق اور طویل ہے۔ ہمنے گو پچھلی دو دلیلون پر بہت اختصار سے بحث کی تاہم بہت سی جگہ پر ہوگئی۔ اس لئے اب ہم اسے بھی اختصار سے کام لینے کی کوشش کرین گے۔

موجودات قدرت پر نظر غائر ڈالنے کے بعد جو امر ہمارے ذہن پر گہرا اثر ڈالتا ہے وہ نظام عالم کی ترتیب اور قرینہ ہے۔ اصطلاح مین یہ دلیل (COSMOLOGICAL ARGUMENT) کہلاتی ہے۔ آسمان کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھو تو ہر جگہ شان اور قاعدہ دکھلائی دیتا ہے۔ اگر نیچے زمین کے تختے پر نظر دوڑاؤ تو بھی حسن و خوبی ہر جگہ عیان ہے کہ دل اسے دیکھکر عش عش کرتا ہے۔ پھر دنیا کی چیزون کو لو۔ ایک ایک شے کی ساخت پر غور کرو کیسی باقاعدہ اور مزین ہے۔ پھر تغیرات کو

کو دیکھو۔ سب اشیا ان کے تابع ہین اور نیک فرمانبردار لڑکون کی طرح
ان نامعلوم غیر وید فی اصولون کے مطابق عمل کرتی ہین۔ اس کے
ساتھ ہی یہ بات بھی دیکھنے مین آتی ہے کہ موجودات مین باہمد گر تنازع
اور جھگڑا نہین پایا جاتا۔ قانون اولے سے اتر کر درجہ دوم کے قوانین
ہین جو ہر جگہ اپنے کام مین مصروف رہتے ہین۔

جو اتحاد و موافقت عالم مادیات مین پائی جاتی ہے اس کے مترادف
علت غائی (ADOPTATION) عالم حیات مین نظر آتی ہے عالم
نباتات اور اقلیم حیوانات دونون اس سے بہرہ یاب ہین۔ اس سے
یہ مفہوم ہے کہ عضو ایک خاص کام انجام دینے کو بنایا گیا ہے۔ کسی جانور
کے جسم کو لو۔ یا اور کسی پودہ کی ترکیب پر غور کرو اس سے یہ صاف عیان
ہوتا ہے کہ وہ ایک خاص غرض کے لئے بنا ہے۔ اسکی تشریح کی چندان
ضرورت نہین۔

مگر جب عالم مرئیات مین ترتیب، قانون، موافقت، ترقی، مقصد
آخری اور علت غائی پاتے ہین تو فوراً اس سوال سے دوچار ہوتے
ہین کہ کیا یہ سب آپ سے آپ معرض ہستی مین آئے؟ کیا ان کا منتہٰ
اصلی کوئی نہین ہے؟ بنئے کی دوکان پر ہر چیز قرینہ اور ترتیب سے
موجود رہتی ہے۔ مگر بندر کے گھر مین یہ ترتیب اور سلیقہ عنقا ہے جس
سے یہ ثابت ہے کہ ترتیب عقل کا خاصہ فطری ہے۔ عقل شخصیت پر
دال ہے اور شخصیت کے لئے ارادت لازمی ہے۔ اس سے ثابت
ہوتا ہے کہ نظام عالم ایک ذی عقل صاحب ارادت وجود مطلق کی ہستی کی
طرف اشارہ کرتا ہے جسنے ایسے طور پر قاعدے وضع کئے کہ موجودات انکے
مطابق اپنی حیات مستعار کے ایام مقررہ بسر کرتی ہین۔

(۴) علت غائی اور تجویز

چوتھی دلیل علت غائی اور تجویز سے ہے جسے اصطلاح مین
TELEOLOGICAL ARGUMENT کہتے ہین۔ ڈاکٹر پیلے
اسے ڈیزائن (DESIGN) کے نام سے موسوم کرتے تھے۔ مطلب
اس کا یہ ہے کہ عالم اسباب کی تمام موجودات اور قدرت کے تمام
ظہورات وغیرہ بلا وجہ واقع نہین ہوتے۔ انکا ایک خاص مقصد ہے
اور اسے پورا کرنے کو وہ معرض ہستی مین آتے ہین۔ یہ علت غائی تمام
عالم مین پائی جاتی ہے۔ کوئی حادثہ بلا وجہ نہین ہوتا۔ اسکی تہ مین
ایک غایت پنہان ہے جو ذرہ ذرہ مین پائی جاتی ہے اور اس سے
خدا کی ہستی کا ثبوت ملتا ہے۔ فرض کرو ایک سیاح ہمالیہ کے جنگلون
مین ہفتون تک کسی آدم زاد یا انسانی بستی سے دوچار نہوا اور پھر
یکایک کسی پہاڑی کے دامن مین اسے کوئی غار یا چٹان مین کاٹا
ہوا مکان نظر آئے اور وہ اسے اندر باہر سے خوب دیکھے تو فوراً اسے
گمان گزریگا کہ یہ انسان کی صنعت ہے۔ اگر آگ وغیرہ اور گھر کا مختصر
سامان بھی ہو تو اسے وہان پر انسان کی ہستی کا فوراً یقین ہوجائے گا
وجہ کیا ہے؟ وجہ یہ ہے کہ انسان کی حکمت اور قدرت کے تمام
نشانات وہان پر موجود ہین۔ پھر وہ کیون اس کے وجود سے
منکر ہوسکتا ہے۔ یا اگر کسی تباہ جہاز کے پسماندہ تختے پر بہتے بہتے
کسی ویران اور غیر آباد جزیرہ مین جا نکلین اور وہان پر انسانی بستی
کا کھوج لگاتے ہوئے وہ کسی مکان کو دیکھین تو فوراً کہین گے یہ انسان
کی کاریگری ہے۔ اسی طرح عالم موجودات کی ساخت اور ماہیت
پر نگاہ ڈالنے سے وہ اس کے بنانے والے صاحب قدرت و
حکمت خالق کا ثبوت ملتا ہے۔ تقریباً ایک صدی ہوئی کہ ڈاکٹر ولیم
پیلے نے انسان اور حیوان کے اعضا کی ساخت اور ترکیب بغور
دیکھکر یہ استدلال قایم کیا تھا کہ یہ اپنی ساخت مین کامل اور اپنے
مقررہ فرائض کی انجام دہی مین وفادار اور ایک خاص اعلے مقصد
سے بنے ہین۔ یہ محض اتفاق سے نہین بلکہ انسان اور حیوان کے
پیدا کرنے والے کی علت غائی ہے۔ قدرت کے اندہ وسائل اور مقاصد

ہین جو ایک دوسرے کے ساتھ لازم و ملزوم ہین اور یہ سب خدا کی ہستی پر شاہد ہین۔

(۵) شعور اخلاقی

پہلی چار دن دلیلون کا تعلق عالم اسباب سے ہے اسکی حالت او ماہیت پر غور کرکے یہ نتائج اخذ کئے جاتے ہین اور وہ سب خدا کی ہستی پر دال ہین۔ اب انسان کی حالت ملاحظہ ہو یہ دلیل (MORAL ARGUMENT) کہلاتی ہے۔ ہماری اخلاقی فطرت خدا کی ہستی پر گواہی دیتی ہے ہم جب کوئی کام کرتے ہین تو اندر ایک قسم کی کشاکش ہونے لگتی ہے۔ ہم اپنے جنون کے افعال کی کبھی تعریف کرتے ہین، اور کبھی انھین قابل الزام ٹھراتے ہین۔ یہ نیک و بد کی تمیز، نور ایمان، ضمیر ہے، جو ہمارے فعل کے حسن و خوبی قباحت و مذمت کی نسبت فیصلہ صادر کرتا ہے۔ علاوہ ازین ایک فطری احساس اسبات کا ہے کہ نیک اور مستحسن کام کرنا ہی انسانی فرض اولے ہے نیکی و بدی کا ایک معیار ہے، جسے مد نظر رکھنا پڑتا ہے۔ بلکہ قدرۃً ہم اپنے اعمال کا اس سے اندازہ کرتے ہین۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ حاسۂ اخلاقی کہان سے پیدا ہوا؟ اس کے ساتھ مجھ پر حق اعلیٰ کا سوال وابستہ ہے۔ مجھے اسکی فرمانبرداری کرنا واجب ہے جو راستی و نیکی کا مصدر ہے۔ میری اخلاقی فطرت بھی اپنے اصلی مبدا ر کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ سلسلہ لازم و ملزوم سے نیکی کا احساس ہمین ایک منبع ابدی سے منسوب کرنا پڑتا ہے

(۶) حاسۂ روحانی و ذکاوت طبعی

سب سے اخیر مین سب سے زبردست دلیل دی جاتی ہے جو وہبی یا ذکاوت طبعی یا حاسۂ روحانی کے نام سے مشہور ہے۔ ذکاوت فطری یا وہبی وہ خداداد قوت ہے، جس کے بغیر ہم کسی شے کی حقیقت کو نہین پہچان سکتے۔ جب یہ بیان کیا جاتا ہے کہ خدا کی ہستی کا علم ہماری فطرت مین ودیعت ہوا ہے تو اس سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ وہ اکتسابی علم نہین جو مشاہدہ اور تجربہ سے حاصل ہوتا ہے۔ بلکہ فطرۃً ہماری روحانی فطرت مین موجود و مرکوز ہے ہم بلا استدلال اس سے آگاہ ہین۔ کئی عالم اس باطنی شہادت کو کافی سے زیادہ قاطع و ساطع سمجھتے ہین باقی دلائل اس کے سامنے ہیچ ہین۔ ہر انسان کا دل خدا کی ہستی کا قائل اور اسکی موجودگی پر شہادت دیتا ہے اگر یہ باطنی گواہی نہو تو باقی تمام استدلال اور فلسفہ محض بیکار ہے۔ اس خداداد و اعلےٰ طاقت کے بغیر ہمارا اکتسابی علم بھی فضول ہے۔ ہمین اسکی معقولیت اور صحت کا یقین بھی اسی سے حاصل ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے یہ طاقت ذکاوت طبعی یا ہدایت کے نام سے موسوم ہوتی ہے۔ اسی لئے یہ قوت ہر قسم کے علم کی صحت اور ثبوت کی اصل اور بنیاد مانی جاتی ہے۔ اس کے بغیر عقلی اور اخلاقی زندگی محال ہے۔ اس قوت کی شہادت یہ ہے کہ خدا کا عقیدہ ہر انسان کے دل مین جبلی اور فطری ہے۔ دل مین اس کا احساس ہے۔

آیندہ ہم ہندو مسلمانون کا طریقۂ استدلال دربارہ اثبات واجب الوجود پیش کرین گے اور پھر جدید سائنس کی روشنی مین خدا کی ہستی پر بحث کرکے بہت سی غلط فہمیون کو دور کرین گے، جو دانون کے دلون مین پیدا ہو رہی ہین کہ سائنس دان خدا کے منکر ہین۔

بے۔ آر۔ راسے (ہیڈ ماسٹر لاہور)

(بقیہ صفحہ ۹۶) ہماری دلی دعائین آپ کے ساتھ ہین*۔ آپ نے وعدہ فرمایا ہے کہ آپ وہان سے بھی المعصر کے لئے مضامین تحریر فرماتے رہین گے۔ آپ کا زمانہ پروفیسری نہایت عمدگی سے گزر رہا ہے۔ اور ہر شخص آپ کے حسن اخلاق اور تبحر علمی کا مداح ہے۔ "مقدمۂ سائنس" اور "مبادی طبعیات" دو علمی کتابین زیر تالیف ہین۔

(* اب بوجہ جنگ آپ نے جرمنی جانیکا ارادہ ملتوی کردیا ہے)

سیّد انشاء اللہ خان انشاء

سید انشاء کا شمار شعراء اُردو کے اُس باعظمت اور لایق تعظیم طبقہ مین کیا جاتا ہے جنکی مساعی جمیلہ نے اُردو فن شعر کو پروان چڑھایا اور جن کی فکر کے گہرہاے آبدار آج بھی عروس سخن کے سہاگ کا لازمی جزو بنے ہوئے ہین۔ اس مین شک نہین کہ اکثر علمی حلقون مین اُنھین وہ درجہ نہین دیا جاتا جو میر دسودا ایسے نقادانِ فن نے اپنی قابلیت اور سلامتی طبع کی بدولت حاصل کیا، تاہم اس کا ہر کس وناکس کو اعتراف ہے کہ وہ بڑے پایہ کے شاعر تھے اور اساتذۂ اُردو مین وہ اگر دو چار سے کم تو بیسیون اور سیکڑون سے افضل واعلےٰ تھے۔

ان کا نام سید انشاء اللہ خان تھا اور حکیم میر ماشاء اللہ خان کے سرمایۂ ناز سپوت تھے۔ بقول مولینا محمد حسین آزاد "ان کے بزرگ نجف اشرف سے آئے تھے"۔ ایک صاحب روایت کرتے ہین کہ "انکے آبا و اجداد تیمور کے ساتھ سمرقند سے آکر خطۂ کشمیر مین آباد ہوئے تھے" بہرحال اس مین کسی کو اختلاف نہین کہ ان کے مورث بھی اُسی فتوحات اسلامی کے سیلاب مین ہندوستان آئے تھے جس نے اور بہت سے عربی اور عجمی شریف خاندانون کو یہان پہنچایا ہے، جن کے نام لیوا اسوقت بھی کثیر تعداد کے ساتھ ہندوستان کے ہر حصّہ مین موجود ہین۔

ان کے والد بڑے نامی حکیم تھے۔ دلّی مین آنے کے بعد اُنکی بہت عزت کی گئی اور شاہی طبیب بنا دیئے گئے۔ حکومت مین ضعف آجانے سے اور نیز بعض خانگی وجوہ سے اُنھین مرشد آباد جانا پڑا، اور معلوم ہوتا ہے کہ آخر عمر تک وہین رہے۔ سید انشا انھین کے بیٹے تھے لیکن شہرت مین اُنسے کہین بڑھکر نکلے۔

سید انشا کی تعلیم باپ کے ہاتھون ہوئی یعنی قابل باپ نے بیٹے کو خود زیور علم سے آراستہ کیا، گویا سید انشا کی علمیت وہمہ دانی ایک طرح سے فاضل باپ کی محنت وشفقت کا خوشگوار نتیجہ کہی جاسکتی ہے۔

مولوی شیخ عبد القادر صاحب بی اے، ایڈیٹر مخزن کا خیال بہت درست ہے کہ ہمارے یہان مشاہیر کے مفصل اور ابتدائی سوانح اُسوقت تک غیر ممکن الحصول ہوتے ہین تاوقتیکہ وہ خود اپنے حالات حوالہ قلم نکرین۔ واقعی یہ ہماری بدنصیبی ہے کہ خواہ کسی وجہ سے ہو ہم اپنے اسلاف کے صحیح اور مستند حالات سے بالکل بے خبر رہتے ہین اسکی وجہ کچھ تو خود اُن اسلاف کی لاپرواہی اور کسرِ نفسی ہے جسکی وجہ سے وہ اپنے واقعات زندگی کو پبلک کے لئے قلمبند اور محفوظ کرنا ضروری نہین سمجھتے اور کچھ علمی دلچسپی کا وہ فقدان ہے جو ہمین ان باعظمت نفوس کے سوانحی حالات سے واقفیت پیدا کرنے کا موقع نہین دیتا بہرکیف اسباب کچھ ہون لیکن یہ امر مسلّمہ ہے کہ جسطرح اور بہت سے نامورون کی ابتدائی زندگی کے حالات سے عموماً بے خبری طاری ہے اسی طرح سید انشا کے بچپن اور تعلیم کے زمانے کے واقعات بھی لاعلمی کے پردے مین چھپے ہوئے ہین اور روایت در روایت کسی طریقے سے بھی اس باب مین کوئی نتیجہ مترتب نہین ہوسکتا۔ آبحیات ایسی مستند کتاب بھی اس یگانۂ وقت سخنگو کے شرح حالات بتانے سے ساکت ہے صرف اتنا پتہ چلتا ہے کہ سن تمیز کو پہنچکر سید انشا جو اپنے والد کے ہمراہ مرشد آباد مین تھے دلّی کی کشش نے اُنھین اپنے یہان پھر کھینچ بلایا۔ [1]

دلی مین شاہ عالم بادشاہ فرمانروا تھے۔ اس وقت حکومت اور

---

[1] صحت کے ساتھ یہ بتانا دشوار ہے کہ سید انشا کی پیدائش کہان ہوئی اگر وہ مرشد آباد مین پیدا ہوئے تو دلّی کا یہ آنا پہلا آنا تھا۔ اور اگر دہلی ہی ان کا مولد کہا جائے تو غالباً یہ دوسری دفعہ یہان آئے ہین۔

سلطنت سب برائے نام تھی لیکن بادشاہ رحمدل تھے۔ گئی گذری حالت مین بھی عالمون فاضلون اور شاعرون کی کچھ نہ کچھ قدردانی ہوتی تھی۔ سید انشاء بھی دربار شاہی تک پہنچے۔ بذلہ سنج، ظریف، حاضر جواب، شوخ بیان، یہ پرلے درجے کے تھے اور یہی اوصاف ہین جن سے کوئی شخص عشرت پسند بادشاہون کے مزاج مین دخل پاسکتا ہے۔ سید انشاء بھی بزم شاہی مین بڑے اعزاز واکرام سے لئے گئے۔ مزاج شناسی کا بھی انھین خاص ملکہ تھا۔ بادشاہ کو ان سے یکسطرح کی انسیت پیدا ہوگئی تھی جو بالاخر اس درجہ کو پہنچی کہ "شاہ عالم کو ایک دم کی جدائی ان کی ناگوار ہوگئی"۔

ان الطاف وعنایات کے باوجود جو سید انشاء کے حال پر ہمیشہ مبذول رہا کرتین انھین دلی کا رہنا وبال جان تھا۔ بادشاہ سلامت تو حتی الوسع انھین انعام واکرام سے مالا مال کرنے مین کبھی دریغ نکرتے تھے لیکن جب بیت المال مین آپ ہی خاک اڑ رہی ہو اور مہمات سلطنت کے لئے بھی روپیہ نہ ملتا ہو تو سید انشاء کی ضروریات زندگی کی کفالت بوجہ احسن کہان سے ہوتی۔ دلی مٹ رہی تھی سلطنت کی جڑین گھن لگ گیا تھا۔ لیکن دلی کی دلچسپیان کم وبیش قائم تھین اور انھین چھوڑکر یک قلم ترک وطن کی ٹھان لینا ایسا ہی مجبوری کا کام خیال کرنا چاہیئے۔ ذوق کے وقت مین دلی نزع کے عالم مین تھی۔ لیکن پھر بھی اسکی ادائین کچھ ایسی ہی دلفریب تھین کہ انھین دکن کے سفر سے باز رکھا۔ انشاء کے زمانے مین تو اسکی حالت کچھ بہتر ہی رہی ہوگی غیر ممکن تھا کہ وہ اسکی مفارقت خوشی سے گوارا کرتے۔ لیکن انسان کی ذاتی ضروریات اسے اکثر غیر دلپسند فعل پر بھی مجبور کردیتی ہین جو اسے کرنا ہی پڑتا ہے۔

غرضکہ دلی سے جب سفر کا عزم کیا تو سوائے لکھنؤ کے اور کہان سرا تھا۔ علمدوستی اور معارف پروری عجیب بابرکت چیز ہے۔ قرطبہ اور بغداد کی عظمت انھین باتون سے وابستہ ہے۔ بکرماجیت کا تذکرہ انھین سے آجتک قائم ہے اور انھین کی بدولت آصف الدولہ اور سعادت علی خان کے نام نے بقا، دوام حاصل کی ہے۔ لکھنؤ کی سلطنت کب کی مٹ چکی مگر اس کے اکثر فرمان رواؤن کی نیکیان اسی شان سے زندہ ہین۔ اللہ اللہ لکھنؤ اس وقت کیا رہا ہوگا جب وہان کے چمنستان مین سودا، میر اور انشاء وغیرہ ایسے بلبلان سخن نغمہ سنج رہے ہون گے۔ کیا ہی خوش نصیب وہ لوگ تھے جنھون نے اپنی آنکھون سے یہ سین دیکھے اور کانون سے انکی باتین سنین۔

قاعدہ ہے کہ حاکم وقت کے مذاق کی تقلید عوام بھی کرتے ہین۔ آصف الدولہ اور سعادت علی خان کی قابل قدر صفات کی پیروی انکی رعایا مین بھی تھی۔ عام وخاص مشاہیر کو قدردانی کے ہاتھون لیتے تھے اور انکی خدمت کرتے تھے۔

مرزا سلیمان شکوہ جو شاہ عالم کے بیٹے تھے ان کا گھر غریب الوطن لوگون کے لئے ایک ایسی سرائے تھی جہان غربت مین وطن کا لطف مل جاتا تھا۔ قدردانی کے متلاشی اس سرا مین اکثر شب باش رہ چکے تھے۔ اب انشاء اللہ خان لکھنؤ آئے تو یہین اترے۔ مرزا سلیمان شکوہ کو بھی اہل کمال کی تواضع ومدارات سے خاص دلبستگی تھی۔ انشاء کی خاطر بھی بہت کی گئی۔ ان مین دوسرون کے خوش کرلینے کا مادہ یون ہی بہت تھا اور پھر ذاتی جوہر بھی کوئی چیز ہوتے ہین رفتہ رفتہ ان سے روابط اس درجہ بڑھے کہ آخرکار یہی مرزا سلیمان شکوہ کے استاد ہوگئے۔

مرزا سلیمان شکوہ بجائے خود بہت اچھے سخنگو تھے۔ پہلے مصحفی کو مشورۂ سخن کی خدمت سپرد تھی لیکن سید انشا کی قابلیت نے آخر اس عزت کو اپنا حصہ بنا یا۔ مصحفی کے پختہ کار اور مشاق شاعر

ہونے سے تو کسی کو انکار نہیں اور ہم مجموعی حیثیت سے اُنھیں انشار سے
کبھی کم نہیں سمجھتے تاہم انشار کے کلام کی شیرینی اور ظرافت کے چٹخارے
ایسے نہ تھے جو سلیمان شکوہ ایسے سخن فہم کو آب بدہن نہ کردیتے۔

سید انشار اپنی شاعری کا سکّہ دلّی میں جما چکے تھے اور اُن
کے لکھنؤ آنے سے پہلے ہی یہاں انکا نام شہرت پذیر ہو چکا تھا۔ یہاں
آنے کے بعد انہوں نے کئی ایک نامی معرکے سر کئے اور انکا طوطی
لکھنؤ ایسے شہر میں جہاں ہر قسم کے اہلِ کمال کا مجمع تھا بولنے لگا۔

علامہ تفضل حسین خان لکھنؤ کے ایک فاضل اجل تھے۔ ملکی معاملات
میں بھی اُنھیں بہت کچھ دخل تھا بلکہ کہتے ہیں کہ انھیں کی حسن تدبیر سے
سعادت علی خان کو مسند نشینی کا موقع ملا۔ ذاتی طور پر علامہ موصوف
بہت قابل تھے۔ بعض السنۂ مغربی مثلاً انگریزی و لاطینی میں مہارت
تامہ رکھتے تھے۔ سید انشا بھی اُن سے ملنے کبھی کبھی جایا کرتے تھے
وہ بھی بھانپ گئے تھے کہ یہ کس بلا کا آدمی ہے۔ انھیں علامہ کے
ذریعہ سے آخر انشار نواب سعادت علی خان کے دربار میں پہنچے
اور وہاں جو اعزاز و اکرام اپنے کمال کے زور سے حاصل کیا
وہ اُنھیں کا حصّہ تھا۔

سید انشار طبعاً بڑے مزاج شناس واقع ہوئے تھے اور اُنکے
لطائف و ظرائف سامعین کے دلوں کو متوجہ کرنے کا بہترین ذریعہ
تھے۔ سعادت علی خان کی مجلس بھی انکی بذلہ سنجیوں سے گلزار رہا
کرتی۔ شعراء اُردو کی فہرست پر ایک غائر نظر ڈالئے لیکن داغ
کے سوا کوئی ایسا نظر نہ آئے گا جسے سلف سے لیکر اسوقت تک
انشار کا سا اعزاز و انعام ملا ہو۔ سید انشار محض درباری شاعر نہ
تھے بلکہ سعادت علی خان کے مصاحب اور مقرب یا نفس ناطقہ
تھے۔ باہمی تعلقات و مراسم میں جو بے تکلفی برتی جاتی تھی وہ
کچھ ایسی تھی کہ اُن کا حال کتابوں میں دیکھنے کے بعد بھی اس کا
یقین نہیں آتا۔ آب حیات کے کئی صفحے ایسے واقعات سے مملو
ہیں جنمیں آقا اور ملازم کا ادنےٰ سا فرق بھی معلوم نہیں ہوتا۔

سر جان بیلی برٹش گورنمنٹ کی جانب سے اودھ کے دربار
میں رزیڈنٹ تھے۔ صاحب موصوف کو فارسی وغیرہ شاعری میں
معقول دخل تھا اور انکی علمیت محققانہ پایہ کی تھی جب وہ سعادت
علی خان سے ملاقات کرنے آتے تو سید انشار بھی ہوتے اور علمی
مباحث خوب خوب ہوتے۔ ایسی ملاقات کے موقع پر ہجر بالکسر
و بالفتح کی بحث کا موقع آگیا تھا۔ نواب سعادت علی خان ہجر کو
بالفتح صحیح سمجھتے تھے، اور جان بیلی صاحب کے خیال میں یہ خلاف
محاورہ تھا۔ اتفاقاً سید انشا بھی آپہنچے۔ اُن سے فیصلہ کن رائے
طلب کی گئی۔ اُنھیں کیا خبر تھی کہ یہاں کیا ہو رہا ہے۔ انہوں نے
جان بیلی صاحب سے اتفاق کیا۔ لیکن پھر سعادت علی خان کا
چہرہ دیکھکر سمجھ گئے کہ یہ ان کے خلاف ہوا ہے۔ فوراً بات بنادی
کہ ہجر بالکسر صحیح ہے جبھی تو مولنا جامیؒ فرماتے ہیں ؎

شب وصل است وطے شد نامہ ہجر
سلامٌ ہی حتےٰ مطلع الفجر

سعادت علی خان یہ سنکر خوش ہوگئے۔ اس ایک مثال سے انکے
قوت انتقال ذہنی کا بھی کافی اندازہ ہو سکتا ہے۔ یہی نکتہ سنجی اور
فکر آرائی تھی جس نے سعادت علی خان کو موہ لیا تھا، اور اُنھیں
انشار کے بغیر چین نہ ملتا تھا۔

سعادت علی خان نے سید انشار کے ساتھ جو کچھ نیکیاں کیں
اُن کے تذکرے ابھی باقی ہیں اور انکی قدر و قیمت اور بھی زیادہ
ہوجاتی اگر اُنھیں کے ہاتھوں انکا بُرا انجام نہوا ہوتا۔

سید انشار کے آخری ایام کی دلخراش داستان پروفیسر آزاد
نے نہایت موثر طریقے سے قلمبند کی ہے اور حق یہ ہے کہ اُسکے

مطالعہ سنئے گا ہے چنان اور گاہے چنین" کی سبق آموز فلاسفی نہایت آسانی سے سمجھ مین آجاتی ہے۔

خدا کی قدرت ہے کہ جس سعادت علی خان کے حُسنِ سلوک سے انشاء کے دروازے ہاتھی کھڑے جھومتے ہون اسی کی بدسلوکی سے وہان خاک اُڑنے لگے۔ اللہ اللہ وہ سید انشاء جو کسی وقت بادشاہ کے علی مقرب اور سلطنت بھر مین نہایت با اثر شخص تھے اُنکی آخر یہ حالت ہوجائے کہ کوئی نام کو بھی نہ پوچھے۔ عزت اور امارت کے سامنے سامان مٹی مین مل جائین۔ فاقہ کشی کی نوبت پہنچ جائے اور بالاخر انھین گمنامی اور کس مپرسی کے ایسے عالم مین موت آجائے کہ کسی کو کانون کان خبر نہو۔

سعادت علی خان کے دامن پر یہ ایک ایسا بدنما دھبہ ہے جو ایک طرف ذاتی خوبیون کو خاک مین ملاتا ہے اور دوسری طرف مشرقی بادشاہون کی تلوّن مزاجی کی عبرتناک مثال پیش کرتا ہے۔

مولانا آزاد جنھون نے آب حیات کے صفحون پر تحقیق و تدقیق کے موتی بچھا دئیے ہین انکی نسبت نہین کہا جاسکتا کہ انہون نے ان واقعات کو خواہ مخواہ اہمیت دی اور سچ سمجھ لیا لیکن اس مین شک نہین کہ اگر یہ باتین صحیح ہین تو انشاء کی قسمت پر نہین بلکہ سعادت علی خان کی عقل پر افسوس کرنا چاہیئے۔

یہ امر البتہ کسی قدر حیرت خیز ہے کہ بعض طبقون مین پروفیسر آزاد کے ان بیانات کو صداقت سے بعید خیال کیا جاتا ہے۔ شیخ عبد القادر بی۔ اے۔ اپنے ایک انگریزی مضمون مین جو آزاد پر ہے لکھتے ہین کہ "لکھنؤ کے ایک معزز آدمی جو میر انشاء اللہ کے رشتہ دار ہونے کے بھی مدعی تھے آزاد مرحوم کے خیال کی تردید کرتے تھے۔" افسوس کہ شیخ صاحب نے اُن سے اس معاملہ مین مزید گفتگو پسند نہ کی ورنہ یہ عقدہ بہ آسانی حل ہوجاتا کہ انکا بیان کس درجہ تک قابل قبول ہے ورنہ بغیر مستند تردیدی ثبوت کے آب حیات کے واقعات کیونکر غلط قرار دئیے جاسکتے ہین۔

۱۲۳۳ھ مین سید انشاء کا انتقال ہوا اور بمقام حسین گنج لکھنؤ آئینہ بی بی کے باغ مین مدفون ہین۔

ظاہری اولاد معلوم ہوتا ہے کہ انکی شہرت کو قائم نہین رکھ سکی ورنہ اساتذہ کی طرح ان کے نام لیوا بھی آج موجود ہوتے۔ ہان اولاد معنوی سے اُن کا نام اسوقت تک قائم رہے گا جب تک اُردو زبان باقی ہے اور ادبیات مین شاعری شامل ہے سچ ہے ؎

نوشتہ بماند سیہ بر سفید
نویسندہ را نیست فردا امید

سیّد انشاء کی شاعری

سید انشاء کا مرتبہ اُردو شاعرون مین جو کچھ ہے وہ باخبر اصحاب سے پوشید نہین۔ ان کا کلام بھی قبولیت عامہ کے لحاظ سے معرفی سے ایک حد تک مستغنی ہے۔ سچ یہ ہے کہ ایسا جامع خصوصیات شاعر اُردو مین آجتک نہین گذرا۔ ہان انکی مفرط ظرافت پسندی و بے اعتدالی نے اُن کے کلام کے بہت بڑے حصّہ کو ناقابل قدر ضرور بنا دیا ہے، لیکن دنیا جانتی ہے کہ اُن کا اس قسم کا کلام فی الحقیقت خارجی اسباب سے تھا۔ وہ طبعاً ظریف تھے عام ملکی مذاق سے قطع نظر مجلس شاہی کا بھی یہی رنگ تھا کہ چھوٹے سے لیکر بڑے تک ہنسی اور ٹھٹول کے دلدادہ تھے۔ انشاء نے ممکن ہے انھین وجوہ سے شاید پہلے ہی فیصلہ کر لیا ہو کہ ان لوگون مین ہر دلعزیزی پیدا کرنے کا صرف یہی ایک ذریعہ ہے جسکی معنی خیز تشریح فارسی کے اس شعر مین کی گئی ہے۔

روسخرگی پیشہ کن ومطربی آموز تا سیم وزر از مہتر وکہتر بستانی

اس اصول پر کاربند ہونے سے گو ان کا مطلب ضرور حاصل ہوگیا لیکن اس کے بُرے نتائج کا خمیازہ جو اُنھین اپنی آخر عمر مین اُٹھانا

بڑا دہ سید عبرت خیز و سبق آموز ہے۔ کاش یہی زود طبیعت صلاحیت و شائستگی کے ساتھ صرف ہوتا تو نواب مصطفےٰ خان شیفتہ کو گلشن بیخار میں یہ فقرہ چست کرنے کا موقع نہ ملتا کہ "ہیچ صنف را بطریقہ راسخہ نگفتہ" نواب شیفتہ کی یہ زبردستی ہے کہ سالہا سال کی دماغ سوزی کی داد ان الفاظ میں دی لیکن پروفیسر آزاد کے دل پر بھی ان سے "کٹار کا زخم" نہیں لگنا چاہیے۔ انصاف یہ ہے کہ انشا کی کلیات میں وہ خصوصیات بہ صفت موجود ہیں جو کسی شاعر کو اُستادی کا رتبہ دلانے کا ذریعہ خیال کی جاتی ہیں لیکن اُس میں غیر معتدل خیالات کی بہتات بھی ہے اور بعض اوقات یہی ایک عیب ساری خوبیوں کو چھپا دیتا ہے، اور تصویر کے روشن پہلو پر سطحی نظریں اکثر بمشکل پہنچتی ہیں۔ اسی قابل اعتراض حصہ کلام کی وجہ سے اکثر نقادانِ فن کہتے ہیں کہ سید انشا کا کلام ہر موقع پر قابل سند نہیں۔

اس بحث سے ہمارا منشا یہ نہیں کہ ہم انکے کمالات کے منکر ہیں ہم انشا کے ایک نازک خیال اور مشاق شاعر ہونے کے ہر طرح قایل ہیں۔ اور جو لوگ اُن کو مستند سخنگو نہیں سمجھتے وہ بھی کم و بیش اُن کے کلام کے مطالعہ سے بہرہ اندوز ہوتے ہیں۔ سید انشا شاعر تھے اور پکے شاعر، اور اُن میں وہ تمام اوصاف مبدا فیاض نے ودیعت کئے تھے جو "الشعراء تلامیذ الرحمٰن" کے خطاب کے ضروری اجزا ہیں۔

اُنھیں ابتدائے سن سے شعر گوئی کا شوق تھا۔ شروع شروع میں اپنے والد سے مشورہ لیا کرتے تھے لیکن پھر خود ہی اُستاد تھے خود ہی شاگرد۔ اسی ایک بات سے معلوم ہو سکتا ہے کہ شعر و سخن سے اُنھیں فطری مناسبت کس قدر تھی۔ لیکن ساتھ ہی ماننا پڑتا ہے کہ انکی بے اعتدالی اسی مطلق العنانی کا نتیجہ ہے۔ مولانا آزاد کا ارشاد صحیح ہو کہ جسقدر بتدی زیادہ تیز طباع ہو اتنا ہی زیادہ استاد کا محتاج ہے جیسے ہونہار بچھڑا کہ اچھے چابک سوار کے تلے نکلتا ہے جب ہی جوہر نکالتا ہے۔ نہیں تو بے ڈھنگے ہاتھ پانوں مارتا ہے کہ بدہو جاتا ہے۔

اُن کے طباع ذہن ہونے میں شک کسکو ہو سکتا ہے کہ باوجود کسی قابل و مستند اُستاد کے فیض تربیت سے متمتع نہونے کے شروع ہی سے اُنھوں نے اپنا سکہ جما لیا تھا۔ مرشدآباد سے جب دہلی واپس آئے تو یہاں میر، سودا، اور درد کے شاگردوں کی گرم بازاری تھی لیکن انہوں نے آخر کار اپنا لوہا سب سے منوا لیا۔ مرزا عظیم بیگ عظیم سے ایک ایسا معرکہ سر کیا کہ ہر کہ و مہ ان سے واقف اور ان کی لیاقت کا قایل ہو گیا۔ مرزا عظیم سودا کے شاگرد تھے اور خود ستائی کا مادہ اُنمیں اس قدر تھا کہ اپنے آگے کسی کو کچھ نہ سمجھتے تھے۔ انشا سے بھی چشمکیں ہونے لگیں۔ ایک مرتبہ انھوں نے کسی مشاعرہ میں غزل پڑھی جو بحر رجز میں تھی لیکن چند اشعار بحر رمل میں موزوں ہو گئے تھے۔ انشا کو اس کا علم پہلے سے تھا۔ مشاعرہ میں حاضرین کے سامنے مرزا عظیم سے تقطیع کی فرمائش کی۔ اسی واقعہ سے اُن کا یہ مخمس تعلق رکھتا ہے ؎

گر تو مشاعرہ میں صبا آجکل چلے کہیو عظیم سے کہ ذرا وہ سنبھل چلے
اتنا بھی حد سے اپنی نہ باہر نکل چلے پڑھنے کو شب جو یار غزل در غزل چلے
بحر رجز کو چھوڑ کے بحر رمل چلے

مرزا عظیم کو اپنی غلطی کا اقرار کرنے کے سوا کیا چارہ تھا۔ لیکن انشا کے مخمس کے جواب میں انہوں نے بھی ایک مخمس کہا۔ ایک بند ہدیہ ناظرین ہے ؎

موزونی و معانی میں پایا نہ تم نے فرق تبدیل بحر سے ہوئے بحر خوشی میں غرق
روشن ہے مثل مہر یہ از غرب تا بہ شرق شہ زور اپنے زور میں گرتا ہے مثل برق
وہ طفل کیا گرے گا جو گھٹنوں کے بل چلے

اس نوک جھونک نے بالآخر بہت خطرناک شکل اختیار کرلی تھی لیکن تھے سب صاف دل اور شریف طبیعت آگے چلکر مصالحت ہوگئی۔
لکھنؤ مین کسی شخص کے لئے اُس حالت مین اپنا رنگ جمانا بہت مشکل تھا جب وہان جرأت و مصحفی و قتیل ایسے نکتہ سنج سخنگو مشاعرون کی زینت بنے ہوئے ہون۔ انشاء کے لئے پہلے پہل ضرور مشکل تھی لیکن آخرکار وہان والون نے بھی مان لیا کہ انشا نے فخریہ لہجے مین اپنے لئے جو کچھ کہا ہے یہ سب سچ ہے ؎

اک طفل دبستان ہے فلاطون مرے آگے کیا منہ ہے ارسطو جو کرے چون مرے آگے
کیا مال بھلا قصر فریدون مرے آگے کانپے ہے پڑا گنبد گردون مرے آگے
ہون وہ جبروتی کہ گروہ حکما سب چڑیون کی طرح کرتے ہین چون چون مرے آگے

اُنکی مفصلہ ذیل غزل بہت مشہور اور مقبول ہے۔ یہ لکھنؤ کے ایک مشاعرہ کی طرح پر لکھی گئی تھی۔ مشاعرہ مین جرأت و مصحفی موجود تھے لیکن "سب نے غزلین ہاتھ سے رکھدین" کہ انشاء کے بعد رنگ نہین جمیگا۔ واقعی یہ غزل مختصر ہونے کے باوجود اتنی مرصع اور دلپسند واقع ہوئی ہے کہ اصحاب ذوق سلیم خوب اندازہ کرسکتے ہین ؎

لگا کے برف مین ساقی صراحی ے لا جگر کی آگ بجھے جس سے جلد وہ شے لا
قدم کو ہاتھ لگاتا ہون اُٹھ کہین گھر چل خدا کے واسطے اتنے تو پاؤن مت پھیلا
نکل کے وادی وحشت سے دیکھ اے مجنون کہ زور دھوم سے آتا ہے ناقۂ لیلا
گرا جو ہاتھ سے فرہاد کے کہین تیشہ درون کوہ سے نکلی صدا کہ واویلا

نزاکت اُس گل رعنا کی دیکھیو انشاء
نسیم صبح جو چھو جائے رنگ ہو میلا

لکھنؤ مین سب سے بڑا اور تاریخی مقابلہ مصحفی سے کرنا پڑا۔ اسکی مفصل روداد آب حیات مین درج ہے۔ مصحفی لکھنؤ کے اُستاد تھے۔ اُدھر کے شاگرد کثرت سے تھے۔ وہ سید انشاء کو ٹھنڈے دل سے کب دیکھ سکتے تھے۔ دونون کے دل غبار آلود ہوگئے اور طرفین سے وار چلنے لگے۔ پہلے غزلون مین طرز تشنیع سے کام لیا گیا، پھر عملی طور سے دل کا بخار نکالنے کی راہین پیدا کی گئین، اور معاصرانہ چشمک قلبی عداوت بن گئی۔ انشاء کی یہ غزل اُسی زمانے کی اور مصحفی کی غزل کے جواب مین ہے۔ اس کے بعض شعرون مین مصحفی پر طعن ہے۔

توڑون گا خم بادۂ انگور کی گردن رکھدون گا وہان کاٹکے اک حور کی گردن
کیون ساقی خورشید جبین کیا ہی نشے ہون سب یون ہی چڑھا جاؤن مئے نور کی گردن
تب عالم ہستی کا مزا ہے کہ پڑی ہو گردن پہ مری اُس بت مخمور کی گردن
آئینے کی گر سیر کرے شیخ تو دیکھے سر خرس کا، منہ خوک کا، لنگور کی گردن

حاسد تو ہے کیا چیز کرے قصد جو انشاء
تو توڑ دے جھٹ بلعم باعور کی گردن

آخری دونون شعرون مین مصحفی کی طرف اشارہ ہے۔

مختصر یہ ہے کہ انشا نے لکھنؤ مین بھی اپنا نام چمکایا اور اسی شاعری کی بدولت سعادت علیخان کے دربار مین پہنچے۔ اسی کی بدولت سارے عروج حاصل کئے۔ اور اسی کی بدولت آخرکار وہ ذلت و عُسرت برداشت کی جس سے ہر مقرب شاہی کو اپنے آقا کی تلون مزاجی کے ہاتھون ایک نہ ایک دن دوبدو ہونا پڑتا ہے۔

سید انشا کی تصانیف کی تفصیل یہ ہے:۔

۱۔ دیوان ریختہ۔
۲۔ دیوان ریختی۔
۳۔ دیوان غزلیات فارسی۔
۴۔ دیوان بے نقط۔
۵۔ مثنویان۔
۶۔ شرح مائتہ عامل۔
۷۔ دریائے لطافت
۸۔ داستان نثر اُردو۔

باستثنا آخری دو کتابون کے باقی تمام کلیات انشا* مین شامل ہین جس مین ان کے علاوہ حکایات منظومہ، ہجو، قصائد، چیستان، رباعیات، اور تواریخ کو بھی کافی جگہ دی ہے۔

دریائے لطافت قواعد اردو و منطق وغیرہ مین ایک مفید اور کارآمد رسالہ ہے اور شاید یہ اپنی قسم کی پہلی کتاب ہے۔ اس کا مطالعہ طالبان فن کے لئے ازبس ضروری ہے۔

داستان نثر مین اس بات کا التزام ملحوظ رکھا گیا ہے کہ خالص ہندی یا اردو الفاظ کے سوا اُس مین فارسی و عربی الفاظ کا استعمال مطلق نہین کیا۔ اصل کتاب کے دیکھنے سے اس امر کا سرسری اندازہ ہوسکتا ہے کہ اُس زمانے مین بھی اُردو کس قدر لچکدار تھی اور باوجودیکہ اُسوقت اُسے وہ سامان ترقی میسر نہوئے تھے جو اس پچاس سال کی مدت مین ہوئے ہین لیکن سید انشا اپنے مقصد مین بخوبی کامیاب ہوئے ہین۔ اگر انشا کے زمانے مین ایک قصہ یا کہانی کا ٹھیٹھ اُردو مین ترتیب دینا ممکن تھا تو کیا اس وقت جبکہ اُردو الفاظ و محاورات و اصطلاحات کا مجموعہ بہت کچھ ترقی پذیر ہے اس مین تاریخ و فلسفے پر مستقل تصنیف کا ہونا امکان سے باہر ہے۔

کلیات انشا جس مین ان کا ہر صنف کا کلام بقدر کافی موجود ہے انکی وسعت نگاہ اور بلند نظری کا بہترین ثبوت ہے۔ غزلیات جو واقعی اپنے حقیقی معنون مین کہی گئی ہین قابل توصیف و لایق دید ہین۔ جو غزلین دوست احباب یا سعادت علی خان کی فرمائش سے بطور تفنن طبع لکھی ہین وہ ظرافت پسند طبیعتون کے لئے سرمایۂ دلچسپی ہین لیکن اس راستے مین وہ جادۂ مذاق صحیح سے اکثر کوسون دور جا پڑے ہین۔ ان کے مضامین بھی کچھ زیادہ شگفتہ نہین۔ ہان ان کے مطالعہ سے یہ ضرور منکشف ہوتا ہے کہ طبیعت پر انھین پورا قابو تھا اور سنگلاخ زمینون مین بھی اُن کا توسنِ فکر یکسان تیزی سے چلتا تھا۔ اور پھر پُرگوئی کا یہ عالم ہے کہ بعض اوقات ایک ہی ردیف مین صفحے کے صفحے بھر دیئے ہین۔ ان کی ایک غزل ہے موبافٓ کا جوڑا، قاف کا جوڑا، اس زمین مین بہ تبدیل قافیہ کم و بیش ۱۰ غزلین ہین۔ اسی طرح پتھر کی ردیف مین خوب خوب طبع آزمائی کی ہے اور نہایت مشکل قافیون کو موزون کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان طرحون پر خواہ مخواہ مضامین ٹھونسنے کے سوا اور کیا چارہ ہے۔ مثلاً کہتے ہین ؎

نہ ہاتھ آیا جو جوتا ٹاٹ بانی اور جھکی کا — تو پہنا ایک صاحب نے فرنگی ٹاٹ کا جوڑا
مروڑی فوج انگریزی نے دی اک الیسی ہلکی — کہ رستی کٹ گئی ہلکر کی توماجات کا جوڑا
غرض کہ حرف کی تکرار کی جنے تو وہ کو — یہن آئے ہو تم تو اطلسِ اغراض کا جوڑا
تمہارے بطخے اور بطخ کے غل کرنیکو سن لیو — نہ دیکھا جن نے ہو نپل تلے کے بھوتنے کا جوڑا

لیکن انھین سخت زمینون مین خال خال مضامین نہایت لطیف بندھ گئے ہین سنئے ؎

کیا بھلا شیخ جی تھے دیر مین تھوڑے پتھر — کہ چلے کعبے کے تم دیکھنے روڑے پتھر
کوس بیٹھین فقرا اہلِ دول کو تو ابھی — ان کے ہاتھی ہون پہاڑ اور ہون گھوڑے پتھر
رقت آئی نہ تجھے حال پہ میرے سچ ہے — ہو جو پتھر اُسے کیا کوئی نچوڑے پتھر

کہ نظرِ لعل و زمرد کی طرف۔ پہنے ہین — سرخ اور سبز عجب رنگ کے جوڑے پتھر

قافیہ پیمائی کے انشا بادشاہ ہین اور اسکی مثالین اُن کے کلام مین کثرت سے موجود ہین۔ ایک جگہ لکھتے ہین ؎

ہے زور حسن سے وہ نہایت گھمنڈ پر — نام خدا نگاہ پڑے کیون نہ ڈنڈ پر
گلبرگ تر سمجھ کے لگا بیٹھی ایک چونچ — بلبل ہمارے زخم جگر کے کھرنڈ پر
یہ جو مہنت بیٹھے ہین رادھا کے کنڈ پر — اوتار بن کے گرتے ہین پریون کے جھنڈ پر
اے موسم خزان لگے آنے کو تیرے آگ — بلبل اُداس بیٹھی ہے اک سوکھے ڈنڈ پر

ان زمینون مین جب وہ سلامت روی کے ساتھ کامیاب نہ ہوئے تو اعتدال ہاتھ سے جاتا رہا۔ اور پھر جو خیال سامنے

* کلیات انشا بقیمت عہ دفتر العصر لکھنؤ سے دستیاب ہوسکتی ہے۔

آیا وہ موزون ہوا۔ اکثر اوقات طرز کلام کے ساتھ لہجہ بھی بدل جاتا تھا۔ مندرجہ ذیل اشعار آنادون کے لہجہ مین ہین ؎

جو چاہے تو مجھسے ہنسوڑے کی خیر تو یون دیکھ اس گھوڑے جوڑے کی خیر
دکھائی مجھے سیرِ باغ ارم الٰہی ہو اس سبزہ گھوڑے کی خیر
لگا بیٹھ انشا کو ٹھوکر تو ایک
ارے اپنے سونے کے توڑے کی خیر

انشا کا عشق عاجزی و نیازمندی کو کہین کہین بالکل نظر انداز کردیتا ہے اور زبردستی کی محبت اور آزادانہ لگاؤ کی شکل اختیار کرلیتا ہے۔ کہتے ہین ؎

دیوار پھاندنے مین دیکھوگے کام میرا جب دھم سے آکہون گا صاحب سلام میرا
اچھا مجھے ستاؤ جتنا کہ چاہو مین بھی سمجھون گا گر ہے انشاء اللہ نام میرا

چلتے چلتے جب زیادہ بے راہ ہوجاتے ہین تو ایسی باتین کہہ جاتے ہین جو تہذیب و شائستگی پر چشمک زن ہوتی ہین مثلاً۔

بولے وہ جب کہ ہاتھ رکھا مین نے انکی ران پر خیر ہے تمکو اجی لعنت کرو شیطان پر
جاڑے مین کیا مزا ہو وہ تو سمٹے ہے ہلن اور کھولکر رضائی ہم بھی لپٹ رہے ہون
کیونکر نہ گدگداہٹ ہاتھون مین اسکے اٹھے وہ گوری گوری رانین جسنے دبائیان ہون

انھین بازاری جذبات نے انشائی شاعری کو بدنام کیا ہے لیکن جب ناسخ ایسے متین شاعر نے کھلے الفاظ مین یہ کہنے سے دریغ نہ کیا ہو کہ۔

رکھون مین ساق ساقی گلفام دوش پر
تو انشا کو کس منھ سے الزام دین۔

زبان کے لحاظ سے یون تو کلیات انشا مجموعی حیثیت سے ایک حد تک سقم سے خالی ہے لیکن بعض اوقات غیر مانوس و عسیر الاستعمال الفاظ شعر کی خوبیون کو غارت کردیتے ہین۔ فارسی عربی کے علاوہ اُنھین ہندوستان کی قریب قریب تمام زبانون مین دسترس تھی یا کم از کم ان زبانون کے الفاظ انکی زبان پر چڑھے ہوئے تھے اور وہ موقع بے موقع اُنھین باندھ جاتے تھے۔ لیکن اردو کی نفاست اُسوقت اس دخل درمعقولات کی اسدرجہ متحمل نہین تھی اور اس لئے اِس قبیل کے اشعار چندان لطیف واقع نہین ہوئے۔ انشا کہتے ہین ؎

کسکی یہ چھاتک تانک کی باس سماہی ہو یان دل نے جو اُس کو اڑکے تاڑ دڑا او غش کیا
ہون کشتہ اُنکے گچھے اشارون کی چوٹ کا تھا جنکے سر دوپٹہ تمامی کے گوٹ کا
لونا چماری کی قسم اور کلوا بیر کی کالے بلا کے غول بیابان کی قسم
بھینسا سُرا اپنے حلم مین ایک ایسے برہن جو چٹ سے توڑ ڈالتے ہین گرگدنکی شاخ
جو روپ تھا وہ کداری کا بنگیا سارنگ کہ چاندنی نے لگا دی ہے آگ پانی پر
محمل نشین نے سنکے حدی تیری غش کیا کیا تو نے اشقلا یہ دیا ساربان چھوڑ

اس قسم کی مثالون سے قطع نظر کیجئے تو آپ کو بیشمار ایسے اشعار ملین گے جنہین باوجود انھین معلق و اجنبی الفاظ کے استعمال کے معنوی خوبیان موجود ہین، اور جہان کہین میانہ روی کو مد نظر رکھکر اُنھون نے ہندی خصوصیات کا پیوند لگایا ہے، وہ اور بھی پُر لطف چیز ہے ؎

ہنوز کہتی ہے جمنا سہاگ دکھلا کر کہ خوب کھیلے مہاراج پھاگ پانی پر
نہ اُڑیئے آپ جوگی جی ابھی ہم بھی جو چاہین تو بچھا کر مرگ چھالا بیٹھ لین بے لاگ پانی پر
مانگا جو مین نے بوسہ اُنسے چمن کے اندر بولے کہ یان نہین، چل چھتی بہون کے اندر

پشتو اور ترکی زبانون پر بھی عبور تھا اور دو ایک چیزین ان زبانون مین بھی درج کلیات ہین۔

ماہر السنہ مختلفہ ہوکر غیر ممکن تھا کہ وہ اُن اصول سے بے خبر ہوتے جو فصاحت و بلاغت کا معیار خیال کئے جاتے ہین بعض نہایت خفیف نقایص کے سوا انکی زبان نہایت صاف اور شستہ ہے، اور محاورات و اصطلاحات کے ساتھ اُس

لطف دونا ہو جاتا ہے۔ جو غزل انہون نے اس رنگ مین کہی ہین وہی انکی کلیات کی جان ہین، اور سچ یہ ہے کہ انہین کے بل پر انہون نے دہلی اور لکھنؤ والون کے دلون پر اپنی عظمت کا نقش بٹھا یا تھا۔

انشاء کا ایک مطلع بہت مشہور ہے ؎

جھڑکی سہی ادا سہی چینِ جبین سہی سب کچھ سہی پر ایک نہین کی نہین سہی

اس غزل کا یہ شعر کتنا با مزہ ہے ؎

گر نازنین کہے سے بُرا مانتے ہین آپ میری طرف تو دیکھئے مین نازنین سہی

اسی طرح یہ شعر کتنا برجستہ ہے ؎

لے چلا دامان صحرا کو گریبان پھاڑکر آخر آ مجکو جنون چمٹا ہے پیچھے جھاڑکر

اس غزل مین جسکا یہ مطلع ہے ؎

دھوم اتنی تیرے دیوانے مچا سکتے ہین کہ ابھی عرش کو چاہین تو ہلا سکتے ہین

دو چار اشعار بہت برجستہ کہے ہین ؎

مجھسے اغیار کوئی آنکھ ملا سکتے ہین منہ تو دیکھو وہ مرے سامنے آسکتے ہین

حضرتِ دل تو بگاڑ آئے ہین اُس سے لیکن اب بھی ہم چاہین تو پھر بات بنا سکتے ہین

ہے محبت جو تری دل مین وہ اک طور پہ ہے نہ گھٹا سکتے ہین اسکو نہ بڑھا سکتے ہین

آفتاب اُلٹا، قدح شراب اُلٹا، یہ بڑے معرکے کی زمین ہے جرأت نے بھی اس پر خوب طبع آزمائی کی ہے۔ اُن کا یہ مطلع بہت اچھا ہے ؎

نہ جواب لے کے قاصد جو پھرا شتاب اُلٹا مین زمین پہ ہاتھ مارا بہ صد اضطراب اُلٹا

اُن کے یہ اشعار بھی خوب ہین ؎

ترے دور مین ہو کیش کوئی کیا فلک کہ تیری وہی شکل جون دھرا ہو قدح شراب اُلٹا

مرے سو سوال سنکر وہ رہا خموش بیٹھا نہین بولنے کی جا کہ ملا جواب اُلٹا

کسی تذکرے مین پڑھتے مرے شعر جو اٹھا وہ تو ہوا نے دونہی جزوِ ورقِ کتاب اُلٹا

اب سید انشا کو دیکھئے اپنے رنگ مین کیا گلفشانی کرتے ہین ؎

مجھے کیون نہ آوے ساقی نظر آفتاب اُلٹا کہ پڑا ہے آج خم مین قدح شراب اُلٹا

عجب اُلٹے ملک کے ہین اجی آپ بھی کہ تمسے کبھی بات کی جو سیدھی تو ملا جواب اُلٹا

یہ شب گذشتہ دیکھا وہ خفا سے کچھ ہین گویا کہین حق کرے کہ ہووے یہ ہمارا خواب اُلٹا

اس غزل کا یہ شعر مضمون کے اعتبار سے کتنا اچھوتا ہے ؎

یہ عجیب ماجرا ہے کہ بروزِ عید قربان وہی ذبح بھی کرے ہے وہی لے ثواب اُلٹا

اس مطلع مین سوز دل کی کیفیت کا اظہار ہے ؎

فائدہ دل سے تڑپ چھوٹ جب سے کچھ حاصل نہو کاش سا تون دوزخین پہلو مین ہون پر دل نہو

یہ شعر کس مایوسانہ انداز مین کہا گیا ہے ؎

کہہ تو اے چرخ بھلا تجھسے کسیطرح کبھی دل کے ارمان ہمارے بھی نکل سکتے ہین

اسی غزل کا یہ شعر کتنا پر لطف ہے ؎

گرم رو گرچہ رہ کعبہ مین ہم ہین اے شیخ لیکن اسپر بھی جو مچلین تو مچل سکتے ہین

انشاء کی بعض تشبیہین خانہ ساز ہوتی ہین مثلاً ؎

ہوا جب اشکِ دل با فراغ کا بیٹا تو کیون نہ کہئے پھپھولے کو داغ کا بیٹا

دل ستم زدہ بیتابیون نے لوٹ لیا ہمارے قبلہ کو وہابیون نے لوٹ لیا

دل مین سما رہا ہے یون داغ عشق اپنے جسطرح کوئی بھونرا ہووے کنول مین بیٹھا

آخری شعر بہت بلند پایہ ہے اور داغ دل کو اُس بھونرے سے مشابہت دینا جو کنول مین بیٹھا ہے، نہایت نازک خیال ہے۔

معنی آفرینی کے اور نمونے بھی ملاحظہ ہون ؎

پئے تعظیم اشک اسطرح آہ سرد اُٹھتی ہے کہ جیسے قطرہ افشانی سے بوسے گرد اُٹھتی ہے

سیہ بختون کو ساتھ اپنے اٹھایا داغ غم نے یون لپٹ کر مہر سے کاغذ کی جیسے فرد اُٹھتی ہے

مسیحا کا مگر اعجاز ہے پانسو نہین چوپڑ کے کہ مرجاتی ہے، ہو پھر زندہ ہر اک نرد اُٹھتی ہے

انھین کے ساتھ کے یہ شعر کتنے پر درد ہین ؎

گرہ حسرت کی ہر تار نفس مین پڑ گئی جس سے یہ کیسی ہوک ہر دم اے دلِ پر درد اُٹھتی ہے

ہوئی امید حاصل نہ کر جائے گریہ پر لیکن کہ رخصت کے لئے اب یاس غم پرور دُٹھتی ہے

انشا کی مفصلہ ذیل غزل تاریخی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ اُس زمانہ مین

کہی گئی تھی جب دربارِ شاہی سے قطع تعلق ہو گیا تھا اور ان پر عسرت و مفلسی چھا رہی تھی۔ سچ ہے جو بات دل سے نکلتی ہے وہ تیر ہو کر لگتی ہے۔ اس غزل میں درد و سوز کا مرقع کھنچا ہوا ہے، اور ناممکن ہے کہ کوئی شخص اسے پڑھے اور اس کا دل اس کے حسرت خیز مضامین سے متاثر نہ ہو۔

کمر باندھے ہوئے چلنے کو یان سب یار بیٹھے ہین　　بہت آگے گئے باقی جو ہین تیار بیٹھے ہین

نہ چھیڑ اے نکہتِ بادِ بہاری راہ لگ اپنی　　تجھے اٹکھیلیان سوجھی ہین ہم بیزار بیٹھے ہین

بسانِ نقشِ پائے رہروان کوئے تمنا مین　　نہین چلنے کی طاقت کیا کرین لاچار بیٹھے ہین

یہ اپنی چال ہے افتادگی سے اندنون پہروں　　نظر آیا جہان پر سایۂ دیوار بیٹھے ہین

نجیبون کا عجب کچھ حال ہے اس دور مین یارو　　جسے پوچھو یہی کہتے ہین ہم بیکار بیٹھے ہین

کہان گردشِ فلک کی چین دیتی ہے سنا انشا
غنیمت ہے کہ ہمصورت یہان دو چار بیٹھے ہین

یہ غزل پڑھنے کے بعد ممکن نہین کہ آنکھون کے سامنے انقلاب عالم کی ہو بہو تصویر نہ کھنچ جائے۔

اب ہم کلام انشا رسے خاص خاص اشعار منتخب کرکے ہدیۂ ناظرین کرتے ہین۔ ناظرین ان کی لفظی و معنوی خوبیون کا اندازہ خود کرینگے۔

کیسی ہی کیون نہ ہم مین تم مین لڑائیان ہون　　جب کھل کھلا کے ہنس دو باہم صفائیان ہون

اے پاک ذات صدقے تیری خدائی کے مین　　اتنو نہ میرے اسکے ہرگز جدائیان ہون

حیف ایام جوانی کے چلے جاتے ہین　　ہر گھڑی دن کیطرح ہم تو ڈھلے جاتے ہین

کام فرمائیے کس طرح سے دانائی کو　　لگ گئی آگ ہے یان صبر و شکیبائی کو

وعدہ کرتا ہے غزالانِ حرم کے آگے　　کسنے یہ بات سکھائی ترے سودائی کو

جوششِ قلزمِ احد دیکھو　　دیکھو دیکھو یہ جزر و مد دیکھو

جملہ اشیا کائنات کے بیچ　　ہر طرف جلوۂ صمد دیکھو

تاقتیلِ زخمِ تیغِ غمزۂ قاتل نہ ہو　　دل کے بدلے کاش اک اخگر ہو لیکن دل نہو

بستی تجھ بن اجاڑ سی ہے　　کم بخت یہ شب پہاڑ سی ہے

شاید کہ ہوئی سرایتِ عشق　　کچھ سینہ مین چھیڑ چھاڑ سی ہے

ہر چند کہ بولتے نہین وہ　　باہم پر چھیڑ چھاڑ سی ہے

مجھسے فرمانے لگے اب قدر جانی آپکی　　بندہ کس قابل ہے صاحب مہربانی آپکی

بندگی ہنسنے تو جی سے اپنے ٹھانی آپ کی　　بندہ پرور خیر آگے قدر دانی آپکی

گالیان سن کے جی مین آتا ہے　　لیجے تیری زبان مین چٹکی

ل خون جگر میرا ہاتھون سے حنا سمجھے　　مین اور تو کیا کوسون پر تمسے خدا سمجھے

ہنگامۂ محشر بھی گر سامنے آیا تو　　اسکو بھی تماشائی اک سانگ نیا سمجھے

اشکِ مژگانِ تر کی پونجی ہے　　یہ ثمر اس شجر کی پونجی ہے

آہ کو مت حقیر جان　　یہی تو دودمانِ اثر کی پونجی ہے

جلوۂ یار ہے عزیز بہت　　یہی اہلِ نظر کی پونجی ہے

ل گئے پر حجاب باقی ہے　　فکرِ ناز و عتاب باقی ہے

بات سب ٹھیک ٹھاک ہے پہ ابھی　　کچھ سوال و جواب باقی ہے

اسی سلسلے مین ہمین ان غزلیات کا بھی ذکر کر دینا چاہیے جو دیوان بے نقط مین داخل ہین۔ ذی فہم حضرات منصفی فرمائین کہ کسی خاص التزام سے دو چار سطرین لکھنا مشکل ہوتی ہین، نہ کہ دیوان کا دیوان۔ انشا رنے بے نقط قصیدہ بھی لکھا ہے، اور غزلین بھی۔ غزلون کا مجموعہ دیوان کہلانے کا مستحق نہین۔ ہان باعتبار حجم کے رسالہ کہا جا سکتا ہے۔ اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان مین کیا کیا جوہر قابلیت موجود تھے۔ دنیائے ادب مین کچھ یہ نئی نظیر نہین ہے۔ تاہم اگر انشا کا بے نقط کلام فیضی کے سواطع الالہام کے رتبہ کا نہ بھی سمجھا جائے تو انکی ذکاوت فکر اور دقت رسی کا ثبوت کامل ہے۔ یہ چیزین چونکہ غور و خوض کا نتیجہ ہوتی ہین اور طبیعت پر زور ڈالنے سے حاصل ہوتی ہین اس لئے عموماً انہین شگفتگی نام کو نہین ہوتی۔ لیکن انشار نے اس خار و خشک مین بھی بعض جگہ پھولون کی سی دلفریبی کا سامان پیدا کر دیا ہے۔ خواہ مخواہ کے لئے غیر مانوس فارسی و عربی الفاظ ٹھونسکر

کام نہین نکالا، بلکہ دوسری زبانون کے حتی الوسع قریب الفہم، فصیح اور رواجی الفاظ استعمال کئے ہین۔ مثلاً چند منتخب اشعار درج کئے جاتے ہین ؎۔

لالہ گاکر سر کو ہسار لال ہوا ؏ دس لالہ کو طاوس وار حال ہوا
رہا معاملہ اس طور ہمدگر کہ مدام ادہر کو وعدہ ہوا اور اُدھر سوال ہوا
آہ وہ محل سلما وہ دراوہ صحرا کہ صدا حوصلہ اُس مرحلہ کا گر دہا
ہم کو آرام ہو دلا کس طرح اور وہ کام ہو دلا کس طرح
حور عروس مدعا صل علے محمد عطر سہاگ کا لگا صل علے محمد
سلسلہ گر کلام کا وا ہو سامع درد دل کو سودا ہو

بے نقط رُباعی بھی دیکھئے ؎

ہو عطر سہاگ کا لگا کر مسرور آرام محل رکھ اسم دل کا اور حور
وہ طور دکھا کہ ہمکو کل ہو معلوم موسے کا عالم اور وہ لمعۂ نور

ریختی مین بھی انشا کا کلام موجود ہے لیکن افسوس ہے کہ ہم اس طرز سخن کو حد درجہ معیوب خیال کرتے ہین۔ سوسائٹی کا مذاق مختلف ہوتا ہے۔ ممکن ہے کہ جو چیز آج ناپسند کی جاتی ہے وہ کسی زمانہ مین مقبول عام رہی ہو۔ لیکن اس زمانہ مین جبکہ معیار تہذیب بہت بلند ہوگیا ہے ہمین اس قسم کی مزخرافات سے سید انشا کا تعلق تک شرمناک معلوم ہوتا ہے۔ ریختی کی ایجاد سعادت یار خان رنگین کی رنگینی طبع کا نتیجہ ہے۔ رنگین انشا کے گہرے دوست تھے۔ انہون نے بھی ان کا ساتھ دیکر گویا دوستی کا حق ادا کیا ہے؛ لیکن سچ یہ ہے کہ شائستگی و متانت کا خون کیا ہے۔ سعادت یار خان کی طبیعت ندرت پسند رہی ہو یا نہین لیکن انشا مین یہ صفت ضرور تھی۔ انھین اس ایجاد مین ضرور مزہ ملا ہوگا۔ چہل اور ظرافت انمین بھری ہوئی تھی۔ کچھ دنون اسی ذریعہ سے سعادت علی خان اور اُنکے اہل دربار کی سامعہ نوازی کی ہوگی۔ ہمارے ایک دوست کا یہ خیال صحیح ہوسکتا ہے کہ ممکن ہے اُن کے کلام کا یہ حصہ فرمائشی ہو۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جو شخص جان بیلی صاحب رزیڈنٹ سے تعارف کا ذریعہ ایک اوڑھنی سر پر ڈالکر اور صاحب بہادر کی طرف رمز آمیز اشارے کرکے خود پیدا کرنے اُسے از خود یہ کہنے مین کیا تامل ہوسکتا ہے ؎

مین ترے صدقے نہ رکھ اے میری پیاری روزہ بندی رکھ لیگی ترے بدلے ہزاری روزہ یا ؎

بلا سے اگر آئی ہولی کہار و نہ مجھسے کرو بولی ٹھولی کہار و

بہر کیف اسکی شان نزول کچھ ہو لیکن ہم اس کے محاسن پر نگاہ ڈالنے سے قاصر ہین خواہ اس لئے ہی کیون نہ ہو کہ ہم اسقدر بلند نظر نہین۔

سیّد انشا کو فن قصیدہ نگاری سے جو تعلق ہے وہ اس قسم کا ہے جو عام حالتون مین کسی واقفِ ہنر کو اپنے مخصوص ہنر کے ساتھ ہوتا ہے۔ اُردو شاعری کی تاریخ مین انشا سودا کے بعد دوسرے شخص ہین جنھون نے اس میدان کو سر کیا ہے۔ متعدد قصیدے کہے ہین اور خوب کہے ہین نقادان فن اُنمین اصولاً کوئی نقص نہین پاتے۔ مضامین کی بلندی، الفاظ کی شکوہ، خیالات کی نفاست، معانی کی جدّت، غرض ہر پہلو سے وہ قابل تعریف ہین۔

سید انشا کے کلام کی مابہ الامتیاز ایک یہ خصوصیت بھی ہے کہ انہون نے میانہ روی اور اعتدال کو مدنظر رکھکر جو کچھ لکھا ہے وہ بہت خوب لکھا ہے۔ محققین فن سخن کی رائے ہے کہ حقیقی معنون مین شعر اُسی کو کہہ سکتے ہین جسمین سادگی، صداقت، اور جوش تینوا چیزین موجود ہون۔ انشا کے کلام کا بیشتر حصہ اسی قسم کا ہے قصیدہ کا بھی یہی عالم ہے کہ جو کچھ لکھا ہے خواہ مبالغہ سے کیون نہ ہو سامع کو حقیقت کا شبہ دلاتا ہے۔ تشبیب بجائے خود نہایت دقت گذار راستہ ہے۔ لیکن انشا نے اسے بھی بہت کامیابی کے ساتھ طے کیا ہے

ایک قصیدے کے تمہیدی اشعار قابل ملاحظہ ہین ؎

اے خدا وند مہ و مہر و ثریا و شفق لمعہ نور سے ہے تیرے جہان کو رونق
جبکہ کتب ابداع مین تو نے کھولے دفعتاً نسخۂ افلاک کے جون سات ورق
تذکرہ پھر تو ہوا مسئلہ وحدت کا عقل اول نے پڑھا تجھسے مودب ہو سبق
روح کو حکم تعلق بہ جسد فرمایا تاکہ اشکال ہیولےٰ ہو صور ہو مشتق
واسطے فایدے کے سب یہ ہمارے اعضا عاتق و کتف و ید و ساعد و رسغ و مرفق
سمع و ذوق و بصر و لمس و شم و وہم و خیال بن کہے تو نے دیئے ہمکو کریم مطلق
صدقے اس بندہ نوازی کے ترے ہم جائین
باپ مان ہوتے ہین کب ایسے شفیق و اشفق

ایک قصیدہ بے نقط منقبت حضرت علی (کرم اللہ وجہ) مین بہت طول طویل لکھا ہے، اور اسی رعایت سے نام بھی "طور الکلام" رکھا ہے۔ شاہزادہ سلیمان شکوہ، نواب سعادت علی خان، وغیرہ کے نام سے متعدد قصیدے کلیات مین موجود ہین اور مضامین و معانی کی خوبیون کے اعتبار سے ہر ایک بے نظیر ہے۔

شاہزادہ موصوف کی مدح مین ایک قصیدہ کہا ہے جسکا یہ مطلع ہے ؎

صبحدم مین نے جو لی بستر گل پر کروٹ جنبش باد بہاری سے گئی آنکھ اُچٹ

یہ قصیدہ مطول ہے اور سخت اور ناموس قافیون کو بھی نہایت حسن کے ساتھ نباہا ہے۔ اسی طرز کا ایک اور قصیدہ "دولہن جان" کی تعریف مین ہے جسکی بحر بدلی ہوئی ہے لیکن قافئے یہی ہین۔ ایسی سنگلاخ زمینون مین قصیدہ لکھنا ہر شخص کا کام نہین۔ مصحفی نے بھی اسی طرح مین لکھا ہے۔ لیکن وہ انشا کو نہین پہنچ سکے۔ متاخرین مین امیر مینائی مرحوم نے بھی اسی طرز کا ایک شاندار قصیدہ لکھا ہے اُس مین لکھتے ہین ؎

دو قصیدے جو سنے مصحفی و انشا کے واقعی سکۂ رائج ہین ولیکن سلہٹ

غنیمت ہے امیر نے انھین سکۂ رائج تو تسلیم کیا ورنہ آج بہت سے ناقدر شناس انھین کوڑی کام کا بھی نہین سمجھتے حالانکہ ایسا سمجھنے کی کوئی وجہ اُن کے پاس نہین ہے۔

مولنا فضل رب عرشی، حیدرآباد دکن مین دربار آصفی کے ایک ممتاز شاعر گذرے ہین۔ فارسی قصیدے اور مثنویان لاجواب کہتے تھے۔ افسوس کہ ان کا کلام شائع نہ ہوا ورنہ لوگون کو ان کی بلند پائیگی کا حال معلوم ہوتا۔ بزمانۂ قیام دکن ایک عرصہ تک مجھے انکی خدمت مین حاضری کا موقع ملتا رہا۔ فارسی کی کچھ کتابین بھی ان سے پڑھین۔ حضرت سرشار ان کے پاس اکثر آتے تھے، اور یون بھی ان کی صحبت نہایت دلچسپ رہتی تھی۔ اُردو شاذ و نادر کہتے تھے۔ ایک قصیدہ ان کا بھی اس زمین مین موجود ہے۔ چونکہ تفریحاً لکھا گیا اور دربار مین پیش کرنے کا خیال نہ تھا اس لئے یہ اُن کے فارسی قصیدون کی برابری نہ کرسکتا تھا تاہم بعض جگہ فقا کی لطافت اور خیالات کی ندرت قابل دید تھی۔ وہ فرماتے تھے۔ کہ "جو کچھ انشا رکھ گئے وہ انھین کا حق تھا۔ اب لکھنے والے خواہ کتنا ہی لکھین لیکن الفضل للمتقدم"۔

ہمارا خیال ہے کہ محض "الفضل للمتقدم" انشا کی فوقیت کا کفیل نہین بلکہ اچھوتے اور دلپسند خیالات بھی ہین۔ اسی دولہن جان والے قصیدہ مین جس کا شعر اولین یہ ہے ؎

سحر بہار سے خوشبو مین آگئی یہ لپٹ کہ صاف چاند سے کھڑے کے کھل گئے گھونگھٹ

یہ دو شعر کیا خوب کہے ہین اور تشبیہ کی جدت اور تازگی کس درجہ قابل ستائش ہے ؎

ہوا دماغ مین باد بہار کے یہ بھری کہ گھوڑیان عربی جلو مین سرپٹ
کبھی جو انگلیون کی فندق اسکی دیکھے تو بہار بیر بہوٹی کی طرح جا سمٹ

ایک قصیدے کے یہ اشعار کتنے برجستہ ہین ؎

کیا چیز دیو۔ مرد سخندان کے سامنے   پر جلتے فرشتوں کے ہین انسان کے سامنے
جاری مری زبان سے ہون شوز ندرو شہد   گویا اگر ہون اہل صفاہان کے سامنے
لیلے کا ہاتھ پکڑے ہوئے قیس ہو نمود   گر، اڑ کھڑا ہون خار مغیلان کے سامنے
میری بلائین لیتے ہین جنات عدن مین   حورین ہمیشہ جمع غلمان کے سامنے
ہو جائین مست وحش و طیور و سباع سب   ہون گر اُٹھون جو دشت و بیابان کے سامنے

تقریباً دو سو اشعار کا قصیدہ "سالگرہ بادشاہ ولایت انگریز بہادر مشتمل بر تعریف گورنر صاحب" کے عنوان سے تحریر کیا ہے۔ اس مین خصوصیت سے انگریزی الفاظ استعمال کئے ہین اور نہایت برمحل۔ اسی کو دیکھکر مولانا آزاد کہہ اُٹھے کہ انشا کو سو سال بعد پیدا ہونا چاہئے تھا۔ اس سے یہ بات بھی ظاہر ہوتی ہے کہ انشا کے وقت مین ہی بہت سے انگریزی الفاظ اُردو مین گھل مل گئے تھے ورنہ اُن کا نظم مین اس روانی کے ساتھ چسپان کرنا مشکل تھا۔ اسکا مطلع کس شان کا کہا ہے ؎

گھٹیان نور کی تیار کرا سے بوئے سمن   کہ ہوا کھانیکو نکلین گے جوانان چمن

خیالات کی جدت، مضامین کی برجستگی، الفاظ اور بندش، غرض ہر لحاظ سے یہ اُن کے قصیدون مین فرد ہے۔ اس مین حتی الوسع زبان کی سلاست کا بھی بہت خیال رکھا ہے۔ دو چار شعر نمونتاً درج کئے جاتے ہین اُن سے ناظرین کو معلوم ہوگا کہ اُردو نظم مین انگریزی الفاظ کا پیوند کس خوبصورتی سے لگایا ہے ؎

پتے ہل ہل کے بجا وینگے فرنگی طنبور   لالہ دیگا سلامی کو بنا کر پلٹن
کھینچ کر تار رگ ابر بہاری سے کئی   خود نسیم سحر آوے گی بجاتی ارگن
اردلی کے جو گرانڈیل ہین ہونگے سب جمع   قرنا پھونکیگا جسوقت کہ آ کمہدرشن
آج ہے جون مہینے کی یہ چوتھی تاریخ   کیون نہ اُس روز مبارک کی خوشی ہو ہر بن
ہے اس آفت کا سیک سیر کہ اکب اُسکا   حاضری کھائے جو کلکتہ تو لندن مین تفن

یہ تو یقینی بات ہے کہ اُسوقت تک تحصیل زبان انگریزی کا کوئی چرچا نہ تھا اور یہ قیاس بھی نہین ہو سکتا کہ انشا نے بطور مستثنیات کے اسے سیکھا ہو۔ ہان یہ ضرور ہے کہ انھین سر جان ہیلی سے بے تکلفانہ تعارف تھا۔ سر جان خود ایک مستشرق عالم تھے۔ ممکن ہے کہ انھین کے فیض صحبت سے انھین انگریزی مین شد بد ہوگئی ہو۔ سید انشا یون بھی اجنبی زبانون مین مہارت پیدا کر لینے مین فطرتی مناسبت رکھتے تھے اور اسکا ثبوت ان کے کلیات سے بھی ملتا ہے جسمین عربی فارسی، ترکی، بھاشا، پشتو، پوربی کے نمونے موجود ہین۔

غزل اور قصیدہ کی طرح رباعیات بھی قدر کی چیز ہین۔ ہم اس جگہ اُن مین سے چند ہدیہ ناظرین کرتے ہین امید کہ دلچسپ ثابت ہونگی ؎

ہے کس مجھے تو سب، ہے کس سے پیر   کعبہ مین بہت رہا۔ ہے اب قصد دیر
اے زاہد و برہمن نہین ہے کچھ فرق   یہ بھی اک سیر ہیگی۔ وہ بھی اک سیر

زاہد جو ہین اُنھین ہے طاعت پہ گھمنڈ   اہل دنیا رکھتے ہین دولت پہ گھمنڈ
واقف ہون نہ طاعت سے نہ دولت سے مین   ہے مجکو اگر تو تیری رحمت پہ گھمنڈ

عالم کے بھی طور ہمنے کیا کیا دیکھے   خوبان کے بھی لطف و جور کیا کیا دیکھے
شادی و غم و وصل و ہجر اے انشا   کیا کیا دیکھین گے اور کیا کیا دیکھے

گذری دنیا مین خیر جیسی گذری   ہر طرح یہ غم مین ایسی تیسی گذری
پر وہان کی خبر ملی نہ کچھ آج تلک   بیچارے مسافرون پہ کیسی گذری

متعدد مثنویان، ہجوین اور قطعات وغیرہ بھی انشا سے یادگار ہین، اور ہر ایک چیز مین انشا کا طبعی رنگ موجود ہے۔ ہجوین سودا کے پایہ کو نہین پہنچین۔ میر کی ہجوؤن سے البتہ اچھی ہین۔ تاریخی مادے بعض بہت موزون واقع ہوئے ہین۔ مثلاً شاہزادہ

سلیمان شکوہ کے عقد کی تاریخ لکھی ہے :-

"عقد بلقیس با سلیمان است"

پہیلیان چیستانین بھی خوب کہی ہین۔ اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ طبیعت کتنی رسا رکھتے تھے۔ کئی مصرعے اس صنعت کے ساتھ کہے ہین جو کئی زبانون مین پڑھے جا سکتے ہین۔ غرضکہ سید انشا کمالات گوناگون کے جامع تھے اور وہ اس لحاظ سے اُردو کے "خسرو" کہے جانے کے ہر طرح مستحق ہین۔

اردو زبان کو سید انشا ایسے زبردست شعرا کی ذات پر ناز ہونا چاہئے۔ لیکن جب کسی قوم کی اخلاقی حالت گری ہوئی ہوتی ہے تو اس سے اسلاف پرستی کا مادہ سلب ہوجاتا ہے۔ ایک یورپ ہے کہ ایشیائی شعرا کے کلام کے ساتھ اعتنا کر کے انھین بقائے دوام کی خلعت دے رہا ہے اور ایک ہم ہین کہ اپنے بزرگون کے کارنامون پر پانی پھرتا دیکھتے ہین لیکن ہوش نہین آتا۔ یورپ مین مشہور لوگون کی تصانیف کی قدر کرنے کا ایک معمولی طریقہ یہ ہے کہ ان کو عمدہ طور پر چھپوا دیتے ہین۔ اگر ہم بھی اس پر کاربند ہون تو شاید بحالت موجودہ قدر دانی کا یہی اعلےٰ معیار ثابت ہوگا۔ اگر کلیات انشا مکمل نہین تو منتخب اچھی صورت مین چھاپ دی جائے تو اردو ادب پر بڑا احسان ہوگا، بلکہ ہمارے خیال مین تو انتخاب ہی مناسب ہے تاکہ جو حصہ قابل اعتراض نظر آئے وہ انتخاب مین نہ لیا جائے۔

سید محمد فاروق (شاہپوری)

حُسنِ انتخاب

(۱)

جب ریاست دیوگڈھ کے دیوان سردار سبحان سنگھ بوڑھے ہوئے تو انہون نے جاکر مہاراج سے عرض کی کہ غلام نے حضور کی خدمت چالیس سال تک کی، اب کچھ دن پرماتما کی خدمت کرنے کی اجازت چاہتا ہون۔ علاوہ اس کے اب میرے قوا کمزور ہوئے، ریاست کا کام انجام نہین دے سکتا۔ کہین بھول چوک ہوجائے تو بڑھاپے مین داغ لگے۔ نیکنامی مدتون مین ملتی ہے ؛ بدنامی لمحون مین ملجاتی ہے۔

راجہ صاحب اپنے بیدار مغز دیوان کی بڑی قدر کرتے تھے۔ بہت افسوس کے ساتھ انکی درخواست منظور کی۔ لیکن اس شرط پر کہ وہ اپنے جانشین کا انتخاب بھی خود ہی کرین۔

دوسرے دن ملک کے تمام سربرآوردہ اخبارون مین اعلان ہوا کہ ریاست دیوگڈھ کے لئے ایک لائق دیوان کی ضرورت ہے جو شخص اپنے تئین اس منصب کے قابل سمجھے وہ موجودہ دیوان صاحب کی خدمت مین حاضر ہو۔ یہ لازمی نہین کہ وہ گریجویٹ ہو لیکن توانا اور تندرست ہونا لازمی ہے۔ سوء ہضم کے مریض کو تکلیف کرنے کی ضرورت نہین۔ یہان ایک مہینہ تک امیدوارون کے طور وطریق اور کسب وکمال کی آزمایش کی جائے گی۔ علم کا بہت کم لیکن عمل کا بہت زیادہ لحاظ کیا جائے گا۔ اس آزمایش مین جو شخص پورا اترے گا وہ اس اونچے منصب پر مامور کیا جائے گا۔ آمد ورفت اور دوران قیام کے سب مصارف ریاست کی جانب سے دیئے جائینگے۔

(۲)

اس اعلان نے ملک مین ہلچل مچادی۔ ایسا اونچا عہدہ اور کسی قسم

سند کی قید نہین! صرف تقدیر کا کھیل ہے۔ سیکڑون آدمی اپنا اپنا نصیب آزمانے کے لئے چل کھڑے ہوئے۔ دیوگڈھ مین نئے نئے اور رنگ برنگ کے انسان نظر آنے لگے۔ ہر ایک ریلوے ٹرین سے امیدوارون کا ایک قافلہ اترتا۔ کوئی پنجاب سے چلا آتا تھا، کوئی مدراس سے کوئی نئی وضع کا پابند۔ کوئی سادگی کا دلدادہ۔ پنڈتون، مولویون، اور پنشن یافتہ عہدہ دارون کو بھی اپنی تقدیر کے امتحان کا نادر موقع ہاتھ آیا۔ بیچارے۔ سرٹیفکٹ کے نام کو رو تے تھے۔ اس قید سے نجات ہوئی۔ رنگین عمامے اور قبا اور رنگ برنگ کے انگرکھے اور کنٹوپ، دیوگڈھ مین اپنے جلوے دکھانے لگے۔

لیکن سب سے زیادہ تعداد گریجوایٹون کی تھی۔ کیونکہ سند گو لازمی نہو پردہ پوش ضرور ہے۔

سردار سجان سنگھ نے ان حضرات کے قیام او رمہمانداری کا پورا انتظام کر دیا تھا۔ لوگ اپنے اپنے کمرون مین جاڈٹے اور مہینہ کے دن گننے لگے۔ علم کے مقابلہ مین عمل پر زیادہ لحاظ کئے جانے کا اعلان تھا اس لئے ہر فرد اپنے معیار کے مطابق اپنے خصائل کو بہترین صورت مین دکھانے کی کوشش کرتا تھا۔ مسٹر الف نو بجے دن تک سونے کے عادی تھے۔ آج کل وہ نور کے تڑکے باغیچہ مین ٹہلتے اور جمائیان لیتے نظر آتے۔ مسٹر ب کو حقہ پینے کی دھت تھی۔ آج کل بہت رات گئے کواڑ بند کر کے سگرٹ پیا کرتے تھے۔ مسٹر ج سے اُن کے گھر کے سب نوکر بیزار تھے انھین آجکل سب نوکر کھلے دل سے دعائین دیتے تھے مسٹر د فلسفی تھے اور خدا کے وجود سے منکر۔ آج کل ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پوجاری کو اپنے عہدہ سے مستعفی ہونا پڑے گا۔ مسٹر س کو کتابون سے نفرت تھی۔ لیکن آج کل وہ بڑی بڑی ضخیم جلدین سامنے رکھے دیوانی کے خواب دیکھنے مین محو رہتے۔ شرما جی گھڑی رات ہی سے وید منتر پڑھنے لگتے تھے۔ اور مولنا صاحبون کو وظیفہ اور نماز اور تلاوت کے سوا اور کوئی کام ہی نہ تھا۔ غرض جس شخص سے ملئے وہ اخلاق اور انکسار اور شرافت کا دیوتا معلوم ہوتا تھا۔ ایک مہینہ کا سوانگ ہے یہ کسی طرح کٹ جائے گوہر مراد ہاتھ آگیا تو پھر کون پوچھتا ہے! ہر ایک دل مین یہ خیال بسا ہوا تھا۔

لیکن انسانون کا وہ بڑھا جوہری آڑ مین بیٹھا ہوا دیکھ رہا تھا کہ ان بگلون مین ہنس کہان چھپا ہوا ہے۔

ایک روز نئی وضع والون کو سوجھی کہ آج آپس مین ہاکی کا مقابلہ ہوجائے۔ یہ تجویز چند ہاکی کے مشاق کھلاڑیون نے کی۔ یہ بھی تو آخر ایک کمال ہے۔ اسے کیون چھپا رکھین۔ ممکن ہے کہ ذرا چابکدستی ہی کچھ کام کر جائے۔ طے ہوگیا۔ دو کو کون کہے دس پانچ ٹیمین بن سکتی تھین۔ فریقین نے اپنے کھلاڑی چھانٹ لئے، اور میدان مین ہاکی کا گیند کسی دفتر کے اپرنٹس کی طرح ادھر اُدھر ٹھوکرین کھانے لگا۔

ریاست دیوگڈھ مین یہ کھیل بالکل نرالی بات تھی۔ ایسے دوڑ دھوپ کے کھیل بچون کے لئے مخصوص تھے۔ تعلیمیافتہ لوگ شطرنج اور گنجفہ جیسے تیمن کھیل کھیلا کرتے تھے۔ ہزارون آدمی جمع ہو گئے۔ لیکن حدود سے دور دور۔ گیند کیا ہے پتھر ہے۔ کہین سر پر پڑجائے تو کام ہی تمام کر دے۔ ایسے کھیل سے دور ہی رہنا اچھا۔

کھیل بڑی سرگرمی سے ہو رہا تھا۔ دھاوے کے لوگ جب گیند کو لیکر تیزی اور جوش سے بڑھتے تو ایسا معلوم ہوتا گویا ایک پُرشور لہر بڑھتی چلی آتی ہے۔ لیکن دوسرے فریق کے محافظ گیند کو آگے نہ بڑھنے دیتے تھے۔ اس آہنی دیوار سے ٹکر کھاکر یہ لہر پھر لوٹ آتی۔

شام تک یہی جوش و خروش رہا۔ لوگ پسینہ مین شل تھے۔ خون کی حرارت آنکھ اور چہرہ سے جھلک رہی تھی۔ لیکن ہار جیت کا فیصلہ نہو سکا۔ لوگ اپنے اپنے قیامگاہ کو لوٹے۔

اندھیرا ہوگیا تھا۔ اس میدان کے پچھم کی طرف ایک نالا تھا۔ اس پر

کوئی گذرگاہ نہ تھی۔ راستہ [illegible] ے مین ہوکر جاتا تھا۔ ایک کسان اناج بھری ہوئی گاڑی لئے ہوئے اسی تنگ راستہ سے آیا۔ لیکن کچھ تو نالے مین کیچڑ تھا، اور کچھ اُسکی چڑھائی اتنی تیز تھی کہ گاڑی اوپر نہ چڑھ سکی۔ کسان حیران تھا۔ وہ کبھی بیلون کو للکارتا، کبھی پہئے کو ہاتھون سے ڈھکیلتا لیکن بوجھ زیادہ تھا اور بیل کمزور۔ گاڑی اوپر نہ چڑھتی۔ اگر بہت زور مارنے پر کچھ ابھرتی بھی تو پھر تیزی سے نیچے کی طرف ڈھل جاتی، پھر وہی کشمکش شروع ہوجاتی۔ کسان بار بار بیلون کو ارتا، چیختا، لیکن گاڑی اُبھرنے کا نام نہ لیتی۔ بیچارہ اِدھر اُدھر مایوس نگاہون سے تاکتا، لیکن کسی نجات دہندہ کی صورت نہ دکھائی دیتی۔ گاڑی کو اکیلا چھوڑ کر کہین جا بھی نہ سکتا تھا۔ غریب سخت عذاب مین مبتلا تھا۔ اسی اثنا مین کھلاڑی لوگ ہاتھون مین ڈنڈے لئے جھومتے جھامتے اُدھر سے نکلے۔ کسان نے انکی طرف مرعوب نگاہون سے دیکھا۔ کسی سے مدد مانگنے کی جرات نہوئی۔ سیکڑون آدمیون کی جمعیت تھی۔ کوئی اس غریب کی طرف مخاطب نہوا۔

اس جماعت سے بہت پیچھے ایک نوجوان لنگڑاتا ہوا چلا آتا تھا۔ آج ہاکی کھیلتے ہوے اُس کے پیرون مین چوٹ آگئی تھی۔ لمبا جوان تھا سڈول جسم۔ اسکی نگاہ بھی گاڑی پر پڑی۔ ٹھٹک گیا۔ صورت حال سمجھ مین آگئی۔ ڈنڈا ایک کنارے رکھدیا۔ کوٹ اتار ڈالا اور کسان کے پاس جاکر بولا "مین تمہاری گاڑی نکالدون؟"

کسان ڈرتے ڈرتے بولا "ہجور مین آپ سے کیسے کہون"

نوجوان بولا "معلوم ہوتا ہے تم یہان بہت دیر سے پھنسے ہوے ہو۔ اچھا تم گاڑی پر جاکر بیلون کو سادھو۔ مین پہئون کو ڈھکیلتا ہون ابھی گاڑی اوپر جاتی ہے"

اسنے پہیون کو ڈھکیلنا شروع کیا۔ دلدل زیادہ تھی۔ وہ گھٹنون تک زمین مین گڑ گیا۔ لیکن ہمت نہ ہارا۔ پھر زور کیا۔ اُدھر کسان نے بیلون کو چمکار کر للکارا۔ بیلون کو کچھ سہارا ملا۔ ہمت بندھ گئی۔ انہون نے کندھے جھکا کر جو ایک دفعہ زور کیا تو گاڑی اوپر تھی

کسان ہاتھ جوڑ کر بولا "مہراج آج تمنے مجھے اُبار دیا نہین تو ساری رات یہین بیٹھنا پڑتا"

نوجوان نے ہنسکر کہا "اب مجھے کیا انعام دیتے ہو؟"

کسان نے صدق دل سے جواب دیا "مین ہجور کو کیا دیسکتا ہون نارائن کرے تم ہمارے دیوان ہوجاؤ"

(۴)

مولویون اور پنڈتون نے دیکھا کہ نئی روشنی والے نئی چال چل رہے ہین، اور آج کل ورزش اور پھرتی کی قدر ہوتی ہے تو انہون نے بھی کچھ کرتب دکھانا چاہا۔ ایک پنڈت جی نے فرمایا "بھئی ہمکو تو کبڈی خوب آتا ہے جسے پکڑلون پھر نہین چھوڑنا چاہے وہ مجھے پانی تک گھسیٹتا چلا جائے" دوسرے پنڈت جی نے گلی ڈنڈے پر زور دیا۔ لیکن مولوی صاحبون کو ان تجویزون مین کچھ بیدلی معلوم ہوا۔ انھون نے پٹے اور بنوٹ کی صلاح دی۔ پنڈتون نے کہا یہ ہمسے نہ ہوگا۔ یہان دیوانی لینے آئے ہین ہاتھ پیر تڑوانے نہین آئے۔

آخر بہت ادوکد کے بعد شاعری کی ٹھیری۔ مولویون نے راجہ صاحب کی شان مین مدحیہ قصائد کہے۔ پنڈتون نے کبت اور شلوک بنائے۔ کسی نے تشبیب مین علم نجوم کا خاتمہ کردیا۔ کسی نے گریز مین نزاکت پیدا کی۔ کسی نے دعائیہ کلام مین جدت دکھائی۔ راجہ صاحب کو زیادہ فرصت تو نہ تھی لیکن سمجھے آدمس لین ہرج ہی کیا ہے۔ ذرا دل لگی رہے گی گھنٹون تک قصیدون اور شلوکون کی بارش ہوتی رہی۔ درباریون کی تحسین ناشناس نے کچھ حوصلا افزائی تو نہ کی۔ لیکن یہان تو اپنے کام سے کام تھا۔ شعر و شاعری سے کیا غرض تھی۔ شاعر کو خدا مل جاتا ہے دیوانی مل جائے تو کیا تعجب ہے!۔

اِدھر تو یہ شاعرانہ گرم بازاری تھی۔ اُدھر شہر کے باہر ایک پہاڑ

کے دامن میں جہاں اکثر مسافر لوگ شب باش ہوتے تھے ڈاکہ پڑ رہا تھا۔ ڈاکو مسلح تھے۔ پہلے شور و غل سنائی دیا پھر کئی بندوقوں کی آوازیں آئیں۔ دیوانی کے امیدوار حضرات نے یہ شور و شر سنا تو چونکے۔ سامنے تھوڑی دور پر مشعل کی روشنی دکھائی دی۔ ہوش و حواس جاتے رہے دس پانچ نازک طبع حضرات تو وہیں غش کھا کر گر پڑے۔ کمرے کے دروازے کھٹا کھٹ بند ہونے لگے۔ دلوں میں دھڑکن شروع ہوئی لوگ ایک سناٹے کے عالم میں کان لگائے سن رہے تھے کہ کہیں کمبخت ادھر تو نہیں آ رہے ہیں۔ کیا آفت میں جان مبتلا ہوئی۔ باز آئے اس دیوانی سے۔ یہاں سے جان سلامت جائے تو یہی غنیمت ہے۔

دم کی دم میں یہ خبر ساری بستی میں پھیل گئی۔ لیکن تھانہ میں جانے میں اُسے غیر معمولی تاخیر ہوئی۔ ریل گاڑی اسٹیشن کے قریب پہنچکر دھیمی ہو جاتی ہے۔ جب کوتوال اور داروغہ اور سپاہی ہتھیار سجکر ایک جم غفیر ساتھ لئے موقع واردات کی طرف چلے تو ایسا معلوم ہوتا تھا گویا بلادتی جنو اس کو جا رہے ہیں۔ کوتوال صاحب کی طبیعت تو راستہ ہی میں ناساز ہو گئی، اور کئی کانسٹبل ٹھوکر کھا کھا کر اس زور سے گرے کہ کسی طرح اُٹھ ہی نہ سکتے تھے۔ بیچارے تھانہ دار صاحب آگ میں جھونکے گئے لیکن جب یہ جماعت منزل مقصود پر پہنچی تو وہاں ڈاکوؤں کی بو بھی نہ تھی۔ دو تین عورتیں بیٹھی ہائے وائے کر رہی تھیں، اور کچھ لوگ زخم کھائے ہوئے پڑے سسک رہے تھے۔

داروغہ صاحب کی جان میں جان آئی۔ اب وہ شیروں کی طرح گرجنے لگے۔ چہرہ سے ہیبت برسنے لگی۔ وہ ہمت اور مردانگی جو ڈاکوؤں کی تلاش میں گئی تھی واپس آئی۔ تحقیقات کرنے لگے۔ ڈاکو تعداد میں کتنے تھے؟ کون کون سے ہتھیار اُن کے پاس تھے؟ کدھر سے آئے؟ کدھر گئے؟ کون سی بولی بولتے تھے؟ ہندو تھے یا مسلمان؟ گورے تھے یا کالے؟ بوڑھے تھے یا جوان۔ کس کا مال لے گئے؟ کتنا لے گئے؟

تب ایک بڑھیا بولی: "اگر اس میرے لال نے نہ مدد کی ہوتی تو ایک دھاگا بھی نہ بچتا۔"

داروغہ نے تڑپ کر پوچھا: "وہ کون آدمی تھا؟"

بوڑھیا نے کہا: "کوئی دیوتا تھا اور کون تھا۔ ہتیارے ڈاکو ہمارے ہاتھ پیر باندھ کر دھمکا رہے تھے۔ جو ذرا چوں بھی کرتا تو اُسے ڈنڈے سے مار بیٹھتے۔ ایک جوان سا آدمی جانے کدھر سے آیا، ناراین اُسے یہاں کا دیوان بنائے۔ اُسنے آکر للکارا اور دو تین ڈاکوؤں کو مار گرایا۔ وہ ہتیارے پڑے سسک رہے ہیں۔ پھر تو ہمارے آدمیوں کی ہمت بندھ گئی۔ لوگ سنبھل گئے۔ اُس جوان کو بھی جرور چوٹ آئی ہے چاہے جہاں آئی ہو۔ اُس کے کپڑے لہو میں بھیگے ہوئے تھے۔"

داروغہ جی ساری رات تحقیقات کرتے رہے۔ اور صبح ہوئی تو زخمی ڈاکو تھانہ کے سامنے زنجیروں میں جکڑے بیٹھے تھے۔ ساری بستی میں داروغہ جی کی کارگذاری کی دھوم مچی ہوئی تھی۔ یہ اُنھیں کا کام تھا کہ جان جوکھم میں ڈالکر ڈاکوؤں کو گرفتار کیا۔

(۵)

آخر مہینہ ختم ہوا۔ روز حساب آپہنچا۔ امیدوار حضرات صبح ہی سے اپنی قسمتوں کا فیصلہ سننے کے لئے بیقرار ہونے لگے۔ دن بڑی مشکل سے کٹا۔ روزہ کا دن بھی شاید ایسا پہاڑ نہوتا ہو۔ ہر ایک چہرہ پر امید و بیم کی تصویر کھنچی ہوئی تھی۔ نہیں معلوم آج کس کے اقبال کا ستارہ چمکیگا۔ شام کے وقت شاہی دربار آراستہ ہوا۔ شہر کے روسا اور ریاست کے اہلکار درباری لباس پہنے درجہ بدرجہ بیٹھے۔ دیوانی کے امیدواروں کا جتھا بھی رنگ برنگ کے لباس اور فیشن کی تڑپ جھڑپ دکھاتا ہوا جلوہ افروز ہوا۔

تب سردار سجان سنگھ نے کھڑے ہو کر فرمایا۔

اے میرے دیوانی کے امیدوار صاحبو! مین نے آپ لوگون کو جو کچھ تکلیف دی ہو اس کے لیے مجھے معاف کیجئے مجھے اس خدمت کے لئے ایک ایسے آدمی کی ضرورت تھی جس کے پہلو مین درد رس دل، اور دل مین مردانہ ہمت ہو۔ اور ریاست کے لئے عین خوش قسمتی کا باعث ہے کہ ہمنے اس آدمی کو ڈھونڈھ نکالا۔ ان اوصاف کے آدمی بہت تھوڑے ہین۔ اور جو ہین وہ عزت، اور ثروت، اور نیکنامی کی چوٹیون پر بیٹھے ہوئے ہین۔ جہان تک ہماری پہنچ نہین مین ریاست کو پنڈت جانکی ناتھ سا دیوان ملنے پر مبارکباد دیتا ہون

ریاست کے اہلکارون اور رئیسون اور امیدوارون نے جانکی ناتھ کی طرف دیکھا، اُنہون نے تعظیم سے انہون نے رشک سے،

سردار صاحب نے پھر کہا:۔

"آپ لوگون کو یہ تسلیم کرنے مین شاید تامل نہو کہ جو جوان خود زخمی ہونے پر بھی ایک غریب کسان کی بھری ہوئی گاڑی کو دلدل سے نکالکر نالے کے اوپر چڑھا دے اُس کے پہلو مین درد رس دل ہے۔ صرف درد رس دل نہین بلکہ اس مین ہمت اور حوصلہ ہے جوش اور ایثار ہے۔ وہ غریبون سے ملسکتا ہے۔ اُن کے دکھ اور اُنکی خوشی مین شریک ہوسکتا ہے۔ اُس خوفناک ڈاکہ کی خبر بھی آپ نے سنی ہے مجھے تھانہ دار صاحب معاف فرمائین۔ وہ نوجوان جسنے اپنی جان خطرہ مین ڈالکر کتنے ہی غریب مسافرون کی جان بچائی۔ کیا اس کی ہمت اور دلیری مین کوئی شک ہوسکتا ہے۔ ایسا انسان غلطی کرجائے، دھوکا کھاجائے لیکن وہ دیدہ و دانستہ فرض اور سچائی کے راستے سے نہین ہٹیگا، کیونکہ اسکے پہلو مین درد رس دل اور دلمین مردانہ ہمت ہے!۔

نظم ہاشمی

(ملاحظہ ہو رسالۂ آلناظر لکھنؤ بابت ماہ جون ۱۹۱۲ء)

لکھنؤ کا مشہور رسالۂ آلناظر جو موقت الشیوع ہونے کے لحاظ سے ملک کا ایک ہی پرچہ ہے، ہماری نظر سے ہمیشہ گزرتا رہا ہے اور اب بھی ہم اُسے شوق سے دیکھتے ہین مگر افسوس ہے کہ جسقدر وہ اپنی پابندی وقت کے لحاظ سے قابل قدر ہے اُسی قدر اپنی گرگٹ کی طرح رنگ بدلنے والی پالیسی کے اعتبار سے مضحکہ خیز بھی ہے۔ اُسنے اس پانچ سال کے عرصہ مین یعنی آغاز اجراء سے ابتک سیکڑون پلٹے کھائے اور پچاسون معنوی وظاہری رنگ بدلے۔ شروع مین وہ چالیس صفحہ پر شایع ہوتا تھا۔ بڑھتے بڑھتے اسّی صفحون پر پہنچ گیا۔ اور جو پھر رجعت قہقری اختیار کی تو ۴۸ ۵۶ صفحون پر آرہا! یعنی کبھی وہ ایک فقیر کا بھرا ہوا کشکول تھا جسمین فلسفیانہ علمی تاریخی ادبی، معاشرتی وتعلیم نسوان کے متعلق غرض ایک ایک مضمون ہر قسم کا ہوتا تھا، اور نظمین بھی بکثرت، غزلین بھی معقول تعداد مین۔ مگر اب[1] اس کشکول مین چند مختلف سوکھے ٹکڑون کے سوا کچھ نہین ہوتا۔ نہ نظم کا کوئی شمار ہے اور نہ مضامین کا جو کچھ جس صورت سے پایا بھر دیا۔ اور ایک "دفتر بے معنی" کی صورت بنادی گئی۔ کبھی اُس کے آخر مین ربع مجیب جیسا علمی رسالہ ناتمام ضیمہ کی طور پر شایع ہوکر رہ گیا، کبھی محاربات صلیبی جیسی تاریخی قابل قدر کتاب شایع ہوئی۔ کبھی علمی وتاریخی ضیمہ سے گزر کر شکسپیر کے ڈرامے کا ترجمہ چھپا۔ اور اب یہ دُم چھلا بھی اڑا دیا گیا۔ پہلے ترتیب مضامین اور تھی اب کچھ اور ہے۔ ہمین

[1] فقیر کا کشکول مین نے اس وجہ سے کہا کہ اسی جون نمبر مین ایک مضمون چھپا ہے جسمین قابل مضمون نگار نے ظرافت کے رنگ مین ایڈیٹر الناظر اور دیگر رسائل کے ایڈیٹرون پر خوب خوب پھبتیان اڑائی ہین اور بھک منگا فقیر بنایا ہے، اور حق یہ ہے کہ بجا طور پر بنایا ہے۔

اعتراف ہے کہ الناظر کے صفحات پر کسی زمانہ مین نثر مضامین اچھے اچھے نکل گئے ہین اور بعض نظمین بھی مگر جب سے حضرت شوق نے کنارہ اختیار کیا، اور ایڈیٹر صاحب کی وہ قدر افزائی (جسکا اظہار حضرت شوق کی ایک نظم نیرنگ خیال پر بصورت تنقید کیا گیا تھا) دیکھکر دیگر قلمی معاونین نے بھی رفتہ رفتہ کنارہ کشی اختیار کی اور یہین سے الناظر کے تنزل کی تاریخ کا پہلا باب شروع ہوتا ہے۔ اب اُس مین دوچار مضمون اور ایک آدھ نظم نظر آجاتی ہے۔ مگر جب اصول فن اور صحت زبان کے اعتبار سے دیکھا جائے تو دونون حصے قابل اصلاح نظر آتے ہین جس طرح کہ آج سے چند سال پیشتر تھے۔ بالخصوص حصہ نظم۔ اسکی وجہ شاید یہ ہو کہ الناظر کے عالی خیال ایڈیٹر نظم سے محض نابلد ہین مگر کیا ایسی حالت مین کہ اُس کا سب ایڈیٹر خود خوشگو شاعر اور زبان و اصول سے واقف ہے، الناظر مین ایسی مہمل نظمون کا شائع ہونا افسوس ناک نہین ہے؟ ملک مین یون تو اکثر ادبی رسالے ناقدری کے ہاتھون مٹ گئے۔ اب چند ماہ سے الناظر بھی گر رہا ہو اکثر مضامین نگار ٹوٹ گئے۔ مضامین کی تعداد گھٹ گئی ہے۔ صرف دوچار رطب ویابس مضمون چھپ جاتے ہین۔ مگر سید ہاشمی صاحب فرید آبادی کی توجہ آجکل الناظر کے حال پر خاص طور پر مبذول معلوم ہوتی ہے۔ سید صاحب کا نام اخباری دنیا مین نیا نہین ہے۔ علی گڈھ کالج سے وہ اپنی خودسری اور شوریدہ خیالی کی بدولت نکالے جانے پر ملک مین کافی شہرت پا چکے ہین۔ معلوم ہوتا ہے کہ کالج سے اخراج کے بعد اُن کے ذمہ کوئی کام نہین رہا ہے۔ اور غریب ایڈیٹر نے بھی اپنی ضرورتون کو ملحوظ رکھکر اسکو غنیمت جانا۔ ہمارے سید صاحب صرف نثار ہی نہین بلکہ شاعر بھی ہین۔ لیکن لکھنؤ سے انھین خاص پرخاش ہے۔ چنانچہ اسی جون کے الناظر مین سب سے پہلا مضمون جو اردو تحریر اور ترجمے کے عنوان سے ۱۰ صفحون پر شائع ہوا ہے اس کا اصل موضوع یہی ہے کہ لکھنؤ کے ارباب کمال اور مشاہیر کی تذلیل و تحقیر کی جائے۔

ہم ذیل مین سید صاحب کے چند فقرے درج کرتے ہین۔ جو ہمارے دعوے کا ثبوت ہین۔ صفحہ ۶ پر مولانا حالی پانی پتی کی مدح سرائی کے ضمن مین جن کی شاعرانہ قابلیت و واقفیت کی داد مرحوم اودھ پنچ صحیح معنی مین بارہا دے چکا ہے تحریر فرماتے ہین:۔

" اسے خدا کی دین کہتے ہین اور ہم اسکی مہربانی سمجھتے ہین کہ جب دلّی کے لوگ اونگھ رہے تھے اور لکھنؤ والے ہذیان بک رہے تھے، شاعری کے دیوتا نے پانی پت مین جنم لیا۔

اب نثر کے سلسلہ مین ارشاد ہوتا ہے، ملاحظہ ہو صفحہ ۸۔۔

" درحقیقت یہی چیز جس مین میر حسن کی مثنوی اور نثر مین میر امن کی چار درویش کی کامیابی کا راز چھپا ہوا ہے۔ اور اسی توازن کا فقدان ہے جسکی وجہ سے فسانۂ عجائب نہ زیادہ مقبول ہوئی اور نہ قابلیت رکھتی ہے کہ آئندہ مقبول ہو"

مگر ہم کہتے ہین کہ سید صاحب کی یہ خودرائی اور چیز ہے اور زمانہ کا مشاہدہ اور شے۔ آفتاب پر خاک ڈالنے سے کچھ نہین ہوتا۔ فسانۂ عجائب جسقدر مقبول و مشہور ہوئی دنیا جانتی ہے۔ سرور اپنے رنگ کا آجتک بے مثل انشا پرداز مانا جاتا ہے۔ سید صاحب کی اور گلفشانی دیکھیے۔

" ہماری مراد یہ نہین ہے کہ اس مین فارسی عربی کا میل کم ہو۔ الفاظ پر ہم نہین لڑتے ہم فارسیت و عربیت پر نکتہ چین ہین۔ فسانۂ عجائب پہلے نقص کی بہترین نظیر ہے۔ اور دوسرا عیب عربیت کا پرانے مولویون کے ہان جابجا ملتا ہے"

صفحہ ۱۳ سطر ۲-۳ " غرض یہ حقیقت مین یہ کافی ہے نہ ممکن العمل ہے کہ ہندوستان کے مقامات دور دراز سے لوگ اپنا مذاق سدھارنے دلّی آیا کرین، رہا لکھنؤ سو اُس سے ہم پہلے ہی سے بے عقیدہ ہین"

لکھنؤ سے سید صاحب کی مخالفت کا راز کھل گیا۔ سچ یہ ہے کہ عقیدت ہی ایک ایسی شے ہے جو بسا اوقات انسان کو بھلے اور بُرے مین

تمیز کرنے کا موقع نہین دیتی۔ ورنہ سچ یہ ہے کہ آجکل دلّی مین سوا تجارت کے کچھ نہین رہا ہے۔

زبان مٹ چکی۔ شاعری برباد ہوگئی مگر کوئی اہل سخن باقی نہین رہا اخلاق کی ہر شنفس مین کمی ہے۔ پنجابیت ساری دہلی پر چھا گئی ہے زبان مین سختی درشتگی آگئی۔ تشدید کا استعمال تمام الفاظ مین بہت بڑھ گیا ہے۔ ہم بھی دہلی مین رہتے ہین اور یہ ہمارا ذاتی تجربہ ہے غیر اس سے قطع نظر کرکے ہمنے مانا کہ لکھنو برا ہے۔ یہان والے بیچارے کیا جانین نہ چاندنی چوک کی ٹھوکرین کھائین اور نہ جامع مسجد کی سیڑھیون پر گھومے اور نہ قلعے معلےٰ کی زیارت کی۔ مگر سید صاحب جنکو دہلی سے خاصی عقیدت ہے جنکو دہلی والون کی ہر ادا مین حسن نظر آتا ہے اور جو خود بھی اطراف دہلی کے رہنے والے ہین، انہون نے جو کچھ پایا ہے دہلی سے اور اس سبب سے انکی ہر بات گویا اہل دہلی کی بات اور ہر کلام ان کا گویا دہلی کا ٹکسالی کلام ہے۔ اب ذرا اسکی خوبیان بھی ملاحظہ کیجئے +

ابھی جون نمبر مین "نالۂ یاس" کے عنوان سے جو نظم آپ کی دو صفحون پر ترکیب بند کی صورت مین شائع ہوئی ہے اور جسپر "مخزن" کے الناظر مین فاضل ایڈیٹر کا یہ تعریفی نوٹ ایک ماہ پیشتر چھپ چکا ہے۔

"ہمارے دوست عزیزی سید ہاشمی بھی اس جلسہ مین شریک تھے اور ہماری طرح خالی ہاتھ نہین آئے تھے، بلکہ ایک لطیف و پر درد نظم اس موقع کے لئے لکھ کر لائے تھے جنکو انہون نے خاص لہجہ و انداز مین سنکر بہت حظ حاصل ہوا اور اگر ناظر کی تنگ دامنی مانع نہ آتی، تو ہم اسی وقت ناظرین کرام کو اس سے لذت آشنا بناتے۔ اب جولائی کے پرچہ کا انتظار کرنا پڑیگا"

یہ نالۂ یاس وہی نظم ہے جس سے لذت آشنا ہونے کا انتظار ایک ماہ پہلے سے ایڈیٹر صاحب الناظر کی سفارش پر ناظرین کر رہے تھے، اور جو برار کانفرنس کے جلسۂ ایلچ پور مین پڑھی گئی تھی۔

لکھنؤ والون کا ہذیان بکنا سید صاحب کے قلم سے آپ دیکھ چکے اب خود بدولت کی خوشگوئی و لطافت بھی دیدنی ہے۔ اول بند کا پہلا شعر

حسرتین اس ملک پر اور عبرتین اس قوم پر جسکے جی کے حوصلے ارمان لوٹے سب جائین مر

دوسرے مصرعہ مین "سب جائین مر" کی تعقید سے قطع نظر کرکے جو مہمل اس جگہ زبان پر نہایت ناگوار و ثقیل ہے۔ "ملک پر حسرتین اور قوم پر عبرتین" محاورۂ اہل زبان سے منافی ہے۔ اہل زبان اس موقع پر اظہار افسوس و رنج کرتے ہین اور یہی قاعدہ ہے۔ مصرعہ یون ہونا چاہئے "حیف ہے اس ملک پر افسوس ہے اس قوم پر" دوسرا شعر ؎

ہو چلے معدوم جس کے جوہر انسانیت جسکا جھریت گران ہے عالم تہذیب پر

جھریت بسکون جیم تحتانی بالکل غلط ہے۔ سید صاحب کو ضرورت شعری یا شاعرانہ کمزوری نے اتنا مجبور کردیا کہ مفتوح حرف کو ساکن نظم کر گئے۔

چھٹا شعر ؎

جسکا جینا بار ہے دنیا کو اور مخلوق کو جسکے افسانے پہ شرماتی ہے تاریخ بشر

پہلے مصرعہ مین دنیا کو کے ہوتے مخلوق کو بالکل حشو و برائے بیت ہے جس سے شاعر کی کمزوری کا پورا ثبوت ملتا ہے۔ ساتوان شعر ؎

جسکے گھمنے [illegible] ہی ہو رہی ہو ملک ملک پھیل جائے وان مبادا اسکا زہریلا اثر

یہ ثقات لکھنؤ کی زبان نہین اور گھمنے کی فصاحت سے تو ناظرین الناظر خود محظوظ ہوگئے ہونگے۔ لکھنؤ کے سوقی آدمی بھی ایسی لفظون سے پرہیز کرتے ہین۔ ٹیپ کا شعر ؎

کاش یہ ہوتا کہ ایسی قوم ناہنجار کو برق خاطف گر کے لیجاتی فنا کے غار کو

پہلے مصرعہ مین یہ ہوتا کہ بالکل برائے بیت اور حشو ناجائز ہے۔ لکھنؤ والون پر سختی کرتے ہین اور خود سید صاحب کی یہ حشو سرائی انصاف طلب ہے۔

چھوٹا منھ بڑی بات۔ یا خود را فضیحت و دیگرے را نصیحت، اسی کا نام ہے۔ افسوس صد افسوس "فنائے غار کو" اسکی مہملیت کی بھی کوئی حد نہین۔

لہ غالباً سید صاحب گا کر پڑھتے ہون گے جس طرح کہ دہلی کے اور بعض سخنورون کا شیوہ ہے، اور شاید اسی کو ایڈیٹر صاحب خاص لہجہ و انداز سے تعبیر کرتے ہین۔

دوسرے بند کا پہلا شعر ؎

ہائے میرے دل کا انداز تلاطم ہاشمی کوئی دیکھے میری مایوسی پہ اسکی برہمی

لفظ ہاشم بکسر شین ہے اور برہم بفتح ہائے ہوز۔ دونوں کا قافیہ ہرگز نہین آسکتا تنگ بندی اور چیز ہے اور اصول فن اور شے۔ علاوہ ازین برہمی کا وجود غصہ کے وقت ہونا چاہئے نہ مایوسی مین۔ اس سے بڑھکر سید صاحب کی وسعت معلومات کا گواہ عادل مندرجہ ذیل شعر کا قافیہ ہے ؎

ہے ابھی تک اس مین تابان جلوۂ حسن امید یعنی آتش زیر دامن ہے ابھی سنگ زمین

برہمی کا قافیہ زمین سراسر ناجائز ہے۔ البتہ ہاشمی صاحب کے "دیوتا" نے اس قسم کی تُک بندی کی ہے اور شاذ کو ناز کا قافیہ باندھا ہے۔ غالباً اپنے ممدوح دیوتا کی اندھی تقلید مین ہاشمی صاحب نے یہ جرأت کی ہے۔ سچ ہے حب الشئے یعمی ویصم۔ ساتوین شعر کا دوسرا مصرع ؎

"پر دماغون مین ابھی ہے بوئے عطر میثمی" اس مصرع مین ابھی کے بعد تک کی ضرورت اسی طرح ہے جس طرح کہ پہلے مصرع مین خود ہاشمی صاحب لائے ہین۔ میرے نزدیک مناسب تھا کہ آپ ان خیالات نثر مین ادا فرماتے۔ نظم کرنے کی زحمت بیکار گوارا فرمائی۔ تیسرے بند کا پہلا مصرع "ہوشیار، اے بے خرد تا کے یہی بدمستیان" غریب ہاشمی ضرورت وزن نے پھر محل استعمال سے بے خبر کر دیا۔ یہ "بدمستیان کا ل اور یہی" درستی وزن کیلئے کہہ جانا کسی صورت سے درست نہین۔ پانچوان شعر ؎

نی کو انسان بنانا ہی نہ تھا کچھ سہل یہ حق ادا اسلام کا کرنا ہوا اس سے بھی گران

مرکی تقطیع یکجی گرگئی۔ اوّل مصرعہ کا آخری ٹکڑا سید صاحب کی اُس ماحت ولطافت کی مثال ہے جسکی داد قابل ایڈیٹر ایک ماہ پیشتر پنے ایڈیٹوریل مین دے چکے ہین۔ آٹھوین شعر کا دوسرا مصرعہ "تب مین بنتا ہے جا کر ایک دشت بیکران" یہ جا کر کس ضرورت سے لایا گیا ہے خدا سید صاحب ہی بتائین! بحر کی صفت بیکران ہونا چاہئے۔ اگرچہ معناً خرابی نہین مگر ترکیب مین اجنبیت ضرور ہے۔ چوتھے بند کا پہلا شعر ؎

اوکہ تو اپنی ترقی پر بہت مغرور ہے دور ہے منزل سے او سیلاح کو سول دور ہے

"اوکہ تو" کی فصاحت سید صاحب کے حصہ کی ہے۔ فارسی کی اندھی تقلید اسی کا نام ہے۔

پائے بے زنجیر آزادی کا ہو کیونکر نشان دل مسلم عبدیت مین جب ترا مسحور ہے

اس شعر کا مطلب ہاشمی صاحب خود سمجھین یا ان کے مداح و ممدوح ورنہ ہمارے نزدیک المعنی فی بطن الشاعر کا مصداق ہے۔ چوتھے شعر کا دوسرا مصرعہ ؎ "تیرا قصر آرزو یک حجرۂ بے نور ہے" سید صاحب یہ وہی نقص فارسیت ہے، جسکی بہترین نظیر آپ فسانۂ عجائب کو کہتے ہین اور جس نے آپ کے خیال مین اس نادر کتاب کو نہ مقبول ہونے دیا اور نہ قابل مقبولیت رکھا۔ ساتوان شعر ؎

وہ محمد مصطفیٰؐ وہ صاحب ناز جلال ظلمتون مین اسم مطہر جس کا شمع نور ہے

حضرت پیغمبر علیہ السلام کو صاحب ناز کہنا خلاف شان ممدوح ہے اور نام پاک کی جگہ اسم مطہر لانا ایسی جدت ہے جو کسی صحیح گو شاعر کے کلام مین نہین ملسکتی۔ مطہر کے معنی پاک کرنے والا۔ نہ پاک۔ اس سے سید صاحب کی عربی دانی کا ثبوت ملتا ہے۔ کیون نہ ہو آخر ہاشمی ہین۔ آپکی شاعرانہ نوعیت کا ہم پہلے ہی اعتراف کر چکے ہین ورنہ مصرعہ یون ہو سکتا تھا "ظلمتون مین جسکا نام پاک شمع نور ہے" مگر ظلمتون مین نام پاک کا شمع نور ہونا بھی عجیب بے تکی منطق ہے ؎

پیشتر خطرے بہت کچھ تجھ سے تھے اشرار کو کیونکہ وارث مصلح عالم کا تو مشہور ہے

نہین معلوم ہوا کہ وارث مصلح عالم کا سید ہاشمی نے کسے قرار دیا ہے۔ عالم تو بیشک نبی کا وارث ہوسکتا ہے بمصداق حدیث نبویؐ العلماء ورثۃ الانبیاء" اور اگر یہان محض مسلم کی جانب خطاب ہے تو وارث کا لفظ ٹھیک نہین بلکہ لفظ پیرو یا کوئی اسی کا ہم معنی لفظ لانا چاہئے تھا۔ حضرت مصطفےٰؐ کی شان مین ارشاد ہوتا ہے ؎

جسنے بہکایا کہ امت شل اک کنبہ کے ہے یعنی کل کے چین پر ذاتی خوشی محصور ہے

بہکایا غالباً کاتب کی غلطی ہے۔ تبلایا یا اور کوئی لفظ اس کا ہم معنی

٭ جولائی نمبر مین تصحیح کر دی گئی ہے کہ بہکایا کے بجائے "جھلکایا" ہونا چاہئے۔ مگر جھلکایا بھی دکھلایا اور تبلایا کے معنی مین استعمال کرنا بالکل غلط ہے!

ہوگا۔ ورنہ بہکانا حضرت کی شان مین ناقابل معافی گستاخی ہے ؎
تجھ سے ہے ہیہات صد تذلیل دین پاک کی خندہ زن آج اسپہ اک اک سفلہ منزد ہے
اول مصرعہ مین صد تذلیل ہاشمی صاحب کی مخصوص فصاحت ہی جسکو ہم ناواقفان فن غرابت کہتے ہین۔ جسنے مصرعہ کو ستیاناس کر دیا ہے۔ گر ہے تو ایجاد بندہ اگرچہ گندہ۔ آخری بند کا پہلا شعر ؎
تسبے بھی دو بول اب لے صاحبانِ انجمن یعنی بھر بھر نائیے پیالون مین صہبائے کہن
سید صاحب کے دو بول صاحبانِ انجمن سے کیا خوب ہین سبحان اللہ دو بول اور تمام حاضرین انجمن سے؟ یہ تو جانورونکی بولی ہے۔ دوسرے مصرعہ مین "پیالون مین" سے آگے "تہے" "لانا ضروری ہی ورنہ مصرعہ مہمل رہے گا دیکھئے "دی" بھر گرگئی۔ پیالہ مین اظہار یا ضروری ہے پیالہ غلط ہے۔ دوسرا شعر ؎
وہ مبارک کوششین ہوتی ہین بار آور ضرور جنکی ہون تائید پر اخلاص اور سچی لگن
اس مصرعہ کی فصاحت نظم کی جان ہے اور اس قسم کی فصاحتین سید صاحب کا مخصوص جوہر ہین اس نظم مین کئی جگہ پائیے گا۔ سچی لگن اگر لگاؤ اور دلی تعلق کے معنی مین کہا گیا ہے تو متروک اور مہمل ہے ؎
حوصلہ افزود ہے خود مشکلون کی زیادتی رک کے جو دریا بڑھے ہوتا ہی دونا موجزن
حوصلہ افزائی کی جگہ حوصلہ افزود لانا، سید صاحب کی فارسی دانی کو بھی مشتبہ کئے دیتا ہے۔ اور پھر "زیادتی" کی "یا ی" "اول کا تقطیع سے گر جانا تو ہاشمی صاحب کی شاعرانہ قدرت و واقفیت کا ایسا ثبوت ہے جس پر مبتدی بھی بغیر مضحکہ اڑائے نہین رہ سکتا۔ مگر نہین سید صاحب کو اپنے "دیوتا" کی تقلید مین سب کچھ جائز ہو گیا ہے۔ اس شاعری پر لکھنؤ والون کی شاعری پر تہمت ہذیان، ایک غیرت دار آدمی ہی کر سکتا ہے۔ شاباش ہے آپ کی جرارت اور دیدہ دلیری کو ؎
اور پھر یہ کام یعنی علم اور فن کا رواج جنکی یہ سب جوت ہی دنیا مین لے اہلِ وطن
علم و فن کے رواج کی جوت آج سید صاحب ہی کے کلام سے دریافت ہوئی چراغ کی جوت ہوتی ہے۔ مگر علم و فن کی یا اُسکے رواج کی جوت بھی کیا خوب! جوت غالباً روشنی کے معنی مین نظم کیا گیا ہی جو غلط در غلط ہے۔ اسی قابلیت کے بھروسے پر سید صاحب لکھنؤ والون کے منہ آئے ہین "سبحان تیری قدرت!" ؎
خالصاً للہ و للمخلوق ہو گر یہ سعی اِس سے بڑھکر نے عبادت نے کوئی کارِ حسن
"خالصاً للہ و للمخلوق" کی عربیت جسکو مصرعہ کا لنگر بھی نہین سنبھال سکتا بڑی وزنی ہے حضرت! یہ وہی عیب ہے جسکی نسبت آپ فرما چکے ہین "اور دوسرا عیب عربیت کا پرانے مولویون کے ہان جابجا ملتا ہے"! مگر اس بیسوین صدی مین اور علیگڑھ کے تعلیم یافتہ، دہلی کے تربیت یافتہ ناظم و ناثر کے کلام مین اُس عیب کا ہونا کسقدر شرم کی بات ہے۔ ایسی حالت مین کہ وہ خود اُسے برا سمجھتا ہے۔ میرے نزدیک اُردو شاعری پر یہ پتھر برسانا ہے۔ اور سعی بسکون "ع" چاہئے۔ لہذا اپنی کمزوری سے اسکو متحرک نظم کرنا ناجائز اور غلط ہے۔ سید صاحب خدا کے لئے شاعری کو چوپٹ نہ کیجئے۔ دوسرے مصرعہ مین فارسی حرف نفی "نے" نے جو حسن پیدا کر دیا ہی وہ صاحبان مذاق سلیم پر پوشیدہ نہین ہے ؎
کچھ کرو اخلاق تلجاین کہ تم کچھ کر گئے ورنہ یون تو بیل بھی بک بہت اور مر گئے!!!
دوسرے مصرع کے آگے تین علامات تنبیہ ہین اور اس مصرعہ پر خط بھی ہے۔ نہ معلوم وہ کیا خصوصیت ظاہر کر رہا ہے۔ یہ نہ کوئی مثل ہی اور نہ ایسا مصرعہ جسکی خاص طور پر داد دیجائے۔
اب چند وہ مصرعے ملاحظہ ہون جنکو فارسی و عربی کے کثیر الفاظ نے غرابت کا جامہ پہنا دیا ہے۔ "جسکی حجریت گران ہے عالمِ تہذیب پر"
یعنی استحصال حق اور انتقام ظلم و شر یعنی آتش زیر دامن ہی ابھی سنگ زمین
گرچہ یا عشرت کے طوفان فرو ماندہ کی ہے سطح مین یاسوت سوکھے پڑے ہے کچھ کچھ نمی
الغرض گو اب گمان خواب سرشب کا نہین تیرا قصر آرزو یک حجرۂ بے نور ہے
دین فطرت کے ترفع کے لئے مامور ہے۔ ترفع کی غرابت شکوہ سنج فصاحت ہے "تجھ سے ہے ہیہات صد تذلیل دین پاک کی" ان الجھے ہوئے مصرعونکے علاوہ عبدیت۔ حجریت۔ انسانیت۔ فارسیت۔ عربیت ایسے مصدر ونکی بھرمار بھی منافی فصاحت ہے۔ المختصر یہ نظم ۱۹۱۱ء کی ایک زندہ ادبی یادگار ہی۔ ہاشمی صاحب کا نام انجمن ترقی اُردو کے ارکانِ شوریٰ کی فہرست مین بھی شامل ہی اور جب ایسے قابل افراد اِس مین شامل ہین تو ترقی معلوم! آخر مین مومن کا یہ شعر پڑھتے ہوئے ہم ناظرین سے تضیع اوقات کی معافی مانگتے ہین ؎
یہ عذرِ امتحانِ جذبِ دل کیسا نکل آیا مین الزام اُنکو دیتا تھا قصور اپنا نکل آیا

نقادِ سخن

عصریات

سائنس کی مجبوری

سائنس نے دنیامین اجرام واجسام اشیار کی حقیقت کھول دی لیکن باوجود اس کے بہت سی باتین ایسی ہین جنھین سائنس آجتک حل نکرسکا۔ ان سب کی فہرست ایک انگریزی اخبار پیش کرتا ہے۔ (۱) کیا باعث ہے کہ بعض جراثیم پانی مین اُبالے جائین توبھی زندہ رہتے ہین۔ (۲) دھوپ اور سورج کی روشنی انگور کے عرق کو شکر کی طرح شیرنی مین کیون تبدیل کردیتی ہے۔ (۳) کیا باعث ہے کہ درختون کا رس جاڑے مین منجمد نہین ہوتا (۴) چمگادڑ مین وہ کیا طاقت ہے کہ وہ اندھیرے مین چڑیون کو پکڑ لیتا ہے (۵) یہ کیا سبب ہے کہ انگلی کٹ جانے سے دماغ پر اسکا اثر پڑتا ہے۔ (۶) کبوتر مین وہ کونسی حس ہے جسکی مدد سے وہ دور دراز سفر مین بھی راستہ نہین بھولتا۔ (۷) موسم خزان مین جو تخم بوئے جاتے ہین وہ سردیون کا بار برداشت کرکے موسم بہار مین کیون اُگتے ہین۔ انڈے مین سے نکلنے کے بعد فوراً ہی چوزہ کیون دانہ تلاش کرنے لگتا ہے۔ اسکو کونسی طاقت یہ فعل بتلاتی ہے۔ (۹) اگر زمین اتنی ہی قدیم ہے جتناکہ دعوے کیا جاتا ہے توکیا وجہ ہے کہ ریڈیم کی طاقت اسوقت تک اسمین سے زائل نہین ہوتی۔

دنیامین سب سے پرانی تاریخ

(۳۱ جنوری ۱۹۱۶ء کے سول اینڈ ملٹری گزٹ مین پروفیسر پیٹری صاحب کے لکھے ہوئے مضمون کا خلاصہ)

اٹلی کے ایک عجائب گھر مین سیاہ پتھر کا ایک صاف اور چمکدار ٹکڑا رکھا ہے۔ یہ پتھر جس مین بہت ہی چھوٹے حروف کھدے ہوئے ہین، حال مین ہی مصر سے ملا تھا چنانچہ اس پتھر پر مصر کے نہایت قدیم زمانہ کی جو مصوری تحریر ہے اُس مین وہ تاریخ لکھی ہے جو دنیامین سب سے پرانی کہی جاسکتی ہے۔ کیونکہ یہ لکھائی تقریباً ۸ ہزار برس تک جاری رہی تھی۔ گویا کہ یہ تاریخ اُس زمانے کے بھی بہت پہلے سے شروع ہوئی تھی جبکہ مصر کے مشہور مینار بنے تھے، اور حضرت موسیٰ کے وقت سے اتنے پہلے ختم ہوگئی تھی جتنا زمانہ کہ اب حضرت موسیٰ کو گذر چکا ہے۔

اس تاریخ کی خلاصہ کیفیت یہ ہے کہ اس مین سب سے پہلے ان بادشاہون کے نام لکھے ہین جو مصر کی ایک قوم ہونے سے پہلے شمالی مصر مین حکومت کرتے تھے۔ لیکن جب سے تمام مصر ایک بادشاہ کے تحت مین آگیا تھا۔ اس وقت سے اس مین ہر سال کے بڑے بڑے واقعات بھی لکھ دیئے ہین۔ پھر اُن لڑائیون کا ذکر ہے جو حبشیون اور ان لوگون مین ہوتی رہتی تھین جو دریائے نیل کی دلدل مین رہتے تھے۔ پھر ایک قسم کے دریائی گھوڑون کے شکار کا۔ مندر وغیرہ کی عمارتون کے بننے کے۔ اور ان تہوارون کا ذکر ہے جو مصری دیوتاؤن کے لئے منائے جاتے تھے۔ اس تاریخ مین شروع ہی سے دریائے نیل کے چڑھاؤ کا ٹھیک ٹھیک حساب بھی ہر سال کا لکھا ہوا ہے پہلے پہل تو یہ حساب انگلیون سے ہی لگایا گیا تھا۔ لیکن بعد مین اسقدر باریک کردیا گیا کہ ایک انگل کے ۱/۴ حصہ تک کا بھی حساب رکھا گیا۔ اس تاریخ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ خراج جمع کرنے کی غرض سے ہر دوسرے سال مصر کے تمام مویشی کا باقاعدہ شمار ہوتا تھا اور اس تاریخ کے آخری زمانہ مین زمین اور قیمتی چیزون بھی شمار مین آنے لگی تھین۔

مصر مین جہازون کے بننے کا بھی ذکر ہے۔ چنانچہ لکھا ہے کہ ایک سال ۱۰۰ فیٹ یا اس سے کچھ زیادہ لمبے ۶۰ جہاز بنائے گئے تھے اور ان جہازون مین سب سے بڑا جہاز ۱۷۰ فیٹ لمبا تھا اور ۴۰ جہاز ملک شام سے مصر کو لائے گئے تھے جبکے ذریعہ سے سوڈان مین ایک مہم بھیجی گئی تھی۔

جو واپسی پر وہان سے ۷ ہزار قیدی اور ۳ لاکھ مویشی لائی تھی۔ مویشی کو پانی پلانے کے لئے صحرا مین ۲۴۲ تالاب اور دور دور کی چراگاہون مین مویشی کی حفاظت کے لئے ۵۳ چھوٹے چھوٹے قلعے بنائے گئے تھے جن مین محافظ مقرر کئے جاتے تھے۔ سمندر کے راستہ سے سینائی اور جنوبی عرب مین مہم بھیجنے اور بحر قلزم مین جہازون کے بیڑے کے رکھنے کا بھی ذکر ہے۔

اسی تاریخ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ۷ ہزار برس گزرے جبکہ اس ملک (مصر) کو ضلعون مین تقسیم کر دیا گیا تھا، اور ہر ایک ضلع کا ایک علیحدہ گورنر ہوتا تھا، اور پھر بڑے بڑے شہرون کا بھی ایک ایک گورنر ہوتا تھا یہ گورنر بالکل خود مختار ہوتے تھے، اور سب اپنا اپنا خراج لیا کرتے تھے۔ جس مین سے ہر سال بادشاہ کو کچھ دیا کرتے تھے۔ بادشاہ کو گورنرون سے کچھ زیادہ اختیار نہ تھا تو صرف یہی تھا کہ لڑائی کے وقت وہ اپنے اختیار سے جوان اور رسد جمع کر لیتا، اور امن قائم رکھنے کے لئے کچھ لوگ نگران یعنی انسپکٹر ہوا کرتے تھے جو "چشم شاہ" یعنی بادشاہ کی آنکھ کہلاتے تھے۔

بادشاہ اور اُس کے محل کا خرچ شاہی جاگیر سے چلتا تھا مثلاً شاہی انگوری باغ بھی تھے جنمین مختلف قسم کے انگور لگا کرتے تھے مصر مین اُس وقت حکام بھی بہت سے تھے جن مین سے ہر ایک کے پاس مختلف قسم کی مہر ہوا کرتی تھی چنانچہ بادشاہون کے مقبرے سے بڑے بڑے حکام کی دو سو سے زیادہ مختلف قسم کی مہرین ملی ہین۔ اُس زمانہ مین یہ دستور تھا کہ بادشاہون کو دفن کرتے وقت ان کا کھانا بھی انھین کے مقبرون مین رکھ دیا کرتے تھے اور اُس کھانے پر اُن خاص خاص حکام کی مہر لگا کرتی تھی جو اس کے ذمہ دار ہوتے تھے، مثلاً اس خاص حاکم کے پاس ایک علیحدہ مہر ہوتی تھی۔ اور جو کنول کے بیجون کے جمع کرنے کی نگرانی کرتا تھا۔ ان بیجون سے روٹیان پکائی جاتی تھین اسطرح اُس افسر کی بھی ایک خاص قسم کی علیحدہ مہر ہوتی تھی جو بادشاہ کے منھ دھونے کے لئے پانی وغیرہ کی قسم سے کوئی قیمتی چیز بہم پہنچایا کرتا تھا۔

پھر ان بڑے بڑے حکام کے پاس بھی جو ہر سال سلطنت کے اعلےٰ عہدون پر تعینات کئے جاتے تھے خاص قسم کی مہرین ہوا کرتی تھین۔ ان حکام مین ایک تو وزیر اعظم ہی تھا پھر وہ حاکم جس کے پاس خود بادشاہ کی مہر رہتی تھی، ساتھ ہی بادشاہ کے ذاتی نوکرون کا سردار یعنی خانساماں اور میر عمارت بھی تھے جن کے پاس اپنی اپنی مہرین رہتی تھین۔ ان حکام مین سب سے پُرانا اور سب سے بڑا وہ حاکم ہوا کرتا تھا جو دریائے نیل کے سیلاب کو درست رکھتا تھا اور جس کا فرض تھا کہ پشتون کی حفاظت کرے اور جب کبھی ضرورت ہو تو مزدور لگا کر ان کی مرمت کروا دے۔ چنانچہ اب بھی اس بات کو بہت ضروری سمجھا جاتا ہے۔ کیونکہ اگر کسی چھوٹے سے چھوٹے سوراخ کو بھی فوراً بند کیا جائے تو ممکن ہے کہ اس کا پانی بہ کر سوراخ کے بند ہو سکنے سے پہلے کئی ایک گاؤن کو تباہ کر ڈالے۔ اس لئے سیلاب کو درست رکھنے والا افسر ملک کی حفاظت اور سرسبزی دونون باتون کا بہت بڑا ذمہ دار ہوا کرتا تھا۔ اس زمانہ مین ذخیرون کے حساب کتاب رکھنے والے اہلکار بھی ہوا کرتے تھے جن کے پاس شاہی مہر رہتی تھی۔ اور جو رتبہ مین ایسے ہی ہوتے تھے جیسے کہ اب کلکٹرون کے پیشکار اور خزانہ کے منشی یا بابو ہوتے ہین۔ کیونکہ وہ رسیدون اقرارنامون اور جنس ادا کرنے کے حکمون وغیرہ پر مہر کر دیا کرتے تھے اس لئے کہ اُس زمانہ مین روپے پیسے کا رواج تو تھا نہین اور تمام قسم کا لین دین جنس مین ہی ہوا کرتا تھا۔ ان کے علاوہ کچھ درباری اہلکار بھی ہوتے تھے جیسے کہ بادشاہ کے ذاتی ہمراہی تہوارون کا منتظم اور شاہی مقبرون کا محافظ۔

مصر جیسے بارش نہونے والے ملک مین معمولی عمارتون کے لئے پتھرون کی ضرورت نہین ہوتی، بلکہ اینٹ اور لکڑی سے ہی کام چلا کر وہان کے لوگون کے سینکڑون برس نکل جاتے ہین۔ معلوم ہوتا ہے ۷ ہزار برس گزرے کہ مصر مین شہتیر کثرت سے تھے درختون کا

استعمال بھی وہان کے لوگ بہت عرصہ سے جانتے تھے چنانچہ مصر کے بہت ہی قدیم زمانے کے کچھ بادشاہون نے اینٹون کے بڑے بڑے قلعے بنائے تھے جن مین سے دو اب تک موجود ہین - اور بہت سے مقبرے لکڑی کے بنے ہوئے تھے - ان عمارتون مین سخت پتھر، ہاتھی دانت اور سونے کے پتھرون پر کھدائی کا کام تجربہ کار کاریگرون نے نہایت ہنرمندی سے کیا ہے اور خاصکر مصری مقبرون مین جو نقاشی کا کام ابھی تک دیکھنے مین آتا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آجکل کا ہوشیار سے ہوشیار کاریگر بھی اس سے اچھا نہین بنا سکتا۔

ان حیرت انگیز و تعجب بڑھانے والی تحریرون سے ظاہر ہوتا ہے کہ ۶ ہزار برس کے اندر بنی آدم نے حکومت عمارت اور دستکاری مین کس قدر کم تبدیلیان کی ہین۔

انگلستان کے تعلیمی اخراجات

برطانیہ اپنے اسکولون او یونیورسٹیون پر سالانہ کس قدر خرچ اٹھاتا ہے یا یون کہو کہ برٹش گورنمنٹ اپنے افراد کی تعلیم و تربیت پر کیا خرچ کرتی ہو ذیل کے مختصر مضمون اور اعداد سے ظاہر ہے۔

کیمبرج - آکسفورڈ (مع انجنیرون کے ماسوا) گلاسکو اور ایڈنبرا کی یونیورسٹیون کو چھوڑ کر باقی کو ۱۹۱۱ء مین پچھتر لاکھ روپیہ عطیات اور وصیت کی صورت مین ملا - ویلز اور انگلستان کی یونیورسٹیون کو ۱۹۱۳ء مین ٹکنیکل اور فنی تعلیم کے لئے ۵۴ ہزار پونڈ اور دیے گئے - جرمنی تعلیم کا خرچ دو سال مین سہ گنا ہو گیا ہے کیونکہ ۱۹۱۰ء مین صرف ۴ ۵ ہزار پونڈ دیئے گئے تھے - سرکاری خزانہ سے جو امداد یونیورسٹی کو دیجاتی ہے - بیس سال کے عرصہ مین ساڑھے اٹھائیس ہزار پونڈ سے دو لاکھ پونڈ تک جا پہونچی ہے - یونیورسٹیون اور یونیورسٹی کالجون کی آمدنیون کی کیفیت حسب ذیل ہے - واضح ہو کہ یہ صرف انگلستان کی کیفیت ہے :-

(۱) فیس	۱۸۰۳۰۱	پونڈ
(۲) عطیات	۸۵۸۲۵	پونڈ
(۳) خاص رقوم چندہ	۲۲۸۳۷	″
(۴) مقامی حکام کیطرف سے گرانٹ	۹۵۸۰۵	″
(۵) پارلیمنٹری گرانٹ	۲۱۵۰۰۳	″
(۶) اسپتالون وغیرہ کی دی ہوئی قیمین	۶۶۹	″
(۷) دیگر وسائل سے	۲۲۶۹۴	″
میزان کل	۶۲۲۴۷۷	پونڈ

کل خرچ تعلیمی انگلستان کی تعلیم گاہون کا چھ لاکھ دو ہزار پونڈ - اور ویلز کا (۶۳۴۷۵) پونڈ تھا - ہر دو ملکون کے یونیورسٹی طلبہ کا شمار (۹۲۰۲) تھا - انہین سے (۶۱۱۶) ڈگری حاصل کرنے والے طلبہ تھے - لندن میڈیکل اسکولون کو کل آمدنی (۵۹۵۰۰) پونڈ ۱۹۱۱ء مین ہوئی - کل خرچ ساڑھے باون ہزار پونڈ ہوا - فیس سے ۷۰ فیصدی آمدنی ہوئی - کل ۱۴۸۰ طلبہ سارے وقت کے اور ۲۶۷ نصف وقت کے طلبہ تھے - انیس سال سے اوپر عمر کے طلبہ کا شمار ۵۰ فیصدی ہے اور سترہ سال کی عمر والون کا ۴ فیصدی تھا۔

ابتدائی مدارس انگلینڈ اور ویلز مین ۱۸۷۰ء مین ابتدائی اسکولون کے لڑکون کا شمار (۱۹۱ ۵۲۴۰) تھا - مگر ۱۹۱۱ء مین ۵۳ لاکھ ۴۶ ہزار ہو گیا - اور ہر درجہ کے اُستادون کا شمار ۱۴۷۹۸ سے بڑھکر ایک لاکھ ۶۰ ہزار ہو گیا - سارٹیفکیٹ یافتہ استاد ساڑھے اٹھتر ہزار سے ایک لاکھ ۴ ہزار ہو گئے استادون کے مشاہرون کی رقم بڑھگئی ہے الغرض رپورٹ کو دیکھنے سے ہر طرف ترقی نظر آتی ہے - آئرلینڈ کے ابتدائی مدارس مین ۷ لاکھ طلبہ ہین اور انکی تعلیم پر ۱۷ لاکھ پونڈ خرچ ہوتے ہین - ۴۰۰ ہزار طلبہ استانیون کے سپرد ہین۔

اُردو ٹائپ کی ضرورت

ریاست حیدرآباد نے اُردو زبان کی یہ بہت بڑی خدمت کی کہ اسطرف

ڈاکٹر جگدیش چندر بوس

ایم-اے ڈی-ایس-سی سی-ایس آئی سی-آئی-ای

توجہ کی ہے کہ نستعلیق اُردو ٹائپ کے نمونوں سے کوئی نمونہ ایسا پسند کیا جائے جو سرکاری چھاپہ خانہ کے کاموں مین آسکین چنانچہ ایک کمیٹی اس غرض سے قایم کی گئی ہے جس کے سکرٹری صیغہ تعلیمات کے سکرٹری ہین۔ اس کمیٹی کا کام یہ ہوگا کہ ہندوستان اور ولایت سے مختلف نمونے ٹائپ کے طلب کرے اور ان مین سے جو قابل پسند ہون اُنکو سرکاری چھاپہ خانہ مین مروج کیا جائے نستعلیق ٹائپ کے شوشہ کیونکر محفوظ رکھے جائین مشین مین جبکہ وہ دخانی قوت سے چلائی جاتی ہے اُردو نستعلیق جلد خراب ہوجاتا ہے باوجودیکہ بمقابلہ لیتھو اُردو ٹائپ کی چھپائی مین بہت بڑی کفایت متصور ہے مگر اس پر بھی اسقدر کم رواج اردو ٹائپ کا ہے کہ اسکی چھپائی مقبول عام نہین ہوتی ہے ایک طریقہ اس کے مقبول بنانے کا ہے اور وہ یہ ہے کہ حیدرآباد کی سی اہم ریاست اس بارہ مین خاص دلچسپی لے۔

خوراک اور ہوا کے بغیر زندہ رہنے والے جانور۔

اسکاٹ لینڈ کے ایک ماہر علم حیوانات مسٹر میکڈانلڈ کا بیان ہے کہ دنیا بھر کے جانداروں مین کچھوا عجیب و دلچسپ حیوان ہے۔ یہ جانور خشکی اور تری دونون مین غیر محدود وقت تک رہ سکتا ہے۔ اور لاتعداد وقت تک نہ صرف بے آب و دانہ بلکہ سانس لئے بغیر بھی زندہ رہ سکتا ہے۔ اگرچہ اسکی وضع قطع یا ساخت مچھلی یا چرندے یا جانوروں کی ایسی نہین تاہم اس مین ان تینون اقسام کے جانداروں کی خاصیتین موجود ہین۔ اسکی خوراک تو شاید کچھ ہے ہی نہین۔ کیونکہ اگر اسے کسی پیپے مین کئی ہفتون تک بند رکھا جائے تو جب کبھی نکالئے گا ویسا ہی ہٹا کٹا ہوگا جیسا کہ بند کرنے سے پیشتر تھا یعنی فاقون سے اسپر کوئی نمایان اثر ظاہر نہوگا۔ اور تو اور کچھوے کے بچون کا بھی یہی حال ہے۔ ادھر بچہ انڈے سے نکلا اور اُدھر یہ سمندر کی طرف روانہ ہوا۔ اسے نہ تو کسی راہ نما کی ضرورت ہے نہ کسی سدھانے والے کی۔ صانع حقیقی نے اس کے مغز ہی مین یہ بات پیدا کردی ہے کہ یہ پیدایش ہی سے اس بات کو سمجھ جاتا ہے کہ جب تک اسکی پیٹھ سخت نہ ہوجائے گی یہ مچھلیون سے بچ نہ سکے گا اس لئے عموماً یہ چھوٹے چھوٹے پودون اور جھاڑیون مین چھپا رہتا ہے اور جو کچھ میسر آجائے اُسپر بسر اوقات کرتا ہے حتے کہ اسکی ڈھال یعنی پیٹھ کافی سخت ہوجائے۔

سال بھر مین اس کا وزن ۱۲½ سیر ہوجاتا ہے اسوقت یہ باہر نکلتا ہے کیونکہ اب اسکی قدرتی ڈھال اسقدر زبردست ہوتی ہے کہ خواہ کوئی مچھلی کتنی ہی بڑی اور کیسے ہی تیز دانتون والی کیون نہ ہو اسے کچھ نقصان نہین پہنچا سکتی۔ جہان خطرہ ہوا اور کچھوے نے اپنی گردن اندر کی طرف کھینچ لی۔ اب حملہ آور خواہ کچھ کرے اُسے چشم زخم نہین پہنچا سکتا۔

انجمن ترقی سائنٹفک وصنعتی تعلیم۔

اس انجمن کی مرکزی کونسل کا دسوان سالانہ جلسہ حال مین بمقام کلکتہ بصدارت آنریبل راے سیتا ناتھ راے صاحب بہادر منعقد ہوا۔ اس انجمن کا خاص مقصد یہ ہے کہ ہندوستانی نوجوان بغرض ترقی سائنٹفک وصنعتی تعلیم غیر ممالک کو بھیجے جائین۔ چنانچہ اسکی کارگزاریون کی کیفیت پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بلاشک ہندوستانیون کی صنعتی تعلیم کی ترقی کے لئے انجمن مذکور بیش بہا خدمات انجام دے رہی ہے۔ گزشتہ دس سال کے اندر انجمن مذکور نے تین سو ہندوستانی طلبہ کو سائنٹفک اور صنعتی تعلیم کے لئے غیر ممالک کو بھیجا جن مین سے ۱۱۲ تعلیم سے فارغ ہوکر ہندوستان کو واپس آگئے۔ اور اُن مین سے ایک سو نوجوانون کو پیشہ کے کارخانون مین اچھی اسامیان مل گئین ہین جنکا سرمایہ ۱۰ لاکھ سے زیادہ ہے اس انجمن کے بھیجے ہوئے طلبہ غیر ممالک سے جب فارغ التحصیل ہوکر واپس آتے ہین تو انکو ریلوے صنعتی کامون میونسپلٹیون۔ بیمہ کی کمپنیون تجارتی انجمنون محکمجات بندوبست اور محکمہ مال مین جگہ ملجاتی ہے۔ کالجون مین پروفیسری پر مقرر ہوتے ہین۔ دیسی ریاستون مین کئی فوج مین

اور گورنمنٹ کے محکمون مین اسامیان مل جاتی ہین اصلیت یہ ہے کہ صنعتی تعلیم و تربیت یافتہ نوجوانون کو روزگار ملنے کی اسقدر دقت نہین ہے جیسا کہ بعض اوقات خیال کیا جاتا ہے۔ بعض اطراف سے انجمن کی ان کارگذاریون پر مخالفانہ نکتہ چینی ہوتی ہے لیکن صدر نشین صاحب نے ان تمام اعتراضات کی کماحقہ تردید کر دی۔ جاپان مین حال مین جو صنعتی ترقی نمودار ہوئی ہے اسکی تاریخ پر سرسری نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمکو اپنے نوجوانون کو صنعتی تعلیم و تربیت حاصل کرنے کے لئے غیر ممالک کو بھیجنا نہایت ضروری ہے۔ کیا ہمارے صوبجات کے محب اس جانب توجہ نہ کرین گے کیا یہ ممکن نہین ہے کہ ہمارے صوبجات مین بھی ایک ایسی ہی انجمن قایم کیجائے اور بہت سے ہونہار نوجوان جو مجبوراً قلیل تنخواہ پر سرکاری ملازمت پر اپنے سلسلۂ زندگی کو ہمیشہ کے واسطے غارت کر دیتے ہین معقول وظائف سے اُنکی مدد کی جائے اور وہ غیر ممالک سے تعلیم پا کر یہان آئین اور خود بھی آرام و اطمینان سے زندگی بسر کرین اور اپنے ملک کو بھی فائدہ پہنچائین۔

لڑکی کے پھیپھڑے سے لوہے کی کیل

مقام الڈرج مین ایک لڑکی اڈ ولیسہ نامی رہتی تھی جسکی عمر بمشکل چار سال ہوگی۔ اس لڑکی کی زندگی ایک ڈاکٹر نے حیرتناک عمل جراحی کرکے بچائی ہے جسکی تفصیل درج ذیل ہے:-

اس لڑکی کے پھیپھڑے مین کسی طرح سے لوہے کی ایک کیل چلی گئی، اور اسے چند ہفتے گذر گئے تھے۔ چونکہ موضع مذکور مین کوئی شفاخانہ نہ تھا اس لئے لڑکی کے والدین اسے بسرعت تمام بومونٹ شہر کو لے گئے جو الڈرج سے اکاسی میل جانب جنوب واقع ہے۔ کئی جراحون نے ملکر دو دفعہ لڑکی پر عمل جراحی کیا۔ مگر بے سود۔ آخر سب نے ملکر اسے لاعلاج ٹھہرایا لڑکی کا والد گوارا نہ کر سکا کہ ہاتھ پر ہاتھ رکھکر بیٹھا رہے۔ یہ فوراً اپنی بچی کو نیو آرلنس لے گیا۔ پہلی دفعہ جو عمل جراحی کیا گیا اسمین ناکامی ہوئی۔ دوسری دفعہ ڈاکٹر بنو نے عجیب طور پر عمل جراحی کیا۔ اس نے ربڑ کی ایک نالی لڑکی کے گلے کی راہ سے پھیپھڑے تک پہنچائی۔ ڈاکٹر خود ایکس ریز یعنی برقی شعاع کے ذریعے سے دیکھتا رہا جب ربڑ کی نالی آہنی کیل پر جا لگی تو اس نے باہر کے سرے پر ایک بہت بڑا اسنگ مقناطیس رکھا جس نے کیل کو کھینچ لیا، اور اسطرح سے لڑکی جان بخشی ہوئی

عجیب وغریب اخبار

دار الحکومت ہنگری (بوداپسٹ) کے مقام "ہرمندر" مین ایک اولوالعزم ٹیلیفون کمپنی نے عجیب طرح کا اخبار نکالا ہے کہ نہ اس کے لئے کاغذ کی حاجت ہے نہ چھاپنے کی ضرورت ہے نہ پریس قایم کرکے ضمانت دینے اور پھر ضبط ہو جانے کا خوف ہے۔ اخبار کے سات ہزار خریدار ہین جو سو میل کے دائرہ مین پھیلے ہوئے ہین۔ کمپنی انکے لئے صبح کے آٹھ بجے سے رات کے گیارہ بجے تک کے وقفہ مین ٹیلیفون کے ذریعہ سے ایک ہی اخبار نہین بلکہ اخبار کے مختلف ایڈیشن غیر کاغذی صورت مین شائع کرتی ہے جنمین لیڈنگ آرٹیکل بھی ہوتے ہین۔ نوٹ بھی ہوتے ہین۔ خبرین بھی ہوتی ہین مختلف معاملات پر آزادانہ رائے زنی بھی ہوتی ہے اور یہ سارا مجموعہ ٹیلیفون کی وساطت سے خریدارون کے پاس بھیج جایا کرتا ہے اس اخبار مین اشتہارات بھی ہوتے ہین جنکا معاوضہ ۱۲ سکنڈ کے لئے دو شلنگ (ڈیڑھ روپیہ) مقرر ہے۔ جرمنی و انگلستان مین بھی آجکل یہ طریقہ زیر بحث ہے اور عام میلان اسکو رواج دینے کا طرفدار ہے

مصنوعی اُون

مانچسٹر (برطانیہ) کا ایک جولاہا مدت سے روئی کے تجربات مین مصروف تھا۔ اُسے بہت ہی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا، اور بارہا تجربات مین ناکامی ہوئی۔ تاہم وہ استقلال سے کام لیتا رہا۔ آخرکار وہ روئی کو اُون کی صورت مین تبدیل کرنے مین کامیاب ہو گیا۔ گویا یہ مصنوعی اُون ہے جسمین بھیڑ کی اُون کے بہت سے خواص موجود ہین۔ اس مصنوعی اُون سے ایک قسم کا کپڑا بھی تیار کیا گیا ہے۔

کلام اکبر

یہ مسلّم ہے کہ ہم میں خودکشی جائز نہیں   ہاں یہ کہنا ہے کہ اب اس پر خوشی جائز نہیں

کھلا دیوان مرا تو شور تحسین بزم میں اٹھا   مگر سب ہو گئے خاموش جب مطلع کا بل آیا

حقائق میں بھی ہیں قسمیں سبھی ہے اور نئی بھی ہے لگا بھی   پھر ایسے دعوئ حق پرستی اور ایسے یاں اتہام بھی

پڑھے اُس باجماعت تاثیر ملت جا نہیں سکتی   لبِ اُس جا کہ آواز اذان بھی آ نہیں سکتی
تمہیں کو ناز ہو لے نوجوانوں ایسے لیڈر پر   مری امید تو نغمہ خوشی کا گا نہیں سکتی

اب تو پنڈت جی کا نام ہی لارک ہے   دل میں پیکر مانسن سے پارک ہے

ہوا بدلے جو دنیا کی تو مجھکو کیوں تکلف ہو   مگر اتنی نہ بدلے سانس لینے میں تکلف ہو

اب کہاں دست جنون تار گریباں اب کہاں   پانیر اور دستِ مجنون اور خبر ہے تار کی
لے لیا تیرہن نے کمسریٹ میں ٹھیکہ دودھ کا   ریل بنوانے لگے دریا داب کوہسار کی

فلسفے میں کیا دھرا ہے گھر کا ہو یا لندنی   سعی کا موقع ملے تو آرٹ یا سائنس سیکھ
دشمن دانا سے بچ پہچان لے نادان دوست   صرف لفاظی سے ان روزوں نہیں ملنے کی بھیک

مشرق کے جو ہو رہے تو پستی میں پڑے   مغرب سے سبق لیا تو مستی میں پڑے
پیدا ہی نہ ہونے کاش اطفال یہاں   آخر یہ کیوں بلائے ہستی میں پڑے

رقیبوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا جا کے تھانے میں
کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں

حاصل دنیا

آج ہے تاریخ عالم پر مری گہری نظر   صفحہ صفحہ میں ہے جسکے جلوہ گیتی فروز
ڈھونڈھا بارے آتے ہیں آنکھوں میں آنسو بھی مگر   ہے سر ایک نام اُس میں روشن مثل مہر نیمروز

حشر کے دامن سے طولانی ہے دامانِ خیال   سامنے فہرست آثار صنادید زمان
ہے دماغ اسوقت میرا محشرستانِ خیال   دیدۂ عبرت نگہ سے دیکھتا ہوں یہ سماں

ایک بھی ان میں سے اب باقی نہیں ملتے ہیں روزگار   دیکھکر یہ ہو کا عالم سخت حیرت ہو گئی
کیا تری رفتار ہے اے گردش لیل و نہار   سوچکر انجام دنیا مجھکو عبرت ہو گئی

خاک کے پردے میں پوشیدہ ہوئے وہ سب کے سب   حسرت دیدار کچھ تسکین ہماری ہو گئی
طبقۂ گور غریباں کے گنے ذرات جب   عالم رفتہ کی سب مردم شماری ہو گئی

وہ مقدس حضرت آدم کا ہیکل کیا ہوا   نسل سے جسکے ہے سب آثار ہستی کا نظام
خامۂ ابداع کا وہ نقش اول کیا ہوا   جس کے گل بوٹے نظر آتے ہیں دنیا میں تمام

حسن یوسف ہی نہ اب وہ گرمی بازار ہے   عشق ہی وہ اور نہ طوفان خیزی جذبات ہے
وہ سلاطین زمانہ ہیں نہ وہ دربار ہے   حاصل دنیا ہے کیا یہ سوچنے کی بات ہے

پیاری دنیا اگر کہ جلوہ تیرا ہے طاقت ربا   تیری رعنائی پہ دلدادہ ہیں ارباب ہوس
کشتۂ طرز تغافل ہیں ترے اہل وفا   زندگی میں چھٹ نہیں سکتے اسیران قفس

رازِ بقا

راستہ چلنے میں آنکھیں بند غفلت تھی   ہوش میں آ ہے تری رفتار میں دیوانگی
دیکھ آنکھیں کھول کر اے جادہ پیمائے فنا   کس طرف لے جا رہی ہے تجھکو اے زندگی
راہ یہ جاتی ہے سیدھی جانب ملک عدم   اسکو طے کرکے ملے گی تجھکو منزل موت کی

یہ وہ منزل ہے جہانسے عود ممکن ہی نہیں　یا نون اٹھتے ہی نہیں یان سے بقصد واپسی
ایسی وحشت خیز منزل ہو یہ اے غافل جہانؔ　مونس و ہمدم نہیں کوئی سوائے بیکسی

ہے یہ حدِ آخر ملکِ فنا یا یون سمجھ　راہِ اقلیمِ بقا کی پہلی منزل ہے یہی
ہے اسی منزل کی جانب رُخ ہر اک مخلوق کا　وہ فرشتہ ہو کہ جن ہو جانور یا آدمی

اک نہ اک دن ہے ورود اسجا سبھو کا ناگزیر　آج اگر کوئی نہیں پہنچا یہان تو کل سہی
شادیانا شاد سکو جان پیاری ہے مگر　نقدِ عمرِ بے بقا ہے رونمائی موت کی

نذر کر دی ایک نے کل ہجر مین درد و کے عمر　دوسرے نے یہ سمجھکر آج خوش ہو کر جان دی

ہجر سے کل بچ کے جان نیک انجام آگئی
آج شادی مرگ ہو کر وصل کے کام آگئی

منظرِ دنیائے فانی ہے تماشائے سراب　اہلِ بینش جانتے ہین اسکے نظارہ کو خواب
ڈوبتے دیکھے ہین کتنے ہی جہازِ زندگی　وقتِ غرق آیا ادھر ٹوٹی اُدھر کی طنابؔ

موجہ بادِ فنا نے کر دیا برباد اُسے　سر اُٹھایا جس نے تنک مانند حبابؔ
کیا ہوا رشکِ ارسطو ہے جو کوئی عقل مین　کیا ہوا اگر فلسفہ مین ہے فلاطون کا جواب

کیا نتیجہ ہے اگر کوئی ہے یوسف سا حسین　نفع کیا گر ہے کسی کو گنج قارون ستیابؔ
چاہے کوئی حسن مین یکتا ہو یا دولت مین فرد　عقل مین بے مثل ہو یا فلسفہ مین انتخاب

آخر کار ایک دن ہونا ہے ان سب کو فنا　ذرہ ذرہ جسم کا ہو جائے گا جزوِ تراب
حسن و دولت عقل و حکمت کام آنے کی نہیں　ہان اگر کام آئے گی غافل تو اک جنسِ ثواب

یہ متاعِ مستقل ہے ساتھ اعمالِ خیر　کیون حصولِ جنسِ فانی مین ہو سعی بے حسابؔ
کب تلک آنکھین بند رکھے گا زمانہ ہوشیار ہو　دیکھ چشمِ وا سے دنیائے دنی کے انقلابؔ

پردہ داری می کند بر طاق کسرے عنکبوت
چغد نوبت می زند بر گنبد افراسیاب

آئے دن تغییرِ عالم کے مناظر دیکھ کے　سارے ارمان مٹ گئے ہستی کے جو سب چلے
ہو گیا دنیائے فانی سے کچھ ایسا جی اچاٹ　شاق ہے رہنا یہان کا ہم کو دم بھر کیلئے

اب طبیعت بجھ گئی احساس باطل ہو گیا　جی نہ ویرانہ سے گھبرائے نہ بستی مین لگے
رنجِ دنیا کا کوئی موذی اثر دل پر نہیں　دلکو بہلاتے نہیں دل لگی کے مشغلے

ہان ہنسی بھی آتی ہو گی لیکن ایسے شخص کو　جسکی آنکھون پر کہ ہونگے پردہ غفلت پڑے
رنجِ دنیا بھی ستاتا ہو گا لیکن صرف انہین　جن کو کم صدمے زمانہ کے حوادث نے دیئے

ہوش والے کیا ہنسینگے جن کو ہے فکرِ مآل　اور انہین کیا غم جو غم سہنے کے عادی ہو گئے
خوب دیکھا ہمنے دنیا کا یہی دستور ہے　مٹ گئے ہین لوگ جو چرخ کی رفتار سے

اسکے دستِ ظلم سے ممکن نہیں ہرگز امان　سچ کہین ہمنے تو ہائی اسقدر صدمے سہے
رنج ہی کو جانتے ہین اب مفادِ زندگی　قلب بے حس ہو گیا ہے خشک آنسو ہو گئے

چھٹتے ہین کب رہِ زیست کی قیدِ ستم سے دیکھئے
ہو رہائی کب تلک اس زندانِ غم سے دیکھئے

نشتر [illegible]

رباعیات کوثر

خلاق بہارِ باغِ دنیا تو ہے　پھولون پتون کا جلوہ پیرا تو ہے
خارِ صحرا ہون یا کہ برگِ گلِ تر　کہتے ہین کہ اے قدیر یکتا تو ہے

خالق رازق علیم و دانا تو ہے　معطی محسن فرید و یکتا تو ہے
کیا کوہِ گران کا بار اُٹھائے تنکا　یارب مین ضعیف ہون توانا تو ہے

شایانِ غرور و ناز تو ہے یارب　عاجز بے کس نیاز تو ہے یارب
سب کی بگڑی کو جو بنا دیتا ہے　بے شک وہ کریم کارساز تو ہے یارب

چاند سورج نجوم سے ہے مصباح　اسکی قدرت کا کرتے ہین ایضاح
ظلمت و نور کی ہے یہ تسبیح　خالق اللیل فالق الاصباح

ہو مالکِ ملک و تخت یا صاحبِ تاج　ہو باج گزار یا ستانندۂ باج
سلطان و وزیر ہون کہ درویش و فقیر　یارب ترے انعام کے سب ہین محتاج

ای خالقِ ارض و گنبدِ نیلی کاخ　وحدت تری خرک و کفر کی ہے ناسخ

مولے ترے افضال کے سب طالب ہین　زاہد عابد ہون یا کہ رند گستاخ

خالق رازق قدیر وجبار ہے تو　معطی محسن غفور غفار ہے تو
میرے عیبون کو اپنی رحمت سے چھپا　رحمن و رحیم عفو و ستار ہے تو

بیکس عاجز کا والی و چارہ ساز　یارب تری ذات پاک ہی نقطہ نواز
اپنی رحمت سے عاصیون کو بخشنا　کام آئے قیامت مین نہ روزہ نہ نماز

دن رات خیال شاہدان طناز　عارض پیش نظر تھے یا زلف دراز
سب عمر کٹی حیف سیہ کاری مین　روزہ رکھا پڑھی نہ اک وقت نماز

صد حیف گناہون مین کٹی عمر دراز　ہم نفس کے تابع رہے یا بندۂ آز
صہبائے جوانی سے سیہ مست رہے　سوچے نہ زمانے کا نشیب اور فراز

حال عمل زشت کرون کیونکر عرض　ہوتے رہے ترک رات دن سنت و فرض
آب رحمت سے داغ عصیان دھو دے　اے خالق اطباق سموات و ارض

گھڑی

(شہزادہ مرحوم کی ابتدائی زمانے کی ایک غیر مطبوعہ نظم)

غضب کا وہ ابھرا ہوا صاف چہرہ　وہ پرزون کی شوخی وہ شفاف چہرہ
تری کوک مین ہے وہ جادو بیانی　دلاویز ہے وہ تری چھیڑ خوانی
ہین حیران تیری صدا سننے والے　کہ کہتے ہین صل علی سننے والے
تجھے بارہا زینت کوٹ دیکھا　جوانون کو تجھ پہ بہت لوٹ دیکھا
تڑپنے مین تیرے تپش حسن کی ہے　کہ پرزون مین تیرے کشش حسن کی ہے
قیامت ہے ضو تیری نور افگنی کی　مگر تو دلہن ہے نئی روشنی کی
ترے حسن پر ہر بشر مشیفتہ ہے　تری ہر ادا پر نظر شیفتہ ہے
امیدہ تو پردہ ساز مین ہے　عجب دلکشی تیری آواز مین ہے
ترے کیل پرزون مین شوخی بھری ہے　تری چال مین اے گھڑی دلبری ہے
جوانان لندن کی دولہن تو ہی ہے　مگر آج کل جان فیشن تو ہی ہے
قیامت کا تیرا قد نازنین ہے　کہ پاکٹ مین ییلاسے پردہ نشین ہے
نہوگی کبھی ختم رفتار تیری　رکے گی نہ تا حشر تلوار تیری
برابر نہین تیرے وعدہ مین شک ہے　کہ اوقات کی جانچ کی تو محک ہے
برابر نہین تیرے قدمین کجی ہے　کہ شیوہ ترا اے گھڑی راستی ہے
نتیجہ ور صدق ہے تیری چابی　سحر حسن کا ہے تری آفتابی
جگاتی ہے تو خفتگان سحر کو
اٹھاتی ہے بستر سے اک اک بشر کو

قحط علم

خشک ان روز دن ہی کشت زار علم　اب نہین پہلی سی پیدا وار علم
عقل و دانش کا نہ کیونکر قحط ہو　جب نہ برسے ابر دریا بار علم
جہل کی ہے دھوپ پھیلی ہر طرف　ہین کہان اشجار سایہ دار علم
بحر عالم سے کنارا کر گئے　قدر دان گوہر شاہوار علم
بڑھ رہی ہین جہل کی تاریکیان　گھٹ رہے ہین دمبدم انوار علم
اس سے اچھا شغلہ کوئی نہین　بہترین شغل کاروبار علم
کم نصیبی ہے نتیجہ جہل کا　نیک بختی ہے مآل کار علم
گوہر مقصود قیصر کو ملا
ہے عجب در بار دریا بار علم　**حسین عباس قیصر**

قطعہ شاکر

اجل کرے گی نہ ہنگام نزع پاس ترا　بقا نہین ہے تجھے ہی غلط قیاس ترا
پہن کے جامۂ ہستی ہے ننگ اترانا　کہ مستعار ہے بوسیدہ یہ لباس ترا

وہ ہم نشین اب اگلے سے انجمن مین نہین　وہ کیف نشۂ وحدت خم کہن مین نہین
اب ایک ایک کا دشمن بنا ہے اے شاکر　وطن وہی ہے وہ اگلا مگر وطن مین نہین

فطرت

عجب منظر تری صنعت کا ہے اے نقاش قدرت
کہ جسکا نام دنیا مین تماشاگاہ فطرت ہے

مجھے تو دیکھکر نقش و نگار خلق حیرت ہے
کہ قطرہ سے ہیولی اور ہیولے سے یہ صورت ہے

زمین تونے بنائی آفرینش کے ٹھہرنیکو
اور اُسپر چرخ کی کیسی لگائی بے ستون چھت ہے

اُگائے کسقدر گلہائے رنگارنگ اے قادر
عیان فرمائی جتنی راز کے پردہ مین حکمت ہے

بنایا خاک کے پتلے کو مخلوقات مین اشرف
کیا اس کو عطا علم و ہنر فہم و فراست ہے

تماشا ہے نظارافروز کثرت مین جو وحدت کا
اسی کا جلوہ ہر سو دیکھتا اہل بصیرت ہے

شجر کو اپنی عریانی کا غم بہمن مین کیون ہوگا
جب اسکو آمد آذر دی مین رنگا رنگ خلعت ہے

زمین کا گھومنا محور پہ اپنے اسکا باعث ہے
مہ و خور کو بظاہر دیکھنے مین جو مسافت ہے

یہ پرتو ماہ کا اور یہ ضیائے نیر اعظم
تجلّی برق کی تیرا ظہور شان و شوکت ہے

جو قدرت پیکر خاکی کو گویائی کی حاصل ہے
ہے اس مین رمز گویا اوٹ مین تنکے کے پربت ہے

نہ ہوتی طبلۂ عطار کو عزت کبھی حاصل
مگر اصل اسکی شہرت کی فقط بھونرون کی نکہت ہے

بشر کو غیظ دریا کو تلاطم باد کو تندی
سمک کو تجھسے پستی آسمان کو تجھسے رفعت ہے

روانی آب کو آتش فشانی کوہ کو تجھسے
کرہ مین ارض کے شامل حرارت اور برودت ہے

بخار اٹھا زمین سے ابر بنکر عرش پر پہنچا
ہوئی کایا پلٹ اسکی تو پھر باران رحمت ہے

کرشمہ تیری قدرت کا پہاڑ و نکے ہے جھرنے مین
سمندر کی بھی لہرون مین بپا شور قیامت ہے

تجھی سے نطق انسان کو پر پرواز طائر کو
صلابت سنگ کو آہو کو رم وحشی کو وحشت ہے

دیا اندوہ و حرمان عاشق ناشاد کو تونے
حسینون کو بنایا تونے با ناز و نزاکت ہے

مہیا گر تونگر کے لئے سامان ہے عشرت کا
گدا کو گوشۂ خلوت ہے اور گنج قناعت ہے

ستارہ ذرہ کے اقبال کا گیتی پہ چمکایا
صف انجم سے گردون کی سراسر زیب و زینت ہے

نظام دو جہان مین ہے مجال دم زدن کسکو
وہی ہوتا ہے اے خلاق جو تیری مشیت ہے

عطا کی خاک کے پتلے کو تونے عقل و دانائی
نہ ہو گر عقل و دانش تو بدن مٹی کی صورت ہے

شب و روز اور صبح و شام سب پیدا کئے تونے
تجھی سے روشنی دن کے لئے اور شب کو ظلمت ہے

جواہر کے خزانے بھر دیئے ہین کوہسارون مین
صدف کے پیٹ مین رکھا گہر کیا بیش قیمت ہے

ملکا چارون عناصر مختلف کو ایک قالب مین
مخالف ایک کی بس دوسرے سے گو طبیعت ہے

موالید ثلثہ مین بنائین اسقدر شکلین
کہ جنکی صفحۂ قرطاس پر مشکل صراحت ہے

صفت ہے فرق اور تمیز کا باہم اگر اُن مین
بکر کی اور صورت ہے زید کی کچھ اور صورت ہے

درختون طائرون چوپایون کیڑون مچھلیون سب مین
رکھا ہے فرق تمیز ی غرض جتنی کہ خلقت ہے

پری اور جن کی شکلین بھی نہونگی ایک سانچہ کی
نہین دیکھی ان آنکھون نے کہین کیا انکی حالت ہے

بنی آدم کو ان سب پر بنایا حکمران تونے
نہون ہم اسپہ بھی شاکر تو یہ کفران نعمت ہے

سرور و انبساط و نای و نوش و نغمۂ دلکش
یہ ساماں کئے پیدا کہ جن سے دلکو فرحت ہے

پر اُسکے ساتھ ہی آلام و امراض و غم و حرمان
صعوبت کلفت و رنج و کدورت کی بھی آفت ہے

نمو عالم ہستی کے سارے سازا و رساماں
فنا اکدم مین ہوجاتے ہین دنیا جائے عبرت ہے

مرقع دہر کا اس مختصر سی نظم مین کھینچون
بھلا مجکو دکالت مین کہاں اسکے فرصت ہے

ہمیشہ واقعاتی نظم مین لکھتا رہا عنبر
بدلنا ازدو تر رنگ سخن کو سخت دقت ہے

[illegible]

تازہ غزلین

از سید نظیر حسین صاحب نظیر

زمانے مین جسے اے ہمد موسب دل سمجھتے ہین
وہ قاتل کیطرف ہے جب تو ہم قاتل سمجھتے ہین

فلک کی برخلافی سے بھی اپنا مدعا نکلا
وہ کام آسان ہوتا ہے جسے مشکل سمجھتے ہین

نتیجہ عشق کا یہ ہے دوئی باقی نہین رہتی
انہین دیکھو ہمارے دلکو اپنا دل سمجھتے ہین

حسینونکی محبت بھی ہے کیا انصاف کی دشمن
اُسی کو ذبح کرتے ہین جسے مائل سمجھتے ہین

بڑھی ہے ناتوانی اسقدر صحرائے الفت مین
کہ ایک ایک گام کو ہم سیکڑون منزل سمجھتے ہین

نہ کیونکر آشنائے بحر الفت ہمتین ہارین
وہی دھارا نکلتا ہے جسے ساحل سمجھتے ہین

وہ کہتے ہین کہ ہم سبکی خبر رکھتے ہین اے نرگس
ہمارے چاہنے والے ہمین غافل سمجھتے ہین

خیال یار و داغ عشق لاکھون حسرت و ارمان
مزے لیتے ہین تنہائی کو ہم محفل سمجھتے ہین

ہر اک دل جلوہ گاہ یار ہو یہ ہو نہین سکتا
وہین رہتے ہین وہ جس دل کو قابل سمجھتے ہین

نظیر اہل ہنر سے کام ہے اوروں سے کیا مطلب
جو خود کامل ہین وہ بیشک تمہین کامل سمجھتے ہین

۲- سید الشعرا حضرت صمیم (بلند شہری)

آگ داغِ عشق کی یارب نہاں پردے میں ہو
خاک ہو جاؤں مگر دلکا دھواں پردے میں ہو

عشق ہو تو صبر کا بھی امتحاں پردے میں ہو
ضبطِ الفت چاہئے تو کیوں فغاں پردے میں ہو

آپکی ٹھوکر سے ہو گرد دلکی چادر مشتِ خاک
خاکساری سے ہماری آسماں پردے میں ہو

توتش اُڑیں دلکے مگر نظریں رہیں دل کی اُدھر
چشم بد دور ایسی آنکھوں کا سماں پردے میں ہو

بوسۂ لب دو تو دل پر رشک آئے خضر کو
آبِ حیواں پیکے عمرِ جاوداں پردے میں ہو

کھل کے آؤ سامنے میرے جو آنا ہے تمہیں
کوئی کیا سمجھے ۔ کسی کو کیا گماں پردے میں ہو

جان اب کھنچنے لگی اتنو دکھا صورت مجھے
پھر کہاں میں ۔ تو خدا جانے کہاں پردے میں ہو

آخر اک دن سر کو ٹکرا ہی گئے ہم دیوار سے
منہ نکلیں کسکا جو تجھسا نوجواں پردے میں ہو

اب زباں کھلنے کو ہے ٹوٹیگی مہر ضبط کی
اب کسی پیمانِ تسکیں کا کیوں بیاں پردے میں ہو

بے خبر ہو میری آنکھوں سے اندھیرا حشر کا
حشر کے بادل میں بھی دلکا دھواں پردے میں ہو

چاند کا ٹکڑا ہے مکھڑا تل ہے تارا آنکھ کا
بے نقاب آؤ تو کیوں جلوہ نہاں پردے میں ہو

ہمسے کھل کھیلے مزے لیکر تو اتنا ہو حجاب
دخترِ رز پہلو میں ہو پیرِ مغاں پردے میں ہو

راز کھلجائے گا آخر بے زبانی کا مری
دل نہ قابو میں تو کیونکر بیاں پردے میں ہو

ضبطِ دلکی آرزو کہتی ہے تلووں سے مرے
کوئی چھالا ہو تو کانٹے کی زباں پردے میں ہو

یہ رنگیلی ہے اسے ساقی نہ چھپنا چاہئے
یہ پری ایسی نہیں جسکی دکاں پردے میں ہو

ناوکِ دلدوز تو پی ہی گیا آخر لہو
خون کا پیاسا نہ ایسا میہماں پردے میں ہو

ظاہری توبہ نہ ٹوٹے چھپکے کھل کھیلو صمیم
پیر دمرشد رنگ اب جو کچھ ہو ہاں پردے میں ہو

جسکو ہم چاہیں وہ صورت آشنا پردے میں ہو
دیکھا کوئی کیوں دیکھے جب اپنا مدعا پردے میں ہو

دیکھنے والا نہ ہو تجھکو تو میں دیکھوں تجھے
دل میں میرے تو ہو دل کا مدعا پردے میں ہو

اب نہ تم چھپنا تمہیں اُٹھتی جوانی کی قسم
کوئی کیا کہدے تمہیں کیا جانے کیا پردے میں ہو

شرم ہے ضبطِ محبت کی خدا سے کیا کہیں
مدعا ظاہر نہ ہو تو کیا دعا پردے میں ہو

دل مرا چھلا سمجھکر بند مٹھی میں کیا
ہاتھ کیونکر آئے جب دزدِ حنا پردے میں ہو

کھیلنا تھا خوب کھل کھیلے بس اب تلین ہو
چار دن تو آبرو نامِ خدا پردے میں ہو

سامنے آتے ہوئے جھکتی ہیں آنکھیں آپکی
دل ہی میں آؤ کہ جلوہ چاند کا پردے میں ہو

ہمسے چھپنا بھی کسی کا ہے قیامت سے نہ کم
دیکھئے فتنے اٹھیں کیا حشر کیا پردے میں ہو

چھپکے سو سو بار توبہ کی ہے دو دو گھونٹ پر
یہ بھی اک چسکا ہے ۔ اتنا تو مزا پردے میں ہو

کھلکے ملنا ہمسے غیروں سے چھپانا منہ ترا
کیا عجب ہے یہ بھی کوئی شعبدہ پردے میں ہو

ڈھل چکا جب حسن تو چہرے پہ ڈالی ہے نقاب
اب کہاں صورت وہ اب جسکی ہوا پردے میں ہو

مار ڈالا اُنکی شرمیلی نگاہوں نے مجھے
یا الٰہی حشر کے دن خونبہا پردے میں ہو

دخترِ رز آخر نکل ہی کر رہے گی ایکدن
یہ رنگیلی وہ نہیں جو پارسا پردے میں ہو

رک جائے چوٹ گھونگھٹ میں نگاہِ ناز کی
جو کلیجہ توڑ دے ایسی ادا پردے میں ہو

دلکے ٹکڑے اُڑ گئے صدقے میں اس آواز پر
اور بھی اکبار ایسی ہی صدا پردے میں ہو

اب ہے پیری ۔ چاہئے اب شرم دنیا کی صمیم
عیب اب جو کچھ ہوا ہے مرد خدا پردے میں ہو

۳- منشی احسان اللہ خان صاحب احسان مدیرِ نظم بہادر گڈھ

دردمند ہجر ہوں میری دوا پردے میں ہو
موت کا بھی سامنا اب یا خدا پردے میں ہو

رازِ الفت ہو نہ افشا مدعا پردے میں ہو
دل یہ کہتا ہے محبت کا مزا پردے میں ہو

جور بیجا ہو کہ ظلم ناروا پردے میں ہو
جو ستم مجھپر ہو میرے دلربا پردے میں ہو

عشق اگر ہے حسن والونکی نہ ہو پردہ دری
بیوفائی کا بھی اُنکی تذکرا پردے میں ہو

شکوۂ جور و جفا سنتے ہیں جب بیٹھے ہوئے
نیچی نظروں کا اشارہ ہے گلا پردے میں ہو

روشنی محدود کب ہے شمع کی فانوس میں
بوئے گل کب ہے کہ حسنِ مہ لقا پردے میں ہو

یہ تمنا کا لہو ہے یہ نہیں رنگِ حنا
دستِ رنگیں کی جھلک آنگی کیا پردے میں ہو

کوئی نالہ کش پسِ دیوار اُدھر ہو آہ ہائے
کوئی حیلہ ساز ۔ پابندِ جفا پردے میں ہو

شوخیاں نیچی نگاہوں کی تکہ تی ہیں مگر
کمسنی کا ہے تقاضا اب حیا پردے میں ہو

ہاتھ سے چھوٹے نہ دامن مرتے مرتے صبر کا
ہو اگر احسان کسی پر مبتلا پردے میں ہو

۴- سید علی رضا صاحب ماہر (نگنوی)

تپشِ غم کو سکونِ دلِ نالاں سمجھا
خلشِ درد کو میں عشق کا درماں سمجھا

بیت ابرو کو جو سرنامۂ دیوان سمجھا زلف کو عشق کا ایک سلسلہ جنبان سمجھا
قطرہ اشک کو سرچشمۂ طوفان سمجھا لکہ ابر کو اک گوشۂ داماں سمجھا
انکی باتون سے سر بزم جو کچھ دل ٹھہرا لب جان بخش کو مین عیسی دوران سمجھا
کشمکش سے سگ و درباں کے ہوا کام تمام تیرے گھر مین نہ کوئی حرمت مہمان سمجھا
میرے بہلانے سے کیا کیا دل مضطر مچلا انکے سمجھانے سے کیا کیا دل نالان سمجھا
مرتے مرتے بھی نہ آئی مرے ابرو پہ شکن دہن زخم کو اسکا لب خندان سمجھا
آہ سنکر کسی مظلوم کی دل تھام لیا صحبت عیش کو مین خواب پریشان سمجھا
فصل گل آتی ہے پھر چاک نظر آنے لگے جنبش دست کو کیا خوب گریبان سمجھا
دل نے ناکامی پہ اپنی کف افسوس ملا لب خاموش کی جنبش جو نہ درمان سمجھا
ناوک ناز سے چھد کر جو مرا دل نکلا حسرتون نے اسے اک وصل کا سامان سمجھا
حسرت دید کے اظہار پہ درباں بگڑا بڑھ کے دامن جو لیا سگ جانان سمجھا
ضبط نے مہر لگا دی شب فرقت لب پر درد کو عشق کا گنجینۂ پنہان سمجھا
وصل کی شب مین جو دل کا کوئی ارمان نکلا نگہ ناز نے پر دردہ احسان سمجھا

دلکے داغون نے عجب باغ کھلایا ماہر
گوشۂ قبر کو مین رشک گلستان سمجھا

۵۔ حاجی حکیم محمد عاشق حسین خانصاحب ابو العلائی ہاتف

عرش خدائے عز و جل ہے خطاب دل ہے اس لئے فلک رفیع جناب دل
تار نفس سے گوہر جان کی ہے آبرو ٹوٹے کہین نہ سلسلۂ پیچ و تاب دل
پہونچے گا داغ سینہ کا کونین تک فروغ ہوگا محیط کون و مکان آفتاب دل
دود زبان شمع سے پیدا ہے پیچ زلف سوز درون سے آتی ہے بوئے کباب دل
پتھر سے ساخت اسکی یہ تعمیر نور کی دل کعبہ کا جواب نہ کعبہ جواب دل
روز ازل سے اس یم خوبی کا عشق ہے ہے بند جسکے شوق مین چشم حباب دل

ہاتف تمام راز ہین اس مین چھپے ہوے
مطلب سے خالی جان نہ ہرگز کتاب دل

۶۔ سید محمد سلطان صاحب سلطان منگرولی

اپنی نظرون سے گرا کر نہ کرو گم مجھکو کھو گیا مین تو نہ پاؤ گے کہین تم مجھکو
جانتا ہون مین تمھین جان کا اپنی مالک کہہ دیے لاگ سمجھتے ہو جو کچھ تم مجھکو
لیکے آغوش مین بھی ہائے ستایا نہ کیا آگیا ان کی نزاکت پہ ترحم مجھکو
کشتۂ طرز خموشی ہون اٹھون گا نہ کبھی آکے سو بار مسیحا جو کہین قم مجھکو
آرزو دل کی ہے وہ روز دکھائے اللہ مجھکو انکار ہوا ور پیار کرو تم مجھکو
خوب انصاف ہے جو چاہین کہے جائین حضور مین سنے جاؤن نہین حکم تکلم مجھکو
منھ چڑھا جاؤ جو خلوت مین تو آجائے مزہ چھیڑتے رہتے ہو محفل مین بہت تم مجھکو
رونے والا بھی نہین نعش پہ غربت مین کوئی بیکسی پر مری آتا ہے تبسم مجھکو

ہے بڑی شان مری نام ہے سلطان مرا
تم ہو معشوق تو جو چاہو کہو تم مجھکو

۷۔ منشی عبد الرحمن محمد محسن صاحب خوشتر منگرولی

لطف سے میری طرف ایک نظر تو دیکھو چاہنے والا تمھارا ہون ادھر تو دیکھو
جب کہا مین نے ترے لب مین مسیحائی ہے ہنسکے فرمایا ستمگر نے کہ مر تو دیکھو
سر فدا کرنے کو تیار ہے کس ہمت سے اپنے جانباز کا اے جان جگر تو دیکھو
محفل غیر سے تم آہی گئے تھام کے دل بیقراری کا ہماری یہ اثر تو دیکھو
صورت برق ٹھہرتی ہی نہین ایک جگہ کیسی بیتاب ہے قاتل کی نظر تو دیکھو
چھپ سکے گی نہ چھپائے سے یہ چوری ہرگز دلکو لیکر مرے اک بار مکر تو دیکھو

داد ملتی ہے تمھین کچھ کہ نہین۔ اے خوشتر
جان نثاری کا ذرا حوصلہ کر تو دیکھو

رباعی انیس

چھٹتا ہے مقام کوچ کرتا ہون مین فرقت اے زندگی کہ مرتا ہون مین
اللہ سے لو لگی ہے میری اوپر کے دم اسواسطے بھرتا ہون مین

اُردو مین ایک بیش قیمت اضافہ

عورتون کے لئے دو مفید اور ضروری کتابین

اردو زبان مین ایسی کتابین جنمین تندرستی اور حفظان صحت، بچون کی پرورش اور وہ ضروری معلومات جن کا عورتون کے لئے جاننا شمل ضروریات ستہ کے ہے نادر و نایاب ہین لیکن حال مین علیا حضرت سرکار عالیہ فرمانروائے بھوپال دام اقبالہا و مدظلہا نے جن کو اپنے صنف کی ہر قسم کی بہبودی و ترقی کا خیال بدرجہ غایت مد نظر ہے اپنے اہم مشاغل حکومت مین سے وقت نکالکر ان مضامین پر دو نہایت مفید کتابین شائع فرمائی ہین جنکا نام **تندرستی** اور **بچونکی پرورش** ہے حضور ممدوحہ نے ان مضامین کو اس طریقہ سے بیان کیا ہے کہ اُردو پڑھی ہوئی عورتین اچھی طرح اُن پر عبور حاصل کرسکتی ہین۔

(۱) **تندرستی** ۱۰۰ صفحہ کی کتاب ہے جو ۳ ابواب اور ۴۵ مضامین پر مشتمل ہے۔ اوّل باب مین نہایت مفصل و مشرح ہدایات حفظان صحت ہین۔ دوسرے باب مین امراض متعدی سے حفاظت کے طریقے بتلائے گئے ہین تیسرے باب مین اصول تیمارداری و واقفیت کی ضرورت اور عدم واقفیت کے نقصانات کی چند مثالین دیکر تیمارداری کی ضروری باتوں کو بیان کیا ہے قیمت [illegible]

(۲) **بچونکی پرورش** ۱۵۰ صفحہ کی کتاب ہے جو ۹ ابواب اور ۱۰۰ مضامین پر مشتمل ہے۔ باب اوّل مین زچہ خانہ کی ضروریات اور اولاد کی احتیاطین۔ باب دوم مین قدرتی رضاعت۔ اور باب سوم مین مصنوعی رضاعت اور بچہ کی غذا باب چہارم مین سونے کا طریقہ بچے کا وزن، قد، سر، حواس خمسہ، دماغ، دانت کا نکلنا، بولنا وغیرہ باب پنجم و ششم مین دوا علاج بیماری کی ابتدائی علامات اور چند عام بیماریان درج کیگئی ہین۔ باب ہفتم و ہشتم مین زمانہ طفولیت مین جو بیماریان ہوتی ہین اور ضرورتین واقع ہوتی ہین صراحت کے ساتھ درج کیگئی ہین سب سے آخر مین بچے کی نگرانی اور صحت کے اصول اور [illegible] بیان کیا ہے

قیمت [illegible] [illegible]

المشتہر۔ سکریٹری ہمدرد پبلشنگ کمپنی ہمدرد پریس لکھنؤ

ضروری اعلان

ہمارا کارخانہ کانچ سازی جو موجودہ ترقیات کا مکمل نمونہ ہے اب کام کرنے کے لئے بالکل تیار ہے۔ پینل (اندر کو دبی ہوئی) طرز کی بوتلین سر مین لگانے کے تیلون کے لئے، چوکور بوتلین، گول کنارے کی بوتلین، دوائیون کے لئے چھوٹی گول بوتلین، ہر قسم کی چمنیان اور لالٹینون کے گلوب وغیرہ کے لئے اسوقت آرڈر درج رجسٹر ہو رہے ہین

ہمارے کارخانہ کانچ سازی مین

شیشہ کو نہایت بہترین صورت مین صاف کیا جاتا ہے

کام کی صفائی قابل داد ہے!

پیکنگ کا طریقہ ایسا اچھا ہے کہ راستہ مین بہت کم نقصان ہوتا ہے!

جملہ دریافت طلب امور کے لئے پتہ ذیل پر خط و کتابت کرنا چاہئے

جگمل راجہ۔ الہ آباد گلاس ورکس نینی [illegible]

مرقعِ ادب

میری قسمت سے آئی یا مین یہ رنگ قبول پھول لکھین لطیفہ بین ایک وہ مین کیلئے

مرقع ادب ہندوستان مین غالباً اپنے موضوع کی پہلی کتاب ہوگی جسمین ملک کے مشاہیر انشاپردازون اور اہل قلم کے چیدہ چیدہ دلچسپ خطوط بڑی محنت سے تلاش کرکے جمع کردیئے گئے ہین جنمین سادگی، رنگینی، روزمرہ، نفیس محاورے، شوخی، بے تکلف بول چال، تحقیق، و تدقیق ہر قسم کے عنصر لطیف آپ ملاحظہ فرمائین گے۔

اس انشاے لطیف مین امیر مینائی۔ شوق قدوائی۔ اکبر الہ آبادی نظم لکھنوی۔ احسان شاہجہان پوری۔ وجاہت جھنجھانوی۔ دلگیر اکبرآبادی عجوی لکھنوی۔ مظہر مرادآبادی۔ عزیز لکھنوی۔ ارشد تھانوی قیصر بھوپالی جلیل القدر جلیل۔ حضور مرادآبادی۔ شہید مچھلی شہری۔ ریاض خیرآبادی۔ حکیم برہم۔ مولانا عبدالرزاق مولف البرامکہ وغیرہ مسٹر ایم مہدی حسین۔ مولانا سجاد حیدر صاحب بی اے۔ خان بہادر میر ناصر علی وغیرہ بزرگون اور احباب کے خطوط ہین۔ ان کے علاوہ دیگر احباب کے خطوط بھی اس مرقع مین لئے گئے ہین جنکا ایک ایک فقرہ مستقل داد چاہتا ہے۔ اس کتاب کو مین نے اپنے بساط کے موافق دلچسپ بنانے کی بے انتہا کوشش کی ہے خدا کرے میری محنت ٹھکانے لگے۔

"مرقع ادب" خاص اہتمام سے شائع ہو رہی ہے۔ کاغذ ولایتی نفیس۔ تقطیع چھوٹی۔ لکھائی اعلی درجہ کی۔ ضخامت ۱۶ اجزء قیمت علاوہ محصولڈاک عہ۔ جو صاحب قبل اشاعت قیمت بھیجدینگے اُنکے لئے محصولڈاک معاف درخواست جلد آنا چاہئے۔

نوٹ:۔ میری کتاب سے حضرت امیر مینائی کے وہ خطوط خارج ہین جو جناب ثاقب نے "مکتوبات امیر مینائی" مین شائع کئے ہین۔

المشتہر: صفدر مرزاپوری اردو کلب محمود نگر لکھنؤ

جدید الطبع کتابین

(۱) **حدیقۃ الاخلاق** "اکانومی آف ہیومن لائف" کا اردو ترجمہ اس کتاب کی نصیحتین موتیون مین تولنے کے قابل ہین۔ تقریباً تمام مہذب زبانون مین اسکا ترجمہ ہوا ہے۔ صرف انگریزی زبان ہی مین ایک صد کا ایڈیشن شائع ہوچکے ہین منشی پیارے لال صاحب شاکر (میرٹھی) نے اسکا اردو ترجمہ نہایت سلیس اور عام فہم کیا ہے سب سے بڑی سفارش اس کتاب کی یہ ہے کہ قابل مترجم نے اس ترجمہ کو اپنے بچون کے نام پر مخصوص کیا ہے قیمت ۱۲ر

(۲) **عالم خیال** مولوی احمد علی صاحب شوق قدوائی لکھنوی کی ایک بے اضافت و بے بدل اُردو نظم جو پبلک سے خلعت قبول حاصل کرچکی ہے۔ چارون رنگون کے ساتھ چار عالمانہ ریویو بھی شامل ہین۔ نیز منشی پیارے لال صاحب شاکر (میرٹھی) نے بھی ایک دلچسپ مقدمہ لکھا ہے شروع مین ایک محو خیال عورت کی نادر تصویر چسپان کیگئی ہے جو انھین نظمون کے لئے ایک چابکدست مصور نے بنائی ہے۔ قیمت ۔ ۔ ۔ ۔ ۶ر

(۳) **اکسیر سخن** مہاکوی کالیداس کی موسمی نظمون (رتو سنگھار) کا اردو ترجمہ نظم۔ شروع مین ملک کے مشہور فسانہ نویس بابو پریم چند صاحب نے ایک دلچسپ مقدمہ لکھا ہے جو بجائے خود دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ مہاراجہ بہادر سر راجہ کشن پرشاد صاحب شاد بالقابہم کے نام نامی پر یہ کتاب معنون کی گئی ہے اور آپکی تصویر بھی شامل ہے۔ نیز ان نظمون کے مترجم منشی پیارے لال صاحب شاکر میرٹھی کی تصویر بھی کتاب کے شروع مین لگائی گئی ہے۔ غرض یہ کتاب اس قابل ہے کہ ہاتھون ہاتھ خریدی جائے۔ قیمت ۶ر

روزنامچہ سیاحت آنریبل خواجہ غلام الثقلین صاحب بی اے ال ال بی۔ کا سفرنامہ جسمین عراق، حجاز، عجم وغیرہ کے مختلف اقطاع کی سیاحت کا حال درج ہے نہایت دلچسپ وکارآمد کتاب ہے حجم تقریباً ۰۰ صفحات قیمت عہ

(خرچہ روانگی خریدارون کے ذمہ ہوگا)

المشتہر۔ سکرٹری میرزا پبلشنگ کمپنی، میرزا پریس۔ لکھنؤ (دوم)

تذکرۃ الشعرا

از حسرت موہانی

سال مین چار بار سو سو صفحون پر سالانہ حجم ۴۰۰ صفحہ

قیمت سالانہ عا مع محصولڈاک — فی پرچہ ۸ مع محصولڈاک

یعنی اُردو زبان کے تمام مشہور اور صاحب دیوان اساتذہ کا ایک مبسوط تذکرہ مع ضمیمہ تذکرۃ الشعرا یعنی انتخاب دواوین اساتذہ مطبوعہ وغیر مطبوعہ نایاب پہلا پرچہ مشتمل حالات وتنقید کلام ثاقب ورسا شاگردان داغ وضمیمہ انتخاب دیوان آسیر شہیدی وتنہا شاگردان مصحفی شائع ہوچکا ہے۔

- دیوان حسرت موہانی ۱۴/
- دیوان غالب مع شرح از حسرت موہانی عہ/
- مکتوبات امیر مینائی مع ... داغ و امیر عہ/
- ... تسلیم استاد حسرت موہانی ۴/
- دیوان حسرت استاد جرأت ۴/
- دیوان ... شاگرد مرزا ... ۵/
- دیوان میر حسن ۵/
- دیوان جرأت ۵/
- دیوان مصحفی ۸/
- دیوان میر سوز ۱۴/
- دیوان قائم چاندپوری ۴/
- انتخاب ... [illegible] عہ/
- دیوان شیفتہ ۸/
- دیوان مرزا مائل دہلوی ۲/

المشتہر سید فضل الحسن حسرت موہانی سابق ایڈیٹر اردوی معلی علیگڈھ

پوسٹ کارڈ تقدیر

آپ ایک پوسٹ کارڈ پر اپنا نام اور تاریخ پیدائش اور اگر تاریخ معلوم نہو تو تخمینہ عمر اور پوسٹ کارڈ لکھنے کی تاریخ اور وقت لکھ کر بھیج دیجئے ہم آپکو آیندہ بارہ مہینے کے پیشتر آنے والے حالات و واقعات یعنی خوشی وغم کس ماہ مین کس تجارت نفع ہوگا روزگار کے متعلق ترقی، تبدیلی، موقوفی، علالت کیا اولاد ہوگی وغیرہ جملہ باتون کا خلاصہ عہ مین بذریعہ ویلیو پی ایبل ارسال کردینگے اطلاق ہونے پر قیمت بلاعذر واپس ہوگی اگر امتحان مدنظر ہو تو ۲ کے ڈاک کے ٹکٹ ارسال کردیجئے ہم آپ کو آپکی گزشتہ زندگی کے خاص تین واقعات لکھکر بھیجدینگے اسسے ہمارے اشتہار کی اصلیت ظاہر ہوجائیگی جنم پترا وغیرہ بھی تیار کیا جاتا ہے فیس صہ لغایت عـہ مختلف سوالات کا جواب بھی دیا جاتا ہے فیس فی سوال عہ (جواب طلب امور کے لئے جوابی کارڈ یا ۲ کا ٹکٹ آنا چاہیے)

المشتہر پروفیسر الیف ای میرل، وکٹوریہ گنج لکھنو۔

درازی دیکھکر بالونکی حیرت سی پیدا ہوتی ہے سما جاتے ہین کیونکر گیسوئے خمدار آنکھون مین

کیشولن نہایت خوش رنگ وخوشبودار تیل ہے۔ اسکے چند روزہ استعمال سے بال نرم وچمکدار ہوجاتے ہین۔ بالون کی سیاہی قائم رکھنا اور بالون کو دراز کرنا اس کا ادنی کرشمہ ہے۔ بالون کے امراض دور کرنے مین بے مثل ہے۔ سر کی گرمی وخشکی کا دافع ہے۔ آزمائش شرط ہے۔ قیمت صرف ۱۲ر (محصولڈاک وخرچہ پیکنگ ۵ر)

ایجنٹون کی ضرورت ہے

المشتہر۔ کیشولن کمپنی۔ مینوفکچرنگ پرفیومرس لکھنو

"العصر" جلد اوّل ودوم

جلد اول جسمین ساٹھ سے زائد نامور اہل قلم کے تقریباً پچاسی مضامین نظم ونثر درج ہین تصاویر کی تعداد ۳۰ ہے۔ حجم پونے تین سو صفحہ۔ قیمت مع محصول دو روپیہ۔

جلد دوم جسمین ۵۰ سے زائد نامور اہل قلم کے تقریباً اسّی مضامین نظم ونثر درج ہین۔ تصاویر کی تعداد ۱۵ ہے۔ حجم ڈھائی سو صفحہ۔ قیمت مع محصول دو روپیہ۔

مکمل جلدونکی تعداد بہت کم ہے۔ جلد طلب کیجئے۔ ورنہ پھر یہ علمی ذخیرہ کسی قیمت پر دستیاب نہوسکیگا۔ دونون جلدین یکجائی لینے کی صورت مین ۴ قیمت لیجائیگی۔ قسم دوم کی بھی کچھ مکمل جلدین موجود ہین۔ قیمت مع محصول عہ، مجلد۔ اگر دونون جلدین یکجائی لینے کی صورت مین صرف عاؔ قیمت لیجائے گی۔

المشتہر۔ منیجر رسالہ العصر۔ منزوا پریس۔ لکھنو۔

کتب خانہ جامعہ عثمانیہ